سیکولرزم

ڈاکٹر سفر الحوالی

www.KitaboSunnat.com

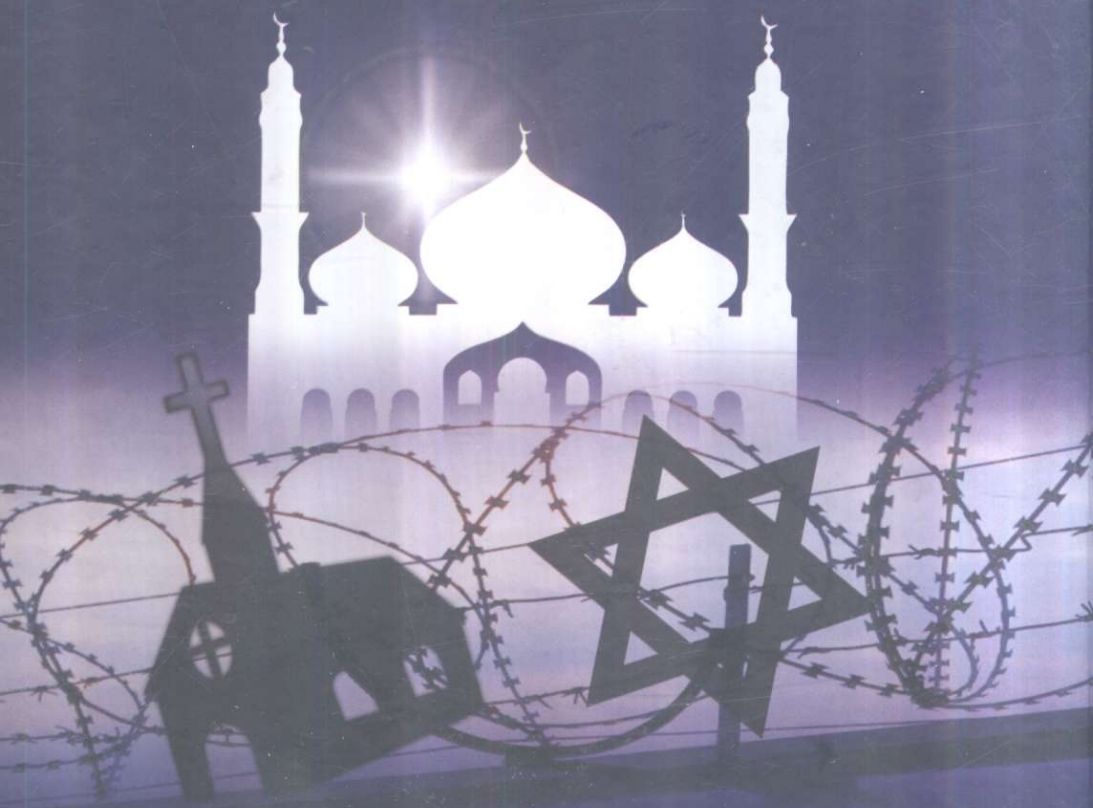

مترجم: محمد زکریا رفیق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب .....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشرواشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی وشرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

سیکولرزم

آغاز، ارتقا، اسلامی زندگی پر اثرات

تالیف: ڈاکٹر سفر بن عبدالرحمٰن الحوالی

ترجمہ: محمد زکریا رفیق

www.KitaboSunnat.com

کتاب سرائے

بیت الحکمت لاہور کا اشاعتی ادارہ

الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ○ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَتَّقُونَ﴾ (النحل:۵۱۔۵۲)

اللہ تعالیٰ ارشاد فرما چکا ہے کہ دو معبود نہ بناؤ۔ معبود تو صرف وہی اکیلا ہے، پس تم سب صرف میرا ہی ڈر خوف رکھو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور اسی کی عبادت لازم ہے، کیا پھر تم اس کے سوا اوروں سے ڈرتے ہو؟

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ﴾ (انعام:۱۶۲۔۱۶۳)

آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں سے پہلا ہوں۔

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ (المائدۃ:۵۰)

کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیاد
پروفیسر عبدالجبار شاکر رحمہ اللہ
۱۹۴۷-۲۰۰۹

جملہ حقوق محفوظ

۲۰۱۷ء - ۱۴۳۸ھ

نام کتاب: ..... سیکولرزم

تالیف: ..... ڈاکٹر سفر بن عبدالرحمٰن الحوالی

ترجمہ: ..... محمد زکریا رفیق

ناشر: ..... بیت الحکمت لاہور

مطبع: ..... عثمان، عمیر، شفیق پریس

صفحات: ۵۵۲

جلد ساز: ..... بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز،
مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884
ای میل: Kitabsaray@hotmail.com

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ترتیب

- عرض مترجم ۱۳
- پیش لفظ ۱۷
- علمانیہ اور سیکولرزم کی تعریفات ۲۷
- حصہ اول: یورپ کا دین عیسائیت، جس سے منحرف ہوکر وہ سیکولر بنا ۳۱
- باب:۱ عیسائیت میں تحریف ۳۳
  - مقدمہ ۳۳
  - دین عیسائیت میں عقیدے کی تحریف ۳۸
  - الف۔ اُلوہیت کا مسئلہ ۳۸
  - پولس (St.Paul) ۳۹
  - ب۔ اناجیل (Gospels) کی تحریف ۴۴
  - یورپ میں عیسائی شریعت کی تحریف کیسے ہوئی؟ ۵۰
  - دین کا ریاست سے الگ ہونا ۵۰
  - ۱۔ مسیحی علیہ السلام سے منسوب یہ قول: ''قیصر کو قیصر کا حق دو اور اللہ کو اللہ کا حق دو'' ۵۹
  - ۲۔ مسیح علیہ السلام سے منسوب دوسرا قول: ''میری مملکت، یہ جہان نہیں'' ۶۱
  - اصطلاحات۔۱ ۶۴
- باب:۲ دین عیسائیت میں بدعات نے کیسے جنم لیا؟ ۶۶
  - تمہید ۶۶
  - ۱۔ عیسائی دینی پیشوا ''پادری'' ۶۸
  - ۲۔ رہبانیت (Monasticism) ۷۵
  - اسباب رہبانیت ۷۵
  - نظام رہبانیت ۷۸
  - رہبانیت کے نتائج ۸۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- ۳۔اسرارمقدس۔عشائے ربانی ۸۲
- ۴۔تصویروں اور مورتیوں کی عبادت ۸۵
- ۵۔معجزات اور خرافات ۸۸
- ۶۔بخشش کے پروانے (Indulgence) ۹۱
- اس بدعت کے نتائج ۹۴

حصہ دوم: یورپ میں سیکولرزم کے اسباب ۹۷

باب:۳ کلیسا (Church) کی سرکشی ۹۹

- کلیسا کے اکابرین کی سرکشی اور اُس کے اسباب ۹۹
- ا: دینی سرکشی ۱۰۲
- ۲: سیاسی سرکشی ۱۰۵
- ۳: مالی سرکشی ۱۰۹
- کلیسائی سرکشی کے مظاہر ۱۰۹
- ا۔جاگیردارانہ املاک ۱۱۰
- ۲۔اوقاف ۱۱۰
- ۳۔عشور ۱۱۰
- ۴۔سال کا پہلا ٹیکس ۱۱۱
- ۵۔تحائف وعطیات ۱۱۱
- ۶۔بیگار ۱۱۱

باب:۴ کلیسا اور علم کی باہمی کشمکش ۱۱۳

- اول: جدید دور کا آغاز اور سترہویں صدی ۱۱۶
- دوم: اٹھارویں صدی ۱۲۱

باب:۵ فرانسیسی انقلاب (French Revolution) ۱۲۵

- ا۔لادینی فکر (Irreligion) جس نے دورِ تنویر (Enlightenment) کو پیدا کیا ۱۲۷
- ۲۔کلیسا کا عوامی مطالبات کی راہ میں حائل ہونا ۱۲۹
- ۳۔خفیہ شیطانی قوتیں ۱۲۹
- اصطلاحات۔۵ ۱۳۲

باب:۶ نظریہ ارتقا (Evolution Theory) ۱۳۴

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- ڈارون ازم کا فنی تعارف اور علمی حیثیت ۱۳۵
- ڈارون ازم کے اثرات ۱۴۰
- ۱۔ دینی عقیدے کا انہدام ۱۴۰
- ۲۔ غایت و مقصد کی نفی ۱۴۴
- ۳۔ انسان کی حیوانیت و مادیت ۱۴۶
- ۴۔ مطلق ارتقا کی فکر ۱۴۸
- اصطلاحات۔۶ ۱۵۳

■ حصہ سوم: یورپی زندگی میں سیکولرزم ۱۵۵

■ باب:۷ سیاست و قانون کا سیکولرزم ۱۵۷

- بحث اوّل: مسیحی دور میں سیاست و قانون ۱۵۷
- قبل جدید سیاسی نظریات ۱۵۸
- ۱۔ خیالی نظریہ ۱۵۹
- ۲۔ نظریہ عقد اجتماعی ۱۵۹
- ۳۔ نظریہ حق الٰہی ۱۶۱
- بحث دوم: جدید و معاصر نظریات ۱۶۴
- بحث سوم: جدید دور پر ایک نظر ۱۷۶
- ۱۔ لبرل ڈیموکریسی (Libral Democracy) ۱۷۷
- ۲۔ کمیونزم (Communism) ۱۸۴
- اصطلاحات۔۷ ۱۸۷

■ باب:۸ اقتصاد کا سیکولرزم ۱۹۳

- بحث اوّل: مسیحی دور میں اقتصاد ۱۹۳
- ۱۔ جاگیردارانہ نظام اور کلیسا کا نظریہ ۱۹۴
- جاگیرداری نظام کی اجمالی تصویر ۱۹۵
- ۱۔ جاگیرداری نظام کا دین سے تعلق ۱۹۸
- ۲۔ جمودِ مطلق کی خرابی ۱۹۸
- بحث دوم: لادین اقتصادی نظریات ۲۰۰
- ۱۔ فطرت پرستی کا نظریہ (فزیوکریسی۔Physiocracy) ۲۰۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

- ۲۔کلاسیکل سرمایہ دارانہ مکتب فکر ۲۰۳
- (ا) آدم سمتھ (Adam Smith) (۱۷۹۰ء) ۲۰۴
- آدم سمتھ کے افکار کے اثرات ۲۰۴
- (ب) مالتھس (Malthus) (۱۸۳۴ء) ۲۰۵
- مالتھس کے افکار کے اثرات ۲۰۶
- (ج) ریکارڈو (Ricardo) (۱۸۲۳ء) ۲۰۷
- کلاسیکل معاشی مکتبہ فکر کے عام اثرات ۲۱۰
- ۳۔کیمونزم کا اقتصادی نظام ۲۱۳
- کیمونسٹ فکر کے مصادر پر مبادیات ۲۱۳
- کیمونسٹ معاشرے میں دین کا کردار ۲۲۱
- جدید جاہلیت کی معاصر صورت حال ۲۲۲
- ا۔سرمایہ دار مغرب میں جدید معاصر جاہلیت کی صورت حال ۲۲۳
- ۲۔کیمونسٹ مشرق میں سیکولر اقتصاد کے نتائج ۲۲۹
- اصطلاحات۔۸ ۲۳۵

باب:۹ علم (Science) کا سیکولرزم ۲۳۷

- بحث اوّل: انیسویں صدی میں دین کے متعلق جدید علم کا موقف ۲۳۷
- بحث دوم: جدید علم کی دین سے جدائی اور معاشرے پر اثرات ۲۵۰
- اصطلاحات۔۹ ۲۵۷

باب:۱۰ یورپی معاشرت واخلاق کا سیکولرزم ۲۵۹

- بحث اوّل: قرون وسطیٰ کا معاشرہ واخلاق ۲۵۹
- بحث دوم: یورپ کے لادین معاشرتی مکاتب فکر اور نظریات ۲۶۳
- مقدمہ ۲۶۳
- علم معاشرہ (Sociology) کی پیدائش ۲۶۴
- ا۔عقد اجتماعی (Social Contract) کا نظریہ ۲۶۴
- ۲۔طبعی مکتبہ فکر (Physiocracy) ۲۶۶
- ۳۔عقلی وضعی مکتبہ فکر (Rationalism and Positivism) ۲۷۰
- الف۔آگسٹ کامتے (August comte) ۲۷۰

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- ب۔دورخائم(Durkheim) ۲۷۲
- ۴۔اخلاق اور معاشرے کے بارے میں کیمونزم کا نظریہ ۲۷۶
- ۵۔نظریہ عضویت(Organism)اور نظریہ افادیت(Utilitarianism) ۲۷۹
- ۶۔جدید نفسیاتی مطالعہ جات ۲۸۳
- اوّل: سلوکی مکتب فکر(Behaviourism) ۲۸۳
- دوم: تحلیل نفسی کا مکتب فکر (Psycho-analysis) ۲۸۵
- بحث سوم: موجودہ لادین معاشرے کی صورت حال ۲۹۱
- اصطلاحات۔۱۰ ۲۹۴
- باب: ۱۱ یورپ میں عورت کی معاشرتی آزادی اور حقوق(Feminism) ۲۹۷
- تمہید: یورپی فیمی نزم پر ایک طائرانہ نظر ۲۹۷
- بحث اوّل: مسیحی یورپ میں عورت کی صورت حال ۱۰۳
- بحث دوم: انقلاب فرانس کے بعد یورپی عورت کی صورت حال ۳۰۲
- یورپ میں عورت کی آزادی کے اثرات ۳۱۶
- کیمونسٹ معاشرے کے متعلق کچھ باتیں ۳۱۹
- باب:۱۲ ادب وفن(Literature and Art) کا سیکولرزم ۳۲۴
- تمہید ۳۲۴
- بحث اوّل: یورپی بیداری کا دور(Renaissance) ۳۲۶
- نوکلاسیکیت(Neo-Classicism) ۳۲۶
- بحث دوم: جدید دور ۳۳۳
- ا۔رومانیت(Romanticism) ۳۳۳
- ا۔انسان پرستی کے میلان کا ارتقا(Humanism) ۳۳۳
- ۲: عقلیت (Rationalism) کے خلاف ردّعمل، جو سترہویں اور اٹھارویں صدی میں غالب رہی ۳۳۵
- ب۔واقعیت(Realism) ۳۳۶
- تحریک واقعیت کے ابتدائی اہداف ۳۳۷
- بحث سوم: معاصر ادب(Contemporary Literature) ۳۴۱
- واقعیت سے لامعقولیت(Absurdism) کی طرف ۳۴۱

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

- ۱۔اباحیت کا رجحان (Permissiveness) ۳۴۲
- ۲۔ضیاع کا رجحان (Alienation) ۳۴۴
- ادب ضیاع کی مثالیں ۳۴۷
- ۱۔قضیہ از کافکا ۳۴۷
- ۲۔بوڑھا اور سمندر از ہمنگوائے ۳۴۸
- ۳۔پچیسواں گھنٹہ ۳۴۸
- ضیاع کے مکاتب فکر کی مثالیں ۳۵۱
- ۱۔وجودیت (Existentialism) ۳۵۱
- ۲۔رمزیت (Symbolism) ۳۵۲
- ۳۔سریالیت (Surrealism) ۳۵۲
- ۴۔کچلی ہوئی نفسیات کا ادب ۳۵۳
- ۵۔مایوسی اور قنوطیت کا ادب (ادب مستحیل) ۳۵۳
- ۶۔عدمیت پسند ادب (Nihilism) ۳۵۴
- ۷۔فرار اور خواب و خیال کا ادب ۳۵۴
- اصطلاحات۔۱۲ ۳۵۵

- باب:۱۳ دین کے لیے کیا باقی بچا؟ ۳۵۸
- باب:الحاقی۔۱ سرمایہ دارانہ نظام، بنیادی تعارف (مغربی تہذیب پر ایک جامع نظر) ۳۶۵
- سرمایہ دارانہ نظام کا تاریخی پس منظر ۳۶۵
- تحریک اصلاح مذہب۔عیسائیت کی پہلی علمی شکست ۳۶۶
- عیسائی علمیت کی پہلی شکست اجماع کے انکار پر مبنی تھی ۳۶۶
- سرمایہ دارانہ نظام، اُصول و مبادی اور اساسی اقدار ۳۶۷
- پروٹسٹنٹ فکر سے جدیدیت کی فکر تک ۳۶۷
- سرمایہ دارانہ علمیت ۳۷۰
- تصور انسانی حقوق ۳۷۳
- جمہوریت اور سرمایہ داری ۳۷۴
- سرمایہ دارانہ معیشت ۳۷۶
- اشتراکی یا ریاستی سرمایہ داری ۳۸۲

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- وحی یا سائنس ۳۸۴
- لبرل سرمایہ دارانہ ریاست، حقیقت و ماہیت ۳۸۶
- عالمی سرمایہ دارانہ تنظیم اور امریکہ ۳۸۹
- حصہ چہارم: اسلامی زندگی میں سیکولرزم ۳۹۱
- باب:۱۴ اُمت اسلامیہ کا انحراف (داخلی عامل) ۳۹۳
  - ۱۔ الوہیت کے مفہوم میں انحراف ۳۹۴
  - ۲۔ تقدیر کے مفہوم میں انحراف ۴۰۱
- باب:۱۵ یہودی صلیبی ریشہ دوانیاں (خارجی عامل) ۴۰۷
  - ۱۔ براہ راست قبضہ کرنے والی قوتیں ۴۱۳
  - ۲۔ مستشرقین (Orientalists) ۴۱۶
  - ۳۔ عیسائی دینی مبلغین (Missionaries) ۴۲۲
  - ۴۔ عرب نصاریٰ ۴۲۵
- باب:۱۶ سیکولرزم کے اسلامی زندگی پر اثرات ۴۲۸
  - سیاست و قانون میں سیکولرزم ۴۲۸
  - ترکی کی سیاست میں سیکولر رجحانات کا ارتقا ۴۲۹
  - مصر کی سیاست میں سیکولر رجحانات کا ارتقا ۴۳۵
- باب:۱۷ نظام تعلیم میں سیکولرزم ۴۴۴
  - مصر کے نظام تعلیم میں سیکولر رجحانات کا ارتقا ۴۴۴
  - مصر میں سیکولر ادبی رجحانات کا ارتقا ۴۵۸
- باب:۱۸ معاشرت و اخلاق میں سیکولرزم ۴۶۴
  - بلاد عرب میں بے حجابی اور تحریک نسواں کا ارتقا ۴۶۵
- حصہ پنجم: اسلام میں سیکولرزم کا حکم ۴۷۹
- باب:۱۹ کیا اسلام میں سیکولرزم کی گنجائش اور ضرورت ہے؟ ۴۸۱
  - اسلام اور کلیسائی دین میں جوہری فرق ۴۸۱
- باب:۲۰ اسلام میں سیکولرزم کا حکم ۴۹۷
  - اصطلاحات ۴۹۷
  - عبادت و طاغوت کی حقیقت ۵۰۱

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

- ۱۔طاغوت ۵۰۲
- ۲۔عبادت ۵۰۴
- سیکولرزم اسلام کے منافی ہے ۵۰۸
- ۱۔سیکولرزم حکم بغیر ما انزل اللہ (شریعت کی تحکیم وتنفیذ سے روگردانی) ہے ۵۰۸
- سیکولرزم کے حامیوں کے شبہات ۵۱۶
- ۲۔سیکولرزم عبادت الٰہی میں شرک ہے ۵۲۵
- انسان پر سیکولرزم کے برے اثرات ۵۳۲
- ضمیمہ جات ۵۳۷
- ضمیمہ۔۱ اہم فلاسفہ کی تاریخ ایک نظر میں ۵۳۷
- ضمیمہ۔۲ یورپ کی فکری تاریخ کے اہم ادوار ۵۴۱
- ضمیمہ۔۳ تاریخ یورپ کا ایک مختصر خاکہ ۵۴۵
- مزید مطالعہ کے لیے اہم مجوزہ کتب ۵۴۹

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عرض مترجم

الحمد لله ربّ العالمین۔ نحمده ونصلّی علی رسوله الکریم ۔ اما بعد!

شریعتِ اسلامی انسانی زندگی کے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ تین بنیادی علوم ''عقیدہ، تزکیہ نفس اور فقہ'' پر مشتمل ہے جو انفرادی واجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہیں۔ شریعت جیسی عظیم نعمت اُس وقت تک کما حقہ فائدہ نہیں دیتی جب تک اُس کو اپنے دور کے حالات پر منطبق نہ کیا جائے۔ موجودہ دور میں شریعت کے انطباق کا سب سے بڑا موضوع مغرب کے افکار، تہذیب، علوم وفنون، نظام اور طرز زندگی ہے۔ موجودہ دور میں شریعت کی روشنی میں مغربی تہذیب کا فہم حاصل کیے بغیر ہم شریعت کے تقاضوں کو بجالانے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ تعلیم، تربیت، دعوت، احیائے دین، شرعی سیاست اور جہاد کے تمام تر معاصر مناہج کا دارومدار اِس بات پر ہے کہ ہم اپنے دور کی غالب تہذیب کا فہم کس قدر جامع ومانع طریقے سے حاصل کرتے ہیں۔ اسلام کے زوال اور شکست و ریخت کا صحیح اندازہ بھی اُس وقت ہوتا ہے جب ہم مخالف فکر کو تمام فکری وعملی پہلوؤں سمیت سمجھنے کی کوشش کریں۔

زیرِنظر کتاب ''العلمانیة، سیکولرزم'' ڈاکٹر سفر الحوالی حفظہ اللہ کا ایم اے کا مقالہ ہے جو محمد قطب رحمہ اللہ کی زیرنگرانی سعودی عرب کی مدینہ یونیورسٹی میں لکھا گیا۔ اِس مقالے کو اپنی جامعیت، اختصار، سہل پن اور شرعی اسلوب کی وجہ سے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ چنانچہ اِس موضوع پر کتابچوں، تلخیصات اور تفہیمات کی بھرمار ہوگئی۔ ممکنہ طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب ایک مستقل مکتب فکر کی بنیاد بن گئی جو مغربی فکر وعمل اور اسلامی فکری مسائل کو شرعی تناظر میں دیکھنے کا مستقل اور منظم ملکہ پیدا کرتی ہے۔

اس کتاب میں بتلایا گیا ہے کہ یورپ میں دین عیسائیت کے خلاف لادینیت کی فضا کیسے پیدا ہوئی اور پروان چڑھی۔ دین کو بتدریج سیاست، معاشرت، اخلاق، اُمورِنسوانیت، معیشت، تعلیم، ادب وفن کے میدانوں سے کس طرح بے دخل کیا گیا۔ دین کے مدمقابل بڑے بڑے مکاتب فکر اور فلاسفہ کیسے پیدا ہوئے۔ یورپ کے نئے سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کیسے وجود میں آئے۔ یورپ کی تہذیب مسلمانوں پر کیسے اثر انداز ہوئی اور وہ اپنے فکر وعمل میں کیسے مغرب سے متاثر ہوتے چلے گئے۔

اُردو لٹریچر میں مغربی تہذیب کو سمجھنے کے لیے بہت قیمتی اور مفید مواد موجود ہے جو مختصر، سہل اور جامع ومانع بھی ہے اور منتہی طالب علموں کی تسکین کا سبب بھی۔ تاہم اِس کتاب کی افادیت دو مقاصد کے تحت اُردو لٹریچر میں ایک نیا اضافہ ہو سکتی ہے۔

① یہ کتاب اصلاً مبتدی طالب علموں کے لیے ہے جو مغربی فکر وتہذیب کو شروع سے ایک تاریخی تسلسل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے تحت سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب زندگی کے تمام پہلوؤں پر مغرب کے تمام بڑے بڑے مکاتب فکر پر محیط ہے۔ تاریخی تسلسل اور جامعیت کا اسلوب لائق تحسین ہے ۔

② سیکولرزم کے منتہی طالب علموں کے لیے اس کتاب میں اہم چیز شرعی نقد کا وہ خاص اُسلوب ہے جو اُردو دان طبقے کے لیے نیا ہے لیکن شرعی علما کی دنیا میں مشہور و معروف ہے۔

ڈاکٹر سفر نے اس کتاب کے اندر مغربی افکار کا فہم پیش کیا ہے اور ساتھ ساتھ نقد و جرح بھی۔ اُردو زبان میں مغربی فکر و فلسفہ کو بیان کرنے والے حضرات کی فہرست بڑی طویل ہے لیکن اُن میں شرعی نقد کی صلاحیت رکھنے والوں کی تعداد گنی چنی ہے۔ ڈاکٹر سفر کی تنقید داخلی بھی ہے اور خارجی بھی۔ داخلی تنقید کے تحت وہ مغربی افکار کا ردّ مغربی مفکرین کے اقوال سے کرتے ہیں۔ جیسے لبرل ڈیموکریسی کے عیوب کو لاسکی وغیرہ کے افکار سے واضح کیا گیا۔ اسی طرح مختلف مکاتب فکر کے ارتقا میں ہر بعد والا مکتب فکر پہلے مکتب فکر کی تغلیط کرتا ہے جیسے فزیوکریسی کا ردّ کلاسیکل سرمایہ داروں نے کیا اور سرمایہ داروں کا ردّ سوشلسٹ مفکرین نے کیا وغیرہ۔ مغربی فکر پر نقد کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ مغربی افکار کا مغربی معاشرے پر ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ ڈاکٹر سفر نے اِس کا مسلسل اہتمام کیا ہے۔

ڈاکٹر سفر کی خارجی تنقید شریعت کی روشنی میں ہے جو فقہی محاکمہ کے بجائے عقیدہ کی روشنی میں پیش کی گئی۔ یقیناً عقیدے کی روشنی میں سیکولرزم کا محاکمہ بہت قیمتی اور اعلیٰ چیز ہے لیکن فن عقیدہ کی زبان، اسلوب اور مزاج برصغیر کے علمی طبقے کے لیے اجنبی ہے۔ اِس اجنبیت کو دور کرنے کے لیے آخری باب کے شروع میں عقیدے کی اصطلاحات کا تعارف پیش کیا گیا ہے جس سے عقیدے کا محاکمہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر باب کے آخر میں اہم اصطلاحات کو تحریر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سفر الحوالی کا اسلوب تحریر مورخانہ اور صحافیانہ ہے۔ انھوں نے خالص فلسفیانہ لب ولہجہ استعمال نہیں کیا۔ البتہ انھوں نے مغرب کے مکاتب فکر کو اُن کے فنی ناموں کے ساتھ بیان کیا ہے جس کی وجہ سے مغربی فکر کا مطالعہ انگلش کتابوں سے کرنا آسان ہو جاتا ہے اور عالمی فکر کے ساتھ تعلق استوار ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے مغربی فکر پر تنقید ایسے ذاتی وضع کردہ اسلوب کے تحت کی جو فقط اُن کے ساتھ خاص تھا اور اُس کے ذریعے سے عالمی انگلش فکری ورثے کے ساتھ تعلق استوار نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح بعض لوگوں نے مغربی فکر پر ایسی شرعی تنقید کی جو اہل سنت و جماعت کے عقیدہ و فقہ کی تاریخی زبان پر مشتمل نہ تھی۔ یہ اسلوب بھی قابل اتباع نہیں۔

ترجمہ کا کام درحقیقت دو بڑی قوموں کا باہمی تبادلہ خیال اور ایک دوسرے کی تاریخی علمی روایت سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ اِس کتاب کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں کہ اہل عرب عالمی مغربی فکر کو کس شعور اور گہرائی کے ساتھ سمجھتے ہیں اور اُن کی فکری گہرائی کے ماخذات و مراجع کیا ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سفر کی فکر کے ماخذات علمی سطح پر کس درجے کے ہیں کہ اُن کے کام پر اعتماد کا مظاہرہ کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان مغربی فکر و فلسفہ کو سمجھنے میں اُردو زبان سے بہت آگے ہے۔ ول ڈیورانٹ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چالیس جلدوں پر مشتمل شہرہ آفاق کتاب (Story of civilization) کا عربی ترجمہ قصة الحضارة کے نام سے ۱۹۸۰ء سے بھی پہلے شائع ہو گیا تھا جو سیکولرزم کی تاریخ لکھنے میں ایک بنیادی ماخذ ہے۔ عربی میں تاریخ فلسفہ پر آٹھ جلدوں پر مشتمل ایک بڑا کام معرض وجود میں آچکا ہے۔ عربی کا سب سے زیادہ مشہور انسائیکلو پیڈیا الموسوعة العربية العالمية (World Arabic Encyclopedia) مغربی فکر و فلسفے کی تشریح و توضیح میں اردو کے چند گنے چنے انسائیکلو پیڈیاز سے بہت آگے ہے۔ اردو میں بھی فلسفہ کی ڈکشنری پر کام ہو چکا ہے لیکن عربی کی فلسفیانہ ڈکشنریاں تعداد میں زیادہ اور وسعت و دقت کی حامل ہیں۔ مغربی فکر و فلسفہ پر عربی کی سیکڑوں فنی کتب انٹرنیٹ (مثلاً Kt-b.org وغیرہ) پر موجود ہیں جن کا اردو زبان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان میں مغربی فکر و فلسفہ کو سمجھنے کے وسائل و ماخذات اردو سے زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر سفر الحوالی کے ماخذات اُن کی کتاب کے آخر میں پیش کیے گئے ہیں جو حقیقت میں وسیع و عریض بھی ہیں اور فکری نقد کی حامل بھی، عربی کتاب اُن کی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہے۔ (www.alhawali.com)

کتاب کا ترجمہ دو مراحل کے بعد پایہ تکمیل کو پہنچا۔ پہلے مرحلے میں نیم لفظی اور نیم بامحاورہ ترجمہ کیا گیا تا کہ کتاب کے کسی جملے کا مدعا و مقصود ضائع نہ ہو۔ دوسرے مرحلے میں سارے ترجمے کو سلیس، عام فہم اور خوب صورت بنانے کی کوشش کی گئی۔ کتاب کی آزاد ترجمانی، تلخیص، ترمیم یا تشریح نہیں کی گئی جو ابہام، انحراف اور شکوک پر مشتمل ہو اور حوالے کے قابل نہ بن سکے۔ اُردو زبان کے محاوروں، برصغیر کے ماحول و ثقافت اور مخاطبین کی ذہنی سطح کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرح سے مولف ڈاکٹر سفر کے لب و لہجہ اور تحریری مزاج کی بھی حتی الامکان پابندی کی کوشش کی گئی ہے۔ ترجمہ میں اجنبیت، خلا اور کھردراپن ناگزیر ہوتا ہے۔ تاہم اُس کو حتی الامکان کم کرنے کے لیے سیکولرزم کی تمام فکری مباحث کو متبادل اردو، عربی اور انگلش کتابوں سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کی تسہیل و اضافہ کے ضمن میں درج ذیل اُمور کو اختیار کیا گیا ہے۔

① ہر باب کے آخر میں اہم اصطلاحات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ہر اصطلاح کے فنی تعارف کے ساتھ ساتھ اُس کے شرعی حکم پر بھی چند کلمات نقل کیے گئے ہیں تا کہ گہری نظر والے اصطلاح کی تہہ تک پہنچ سکیں۔ اصطلاحات کے فنی معانی کی تعیین کے لیے زیادہ تر فلسفے کی عربی ڈکشنری سے رجوع کیا گیا ہے جو فنی فہم کے ساتھ ساتھ شرعی فہم بھی دیتی ہیں، تاہم بعض الفاظ کی تحقیق کے لیے فلسفے کی اُردو و انگلش لغات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اِس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کا کام بھی بے حد مفید ہے۔

② ڈاکٹر سفر کی کتاب کے تمام مباحث اُنھی کی ترتیب کے مطابق پیش کیے گئے ہیں۔ تاہم بعض مقامات پر سرخیوں کی کمی محسوس ہوئی تو اُن کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اُن کا ایک باب انتہائی طویل تھا تو اُس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

③ اہم الفاظ، اشخاص، مقامات، اصطلاحات کو جلی حروف میں لکھا گیا ہے تا کہ کتاب کا تسلسل ایک ہی نظر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں آسانی سے سمجھ آ سکے۔

④ عربی مراجع کی فہرست اصل عربی کتب میں موجود ہے، وہاں سے مراجعت کی جا سکتی ہے۔ عربی مراجع کے نہ ہونے کے باوجود کتاب کی اہمیت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ ہمارے علم کے مطابق مغربی تہذیب پر شرعی نقد کرنے والوں کی تعداد کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ مغربی تہذیب پر مستند عالم کی شرعی راہنمائی اتنی قیمتی ہے کہ اُس کو خوب پڑھنا واجب ہے۔ البتہ عربی مراجع کی کمی دور کرنے کے لیے کتاب کے آخر میں مجوزہ اُردو کتب کی فہرست دی گئی ہے۔

⑤ کتاب میں مختلف ضمیمہ جات اور الحاقی ابواب بھی شامل ہیں جو مترجم کی طرف سے ہیں اور موضوع کو سمجھنے میں انتہائی مفید ہیں۔ اِس طرح کتاب کا حجم تو بڑھ گیا ہے لیکن ہمارے گمان میں اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ جہاں کچھ لوگ مختصر کتابیں پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں وہاں کچھ لوگ طویل کتابیں پڑھنے والے بھی ہوتے ہیں۔ ہمارا مقصود سیکولرزم کی حقیقت کو اتنا منقح کرنا ہے کہ کسی قسم کا اشکال باقی نہ رہے۔

ڈاکٹر سفر الحوالی کی کتاب یورپی افکار اور مکاتب فکر کے ارتقا کو بیان کرتی ہے جو کئی صدیوں پر مشتمل ہے۔ تاہم اِس میں تازہ ترین صورت حال کی کمی محسوس ہوئی جیسے مابعد جدیدیت کے ہر شعبہ زندگی پر اثرات کا تذکرہ سرے سے نہیں کیا گیا۔ اسی طرح سیکولرزم کے حوالے سے ترکی اور مصر کی صورت حال تو واضح کی گئی لیکن برصغیر پاک و ہند کی صورت حال واضح نہیں کی گئی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کتاب کی تدوین ثانی میں ان کوتاہیوں کو ختم کیا جائے اور تسہیل و تحقیق کے اعلیٰ لوازمات پورے کیے جائیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب کی ایک تلخیص بھی پیش کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

کتاب کو علمی اعتبار سے بہتر، جامع اور مستند بنانے میں ہر ممکن کوشش کی گئی، تاہم اہل علم سے درخواست ہے کہ وہ اِس میں کوئی نقص اور عیب دیکھیں تو ضرور راہنمائی فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں بہترین جزا سے نوازے۔ آمین

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ میرے گناہوں کو معاف فرمائے، میری لغزشوں سے درگزر فرمائے، میرے اہل خانہ کی اور میری اصلاح فرمائے، ہمیں ہدایت پر گامزن رکھے، ہمیں دنیا اور آخرت کے ہر فتنہ اور شر سے محفوظ رکھے، ہماری دینی محنتوں کو قبول فرمائے۔ آمین

محمد زکریا رفیق
فاضل علوم شرعیہ، جامعہ محمدیہ گوجرانوالہ
مدرّس علوم شرعیہ۔ محقق شعبہ سیرت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ أَنْفُسِنَا وَسَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَهْدِهِ اللّٰهُ فَلا مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُضْلِلْ فَلا هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لا إِلٰهَ إِلا اللّٰهُ وَحْدَهُ لا شَرِيكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ.

امابعد: اللہ تعالیٰ نے اس امت پر بہت بڑا احسان کیا کہ اس کی خاطر سب سے افضل رسول بھیجا، کامل دین اور مضبوط شریعت نازل کی۔ یہ امت مستحق تھی کہ اس کا نام ''مسلمین'' رکھا جائے کیونکہ اس میں عاجزی و فرماں برداری کے تمام پہلو موجود تھے۔ یعنی دل اور اعضاء کی فرماں برداری، فرد اور معاشرے کا اللہ کے سامنے جھکنا اور ساری زندگی کو اللہ وحدہ لاشریک کے سپرد کر دینا۔

یہ وہ اسلام تھا جس کو کلمہ توحید ﴿لا إِلٰهَ إِلا اللّٰه﴾ نے اپنے اندر سمویا ہوا تھا۔ یہ کلمہ پوری کائنات کے وزن کے برابر تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ بھاری تھا۔ صحابہ کے دور سے یہ 'امت مسلمہ' صدیوں پر محیط پوری دنیا کے انسانوں کی قیادت کرتی رہی اور معمولی مقدار کے علاوہ ساری متمدن دنیا پر غالب رہی۔ اس امت کا مرکز مشرق و مغرب کے براعظموں کے درمیان تھا۔ اس امت کو یہ سب کچھ کلمہ طیبہ کے ادراک سے حاصل ہوا۔ امت نے اس کلمے کو سمجھا، اس کے تقاضوں پر عمل کیا اور اس کے فہم کو عملی زندگی میں واقع کیا۔ پھر اس امت مسلمہ کی شان و شوکت ختم ہوتی چلی گئی، اس کی تہذیب کملا گئی۔ اس کا عالی شان مرتبہ اور جاذب نظر مرکز گم ہوتا چلا گیا۔ اور یہ سب کچھ کلمہ ﴿لا إِلٰهَ إِلا اللّٰه﴾ کے سمجھنے کے سبب سے ہوا۔ کلمہ کے تقاضے بھلا دیے گئے اور اس کا فہم زوال پذیر ہو گیا۔

کلمہ توحید لا الہ الا اللہ اس امت کی جان تھی۔ یہ کلمہ امت کے وجود کا راز اور زندگی کا منبع تھا۔ جیسے جیسے امت اس عظیم نور سے دور ہوتی چلی گئی ویسے ویسے وہ اپنی ذاتی شان اور مرتبے سے بھی دور ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ معاملہ مکمل انحطاط تک پہنچ گیا۔

جب اس امت کو ''اپنی حیثیت و مقام سے جہالت'' کا خوف ناک مرض لاحق ہوا تو اس کا لازماً نتیجہ یہ نکلا کہ یہ دوسری قوموں کی جان لیوا تقلید میں ہانپنے لگی اور ناسمجھی میں ان کی طرز زندگی، نظام ہائے حیات اور اقدار کو اپناتی چلی گئی۔

یہ معاملہ امت مسلمہ کی زندگی میں پیش آیا۔ نبی ﷺ کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لَتَرْكَبُنَّ سُنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ ، وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ ، حَتَّى لَوْ اَنَّ أَحَدَهُمْ دَخَلَ جُحْرَ ضَبٍّ لَدَخَلْتُمْ ، وَحَتَّى لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ جَامَعَ اِمْرَأَتَه بِالطَّرِيْقِ لَفَعَلْتُمُوْهُ۔

''تم پچھلی امتوں کی تقلید کرنے لگو گے ایسے جیسے بالشت کے برابر بالشت ہوتی ہے اور بازو کے برابر بازو ہوتا ہے۔ حتی کہ اگر پچھلی امت کا کوئی انسان گوہ کی بل میں داخل ہوا تھا تو تم بھی داخل ہو گے۔ اور اگر ان میں سے کسی نے اپنی بیوی کے ساتھ برسرعام جماع کیا تھا تو تم بھی ایسا کرو گے''

(امام مالک نے اس کو صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس کی اصل صحیح مسلم میں ہے)

'مرض سے لاعلمی اور اس کے اسباب سے بے خبری' خود اس مرض کی ذات سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔ غلط تشخیص غلط علاج کا سبب ہوتی ہے۔ اور ہماری امت کی غلط تشخیص بار بار رونما ہوتی رہی۔

اس امت کو خیال دلایا گیا کہ اس کے امراض کی دوائی سادہ بدیسی علاج، کھوکھلے مظاہر، مختلف بیوند کاریوں سے ممکن ہے اور یہ سب کچھ کافروں سے مل سکتا ہے۔ ہم کافروں کو کافر کہنے سے شرماتے رہے بلکہ ان کو تہذیب یافتہ دنیا اور ترقی یافتہ اقوام کہہ کر پکارتے رہے۔

غیر اقوام میں ضم ہونے پر رضامندی درحقیقت بہت بڑی نفسیاتی جنگ کا سبب بنی جس کو ہم 'الغزو الفکری' یا 'فکری جنگ' کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور یہی فکری جنگ ہمارے وجود کے جوہر اور اساس کو نشانہ بناتی رہی۔

فکری کشمکش کے ہراول دستے، جیسا کہ شیطانی راستوں کا جال ہے، کئی قسم کے نعروں اور رویوں کے ساتھ ہمارے پیچھے لگ گئے، اور دستے بھی ایسے کہ فریب خوردہ اور مرعوب امت کو گمراہ کرنے اور دھوکہ دینے کے لیے کافی تھے۔

اشتراکیت، قومیت، وطنیت، حریت، فلسفہ اور لادینیت جیسے نام اور نعرے ظاہر ہوئے، ان وباؤں کا اثر ایسے پھیل گیا جیسے آگ نرم اور خشک لکڑیوں میں پھیل جاتی ہے۔ یہ نظریات اُن انسانوں کی عقلوں اور دلوں پر چھا گئے جن کی حفاظت کلمہ توحید ﴿لا اِلٰـهَ اِلا اللّٰـه﴾ سے تھی۔ انھی افکار و نظریات پر کمزور مسخ شدہ نسلیں پروان چڑھنے لگیں۔ امت مغرب کی غلامی پر لگ گئی اور اس کے اندر قوت حیات کے سرچشمے بند ہو گئے۔

بیسویں صدی کے طلوع ہونے کے بعد کئی تاریک دور بیت چکے ہیں جن میں یہ بیمار افکار و نظریات ہر طرف پھیل گئے۔ مسلمان امت میں کئی تحریف شدہ مذہب پروان چڑھے حتی کہ اسلام دشمنوں نے یہ بدفال منہ سے نکالی کہ یہ امت اپنے آخری سانس پورے کرنے والی ہے اور بالآخر دم توڑ دے گی۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی سازشوں کو ان کے منہ پر دے مارا۔ اس نے ڈھیروں آفات، آلام اور تاریکیوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اندر سے ایسے افراد پیدا کیے جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کر دکھایا۔ ہر اسلامی شہر اور علاقے سے جہادی تحریک پھٹ پڑی۔ ان تحریکوں سے اصیل فکر پھوٹ پڑی جو براہ راست کتاب وسنت سے غذا لیتی تھی۔ یہ امت مکمل شعور کے ساتھ ہدایت پر کاربند ہو کر اپنے تجدیدی مراحل طے کرنے لگی۔ اس امت کی قوت فکر کا راز بلکہ حیات وبقا کا راز فقط ایک بات میں چھپا ہوا تھا: ﴿لا اِلٰهَ اِلا اللّٰه﴾

''امت کے انحطاط کی سب سے بڑی وجہ کلمہ ﴿لا اِلٰـهَ اِلا اللّٰه﴾ کی حقیقت سے انحراف ہے۔ اور امت کی ترقی کا راستہ اس بات سے شروع ہوتا ہے کہ اس کلمے کا مفہوم صحیح کیا جائے، کلمہ سے پھوٹنے والے تصورات درست کیے جائیں، امت کے ذہن سے چمٹا ہوا اضطراب اور ابہام زائل کیا جائے۔''

علمی منہج واسلوب کے اعتبار سے عقیدہ کی طرز فکر کا تقاضا تھا کہ وہ علم کلام جس میں ہمارے ماضی کے علمائے عقائد مشغول رہے، اُس کو فقط ایک تاریخی مسئلہ قرار دیا جائے۔ صاف ستھرے اسلامی عقائد اور روشن تصورات ومفہومات ایک ایسے پاک صاف اصیل علمی منہج کا تقاضا کرتے تھے جو قدیم یونانی اثرات سے پاک ہو اور جدید مسموم فکری کشمکش سے غیر آلودہ ہو۔ خالص اسلامی عقیدے کی بنیاد پر امت کی ترقی ایسی حقیت تھی جس پر ایمان لانا آسان نہ تھا۔ وہ لوگ جنھوں نے اس حقیقت کو واضح کیا، بذات خود اس تلخ تجربہ کو محسوس کر چکے تھے جب انھوں نے اسلام کی تدریس کو مغربی طریق کار واسلوب کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ انھیں یہ احساس بھی تھا کہ مسلمان امت اور اس کے دین کا یہ حق ہے کہ امراض کی تکلیف اور علاج بار بار نہ ہو۔ امت کا راستہ خالص علمی منہج کے مطابق منصوبہ بندی سے ہو۔ ایسے اسلامی تعلیمی وتدریسی اسباق پڑھائے جائیں جو تخصص کے درجے کے ہوں، اسلامی عقیدہ پر خصوصی زور صرف کیا جائے اور غیر اسلامی افکار ومذہب کو بھی اسلامی منہج کے مطابق پڑھایا جائے۔

ان افراد میں سے ایک فاضل محترم جناب محمد امین ﷾ (سابق رئیس وراسات عالیہ، شریعت کالج) تھے۔ انھوں نے مکمل محنت کی کہ ''فکری مذاہب'' کے سبق کی تعلیم کو عقیدہ کے تحت بڑے اسباق کے تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ''فکری مذاہب'' کا مضمون تدریس کی غرض سے عصر حاضر کے عظیم مسلم مفکر ''استاذ محمد قطب حفظہ اللہ'' کے حصے میں آیا۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے کہ اس مقالے کا لکھاری شعبہ عقیدے سے ملحق تھا اور اس نے ایم اے کے درجہ تخصص کے مقالے کے لیے اس مضمون کو چنا اور استاد محمد قطب کے زیر نگرانی کام کیا۔

مؤلف نے سیکولرزم کے موضوع کو کیوں اختیار کیا؟

اگر چہ میں کوئی بھی فکری مذہب اپنے مقالہ کے لیے چن سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے سیکولرزم اور اس کے اثرات کا مضمون چننے کی راہنمائی کی۔ اس کے کئی اسباب تھے۔ جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

① یہ بات ایک حقیقت ہے کہ عوام تو ایک طرف رہی اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی سیکولرزم کے حقیقی مفہوم میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الجھن کا شکار ہیں۔ کیمونزم اور سوشلزم عالمی سطح پر زوال پذیر ہوئے اور کئی افراد نے ان کی حقیقت کھول کھول کر بیان کی، پھر بھی سیکولرزم ترقی کر رہا ہے۔ اور یہ ترقی کہیں تو اس کے صریح نام کے ساتھ ہو رہی ہے یا مختلف نعروں کے ذریعے جیسے جمہوریت، دین اللہ تعالیٰ کے لیے اور وطن سب کے لیے، سیاست میں کوئی دین نہیں اور دین میں کوئی سیاست نہیں۔ وغیرہ

② سیکولرزم ایک مکمل مغربی فکر ہے جو دین کو زندگی سے الگ قرار دیتی ہے۔ آج کی اسلامی دنیا اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں سیکولرزم کو برداشت کر رہی ہے، اگرچہ اسلامی دنیا میں سیکولرزم اس مکمل اور ننگی شکل میں وجود نہیں جیسا کہ یورپ میں ہے۔ مشرق و مغرب، عالم اسلام اور عالم مغرب میں سیکولرزم کے زندہ وجود نے میرے لیے راستہ ہموار کیا کہ میں اس موضوع کو اختیار کروں۔ میرا خیال ہے کہ ماہرین اس مضمون کی تدریس کو لازم کریں۔ وہ سیکولرزم کے کھوٹے پن کو واضح کریں اور سیکولرزم کو اسلام کے صحیح مفہوم کے مطابق روشن کریں جو لا الہ الا اللہ کے تقاضوں کے برعکس ہے۔

مجھے شروع میں احساس ہو گیا کہ یہ مہم آسان نہیں، مجھے خالص شرعی بحثوں سے ہٹ کر غور و خوض کرنا پڑے گا اور مغربی فکر پر میرا سابقہ مطالعہ فقط تمہید ثابت ہوگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں سیکولرزم کا عنوان اختیار کرتا ہوں تو مجھے نئے سرے سے سخت محنت کرنا پڑے گی۔

میں علمی طور پر مقالہ کے لیے مقرر مدت کا نصف حصہ مسلسل اور باقاعدہ مطالعہ میں مصروف رہا۔ فاضل استاذ محترم مسلسل اپنی قیمتی راہنمائی سے نوازتے رہے۔ میں نے سیاست، اقتصاد، علم، ادب اور فن میں مغرب کے مختلف نظریات اور بڑے بڑے مکاتب فکر کا مطالعہ کیا۔

میں جیسے جیسے اپنے مطالعہ میں گھستا چلا گیا، اپنے راستے میں آگے بڑھنے کا عزم و اعتماد بڑھتا چلا گیا۔ میں نے مقالہ کے آخر میں طویل مراجع ذکر کیے ہیں لیکن یہ میرے مطالعہ کا فقط ایک جزو ہیں میں کسی خسارے کو محسوس نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے مغربی جاہلی فکر کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ دیکھنے کا موقع دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مغربی فکر صرف باطل ہی نہیں بلکہ یہ نہایت حقیر اور کمزور ترین ہے۔ میں اپنی دل کی گہرائیوں سے یہ تمنا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے ہر نوجوان کو مغربی فکر کی خرابی سمجھنے کی توفیق دے جیسے اس نے مجھے توفیق عطا کی۔

مقالہ "سیکولرزم" کے ذیلی مباحث:

میں نے اپنے مقالے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:

پہلا حصہ: یورپ کے سابقہ دین کا تعارف جس سے منحرف ہو کر اس نے لادینیت اختیار کی

میں نے اس حصے میں ثابت کیا ہے کہ یورپ کے عیسائی مذہب میں تحریف کی گئی اور یہ عقیدہ و شریعت میں برحق دین الٰہی کی نمائندگی نہیں کر سکتا۔ میں نے عیسائی بدعات، خرافات اور تحریفات پر بھرپور تنقید کی ہے۔ عیسا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یت کی تنقید میں میرے ساتھ لادینیت کے علم بردار بھی شریک ہیں لیکن میں ان کے تنقیدی منہج اور طریق کار سے متفق نہیں بلکہ میں بعض اوقات ان کے نقطہ نظر سے اختلاف کرتا ہوں۔ قاری محسوس کرے گا کہ میں نے اس حصے کو طویل بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے انحراف کا سب سے بڑا سبب کلیسا کا کردار تھا۔ اس کے مقابلے میں اسلام خرافات سے بھی ویسے ہی جنگ کرتا ہے جیسے الحاد سے جنگ کرتا ہے۔

دوسرا حصہ: سیکولرزم کے اسباب

سیکولرزم کا بنیادی سبب تو تحریف شدہ عیسائیت تھی لیکن اس حصے کے اندر سیکولرزم کے فوری درپیش اسباب کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اسباب یہ ہیں۔

ا: کلیسا کا دینی، سیاسی اور مالی امور میں اپنی حدوں سے تجاوز کرنا اور اس کے تاریخی شواہد۔

ب: کلیسا اور جدید علم کے درمیان کشمکش۔ اس کشمکش کو تاریخی طور پر کاپرنیکس سے لے کر نیوٹن کے نظریے تک تاریخی نقد کے مکتبہ فکر کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ اور ابتدائی پادریوں اور ملحدوں کا نقطہ نظر بھی واضح کیا گیا ہے۔

ج: انقلاب فرانس۔ جو عیسائی یورپ میں پہلی لادین ریاست قائم کرنے کی وجہ بنا۔ اس انقلاب کے اسباب، نتائج اور طاقتور عناصر کو بیان کیا گیا ہے۔

د: نظریہ ارتقا۔ اس نظریے کے ساتھ ہی عیسائیت کا فکری عمل یورپ سے ہمیشہ کے لیے غلبہ سے محروم ہو گیا۔ اس نظریہ کے ان تباہ کن نتائج پر بھی گفتگو کی گئی ہے جو فکر اور زندگی کو لاحق ہوئے۔ اسی طرح فہم و شعور اور طرز زندگی کے میدانوں میں جو عملی نتائج سامنے آئے ان کو پیش کیا گیا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ کچھ دیگر اسباب بھی کم اہم نہ تھے لیکن ان کو بیان نہیں کیا گیا۔ مثلاً سیکولرزم کے فکری ارتقا میں یہود کا ایک مستقل کردار ہے لیکن میں نے یہود کو اس اعتبار سے پیش نہیں کیا۔ کیونکہ آنے والی بحثوں سے واضح ہوگا کہ یہود واقعات و حادثات کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے تھے لیکن وہ واقعات کے خود خالق نہ تھے۔ اس کی مختلف مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً

یہود نے انقلاب فرانس اور ڈارونزم کو الحاد و اباحیت کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ صنعتی انقلاب کو عالمی اقتصاد پر غلبہ پانے کے لیے استعمال کیا۔ ڈیموکریسی کو اس لیے استعمال کیا تاکہ داخلی سیاست کو مختلف رخ دیا جا سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر یہود کے مخصوص نظریات کو بھی مستقل بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ریکارڈو اور مارکس کو معاشیات کے باب میں اور درخائیم اور فرائڈ کو سماجیات اور اخلاقیات کے باب میں۔ ان نظریات کو مستقل اس لیے بیان کیا ہے کیونکہ ان کا سیکولرزم کے موضوع کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔

اسی طرح یورپ میں برپا اصلاح مذہب کی عیسائی تحریک نے بھی کلیسا کو ہلا کر رکھ دیا اور عیسائی عالم کی ظاہری وحدت کو توڑ کر رکھ دیا۔ اصلاح مذہب کی عیسائی تحریک بھی سیکولرزم کے اسباب میں کم اہم نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسرا حصہ: یورپی زندگی میں سیکولرزم

یہ اس مقالے کے موضوع کا سب سے بنیادی باب ہے۔ اس کو چھ ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا باب: حکومت و سیاست میں سیکولرزم۔ اس میں لادینی سیاسی فکر کے مشہور نظریات پیش کیے گئے ہیں مثلاً مثالی تصوراتی ریاست کا نظریہ، معاہدہ عمرانی کا نظریہ، ریاست کا حق ربانی کا نظریہ، اس کے بعد جدید سیاسی نظریات پیش کیے گئے ہیں جیسے میکیاولی کا نظریہ، ڈیموکریسی اور اس کی دو اقسام یعنی لبرل و کمیونسٹ۔

نظریات پر نقد و جرح کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ مختلف نظریات کو ان کے بنیادی حاملین کے تصورات کے مطابق پیش کیا گیا۔ اس سے قاری خود تنقیدی نتائج تک پہنچتا ہے اور کسی قائل کے ذمے کوئی قول زبردستی جڑنے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اور یہی طریق کار تمام ابواب میں ہے۔

ان نظریات کا رد کرنے کا سب سے بہتر اسلوب یہ سمجھا گیا کہ ان کے عملی زندگی پر اثرات و نتائج کو بیان کیا جائے اور یورپی مفکرین سے ہی گواہیاں پیش کی جائیں۔

نقد و جرح کے اس اسلوب کی دو بڑی وجوہات ہیں۔

(الف) کسی بھی نظریے کی عملی تطبیق ہی اس کی کامیابی یا ناکامی کی حقیقی کسوٹی ہوتی ہے۔

(ب) مختلف لادین نظریات کی تفصیلات کا مناقشہ بہت زیادہ محنت طلب بھی ہے اور اس کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں کیونکہ اسلام تمام لادینی تصورات و نظریات کو اُن کی بنیاد سمیت کلی طور پر رد کرتا ہے۔ جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان کتاب کے پانچویں حصے میں آئے گا، ان شاء اللہ۔

دوسرا باب: ''معاش و اقتصاد میں سیکولرزم''۔ اس میں قدیم جاگیردارانہ نظام پر گفتگو کی گئی ہے پھر اس کے بعد لادینی اقتصادی مکاتب فکر کو بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً طبیعی مکتب فکر (فزیوکریسی)، سرمایہ داری کا کلاسیکی مکتب فکر اور کمیونزم کا مکتب فکر۔ ہر مکتب فکر کے نظریات پیش کرنے کے بعد عصر حاضر کے حالات بھی بیان کیے گئے۔ اور وہ خوف ناک نتائج جو دین کو اقتصاد سے الگ کرنے کے ساتھ رونما ہوئے (خواہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام ہو یا مشرقی کمیونزم) سب کو واقعاتی شواہد کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔

تیسرا باب: ''علم میں سیکولرزم'' اس باب کے اندر وہ بنیادیں اور ظواہر بیان کیے گئے ہیں جن پر علم کی لادینیت قائم ہوئی مثلاً کلیسا کا موقف، یورپی نفسیات میں دینی اور بت پرستانہ ورثہ کے اثرات جو الحاد کو انسان کا دشمن بنا کر پیش کرتا تھا اور جو جان بوجھ کر انسان کو جاہل رکھنا چاہتا تھا۔ یہ سب کچھ توراۃ کے پیدائش والے باب اور یونانی دیومالائی کہانیوں میں موجود تھا۔ میں نے علم کی لادینیت کے مظاہر بھی بیان کیے ہیں مثلاً واقعات کی تشریح میں فقط صوری علتوں پر اکتفا کرنا اور غایات و مقاصد کی بحث کو بعید از قیاس سمجھنا۔ علمی بحثوں کو اللہ کے نام اور الٰہی دلائل سے خالی کرنے پر ہی علمی قرار دینا۔ زندگی کی ابتدا کے مسئلہ میں کمزور گنجلک متبادل تعبیرات بیان کرنا۔ کائنات اور زندگی کی تفسیر کو مطلق میکانکی قرار دینا۔ مغرب میں ''علم برائے علم'' اور اشتراکی ممالک میں ''علم برائے مخصوص

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریہ'' کا نعرہ بلند کرنا۔ حسب عادت علم اور دین کی علاحدگی کے برے اثرات و نتائج بھی بیان کیے جو معاصر معاشرے پر قائم ہوئے مثلاً الحاد کا فروغ، تعلیم یافتہ نسلوں کا قلق اور بے چینی میں مبتلا ہونا، علم کا بذات خود ایک خطرے کی صورت اختیار کر جانا جو پوری انسانیت کو دھمکا رہا ہے۔

چوتھا باب: معاشرت اور اخلاق کا سیکولرزم۔ تمہیداً قرون وسطیٰ کے کلیسائی اخلاق و معاشرے پر گفتگو کی گئی پھر لادین معاشرتی مکاتب فکر اور نظریات پر تفصیلی بات چیت کی گئی۔ سب سے پہلے علم سماج کی پیدائش اور مکاتب فکر پر گفتگو کی گئی یعنی عقد اجتماعی کا نظریہ، طبعی مکتبہ فکر، عقلی وضعی مکتبہ فکر یعنی کامتے اور دورخائم کے نظریات، کیمونزم کا معاشرتی نظریہ، عضویت اور افادیت کا مکتبہ فکر، جدید نفسیاتی مطالعہ جات یعنی سلوکیت اور تحلیل نفسی۔ پھر معاصر اخلاقی و معاشرتی صورت حال پر گفتگو کی گئی اور اس ضمن میں ایک مثال پر اکتفا کیا گیا اور وہ عورت اور اس کے متعلق پھیلنے والے معاشرتی فسادات پر مشتمل ہے۔ معاصر مشرقی اور مغربی لادین معاشروں کے اخلاقی انحطاط کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔

پانچواں باب: ادب وفن۔ اس میں یورپی ادبی رجحانات کا ذکر کیا گیا ہے۔

① بیداری کا ''نوکلاسیکی دور'' اس میں یونانی بت پرستانہ ورثہ کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور انسان پرستی کے میلان کو ابھارا گیا۔

② جدید دور:

ا: رومانسیت: اس کی تصویر کشی زندگی سے فرار ہے اور اس کی مثالیت 'فطرت و نیچر' کو معبود قرار دینا ہے۔

ب: واقعیت: اس کی پیدائش، اہداف، فنی امتیازات۔

③ معاصر ادب ''واقعیت سے لامعقولیت کی طرف سفر''، اس کے فکری اور معاشرتی اسباب۔ اس کے بڑے بڑے رجحانات کا تذکرہ:

ا: اباحیت کا رجحان، اس کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

ب: محرومی و بے مقصدیت کا رجحان، اس کی ادبی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

معاصر صورت حال میں ہر میدان کے اندر وہ مختصر مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں جو معاصر محرومی وضیاع کے مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتی ہیں جیسے وجودیت، رمزیت، سریالیت وغیرہ

اس مقالے کی تیاری میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ پیچیدہ نظریات کو مختصر اور آسان اسلوب کے ساتھ کیسے پیش کیا جائے۔ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری اس معاملے میں مدد کی۔

چھٹا باب: دین کے لیے باقی کیا بچا، یہ اس حصے کا تکملہ ہے جس میں آخرت اور جزا و سزا پر ارتکاز کیا گیا ہے۔ نیز کلیسا کے نصیب میں لکھی ہوئی مفلسی کا بیان ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جدید فساد کی وبائیں کیسے پھوٹیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چوتھا حصہ: اسلامی زندگی میں سیکولرزم کی ابتدا:

اس مقالے کا خاکہ وضع کرتے ہی سوچ لیا گیا تھا کہ سیکولرزم پر بحیثیت ایک 'مغربی فکر ونظریہ' گفتگو کرنا اس وقت تک مناسب نہیں جب تک اس کے ساتھ اسلامی زندگی پر اثرات بیان نہ کر دیے جائیں۔

حق تو یہ ہے کہ عالم اسلام میں سیکولرزم کے آغاز وارتقا پر الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ساتھ سیکولرزم کے اسباب ومظاہر پر تسلی بخش مواد پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب کے حجم اور مدت کا بھی خیال رکھا گیا۔ یورپ کے اندر سیکولرزم اور اس کے نتائج پر جو گفتگو کی گئی ہے وہ اجمالی طور پر ہر جگہ پر اس کے مظاہر کے حوالے سے منطبق ہو سکتی ہے۔

میں نے اس موضوع کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

الف: مسلمانوں کا انحراف۔ ب: یہودی وصلیبی منصوبہ بندیاں:

ا: **مسلمانوں کا انحراف:** جو یورپ میں نصرانیت کی تحریف کے مدمقابل تھا۔ میں نے اس انحراف کی مختلف صورتیں واضح کی ہیں جو توحید اور عقیدے سے متعلق ہیں۔ میں نے واضح کیا کہ کس طرح اسلام کے مفہومات کو فقط تعبدی شعائر کے اندر سکیڑ دیا گیا اور صوفیانہ افکار وتہذیبی جمود کو قبول عام حاصل ہو گیا۔ آخر میں مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ مسلمان بذات خود سیکولرزم کو قبول کرنے پر کیسے تیار ہوئے؟

ب: **یہودی صلیبی منصوبہ بندی:** اس میں مسلمانوں اور یہود ونصاریٰ کے مابین تاریخی دشمنی کی بنیادوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ دشمنی ہمیشہ رہے گی گو اس کے طور طریقے بدل چکے ہیں۔ اس بارے میں عالم اسلام کی منحرف صورت حال کو واضح کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں یہود ونصاریٰ کے طریق ہائے کار کو چار بڑی اقسام میں بیان کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں پر براہ راست قبضہ کرنے والی قوتیں، مستشرقین، عیسائی مبلغین اور باطنیت کے گروہ۔ ان چاروں اقسام کا مشترکہ ہدف ایک ہی ہے یعنی مسلمانوں کو ان کے دین سے نکالنا اور مغربی لادین رنگ میں رنگنا۔

② **اسلامی زندگی میں سیکولرزم کے مظاہر:** یہ ایک بڑا عنوان ہے میں نے اس کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے:

ا: **سیاست وقانون سازی میں سیکولرزم:** اس میں بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تہذیبی انحطاط کے دور میں واضح انحراف کی ابتدا کیسے ہوئی، فقہی استنباط میں جمود کیسے واقع ہوا، بیداری کے داعیوں نے یہ کیسے وہم کیا کہ ان کی پستی کا سبب تنظیمی وادارتی سطح پر پس ماندگی تھی اور مسلمانوں میں اصلاح کی فکر وکوشش کس طرح رنگ بدلتی گئی۔ پہلے کافروں کا انتظامی نظم ونسق منتقل کیا گیا پھر ان کے قوانین منتقل کیے گئے۔ ترکی کے اندر اصلاحی تحریک کس طرح سے مکمل سیکولرزم تک پہنچ گئی اور عرب ممالک کے اندر بالعموم اور مصر میں بالخصوص شریعت کو ملکی نظام سے کس طرح سے الگ کیا گیا۔ استعمار اور اصلاحی داعیوں میں کیسے تعاون واقع ہوا اور اس کے زیر اثر لادین سیاسی افکار اور متعدد نعروں ونظریوں کی حامل پارٹیاں کیسے وجود میں آئیں۔

ب: **تعلیم وتربیت میں سیکولرزم:** اس میں بیان کیا گیا ہے کہ عالم اسلام کا مغربی لادین تہذیب کے ساتھ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کشمکش سے پہلے تعلیمی وتربیتی معیار کیا تھا۔ تعلیم میں خطرناک دوہرا پن کیسے مکمل ہوا اور مغرب کاری کی پہلی تحریک کیسے چلی۔ تعلیم وتربیت کے میدان میں لادینیت کی دعوت کیسے شروع ہوئی؟ مثلاً یہ نعرہ کہ مغربی تہذیب سے استفادہ کیا جائے، چاہے وہ خیر کا معاملہ ہے یا شر۔ تہذیبی اور تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کے ماضی کو حقیر سمجھا جائے، جامعہ ازہر کو ترقی دی جائے، مغربی تعلیمی مناہج کو لاگو کیا جائے، فکر وادب میں لادین مکاتب کو منتقل کیا جائے وغیرہ۔

ج: **معاشرہ واخلاق کے میدان میں سیکولرزم:** اس میں سب سے پہلے یہ بات کی گئی ہے کہ دورانحطاط میں اسلامی معاشرہ اسلام کی حقیقت سے کتنا دور ہو گیا تھا اور وہ حقیقت اسلام کی کیسی بری نمائندگی کر رہا تھا۔ وہ مغربی تقلید کو ذاتی طور پر قبول کر رہا تھا۔ پھر آزادی نسواں کے مسئلے پر تفصیلی بات چیت کی گئی ہے جو جمال الدین افغانی اور رفاعہ طہطاوی سے شروع ہوتی ہے اور قاسم امین اور بیداری نسواں کی تحریک پر ختم ہوتی ہے۔ میں نے اس مسئلے میں علما، زعما اور ادبا کے کردار کو واضح کیا ہے۔ یہ ساری فکر نہ صرف ترکی بلکہ شام ومغرب کے علاقوں میں کیسے پھیلی اور اس کے عملی نتائج کیا واقع ہوئے؟

پانچواں حصہ: اسلام میں سیکولرزم کا حکم

یہ میری کتاب کا آخری حصہ ہے۔ اس کو مزید دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اول: تمہیدی باب۔ **کیا سیکولرزم کی اسلام میں گنجائش ہے؟**

اس کے اندر اسلام اور عقیدہ وشریعت کے لحاظ سے تحریف شدہ نصرانیت کے مابین جوہری فرق تاریخی صورت حال کے مطابق واضح کیا گیا ہے۔ ان دونوں اعتبار سے سیکولرزم کا منحرف تصور ہمارے دین میں داخل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔

دوم: **اسلام میں سیکولرزم کا حکم۔**

اس کے اندر سیکولرزم کا حکم اسلامی اصول عقیدہ کی روشنی میں اور کلمہ ﴿لا الہ الا اللہ﴾ کے حقیقی مفہوم اور طاغوت وعبادت کے مفاہیم کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ سیکولرزم اسلام سے دو جہتوں سے متضاد ہے۔

① اس اعتبار سے کہ سیکولرزم حکم بغیر ما انزل اللہ ہے۔ یعنی شریعت الٰہی سے ہٹ کر حاکمیت۔

② اس اعتبار سے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک ہے۔ اس بارے میں قرآن وحدیث سے تفصیلی دلائل اور علمائے سلف کے اقوال بیان کیے گئے ہیں۔

اس ضمن میں اس شبہے کا جواب دیا گیا ہے کہ بعض سیکولر نظام دینی شعائر کو ادا کرنے کی آزادی دیتے ہیں تو وہ کس طرح سے مذموم ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ شبہ کہ شریعت تو انسانی ارتقا کا ساتھ نہیں دے سکتی اور وہ معاصر زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتی تو اس کی حاکمیت کیسے ممکن ہے؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حق بات تو یہ ہے کہ اس مقالے کا حجم بہت زیادہ بڑھ گیا اور اس کی مقرر مدت بھی ختم ہوگئی جس کی وجہ سے میں بعض موضوعات کو مفصل بیان نہ کر سکا، خصوصاً معاصر اسلامی صورت حال کا موضوع تشنہ رہ گیا۔ اسی طرح موضوعات اور اشخاص کی تفصیلی فہرست ترتیب نہیں دی جا سکی جس سے قاری زیادہ بہتر فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ مغربی مفکرین کا تعارف ان کے نظریات و آرا پیش کرتے وقت ممکنہ طور پر واضح ہوسکتا ہے اور بعض جگہوں پر سن وفات کا اشارہ بھی دیا گیا ہے۔ بوقت ضرورت کسی مفکر کا تعارف حاشیے میں بھی دیا گیا ہے۔

اس مقالے کی تدوین میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کو خالص اپنی رضا کے لیے قبول فرمائے۔ وہ اس حقیر کوشش کو ان لوگوں کے لیے مفید بنائے جو بعد میں اس موضوع کو آگے بڑھانا چاہیں تا کہ ایک مکمل اور خالص اسلامی فکر تک پہنچا جا سکے۔

میں اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے یہ مقالہ لکھنے کی توفیق دی اور مجھ پر احسان کیا۔ میں مدینہ منورہ جامعہ اسلامیہ کے معزز نائب رئیس اور مکہ مکرمہ کلیہ شریعہ کے پرنسپل صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، اسی طرح اس رسالے کے محترم نگران صاحب اور ہر وہ شخص جس نے اِس کے اندر قابل قدر حصہ ڈالا۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علمانیہ اور سیکولرزم کی تعریفات

سیکولرزم (secularism) انگلش زبان کا لفظ ہے۔(۱)

عربی میں سیکولرزم کا ترجمہ علمانیہ کیا جاتا ہے۔ یہ ایک غلط ترجمہ ہے کیونکہ علمانیہ کا 'علم' یا اس کے مشتقات سے کوئی تعلق نہیں۔

انگریزی یا فرانسیسی میں منظم ومدون علم کے لیے 'سائنس' کا لفظ مستعمل ہے اور علمی مکتب فکر پر (scientism) کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مدون ومنظم علم سے منسوب چیز کو سائنٹفک (scientific) کہا جاتا ہے۔(۲)

لفظ 'علمانیہ' میں الف نون کی زیادتی عربی زبان کے اعتبار سے غیر قیاسی ہے کیونکہ اس قسم کے اسما میں الف نون نہیں آتا، یہ لفظ فقط سماعی طور پر آتے ہیں۔ متاخرین کی کلام میں الف نون والے لفظ بکثرت استعمال ہوئے ہیں جیسے روحانی، جسمانی، نورانی وغیرہ

سیکولرزم کا صحیح ترجمہ ''لادینیت'' یا ''دُنیویت'' ہے۔ دُنیویت کا لفظ فقط آخرت کے مقابلے میں نہیں بلکہ خاص ''دین'' کے مقابلے میں ہے یعنی جس چیز کا دین سے تعلق نہ ہو یا دین سے متضاد تعلق ہو اس کو ''دُنیوی'' کہا جاتا ہے۔

علمانیہ کے لفظ کا صحیح ترجمہ ان تعریفات سے واضح ہوتا ہے جو غیر ملکی ڈکشنریوں اور انسائیکلو پیڈیاز نے بیان کیا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سیکولرزم کا لفظ اس طرح سے بیان کرتا ہے۔

''یہ ایک ایسی اجتماعی تحریک ہے جو لوگوں کے سامنے آخرت کی بجائے اکیلی دنیا کو ہی ایک ہدف ومقصد کے طور پر پیش کرتی ہے۔''

یہ تحریک اس لیے برپا ہوئی کیونکہ وسطی عہد میں لوگ دنیا سے شدید اجتناب کرتے تھے اور اللہ وآخرت میں شدید رغبت رکھتے تھے۔ مغربی بیداری کے دور میں لوگ ثقافتی وانسانی ضروریات کی تکمیل میں شدید رغبت کرنے لگے اور اس محسوس دنیا کی لذات کے حصول میں آگے بڑھنے لگے تو ''سیکولرزم'' کا لفظ انسانی مسائل کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارتقا کے تناظر میں استعمال ہونا شروع ہوا۔

سیکولرزم کا رجحان جدید تاریخ کے دوران بتدریج پروان چڑھتا گیا حتی کہ یہ دین مخالف اور مسیحیت مخالف رجحان کے طور پر معتبر ہوا۔(۳)

ویبسٹر کی ''جدید عالمی ڈکشنری'' میں اس لفظ کی تشریح اس طرح کی گئی ہے۔

① ''دنیوی جذبہ یا دنیوی رجحان''۔ خاص طور پر ایسا نظام جو ایسی مبادیات، اعمال اور افعال سے تشکیل پائے جو ایمان وعبادت کی ہر شکل کا انکار کرتا ہو۔

② یہ اعتقاد کہ دین اور کلیسا کے معاملات کا حکومت اور عوام کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔(۴)

آکسفورڈ ڈکشنری ''سیکولر'' کلمے کی تشریح میں یہ کہتی ہے کہ

''سیکولر'' دینوی یا مادی چیز کو کہتے ہیں جو دینی یا روحانی نہ ہو۔ جیسے سیکولر تعلیم، سیکولر فن وموسیقی، سیکولر سلطنت، یعنی کلیسا کی مخالف حکومت۔

''سیکولر'' اس رائے اور فکر کو بھی کہتے ہیں جو اس بات کی قائل ہو کہ دین کو اخلاق وتربیت کی بنیاد نہیں ہونا چاہیے۔(۵)

"المعجم الدولی الثالث الجدید "سیکولرزم لفظ کی تشریح اس طرح سے کرتی ہے۔

''زندگی یا کسی بھی معاملے میں وہ رجحان جو اس بنیاد پر قائم ہو کہ دین یا دینی اعتبارات کو حکومت میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ دینی اعتبارات کو سیاست سے دور رکھنا ہی مقصد بنایا جائے۔ مثلاً سیکولر سیاست یعنی لادین سیاست۔

سیکولرزم ایک اجتماعی اخلاقی نظام بھی ہے جو اس فکر پر قائم ہے کہ اخلاقی وکرداری خوبیوں کو معاصر زندگی اور معاشرتی تعلقات کے تناظر پر قائم کرنا واجب ہے۔ دین کے تناظر پر قائم کرنا واجب نہیں''(۶)

مستشرق آربری اپنی کتاب "الدین فی الشرق الاوسط" میں اس لفظ (سیکولرزم) کی تشریح میں لکھتا ہے:

مادیت کا علمی مکتب فکر، انسان پرستی طبعی مکتب فکر، اثباتیت وغیرہ، یہ سب لادینیت کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن اس نے شرق اوسط میں کسی فلسفیانہ رنگ یا مخصوص ادبیت سے جنم نہیں لیا۔ اس کی ایک بڑی مثال جمہوریہ ترکی میں حکومت کا دین سے یکسر علیحدگی اختیار کرنا ہے۔(۷)

عصر حاضر کی عام اسلامی کتابوں میں سیکولرزم سے مراد "فصل الدین عن الدولة "یعنی دین و سیاست کی علاحدگی'' لیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ سیکولرزم کا مکمل مفہوم نہیں جو افراد واخلاق پر بھی ثابت ہوتا ہو۔ کبھی افراد واخلاق کا تعلق ریاست سے نہیں ہوتا لیکن وہ سیکولر ہو سکتے ہیں۔ اگر سیکولرزم کا ترجمہ "فصل دین عن الحیاة " یعنی ''دین کو مکمل زندگی سے الگ کرنا'' کیا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ سیکولرزم کا صحیح مفہوم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ زندگی کو دین سے ہٹ کر قائم کیا جائے، چاہے یہ قوم کی سطح پر ہو یا فرد کی۔ پھر دین کے محدود تصور کے متعلق مختلف افراد اور حکومتیں مختلف رویے اپناتی ہیں۔ بعض دین سے چشم پوشی کرتی ہیں جیسے لبرل ڈیموکریٹک معاشرے۔ اس کو معتدل سیکولرزم (non religious) کہتے ہیں۔ یعنی ایسے معاشرے جو لادین ہیں لیکن وہ دین کے دشمن نہیں، یہ معتدل سیکولر ہیں۔ یہ انتہا پسند سیکولرز (Antireligious) کے مقابلے میں ہیں جو کہ دین مخالف سیکولر ہیں جیسے کیمونسٹ معاشرے وغیرہ۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام میں سیکولرزم کی دونوں اقسام کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہر وہ فکر جو اپنی مبادیات وتطبیقات میں دینی نہ ہو، وہ دین مخالف ہے۔ چنانچہ اسلام اور سیکولرزم دو ایسے نقیض ہیں جو کبھی اکھٹے نہیں ہو سکتے اور اُن کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ (۸)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ اول

"یورپ کا دین عیسائیت، جس سے منحرف ہو کر وہ سیکولر بنا"

باب ① عیسائیت میں تحریف

① تحریف عقیدہ

② تحریف شریعت

باب ② عیسائیت دین میں پیدا ہونے والی بدعات

تمہید

① مذہبی پیشوا (پادری)

② رہبانیت

③ مقدس مذہبی اسرار

④ تصاویر اور مجسموں کی عبادت

⑤ معجزات و خرافات

⑥ بخشش کے سرٹیفکیٹ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱

عیسائیت میں تحریف

مقدمہ:

بت پرست یورپ 'عیسائی مذہب' کو پہلی صدی عیسوی سے ہی سمجھتا تھا کہ یہ بلند پایہ اور محترم عقاید کا حامل دین ہے۔ اسی طرح ایپقوری رومی سلطنت بعض دیگر عقاید کو بھی مضبوط اور مثالی تعلیمات سمجھتی تھی۔

رومی پیشواؤں نے اپنے محکوم علاقوں میں اس نئی عیسائی جد وجہد کا قلع قمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ اس مقصد کے لیے پہلی تین صدیوں تک کئی قسم کے پرتشدد طریقے آزماتے رہے۔ لیکن کئی تاریخی اسباب، جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں، ایسے پیدا ہوئے کہ شہنشاہ قسطنطین نے اس نئے دین کو قبول کرلیا۔ یہ اس وقت ہوا جب پہلی مسیحی کونسل نیقیہ مقام (Nicene) پر ۳۲۵ء کو منعقد ہوئی۔ اس وقت مسیحیت کو رومی سلطنت کا قانونی عقیدہ قرار دیا گیا۔

نئے عیسائی دین نے رومن امپریلزم کی مختلف اقوام سے شدید اثرات قبول کیے۔ مؤرخین نے اس کے مختلف اسباب بیان کیے ہیں (۹)

ہم ان میں سے وہ بیان کرتے ہیں جن کو ہمارے معاصر امریکی محقق نے پسند کیا ہے۔

① **موافقت کے عناصر:**

آپ یونان کے دیومالائی قصے کہانیوں، ایزیس اور متر کی داستانوں، یہودیت اور اُس دور کے دیگر مذاہب میں وہ مثالیں موجود پائیں گے جن کو عیسائیوں نے اپنے عقاید کا حصہ بنالیا۔

جیسے طہارت کے من گھڑت رسوم ورواج، معبود کا تصور جو مرجاتا اور پھر زندہ ہوجاتا ہے۔ کنواری ماں کا تصور (۱۰) جو حاملہ ہوجاتی ہے۔ محاسبہ کا دن، موسم بہار کی مذہبی تقریبات کا تصور، سردیوں کی آمد کی تقریبات، شیاطین، فرشتوں اور مخصوص مقدس افراد۔

② عیسائی مذہب نے دعویٰ کیا کہ آخرت میں نجات کے لیے ضروری ہے کہ دنیا کی فقیری، ظلم اور مصائب کو قبول کیا جائے۔ عیسائی مذہب کا یہ دعویٰ رومی عوام سے شدید اثرات قبول کرنے کی وجہ سے تھا۔ امپریلزم کی دبی پسی ہوئی عوام بھی اس نظریے کو اپنی دکھ بھری دنیا میں تسکین کا ایک پرکشش راستہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عیسائیت کمزور، لاغر اور مظلوم لوگوں کا دین ہے تو ہماری بات درست ثابت ہوتی ہے اور تمام اناجیل اس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تصریح کرتی ہیں۔

③ عیسائی مذہب کی دینی تعلیمات انتہا درجے کی پیچیدہ تھیں۔ چنانچہ ان میں فلسفیانہ رجحانات رکھنے والے افراد کے لیے میلان کا کافی سامان موجود تھا۔ چنانچہ دوسری صدی کے آخر تک عیسائی مذہب یونانی فکری روایات کے ساتھ مکمل طور پر یک جان ہو گیا۔

④ عیسائی مذہب کے ابتدائی دور میں جیسے استبدادی قوتیں مضبوط ہوئیں ویسے ہی استبداد کی شکار عوام بھی وحدت اور نظم وضبط میں پروئی گئی (۱۱)

⑤ اسی دوران ایک سیاسی عامل یہ بھی پیدا ہوا کہ رومن اسٹیٹ کو ایک ایسے منفرد عقیدے کی ضرورت پیش آئی جو اس کو متفرق اقوام کی عقائدی کشمکش سے نجات دلائے۔

مغربی دنیا ۳۲۵ء سے لے کر آج تک یہی سمجھتی ہے کہ وہ عیسائی دنیا ہے۔ یا کم از کم وہ ایک عرصے تک یہی سمجھتی رہی۔

لیکن اہم سوال یہ ہے کہ عیسائی مذہب حقیقت میں وہی وحی الٰہی تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے مسیح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام پر نازل کی تھی۔

دوسرے لفظوں میں کیا یورپ نے اللہ تعالیٰ کا برحق دین قبول کیا تھا؟ اور اس کی عبادت کا حق ادا کیا تھا؟ اور کیا وہ تاریخ کے کسی مرحلے میں صحیح معرفت کا حامل بھی رہا؟

کوئی بھی مورخ یا محقق عیسائی دین کے پیدائش کے زمانے پر گہری نظر ڈالے تو وہ اس بات کو لازماً پہچان لے گا کہ بحیرہ قلزم کے گرد پھیلا ہوا سارا علاقہ مختلف متضاد عقائد ونظریات کی آماج گاہ تھا۔ ہم ان میں سے چند کو یہاں ذکر کرتے ہیں۔

① **یہودی مذہب:** یہ وہ دین تھا جو بنی اسرائیل پر محدود تھا۔ یہ دین اس وجہ سے الگ تھلگ تھا کہ یہ آسمانی دین تھا۔ اس کے پاس مقدس کتاب تھی۔ اس کا وطن فلسطین تھا جہاں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے اور رسول بھی بنا کر بھیجے گئے۔

② **قدیم بت پرستی:** یہ قدیم بت پرستی کا عقیدہ تھا جو کاہنوں اور ذبح خانوں کے تصورات سے بھرا ہوا تھا۔ اس مذہب کا خیال تھا کہ انسان کی نجات اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی جان کاہنوں کے واسطے سے اپنے معبودوں پر قربان نہ کر دے۔ (۱۲)

③ **نو افلاطونی مذہب:** یہ فلسفیانہ عقیدہ تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات اپنی پیدائش وتدبیر میں تین عناصر سے صادر ہو رہی ہے۔

① ابتدائی تخلیق کار۔

② عقل جو ابتدائی تخلیق کار سے پیدا ہوئی جیسے بیٹا اپنے باپ سے پیدا ہوتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ پہلی روح جس سے تمام روحیں پیدا ہوئیں۔ یہ ''روح''، عقل کے واسطے سے ابتدائی تخلیق کار سے اسکندریہ مقام پر متصل ہوئی۔ (۱۳)

④ **مصری بت پرستی اور تثلیث:** اس کا عقیدہ تھا کہ معبود تین ہیں۔

① حورس جو کہ سیرالیس کا بیٹا تھا۔

② سیرالیس جو کہ ایک وقت میں بذات خود حورس تھا۔

③ ایزلیس۔ حورس کی والدہ (۱۴)

⑤ **رومی بت پرستی۔** امپریلزم کا باقاعدہ سرکاری دین۔ اس کی ابتدائی تعلیمات یہ تھیں۔

① تثلیث۔ (جیوپیٹر۔ مارس۔ کونیوس)

② ایمپائر کی پوجا۔ کیونکہ شہنشاہ رب ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ حاکم کو معبود سمجھنے کا تصور ھیلنستی یعنی نویونانی تصور تھا۔ (۱۵)

③ تصویروں اور مجسموں کو مقدس سمجھنا اور ان کی عبادت کرنا۔ (۱۶)

⑥ **فلسفیانہ افکار۔** ان میں سب سے زیادہ اہم ''رواقی فلسفہ'' تھا۔ یہ عملی پہلو کے اعتبار سے ''دنیا سے لاتعلقی'' کو اہمیت دیتا تھا۔ اور اپنے وجود کی نفی کو بلند پایہ مقصد گردانتا تھا۔ یہ فلسفہ اپیقوری اباحی فلسفے کے مناقض تھا جو رومی معاشرے میں پھیلا ہوا تھا۔ (۱۷)

اگر ہم ان عقائد کے مجموعوں میں سے مشترکہ عقائد نکالیں تو وہ چھ بنیادوں پر مشتمل ہوں گے۔

① یہودیت کی کتاب تورات پر ایمان۔

② فدیہ، نجات اور اللہ و انسانوں کے مابین واسطوں کا عقیدہ۔

③ تثلیث۔

④ حلول (معبودوں کا انسانی شکل اختیار کرنا)

⑤ تصویروں اور مجسموں کو مقدس گردانا۔

⑥ زندگی سے فرار (رہبانیت)

جب ہم ان چھے بنیادوں پر پہلی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ عیسائی دین کی بھی یہی بنیادیں ہیں۔ یہ وہی تعلیمات ہیں جو یورپی فکر پر ایک لمبا زمانہ چھائی رہیں۔ انسان اس نتیجے کو دیکھ کر دہشت زدہ رہ جاتا ہے حالانکہ یہ ایک صحیح ثابت شدہ نتیجہ ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے ''آسمانی خالص دین'' مختلف متحارب خرافات اور وثنیات کا مجموعہ بن جائے؟ اور اگر یہ ممکن ہے تو اس تبدیلی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور سب سے زیادہ قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ ان حالات میں مسیحیت نے اپنے نام اور نسبت کی حفاظت کیسے کر لی؟

مغربی فکر کے اکثر مورخین نے اس قسم کے سوالات کا جواب یہ دیا ہے کہ ''دین نصرانی دو مختلف حصوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں تقسیم ہوگیا تھا۔ان کا آپس میں تعلق مسیح کی لفظی نسبت کے سوا کچھ نہ تھا۔

① اصلی مسیحیت یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اصل دین۔

② رسمی مسیحیت یا پولس کا گھڑا ہوا دین۔

رسمی مسیحیت وہی ہے جس کے اجزا کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، اس کا اعلان مجلس نیقیہ نے سب سے پہلے ۳۲۵ء میں کیا تھا۔

اقوال وشواہد از علمائے مغرب:

برنٹن کہتا ہے: ''نیقیہ کی مجلس میں منظور ہونے والی مسیحیت وہی سابقہ رسمی عقیدہ تھا جو عظیم رومی ایمپائر کا مقرر کردہ تھا۔ یہ رب جلیل کے بارے میں اصل مسیحیوں کی مسیحیت سے یکسر جدا تھا۔ اگر کوئی شخص عہد جدید کو عیسائیت کی آخری تعبیر قرار دے تو وہ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نکالے گا: ''نہ صرف چوتھی صدی کی مسیحیت پہلی مسیحیت سے مختلف ہوگئی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ چوتھی صدی کے مسیحیت خود مسیحیت ہے ہی نہیں۔'' (۱۸)

انگریز مورخ ویلز کہتا ہے: ''ضروری ہے کہ ہم ارتقا یافتہ نیقیہ سے منظور شدہ مسیحیت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کے مابین گہرا فرق واضح کریں۔ یہ بات مکمل طور پر واضح ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات، نبوی تعلیمات کی جدید طرز پر ہی تھیں جو عبرانی انبیا کے ظاہر ہونے سے شروع ہوئی تھیں۔ یہ تعلیمات کاہنوں کی من گھڑت خرافات، مخصوص معبد یا گرجا گھر پر مبنی نہ تھیں۔ اس کے مخصوص شعائر اور بوجھل روایات نہ تھیں۔ اس میں تقرب الٰہی کا تصور ایک منکسر مزاج خشوع سے لبریز دل تھا۔ اس کی واحد مجلس ''واعظوں کی مجلس'' تھی۔ اس کی سب سے اہم محنت 'لوگوں کو نصیحت کرنا' تھی۔ اس کے مقابلے میں چوتھی صدی کی مسیحیت مکمل من گھڑت تھی۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات اناجیل میں بطور مصدر محفوظ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ نئی مسیحیت کاہنوں کا من گھڑت دین تھا جو لوگوں کے صدیوں سے قائم مانوس عادتوں پر مشتمل تھا۔ اس میں 'مذبح کا تصور' ان کی مزین رسوم و رواج کا مرکز تھا۔ ان کی عبادت میں بنیادی وظیفہ وہ قربانی تھی جو ایک روحانی انسان بزرگوں کے لیے پیش کرتا ہے۔ اس عبادت کے لیے ایک ڈھانچہ بھی تشکیل پایا جو چھوٹے پادری، بڑے پادری اور خدمت دین کے لیے وقف شدہ پادریوں کے نظم سے پروان چڑھا۔ اگر مسیحیت نے سیرالیس، آمون اور بعل مردک کے بیرونی عقاید وافکار سے غیر معمولی مشابہت اختیار کی تو یہ بات قابل غور ہے کہ اس کی مذہبی پیشوائیت بھی بالکل ایک نئی طرز کی چیز تھی۔

بعض متشکک مصنفین نے تو یہاں تک جرات کی ہے کہ یسوع علیہ السلام کو سرے سے مسیحی مانا ہی نہیں جاسکتا۔ (۱۹)

یہ محقق علما کی رائے ہے۔ یہاں کلیسا سے منسلک افراد کی رائے جاننا بھی ضروری ہے۔ اس ضمن میں ہمیں ڈاکٹر ولیم ٹمبل کی تحریر کافی ہے جو کنٹربری کے پادری تھے اور انگلینڈ کے ایک بڑے مذہبی عالم تھے۔ وہ کہتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں: ''یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ اللہ اکیلا ہی دین کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے یا دین کا بڑا حصہ اللہ پیش کرتا ہے''۔(۲۰)

یہ کلام کسی بڑے مذہبی عالم کا سہو یا اتفاقی غلطی نہیں۔ یہ کلیسا کے عقیدہ اور اس کی تاریخ کی سچی اور واضح تعبیر ہے۔

ان آرا کی روشنی میں ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ یورپ نے اُس نصرانیت کو قبول کیا تھا جو اللہ کی طرف وحی شدہ تھی اور سچی تھی یا اس من گھڑت مجموعے کو قبول کیا جس کو کلیسا کے ابتدائی آباواجداد نے گھڑ لیا تھا یا اپنے دور کے رائج عام عقاید سے استخراج کیا۔

یہ ثابت شدہ حقائق ہیں کہ کلیسا نے بڑی غلطیوں کا ایک تسلسل سے ارتکاب کیا۔ ان غلطیوں میں سے کوئی ایک غلطی بھی لوگوں کے مکمل اعتماد کے ختم ہونے کا سبب بن سکتی تھی۔ مسیح علیہ السلام کے دشمنوں میں سے کسی نے حضرت مسیح علیہ السلام یا ان کی تعلیمات کو نقصان نہیں پہنچایا جیسا کہ کلیسا نے پہنچایا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہونے پر انتہائی خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ عیسائی تعلیمات کا محافظ اور شارح ہے۔ لیکونٹ ڈی نوی نے سچ کہا ہے: ''انسان نے علمی حقائق کی پرواہ کیے بغیر مسیحی دین کے اندر تیسری صدی سے جو اضافے اور تفسیرات پیش کی ہیں، انھوں نے مادہ پرستوں اور ملحدوں کو دین دشمنی میں اپنی جدوجہد کے جواز پر طاقتور مضبوط دلائل فراہم کیے ہیں''۔(۲۱)

یہاں ہمارا مقصد کلیسا پر حملہ بازی یا عیوب کو اچھالنا نہیں۔ نہ ہی ہم اس سرکشی کو جواز فراہم کر رہے ہیں جو یورپ نے اپنے خالق کے مقابلے میں برسرعام ظاہر کی اور کلیسا کے خلاف بغاوت کو بھی جاری رکھا۔ ہمارا مقصد حقیقت کا بیان ہے جو مومن کی گمشدہ میراث ہے۔ خصوصاً جبکہ مسئلہ پوری انسانیت کا ہے۔ یورپ کا دائرہ کار ساری دنیا پر پھیل چکا ہے۔ اور ہم مسلمان خاص طور پر صلیبی جنگوں یا اسلام کی آمد سے آج تک اس آگ کے اثرات کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اس لیے ہم کوشش کریں گے کہ مسیحیت کے تحریف شدہ عقیدہ و شریعت کے موضوع کو بالتفصیل پیش کریں۔ اس سلسلے میں ہم بذات خود نصاریٰ محققین اور کلیسا کے مصادر پر اعتماد کریں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دین عیسائیت میں عقیدے کی تحریف

الف۔ اُلوہیت کا مسئلہ:

الوہیت کے مسئلے نے فلاسفہ اور مفکرین کو طویل صدیوں تک فلسفیانہ پیچیدگیوں میں مشغول رکھا ہے۔ خصوصاً اللہ کا تصور اور اس کی صفات۔ اس میں کئی قسم کے منحرف تصورات پیدا ہو گئے۔ بعض تجرید میں اس قدر غلو کر گئے کہ معاملہ معموں اور مبہم داستانوں تک پہنچ گیا اور بعض تجسیم میں اس قدر گر گئے کہ انھوں نے خدا کو حقیر مخلوقات اور جمادات کے درجے تک پہنچا دیا۔ بنی نوع انسان اس خبط اور گمراہی سے بے نیاز تھے، انہوں نے اپنے اوپر خود تنگی کی اور حقیقت تک پہنچنے کے غلط طریقے استعمال کیے۔ انھیں اس مسئلے میں غور وخوض کی ضرورت نہ تھی کیونکہ اللہ کی پہچان انسانی فطرت میں موجود ہے اور وہ اس کو وحی الٰہی کی صورت میں بھی حاصل ہو سکتی تھی۔ انسان نے انبیا کی تعلیمات کی بجائے فلسفیوں کے ظن وتخمین اور کاہنوں کی تحریفات کو قبول کر لیا۔

اگر ہم اس مسئلے میں حیران وسرگرداں لوگوں کے لیے کوئی عذر تلاش کر سکتے ہیں تو وہ ان امتوں کے لیے ہے جن سے وحی کا سلسلہ ایک طویل دور تک منقطع رہا جن کی آنکھیں انبیا سے منقول روایات تک رسائی حاصل نہ کر سکیں۔ لیکن وہ لوگ جو نور حقیقت کی نعمت کے باوجود خبطی بنے رہے اور انھوں نے تاریکیوں کو ترجیح دی تو ان کے لیے کیا عذر ہو سکتا ہے؟

وہ معاملہ کتنا سنگین ہو گا جب طب کے ماہرین میں سے کوئی اپنے فن میں ایک عمدہ علمی بحث لکھے اور اپنے خادم کو اس کی حفاظت کی وصیت کرے۔ لیکن خادم اس کی پرواہ نہ کرے، اس میں کمی بیشی کرے اور اس کو کانٹ چھانٹ کر کے بیکار قصے کہانیوں میں تبدیل کر دے۔ اور اگر یہی طریق کار وحی الٰہی کے ساتھ کیا جائے تو سنگینی کس قدر بڑھ جائے گی کیونکہ وحی کے بغیر زندگی درست ہوتی ہے اور نہ دنیا وآخرت سدھر سکتی ہے۔

مسیح علیہ السلام ایک ایسے ماحول میں بھیجے گئے جو وثنیات اور خرافات کے تہ بہ تہ ڈھیر سے بھرا ہوا تھا ہم نے اس کو قریب ہی ذکر کیا ہے۔ مسیح علیہ السلام کسی بھی نبی کی طرح اس ڈھیر کو قوم سے صاف کرنے کے لیے تشریف لائے، وہ ان کو اُس توحید کی طرف دعوت دینے کے لیے آئے جو پچھلے انبیا دیتے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے اپنی ذمہ داری خوب ادا کی اوران کی زندگی اس پر گواہ ہے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اُن کو اٹھالیا تو ان کے پیرو کاروں نے ایسی ایسی تحریفات پیدا کیں جو وہم وگمان میں نہیں تھیں۔

تحریف کا عمل مسلسل دس صدیوں تک جاری رہا بلکہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ابھی تک رکا نہیں۔ تحریف کی ابتدا بہت جلد شروع ہوگئی حتی کہ حواری ابھی بقید حیات تھے۔اس کی ابتدا ایک ایسے موضوع سے ہوئی جس کی زیادہ پروانہیں کی گئی۔

پہلا نزاعی مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ کیا حضرت مسیح علیہ السلام الٰہی طبیعت کے حامل ہیں؟ دائرۃ المعارف برطانیہ کے مطابق سیدنا عیسیٰ علیہ السلام سے ایسا کوئی دعویٰ صادر نہیں جس سے یہ پتا چلتا ہو کہ وہ عنصر الٰہی کے مالک تھے یا وہ عام انسانی عنصر سے اعلیٰ عنصر کے مالک تھے۔(۲۲)

ہمارے علم کے مطابق تمام تاریخی مصادر اس بات پر متفق ہیں کہ عیسائی تحریفات میں سب سے بڑا ہاتھ ایک ایسے مسیحی مبلغ کا تھا جو حواریوں کا پیروکار تھا جس کو محرف مسیحیت ''پولس'' کے نام سے پکارتی ہے۔یہ وہ انسان تھا جس نے پہلی مرتبہ مسیح کی اُلوہیت کا موضوع چھیڑا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں۔(۲۳)

اللہ اس بات سے بلند ہے۔یہ دعویٰ تثلیث کا پہلا بیج ثابت ہوا۔

پولس (Saint Paul):

پولس کا اصلی نام شاؤل تھا۔اس کی شخصی سیرت سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ عقائد میں عبقری حیثیت کا حامل تھا۔اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یہود کے اعلیٰ محکمے ''سان ہدرین'' کی ہدایات نافذ کرتا تھا۔اس کا استاد غمانویل بھی اسی محکمے کا رکن تھا۔(۲۴)

وہ سب سے پہلے اس وقت مشہور ہوا جب اس نے مسیحیوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔(۲۵)

پھر اچانک اس کی شخصیت بدل گئی اور وہ ابتدائی مسیحیت کا اہم فرد اور کلیسا کا روح رواں بن گیا۔اس وقت سے لے کر آج تک تاریخ کلیسا میں کسی شخص کو وہ تقدس وجلال نصیب نہیں ہوا جو اس کو حاصل ہوا۔لیکن یورپ کے آزاد مفکرین اس سے اپنی عداوت کو مخفی نہیں رکھتے۔حتی کہ ایک انگریزی مصنف بنتھم نے اپنی کتاب کا نام اس طرح رکھا: ''یسوع نہ کہ پولس''۔گوستاف لوبون نے حیات الحقائق میں یہی لفظ بولے ہیں۔ویلز نامی مورخ، جو معتدل لوگوں میں سے ہے، نے ایک باب قائم کیا جس کا نام ہے: ''مبادیات جو یسوع کی تعلیمات میں اضافہ کی گئیں'' اس میں وہ کہتا ہے: ''اور اس وقت ایک بہت بڑا معلم ظاہر ہوا جس کو موجودہ ناقدین مسیحیت کا حقیقی بانی قرار دیتے ہیں اور وہ شاؤل طرسوی یا پولس ہے۔صحیح بات یہ ہے کہ وہ یہودی النسل ہے اور اسکندریہ کی ھیلنسی الہیات کا متبحر عالم تھا۔وہ ہیلنسی مکاتب فکر کی فلسفیانہ تعبیرات اور رواقی اسالیب سے متاثر تھا۔وہ دینی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریات کا حامل معلم تھا جو یسوع ناصری سے لمبا زمانہ پہلے لوگوں کو تعلیم دینے میں مشغول رہا۔

نہایت واضح اور راجح بات یہ ہے کہ وہ میتھالوجی سے متأثر تھا کیونکہ وہ ایسی زبان استعمال کرتا تھا جو میتھالوجی عبارتوں سے گہری مشابہت رکھتی تھی۔ اس کے مختلف رسائل کو پڑھنے والا اور اناجیل کو پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا ذہن ایسے افکار سے بھرا ہوا تھا جو واضح طور پر یسوع علیہ السلام کے اقوال و تعلیم سے منقول نہیں۔ اس کا یہ نظریہ تھا کہ جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے قربانی پیش کرتا ہے تو وہ اس کے گناہوں سے کفارہ بن جاتی ہے۔ یسوع علیہ السلام کا دین انسانیت کے لیے ایک نئی زندگی تھی لیکن پولس جن باتوں کی تعلیم دیتا تھا وہ قدیم ادیان کا چربہ تھی۔ انسانوں کی قربانی، معبود کو راضی کرنے کے لیے خون بہانا وغیرہ۔ پولس نے یسوع علیہ السلام کی زیارت نہیں کی۔ اس نے یسوع علیہ السلام کا تعارف و تعلیمات اُن کے اصلی شاگردوں سے سماع کر کے حاصل کیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس نے بہت ساری باتیں بزعم خود یسوع کی روح سے اُن کی نئی پیدائش کے موقع پر حاصل کی۔ اس طرح اُس نے اپنی فکر کو لاہوتی نظام میں داخل کر دیا۔ (۲۶)

ہم ان تمام اثرات و افکار کو ایک طرف رکھ سکتے ہیں جن کو پولس نے متعارف کروایا۔ لیکن ایک چیز کو ہم نہیں بھلا سکتے، وہ اسکندریہ کی لاہوتیات (Theology) ہیں جن میں پولس کافی مہارت رکھتا تھا۔ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لاہوتیات نو افلاطونیت کا فلسفیانہ مکتبہ فکر تھا جس کا ذکر ہم پہلے تثلیث کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ وہاں سے پولس نے تثلیث کی فکر منتقل کی۔

﴿يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِن قَبْلُ﴾ (التوبہ:۹/۳۰)

''اگلے منکروں کی بات کی یہ بھی نقل کرنے لگے''۔

اُس نے افلاطونیت پر جو اصلاح داخل کرنے کی کوشش کی وہ محض ظاہری تھی نہ کہ معنوی۔ اس نے پہلے ازلی منشا کی جگہ پر اللہ کو بحیثیت باپ رکھا۔ اور پہلے منشا سے پیدا ہونے والی عقل کی جگہ پر یسوع کو بیٹے کی حیثیت سے رکھا اور روح کلی کی جگہ پر روح القدس کو رکھا۔ پھر ایک قدم آگے چلا اور اس نے نجات کی فکر کو بھی میتھالوجی سے اخذ کیا اور قربانی کو دوسرا اُقنوم بنایا۔ پھر کلیسا نے اپنا سفر مکمل کیا اور نجات کی فکر کے ساتھ ساتھ اُس صلیب کی لکڑی کو مقدس قرار دینے کی فکر پیش کی جس پر نجات دہندہ کو سولی پر لٹکایا گیا۔ اس طرح سے بدعات ایک دوسرے کے پیچھے آتی چلی گئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصلی تعلیمات غیر محسوس طریقے سے دفن ہوتی چلی گئیں اور ان کی جگہ پر پہلے سے مانوس اضافے جگہ لیتے چلے گئے۔ (۲۷)

اہداف اور مخفی محرکات سے قطع نظر پولس نے عقیدہ توحید کو منہدم کر دیا اور مسیح کے پیروکار اُن باتوں میں داخل ہو گئے جن سے مسیح علیہ السلام نے خود بچنے کی تلقین کی تھی۔ پولس کی تعلیمات مطلق طور پر شرعی حیثیت کی حامل ہو گئیں کیونکہ اس کے پیروکاروں میں سے ایک نے چوتھی انجیل لکھی جو یوحنا حواری کی طرف منسوب ہے۔ جس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بارے میں جیبون کہتا ہے:

''اُس نے کائنات کا افلاطونی نظریہ مسیحی تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس نے ظاہر کیا کہ یسوع مسیح وہ پہلا وجود ہے جس کے اندر کلمہ یا عقل (Logos) مجسم ہو گیا، اسی بات کو افلاطون نے اِس سے پہلے پیش کیا تھا۔ اور وہ کلمہ شروع سے اللہ کے ساتھ متصل تھا''۔ (۲۸)

انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم اس بات کا ذکر کریں کہ پہلی تین صدیاں جن کو کلیسا الحاد کا دور قرار دیتا ہے، اس میں پولس واتھانسیوس کے پیروکاروں اور منکرین تثلیث کے درمیان سخت کشمکش ہوئی۔ منکرین تثلیث کا سربراہ 'آریوس' تھا۔ تثلیث کے حامیوں کو اس وقت تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی جب تک نیقیہ کی ایک مجلس میں تثلیث کو ایک باقاعدہ قرارداد کے تحت پاس نہیں کرالیا گیا۔ اس مجلس میں تثلیث کے حامیوں کی تعداد تھوڑی تھی۔

برٹن کہتا ہے: ''یہ الحاد بڑھتا چلا گیا اور اس نے عقائد وسلوک کے ایک بڑے حصے کو ناکام کر دیا۔ ہم آخری جھگڑے کو پیش کرتے ہیں جو یسوع اور الٰہ واحد یعنی والد الٰہ کے مابین تعلق کے بارے میں تھا۔ یہ جھگڑا بڑھتا چلا گیا حتی کے قسطنطنیہ کے قریب نیقیہ مقام پر ایک مجلس میں عقیدہ تثلیث کو ۳۲۵ء میں قانونی مسیحیت کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ تثلیث تین کا مجموعہ تھا یعنی باپ اللہ، یسوع بیٹا اور روح القدس۔ اس عقیدے کے مطابق یہ تین الگ اشخاص بھی تھے اور ایک بھی۔ مسیحیت نے تین کو ایک قرار دینے کا تصور قائم رکھا جو ریاضی کے اصولوں سے بالاتر تھا۔ (۲۹)

یہاں پر ایک خاص نکتہ قابل غور ہے: پولس اور کلیسا کی آرا عقل وفطرت کے صریح خلاف ہیں۔ انسانی عقل جتنی بھی کوشش کر لے، وہ تین کو ایک قرار نہیں دے سکتی اور ایک کو تین قرار نہیں دے سکتی۔ جبکہ کلیسا کے لاکھوں پیروکار اپنی ہر نماز میں کہتے ہیں: باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام کے ساتھ جو کہ ایک الٰہ ہے۔

انسانی عقل ہمیشہ کلیسا سے یہ اصرار کرتی رہی کہ وہ اُس کو ایسا تسلی بخش جواب دے جو اس کے اندرونی اضطراب کو ختم کر دے۔ یہ کیسے ممکن ہے: (1=1+1+1)

کلیسا نے ہمیشہ ایک ہی جواب دیا کہ عقل اس کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اور یہی رائے عیسائی راہنما آگسٹین (۴۳۰ء) کی تھی۔ اس نے آریوس کے حملوں کا سامنا کیا جو اس نے کیتھولک تثلیث پر کیے تھے۔ اس نے کہا: ''جو کچھ بھی انجیلوں میں آیا ہے اس میں عقل جھگڑا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اناجیل کی اتھارٹی انسانی عقل سے بالاتر ہے''۔ (۳۰)

اسی طرح عیسائی راہنما تھامس اکوینی (۱۲۷۴ء) نے بھی یہی ثابت کیا کہ وہ حقائق جن پر ایمان لانا مقدم ہے، عقل ان کی دلیل لانے پر قادر نہیں۔ عقل کی یہ طاقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ماہیت (Essence) کو تصور میں لا سکے لیکن عقل تین اقانیم کا ادراک نہیں کر سکتی۔ جس نے اقانیم کے عقیدہ تثلیث پر دلیل لانے کی کوشش کی گویا اُس نے اپنے ایمان کو حقیر سمجھا۔ (۳۱)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی کلیسا کی رائے تھی۔ جب اس نے 'ابیلارڈ' کی تنقیدوں کا بارہویں صدی عیسوی میں سامنا کیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں ابیلارڈ کی رائے عام ہوگئی۔ کلیسا نے اس کی کتابوں کو جلانے کو حکم دے دیا اور خود ابیلارڈ کو کہا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی کتابیں آگ میں ڈالے۔ (۳۲)

کلیسا کی یہی رائے برقرار رہی اور وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔

حتی کے مشرقی کلیساؤں نے بھی اسی رائے کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ باسیلوس پادری کہتا ہے: ''تثلیث کی تعلیم ہماری عقل سے بالاتر ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کو باطل قرار دیں۔''

اس کا دوست **توفیق جید** کہتا ہے: ''تثلیث کو باپ، بیٹے اور روح القدس کا نام دینا ایک ایسا گہرا الٰہی راز ہے جس کو ہم اپنی طرف سے کھول نہیں سکتے، نہ اس کا فلسفہ بیان کر سکتے ہیں اور نہ اس میں زائد افکار ڈال سکتے ہیں''۔ (۳۳)

ان جوابات سے واضح ہوتا ہے کہ کلیسا نے اس مشکل کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ عقل کلیسا سے سوال کرتی رہی کہ تثلیث کا راز کیا ہے؟ تو کلیسا جواب دیتا رہا کہ یہ ایک راز ہے۔ کاش کہ یہ واحد راز ہوتا۔ کہنے والا کہ سکتا ہے کہ تمام ادیان بشمول اسلام غیبی امور سے خالی نہیں جن کا ادراک عقل سے ممکن نہیں۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ عقل سے ماورا ہونا اور عقلاً مستحیل ہونے میں بڑا فرق ہے۔ اسلام میں عقل سے ماورا باتیں تو موجود ہیں جن کا عقل سے ادراک نہیں ہوسکتا لیکن وہ عقلاً ناممکنات میں سے نہیں یا خلاف عقل ہرگز نہیں۔ (۳۴)

جب سے کلیسا نے تثلیث کا عقیدہ اپنایا اُس نے اپنے لیے ایک محاذ کھول لیا۔ جس کی وجہ سے اس کے دشمن پولسی کلیسائی دین کو گرانے کے لیے با آسانی مداخلت کرتے رہے۔ یہ عقیدہ اور اِس جیسے دیگر عقائد اس لادین فکر کے بنیادی موضوعات تھے جن کو ''کتاب مقدس کی تاریخی تنقید'' کے پردے میں سترہویں صدی کے اندر بیان کیا گیا۔ کوئی حرج نہیں کہ ہم اس فکر کے ایک نامور فرانسیسی فلسفی ''رینان'' کا قول نقل کریں جس کی کتابوں کو کلیسا نے ممنوع قرار دیا تھا:

''یسوع مسیح کی حقیقی تعلیمات کو اُسی طرح سے سمجھنا چاہیے جس طرح سے وہ خود سکھاتے تھے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اُن جھوٹی شروحات اور تفاسیر کو پہچانیں جنہوں نے مسیحی تعلیمات کا حلیہ بگاڑ دیا اور وہ تاریکیوں کے گہرے بادلوں میں چھپ گئیں۔ ہماری تحقیق ہمیں **پولس** کے دور تک لے جائے گی جو مسیحی تعلیمات کو سمجھ نہ سکا۔ اُس نے اُن کو نئے معانی پہنا کر فریسیوں کے رسوم رواج اور عہد قدیم کی تعلیمات کے ساتھ بہ کثرت خلط ملط کر دیا۔ پولس کے بارے میں مخفی نہیں کہ وہ مختلف قوموں اور دینی مناظرات کا قاصد تھا۔ وہ خارجی دینی مظاہر جیسے ختنہ وغیرہ کی طرف میلان رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ذاتی میلانات کو مسیحی دین میں داخل کر اُس کو فاسد کر دیا۔ مسیح کی حقیقی تعلیمات مکمل طور پر الٰہیاتی اوصاف سے خالی ہوگئیں۔ یہ تمام شارحین اور مفسرین یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یسوع الٰہ ہے لیکن وہ اس پر کوئی حجت نہیں لا سکتے۔ وہ اپنے دعوے پر چند اقوال پیش کرتے ہیں جو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بائبل کے پانچ ابواب میں وارد ہیں یعنی موسیٰ، زبور، رسولوں کے اعمال، رسولوں کے رسائل وخطوط، کلیسا کے آبا کی تالیفات۔ لیکن یہ سب اقوال اس بات پر ہلکی سی دلالت بھی نہیں کرتے کہ مسیح خود اللہ ہے''۔ (۳۵)

کلیسا جانتا ہے کہ تثلیث اس قدر پیچیدہ مسئلہ ہے کہ وہ اس کو حل کرنے پر نہ پہلے کبھی قادر رہا ہے اور نہ کبھی آئندہ قادر ہو سکے گا۔ کلیسا کی تمام تر تشریحات عقلاً غیر تسلی بخش ہیں تو پھر اس عقیدے پر اتنا اصرار کیوں؟ کیا یہ اندھی تقلید ہے یا لوگوں کی عقلوں اور دلوں پر تسلط کی اندھی خواہش؟

بلا شک وشبہ یہ دونوں باتیں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک بات لازمی طور پر موجود ہے۔ لیکن کلیسا اس دعوے کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے کہ وہ عہد جدید کی روایات اور ان کی شروحات کی چھان بین کر کے اپنا موقف پیش کر رہا ہے۔

ہم دوبارہ غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ کلیسا دعویٰ کی دلیل بذات خود دعویٰ کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ تثلیث کے منکرین تثلیث کا انکار اس لیے کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ کلیسا نے اس عقیدے کو انجیل کی نصوص میں داخل کر دیا ہے یا انجیل کی نصوص سے غلط معنی ومفہوم اخذ کیا ہے۔ چنانچہ کلیسا پر لازم ہے کہ وہ اناجیل کی صحت کو ثابت کرے اور اُن سے درست استدلال کو ثابت کرے۔ اور یہ دونوں باتیں اس کے لیے ممکن نہیں۔

منکرین تثلیث کلیسا پر یہ حجت قائم کرتے ہیں کہ اُس نے تثلیث پر دلالت کرنے والی عبارات کو انجیل کے متن میں زبردستی داخل کر دیا ہے۔ منکرین کی یہ حجت ممکن نظر آتی ہے۔ اس کی ایک مثال نیچے پیش کی جاتی ہے:

یوحنا کے پہلے خط کے فصل پنجم میں ہمیں یہ عبارت ملتی ہیں: ''بے شک وہ جو آسمانوں میں گواہی دیتے ہیں: وہ تین ہیں یعنی باپ، کلمہ اور روح القدس اور یہ تینوں درحقیقت ایک ہی ہیں۔ اور وہ جو زمین میں گواہی دیتے ہیں: وہ بھی تین ہیں یعنی روح، پانی اور خون۔ اور یہ تینوں بھی ایک ہیں۔ عیسائی علما میں سے محققین جیسے کریساخ، شولز، آدم کلارک اور حتی کہ متعصب علما جیسے ہارن، یہ سب اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ اصل عبارت اس طرح سے ہے: ''بے شک وہ گواہ جو گواہی دیتے ہیں وہ تین ہیں یعنی روح، پانی اور خون۔'' لیکن تثلیث کے ماننے والوں نے اس کے اندر ایک عبارت کا اضافہ کر دیا جو یہ ہے: ''وہ آسمان میں تین ہیں۔۔۔ الخ'' حتی کہ یہ ملحق عبارت کلیسا کی طرف سے تثلیث کی ایک دلیل بن گئی۔ اس تناظر میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کلیسائی مصلح مارٹن لوتھر نے جب عہد جدید کا جرمن ترجمہ کیا تو اُس نے اِس عبارت کا ترجمہ نہیں کیا۔ (۳۶)

رہی یہ بات کہ کلیسا نے تثلیث کا عقیدہ کتاب مقدس کی نصوص سے غلط استدلال کی بنیاد پر سمجھا اور انجیل کی بعض عبارتوں کی غلط تاویل کی جیسے ''اب'' سے مراد باپ اور ''ابن اللہ'' سے مراد اللہ کا بیٹا وغیرہ۔ ان جیسے الفاظ سے استدلال بھی سابقہ استدلال کی طرح مضبوط نہیں۔ جرین برنٹن نے اسی بات پر تنبیہ کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

''جو شخص عہد جدید کے مصادر کی طبعی تفسیر حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یسوع نے اپنی ذات کے لیے کبھی بھی الوہیت کا دعویٰ نہیں کیا اور اس قسم کے الفاظ (یعنی باپ اور اللہ تعالیٰ کا بیٹا) یہ سب الفاظ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحریف کے ساتھ روایت کیے گئے ہیں یا ان کو مجازی طور پر استعمال کیا گیا ہے یا یہ دونوں باتیں ممکن ہیں''۔(۳۷)

ہمارے لیے اس رائے کی تائید کرنا اس لیے آسان ہے کہ اناجیل اور رسائل میں باپ اور بیٹے کا لفظ مسیح کے علاوہ تمام لوگوں کے لیے بھی بولا گیا ہے اور یہ صرف مسیح کے ساتھ خاص نہیں۔ اس کی مثالیں بائبل میں کئی جگہ پر موجود ہیں، مثلاً

① ہر وہ شخص جو ایمان لاتا ہے کہ یسوع یعنی مسیح اللہ تعالیٰ کی اولاد ہے۔ اور جو والد سے محبت کرتا ہے وہ بیٹے سے بھی لازمی محبت کرتا ہے۔ اس طرح ہم پہچانتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی تمام اولاد سے محبت کرتے ہیں۔(۳۸)

② **انجیل متی** میں ہے۔ مسیح علیہ السلام کہتے ہیں: ''امن والوں کے لیے خوشخبری ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں''۔(۳۹)

اور اس میں یہ بھی ہے کہ مسیح اپنے شاگردوں کو یہ کہتے ہیں: ''تم اس طرح سے دعا مانگو: اے ہمارے باپ جو آسمانوں میں ہے، تیرا نام پاکیزہ ہے۔(۴۰)

③ **انجیل لوقا** میں مسیح فرماتے ہیں: ''جو شخص لوگوں کے سامنے میرا اعتراف کرتا ہے تو یہ انسان کا بیٹا اللہ تعالیٰ کے فرشتوں کے سامنے اس کا اعتراف کرے گا''۔(۴۱)

اور **متی** میں مسیح علیہ السلام سے منقول ہے: ''بے شک انسان کا بیٹا اپنے باپ کی بزرگی کے ساتھ اس کے فرشتوں کی ہمراہی میں آئے گا''۔

اس طرح ہم عہد جدید میں بہت ساری نصوص دیکھتے ہیں جو تمام لوگوں اور مسیح وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے بیٹوں کے نام سے موصوف کرتی ہیں۔ یہ قطعی طور پر مجازی معنی ہے۔ اور مسیح اپنا وصف خود بیان کرتے ہیں کہ وہ انسان کے بیٹے ہیں۔ اِن دونوں کے درمیان تعارض کو اس طرح سے دور کیا جا سکتا ہے کہ مجاز کو حقیقت کی طرف لوٹایا جائے کیونکہ وہی اصل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ مسیح علیہ السلام کے لیے کوئی خصوصی امتیاز نہیں رہتا سوائے اس کے کہ وہ رسول تھے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت نے ان کو بغیر باپ کے فقط ماں سے پیدا کیا۔

لیکن کلیسا اس کھلی حقیقت میں جھگڑا کرتا ہے اور اناجیل سے دلیل پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، خاص طور پر انجیل یوحنا سے۔ اس بنا پر ایک محقق اس مسئلے میں اور دیگر مسائل میں بذات خود اناجیل کی حقیقت و حجیت کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔(۴۲)

ب۔ اناجیل کی تحریف:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام پر صرف ایک ہی انجیل نازل کی جو موسیٰ علیہ السلام کی تورات کی تکمیل کرنے والی تھی۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جب مسیح علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو پکارا اور کہا: ''زمانہ مکمل ہو چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بادشاہت قریب آ چکی ہے لہٰذا توبہ کرو اور انجیل پر ایمان لے آؤ۔(۴۳)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھوں نے اس انجیل سے مراد فقط نازل شدہ انجیل ہی لی تھی کوئی دوسری نہیں۔

اور قرآن وہ واحد کتاب ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے بذات خود لیا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُون (الحجر:۹)

''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

لیکن سابقہ الہامی کتابوں کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اُس دین کے علما کے سپرد کی تھی۔

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ﴾

(المائدہ:۴۴)

''ہم نے تورات نازل فرمائی ہے جس میں ہدایت ونور ہے، یہودیوں میں اسی تورات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے انبیا (علیہم السلام) اور اہل اللہ اور علما فیصلے کرتے تھے کیونکہ انھیں اللہ کی اس کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا''۔

اس اعتبار سے کلیسا کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس انجیل کی آسمانی نصوص کے مطابق اور الٰہیاتی رنگ کے مطابق حفاظت کرتا۔ کوئی باطل اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہ کرسکتا اور نہ ہی کوئی محرف اس میں تحریف کی جرات کرتا۔ لیکن کلیسا نے اپنی عادت کے مطابق اس فریضے میں کوتاہی کی بلکہ تحریف کرنے والے مفاد پرستوں نے اپنے لیے کھلا راستہ پایا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ پر بغیر علم کے باتیں گھڑ دیں۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے لکھاری، جو اکثر الٰہیات کے بلند پایہ ماہر ہیں، اُن کی اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں: ''سیدنا مسیح علیہ السلام کے اپنے اعمال میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی اور نہ ہی کوئی ایک لکھا ہوا کلمہ''۔ (۴۴)

انسائیکلوپیڈیا نے وہ بات کی ہے جو ایک ماہر باریک بین محقق کو کرنی چاہیے۔

ہم مسلمان ایمان لاتے ہیں کہ انجیلوں کے مختلف گوشوں میں مسیح علیہ السلام کے اقوال اور تعلیمات کی کچھ نہ کچھ باتیں موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی الٰہی ہوسکتی ہیں لیکن ہمارے نزدیک وہ مسیح علیہ السلام تک کسی قابل اعتماد تاریخی سند سے نہیں پہنچتی۔ ہم اُن پر ایمان اِس لیے لاتے ہیں کیونکہ اگر ہم اُن کو محفوظ وحی الٰہی یعنی قرآن و سنت پر پیش کریں تو ہمیں اُن کے مابین بہت واضح تعلق محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ شخص جو قرآن پر ایمان نہیں لاتا اور مجرد تحقیق سے ثابت شدہ حقائق کے علاوہ کوئی چیز تسلیم نہیں کرتا، اس کے لیے کوئی عجیب بات نہیں کہ وہ اناجیل کا سرے سے انکار کردے اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی رائے کا حامل بن جائے۔

ہم معاصر مفکرین کی رائے کو چھوڑ دیتے ہیں اور پہلی صدی عیسوی کی طرف لوٹتے ہیں جب اصل انجیل کے وجود کا امکان زیادہ طاقتور اور راجح تھا، دیکھیں ہمیں وہاں کیا ملتا ہے؟

آدم کلارک، جو اناجیل کی شارحین میں سے ایک ہے، کہتا ہے: ''یہ بات پکی ہے کہ جھوٹی اناجیل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسیحیت کی اولین صدیوں میں بھی بہ کثرت رائج تھیں۔ ان غیر صحیح احوال نے لوقا کو مجبور کیا کہ وہ انجیل کو تحریر کریں۔ ان جھوٹی اناجیل میں سے ۷۰ سے زائد کا تذکرہ ملتا ہے اور ان میں سے بہت سارے اجزا ابھی تک باقی ہیں۔ فابری سیوس نے ان تمام جھوٹی اناجیل کو جمع کیا اور تین جلدوں میں چھاپ دیا۔ (۴۵)

اس طرح نازل کردہ ایک انجیل کی تعداد ۷۰ تک جا پہنچی حالانکہ مسیحیت اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ ان باتوں سے مجبور ہو کر لوقا نے انجیل لکھنے کا قصد کیا۔ آپ کا کیا خیال ہے ان انجیلوں میں سے حقیقی انجیل کون سی ہوگی جس کی وحی مسیح علیہ السلام کی طرف کی گئی، اور ہم اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ایک ہی انجیل نازل کی۔

لوقا نے بذات خود ہمارے لیے اس حقیقت کو واضح کیا جو تمام انجیل کو منہدم کرتی ہے اور جس میں اس کی اپنی انجیل بھی شامل ہے۔ لوقا کی انجیل کا مقدمہ ملاحظہ کریں جو اپنی زبان سے یہ کہہ رہا ہے۔

لوقا مقدمے میں کہتا ہے: ''چونکہ بہت سارے لوگوں نے ہمارے یقینی اُمور میں قصے اور کہانیوں کی تالیف کا کام شروع کر دیا، اور یہ وہ لوگ تھے جو شروع سے کلمہ مسیح کے چشم دید ساتھی اور خدام تھے تو میں نے بھی یہی مناسب خیال کیا کہ میں بھی شروع سے تمام باتوں کا انتہائی دقت کے ساتھ جائزہ لوں اور آپ کو مسلسل لکھ کر بھیجتا رہوں، اے محترم تاؤفیلس! تاکہ آپ اس کے ساتھ پہلے سے معلوم کلام کی صحت کو پہچان سکیں''۔ (۴۶)

اس سے پتا چلا کہ نہ تو ستر (۷۰) جھوٹی انجیلیں وحی الٰہی ہیں اور نہ ہی لوقا کی سچی انجیل وحی الٰہی ہے اور نہ ان میں سے کوئی ایک مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب ہے۔ یہ سب واقعات اور قصے ہیں جن کو مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں نے آپ کی زندگی اور دعوت کے متعلق اُسی طرح سے لکھا جیسے انھوں نے اپنے اُن اسلاف سے سنا تھا جو مسیح سے مل چکے تھے اور اُن کی خدمت کرتے رہے تھے۔ اگر ہم فرانسیسی فلسفی **گوستاف لوبون** کی عبارت کو مستعار لیں تو ہم ان انجیلوں کے بارے میں یہ کہہ سکتے ہیں:

''یہ سب غیر ثابت شدہ یادوں اور اوہام کا مجموعہ ہیں جن کو ان کے مولفین کے تخیلات نے پھیلا دیا۔'' (۴۷)

اگر ہم موضوع کے اعتبار سے نہ کہ ثبوت کے اعتبار سے اناجیل کے مشابہ اسلامی کتابیں دیکھیں تو وہ سیرت کی کتابیں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے ہم کسی بھی حالت میں سیرت ابن ہشام وغیرہ کو وحی الٰہی قرار دیں؟ یہ عقلاً اور شرعاً محال ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ سیرت ابن ہشام کی نسبت اس کی مولف کی طرف یقینی ہے، صاحب سیرت حضرت محمد ﷺ تک متصل السند ہے، وہ اصل عربی زبان میں محفوظ ہے اور ترجمہ در ترجمہ سے پاک ہے، جبکہ اناجیل کی یہ صورت حال نہیں۔ سیرت ابن ہشام کو کسی قانونی یا مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کے تحت جمع نہیں کیا گیا بلکہ اس کو تحقیق اور تدقیق کے تحت تالیف کیا گیا۔ مسلمانوں میں سے کتنے ہی بڑے علما ہیں جو عبادت اور تقوے کے بلند مراتب کو پہنچے لیکن مسلمان محققین اُن کی روایات کو قابل اعتماد شمار نہیں کرتے تھے کیونکہ اُن کے اندر علمی تحقیق کی شرائط مکمل نہ تھیں۔ لیکن کلیسا کا کوئی بھی راہب جو کسی عبادت خانے میں الگ تھلگ رہنے لگ جائے یا کوئی عابد مسیح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی محبت کا مظاہرہ کرے اور کہے کہ وہ روح القدس سے بھرا ہوا ہے اور اسے رسول یا مقدس راہنما کا لقب عطا کیا گیا ہے، تو اس کی کلام کو ایسے الہامی وحی شمار کیا جاتا ہے جیسے اُس میں باطل کی آمیزش کا کوئی خطرہ نہیں۔

اسی لیے یہ بات عجیب محسوس نہیں ہوتی کہ کلیسا کے نزدیک رسولوں کی تعداد ایک سو بیس تھی۔ (۴۸)

اور ان کی کلام کو تمام تر علتوں کے باوجود مسلّم مسائل سمجھا گیا اور اُن کے رسائل کو ایسے مقدس قرار دیا گیا جیسے وہ اناجیل مقدس ہوں۔

یہ مسیحیت کی ابتدائی تین صدیوں کا خلاصہ ہے: ستر انجیلیں جو ایک دوسرے کو جھوٹ قرار دیتی ہیں اور ایک سو بیس (۱۲۰) رسول جن میں سے بعض نے انجیلوں کو تالیف کیا، بعض نے رسائل لکھے اور بعض اپنے حافظے اور معلومات سے وعظ و نصیحت کرتے تھے۔ فرقوں اور گروہوں کی ایک بڑی تعداد انتہائی اہمیت کے حامل اساسی مسائل میں اختلاف کرتی تھی اور ۳۲۵ء کا سال تاریخ کے اندر ایک انتہائی اہم موڑ کی نشاندہی کرتا ہے۔ اِس سال نیقیہ کی کونسل منعقد ہوئی جس نے عالمی ادیان کی تاریخ میں ایک نئے باب کی ابتدا کی۔ یہ مجلس اس لائق ہے کہ اس کے بارے میں کچھ گفتگو کر لی جائے۔

کوئی بھی مجلس یا کونسل منعقد کی جائے تو اُس میں چند شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے، خاص طور پر جب کہ وہ دینی ہو۔ ان شرطوں میں سے اہم ترین شرطیں یہ ہیں۔

① بحث و مناظرے کی آزادی۔ چاہے وہ کارکردگی کی تناظر میں ہو یا قراردادوں کو مقرر کرنے کے ضمن میں ہو۔ کوئی ایسی بیرونی جابرانہ طاقت نہیں ہونی چاہیے جو مجلس کی ارکان کو کسی مخصوص موضوع یا قرارداد پر پابند کرے۔

② مقصد کی پاکیزگی اور باہمی افہام و تفہیم۔ یعنی تمام ارکان کے لیے بلا تعصب اور بلا اصرار حق کی تلاش مشترکہ ہدف ہو۔

③ جو مفید اور منطقی قراردادیں منظور کی جائیں، اُن کے بارے میں اقرار کیا جائے کہ وہ خطا و صواب کا احتمال رکھ سکتیں ہیں اور اُن پر مناقشہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ یہ اقرار بھی ضروری ہے وگرنہ فکری استبداد کی تہمت لازم آئے گی۔

نہایت افسوس کی بات ہے کہ اس ''مقدس'' مجلس میں یہ تمام شرائط کلی طور پر مفقود تھیں:

① اس کے انعقاد کا ذاتی سبب بذات خود عیسائی پادریوں کی طرف سے نہیں تھا بلکہ رومی ایمپائر قسطنطین نے اس مجلس کی انعقاد کی دعوت دی۔ وہ بت پرست انسان تھا اور وہ اس وقت تک بت پرست رہا جب تک اسے بستر مرگ پر بپتسمہ نہیں دیا گیا۔ (۴۹)

② مجلس میں دو ہزار اڑتالیس بطریق اور اساقفہ شریک ہوئے جو مختلف متخاصم فرقوں اور گروہوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان میں بڑے بڑے فرقے دو تھے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① موحدین۔ یہ آریوس کے پیروکار تھے اور ان کی تعداد سات سو (۷۰۰) ارکان پر مشتمل تھی۔

① تثلیث پرست: یہ پولس کے پیروکار تھے، اِن کی تعداد تین سو اٹھارہ (۳۱۸) ارکان پر مشتمل تھی۔

یہ بات بھی معلوم ہے کہ قسطنطین کی بت پرستی بھی تثلیث کی حامل تھی۔ یہ چیز بذات خود تثلیث پرستوں کے لیے تقویت کا باعث تھی۔ جب تین سو اٹھارہ (۳۱۸) اسقف کسی مجلس خاص میں موجود ہوں اور ان کے درمیان میں بادشاہ بیٹھے اور اپنی انگوٹھی وتلوار ان کے سپرد کر کے کہے کہ ''میں آج تمھیں اپنی مملکت پر تسلط عطا کرتا ہوں'' اس سے صورت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

③ قسطنطین اور تثلیث کے داعیوں کے لیے فقط قراردادیں ہی پاس نہیں ہوئیں بلکہ ان قراردادوں کے مخالفین کو ملعون ومحروم بھی قرار دیا گیا۔ اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مسیحیت کے اندر محروم قرار دینا ایک بہت بڑی سزا ہے۔ (۵۰)

مجلس کے قراردادوں میں سے ایک اہم ترین قرارداد انجیلوں کی حیثیت سے متعلق تھی اور وہ یہ ہے کہ صحیح اور قابل اعتماد انجیلیں فقط چار ہیں جو متی، لوقا، مرقص اور یوحنا سے منسوب ہیں۔ اور اِن کے علاوہ جو بھی ہیں وہ ردی اور من گھڑت ہیں۔ اُن کو پڑھنا حرام ہے، اُن کو جلانا اور ختم کرنا واجب ہے۔ بلاشک وشبہ یہ قرارداد دین اور تاریخ کے حق میں ظلم وجور پر مبنی تھی۔ کوئی بھی انسان اس مجلس یا قرارداد کو تسلی بخش نہیں کہہ سکتا ہے کہ اس سے وہ اصل نسخہ ضائع ہو گیا جو اصل نازل شدہ انجیل تھی۔ پھر ان چاروں انجیلوں کے درمیان شکل وصورت اور موضوعات کا تضاد بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وحی نہیں بلکہ مسیح علیہ السلام کی سچی سیرت بھی نہیں۔

ستر تالیفات میں سے چار تالیفات کو چننا اور اس کے جواز پر کوئی سبب ظاہر نہ کرنا تحکم اور زبردستی ہے۔ یہ رعونت اور تکلف ہے جو تاریخ کے ہر دور میں کلیسا کا خاصہ رہا ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات بھی عجیب معلوم نہیں ہوتی کہ کلیسا کے باغی فرزندوں نے ان انجیلوں کے ساتھ انتہا پسندی اور غلو کا سلوک کیا۔ کاش کہ معاملہ یہاں تک محدود رہتا۔ لیکن کلیسا بذات خود ان چار انجیلوں کا محافظ بھی نہ بن سکا اور ان کو مزید تحریف سے نہ بچا سکا حالانکہ اُس نے اِن کو اپنے پیروکاروں پر لازم کر دیا تھا۔ شہنشاہوں کے لیے بھی اس تحریف میں خاصی مداخلت تھی۔ لیکن اُن پر اس لیے ملامت نہیں کی جا سکتی کیونکہ انھوں نے اس معاملے میں کلیسا کی پیروی کی۔

انجیل کے مفسرین میں سے ایک مفسر لاندر کہتا ہے: ''مقدس اناجیل کے بارے میں اُن کے مجہول مصنفین کی وجہ سے یہ حکم لگایا گیا کہ یہ درست نہیں۔ چنانچہ بادشاہ اناسطیوس کے زمانے میں قسطنطنیہ کے اندر ایک تنازعہ پیدا ہوا جس کی وجہ سے اناجیل کی دوبارہ تصحیح کی گئی''۔ (۵۱)

یہ قول انتہائی اہمیت کا حامل اعتراف ہے جو تین تاریخی حقائق کو ثابت کرتا ہے:

① انجیل کے مولفین مجہول ہیں اور وہ چوتھی صدی عیسوی تک مجہول رہے۔

② تصحیح کے نام پر اناجیل میں تحریف کی گئی جن میں حکمرانوں کی خواہشات اور میلانات کا عمل دخل ہوتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ انا جیل میں ترمیم اور تبدیلی کا ارتکاب کیا گیا اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھا گیا، اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ روز مرہ کی کارروائی تھی۔ شیخ رحمت اللہ ہندی نے انا جیل کے اندر زیادتی والی تحریفات پر پچاس گواہیاں پیش کی ہیں جو سب کی سب دستاویز اور اعترافات پر مبنی ہیں، ہم ان میں سے فقط ایک پیش کرتے ہیں:

آیت نمبر ۵۳ از باب ۷ اور آیت نمبر ۱۱ از باب ۸ انجیل یوحنا سے الحاقی یعنی اضافہ شدہ ہے۔ ہارن ان آیات کی الحاقیت کے بارے میں کہتا ہے: ارازمس، کالون، پیزا، کروتیس، ۔۔۔ اور دیگر مصنفین جن کا اس نے ذکر کیا ہے، اور نفینس، کوجز ان آیات کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اس نے کہا ہے: ''کرایز ستم، تھیوفلکت، نونسی نے اس انجیل پر شروح لکھی ہیں، انھوں نے ان آیات کی شرح نہیں لکھی بلکہ انھوں نے ان آیات کو اپنی شروح میں نقل بھی نہیں کیا۔ طرطولین اور سائی برن نے باب زنا وعفت کو لکھا ہے اور انھوں نے ان آیات سے دلیل نہیں پکڑی۔ اگر یہ آیات ان کے نسخوں میں موجود ہوتیں تو وہ ان کو ضرور ذکر کرتے یا وہ ان کو دلیل بناتے۔

وارڈ کا تلک نے کہا ہے: ''بعض قدما انجیل یوحنا کے باب نمبر آٹھ کے پہلے حصے پر اعتراض کرتے ہیں اور نورتن نے ان آیات کے الحاقی ہونے پر یقینی طور پر حکم لگایا ہے۔ (۵۲)

یہ بارہ حصے ہیں جن کے الحاقی ہونے اور دیگر مقامات کے الحاقی ہونے پر تقریباً اجماع ہے۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہمارے پاس کلام الٰہی اور کلام بشر کے درمیان فرق کرنے والی کوئی چیز نہیں، کوئی ایسا ضابطہ نہیں جس سے کلام مسیح علیہ السلام کو دیگر کی کلام سے الگ کیا جا سکے۔ لہٰذا انا جیل کے ہر حصے پر اس درجے کا شک وارد ہوتا ہے کہ انجیل کے بڑے بڑے متعصب حامی بھی تحقیق پسندوں کی تسلی نہیں کرا سکتے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

یورپ میں عیسائی شریعت کی تحریف کیسے ہوئی؟

دین کا ریاست سے الگ ہونا:

اس موضوع کو شروع کرنے سے پہلے بطور تمہید دو باتوں کا جاننا ضروری ہے۔

① روم کی نظر میں دین کی کیا حیثیت تھی اور اس بارے میں روم کا مزاج کیا تھا۔

② انجیلی شریعت کی حالت کیا تھی اور جب تک روم نے انجیلی شریعت کو باقاعدہ رسمی طور پر قبول نہیں کیا تھا تو اس کی عملی تطبیق کیا تھی۔

① روم کی نظر میں دین کی حیثیت۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی معاشرہ یعنی سفید فام استعماری نسل کے لیے کوئی ایک دین نہیں تھا جس کی عبادت کی جاتی ہو اور نہ کوئی ایک فلسفہ تھا جس پر ایمان لایا جاتا ہو۔ بلکہ پورا روم انواع واقسام کی تاریک جاہلیتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

حاکم طبقہ بت پرستی کی عیدوں میں عوام کے ساتھ شریک ہوتا تھا اور وہ ڈھیروں قسم کے معبود مجسموں کی خدمت کرتا تھا لیکن وہ عملی زندگی میں مملکت کی حفاظت اور اقتدار پر تسلط کے لیے کسی دین کا پابند نہیں تھا۔ بلکہ رومی شہنشاہ بذات خود معبود ہوتے تھے اور عوام ان کی پوجا کرتی تھی۔

رہا پڑھا لکھا طبقہ تو اس کی مختلف اقسام تھیں۔ بعض وہ تھے جو غالی رواقی مکتبہ فکر کے پیروکار تھے اور تجرید و تصوف میں گھسے ہوئے تھے، بعض ابیقوری مکتبہ فکر کے مرید اور حیوانیت اور حسی لذات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اسی طرح بعض دیگر مکاتب فکر اپنے تصورات اور افکار میں یونانی وثنیت (Paganism) اور فلسفوں سے متاثر تھے۔

رہا عوام کا طبقہ تو وہ طبعی طور پر دین کی طرف مائل تھا لیکن معبودوں کی باہمی شدید مخاصمت اور فلسفیوں کی باہمی کشمکش نے دینی اور فلسفیانہ اعتقادات پر اُس کا اعتماد ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ عوام کا طبقہ خواہشاتِ نفس، جسمانی لذات اور حسی لطف اندوزی کا طالب تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خلاصہ کلام یہ ہے کہ روم نے کوئی ایسا عمدہ دین قبول نہیں کیا ہوا تھا کہ جس سے وہ اپنے تصورات، عقائد اور نظام زندگی کو حاصل کرتا۔ ہاں اُن کے معبود تھے لیکن وہ روایتی معبود نہیں تھے۔ وہ یونانی خرافات کی لاغر اور بے کار نقالی تھی۔ معاشرے میں ایسے افراد موجود تھے جن کے وجود کو خاموشی سے برداشت کیا جاتا تاکہ معاشرے کا عرف قائم رہے لیکن اُن کو حقیقی عملی زندگی کے اندر دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ (۵۳)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ رومی معاشرہ ایک مادہ پرست معاشرہ تھا جو دینی نہیں تھا اور وہ اپنے اعتقادات، چاہے وہ جو بھی ہوں، اور اپنے عملی زندگی کے درمیان شدید دوری رکھتا تھا۔

سیسرو (م ۴۳ ق م) روم کی نظامِ زندگی اور دین کے مابین گہرے فرق کو اس طرح سے بیان کرتا ہے: ''فن کار اپنے فن کے دوران چند اشعار گاتے جن کا معنی ہے: معبودوں کا دنیا کے اُمور میں کوئی دخل نہیں جس کو لوگ مکمل توجہ اور رغبت کے ساتھ تسلیم کریں''۔ (۵۴)

راہب آگسٹین کہتا ہے: ''بت پرست روم اپنی عبادت گاہوں میں اپنے معبودوں کی عبادت کرتے تھے اور تھیٹروں کے اندر ان کا مذاق اڑاتے تھے''۔ (۵۵)

معاملہ فقط یہاں تک محدود نہیں تھا بلکہ ابیقور (۴ ق م) اعلانیہ صراحت کے ساتھ قوم کے اعیان کے سامنے سیکولرزم کی دعوت دیتا تھا: ''یقیناً معبودان انسانوں کے معاملات میں خود کو مشغول نہیں کرتے۔ وہ موجود ہیں کیونکہ وہ وقتاً فوقتاً اشخاص کے لیے ظاہر ہوتے رہتے ہیں لیکن وہ ارضی معاملات کو توجہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ اور کوئی ایسی علامت نہیں جو دلالت کرے کہ وہ گناہ گار کی سزا اور نیکوکار کے ثواب سے دلچسپی رکھتے ہیں؟ کیا ان کی مداخلت کا عقیدہ رکھنا ممکن ہے جب کہ ہم اس دنیا میں کئی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً جو پیٹرا اپنے عبادت خانے پر بجلیاں برساتا ہے۔ کیا ابیقور اس وجہ سے ہلاک ہوسکا کہ وہ اِن معبودان کی توہین کرتا ہے؟ بے شک یہ معبود ہمارے جہان سے بہت دور رہتے ہیں۔ یہ ہمارے معاملات کی بجائے اپنے معاملات پر توجہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے جہان میں عقل مندی اور مزے کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں اور ہمیں بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہم اُن کے طریقے پر چلیں اور ان کو ایک بلند قدر نمونہ مانیں۔ ہم پر یہ واجب نہیں کہ ہم اُن کی خواہش کے مطابق اپنے آپ کو مصروف کر دیں کیونکہ وہ ہم سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کرتے اور نہ ہی ہمارے پرواہ کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان کے ساتھ ویسا سلوک کرنا چاہیے جیسے وہ ہمارے ساتھ کرتے ہیں''۔ (۵۶)

ابیقور کے اس تصورِ معبودان میں روم کی غالب اکثریت شامل تھی اور اِس کا طبعی نتیجہ یہ تھا کہ معبود کے غلط تصور سے دین اور خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کا غلط تصور پیدا ہوا۔ روم کے نزدیک زندگی کی حقیقت کا تصور کشمکش پر مبنی تھا چنانچہ وہ اپنے معبودان کو بھی آسمانوں میں باہمی لڑائی میں مصروف خیال کرتے تھے جیسے ان کے ہیرو مسابقت کے میدان میں ایک دوسرے کو ہرانے میں مصروف نظر آتے تھے۔ ہیرو کی یہ شان نہیں کہ وہ جمہور عوام کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کرے بلکہ اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ میدان مسابقت میں کامیاب ثابت ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روم کے معبودان طبعی طور پر رومیوں کے لیے کوئی ضابطے مقرر نہیں کرتے تھے چنانچہ ضروری ہوا کہ معبود مانے گئے انسان ریاست کے لیے معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی نظام حیات مقرر کریں۔ چنانچہ ان لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں رومی قانون وجود میں آیا جو یورپ کے اندر اپنے ابتدائی دور سے آج تک موجود ہے۔ باقی رہا اخلاقی نظام اور عام آداب کے قوانین، اگر وہ موجود بھی ہیں، تو وہ محض ابیقوری ہیں۔

یہ روم کا دین تھا، خالص وجدانی اور روحانی جس کا عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ انسان پر کوئی خاص اخلاقی پابندیاں بھی عائد نہیں کرتا تھا اور نہ ہی زندگی کے معاملات کو منظم کرتا تھا۔ حتی کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رومی امپریلزم موجودہ امریکہ کا قدیم نسخہ ہے۔

رومی فرد آج کل کے امریکی کی طرح تھا جو ایک بیماری سے نکل کر دوسری بیماری میں داخل ہوتا ہے اور ایک اصول سے بھاگ کر اس کے نقیض میں جا پہنچتا ہے لیکن اس کی عملی واقعاتی زندگی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ دین اُس کی نظر میں محض ایک نظریہ اور ایک روحانی عقیدہ ہوتا ہے۔

② سن ۳۲۵ عیسوی میں انجیلی شریعت کی حیثیت۔

انجیل اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ پہلی کتاب نہیں اور نہ ہی یہ آخری حتمی کتاب ہے۔ یہ آسمانی کتابوں کے مجموعے میں سے ایک ہے جو مسیح علیہ السلام سے صدیوں پہلے اترنا شروع ہوئیں اور اُن کا اختتام آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی آخری کتاب پر ہوا۔

آسمانی کتاب کی ذمہ داری اور اس کے نزول کا مقصد اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مکمل وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ﴾

(البقرہ:۲/۲۱۳)

''دراصل لوگ ایک ہی گروہ تھے، اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو خوش خبریاں دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ سچی کتابیں نازل فرمائیں، تاکہ لوگوں کے ہر اختلافی امر کا فیصلہ ہو جائے''۔

چنانچہ آسمانی کتاب کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ ہر اختلاف میں اُس کے ساتھ فیصلہ کیا جائے اور زندگی کے ہر گوشے میں اُس کو لاگو کیا جائے اور قوانین سازی اور نظامِ اقدار اس سے اخذ کیا جائے۔ تمام آسمانی کتابیں مذکورہ آیت کے مطابق ایک ہی کتاب ہیں کیونکہ ان کا نازل کرنے والا اور ان کا موضوع ایک ہے۔ وہ سب ایک ہی حقیقت کو مضبوط کرتی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید، اُس اکیلے کی عبادت اور عبادت کا وسیع و ہمہ گیر تصور۔ اسی طرح سے تورات تھی:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَكَتَبْنَا لَهُ فِي الْأَلْوَاحِ مِن كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَتَفْصِيلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾

(الاعراف ۱۴۵)

''اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ دی''۔

یہ اپنے دور کے مطابق ایک مکمل شریعت تھی جس پر ایسی حکومتیں قائم ہوئیں جو اپنے دور کی ریاستی خصوصیات کی مالک تھیں۔ ان ریاستوں کے بعض بادشاہ جیسے داؤد اور سلیمان علیہما السلام انبیا تھے جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کرتے اور ساری زندگی کو اُس کی شریعت اور حکم کے مطابق قائم کرتے۔ اسی طرح تورات منہج و شریعت کی صورت میں موجود رہی جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔

﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ﴾ (المائدہ:۴۴)

''اسی تورات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے انبیا (علیہم السلام) اور اہل اللہ اور علما فیصلے کرتے تھے''۔

کسی مومن کے لیے جائز نہیں تھا کہ وہ اپنے تصورات، افکار، سلوک اور ضابطے تورات کے علاوہ کسی اور جگہ سے حاصل کرتا۔

باقی رہا بنی اسرائیل کی زندگی میں تورات کی مخالفت، تو وہ ایسا انحراف ہے جس کو نہ اللہ تعالیٰ برقرار رکھتے ہیں اور نہ اُس کی شریعت قبول کرتی ہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف رسول بن کر تشریف لائے، اور وہ اُن کے آخری رسول تھے، تاکہ اُن کی خرابیوں کی اصلاح کریں اور یہود کے عقائد و اخلاق میں پیدا ہونے والے بگاڑ کو درست کریں۔ وہ اُن کو اُن کی اصل کی طرف لوٹا دیں۔ یعنی اللہ کی توحید، اُس اکیلے کی عبادت، اس کی شریعت کی حاکمیت، اُس کے منہج کی اتباع۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام خاص بنی اسرائیل کی طرف مبعوث تھے۔ وہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے ناسخ نہیں تھے بلکہ اُس کی تکمیل کرنے والے تھے۔ انجیل پچھلی کتاب کی تصدیق کرنے والی تھی لیکن اس پر نگران نہیں تھی۔ (۵۷)

انجیل کی شریعت میں نئی بات یہ تھی کہ وہ بعض ایسے ضابطوں میں تخفیف لے کر آئی جو مستقل قانون کی حیثیت سے نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ وہ یہود کے لیے ایک وقتی سزا کے طور پر جاری ہوئے تھے۔ اُن سزاؤں میں ان یہودیوں کے لیے بڑی بلیغ نصیحت تھی جن کے دل سخت ہو چکے تھے اور روحیں خشک تھیں۔ وہ مادہ پرستی میں غرق، دنیا کی زندگی پر بڑے حریص تھے۔

چنانچہ تورات کے اندر انجیل کی ترمیمات بطور شریعت لاگو کرنا واجب تھا۔ اسی طرح انجیل ایک عقیدہ کی حامل کتاب تھی جس سے زندگی کا سارا منہج پھوٹتا تھا۔

﴿وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِم بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقاً لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۔ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الإِنجِيلِ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فِيهِ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴾

(المائدہ؛۴۶۔۴۷)

''اور ہم نے ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا جو اپنے سے پہلے کی کتاب یعنی تورات کی تصدیق کرنے والے تھے اور ہم نے انھیں انجیل عطا فرمائی جس میں نور اور ہدایت تھی اور وہ اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتی تھی اور وہ سراسر ہدایت و نصیحت تھی پارسا لوگوں کے لیے۔ اور انجیل والوں کو بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ انجیل میں نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق حکم کریں اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ سے ہی حکم نہ کریں وہ (بدکار) فاسق ہیں''۔

لیکن حادثہ یہ ہوا کہ شریعت کو عمومی سطح پر لاگو نہ کیا جا سکا۔ جس کے دو بڑے اسباب تھے۔

اوّل: اِس شریعت کے لیے کوئی ایسی ریاست قائم نہ ہو سکی جو اس کو قبول کرتی اور زمین میں اس کو نافذ کرتی۔ کیونکہ یہ بات یقینی طور پر معلوم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ابھی دعوت کے ہی مرحلے میں تھے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اٹھا لیے گئے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا دعوت کا مرحلہ ویسے ہی تھا جیسے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہجرت سے پہلے دعوت کا مرحلہ تھا۔

دوم: مسیح علیہ السلام ایک ایسی قوم کی طرف بھیجے گئے جن کے دل سخت اور جگر پتھر کے تھے اور اُس پر مستزاد یہ کہ اُن کا علاقہ ظالم بت پرست امپریلزم کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ نیا دین اور اس کا رسول چاروں طرف سے مکمل دشمنی میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں مومنین پر خوف ناک اذیت کا ایسا دور گزرا جس نے ان کو اتنی مہلت نہ دی کہ وہ شریعت کو ریاستی سطح پر لاگو کر سکتے۔ چنانچہ وہ اُس کو محدود انفرادی سطح پر جاری کرتے رہے۔

سب سے پہلے جن لوگوں نے مسیح علیہ السلام کی دعوت و شریعت کے مقابلے میں رکاوٹیں ڈالیں وہ انبیا کے قاتل یہودی تھے۔ اناجیل اور رسائل اُن مصائب کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو مسیح علیہ السلام اور اُن کے پیروکاروں کو یہودی گروہوں کی طرف سے پیش آئے۔ انھوں نے اپنی دشمنی کو اس طرح سے ظاہر کیا کہ رومی حاکم کو مسیح علیہ السلام کے قتل و سُولی پر ابھارا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی طرف اٹھا کر یہود اور رومی حاکم سے نجات دی۔

مسیح علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے پیروکاروں پر یہود اور رومیوں کی طرف سے آزمائش مزید سخت ہو گئی۔

یہود کے بارے میں رسالہ ''اعمال الرسل'' بیان کرتا ہے کہ وہ مسیحیوں کو قتل اور رجم کرتے اور حکمرانوں کو اُن کے خلاف ابھارتے تھے۔ سب سے زیادہ ظلم کرنے والوں میں سے شاؤل یہودی تھا جس کے متعلق مذکورہ رسالہ یہ کہتا ہے: ''شاؤل کلیسا پر حملے کرتا تھا، گھروں میں داخل ہو کر عورتوں مردوں کو گھسیٹتا تھا اور اُن کو جیل کے سپرد کرتا تھا''۔(۵۸)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقیدہ وشریعت کے اعتبار سے مسیحیت پر نازل ہونے والی سب سے بڑی آزمائش ،اُن کی داخلی کمزوری تھی جو شاؤل کے ہاتھوں لاحق ہوئی۔اُس نے بظاہر مسیحیت قبول کی اور اُس کے مناقض تعلیمات کو پروان چڑھایا جن میں سے بعض کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔وہ حقیقی مسیحیوں کے درمیان دشمنی پیدا کرتا اور مسیحی عقائد میں بے راہ روی اور انتشار برپا کرتا تھا۔اس طرح مسیحیوں پر آزمائش کئی گنا سخت ہوگئی اور وہ بیک وقت اپنے دین اور نفس دونوں کے ہاتھوں آزمائش سے دوچار ہوئے۔

یہود اور **شاؤل** کے علاوہ رومی شہنشاہوں نے بھی مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں پر سخت اذیتوں کے پہاڑ توڑے۔اُن میں سے مشہور (**نیرون** ۶۴ م) ،(**تراجان** ۱۰۶ م) ،(ریسولیس ۲۵۱ م) ،(دقیانوس ۱۸۰ م) ہیں۔اُن کے مظالم اس درجے تک پہنچ گئے کہ بعض شہنشاہ مسیحیوں کو جانوروں کے چمڑوں میں لپیٹ کر کتوں کے سامنے پھینک دیتے اور وہ ان کو نوچتے رہتے۔یا اُن کو تارکول سے لیپے ہوئے لباس پہنائے جاتے اور ان پر آگ جلائی جاتی تاکہ یہ انسانی چراغ جلیں اور وہ اپنے رقص گاہوں میں روشنی حاصل کریں۔(۵۹) یہ انسان کے بس میں ہے کہ وہ اُن حالات کا ادراک کرے جن سے شریعت عیسوی گزری اور تین صدیوں تک اُس کے پیروکاروں کو مظالم کا سامنا کرنا پڑا حتی کہ وہ اپنے اعتقادات وافکار چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔اِس صورت حال میں یہ کیسے ممکن تھا کہ حقیقی اعتقادات پر مبنی ایک ریاست قائم ہوتی جو اُن کا دفاع کرتی ،اُن کی تعلیمات کو نافذ کرتی اور دُنیا کے سامنے ثابت کرتی کہ یہ کامل شریعت ہے۔

جب یہ دو حقیقتیں واضح ہوں تو ہم دین وسیاست کی اُس علیحدگی کو سمجھ سکتے ہیں جس کا تجربہ رومی امپریلزم کو کرنا پڑا اور کلیسا کو ۳۲۵ء میں اُس کا سامنا ہوا۔

کلیسا اس وقت خوشی سے پھولا نہیں سماتا جب اس کے لیے سن ۳۲۵ء کا ذکر کیا جاتا ہے۔اس کی نظر میں یہ مسیح کے دشمنوں پر مکمل کامیابی کا سال تھا جس کے بعد ذلت ومصائب کا خاتمہ ہوا اور آزادی وقیادت کا دور شروع ہوا۔

کلیسا نے وہ کامیابی حاصل کی جس کا تصور بھی اُس کے اولین آباواجداد نہیں کر سکتے تھے۔حضرت مسیح علیہ السلام اور اُن کے شاگرد رومی گورنر کے جبر کے تحت زندگی گزارتے رہے۔وہ وسیع اور عریض شہنشائیت کو اِس نظر سے دیکھتے رہے جیسے انھیں اس کی کوئی امید نہ ہو۔لیکن چوتھی صدی میں کلیسا نے بذات خود شہنشاہ پر کامیابی حاصل کر لی۔اُس کو مقدس پانی کے ساتھ مذہبی غسل دیا گیا اور دین مسیح میں داخل کیا گیا۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو کلیسا اور اس کے پیروکاروں کے وہم وگمان سے باہر تھی۔لیکن کلیسا مسیح علیہ السلام کا یہ سچا فرمان بھول گیا: ''انسان کو کیا فائدہ جب ساری دنیا نفع کمائے اور وہ اپنے لیے گھاٹے کا سودا کرے۔''(۶۰)

کلیسا نے قسطنطین اور اُس کی شہنشاہیت کے مقابلے میں کیا فائدہ اٹھایا؟ حقیقت یہ ہے کہ کلیسا کا دین اور اُس کی تعلیمات گھاٹے میں رہیں۔

اگر کلیسا سچا خدا پرست ہوتا تو وہ دورِ ابتلا کے فوراً بعد سب سے پہلے اپنی ذات تلاش کرنے کی کوشش

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتا۔ وہ اصلی انجیل کو ڈھونڈتا، اُس کی نشر واشاعت کرتا اور اُس کو زندگی کے مختلف شعبوں پر لاگو کرتا۔ یہ اُس کے لیے ممکن تھا کہ وہ عقلی طور پر شہنشاہ کو بھی مطمئن کرتا۔ پھر شہنشاہ اُس کو قبول کر کے یا تو حقیقی نصرانی بن جاتا یا کلیسا کی دوستی و ہمدردی سے باز آجاتا۔ کلیسا کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شہنشاہ کے زیر سایہ فقط اپنے حقیقی پیروکاروں پر شریعت کی تطبیق کا تجربہ کرتا۔ یہ سب کچھ اُس فرضی صورت میں ہے جب کلیسا کامیاب ہوتا اور شہنشاہ بھی اُس سے راضی ہو جاتا۔ لیکن جو کچھ واقع ہوا وہ اِس کے الٹ تھا۔ کلیسا رضائے الٰہی، طلبِ آخرت اور لوگوں کی ہدایت میں سنجیدہ نہیں تھا اور نہ ہی قسطنطین مخلص مومن تھا جو اپنی گردن سے بت پرستی کا پٹا اتار کر اپنے دین کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کرنا چاہتا ہو اور اُس کے سامنے ایک عاجز و بے بس عابد کی طرح کھڑا ہونا چاہتا ہو۔

جس چیز نے کلیسا اور شہنشاہ کو اکٹھا کیا، وہ دونوں کا ذاتی دُنیوی مصلحت کا تعلق تھا۔ جس میں غالب حصہ شہنشاہ کی مصلحت کو نصیب ہوا۔

ڈراپر کہتا ہے: ''یہ شہنشا دنیا کا پجاری تھا۔ اُس کے لیے دینی عقائد کوئی خاص اہم نہ تھے۔ اس نے اپنی ذاتی اور عوامی مصلحت اِسی چیز میں دیکھی کہ دو متنافس گروہوں یعنی نصرانیوں اور بت پرستوں کو باہم جوڑ کر اکٹھا کر لیا جائے۔ اس چیز کی خطرناکی کو راسخ العقیدہ نصاریٰ نے بھی محسوس نہ کیا۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ نیا دین قدیم بت پرست عقائد سے ملاپ کرنے کے بعد چمک اٹھے گا اور بعد میں نصرانی دین بت پرستی کی میل کچیل سے پاک ہو جائے گا''۔ (۶۱)

اِس حقیقت کا ادراک انگریز مؤرخ ویلز نے بھی کیا ہے۔ اُس نے رومی شہنشاہیت کو وضاحت سے بیان کیا اور قسطنطین کے قبول مسیحیت اور اُس کو قانونی دین قرار دینے کو اس نظر سے دیکھا ہے کہ یہ قسطنطین کی طرف سے اپنی شہنشاہیت کو بچانے کی ایک کوشش تھی جو مسلسل کمزوری اور شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی۔ (۶۲) اور یہی بات اس سے پہلے جیبون نے کہی ہے۔ (۶۳)

یہ شہنشاہ کی صورت حال تھی، اس کے مقابلے میں جب رُوم کے باسیوں نے مسیحیت کو قبول کیا تو اُن کے سابقہ دینی تصورات اور طرز زندگی سرے سے تبدیل نہ ہوا۔ اُن کے نزدیک تبدیلی صرف یہ ہوئی کہ جوپیٹر، مارس اور کارنیوس کی جگہ باپ، بیٹا اور روح القدس کے لفظ بولے جانے لگے، وہ پولس کے معبودان اور کلیسا سے کوئی قانون سازی یا راہنمائی کی امید نہیں کرتے تھے۔ اُن کی امیدیں فقط وہی تھیں جو وہ اپنے سابقہ جامد خداؤں سے کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک کلیسا کے باپ خدا کی حیثیت جوپیٹر سے زیادہ نہیں تھی جس کو ایتھور نے تراشا تھا۔

اِس طرح کلیسا اپنے فاسد تصورات کے باعث رومی فرد کی گہرائیوں میں پیوست بت پرستی کی جڑوں کو اکھاڑ نہ سکا۔ کلیسا اپنے نفس کو اتنا بلند نہ کر سکا کہ وہ جسمانی لذات سے بلند ہو کر نیکی و طہارت کے عالم کو پہنچ سکے۔ البتہ ایک معمولی تعداد ضرور تھی جو راہب بن کر نیکی اور طہارت کی فضیلت کو پہنچی۔ ایک مغربی مفکر و مؤرخ اِس کو اِس طرح سے بیان کرتا ہے: ''اکثر لوگوں کے نزدیک مسیحیت ایک باریک پردہ تھی جس کے نیچے خالص بت پرستانہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریہ حیات چھپا ہوا تھا''۔(۶۴)

کلیسا اپنی نفسانی طہارت سے عاجز آیا تو اُس کا طبعی نتیجہ یہ نکلا کہ وہ زندگی کو اُس کے مکمل نظام، اقدار اور اخلاق سمیت دین کی بنیاد پر قائم کرنے سے عاجز آ گیا۔ اب دین ایک شخصی خواہش بن گئی جس کا اثر محدود تھا۔ اس کے سوا کوئی چیز نہ بدلی کہ کچھ مخصوص عبادات قدیم عبادت خانوں کے بجائے کلیساؤں میں بجالائی جانے لگیں۔ معاملہ فقط یہاں تک محدود نہ رہا بلکہ کلیسا اثر انداز ہونے کے مقام سے گر کر اثر پذیر ہونے کے مقام تک آ پہنچا۔ چنانچہ اُس کی بنیادی تعلیمات کے اندر بت پرستانہ طور طریقے، افسانے اور خرافات داخل ہو گئیں اور وہ انجیلی روایات اور مقدس مجالس کی آرا میں گھل مل گئیں۔ اسی طرح انجیلی شریعت اور رومی قانون کے درمیان بھی ملاپ ہوا اور مسیحیت ایک مرکب دین بن گیا۔ اس کی تفصیل لوبون نے وضاحت سے بیان کی ہے۔(۶۵)

اس طرح کلیسا گمراہی اور خرابی کا شکار ہو گیا۔ لیکانٹ ڈی نائے کلیسا کا دفاع کرتے ہوئے اِس صورت حال کی ایسی توجیہ بیان کرتا ہے جو کہ درست نہیں۔ وہ کہتا ہے: ''کیتھولک دین جو کہ بحیرہ روم کے درمیانی ساحلوں پر پیدا ہوا، نے لوگوں کی بعض ایسی عادات کو قبول کر لیا جن کو وہ زائل کرنے پر قادر نہیں تھا۔ کلیسا مجبور ہو کر سودا بازی پر اتر آیا اور اِس طرح قدیم خرافات کی موجیں اس پر چڑھ آئیں''۔(۶۶)

لیکن حق یہ ہے کہ سچا مومن اپنے دین کے بارے میں سودا بازی قبول نہیں کرتا چاہے حالات جس قدر سخت ہو جائیں۔

اسی طرح فشر نے کلیسا کے دفاع میں جو توجیہ پیش کی ہے، وہ بھی درست محسوس نہیں ہوتی۔ فشر کہتا ہے: ''مسیحی کلیسا کی حکمت عملی یہ تھی کہ اس کے اوّلین آبا نے اُن عادات و عقائد کو قبول کر لیا جن کو رد کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے تھے جیسے کلیسا نے بحیرہ روم کی قوموں میں راسخ متعدد معبودان کے عقیدے کی پیروی قبول کر لی۔''(۶۷)

کلیسا کا جرم ہلکا ہو سکتا تھا اگر وہ اپنے اِس عمل کو فقط ایک وقتی استثنائی صورت قرار دیتا پھر وہ شریعت کو زندگی کے تمام شعبوں میں نافذ کرتا۔ لیکن عملاً اس کے الٹ ہوا کلیسا بیرونی عقائد کو ایک اُصول اور منہج کے طور پر قبول کر کے واضح گمراہی میں داخل ہو گیا۔

سب سے پہلا شخص جس نے شریعت کی پسپائی کی سنت جاری کی اور بیرونی عقائد کو قبول کیا، وہ شاؤل (پولس) تھا۔ برنٹن کہتا ہے: ''وہ قومیں جنہوں نے مسیحی زندگی کے اسلوب کو پرکشش محسوس کیا، اُن کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ یہود کا قانون یعنی تورات کی شریعت تھی۔ پھر برنٹن اس کی تشریح کرتا ہے کہ پولس نے اس رکاوٹ کو کیسے دور کیا۔ اس نے فتویٰ دیا کہ یونانی، مصری اور رومی لوگوں میں سے جو لوگ مسیحیت کو قبول کر چکے ہیں، وہ ختنے اور قانون کی لفظی پابندی سے آزاد ہیں''۔(۶۸)

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ انحراف ایک مستقل منہج قرار پایا۔ کلیسا نے نیقیہ کی مجلس میں اس کو منظور کر لیا اور عقیدے و شریعت میں مستقل علیحدگی واقع کر دی۔ دین اور ریاست کا دائرہ الگ الگ ہو گیا اور انسانی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی دو مختلف دائروں میں تقسیم ہوگئی۔

اوّل: دینی دائرہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص تھا اور جس کا مرکز ومحور پادریوں کا نظام، رہبانیت، دینی وعظ ونصیحت اور ہلکی پھلکی قانون سازی تھی جو شخصی احوال سے تجاوز نہیں کرتی تھی۔

دوم: دنیوی دائرہ جو قیصر اور اُس کے قانون کے لیے تھا، جو سیاسی، اقتصادی، اجتماعی، ریاستی نظم وضبط اور عام نظام زندگی پر مشتمل تھا۔

یہ ناروا تقسیم تھی لیکن کلیسا نے اس میں کوئی شرم یا عار محسوس نہ کی، اُس نے قیصر کو بادشاہی میں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا دیا بلکہ شریک سے بھی زیادہ بڑا درجہ دیا۔ اس نے انسانی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے اور دوسرا حصہ قیصر کے لیے، چنانچہ جو حصہ اللہ تعالیٰ کا تھا وہ قیصر تک پہنچ جاتا تھا لیکن جو حصہ قیصر کا تھا وہ اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتا تھا۔

بعض مورخین اِس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ کلیسا کا دُنیوی زندگی کے متعلق تصور محدود تھا۔ ''عصور وسطیٰ میں تاریخ یورپ'' کا مصنف کہتا ہے:

''ابتدائی مسیحی لوگوں نے رومی معاشرے کی اصلاح کا ارادہ نہیں کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسیحیت کا قدیم رسوم ورواج کی بہت بڑی تعداد کو حرام قرار دینا معروف ہے۔ اُن کے پاس ریاست اور اصولِ حکمرانی کا کوئی ضابطہ وطریقہ بھی نہیں تھا۔ اسی طرح ان کے پاس معاشرے کی تجدید کا کوئی مخصوص لائحہ عمل اور تنظیم بھی نہیں تھی۔ کوئی شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اقتدار اور اثر ورسوخ سے محروم چھوٹی چھوٹی جماعتیں، رومی سیاست اور رومی معاشرے میں کسی قسم کی کوئی بہتری پیدا کر سکتی ہیں۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ دنیا دھوکے اور شر کا ساز وسامان ہے، انسان ہمیشہ کے لیے جنت سے نکالا گیا ہے اور اس پر ہمیشہ کا عذاب لازم ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دھوکے باز دنیا اِسی طرح جاری رہے گی حتی کہ دُنیا ختم ہو جائے گی۔ مسیح علیہ السلام دنیا میں واپس آئیں گے اور وہی دنیا کو عدل و انصاف سے بھریں گے اور دنیا سے ظلم و جور اور خباثت کا خاتمہ ہوگا۔ جب یہ ساری باتیں کسی مسیحی کے دل میں ہوں تو کون سی چیز اُس کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنی غلامی کو دور کرنے کے لیے جدوجہد کرے یا سودی حرام تجارت کو ختم کرنے کی کوشش کرے یا اُس ظالمانہ قوت کو ختم کرنے کی کوشش کرے جس کی بنیاد پر رومی ریاست ترقی کر رہی تھی۔ مسیحی یورپ میں یہ تصور عام رائج تھا کہ آدم کی غلطی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا لکھا ہوا عذاب انسانیت کے لیے لازم ہے۔ ان حالات میں عام مسیحی ظلم کے نظام کو بدلنے کے لیے کیسے کوشش کر سکتا تھا جبکہ اِس خوف ناک نظام کو بدلنا ان کی ہمت اور استطاعت میں بھی نہیں تھا''۔ (۶۹)

یہ تعلیل وتوجیہ درست ہے لیکن یہ حقیقت کی کامل تصویر نہیں کیونکہ کلیسا اپنے حق میں اناجیل سے منقول کچھ دلائل بھی پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بطور مثال چند دلائل کا مناقشہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔ ان میں سے دو دلائل سب سے زیادہ اہم ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① مسیح علیہ السلام سے منسوب یہ قول: ''قیصر کو قیصر کا حق دو اور اللہ کو اللہ کا حق دو''

یہ قول کلیسا کی دلیلوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ صریح ہے۔ بلکہ جب بھی یورپ پر شریعت کی خلاف ورزی اور خواہش نفس کا غلبہ ہوا تو اس نے یہی نعرہ لگایا ہے۔ اسی نعرے کے سبب مسیحی دین سکڑتا گیا حتی کہ صدیاں گزرنے کے بعد اب اُس کی صورت حال یہ ہے کہ لوگ ہفتے میں چند لمحات کے لیے گرجا گھر میں جاتے ہیں جو ہر قسم کے جذبات سے خالی ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ علمی انصاف کے ترازو میں اِس دلیل کی کیا قدر و قیمت ہے۔

یہ بات گزر چکی ہے کہ مسیح علیہ السلام سے مروی جتنے اقوال ہیں، اُن کی نسبت مسیح علیہ السلام کی طرف یقینی نہیں بلکہ ظن غالب کے مرتبے پر بھی نہیں۔ کلیسا نے آپ کے اقوال و تعلیمات میں تحریف و تبدیل کا عمل کیا، اُن میں اضافے کیے، حتی کہ اُن کو مٹا ڈالا اور ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا۔ چنانچہ مذکورہ قول کے بارے میں ابتدائی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہ بات نہیں کہی، یہ کلیسا کے اِضافات میں سے ہے۔ اگر کلیسا اِس قول کو اناجیل سے ثابت کرتا ہے تو تحقیق عملاً یہ ثابت کر چکی ہے کہ تمام اناجیل ظنی الثبوت اور ظنی الدلالت ہیں۔ اِن حالات میں کلیسا کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنے اہم مسئلے میں ظنیات سے حجت پکڑے؟

چلیں ہم اس نص کی تاریخی علمی حیثیت بھلا دیتے ہیں اور عبارت کے الفاظ اور مدلول کے اعتبار سے گہری موضوعی نظر ڈالتے ہیں۔ کیا ہمیں اس عبارت سے وہ کچھ حاصل ہوتا ہے جو کلیسا حاصل کرنا چاہتا ہے؟

یہ عبارت بظاہر شرک کا صریح حکم ہے یعنی قیصر کو قیصر کا حق دو اور اللہ تعالیٰ کو اللہ تعالیٰ کا حق دو۔ یہ عبارت قیصر کو اپنے توجہات اور اعمال میں اللہ تعالیٰ کا شریک بنا رہی ہے۔ جو شخص اس عبارت کو اس کے ظاہر پر محمول کرتا ہے وہ یقینی طور پر اتباع اور اطاعت کے شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے، جو شرک اعظم ہے اور توحید اُلوہیت کے منافی ہے۔ یہ دلالت خود اِس بات کی نفی کرتی ہے کہ یہ کلمہ مسیح علیہ السلام سے صادر ہوا۔ کیونکہ تمام انبیا علیہم السلام پوری دنیا کو شرک سے بچانے کے لیے بھیجے گئے، چاہے وہ چھوٹے درجے کا ہو یا بڑے درجے کا۔ چنانچہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اولوالعزم نبی شرک کی دعوت دے؟

حقیقت میں اتنی بات اس عبارت کی حجیت کو ساقط کرنے کے لیے کافی ہے، لیکن ہم کلیسا کو مہلت دیتے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام نے یہ بات کہی ہے۔ کیا یہ لازم آتا ہے کہ اس کے ظاہر سے فقط وہی بات سمجھی جا سکے جو کلیسا نے سمجھی ہے؟ کیا ہم اس عبارت سے کلیسا کا سب سے بڑا عملی اُصول اخذ کر سکتے ہیں؟ اگر اس قول کو حقیقت پر محمول کرنا ہے تو ہمیں اس عبارت کا سیاق و سباق سمجھنا چاہیے جو اس کے فہم پر مدد دیتا ہے:

متی اپنی انجیل میں کہتا ہے: ''فریسی چلے گئے اور مشورہ کرنے لگے کہ مسیح کو اِس کلمے کی بدولت شکار کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے مسیح کی طرف اپنے شاگردوں کو ہیروڈوس کے کارندوں کے ساتھ بھیجا اور یہ کہا: ''اے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استاد آپ سچے ہیں، اللہ تعالیٰ کا برحق راستہ سکھاتے ہیں اور کسی کی پروا نہیں کرتے۔ آپ لوگوں کے چہروں کی طرف نہیں دیکھتے۔ آپ کا کیا خیال ہے، قیصر کو جزیہ دینا جائز ہے یا نہیں۔ یسوع علیہ السلام کو اُن کی خباثت کا علم ہو گیا۔ انھوں نے کہا: اے ریاکارو! تم مجھ پر تجربہ کیوں کرتے ہو۔ تم مجھے جزیے کا معاملہ بتاؤ۔ انھوں نے آپ کو دینار پیش کیا تو مسیح علیہ السلام نے اُن کو کہا: اِس پر کس کی تصویر اور لکھائی ہے؟ انھوں نے کہا: قیصر کی۔ تو آپ نے ان کو کہا: قیصر کو وہی دو جو قیصر کا ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہی دو جو اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جب انھوں نے یہ بات سنی تو انھیں بڑا تعجب ہوا اور وہ آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔''

مسیح علیہ السلام اور اُن کے پیروکار اقلیت میں تھے اور اُن پر ظلم ڈھایا جا رہا تھا۔ انھوں نے ایک نئی دعوت کی بنیاد رکھی تھی۔ اُن کی طاقت میں نہیں تھا کہ وہ سرکش امپریلزم سے ٹکراتے اور اُس کے ساتھ کھلی کھلی دشمنی اختیار کرتے۔ یہ کھلی دشمنی ان سے مطلوب ہی نہ تھی، کیونکہ وہ دعوت کے مرحلے میں تھے جیسے اِسلام جہاد کے فرض ہونے سے پہلے دعوت کے مرحلے میں تھا۔ یہ مرحلہ تقاضا کرتا تھا کہ كُفُّوا اَيْدِيَكُمْ (ہاتھ روک کر رکھنے) کے اصول کو لازم پکڑا جائے تاکہ طاقت ور دشمن بھڑک نہ سکے اور دعوت کو اس کے ابتدائی مرحلے میں چیر پھاڑ نہ سکے۔

اس دعوتی منہج کو فریسیوں نے بغور دیکھا جو مسیح علیہ السلام کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی طرف سے ایک سازش تیار کی تاکہ مسیح (علیہ السلام) اور اس کی دعوت کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ مسیح (علیہ السلام) کی دعوت اپنے منہج سے نکل کر غلط راستے پر جا نکلے۔ اس طریقے سے وہ مسیح (علیہ السلام) کو رومی حاکم سے سزا بھی دلوانا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی طرف سے یہ خبیث سوال پیش آیا۔

حقیقت یہ تھی کہ مسیح علیہ السلام اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والی معمولی مقدار اِس قدرت کی حامل نہ تھی اور نہ ہی اُن کا منہج تھا کہ وہ رومی عامل کو جزیہ کی ادائیگی سے انکار کریں۔ رومی عامل یہ جزیہ ریاست کی تمام رعایا سے وصول کر کے قیصر طاغوت کے حوالے کرتا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ مسیح علیہ السلام اس ظالمانہ صورت حال سے مطمئن تھے اور یہ اعتراف کرتے تھے کہ قیصر اللہ کے مساوی حق رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت میں شریک ہے، جیسا کہ بعد میں کلیسا نے سمجھا۔

اگر یہ عبارت واقعتاً مسیح علیہ السلام سے منقول ہے تو یہ ایک وقتی تقاضے کے مطابق تھی کیونکہ اُس دور کے مخصوص مرحلے کی دعوت اور صورت حال ایسی تھی۔

چونکہ انبیا کی دعوت اپنے جوہر میں ایک جیسی ہوتی ہے لہٰذا اسلام کے اندر بھی جہاد کی اولین فرضیت محض ایک اجازت تھی نہ کہ ایک حکم جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ﴾

(حج: ۳۹/۲۲)

''جن (مسلمانوں) سے (کافر) جنگ کر رہے ہیں انھیں بھی مقابلے کی اجازت دی جاتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں۔ بے شک ان کی مدد پر اللہ قادر ہے''۔

یہ اس وجہ سے تھا کہ مکے میں اسلام قبول کرنے والی قلیل تعداد قریش کے اُن جابر مشرکوں سے انتقام لینا چاہتی تھی جنھوں نے اُن پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے۔ مکہ کے یہ مسلمان مشرکین کے خلاف کوئی خفیہ تدبیر کرنا چاہتے تھے اور ان کے مال اور آرام سے کچھ مقدار چھیننا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے نبی ﷺ سے اجازت مانگی تو اللہ تعالیٰ نے کفِّ ید (ہاتھ اٹھانے سے پرہیز) کا حکم دیا۔ اِس لیے نبی ﷺ نے اُن کو جواب دیا اِنِّی لَمْ اُوْمَرْ بِھٰذا یعنی مجھے اِس کا حکم نہیں دیا گیا۔

یہ اس وجہ سے تھا تا کہ دعوت اپنے مقرر منہج پر جاری رہ سکے اور دشمن کے تحرکات اُس کا بھڑکا کر جڑ سے ختم نہ کر سکیں۔

اگر مسیح علیہ السلام اپنی دعوت میں قوت کے اُس مرحلے تک پہنچ جاتے جہاں تک اسلامی دعوت پہنچی تھی اور اُسے جہاد کی اجازت ملی تو وہ بھی اپنی قوم کو لازمی اجازت دیتے اور قیصر کو جزیہ دینے سے انکار کر دیتے۔ وہ روم کے خلاف جہاد کا حکم دیتے اور اُن کے ساتھ دشمنی کو اعلانیہ ظاہر کرتے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر اِس عبارت کو مان بھی لیا جائے تو یہ ایک جزوی وقتی دلالت ہے جو ایک فروعی مسئلے میں ہے۔ اِس سے ایک عام ابدی قاعدہ نکالنا جائز نہیں جس سے اللہ تعالیٰ کی شریعت کا اہمال لازم آتا ہو، دین عملی زندگی میں قائم ہونے سے دُور ہوتا ہو اور طاغوت کے احکام کا اقرار ہوتا ہو۔

② مسیح علیہ السلام سے منسوب دوسرا قول: ''میری مملکت، یہ جہان نہیں''

اس بات سے قطع نظر کہ اس عبارت کی نسبت مسیح علیہ السلام کی طرف صحیح ہے یا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کلیسا نے اس کا کیا خاص مفہوم اخذ کیا۔ اُس نے اِس قول کو اپنے عقیدہ کا اصول و منہج بنایا جس سے وہ بشری فطرت اور درست ایمانی ترقی کو دباتا رہا۔

کلیسا نے مسیح علیہ السلام کے قول ''میری مملکت یہ دنیا نہیں''، بالفرض تسلیم کر لیں کہ یہ مسیح علیہ السلام کا قول ہے، سے یہ سمجھا ہے کہ دنیا اور آخرت دو متخاصم ضدین ہیں جن کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ دنیا شیطان کی مملکت ہے جو شرور و آثام کا گڑھ ہے۔ انسان کی وہ محنت جو وہ دنیا میں اپنے حالات بہتر کرنے اور کائنات کے خزانوں سے متمتع ہونے کے لیے کرتا ہے، گندا عمل ہے۔ اِن کی طرف شیطان مائل ہوتا ہے تا کہ انسان کو مسیح علیہ السلام کی ہمیشہ والی مملکت (آخرت) سے دور کر سکے۔ فقیری اور سخت کوشی کی زندگی، کلیسا کے مفہوم کے مطابق، اُخروی ملکوت کی ضامن ہے۔ اناجیل مسیح علیہ السلام کی طرف یہ قول بھی منسوب کرتی ہیں: ''اونٹ کا سوئی کے سوراخ سے گزرنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت یہ کہ کوئی مال دار اللہ کی بادشاہت (جنت) میں داخل ہو سکے'' (۷۰)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان عبارات کے تقاضوں کے مطابق انسان اللہ سے دنیا کی متاع اور نقد بھلائیوں کا سوال نہیں کر سکتا بلکہ وہ اُسی پر اکتفا کرے جو مسیح علیہ السلام نے بمطابق روایاتِ اناجیل طلب کیا یعنی (خُبزُنا کِفافاً) ہماری روٹی ضرورت بھر ہوگی۔(۷۱)

اس مفہوم کے مطابق انسان وراثتی خطا کا حامل ہوکر پیدا ہوتا ہے اور وہ دنیا میں ایسے داخل ہوتا ہے جیسا مجرم جیل میں۔ اور جیسے اُس کے باپ نے درخت سے کھایا تھا تو اسے جنت سے نکال دیا گیا اور اُسے محرومی و گندگی کی سزا دی گئی۔ اسی طرح جب وہ دنیا کی طیبات اور لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے تو وہ ملکوت کی نعمتوں سے محرومی کی سزا دیا جائے گا۔

جب دنیا اور انسان کے بارے میں یہ تصور ہو تو طبعی طور پر فاسد فرد کی اصلاح کیسے ہوسکتی ہے؟ جس کی اصل ٹیڑھی پیدا کی گئی ہو، اُس کو درست کرنے کا کیا فائدہ؟ جابر لوگ لوگوں پر مسلط رہیں، وہ اُن کو غلام بنا کر رکھیں اور کائنات میں من مانی کر کے فساد پھیلائیں، ان کا محاسبہ مسیح علیہ السلام جزا و سزا کے دن لے لیں گے۔ لوگ مال جمع کریں اور دنیا کی زندگی سے لطف اندوز ہوں، وہ شادیاں کریں اور دنیا کے اعلیٰ مناصب حاصل کریں، یہ سب کچھ ان کو ملکوت میں داخلے اور ملاءِ اعلیٰ میں کامیابی حاصل کرنے سے محروم کر دے گا۔

لیکن جو کامل ایمان والا مسیحی ہے، اُس کو اِن اُمور سے کیا دلچسپی؟ اُس کی ساری فکر اِس قضیے سے دور بھاگنے میں ہے، وہ اپنے وجود کو اس زمین میں جو شیطان کی مملکت ہے ایک مستقل مسئلہ سمجھتا ہے۔

کلیسا نے اِس عبارت اور اس جیسی دیگر عبارتوں سے دنیا کی زندگی کا تنگ اور سلبی مفہوم اخذ کیا اور نتیجۃً دین کی ذمہ داری کا مفہوم بھی تنگ ہوگیا۔ وہ مایوس ہوگیا کہ دنیا کبھی عدلِ الٰہی اور حق پر قائم ہوسکتی ہے۔ چنانچہ کلیسا نے کامل و ہمہ گیر منہج ربانی میں تحریف کی حالانکہ وہ اُس منحرف جاہلی صورتِ حال کو بدلنے کے لیے نازل ہوا تھا جس میں لوگ بمشکل زندگی گزار رہے تھے۔ انھوں نے ایک نیا واقعہ قائم کرنا تھا جس میں نازل کردہ شریعت حکومت کرتی لیکن انھوں نے دنیا کا محدود بدھ متی تصور لیا جو محض آخرت کے خوابوں اور امیدوں سے لبریز تھا۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ ریاست کے اُمور کی تنظیم، سیاسی و اقتصادی نظاموں کی اصلاح اور معاشرتی ضوابط کی بہتری دین میں کسی حیثیت کی حامل نہیں کیونکہ مسیح کی مملکت اِس جہان سے تعلق نہیں رکھتی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ کلیسا سیاسی اقتدار اور معاشرتی اثر و رسوخ کا کبھی کوئی موقع حاصل نہ کر سکا۔ اُس کو ایسے مواقع ملے جو سرکش ترین قیاصرہ کو بھی میسر نہ آئے ہوں (۷۲)۔ لیکن یہ موقع دینی وڈیروں کے شخصی مفاد کے تنگ دائرے تک محدود رہا۔ پوپ کی پہلی درجے میں یہ کوشش ہوتی کہ وہ بادشاہوں کو تاج پہنائے اور ان سے ٹیکس اور افرادی لشکر حاصل کرے۔ وہ اس میں کسی قسم کے تساہل کی اجازت نہ دیتا تھا۔ رہی شریعت کی حاکمیت تو وہ ان کا معاملہ نہ تھا، کیونکہ وہ قیصر کا اختصاص تھا اور ان کے لیے یہ اُصول تھا کہ مسیح کی مملکت یہ جہان نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت سابقہ عبارت کی طرح کلیسا کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اگر یہ عبارت واقعتاً

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مسیح علیہ السلام سے ثابت ہے تو اِس کا صحیح معنی و مفہوم وہ ہے جس کی وضاحت سیاق سے ہوتی ہے۔ انجیل یوحنا کے مطابق اِس کا سیاق اس طرح ہے: ''پیلاطس دارولایت میں داخل ہوا۔ اُس نے یسوع (علیہ السلام) کو بلایا اور اُس کو کہا: تو یہود کا بادشاہ ہے؟ یسوع علیہ السلام نے اِس کو جواب دیا: کیا تو یہ بات اپنی طرف سے کر رہا ہے یا دوسروں نے تجھے یہ کہا ہے؟ پیلاطس نے جواب دیا: کیا میں یہودی ہوں؟ تیری امت اور کاہنوں کے رؤسا نے تجھے میرے سپرد کیا ہے۔ میں کیا کروں؟ یسوع نے جواب دیا: میری مملکت یہ جہان نہیں۔ اگر میری مملکت اس جہان سے ہوتی تو میرے خدام اس بات کی کوشش کرتے کہ میں یہود کے سپرد نہ کیا جاؤں۔ لیکن اب میری مملکت یہاں نہیں''۔ (۷۳)

قضیہ اس طرح سے ہے کہ یہود نے ایک سازش کی۔ انھوں نے دیکھا کہ (پیلاطس) کے دل میں مسیح علیہ السلام کے خلاف ایک تہمت کو داخل کیا جاسکتا ہے۔ یہود نے کہا: مسیح دعویٰ کرتا ہے کہ وہ یہود کا بادشاہ اور سیاسی لیڈر ہے جو اپنی امت کو رومی استعمار اور قیصر کی ماتحتی سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ یہ تہمت کافی تھی کہ مسیح علیہ السلام اور اُن کی دعوت کو سخت ترین سزاؤں سے دوچار کرے۔

یہود نے رومی حاکم اور اس کی سلطنت کے تحفظ کے لیے کام کیا۔ انھوں نے مسیح علیہ السلام کو اس تہمت کے ساتھ اُس کے سپرد کر دیا۔ اُس وقت پیلاطس کی نفسیات دو دھاروں میں تقسیم ہوگئی: رومی وطنی نخوت کا دھارا اور عقل ومشاہدہ کا دھارا۔ وہ یہود کے خبث باطن کو بھی جانتا تھا اور مسیح (علیہ السلام) کی برأت کا بھی یقین رکھتا تھا۔ اُسے بہت تردّد لاحق ہوا اور آخر کار اس نے مسیح علیہ السلام کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ یہود یہ دیکھ کر چلانے لگے: اگر تو نے اِس کو چھوڑ دیا تو تو قیصر کا وفادار نہیں۔ وہ شخص جو بادشاہ بننا چاہتا ہے، وہی قیصر کا مقابلہ کرتا ہے۔ (۷۴)

اُس نے جب اُن کا مسیح کو سولی دینے پر اصرار دیکھا تو مسیح علیہ السلام کو اُن کے سپرد کیا اور یہ کہا: تمہارے پاس ایک شریعت ہے جس کے مطابق تم اپنی عوام کے فیصلے کرتے ہو۔ تم اپنے اس بادشاہ کو پکڑو اور اپنی شریعت کے مطابق اس کو پھانسی دو۔ وہ یہ کہتے ہوئے چلائے: تو اس کو خود سولی دو۔ ہمارا بادشاہ قیصر کے سوا کوئی نہیں۔ (۷۵)

آخر سازش ویسے کامیاب ہوگئی جیسے یہود کا گمان تھا۔

انجیل یوحنا کی روایت کے مطابق مختصر قصہ یہی ہے۔ مسیح علیہ السلام کے الفاظ ''میری مملکت یہ جہان نہیں'' کے الفاظ اُس وقت صادر ہوئے جب اُن سے رومی گرفتاری کے دوران تحقیق کی جارہی تھی، جیسا کہ انجیل کہتی ہے۔ اور اگر مسیح علیہ السلام نے واقعتاً یہ کہا ہے تو اِس سے اُن کی مراد پیلاطس کو جواب دینا تھا: میں اُس طرح کا بادشاہ نہیں جیسا کہ تم اور یہود تصور کر رہے ہو، یعنی قیصر اور کسریٰ کی طرز پر۔ تمہارے خیال کے مطابق بادشاہ وہ ہوتا ہے جس کا عظیم جاہ وجلال اور بلند عزت ومجد ہو۔ میرا اِس دنیا میں اس طرح کا کوئی حصہ نہیں۔ میرا وہ حصہ اللہ کے ہاں اُس کی تابعیت والی اور عزت والی جگہ میں ہے۔ جب مجھے تمہارے دنیوی مناصب اور جھوٹے مظاہر کی طمع ہی نہیں تو تم مجھے کیوں قصوروار بناتے ہو اور کس حق کا بدلہ لینا چاہتے ہو؟

مسیح علیہ السلام نے یہ نہیں کہا اور نہ ہی کہنے کا ارادہ کیا: مجھے ضعفا اور عاجز لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کو کلیسا میں وعظ کروں اور اُن کے ساتھ گرجا گھروں کو بھر دوں۔ میری تعلیمات چند ایسی رُوحانی رسوم کے سوا کچھ نہیں جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ مسیح علیہ السلام نے اپنی صریح دعوت کا خواص کے سامنے اعلان کیا: یہ نہ سمجھو کہ مجھے زمین میں سلامتی ہی سلامتی حاصل ہوگی۔ میں سلامتی سے ملنے نہیں بلکہ تلوار سے ملنے آیا ہوں۔ (۷۶)

اُس نے وہ بات نہیں کہی جو یہود نے کہی: میرا بادشاہ تو فقط قیصر ہے۔ اگر وہ یہ بات کہتے تو شاید اذیت اور تہمت سے بچ جاتے۔ لیکن اللہ کی پناہ! کہ وہ یہ بات کہیں حالانکہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ جن کو اللہ نے زمین میں غیر اللہ کی ہر سلطانی مٹانے کے لیے بھیجا۔ وہ غیر اللہ کی حاکمیت کو گرانے سے جتنا بھی عاجز تھے لیکن انھوں نے کم از کم قیصر کی بادشاہت کا اقرار و اعتراف تو نہیں کیا۔

وہ اللہ کی طرف سے یہ جانتے تھے کہ اُن کا انجام قریب ہے۔ اور اُن کو دُنیا کی زندگی میں غلبہ نصیب نہ ہوگا۔ اس لیے انھوں نے اپنے کسی پیروکار کو دفاع کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ اُس آدمی کو جس نے تلوار نکالی تھی، نیام میں ڈالنے کا حکم دیا اور پیلاطس کو صریح طور پر کہا تھا: ''میری مملکت یہ جہان نہیں۔ اگر ہوتی تو میرے خدام کوشش کرتے کہ میں یہود کے سپرد نہ کیا جاؤں۔ لیکن میری مملکت یہاں نہیں''

یہ ہمارا نظریہ ہے اور ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ کلیسا جان بوجھ کر اُن عبارات کا قصد کرتا ہے جنھیں اناجیل مسیح (علیہ السلام) کی طرف منسوب کرتی ہیں اور جو مجازاً کہی گئیں یا کسی خاص وقتی حالات کے تحت وارد ہوئیں۔ لیکن کلیسا اُن سے اُصولی قواعد ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اُن پر اپنے محرف دین کی بنیاد رکھ سکے۔ وہ اس ضمن میں استدلال کی منطق اور علمی تحقیق کے تقاضوں کا خیال بھی نہیں رکھتا۔

اصطلاحات: ۱

نوفلاطونیت (Neo-Platonism)

تیسری اور چھٹی صدی عیسوی کے دوران افلاطون کے نظریات کی کی جانے والی رجعت پسند اور صوفیانہ تشریح جس کا بنیادی نظریہ اشراقیت ہے۔ نوفلاطونیت سے تاثر پذیری کی وجہ سے مسیحیت کی وہ دینی شان باقی نہ رہی جو الہامی دین کا خاصہ ہوتی ہے۔

ایپی قوریت (Epicurus)

وہ نظریہ جس کے نزدیک لذت سب سے بڑی خیر ہے۔ زندگی کا مقصد مسرت کا حصول ہے اور مسرت وہی ہے جو عقل اور اعتدال پر پوری اترے۔ دیوتا اور خدا انسانی دہشت کی پیداوار ہیں، اس دہشت کے خاتمے سے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ایپی قوریت دین کے عین منافی ہے۔

رواقیت (Stoicism)

زینو قبرصی (۳۳۳ ق م تا ۲۶۴ ق م) کا مکتب فکر جس کے نزدیک علم فقط حواس سے حاصل ہوتا ہے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقت فقط مادہ ہے، کوئی غیر مادی شے نہیں۔ اس کا نظریہ کائنات ہمہ اوست کا ہے۔ یہ نظریہ بھی دین کے منافی ہے۔

متکلمین یا مدرسی مفکرین (Scholastic)

قرون وسطی کے مکتبہ علم الکلام سے تعلق رکھنے والے مفکرین جنہوں نے مذہبی نظریات کو عقلی بنیادیں فراہم کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے افلاطون اور ارسطو کے فلسفے پر انحصار کیا۔

مدرسیت کے تین مراحل ہیں۔ نو افلاطونیت (۹ تا ۱۳ صدی)۔ مسیحی ارسطویت (۱۴ تا ۱۶ ویں صدی)۔ کاؤنٹر ریفارمیشن (۲۰ صدی)

رہبانیت (Monasticism)

وہ نظریہ جو اخلاقی اور روحانی ترقی کے لیے ترک لذات بلکہ ترک دنیا کو لازم قرار دے۔ عیسائیت، جین مت اور بدھ مت اس کے قائل ہیں جبکہ اسلام میں یہ نظریہ نہیں۔

یورپ کے اندر یہ نظریہ و عمل قرونِ وسطی کے اوائل میں نہایت مقبول تھا۔ ۱۳ ویں صدی میں کمزور ہوا اور آج پوری دنیا میں اس کے ماننے والے انتہائی محدود ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۲

دینِ عیسائیت میں بدعات نے کیسے جنم لیا؟

تمہید:

مسیحی وحی کی تحریف اور مسیحی اقوال کی بعید تاویلات جیسے امور کے لیے کلیسا نے اپنا دروازہ چوپٹ کھول دیا۔ نتیجے میں مستقبل کے انتہائی خطرناک اور مہلک فیصلے درست قرار پائے۔ کلیسا کی تحریفات بے ڈھنگی تھیں اور کسی معین قاعدے قانون کی پابند نہ تھیں۔ چنانچہ اضافہ جات اور پیچیدگیوں کے لیے کھلا میدان تھا۔ دنیوی لالچ اور شخصی مفادات نے معاملے کو آگے بڑھایا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ حماقتیں بھی ہوئیں جو دین سے منسوب بعض افراد نے نہایت سادگی سے سرانجام دیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مستقل رسوم اور دینی شعائر بن گئیں۔ تاریخ عیسائیت میں اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ عیسائیت پر ملاوٹی دین کا عیب لگایا گیا اور وہ ایسی کھٹالی بنا جس میں عقائد، خرافات اور متضاد آرا پگھل کر ایک ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے ایک غیر مرتب اور غیر منظم دین کی شکل اختیار کرلی۔

کھرے کو کھوٹا کرنا اور اصلی دین کو بدعتی دین سے الگ کرنا مشکل تھا چنانچہ مغربی ناقدین کا نقطہ نظر اس نصرانی دین کے بارے میں بڑا متضاد اور مختلف ہے۔

بعض تصریح کی حد تک غلو کرتے ہیں کہ یہ نصرانیت وضعی دین ہے جو سابقہ ادیان کی بہ نسبت ترقی یافتہ شکل اور دقیق تنظیم کا حامل ہے لیکن انسان نے اس کو اپنی مرضی کے مطابق گھڑا ہے، اس کے رسوم ورواج اُن طوطمی رسوم اور بت پرستانہ شعائر کا ہی تسلسل ہیں جو قدیم وحشی قبائل میں جاری تھے۔

اِن کے مقابلے میں دوسروں خصوصاً دینی میلان رکھنے والوں کا تعصب ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ دین نصرانی مکمل ہے، حقیقی طور پر دین سماوی ہے۔ جو کچھ اناجیل میں ہے سب وحی ہے۔ کلیسا کے اعمال جائز ہیں جن کو مسیح نے برقرار رکھا اور املا کرایا۔ اِن میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو من گھڑت بدعت یا غلط اضافہ قرار دیا جائے۔

ہمارے خیال میں اِس بارے میں ہمیشہ کی طرح فیصلہ کن بات قرآن کریم میں ہے جو سابقہ کتب کی اصلاح کرنے والی نگران کتاب ہے۔ یہ رائے موضوعی اور صاف ستھری ہے جو فقط مسلم محقق کے حصے میں آئی ہے۔

ہم پہلے عقیدہ وشریعت کی مسیحی تحریفات پر گفتگو کر چکے ہیں۔ تحریف بذات خود ایک خطرناک بدعت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، لیکن دین عیسائیت میں معاملہ فقط اُس تحریف پر محدود نہیں جو بالفعل موجود اُمور میں ہے بلکہ ایسی ایجادات تک پہنچ گیا جو سرے سے موجود ہی نہیں۔ وضعی تعلیمات گھڑ کر عین مسیحیت میں داخل کی گئیں۔ ان میں ایک دینی پیشوائیت کی بدعت ہے جو سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والی ہے۔ دیگر بدعات اس وقت تک نشو ونما نہیں پا سکتی تھیں جب تک دینی پیشوا اُس کو گھڑ نہ لیتے اور اُس کو بزعم خود شریعت قرار نہ دے دیتے۔ اسی لیے سب سے پہلے اس بدعت پر گفتگو کی جائے گی پھر بعض دیگر بدعات پر تا کہ وہ مہا بدعت کے طور پر ثابت ہو سکے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① عیسائی دینی پیشوا ''پادری''

نظریہ ارتقا سے متاثر تاریخ کا جاہلی نظریہ یہ کہتا ہے کہ انسان کی دینی واجتماعی زندگی تین بڑے مراحل سے گزری ہے۔

① جادو وخرافات کا مرحلہ۔

② دین کا مرحلہ۔

③ سائنس کا مرحلہ۔

پہلے مرحلے میں انسانی فکر اپنے ادنی اور کمزور ترین شکل میں تھی۔ انسان سمجھتا تھا کہ اس کی زندگی خفیہ اسباب سے مربوط ہے جن کا ادراک نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ وہ جادو اور شعبدہ بازی سے متاثر ہوتا تھا جو غیر حسی تاثیر کے حامل تھے۔ جیسے جیسے انسان کا اپنی زندگی کے بارے میں شعور بڑھتا گیا، اس کی امیدیں بڑھتی گئیں تو اُس کا جادوگروں اور کاہنوں سے تعلق بھی بڑھتا گیا تا کہ وہ مزعومہ شریر ارواح کو دور کر سکے اور متنوع معاشی مفاد حاصل کر سکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ساحر اور کاہن وحشی قبائل کے ہاں بلند ترین معاشرتی مقام پر فائز ہوگئے۔ اُن کو قبائل کی سرداری پیش ہونے لگی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیروکاروں کے مالوں اور عورتوں میں اپنے لیے مادی مفاد حاصل کرلیا۔

زراعت کی دریافت اور پرامن انسانی زندگی برپا ہونے کے بعد عبادت خانے اور ہیکل تعمیر کیے گئے۔ بعض کاہن بادشاہ بن گئے جو حکومت کو وراثتاً حاصل کرتے تھے، بعض عبادت خانوں اور ہیاکل کے رئیس بن گئے جن پر عزت، وقار اور وافر مال کی بارش ہونے لگی۔

انسان جب دوسرے مرحلے یعنی ''دین کے مرحلے'' میں داخل ہوا تو پہلے مرحلے کی وراثت سے کچھ خرابیاں باقی رہ گئیں۔ اُن میں سب سے نمایاں خرابی مخصوص دینی وڈیروں کی پیشوائیت تھی جو کہ ساحروں اور کاہنوں کی پیشوائیت کا تسلسل تھی۔ وہ بعینہ اُسی ذمہ داری کو لے کر کھڑے ہوئے جو اِس سے قبل ساحروں وکاہنوں کی تھی۔ واحد فرق یہ تھا کہ وہ اپنے غلبے کی سند دین سے لیتے تھے جبکہ دوسرے جادو سے لیتے تھے۔ (۷۷)

یہ دینی پیشوائیت کے ظہور کا جاہلی نظریہ ہے۔ یہ ناقص تعلیل ہے کیونکہ یہ وحی الٰہی کا انکار کرتی ہے اور جان بوجھ کر اُن روشن وقفوں کو نظر انداز کرتی ہے جو تاریخ انسانی کی ابتدا سے باری باری نمودار ہوتے رہے۔ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انبیا علیہم السلام کی بعثت کے ادوار تھے۔

﴿وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ﴾ (فاطر۔۳۵/۲۴)

''اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو''۔

یہ نظریہ منہج الٰہی سے انحراف کے اُن ادوار پر ہی محدود رہا جن میں خرافات اور شرکیات کا غلبہ تھا اور انبیا کے پیروکار بتوں کے مجاور، مشعوذ اور کاہن بن گئے۔

'اسلامی تصور' تاریخ انسانی کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ یہ دو متوازی خطوط پر مشتمل ہے: ایک روشن خط جو اُس انسانی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے جو اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھا اور انبیا کے راستے پر چلتا رہا۔ جو انسانیت کو جادہ طریق کی طرف پھیرنے کے لیے ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہے۔

دوسرا تاریک خط ہے جو شیطان کی پارٹی اور گمراہی کے ادوار کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ ادوار انسانیت پر اُس وقت آئے جب وہ اِس سے پہلے ایمان پر قائم امت تھے۔ تاریخ کی عام علامت یہی رہی ہے کہ وہ ہدایت وضلالت اور حق و باطل کے مابین ایک کشمکش ہے۔

ہم سابقہ ادوار میں اس نمایاں مشابہت کا انکار نہیں کر سکتے جو مسیحیت کے پادریوں اور ساحروکاہن طبقے کے درمیان ممکن ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم اِس کو اِس طرح دیکھتے ہیں کہ یہ دونوں گروہ اپنی بنیادی اصل سے منحرف ہو گئے۔ ہم اس سے آگے نہیں بڑھتے۔ دینی پیشواؤں کی حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری احبار پر ڈالی تو معاملہ کی نزاکت کا تقاضا یہ تھا کہ محنت وصلاحیت کی حامل ایک بڑی تعداد کتاب کی حفاظت، شرح وتوضیح کے لیے فارغ ہوتی تاکہ اس کے مطابق فرد و معاشرے کا سفر جاری رہتا۔ اللہ نے ان علما کو حکم دیا تھا کہ وہ ربانی بن کر رہیں کیونکہ وہ کتاب کے عالم ہیں اور اس کو پڑھتے ہیں۔ ان کو کسی بھی چیز کے چھپانے، تحریف کرنے یا اس کے بدلے دُنیاوی مال ومتاع خریدنے سے منع کیا۔ لیکن واقعہ یہ ہوا کہ بہت سارے احبار فانی دنیوی اغراض کے پیچھے لگ گئے۔ وہ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے معمولی قیمت حاصل کرنے لگے۔ یوں انھوں نے امانت کو ضائع کیا، اُس کی حفاظت میں کوتاہی کی اور اپنے لیے دنیوی غلبے کی کوشش کی۔ وہ لوگوں کے مال باطل طریقے سے کھانے لگے۔ وہ لوگوں کے نذرانے قبول کرتے، لوگوں پر ہیکل اور عبادت خانے کے نام پر ٹیکس لاگو کرتے اور اپنے دینی منصب کو بری طرح سے استعمال کرتے۔

اس طرح وہ اللہ کی ناراضی کے مستحق ٹھہرے اور بعد والوں کے لیے بری مثال اور گندے مقتدا بنے۔ پھر اللہ نے عیسیٰ بن مریم کو انجیل دے کر مبعوث کیا۔ انھوں نے اپنے پیروکاروں کو یہود احبار کے نقش قدم پر چلنے سے نہایت سختی کے ساتھ ڈرایا۔ مسیح علیہ السلام نے یہود کو عہد فروش، سانپوں کی اولاد، دنیا کے پجاری کے نام سے پکارا۔ انھوں نے اپنی قوم کو اللہ اکیلے کے ساتھ براہ راست تعلق، توبہ اور فرماں برداری کی دعوت دی۔ وہ اپنے حواریوں اور شاگردوں کو یہ وصیت کرتے تھے: امت کے وڈیرے امت کے سردار بن بیٹھتے ہیں اور ان کے بڑے اُن پر

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلّط ہو جاتے ہیں، تمہارے اندر ایسا نہ ہو۔(۷۸)

لیکن عیسائی پادری اور درویش، یہودی احبار سے زیادہ بہتر حالت میں نہ تھے۔ وہ بھی دنیا کی طرف جھک گئے اور مومن پیروکاروں کو اپنا غلام بنا لیا۔ اِس معاملے میں رومی سلطنت نے بھی مدد کی، اُن کے مراکز کو برقرار رکھا اور اُن کو تقویت دی۔ عیسائی کلیسا نے روم کے ریاستی ڈھانچے کی طرز پر اپنے لیے مذہبی پیشوائیت کا ڈھانچہ تخلیق کیا۔ چنانچہ جیسے ریاست کی تشکیل ایک مخروطی مینار کی شکل میں ہوتی ہے جس کی چوٹی پر شہنشاہ ہوتا ہے اور اُس کی تہ میں لشکر ہوتا ہے، اِسی طرح کلیسا کی تشکیل بھی اداراتی سطح پر ایک مخروطی مینار کی شکل میں ہوئی جس کی چوٹی پر پوپ ہوتا تھا اور اس کی تہہ میں راہبوں کا طبقہ ہوتا تھا۔ دین اور ریاست کی علیحدگی کے قانون کے تحت شہنشاہ نے کلیسائی اداراتی ڈھانچے کو تحفظ دیا اور اُس میں اپنے لیے کوئی حرج محسوس نہ کیا۔ چنانچہ کلیسا کا ڈھانچہ راسخ اور مضبوط ہو گیا۔

انگریز مورخ ویلز مسیح علیہ السلام کی مسیحیت اور کلیسا کی مسیحیت کے مابین فرق کے ضمن میں کہتا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، یسوع ناصری کی تعلیمات ایک نبی کی تعلیمات تھیں۔ یہ جدید طرز کی تھیں جو عبرانی انبیا کے ظہور سے ہی شروع ہو گئیں۔ یہ جعلی کاہنوں کی طرز کی نہ تھیں جن کے مخصوص مقدس عبادت خانے اور ہیکل ہوتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات میں وہ مخصوص شعائر اور رسوم نہ تھے جو بعد میں پیدا ہوئے۔ ان کے ہاں اللہ کے تقرب کا طریقہ ''ٹوٹا ہوا عاجز دل'' تھا جو لوگوں سے محبت کرتا تھا۔ ان کی واحد اداراتی سطح واعظوں کی جماعت تھی جس کا واحد بنیادی کام وعظ و نصیحت تھا۔

باوجود اس کے کہ چوتھی صدی کی مسیحیت مکمل تشکیل پا چکی تھی اور اُس نے یسوع کی انجیلی تعلیمات کو بھی ایک بنیاد کے طور پر محفوظ رکھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اندرون میں کاہنوں والا دین بھی موجود تھا جو ہزاروں سالوں سے لوگوں کے ہاں مالوف و مانوس تھا۔ ذبح کا مذموم تصور من گھڑت رسوم میں بنیادی کردار کا حامل تھا۔ اس عبادت میں جو ہری عمل وہ قربانی تھی جس کو مخصوص چھوٹے پادری اپنے بزرگوں کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اس کا ایک اداراتی ڈھانچہ بھی تھا جو بڑی تیزی سے خدام، چھوٹے اور بڑے پادریوں سے تشکیل پا رہا تھا۔(۷۹)

دینی پیشواؤں نے اپنے وجود کے جواز میں جو بنیادی وجہ پیش کی، وہ ''اللہ اور مخلوق کے مابین واسطوں'' کا اصول تھا۔ جس کا صرف یہ تقاضا نہ تھا کہ انسان دینی پیشوا کے پاس جا کر اللہ کی عبادت کا طریقہ سیکھے بلکہ یہ تقاضا بھی تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اُس کے واسطے سے کرے۔ گناہ گار کو یہ حق نہیں کہ وہ خود اللہ کی طرف تائب ہو سکے اور بخشش کا سوال کرے بلکہ اس پر لازم ہے کہ وہ دینی پیشوا کا رُخ کرے اور اس کے سامنے گناہ کا اعتراف کرے تا کہ وہ اللہ کے ہاں وسیلہ بن کر کھڑا ہو اور اللہ اُس کو معاف کر دے۔ اس اصول کے مطابق دینی پیشواؤں نے خود کو اللہ کا مقابل اور شریک بنا کر پیش کیا اور اپنے پیروکاروں کو شرک اکبر میں جا گرایا۔

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾(توبہ۔۳۱/۹)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے''۔

یہ اصول شرعی و عقلی اعتبار سے باطل تھا۔ کیونکہ اناجیل میں تحریفات کے باوجود، دینی پیشوائیت پر کوئی دلالت نہ تھی کہ مسیح علیہ السلام نے اس کا اقرار کیا ہو یا اس کی دعوت دی ہو۔

اس اُصول پر بالآخر کئی بُرے نتائج مرتب ہوئے۔ مثلاً دینی پیشواؤں کا انجیل کی قرات وتشریح پر اجارہ داری، بخشش کے سرٹیفکیٹ کی خرابی اور پے در پے دینی فرقہ بندیاں جس نے عام زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ آخر کار اسی دینی پیشوائیت کو سترہویں صدی کے اندر ملحدین نے تمام ادیان کے مقابلے میں اور خصوصاً مسیحیت کے مدمقابل ایک حجت کے طور پر پیش کیا۔ ان امور کی تفصیل آنے والے ابواب میں آئے گی۔ باذن اللہ (۸۰)

ہدایت پانے والا فرانسیسی عالم ''ناصر الدین ڈینیہ'' کہتا ہے: وسیلے اور واسطے کا مسئلہ ان بڑے بڑے مسائل میں سے ہے جن کے ساتھ اسلام تمام ادیان پر فائق ہے۔ اسلام میں اللہ اور اس کے بندے کے درمیان کوئی وسیلہ نہیں۔ اسلام میں عیسائی طرز کے پادریوں اور رہبان کا کوئی وجود نہیں۔

یہ واسطے ادیان پر بدترین ظلم وآزمائش ہیں چاہے یہ جس قدر حسن نیت اور اخلاص وعقیدت پر مشتمل ہوں۔ مسیح علیہ السلام نے بذات خود اس کو محسوس کر لیا تھا۔ کیا انھوں نے ہیکل کی خرید وفروخت کرنے والوں کو دھتکارا نہ تھا۔ مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں نے وہ کام نہ کیا جو مسیح علیہ السلام نے خود کیا۔ آج اگر عیسی علیہ السلام لوٹ آئیں تو ہیکل کے کتنے بیوپاریوں کو دھتکار دیں۔

خاندانوں اور قوموں کے درمیان کتنے ہی مصائب وابتلائیں ان دینی پیشواؤں کے ذریعے سے واقع ہوئیں، کتنے جانور اور اونٹ ان کے واسطے سے ذبح ہوئے۔ وہ ان سب کے بارے میں یہی چیختے رہے کہ یہ اللہ کی بزرگی کے نام پر ہے۔ (۸۱)

دینی پیشوائیت کے بدترین تسلط کے جواز میں ایسی کمزور سند پیش کی جاتی ہے جس کا مناقشہ ضروری ہے۔ یہ بات گزر چکی ہے اور آئندہ بھی ایک تاریخی حقیقت کے طور پر سامنے رہے کہ اللہ پر افترا اور استنباط میں غلط فہم، کلیسا کے دو ایسے لازم ملزوم امور ہیں، جیسے سایہ اپنے اصل کے ساتھ۔ اللہ تعالی نے اہل کتاب پر اُن کی بار بار کی خطاؤں کے سبب گرفت کی۔

﴿تَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ (انعام۔۹۳/۶)

''تم اللہ تعالی کے ذمے جھوٹی باتیں لگاتے تھے''۔

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ﴾ (النساء۔۴۶/۴)

''کلمات کو ان کی ٹھیک جگہ سے ہیر پھیر کر دیتے ہیں''۔

کلیسا کا دعویٰ ہے کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں میں سے ایک بڑے حواری پطرس کو کہا تھا:

''تو پطرس ہے۔ اس چٹان پر تو میرا بیٹا ہے اور میرا کلیسا ہے۔ جہنم کے دروازے تجھ پر کبھی قدرت نہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاسکیں گے۔ میں تجھے آسمانوں کی بادشاہت کی کنجیاں دیتا ہوں۔ جس کو تو زمین میں اپنے ساتھ ملائے گا وہ آسمانوں میں بھی ملا ہوا ہوگا۔ اور جس کو تو زمین میں چھوڑ دے گا، وہ آسمان میں بھی چھوڑا ہوا ہوگا۔'' (۸۲)

کلیسا نے یہ سمجھا کہ اس قول سے مسیح کا مطلب یہ ہے کہ غالب دینی اقتدار اس کے نام سے اُس جگہ مرکوز ہوگا جہاں بڑا حواری پطرس فوت ہوگا۔ اِس مرکز سے اُس کا نفوذ پوری دنیا میں پھیلے گا اور وہ مسیح علیہ السلام کے نام کے ساتھ حکومت کرے گا۔ چونکہ کلیسا کے بقول پطرس روم میں فوت ہوئے تو روم پوری دنیا پر حکومت کے لیے مسیح علیہ السلام کی بنیاد ہے۔ اسی میں کلیسا کا بنیادی ٹھکانہ ہے جہاں مسیح علیہ السلام کا نمائندہ اور اس کا معصوم عن الخطا قاصد 'پوپ' رئیس بن کر رہتا ہے۔ کلیسا جو بھی مقرر کرے وہ عین صواب ہے کیونکہ مسیح علیہ السلام روح القدس کے واسطے سے بذات خود اپنے تصرفات کلیسا پر املا کراتے ہیں۔ جب تک کلیسا اللہ کے نام کی محنت جاری رکھے گا اور اپنی مشیت کے مطابق (جبکہ بزعم خود اُس کی مشیت اللہ کی مشیت ہے، نعوذ باللہ) لوگوں کو آزاد کرے یا پکڑے گا، تو اُس کی اطاعت واجب ہوگی، اور اُس کی الزامی قرار دادیں مسیح علیہ السلام کے ہر مومن پر لازم ہوں گی۔ پیروکاروں پر فقط اندھی اطاعت ہے جس میں بحث و جھگڑے کی کوئی گنجائش نہیں۔ کلیسا کے نزدیک یہ ناقابل معافی گناہ ہے کہ اللہ کے اُن احکام سے تصادم اختیار کیا جائے جو کہ انسانی عقل کے واسطے سے کلیسا کے اوامر ہیں۔ جو بھی تصادم اختیار کرے، کلیسا کے اختیار کو چیلنج کرے یا اُس کی قراردادوں پر تنقید کرے وہ کافر بدعتی ہے، اُس پر لعنت اترتی ہے اور وہ اخروی ملکوت میں داخل ہونے سے محروم قرار پائے گا۔ چاہے بظاہر اُس کی رائے کتنی وزنی کیوں نہ ہو، چاہے اُس کی خدمات مسیحیت یا خود کلیسا کے لیے کتنی عظیم کیوں نہ ہوں۔

اگر کوئی حاکم یا قوم کلیسا پر سرکشی کرے تو مقدس لشکر مسیح علیہ السلام کی خوش نودی کی خاطر، اُس کو پیس کر رکھ دے گا۔

یہ کلیسا کا دعویٰ تھا جو ایک تاریخی حقیقت میں بدل گیا، جس کے بُرے نتائج یورپ پر بلکہ پوری دنیا پر ظاہر ہوئے۔ ہم اُس کے مقابلے میں ایک ہی صریح موقف رکھتے ہیں: اللہ کے سچے رسول مسیح علیہ السلام یہ بات قطعاً نہیں کہہ سکتے، ہمیں اس سے مطلق انکار ہے۔

یہ قول اس توحید کو ضرب لگاتا ہے جو تمام انبیا کی دعوت کا مرکزی نقطہ تھا، یہ صحیح ایمانی عقیدے کے جوہر کو چوٹ لگاتا ہے۔ یہ اناجیل کے اُس دعویٰ کی طرح ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خود کہا تھا: میں اللہ کا بیٹا ہوں۔ جبکہ انجیل متی صراحت کرتی ہے کہ مسیح علیہ السلام نے پطرس کے دعوے کو رد کیا جب اُس نے کہا: تو مسیح ہے اللہ کا زندہ بیٹا۔ اللہ تعالیٰ اس سارے قضیے کے بارے میں فرماتے ہیں:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ○ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿

(آل عمران۔۳/۷۹۔۸۰)

''کسی ایسے انسان کو جسے اللہ تعالیٰ کتاب، حکمت اور نبوت دے، یہ لائق نہیں کہ پھر بھی وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم سب رب کے ہو جاؤ، تمہارے کتاب سکھانے کے باعث اور تمہارے کتاب پڑھنے کے باعث۔ اور یہ نہیں (ہوسکتا) کہ وہ تمہیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لینے کا حکم کرے، کیا وہ تمہارے مسلمان ہونے کے بعد بھی تمہیں کفر کا حکم دے گا''۔

انبیا توحید کے داعی اور حق کے رسول ہوتے ہیں۔ اُن سے ایسے کسی دعوے کا صدور ممکن نہیں جس میں شرک کا شائبہ ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی نبی اپنے نفس کے متعلق خصائص اُلوہیت میں سے کسی چیز کا دعویٰ کرے، پھر اُس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی الٰہی خصوصیت دوسروں کو بھی منتقل کرے۔ نعوذ باللہ من ذلك

مسیح علیہ السلام بشر رسول تھے۔ وہ اپنی ذات کے لیے نفع ونقصان کے مالک نہ تھے۔ یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ ان کو ملکوت کی چابیوں کا مالک قرار دیا جائے، جن کا مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں؟ جب ہم پورے جزم سے انکار کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام الٰہی اختیارات کے مالک نہیں ہوسکتے تو پھر اس جھگڑے کی ضرورت نہیں رہتی کہ آپ نے اپنے اختیارات پطرس کو منتقل کیے۔ پھر یہی اختیارات پطرس کی طرف سے کلیسا کو منتقل ہوئے۔ محرف عیسائیت کی تہ میں یہی بنیادی خطا ہے جس کا اقرار کسی صورت ممکن نہیں۔ بلکہ کسی مسلمان کے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو الٰہ مانے۔

کلیسا اپنے دعویٰ جات پر جاہل عوام کو تو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرسکتا ہے لیکن یہ اُس کے بس میں نہیں کہ وہ کسی علمی محقق کو یقینی دلائل کے ساتھ مطمئن کرسکے۔ کوئی بھی عقل سلیم والا انسان کلیسا کی ٹیڑھی منطق کے ساتھ نہیں چل سکتا۔

امریکی مصنف جرین برنٹن کلیسا کے استدلال کا مذاق اڑاتا ہے اور کلیسا کی خطا کا سبب 'پطرس' اور 'صخرہ' کے الفاظ کی ظاہری مشابہت کو قرار دیتا ہے۔ (۸۳)

جب اناجیل کے متعصب مفسرین بھی اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اناجیل کی کئی آیات ایسی ہیں جن کی کوئی اصل نہیں، جیسا کہ پہلے تثلیث کی بحث میں گزر چکا ہے، تو کلیسا کے پیشواؤں سے ہٹ کر دیگر ناقدین اور منکرین کا کیا حال ہوگا۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ کوئی مسلمان نقد کرے جو بلاشک وشبہ یقینی معلومات کا واحد حامل ہے۔

تاریخی نقطہ نظر سے ان خرابیوں کا جواز ممکن نہیں جن کا کلیسا نے ارتکاب کیا۔ اس طرح وہ خوف ناک جنگیں جنہوں نے تہذیب کے سفر میں رکاوٹ ڈالی اور بے قصور لوگوں کی جانیں ضائع کیں۔ اسی طرح استبداد و سرکشی کا وہ دور جو زندگی کے تمام شعبوں میں دینی پیشواؤں کے واسطے سے عام رہا۔ کلیسا کا بے بس ولاچار عوام کے مقابلے میں ہمیشہ ظالموں اور سرکشوں کی صف میں کھڑا ہونا، تفتیشی محاکم کے مظالم، علما کو جلانا، اس طرح کے دیگر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جرائم جن کا جواز اس دلیل کے ساتھ ممکن نہیں کہ مسیح علیہ السلام نے اپنا اختیار اور اقتدار ظالم دینی پیشوائیت کو عطا کر دیا۔

اگر ہم انجیل متی کو دیکھیں جس نے اس افترا کو وارد کیا ہے، تو ہم اس قول کے فقط تین فقروں کے بعد مسیح علیہ السلام کا یہ قول دیکھتے ہیں جس میں وہ پطرس سے مخاطب ہو کر فرما رہے ہیں: ''مجھ سے دور ہو جا، اے شیطان! تو اللہ کے حق میں فکر نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے حق میں فکر کرتا ہے''۔ یہ وصف اور یہ تہمت اختیارات کی سابقہ منتقلی اور سابقہ بے انتہا تکریم کے ساتھ کیسے ممکن ہے؟

کلیسا اس قول کو یا اس جیسے دیگر اقوال کو تو دیکھتا ہے لیکن مسیح علیہ السلام کے اس صریح فرمان سے چشم پوشی کرتا ہے: ''امت کے بڑے امت کے سردار بن بیٹھتے ہیں۔ تم میں کوئی ایسا نہ ہو''

اور اُن کا یہ فرمان: ''اپنے دشمن سے محبت کرو، نفرت کرنے والوں سے اچھا سلوک کرو، اپنے اوپر لعنت کرنے والوں کے لیے برکت کی دعا کرو، جو تمھارے ساتھ برا سلوک کریں، اُس پر رحمت کی دعا کرو'' (۸۴)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

② رہبانیت

زمین میں انسانی وجود کا ایک عظیم مقصد ہے جس کی خاطر اللہ نے انسان کو تخلیق فرمایا ہے۔ اُس نے انسان کو زمین میں ''**خلافت فی الارض**'' کی عظیم ذمہ داری کے لیے قائم کیا۔ اللہ نے انسان کو اس زمین کی بہتری کے ساتھ ساتھ آبادکاری کی ذمہ واری بھی سونپی تا کہ انسان اپنے مقصد وجود کو بھول نہ جائے۔ اللہ نے اس عظیم مقصد کو اُس کی تخلیق کا جز بنا کر اُس کی نفس کی گہرائیوں میں ودیعت کر دیا۔

﴿ فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾ (روم۔۳۰/۳۰)

''اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے (لازم پکڑو)''

اللہ نے انسان کی طرف مسلسل رسول بھیجے تا کہ وہ اس مقصد اور دعوت کے لیے ایک زندہ نمونہ بن سکے۔

لیکن لوگ شیطان کے ورغلانے کے ساتھ راستے سے گمراہ ہو جاتے ہیں اور اپنے وجود کی غایت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی نقد حیوانی خواہشات کی حدود میں مگن ہو جاتے ہیں، چنانچہ ان کے اعمال بگڑ جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

اس حقیقت سے غفلت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو اس قدر ہلکا سمجھتے ہیں کہ اُس کو حقیقی قدر و قیمت سے گرا دیتے ہیں جو اللہ نے مقرر کی ہے۔ وہ انسانی نفس کو بے جا عذاب دے کر سمجھتے ہیں کہ وہ اس کو مہذب کر رہے ہیں۔ اس طرح وہ دنیا کی آبادکاری کے عظیم مقصد سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

رہبانیت کو لوگ قدیم زمانے سے جانتے ہیں۔ یہ اُس غلط سلبی تصور کی عملی تطبیق ہے جو انسان کی طبیعت اور اس کی ذمہ داری کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے۔

رہبانیت (Monasticism) انسان کی خود ساختہ بدعت ہے اور یہ متعدد ادیان میں مشترک ہے۔ عیسائیوں کی رہبانیت کے کچھ واضح اسباب تھے جن کی بدولت وہ عیسائیوں میں خوب پروان چڑھی حتی کہ یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کلیسائی دین کے مظاہر میں ایک واضح ترین مظہر بن گئی۔

اسباب رہبانیت:

① **موروثی گناہ کا عقیدہ**: یہ محرف مسیحیت کی بڑی تعلیمات میں سے ایک ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے شجر معرفت! سے کچھ کھالیا۔ اللہ نے اس کو جنت سے نکالنے اور مٹی میں رہائش کی سزا دی۔ انسانی عقل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس غلطی کی سزا میں لمبے زمانے تک گھسٹتی رہی، حتی کہ (نعوذ باللہ) اللہ نے اپنے بیٹے کو اتارا تا کہ اُس کو نوع انسانی کے فدیے کے لیے سولی پر لٹکایا جائے۔ وہ انسانوں کو اس غلطی سے نجات کا راستہ بتلائے۔ انسان پر لازم قرار پایا کہ وہ اپنے نفس کو قتل کرے تا کہ نجات حاصل کر سکے۔

انجیل متی کہتی ہے: ''جو اپنے نفس کو خلاصی دلانا چاہتا ہے، وہ اس کو ہلاک کرے'' (۸۵)

انجیل لوقا کہتی ہے: ''جو شخص چاہتا ہے کہ اپنے نفس کو نجات دلائے، وہ اس کو ہلاک کرے۔ اور جو اس کو ہلاک کرے گا۔۔۔'' (۸۶)

سفر تکوین کی روایت کے مطابق عورت ذات نے مرد کو درخت سے کچھ کھانے پر مجبور کیا چنانچہ محرف نصرانیت نے عورت سے دشمنی اختیار کی کہ یہ برائی کی جڑ اور غلطی کا منبع ہے۔ چنانچہ غلطی سے خلاصی کا عمل اُس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک انسان اپنی ذات کا انکار نہ کرے اور تمام فطری میلانات اور طبعی رغبتوں کو قتل نہ کرے۔ وہ جسمانی خواہشات خصوصاً جنسی شہوت اور انسانی بدن سے انتہائی حقارت کا سلوک کرے تا کہ غلطی سے چھٹکارا پا سکے۔

④ **یہودی مادیت اور رومی ابیقوریت کا ردعمل**: اللہ نے اپنے بندے اور رسول مسیح کو دو قسم کے گروہوں کی طرف بھیجا۔ ایک وہ جو دنیا پر مر مٹنے اور اس کی لذتوں میں فنا ہونے والے تھے۔ یہ شہوتوں کی ذلیل غلامی کرنے والے اور متاعِ دنیا کے ساتھ سب سے زیادہ چمٹنے والے حریص یہودی تھے۔ دوسرا گروہ رومی استعمار تھا جو حیوانی زندگی اور گندی شہوات کے جوہڑ میں کانوں تک غرق تھا۔ ان حالات میں مسیح علیہ السلام تشریف لائے، وہ اللہ کے حکم سے اُن کو بلیغ وعظ کرتے، آخرت کی یاد دلاتے، کئی قسم کی مثالیں دے دے کر سمجھاتے اور انتہائی مؤثر قصے بیان کرتے۔ یہ سب اس لیے تھا تا کہ وہ دنیا کی غلامی سے اللہ کی عبادت میں آجائیں اور اُن کی آنکھیں اُن ہولناک مراحل کے لیے کھل جائیں جو دوسرے جہان میں اُن کے لیے منتظر تھے۔ مسیح علیہ السلام پر ایک قوم ایمان لائی، اُن کے نفس متاثر ہوئے اور ان کے دلوں نے نصیحت قبول کی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مادیت کے ردِعمل میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ وحی کے امر کردہ حدود اور فطرت سلیم سے نکل گئے۔ انھوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف یہ منسوب کیا کہ انھوں نے مال دار انسان کو اپنے مال سے الگ تھلگ ہونے کا حکم دیا ہے۔ مال دار انسان صلیب اٹھائے اور صلیب کی پیروی کرے۔ مسیح علیہ السلام نے کہا: اونٹ کا سوئی کے سوراخ سے گزرنا ممکن ہے لیکن ایک مال دار انسان کا اللہ کی بادشاہی میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ (۸۷)

انھوں نے اپنے شاگردوں کو یہ وصیت کی: ''تم لوگ اپنی جگہوں میں سونا، چاندی اور تانبا اکٹھا نہ کرو، نہ زادِ راہ لو اور نہ دو دو کپڑے، نہ جوتے اور نہ ڈنڈا'' (۸۸)

③ **مروج فلسفوں اور قنوطی وثنیت کا اثر**: مسیح علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مابین وحی کے انقطاع کا دور ہے۔ اس دور کے لوگ دینِ حقیقی کے پیاسے تھے اور محرف عیسائیت اس پیاس کو بجھانے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ گہری فکر اور حساس طبیعت کے لوگ الجھن میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے ایسے فلسفے اختیار کر لیے جو زندگی سے فرار اور مادے سے ماورا جہان میں استغراق پر مبنی تھے۔ اس کی بہترین مثال رواقی فلسفہ ہے۔

اس کے مقابلے میں مہلک بت پرستی تھی جو جسم کو مغلوب رکھنے کا درس دیتی اور مایوسی اور روکھی زندگی کو مقدس مانتی جیسے بدھ مت اور برہمنیت۔

جب مسیحیت کا سب سے بڑا محرف پولس آیا تو وہ ان فلسفوں اور وثنیات سے بھی متاثر ہوا۔ اس نے ایک وضعی دین کا بیج بویا اور اس کو مسیحیت کی خاص تعلیمات میں داخل کر دیا۔ پھر اُس کے بعد اُس کے پیروکار اُس کے نقش قدم پر چلتے گئے۔ پولس کی داخل کردہ خرابیوں میں سے ایک خرابی یہ نظریہ تھا یعنی دنیا کی زندگی اور ساز و سامان کو نحوست کی نظر سے دیکھنا۔

اس باطل عقیدے اور دیگر بدعات نے مسیح علیہ السلام سے متصل صدیوں میں رہبانیت کو رواج دینے میں بہت حصہ لیا۔

''معالم تاریخ انسانیت'' کا مصنف کہتا ہے: ''عبادت خانے مسیحیت کے ظہور سے قبل دنیا میں موجود تھے۔ جب یسوع ناصری کے زمانے سے قبل یہود پر اجتماعی بدبختی نازل ہوئی، تو اسینین عبادت گزاروں کا ایک گروہ معاشروں سے الگ تھلگ زندگی گزارتا تھا اور سادہ زندگی گزارنے کے لیے اپنے نفس کو خلوت گزینی اور انکار ذات کے سپرد کرتا تھا۔ اسی طرح بدھ مت نے ایسے معاشرے پیدا کیے جو عام محنت و مشقت جھیلنے اور دنیا میں تجارت سے الگ رہتے تاکہ سادگی اور غور و فکر کی زندگی گزار سکیں''۔۔ ''تاریخ مسیحیت کے ابتدائی زمانے میں خاص طور پر مصر میں ایک تحریک پیدا ہوئی جو عام زندگی کی جانبازی، محنت و مشقت سے دور بھاگتی تھی۔ مردوں اور عورتوں کی ایک بہت بڑی تعداد جنگلوں کی طرف نکل گئی اور مکمل عزلت کی زندگی گزارنے لگی جس کی واحد مصروفیت نمازیں اور غور و فکر تھا۔ وہ غاروں اور چٹانوں پر شدید فقیری کی حالت میں زندگی گزارتے اور ان صدقات پر گزارا کرتے جو اتفاقاً گزرنے والے افراد اُن کی پاکیزگی سے متاثر ہو کر ان پر پھینکتے تھے۔ (۸۹)

④ **سخت معاشرتی طور طریقے:** رومی معاشرہ ظالم طبقاتی معاشرہ تھا۔ جس میں افراد کے بڑے بڑے گروہ چند افراد کے مفاد کے لیے جان توڑ محنت کرتے تھے۔ استعماری علاقوں کے باشندے خاص طور پر لاچاری اور ظلم و زیادتی کے سائے میں مشکل ترین زندگی گزارتے۔ چنانچہ بہت سارے لوگ زندگی سے مایوس ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ سرداروں اور وڈیروں کی خدمت سے جان چھڑانے اور بقدر کفایت زندگی کے حصول کا ذریعہ یہ ہے کہ گرجا گھروں میں داخلہ لیا جائے۔ جہاں اُن پر اہل خیر اور کلیسا کے اوقاف کے صدقات خرچ ہوں گے۔ ''قصة الحضارة'' کا مصنف ذکر کرتا ہے: ''ہزاروں نوجوان روم کی طرف سے لازم کردہ عسکری خدمت سے بھاگ کر عبادت خانوں میں داخل ہو گئے''۔ (۹۰)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظامِ رہبانیت:

نظام رہبانیت راہب کے لیے چند شرائط کو لازم قرار دیتا تھا جو یہ ہیں:

① **تجرد کی زندگی:** یہ رہبانیت کی اہم ترین شرط تھی۔ کیونکہ بیوی کی موجودگی میں رہبانیت کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ مسیح علیہ السلام نے شادی نہیں کی۔ انجیل متی مسیح علیہ السلام کی طرف یہ قول منسوب کرتی ہے: ''ایسے خصی پائے جائیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو آسمانوں کی بادشاہت کی خاطر خصی کیا چنانچہ جو اس کو قبول کرنے کی طاقت رکھتا ہو، وہ ضرور قبول کرے۔'' (۹۱)

محرف عیسائیت کی بنیادی اصولوں میں یہ بات تھی کہ عورت سے نفرت کی جائے اگر چہ وہ بیوی کیوں نہ ہو اور جنسی تعلق کو حقیر گردانا جائے اگر چہ وہ حلال کیوں نہ ہو۔ حتی کہ یہی اُصول غیر راہبوں کے لیے بھی مقرر تھا۔ کلیسا کا ایک راہنما سان بونافتور کہتا ہے: ''جب تم عورت کو دیکھو تو اس کو انسانی وجود شمار نہ کرو بلکہ وہ ایک زندہ وحشی وجود ہے، تم جس کو دیکھتے ہو وہ بذات خود شیطان ہے، جس کی آواز تم سنتے ہو وہ اژدھا کی پھنکار ہے'' ۔ (۹۲)

کلیسا کی سخت مشکلات میں سے ایک دینی پیشواؤں کی شادی یا ان کی لونڈیوں کا مسئلہ تھا۔ ''کلیسا زمانہ بعید سے دینی پیشواؤں کی شادی کا مخالف رہا ہے۔ اس کی دلیل یہ رہی ہے کہ شادی شدہ انسان اپنی محبت اپنی بیوی بچوں کے لیے ایسے مقام پر رکھتا ہے جو کلیسا کے مرتبے سے بھی بلند ہو جاتا ہے''۔۔۔ ''وہ کوشش کرتا تھا کہ اپنی کرسی یا مرتبہ اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کی طرف منتقل کرے۔ چنانچہ پادری کے لیے واجب ہے کہ اپنی زندگی کو اللہ اور بنی نوع انسان کے لیے وقف کر دے۔ اس کا اخلاقی معیار عوام کے اخلاقی معیار سے بلند ہونا چاہیے۔ پادری کے مقام و مرتبے کے لیے یہ معیار ضروری ہے تا کہ وہ لوگوں کا اعتماد حاصل کر سکے اور ان کے سامنے بزرگی قائم ہو سکے'' ۔ (۹۳)

''دینی پیشواؤں کا شادیوں اور بیویوں سے دُور بھاگنے کے اثرات سولہویں صدی تک پھیلے ہوئے ہیں اور بالآخر کلیسا کی شکست کے ساتھ ختم ہوئے'' ۔ (۹۴)

یہ حالت غیر راہبوں کی تھی، تصور کیجیے کہ راہبوں کا کیا حال ہوگا؟

② **دنیا سے کامل تجرد:** یعنی معاشرہ سے کامل علیحدگی، زندگی سے ہر قسم کی امید ختم کرنا اور بقدر ضرورت رزق پر قانع ہونا۔ جسمانی مطالبات جیسے لباس اور صفائی پر توجہ نہ کرنا اگر چہ وہ ضروری کیوں نہ ہوں۔ چونکہ محرف مسیحیت عام فرد کو تعلیم دیتی تھی کہ وہ زندگی کو حقیر سمجھے اور وہ اس طرز عمل کو اولین واجب قرار دیتی تھی۔ چنانچہ یہ بدیہی تھا کہ راہب کا معاملہ زیادہ سخت اور بھاری ہو۔

''المشكلة الاخلاقية والفلاسفة'' کا مصنف کہتا ہے: ''ہمیں یہ دلچسپ باب (یعنی مسیح کی حکایت) پڑھنا چاہیے۔ یہ باب مسیحی تبتّل (شادی سے پرہیز) کے ابواب میں سب سے بڑا ہے۔ ہمیں صحیح مسیحی زندگی کے مظاہر کو ان صحیفوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حالات کی تعبیر میں یہ سب سے بہترین تصویر ہے: ہر علم کے لیے بنیادی حقارت حتی کہ اس میں الٰہیات کا علم بھی داخل ہے، ہر اس چیز کے لیے قطعی حقارت جس کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم اس دنیا کے وسائل کو کر پکارتے ہیں: دولت، شرف اجتماعی حتی کہ اعلیٰ ترین منصب۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ہمیشہ تواضع اور ندامت کو محسوس کریں اور عملی طور پر قربانیاں سرانجام دیں۔ ہمارا ہر مظہر شفقت اور رحم دلی سے بھرپور ہو۔ ہمارے حواس خاموشی، انقباض اور دینی غور وفکر میں گھرے ہوں کہ ہم اپنے وجود کو بھول جائیں۔ واجب ہے کہ ہم تمام دنیوی میلانات کو قتل کر دیں۔ واجب ہے کہ رغبتوں کی دنیا مر جائے۔ لازم ہے کہ ہم اِس فانی دنیا سے اُن باتوں کی ابتدا کریں جو ہمارے لیے ابدی وجود کی تشکیل کریں''۔

پھر ان تعلیمات پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

''رہبانیت عظمت اور بلندی کی ایک کوشش لیکن انسانیت پر ایک سخت قضا ہے۔ رہبانی اصولوں کی تنفیذ یہ ہے کہ سارا معاشرہ ایسے عبادت خانوں سے بھر جائے جن میں ایک طرف فقط مرد ہوں اور دوسری طرف فقط عورتیں۔ وہ اپنی اپنی طہارت اور غور وفکر کا اہتمام کریں اور بالآخر انسانی نوع کا خاتمہ ہو جائے''۔ (۹۵)

③ **مسلسل عبادت:** رہبانی نظام راہب پر فرض کرتا ہے کہ وہ مسلسل حالت عبادت میں رہے جو اس پر اس کے باپ نے لکھ دی ہے۔ وہ اطاعت میں تردد نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس پر لازم تھا کہ اپنے نفس کو محنت میں ڈالے اور اس پر طاقت سے بڑھ کر بوجھ ڈالے جیسے نمازیں، روزے، تراتیل، ترانیم، دیگر مذہبی رسوم وغیرہ۔ جب وہ ان سے تھک جائے یا ان میں کوتاہی کرے تو اس نظام کی سخت سزائیں اس کی منتظر ہوتی تھیں۔ ہم بطور مثال عیسائی بزرگ 'کولمبان' کی تعلیمات کو لیتے ہیں جس نے فرانس میں فوج مقام پر پہاڑوں میں گرجے بنوائے۔ اس کی تعلیمات میں مذکور ہے: ''واجب ہے کہ آپ ہر روز روزہ رکھیں۔ ہر روز نماز پڑھیں۔ ہر روز محنت کریں اور ہر روز قرأت کریں۔ راہب پر لازم ہے کہ باپ کے حکم کے تحت زندگی گزارے''

''لازم ہے کہ وہ بستر پر جائے تو تھکا ہارا ہو، اُس پر راستے میں ہی نیند کا غلبہ ہو۔ سزائیں سخت تھیں جو اکثر کوڑوں کے ساتھ ہوتی تھیں: چھ کوڑے جب وہ مذہبی نغمے کی ابتدا میں اونگھے، یا وہ مسیحی دعائیہ عبادت سے قبل اپنے ناخن ہموار کرنا بھول جائے۔ اسی طرح وہ نماز کے دوران مسکرائے یا عشائے ربانی کے دوران اپنے دانتوں کے ساتھ پیالہ ٹکرائے۔''

''بارہ کوڑے راہب کی سزا تھی جب وہ کھانے سے قبل کی دعا بھول جائے اور ۵۰ کوڑے نماز سے پیچھے رہنے والے کے لیے تھے اور سو کوڑے اُس کے لیے جو جھگڑے میں شریک ہو اور دو سو کوڑے اُس کے لیے جو کسی عورت کے ساتھ بغیر کسی وقار کے گفتگو کرے''

'کولمبان' نے حمد کا ایک نظام قائم کیا جو کبھی ختم نہ ہوتا تھا۔ اوراد و وظائف دن رات بلا وقفہ جاری رہتے تھے۔ راہبوں کے ایک گروہ کے بعد دوسرا گروہ اُن حمدوں کو عیسیٰ، مریم اور عیسائی بزرگوں کی طرف لوٹاتے تھے'' (۹۶)

④ **جنونی تعذیب:** معاملہ وہاں تک محدود نہ رہا جس کا ذکر ہوا ہے بلکہ جیسا کہ بدعتوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر جنونی طرز عمل اور غیر فطری امور میں داخل ہو جاتی ہیں۔ بعض راہبوں نے بدعات کو اس لیے گھڑا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تا کہ وہ اپنی قوتِ ایمانی اور گہرے اخلاص کا اظہار کر سکیں۔ مؤرخین اس ضمن میں عجیب وغریب واقعات ذکر کرتے ہیں۔ وہ راہب **ماکاریوس** کے متعلق بتلاتے ہیں کہ وہ چھ ماہ ایک جوہڑ میں سویا رہا تا کہ اُس کے ننگے جسم کو زہریلی مکھیاں کاٹیں اور وہ ہمیشہ بھاری بھرکم لوہا اٹھائے رکھتا تھا۔ اس کا ساتھی راہب یوسیبیس دو بھاری بھرکم لوہے کے وزن اٹھاتا تھا۔۔۔ اور وہ ایک جاری کنویں پر تین سال کھڑا رہا۔۔۔ راہب یوحنا نے تین سال تک ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر عبادت کی، وہ اس مدت میں نہ سویا اور نہ بیٹھا۔ جب وہ بہت تھک جاتا تو ایک چٹان سے ٹیک لگا لیتا۔ بعض راہب مستقل کپڑے نہ پہنتے تھے، وہ اپنے لمبے بالوں سے ستر پوشی کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بل جانوروں کی طرح چلتے تھے۔ وہ اکثر درندوں کی غاروں، جاری کنوؤں اور قبرستانوں میں رہتے تھے۔ وہ اعضا دھونے سے اجتناب کرتے تھے مبادا گناہ ہو جائے۔ اُن کے ہاں سب سے زیادہ زاہد وہ تھا جو سب سے زیادہ صفائی ستھرائی سے دور ہو اور نجاستوں میں لت پت ہو۔ راہب **اتھینس** کہتا ہے: راہب انتھونی نے ساری زندگی دونوں پاؤں کے دھونے کا گناہ نہیں کیا۔ راہب ابراہیم نے اپنے چہرے اور پاؤں کو پچاس سال تک پانی نہ لگایا۔ کسی زمانے کا راہب **اسکندری** افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے: ہائے افسوس! ایک وقت تھا جب ہم چہرے کے دھونے کو حرام سمجھتے تھے اور اب ہم حماموں میں داخل ہوتے ہیں۔ (۹۷)

ایک خلوت گزیدہ راہب ایسا بھی تھا جس نے پرہیزگاری کا ایک نیا درجہ گھڑا۔ وہ اپنے آپ کو ایک تنگ غار میں ایک چٹان سے منسلک زنجیر کے ساتھ باندھے رکھتا تھا۔ (۹۸)

عیسائی بزرگ کو لبان کے کندھوں پر گلہریاں چلتی پھرتی تھیں، وہ اُس کی ٹوپی میں داخل ہوتیں اور نکل جاتیں (۹۹) اور وہ ساکن و جامد ٹھہرا رہتا۔

رہبانیت کے نتائج:

کائنات میں اللہ کی سنت ہے کہ جو اُصول یا نظام فطرتِ انسانی کے موافق نہیں ہوتا، اُس کا انجام خسارہ اور فنا ہوتا ہے۔ اُس کے پیروکار شقاوت اور تباہی سے دوچار ہوتے ہیں۔ انسان کی فطرت کے موافق دین، انسان کے خالق کے سوا کوئی نہیں لا سکتا۔ اسی وجہ سے انسان کے اپنے وضع کردہ مذہب نسل انسانی کے حق میں سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رہبانیت انسانی فطرت میں نہیں اور نہ یہ انسانی وجود کا مقصد ہے۔ بلکہ یہ انسانی فطرت کے منافی ہے۔ اِسی وجہ سے اللہ نے اِس کا حکم دیا اور نہ اِس کو مشروع قرار دیا۔

﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (الحدید۔ ۵۷/۲۷)

''ہاں رہبانیت (ترک دنیا) تو ان لوگوں نے از خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر اسے واجب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ کیا تھا سوائے اللہ کی رضا جوئی کے۔ سوانھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی''۔

یہ ان لوگوں کے حق میں بھی بدعت ہے جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنے نفس پر اِس کو لازم کرتے ہیں۔ پھر اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو فسق و فجور اور طلب دنیا کے لیے اس میں داخل ہو جائیں؟

آپ تاریخ مغرب کے عہد وسطیٰ کی کوئی کتاب اُٹھالیں، آپ کو وہ رہبانی زندگی کی خرابیوں اور عیوب سے بھری ہوئی ملے گی۔ اُس میں رُسوائیوں اور زنا کاریوں کی وہ تفصیل ملے گی جس کے مقابلے میں بعد والے ادوار کا فساد بھی شرما جائے۔

رئیس دیر کلونی کہتا ہے: بعض دینی پیشوا عبادت گاہوں کے اندر یا باہر کنواری مریم کے بیٹے کے ساتھ بے ہودہ سلوک کرتے ہیں۔ وہ یہ بے ہودگی ان گھروں میں بھی کرتے ہیں جو پرہیز گار مومنین نے عفت وطہارت کے لیے بنائے تھے۔ یہ گھر بے حیائی سے ایسے بھر گئے کہ مریم عذرا کو کوئی ایسا جگہ نہیں ملتی جہاں وہ عیسیٰ بچے کو رکھ سکے۔ (۱۰۰)

دین میں غلو، بے جا پرہیز گاری اور فطرت سلیم پر ناجائز مشقت نے بالکل الٹ نتائج پیش کیے۔ عبادت خانے فسق و فجور کے ایسے ٹھکانے بن گئے کہ لوگ ان کی مثالیں پیش کرتے۔ مشرق کے نصاریٰ حیا اور دین داری میں زیادہ مضبوط تھے لیکن ان کا حال یہاں تک پہنچ گیا کہ بے شرم، بے باک اور آوارہ لوگ عبادت خانوں کا ایسے رخ کرتے جیسے آج کل بدکار لوگ زنا خانوں کا رخ کرتے ہیں۔ انھوں نے اس ضمن میں کتابیں بھی لکھیں جن میں سے ایک ادب عربی پڑھنے والوں کے ہاں ''الدیارات'' کے نام سے معروف ہے۔ (۱۰۱)

یہ راہبوں کی صورت حال تھی، اِن کے مقابلے میں عام مسیحی فرد کا دین پر اعتماد مزید کمزور ہو گیا۔ اُن کے دلوں میں دینی اخلاق واقدار کمزور ہو کر رہ گئے۔ کیسے نہ رہتے جبکہ وہ دینی بادشاہت کے خواص اور طہارت کے عظیم نمونوں کو دیکھتے کہ وہ فجور میں غرق ہیں اور جسمانی لذتوں میں انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں۔ غیور مسیحی ان خرابیوں کی وجہ سے کلیسا سے الگ تھلگ ہو گئے اور انھوں نے اپنے نئے دینی فرقے بنا لیے جن کے خاص عبادت خانے تھے جو شروع شروع میں صاف ستھرے تھے۔ لیکن جلد ہی وہ بھی اُسی گندگی میں گر گئے جس میں اُن کے اسلاف گرے تھے۔ یہ سب کچھ اُس مرحلے میں تھا جب کلیسا کا قبضہ اور قوت مضبوط تھی لیکن بعد والے مرحلے میں اُس کی قوت کمزور ہو گئی اور کلیسا کی جکڑ بندیوں کے خلاف ایک زبردست ردِّ عمل سامنے آیا۔ یہ ردِّ عمل اباحی فلسفوں اور غیر اخلاقی تحریکیں پر مشتمل تھا جو ہر جگہ پھیل گیا۔ یہ رائے درست قرار پائی کہ مسیحیت ایک منظم نفاق ہے جیسا کہ عقل پرست ناقدین نے مختلف ادوار میں اُس پر تہمت لگائی۔ ''اکثر لوگوں کے ہاں مسیحیت ایک باریک پردے کے سوا کچھ نہیں جس کے نیچے زندگی کا خالص وثنی نظریہ چھپا ہے''۔ (۱۰۲)

یورپی نفسیات کی گہرائیوں میں رہبانیت کے باقی ماندہ ناکارہ اجزا پیوست رہے۔ چنانچہ جب یورپ میں دین کے اثرات زائل ہوئے، تو بالخصوص عورت اور جنس کے مسئلے میں جدید تباہ کن نظریات پیدا ہوئے۔ جیسے فرائیڈزم جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ اسرار مقدس

اللہ نے انسانی نفس کو ایمان بالغیب پر پیدا کیا ہے۔(۱۰۳)۔ وہ جس چیز کو ذاتی طور پر دریافت نہ کر سکے تو اس کی طرف گہرے شوق اور تجسّس کا اظہار کرتا ہے۔ انسان کے بہت سارے موضوعات اُس وقت تک پرکشش اور پسندیدہ ہوتے ہیں جب تک وہ مبہم اور مجہول ہوتے ہیں۔ جب وہ وجود میں سامنے آجاتے ہیں تو ان کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن انسانی نفس اکیلا یہ طاقت نہیں رکھتا کہ غیب اور حاضر میں خط فاصل تلاش کر سکے اور معلوم و مجہول کے مابین فاصلہ کر سکے۔ اُس کے لیے وحی الٰہی کی طرف رجوع ضروری ہوتا ہے۔ نامعلوم دنیا کو جاننے کا یہ واحد سلیم راستہ ہے لیکن لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور اسرار کو دیگر طریقوں سے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ وحی سے بے نیاز ہو کر غیب کی باتیں جاننے کی تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ شیطان اپنے کارندوں کے ذریعے سادہ لوح لوگوں کو کاہنوں، ساحروں اور شعبدہ بازوں کی طرف بھیجتا ہے۔ اس طرح بالآخر لوگ اُس شرک میں واقع ہو جاتے ہیں جس کی ہر قسم کو مٹانے کے لیے انبیا تشریف لائے۔

انسانیت اس غلطی میں قدیم دور سے واقع ہوئی اور قدیم وثنیات مخفی اسالیب، پیچیدہ رموز اور پراسرار باتوں سے بھر گئی۔ انبیا کے حقیقی پیروکاروں سے یہ بدترین غلطی ہوئی کہ انھوں نے بھی اِن اسرار و رموز میں سے کچھ چیزوں کو اپنے دین میں داخل کر دیا۔ یہی معاملہ مسیحیت کے ساتھ ہوا۔

محرف مسیحیت متعدد اسرار پر مشتمل ایک مذہب ہے جن میں بعض یونانی اسرار ہیں اور بعض بت پرست مذاہب سے ماخوذ۔ اسی طرح بعض اسرار پولس اول کے دیو مالائی دین سے منتقل ہوئے۔ ان اسرار میں سے بعض عقیدے سے متعلق ہیں جیسے تثلیث کا تصور۔ یہ مسیحیت کا سب سے بڑا اور سب سے خطرناک راز ہے۔ بعض عبادت کے امور اور رُسوم سے متعلق ہیں جیسے بپتسمہ اور عشائے ربانی، اعتراف گناہ اور مقدس زیتون، قریب الموت کے لیے آخری نماز وغیرہ۔ یہ سب مسیحی مذہب کے خفیہ اسرار ہیں۔

کلیسا اپنے غیر عقلی رسوم اور غیر فطری طور طریقوں کو یہ کہہ کر جائز بنانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہ اللہ کے مقدس راز ہیں۔ چنانچہ راز کا لفظ ایسا پردہ ہے جو تمام نقائص اور رسوائیوں کو چھپا لیتا ہے۔ یہ ایسا فوری اسلحہ ہے جو ہر اعتراض کا مقابلہ کرتا ہے۔

تثلیث کے راز پر پہلے گفتگو گزر چکی ہے، اب ہم عیسائی رسوم و رواج پر گفتگو کرتے ہیں۔ ہم ان میں سے فقط ایک رسم یعنی عشائے ربانی پر مناقشہ کریں گے تاکہ اس کے ذریعے باقی مسیحی اسرار کو سمجھا جا سکے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عشائے ربانی:

عشائے ربانی مسیحی رسوم میں ایک اہم عمل ہے۔ اِس کا نام مقدس قربانی بھی رکھا جاتا ہے۔ اِس کی مشروعیت کی اصل انجیل متی میں وارد ہوئی ہے۔ انجیل متی کے الفاظ ہیں: ''وہ جو کچھ کھا رہے تھے تو یسوع نے روٹی پکڑی۔ برکت کی دعا کی۔ اس کے ٹکڑے کیے اور شاگردوں کو دیا اور کہا: لو کھاؤ، یہ میرا جسم ہے اور گلاس پکڑا اور شکر کے کلمات کہے اور ان کو دیا اور کہا: پیو تم سب اس سے، کیونکہ یہ میرا خون ہے عہد جدید کے لیے، یہ بہت سارے لوگوں کے لیے بہایا جائے گا تا کہ ان کی غلطیاں معاف ہوں''۔ (۱۰۴)

انجیل یوحنا عشائے ربانی کا بعینہ ذکر نہیں کرتی لیکن وہ اصحاح سادس میں یہ ذکر کرتی ہے کہ یہود نے مسیح سے کوئی معجزہ طلب کیا جیسے ان کے اجداد پر اللہ نے روٹی نازل کی تھی۔ تو مسیح علیہ السلام نے ان سے کہا: ''میں ہی زندگی کی روٹی ہوں۔ جو مجھے قبول کرے گا وہ بھوکا نہ رہے گا اور جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ پیاسا نہ ہوگا'' جب انھوں نے اس بات سے یہود کی دہشت دیکھی تو مزید تاکید میں یہ کہا: میں تم سے سچی سچی بات کہہ رہا ہوں: اگر تم ابن انسان کا گوشت نہ کھاؤ گے اور اس کا خون نہ پیو گے تو تمھارے لیے زندگی نہ ہوگی، جو میرا جسم کھائے گا اور میرا خون پیے گا اس کے لیے ابدی زندگی ہے۔ میں اسے آخری دن کھڑا کروں گا، کیونکہ میرا جسم سچا کھانا ہے اور میرا خون سچا مشروب ہے۔ جو میرا جسم کھائے گا اور میرا خون پیے گا، وہ مجھ میں ثابت ہوگا اور میں اس میں۔ (۱۰۵)

دیگر عقل پرست ناقدین کی طرح گوستاف لوبون کا بھی خیال ہے کہ نصرانی شعائر، جن میں سے ایک عشائے ربانی ہے، بت پرست خرافات سے منقول بدعت ہے۔ (۱۰۶) اُس کا خیال ہے کہ پولس (شاؤل یہودی) بت پرست خرافات پر یقین رکھتا تھا یا کم از کم ان سے متاثر تھا۔ بت پرستانہ شعائر میں مقدس بچھڑے کی قربانی شامل تھی۔ (۱۰۷)۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پولس بہ کثرت اپنے رسائل میں جسد مسیح (علیہ السلام) اور اُس کا پیروکاروں میں حلول ہونے کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ اصحاح نمبر ۱۱ میں وارد ہے جو پولس کا پہلا خط ہے جو اہل کارنیتوس کی طرف لکھا گیا۔ (۱۰۸)۔ اس میں متی کے سابق کلام کے مشابہ کلام ہے اور یہ اضافہ بھی شامل ہے کہ یہ اُس رات ہوا تھا جس رات مسیح علیہ السلام کو دشمنوں کے سپرد کیا گیا۔ سماجیات کا جدید علم عشائے ربانی کی فکر کو قدیم اصل کی طرف لوٹاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو اُن کی اصطلاح کے مطابق طوطم کے نام سے معروف ہے۔ یہ ایک پیچیدہ نظام ہے جو قبیلے کے مابین تعلق و قربت کو قائم کرتا ہے۔ طوطم ایک حیوان یا پودا ہوتا ہے جس کا شکار اور کھانا خاص مواقع کے علاوہ حرام ہوتا ہے۔ قبائل کے معتقدین کا وہم ہوتا ہے کہ طوطم کھانے سے کچھ بہترین صفات حاصل ہو جاتی ہیں۔ وہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ طوطم کا خون خاص خاص مواقع پر تناول کرنے سے ان کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ (۱۰۹)

خواہ جو بھی حالت ہو، اوّلین مسیحی ایک تہوار عید فصح کے نام سے منعقد کرتے تھے جس میں خاص طور پر روٹی اور شراب کا اہتمام ہوتا۔ یہ روٹی اور شراب مسیح علیہ السلام کے خون اور جسم کی علامت سمجھی جاتی۔ یہ عید مسیح علیہ السلام کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موت کی یاد میں منائی جاتی۔ جیسا کہ پولس کی روایت کے مطابق اس نے وصیت کی تھی (یہ کام میری یاد کے لیے کرو) اتنا کافی تھا کہ یہ بدعت یہیں ٹھہر جاتی لیکن کلیسا اپنی عادت کے مطابق تحریف، سوئے فہم اور حقیقت ومجاز کو خلط ملط کرنے کا عادی تھا۔ اُس نے اِس معروف عقیدہ میں یہ اضافہ کیا کہ تحوّل و استحالہ کا عقیدہ بھی شامل کر دیا یعنی یہ عقیدہ کہ عشائے ربانی کو کھانے والے حقیقی طور پر مسیح علیہ السلام کے جسم کو کھاتے ہیں اور حقیقی طور پر ان کے خون کو پیتے ہیں۔ شراب اور روٹی مسیح علیہ السلام کے جسم اور خون میں کیسے بدل جاتی ہے تو یہ ایک راز ہے جس کے بارے میں سوال کرنا کسی کے لیے جائز نہیں، وگرنہ وہ دینی بادشاہت سے محروم ہو جائے گا اور دھتکار دیا جائے گا۔

ظاہر ہے استحالہ ایسا عقیدہ ہے کہ عقل اس کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے گی کیونکہ کوئی عقل سلیم طاقت نہیں رکھتی کہ وہ روٹی اور شراب کو گوشت اور خون میں تبدیل ہونے کا تصور کرے جبکہ کھانے والے عام روٹی اور شراب کا ذائقہ چکھ رہے ہوں۔ پھر مسیح کا جسم ایک ہے اور عشا کے دسترخوان ہر سال مختلف مقام پر ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ تو مسیح علیہ السلام کا خون اور جسم ان سب پر کیسے تقسیم ہو سکتا ہے؟!

کلیسا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ عشائے ربانی کا مقصد یہ ہے کہ مسیح کھانے والوں کے جسم میں داخل ہو جائے اور وہ بھی اُلوہیت سے لطف اندوز ہوں۔ تو کیا یہ مقصد فقط ایک عقیدہ رکھنے سے پورا ہو جاتا ہے۔ اِس رسم کا کیا فائدہ ہوگا بلکہ رسم کے پس پردہ مقصد کے حصول سے کیا فائدہ ہوگا۔

یقیناً کلیسا نے اپنے پیروکاروں کی سادگی اور جہالت کو استعمال کیا اور اُن پر اس قسم کے عجیب وغریب مرکب عقائد لاگو کر دیے۔ لیکن بشری فطرت یقیناً جاگتی ہے چاہے جتنا عرصہ سوئی رہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب کلیسا نے انسانی عقل اور فطرت کے ساتھ حد درجہ دشمنی کا سلوک کیا تو اس کے خلاف انتقام بھی اسی شدت سے پیدا ہوا۔ کلیسا کے خلاف انقلاب کی ابتدا اُس وقت ہوئی جب یورپ نے پہلی بار اسلام کے نور کا مشاہدہ کیا۔ بالآخر پچھلی صدی میں کلیسا کے مکمل انہدام کے ساتھ انقلاب کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

استحالہ کا مسئلہ ان محاذوں میں سے ایک ہے جو کلیسا کے خلاف کھولا گیا اور کلیسا اس کو بند کرنے کی طاقت نہ رکھ سکا۔ اس من گھڑت عقیدے پر مؤرخین اور مفکرین نے بڑی کڑی تنقید کی۔ اس کے اولین منکرین میں ''ویکلف'' نامی کلیسا کا مصلح تھا (۱۱۰)۔ پھر اس کو پروٹسٹنٹ تحریک نے ہدف تنقید بنایا جس کی قیادت ''مارٹن لوتھر'' نے کی۔ پھر اس کے بعد عقل پرست ناقدین پیدا ہوئے جنھوں نے ان سب باتوں کا سب سے زیادہ مذاق اڑایا۔ ان کے اکابرین میں فرانسیسی فلسفی "والٹیئر" تھا۔ (۱۱۱)

معاصر محققین میں سے ایک عشائے ربانی کے متعلق کہتا ہے: ''متاخر دور میں حقائق کو خراب کرنے یا حقائق پر اضافہ کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں، بعض مؤرخین کے نزدیک اس کی بہترین مثال عشائے ربانی کی رسم ہے''۔ (۱۱۲)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

④ تصویروں اور مورتیوں کی عبادت

نصرانیت نے اڑوس پڑوس کی وثنیات اور مذاہب سے عقیدہ، شریعت اور شعائر کی تمام اقسام میں استفادے کیے۔ اسی طرح ذوق، وجدان اور عام مظاہر پر وثنی اثرات نظر آتے ہیں۔ محرف مسیحیت کا کوئی عقیدہ یا رسم ایسی نہیں جس پر بت پرستی کے واضح نشانات نہ ہوں۔ اس کی بہترین مثال مورتیوں اور تصویروں کا استعمال ہے۔ کوئی عبادت خانہ یا کلیسا ایسا نہیں جو ان سے خالی ہو حالانکہ تورات کی شریعت نے تصاویر اور مورتیاں گھڑنے کو حرام قرار دیا اور اس کو وثنی اعمال میں سے شمار کیا ہے۔ (سفر التثنیہ)

تصویروں اور مورتیوں کی عبادت، دیگر بدعات کی طرح، پہلے پہل محدود دائرے میں ظاہر ہوئی۔ پھر بتدریج اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور یہ ہر طرف پھیل گئی۔ لیکن یہ عین دین میں رسمی طور پر اُس وقت داخل ہوئی جب نیقیہ کی دوسری مجلس منعقد ہوئی جیسا کہ نیچے آ رہا ہے:

ول ڈیورانٹ کہتا ہے: ''کلیسا شروع شروع میں تصویروں اور مورتیوں کو ناپسند کرتا تھا اور اس کو وثنیت کے بچے کھچے اثرات شمار کرتا تھا۔ وہ وثنی مجسمہ سازی کو بھی کراہت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن جب مسیحیت قسطنطین کے عہد میں غالب آ گئی تو ماحول، روایات اور یونانی مورتیوں کے اثرات کے تحت اُس نے وثنی افکار کے ساتھ تعارض مدھم کر دیا۔ اور جب عیسائی اولیا و بزرگان معبودین کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی تو ان کی معرفت اور یادداشت کی ضرورت پیش آئی تو ان کے لیے مریم عذرا کی کئی تصویریں بنائی گئیں۔ لوگ ان تصویروں کی صرف اس لیے تعظیم نہ کرتے تھے کہ یہ مسیح کی شبیہ یا تمثیل ہیں بلکہ انھوں نے اس کے ساتھ ساتھ صلیب کی لکڑی کی تعظیم بھی شروع کر دی۔ حتی کہ صلیب سادہ عقل والوں کے ہاں ایک طلسم تھا جو عجیب ساحری قوت کا حامل تھا''۔

عوام نے فطرت کی لگام کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آثار، تصاویر اور مجسموں کو معبودان کی حد تک پہنچا دیا۔ لوگ ان کو سجدہ کرتے اور بوسہ دیتے۔ وہ شمعیں جلاتے، خوشبوئیں سلگاتے، ہار پہناتے اور ان کی مخفی تاثیر سے معجزات طلب کرتے۔

اُن یونانی شہروں میں جہاں کلیسا کے مذہب کو ایک خاص طریقے سے قبول کیا گیا، ہر جگہ مقدس تصویریں عام نظر آئیں گی۔ کلیسا، عبادت خانے، گھربار، دکانیں حتی کہ گھریلو ساز و سامان اور زیورات، ملبوسات بھی اس سے خالی نظر نہ آئیں گے۔ وہ شہر جہاں وباؤں، بھوک، اور جنگ کا خطرہ ہوتا تھا وہ ان مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے پاس موجود دینی آثار کی قوت پر اعتماد کرتے یا تصویروں میں نظر آنے والے اولیا اور بزرگان پر۔ (۱۱۳)

مسیحیت کی ابتدائی صدیوں کی یہ صورت حال تھی۔ لیکن جب آٹھویں صدی میں عظیم اسلامی پھیلاؤ ہوا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اوراس نے بہت سارے آباد علاقوں کو اپنی خالص توحیدی تعلیمات کے ساتھ گھیر لیا تو اردگرد کے دینی ماحول خصوصاً نصرانی روی سلطنت پر بڑا گہرا اثر پڑا۔ مغرب کے لوگوں نے اپنے عقائد کی کمزوری اور اپنی گھسی پٹی فکر کو محسوس کیا، وہ مسلمانوں کے خالص عقیدے اور بلند و بالا تہذیب کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔

اسی وجہ سے مغرب میں تاریخ کے مختلف وقفوں میں اس بدعت کے خلاف دشمن تحریکیں کھڑی ہوئیں۔ جن میں مشہور یہ ہیں: شہنشاہ لیوثالث نے ایک سرکاری حکم صادر کیا کہ تصویروں کو مٹا دیا جائے اور مجسموں کو ختم کر دیا جائے۔ اس نے کوشش کی کہ اپنی قوم اور اپنے دین کے اس دھبے کو دور کرے جو اس کے دشمن مسلمانوں کے سامنے عیب کا مظہر تھا۔ لیکن کلیسا نے اس سے انکار کر دیا۔ کلیسا اور عوام بھڑک اٹھے، انھوں نے اس کو ختم کرنے سے انکار کر دیا اور دوسرا شہنشاہ مقرر کرنے کا مطالبہ کیا۔

تحریک ختم نہ ہوئی بلکہ اس کے شعلے زیادہ بھڑکنے لگے۔ چنانچہ مغرب کے اساقفہ کی مجلس جمع ہوئی، جس کو پوپ گریگوری ثانی نے بلایا اور تصویروں و مورتیوں کو ختم کرنے والوں پر لعنت کی گئی۔ (۱۱۴)

اس کی اولاد کے عہد میں کشمکش دوبارہ پیدا ہوگئی اور اس مسئلے کی حلت و حرمت میں مناقشہ ہونے لگا۔ ملکہ شہنشاہ ''ابرینی'' جو مامون الرشید کی ہم عصر تھی، نے مسیحی دنیا کے دینی پیشواؤں کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلے کی تحقیق کے لیے عام مجلس منعقد کریں اور ایک مضبوط قرارداد منظور کریں۔ چنانچہ ۷۸۷ء میں نیقیہ کی دوسری مجلس جمع ہوئی۔ ۳۵۰ اسقف حاضر ہوئے اور نیچے والی قرارداد منظور ہوئی:

ہم سب یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ تصاویر نہ صرف کلیساؤں، مقدس عمارتوں اور کہنوتی لباس میں ظاہر ہوں بلکہ گھروں، دیواروں اور راستوں میں بھی موجود ہوں، کیونکہ جب ہم اپنے رب یسوع مسیح کا لمبا مشاہدہ کریں گے اور اس کی بزرگ والدہ، رسولوں اور باقی اولیا کی تصاویر کو دیکھیں گے، تو ہم ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کریں گے اور ان کی عزت کریں گے۔ لہٰذا واجب ہے کہ ہم ان تصویروں کو عزت و احترام کا سلام پیش کریں، نہ کہ عبادت کریں جو کہ فقط الٰہی طبیعت کے ہی لائق ہے۔ (۱۱۵)

اسی طرح سے کلیسا کی وثنیت ایک لمبے زمانے تک اس کے معارضین کے افکار پر غالب آ گئی۔ یہ گمان کیا گیا کہ عبادت تو فقط رکوع و سجدہ ہوتی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔

اُس کے بعد تقریباً تین صدیوں تک، وثنی مغرب مسلم مشرق سے صلیبی جنگوں کی وساطت سے مضبوط رابطے میں رہا۔ یہ ایک طاقتور عامل تھا جو مورتیوں اور تصویروں کی عبادت کے لیے تحریکیں کھڑا کرتا رہا اور کئی کلیسائی مصلحین آواز اٹھاتے رہے۔ اصلاحی تحریک کے اٹھتے ہی پروٹسٹنٹ نے تصویروں اور مورتیوں پر جنگ کھڑی کر دی۔ پروٹسٹنٹ کلیساؤں نے تصاویر اور مورتیوں کو ناجائز قرار دیا لیکن کیتھولک ازم اُن کی تقدیس پر مصر رہا اور ان کے ختم کرنے والوں پر لعنت کرتا رہا۔

شاید آج کا انسان دہشت زدہ ہو جائے جب اُسے پتہ چلے کہ تصویروں کی تقدیس کی عام مغربی روایت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آج بھی موجود ہے اور صرف دینی لوگوں میں نہیں بلکہ عام لوگوں میں بھی ہے حتی کہ بعض تعلیم یافتہ لوگ بھی اس سے اجتناب نہیں کرتے۔(۱۱۶)

مسیح اور اس کی ماں کی تصویریں اس درجہ گراوٹ کا شکار ہوئیں کہ سینمائی فلموں میں دکھائی گئیں۔ بے شرمی اور بے ہودگی کی حد ہوگئی جب سویڈن کی ایک کمپنی نے ۱۳۹۷ھ میں ایک فلم نکالی جو مسیح کی جنسی زندگی کے متعلق تھی۔ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مغربی ممالک نے اس شریر فعل کے مقابلے میں خاموشی اختیار کی جبکہ بعض اسلامی تنظیموں نے اس فلم کو روکنے کی آواز اٹھائی۔

معاملہ صرف مسیح اور اس کی ماں تک محدود نہیں بلکہ کلیسا باری تعالیٰ پر جرأت کرتا ہے اور اُس کی تصویریں بناتا ہے جیسے مخلوق کی تصویر بنائی جاتی ہے۔ تعالی اللہ عن ذالك علوا كبيراً

استاذ ناصر الدین ڈینیہ کہتے ہیں:

''دین اسلامی وہ واحد دین ہے جس میں الٰہ کی نہ کوئی انسانی شکل ہے اور نہ کوئی دوسری شکل۔ لیکن مسیحیت میں لفظ اللہ ایک آدمی کی تصویر پر مشتمل ہے جو کہ ایک ضعیف بوڑھے کی ہے۔ اُس پر بزرگی، بڑھاپے اور کمزوری کی تمام علامات نمایاں ہیں۔ چہرے کی جھریاں گہری ہیں اور سفید داڑھی لٹکی ہوئی ہے جس سے دل میں موت اور فنا کی یاد پیدا ہوتی ہے۔ ہم لوگوں کو سنتے ہیں جو چیختے ہیں کہ ''اللہ کو زندہ رہنا چاہیے'' تو اس میں کوئی عجیب بات نہیں۔ ہم ان کی چیخ و پکار پر تعجب نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ابدی دائمی رمز کو ایک بوڑھے شیخ کی شکل میں دیکھتے ہیں جو رذیل ترین عمر کو پہنچ چکا ہوتا ہے۔ وہ اُس پر ہلاکت و فنا سے کیوں نہ ڈریں اور اُس کے لیے حیات کا مطالبہ کیوں نہ کریں؟ اسی طرح سے یہودیوں کا ''یاہو'' ہے جو اُن کے ہاں توحید کی ایک تمثیل ہے، وہ بھی اُس کو ایسی ہی ہلاکت خیز شکل میں پیش کرتے ہیں، آپ اس کو ویٹی کن کے عجائب گھر اور اناجیل کے قدیم تصویر شدہ نسخوں میں دیکھ سکتے ہیں۔(۱۱۷)

یہ معاملہ ہے۔ الٰہ کی تصویر کلیسا کی نظر میں انحراف نہیں۔ ان کے علما میں سے ایک تاکید سے کہتا ہے۔

''یہ ممکن نہیں کہ ہم اللہ کو بشری صورتوں کے علاوہ کسی طریقے سے سمجھ سکیں''(۱۱۸)

ہم اس کے بعد یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سادہ وثنیت نے مغربی تعلیم یافتہ انسان کے دل میں کیا کچھ پیدا کیا ہوگا۔ وہ دین سے کتنا متنفر ہوا ہوگا اور 'علم و معرفت' کے لباس میں چھپے الحادی افکار کا کتنا شکار ہوا ہوگا؟

یہ بات باقی ہے کہ بت پرستی سے اخذ و استفادہ میں فقط تصویروں اور مورتیوں کا ہی اضافہ نہ ہوا بلکہ یورپ کی وحشی قومیں نصرانیت میں اس حال میں داخل ہوئیں کہ وہ نام کے نصرانی تھے لیکن عقائد و روایات کے اعتبار سے پرانے بت پرست ہی تھے۔ کلیسا اُن سے اس لیے چشم پوشی کرتا تھا کہ وہ فرماں برداری پر راضی ہو گئے اور مقرر ٹیکس ادا کرنے لگے۔ کلیسا کا ہدف لوگوں کی ہدایت نہ تھی بلکہ اپنی بادشاہت اور اقتدار کو پھیلانا تھا خصوصاً جبکہ کلیسائی نظام بذات خود ہدایت یافتہ نہ تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

⑤ معجزات اور خرافات

محرف مسیحیت کی بہت ساری تعلیمات فطرت اور بدیہی فکر کے خلاف ہیں جس کی وجہ سے اُس کو عقلی و منطقی دلیل کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چونکہ کلیسا دلائل میں کمزور ہے اس لیے وہ اس کمی کو خوارق اور معجزات کے ذریعے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ ضعیف اور سادہ عقل والوں کو متاثر کر سکے۔ کلیسا کے خوارق خوف ناک خوابوں، غیب اور مستقبل کی خبر دینے اور سخت امراض کی شفا کے لیے مختلف حربے اختیار کرنے سے متعلق تھے۔ اِس کے ساتھ دیگر اُمور بھی چلتے رہتے جیسے تعویذ لٹکانا، دَم کرنا، مجہول کلمات بڑبڑانا، صلیب کا اشارہ، عیسائی اولیا کی تصویریں لٹکانا، شیاطین سے مقابلہ، شریر روحوں کو بھگانا، مصائب اور وباؤں کو روکنا اور جنگوں میں نصرت طلب کرنا وغیرہ۔

وحشی یورپی عقلیت نے با آسانی اِن کمزور باتوں کو قبول کر لیا اور کلیسا وثنی وراثت کے سبب ہر اُس چیز کی تصدیق کرتا چلا جو اس کی گہرائیوں میں پہلے سے داخل ہو چکی تھی۔

مسیحیت کے قرونِ اولیٰ میں اکثر معجزات مسیح علیہ السلام، اُس کی ماں اور کچھ رسولوں و تلامیذ کے گرد گھومتے تھے۔ لیکن کلیسا نے خدائی حقیقی معجزات پر اکتفا نہ کیا بلکہ دیگر خوارق کو بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ وہ خوف ناک اوہام تھے جن پر قدیم وثنی اساطیر کی علامات نمایاں تھیں اور جن کو یونانی شعرا اپنے خیالات میں پیش کرتے رہتے تھے۔

ہم اس کی ایک مثال (ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام) سے پیش کرتے ہیں۔ یوحنا نے خواب کے ۱۲ ویں اصحاح میں تصویر کشی کی ہے: ''آسمان میں ایک عظیم نشانی ظاہر ہوتی ہے جو کہ ایک عورت ہے جو سورج و چاند کی شلوار اوڑھے ہوئے ہے۔ اس کے پاؤں اور سر کے پاس ۱۲ ستاروں کا ایک تاج ہے۔ وہ حاملہ ہے اور دردِ زہ سے چیختی ہے۔ پھر ایک اور معجزہ آسمان میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سرخ رنگ کا ایک عظیم سانپ ہے جس کے سات سر اور دس مینڈھیاں ہیں۔ اُن سروں پر سات تاج ہیں اور اس کی دُم آسمانوں کے ایک تہائی ستاروں کو گھسیٹ رہی ہے۔ اس نے ان کو زمین پر پھینکا۔ سانپ ولادت کے لیے تیار عورت کے سامنے تھا تاکہ ولادت ہوتے ہی وہ اس کے بچے کو نگل جائے۔ عورت نے ایک مذکر بچہ جنا جو تمام امتوں کو اپنے لوہے کے ڈنڈے کے ساتھ ہانکے گا۔ اُس نے بچے کو اچکا اور اللہ کے پاس اس کے عرش کی طرف لے گیا۔ عورت خشکی کی طرف بھاگی جہاں اللہ نے اس کے لیے ایک جگہ تیار کر رکھی تھی تاکہ وہ اس کی نگہداشت دو ہزار دو سو ساٹھ دن تک کرے۔ آسمان میں جنگ چھڑ گئی، میکائیل اور اس کے فرشتے، سانپ اور اس کے فرشتوں سے لڑ پڑے''

پطرس کا رسالہ (اعمال الرسل) اس معجزہ کو اس طرح سے بیان کرتا ہے: ''پطرس چھت پر چڑھا تاکہ چھ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بجے نماز پڑھے۔ وہ بہت بھوک محسوس کرنے لگا۔ اس دوران لوگ اس کے لیے کھانا تیار کرنے لگے کہ اس پر ایک غیب واقع ہونے لگا۔ اس نے آسمان کو کھلا دیکھا اور ایک برتن اُس پر نازل ہونے لگا جیسے ایک عظیم تھال ہو جس کے چاروں کونے مربوط تھے، جو زمین کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اُس میں ہر قسم کے زمین کے جانور، وحشی جانور، رینگنے والے جانور اور آسمان کے پرندے تھے"۔ (۱۲۰)

لیکن آنے والے دور میں معجزات کا دائرہ اس قدر پھیل گیا کہ دینی پیشوائیت کا مقام و تقدس اُن کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے خوارق کے مرہونِ منّت ہو گیا۔ وہ اپنے منصب میں ترقی کے لیے ایسے اعمال بجالاتا جن کی علت سادہ عقل لوگوں پر مخفی ہوتی۔ وہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ یہ روح القدس کی طرف سے اُس کے لیے تحفہ ہے۔ تاریخ ذکر کرتی ہے کہ شہنشاہ شارلیمان اور اس کے درباری گھبرا گئے جب رشید نے اس کو ایک گھڑی کا تحفہ بھیجا۔ اُن کا گمان تھا کہ شاید یہ کوئی خفیہ جن یا شیطان کی قوت ہے۔ یہ شہنشاہ کی حالت تھی تو عام کسانوں اور چرواہوں کا کیا حال ہوگا؟

اس کے تاریخی شواہد اس قدر زیادہ ہیں کہ ہم قرونِ وسطیٰ سے ہٹ کر جدید دور میں بھی اس کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ کلیسا کے بہت سارے خرافات ابھی تک مغربی دنیا میں موجود ہیں۔ فریزر کہتا ہے: "فرانس میں اکثر کسان یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پادری عناصر پر ایسی خفیہ قوت رکھتا ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور جب وہ خاص درود پڑھتا ہے جو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی پڑھ سکتا ہے تو وہ کچھ وقت کے لیے طبعی دنیا کے قوانین باطل کر دیتا ہے یا مکمل طور پر الٹ سکتا ہے"۔

دیگر علاقوں میں لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ پادری آندھیوں کو بکھیرنے پر قدرت کا مالک ہے، اگرچہ یہ ملکہ ہر پادری کو حاصل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے جب بعض بستیوں میں کلیسا کا نگران بدلتا ہے تو ابرشیہ (پادری کے زیر انتظام علاقے) کے پیروکار اپنا شوق ظاہر کرتے ہیں کہ نئے نگران کے بارے میں جانیں کہ وہ کس قدرت کا مالک ہے؟ اسی وجہ سے جب ہلکی سی آندھی ظاہر ہوتی ہے تو وہ اُس کے سامنے جھک جاتے ہیں اور اس کا امتحان لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اُس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ گہرے بادلوں کے مقابلے میں بعض شعائر اور تراتیل بجالائے۔ جب اُن کی امیدوں کے مطابق نتائج سامنے آجاتے ہیں تو نئے نگران کو کلیسا کے پیروکاروں کی طرف سے ہمدردی و احترام میسر آجاتا ہے۔ (۱۲۱)۔ وگرنہ اس کے الٹ ہوتا ہے۔

کچھ خاص وظائف ایسے بھی ہیں جن کو پادری اپنے انتقامی اعمال میں استعمال کرتے ہیں اُن کے بارے میں فریزر گفتگو کرتا ہے: "یہ خاص وظیفے صرف گرے ہوئے یا متروک کلیسا میں قائم کیے جاتے ہیں جہاں الّو بولتے ہیں اور چمگادڑ شام کے دھندلکے میں آوارہ پھرتے ہیں اور اجڈ قوم کے گروہ رات میں وہاں بسیرا کرتے ہیں۔ وہاں رات کو شریر پادری اپنی بے حیا معشوقہ کے ساتھ آتا۔ جب گھڑی رات کا ۱۱ بجے کا گھنٹہ بجاتی تو وہ وظیفہ آخری حصے سے شروع کی طرف پڑھا جاتا۔ پادری اُس وقت فارغ ہوتا ہے جب گھڑی آدھی رات کا اعلان کرتی ہے۔ اُس کی معشوقہ اُس کی مدد کرتی۔ وہ جس قربانی کو پیش کرتا، اُس کا سیاہ رنگ کا ہونا ضروری ہوتا۔ اسی طرح وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبیذ نہیں پی سکتا بلکہ اس کے بدلے وہ کنویں سے کچھ پانی پی سکتا ہے جس میں ایسے بچے کا جسم ڈالا گیا ہو جو تبسمہ سے پہلے فوت ہو گیا ہو۔ پھر وہ صلیب کی علامت لگا تا لیکن زمین پر اپنے بائیں پاؤں کے پاس۔ وہ کئی دوسرے کام بھی کرتا جن کو کوئی بھی مسیحی دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا الا یہ کہ وہ باقی ساری زندگی کے لیے اندھا، بہرہ اور گونگا بننے کے لیے تیار ہو جائے''۔ (۱۲۲)

۱۸۹۳ء میں جزیرہ صقلیہ کے اندر ایک ایسا واقعہ ہوا جو پادریوں کی عوامی حاجت روائی کی حقیقت پر بہترین مثال بنا۔ یہ جزیرہ خشک سالی کے سبب ایک خوف ناک صورت حال سے دوچار تھا۔ خشک سالی مسلسل چھے ماہ سے جاری تھی اور خوراک کی مقدار تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ لوگوں کو شدید گھبراہٹ لاحق ہوئی اور انھوں نے بارش کے لیے ہر ممکن معروف تجربہ آزما ڈالا۔ وہ گروہ در گروہ گھروں سے نکلے اور تصویروں و مورتیوں کو گھیر لیا۔ وہ درود پڑھنے کے ساتھ ان کو وسیلہ بنانے لگے۔ کلیساؤں میں دن رات شمعیں جلائی گئیں، درختوں پر کھجوروں کی شاخیں لٹکائی گئیں جن کے بارے میں ان کو معلوم تھا کہ ان چھڑیوں میں سے کسی ایک میں خصوصی برکت ہے۔ (۱۲۳) انھوں نے کھیتوں میں وہ مٹی ڈالی جو کلیسا میں جھاڑو دیتے وقت اکٹھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بے سود رہا۔ انھوں نے اپنے بچے اپنے کندھوں پر اٹھائے اور ننگے پاؤں، ننگے سر اور ایک دوسرے کو کوڑے مارتے ہوئے چلے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

آخر کار وہ بزرگان اور اولیا کی طرف مجبور ہوئے اور عیسائی بزرگ فرانسس کے گرد جمع ہو گئے جس کے بارے میں اُن کا عقیدہ تھا کہ اس کی برکت سے بارش حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے اس کے لیے صلوات، ورد و درود پڑھے لیکن اُن کی سب کوششیں رائیگاں ہوئیں۔ آخر انھوں نے اکثر اولیا کی تصاویر کو پھینک دیا اور بزرگ یوسف کو ایک باغ میں ڈال دیا تا کہ وہ بذات خود لوگوں کی حالت کا تجربہ کرے۔ انھوں نے قسم اٹھائی کہ وہ اس کو دھوپ میں کھڑا رکھیں گے جب تک بارش نہ ہو جائے۔ انھوں نے بعض بزرگان کے چہرے دیوار کی طرف پھیر دیے جیسے استاذ نافرمان شاگرد کے ساتھ کرتے ہیں۔ بعض کے قابل فخر لباس اتار دیے اور ان کو بدترین گالی گلوچ دی۔ قدیس میخائل جو اُن کے عقیدے کے مطابق فرشتوں کا سردار ہے، کے سنہری پر نوچ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور اُس کی جگہ چاندی کے پر لگا دیے۔ بعض علاقوں میں لوگوں نے مقامی پادری کو قید کیا اور ننگا چھوڑ دیا۔ (۱۲۴)

مغرب میں آج بھی بڑی عجیب و غریب باتیں مشہور ہیں، جن کی بنیاد میں کلیسا کی خرافات ہیں۔ جیسے ۱۳ کے عدد کو منحوس سمجھنا۔ اِس کی بنیاد یہ ہے کہ یہوذا جس نے رومی حکام کو مسیح علیہ السلام کی خبر دی تھی وہ مسیح کا تیرہواں شاگرد تھا تو یہ عدد کلیسا اور اس کے پیروکاروں کے لیے نحوست کا سبب بن گیا۔ حتیٰ کہ جب مغربی شہروں میں گھروں کی گنتی لگائی جاتی ہے تو بعض اس عدد کو گھر پر لگانے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کی جگہ ۱۲ ب لگواتے ہیں۔

یہ کلیسا کی خرافات ہیں جو کائنات و زندگی کے موضوع سے ہٹ کر ہیں۔ کائنات و زندگی کی خرافات کا تذکرہ علم کے سیکولرزم میں آئے گا۔ وہاں بیان ہوگا کہ ان خرافات کا علم و دین اور وحی و عقل کی باہمی کشمکش پر کیا اثر واقع ہوا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

⑥ بخشش کے پروانے

کلیسا کے عجیب وغریب تصرفات اور گمراہ کن بدعات نے ایسی خرابیاں پیدا کیں جن کی مثال تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔ جس شخص کے پاس معمولی سی بھی عقل ہو یا ایمان کا ذرہ ہو وہ ایسی حرکات نہیں کرسکتا جو کلیسا نے اختیار کیں۔ کلیسا نے جنت کی تقسیم اور اُس کے ساز وسامان کو اعلانیہ طور پر فروخت کرنا شروع کردیا۔ خریداروں کے لیے معاہدے لکھے جاتے جن میں کلیسا ضمانت دیتا کہ خریدار کے لیے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کردیے گئے ہیں۔ وہ اُن کو ہر سابقہ اور لاحقہ جرم سے بری قرار دیتے اور عذاب سے نجات کی خوش خبری دیتے۔ جب خریدار بخشش کا پروانہ حاصل کرکے اپنے بستے میں سنبھال لیتا تو اس کے لیے ہر پابندی حلال ہو جاتی اور ہر حرام مباح ہو جاتا۔ بخشش کے پروانے کی موجودگی میں اسے کیا پروا ہوسکتی اگر وہ زنا، چوری یا قتل کرے بلکہ گستاخی، الحاد یا کفر کا ارتکاب کرے، جبکہ پروانہ مسیح علیہ السلام کی طرف سے عطا کردہ ہو۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ مسیح خود بخشش عطا کرے اور خود گناہوں کا محاسبہ کرے۔

جب خریدار اس درجہ مطمئن ہو جائے کہ اس کی خوشی کو کوئی چیز مکدر نہ کرسکے اور اس کی مسرت کو کوئی چیز مدھم نہ کرسکے تو اُسے اِس کے سوا اور کیا فکر ہوسکتی کہ وہ اپنے والدین اور اقربا کے لیے بھی جلد از جلد پروانے حاصل کرے۔

لیکن نرم دل کلیسا تمام مسیحیوں کو اپنی رحمت کے ساتھ گھیر لیتا ہے اور اُن کی خوشی کی تکمیل کرتا ہے۔ چنانچہ اُس نے مباح قرار دیا کہ جو دوسروں کے لیے بخشش کے پروانے خریدنا چاہے، وہ خرید سکتا ہے۔ اُس پر فقط یہ لازم ہوگا کہ قیمت ادا کرنے کے بعد مخصوص خانے میں مغفور کا نام لکھے۔ چنانچہ مغفور کو فوراً چھوڑ دیا جائے گا اور وہ مسیح اور اولیا کے ساتھ نعمتوں کے مقام پر پہنچ جائے گا۔

رہا بدنصیب غلام جو اپنے مغفور جاگیردار سردار سے اتنے پیسے حاصل نہ کرسکا کہ جس سے وہ مقدس آبا سے کوئی پروانہ خرید سکتا، یا لاچار مریض جو کوئی روزی حاصل نہ کرسکا یا نادار فقیر جو چند دینار ادا کرکے جنت خرید کرنے سے عاجز رہا، یہ لوگ کلیسا کے اِس عطیے سے محروم رہتے تھے چاہے اُن کا تقوی کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اور اُن کی مسیح سے محبت اور عذرا سے تعلق کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو۔

یہ کلیسا کی خرابی کی جڑ تھی۔ کلیسا اس کی دلیل کہاں سے لایا جبکہ اناجیل اور رسائل اس کے تذکرے سے بالکل خالی ہیں۔

وہ اساس جس سے یہ بدعت پھوٹتی ہے، بت پرستانہ فکر ہے یعنی یہ فکر کہ دینی پیشوا اللہ کے ہاں گناہوں کی بخشش کی سفارش کرتے ہیں۔ اس فکر کے تحت جاہل اور سادہ لوگ پادریوں کو وسیلہ بنانے لگے تاکہ اللہ کے تقرب کی امید کرسکیں۔ اس طرح اللہ اور مخلوق کے درمیان واسطے کا تصور مضبوط ہوگیا۔ حتی کہ یہ ہر دینی پیشوا کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے عام حق بن گیا۔ بلکہ دینی پیشواؤں کی اصل ذمہ داری یہ ٹھہری کہ وہ اللہ اور مخلوق کے مابین واسطہ بنیں۔ لوگ پادری کے واسطے سے نماز ادا کریں، عشائے ربانی تناول کریں، بپتسمہ کروائیں۔ پادری ہی شادی بیاہ اور موت کی رسومات ادا کرے اور گناہ گاروں کے اعترافاتِ گناہ قبول کرے۔

دینی پیشوا لوگوں کے اعترافِ گناہ کو خود قبول نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اُن کے پاس کوئی حق مغفرت نہ تھا لیکن ان کے دعوے کے مطابق مسیح علیہ السلام ہر اُس شخص کو بخش دیتے ہیں جو کلیسا کے کسی پیروکار کے سامنے گناہ کا اقرار کرے۔ کیونکہ مسیح علیہ السلام نے کلیسا کو اپنی بادشاہت عطا کر رکھی ہے اور اُس کو جہانوں کی سرداری دے رکھی ہے۔

چنانچہ مسیحی فرد جب زندگی میں ایک خاص موقع پر اعتراف کر لے تو وہ مسیح علیہ السلام کے ساتھ ملکوت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ موت کے وقت کا اعتراف ہے جب اُس کے جسم کی چکنائی مقدس زیتون کے ساتھ مل جائے۔ اُس وقت وہ ہر میل کچیل اور گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ کلیسا کی طرف سے مخالفین کے لیے سب سے کڑی سزا یہ ہوتی تھی کہ اُن کو موت کے وقت آخری اعتراف سے محروم قرار دیا جائے۔ کوئی مسیحی اس محرومی کے سبب جہنم میں جانے سے شک نہیں کر سکتا تھا۔

لمبی مدت تک یہی صورت حال جاری رہی حتی کہ تیرہویں صدی عیسوی طلوع ہوئی اور کلیسا کو اپنی تاریخ کا ایک فیصلہ کن مرحلہ درپیش ہوا۔ اُسے اپنے دشمنوں کو مقابلہ کرنے کے لیے اپنے دینی اختیارات اور مالی وسائل میں اضافے کی حاجت پیش آئی۔ چنانچہ اس نے ایک مجلس بلائی تا کہ مطلوبہ مقصد کی تکمیل کے لیے مناسب لائحہ عمل تلاش کیا جا سکے۔ چنانچہ ۱۲ویں مجلس لاترن مقام پر ۱۲۱۵ء میں منعقد ہوئی۔ اِس مجلس میں دو نئے مسائل کا اقرار کیا گیا جن کا آنے والی صدیوں میں مسیحیت پر بڑا گہرا اثر واقع ہوا:

① استحالہ کا مسئلہ، جس کا قریب ہی عشائے ربانی کے تحت ذکر گزر چکا ہے۔

② کلیسا کا گناہ گاروں کو بخشنے کا حق۔ یہ آنے والی قرارداد کی شکل میں تھا:

③ چونکہ یسوع مسیح نے کلیسا کو بخشش عطا کرنے کا اختیار دیا تھا لہٰذا کلیسا نے اُس اختیار کو استعمال کیا جو اس کو پہلے دن سے اوپر سے حاصل ہوا تھا۔ مقدس عیسائی کونسل اِس بات کا اعلان کرتی ہے اور حکم دیتی ہے کہ مسیحی عوام کی نجات کا یہ عمل کلیسا کے اندر بجالایا جائے اور عیسائی مقدس کونسلوں کے اختیارات کے مطابق ثابت کیا جائے۔ وہ لوگ محروم قرار دیے جائیں گے جو سمجھتے ہیں کہ بخششیں مفید نہیں یا کلیسا بخشش عطا کرنے کے اختیار نہیں رکھتا۔ لیکن یہ بات بھی ضروری ہے کہ بخشش کا اختیار اعتدال اور احتراز کے ساتھ قدیم محفوظ عادت کے مطابق اور کلیسا میں ثابت شدہ طریقہ پر استعمال کیا جائے۔ تا کہ کلیسائی تہذیب فرطِ تساہل کی وجہ سے پستی کا شکار نہ ہو۔ (۱۲۶)

یہ سارا معاملہ ہے۔ عیسائی مقدس کونسل نے تمام مسیحیوں پر لازم کیا کہ وہ ابرشیہ کے پادری کے سامنے ہر سال ایک مرتبہ اعتراف کریں تا کہ وہ بخشش حاصل کر سکیں۔ (۱۲۷)۔ چنانچہ لوگ گروہ در گروہ طلبِ مغفرت کے لیے ابرشیات جانے لگے۔ اور پادریوں کو تحائف و صدقات پیش کرنے لگے۔ کلیسا کا مرکز معنوی اور مادی لحاظ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے بلند ہو گیا۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ سُست ہو گیا اور بہت سارے لوگ اعتراف سے غفلت کرنے لگے۔ اسی دوران کلیسا کا اپنے مرکز کو مضبوط کرنے اور خزانوں کو پورا کرنے کے لیے ضرورت بڑھ گئی۔ چنانچہ اُس نے اس معاملے کو جاری رکھنے کے لیے ایک اور کامیاب طریقہ اختیار کیا۔ سوچ و بچار کے بعد اُس کو یہ حل سوجھا کہ بخشش کے پروانے لکھے جائیں جو خواص پر بیچے جائیں اور ابدی بخشش کی عبارت ایسی ہو جو کلیسا کے مقرر مال کی ادائیگی پر طاقتور محرک بنے یا اُن خدمات کو بجالانے پر اُبھارے جن کو کلیسا پسند کرتا ہے۔ سرٹیفکیٹ کی عبارت اس طرح تھی:

''ہمارا رب یسوع تجھ پر رحم کرے۔ اے فلاں (اس کا نام لکھا جاتا جس کی بخشش کی جاتی تھی)۔ وہ تجھے کلی آلام کے بدلے قدسی استحقاقات سے گھیر لے۔ میں عطا کیے گئے رسولی اختیار کی وجہ سے تمھیں تمام قصاصوں، احکام اور کلیسائی مالی ذمہ داریوں سے جو اُس نے واجب کیے تھے آزاد کرتا ہوں۔ اسی طرح تمام زیادتیوں، خطاؤں اور گناہوں سے بھی جو تو نے ارتکاب کیے، چاہے وہ جتنے بڑے اور سخت کیوں نہ ہوں۔ اور ہر علت سے اگرچہ وہ ہمارے اقدس باپ پوپ اور رسولی کرسی کے لیے محفوظ کیوں نہ ہوں۔ اور میں گناہ کی تمام گندگیوں کو مٹاتا ہوں اور ملامت کی تمام علامات کو جو تو نے اس دوران اپنے نفس پر ڈالیں۔ میں اُن تمام تلافیوں کو بھی ختم کرتا ہوں جو تو نے اپنی پاکیزگی کے لیے خود پر لازم کیے۔ میں تمھیں نئے سرے سے کلیسائی اسرار کی طرف لوٹاتا ہوں اور عیسائی بزرگوں کی صحبت عطا کرتا ہوں، میں تمھیں دوبارہ نیکی اور طہارت کی اُس کیفیت پر لوٹاتا ہوں جو تیرے بپتسمہ کے وقت تھی حتیٰ کہ موت کے وقت تیرے سامنے وہ دروازہ بند کر دیا جائے گا جس سے گناہ گار عذاب کی جگہ میں داخل ہوتے ہیں اور وہ دروازہ کھولا جائے گا جو خوشی کی فردوس کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر تو کئی لمبے سالوں تک زندہ رہا تو یہ نعمت غیر متغیر جاری رہے گی حتیٰ کہ تیرا آخری وقت آجائے گا۔ باپ، بیٹے اور روح القدس کے نام کے ساتھ۔ (۱۲۸)

یہ بات باقی ہے کہ ہم اپنی نظر ان حالات وضروریات پر ڈالیں جن کی وجہ سے کلیسا مجبور ہوا کہ اس قسم کے تصرفات کرے۔ کلیسا اپنی تاریخ کے اِس مرحلے میں اپنے سب سے بڑے اور خطرناک دشمن (مسلمانوں) کا سامنا کر رہا تھا اور صلیبی جنگوں کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ صلیبیوں کی شکست کی علامات ظاہر ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ یورپیوں کے دلوں میں دینی جذبہ بڑے پیمانے پر کمزور ہو رہا تھا۔ جنگجو کلیسا پر اپنا اعتماد کھو رہے تھے کیونکہ ان کی مدد کے قطعی وعدے ناکام ثابت ہوئے تھے جو کلیسا نے ان کے ساتھ کیے تھے۔ وہ اپنے معرکوں میں عیسائی بزرگوں، فرشتوں اور مسیح کا کوئی اثر نہیں دیکھتے تھے بلکہ اس کے برعکس اُن کا خیال تھا کہ وہ اُن کے مخالف کھڑے ہیں۔ اس طرح کلیسا کا موقف ہل کر رہ گیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ نصرت کے میٹھے وعدے اور شرکائے جنگ کے لیے مغفرت کا زبانی اقرار کوئی خاص فائدہ نہ دے گا۔ چنانچہ امیدوں کو ٹھوس حسّی معاہدہ کی تحریری شکل دی گئی تاکہ جنگجو اُس کو محسوس کر سکے اور اٹھا سکے۔ اس طرح وہ صلیبی حملے میں بھرپور اعتماد کے ساتھ شرکت کر سکے۔ اس مقصد کی خاطر ایک نئی خرابی پیدا ہوئی جو مغفرت کے پروانوں یا بخشش کے سرٹیفکیٹ کی شکل میں تھی۔ دل ڈیورانٹ نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درست کہا تھا: یہ پروانے مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگوں میں شرکت کرنے والوں پر بانٹے جاتے۔(۱۲۹)

مغفرت کا پروانہ صرف دو قسم کے افراد کو حاصل ہو سکتا تھا:

① مال دار آدمی جو کلیسا سے مقرر نرخ پر پروانہ خریدتا۔

② وہ آدمی جو اپنی تلوار اٹھاتا اور اپنا خون کلیسا کی نصرت، دفاع اور اصولوں کی حفاظت میں بہا دیتا۔

اِن دو کے علاوہ تیسرا وہ آدمی تھا جو اپنے دل کو غم سے چکنا چور کر دیتا کیونکہ وہ پروانے کی قیمت ادا کرنے کی ہمت نہیں رکھتا تھا یا جنگ میں شرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ یا تو بے بس مریض ہوتا یا کلیسا کی خاطر موت کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن دونوں صورتوں میں وہ سخت کشمکش اور جان لیوا احساس محرومی کا شکار ہو جاتا۔

اِس طرح ساری دنیا نے گھاٹے کا سودا کیا اور کلیسا اکیلا فائدے میں رہا، اگرچہ وہ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ بُرے مقام میں ہوگا۔

اس بدعت کے نتائج:

تاریخ میں اس قسم کی بدعت عزت واحترام کی حامل نہیں رہتی۔ اُس کے خلاف طاقتور اور توانا آوازیں اٹھتی ہیں اور کئی گہرے ردعمل ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُس زمانے میں جب یورپ اسلام کے نور کا مشاہدہ کر رہا تھا، خوابیدہ عقلیں زندگی میں اپنا مقام تلاش کر رہی تھیں اور فطرتیں طویل نیند کے بعد جاگنے لگیں تو اس بدعت کے خوف ناک نتائج آنا شروع ہوئے۔

یہ بدعت شروع شروع میں کلیسا کی قوت اور عظمت کا نشان تھی لیکن بعد میں اُس پر شر اور وبا بن کر ٹوٹ پڑی۔ اس کی مختصر تفصیل اس طرح ہے:

شروع شروع میں دینی پیشواؤں کا مقام ومرتبہ جاہل اور سادہ لوگوں کی نظر میں بلند ہو گیا کیونکہ مسیح علیہ السلام نے ان کو یہ عظیم مرتبہ عنایت کیا اور اُن کو اپنی روح عطا کی جیسا کہ وہ دعویٰ کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی اطاعت اور خوش نودی لازم قرار پائی تاکہ مسیح علیہ السلام کا تقرب اور رضا حاصل ہو سکے۔

جب لوگ، بادشاہ اور فقیر، کلیسا کے حق بخشش پر ایمان لے آئے تو اُن کے لیے حق حرمان پر ایمان لانا بھی ممکن ہو گیا۔ وہ بخشش میں زیادہ طمع نہ رکھتے تھے جتنا محرومی سے ڈرتے تھے۔

سیاسی اعتبار سے کلیسا طاقتور ہو گیا اور اس کا اقتدار ان سُورماؤں سے زیادہ مضبوط ہو گیا جو حصولِ مغفرت کے لیے اُس کی راہ میں رضا کارانہ قتال کرتے۔ اُس کے مقابلے میں بادشاہوں کا اقتدار کمزور ہو گیا جو بذاتِ خود صلیبی جنگوں میں کلیسا کے سپاہی بن گئے۔ جس بادشاہ نے تردد کیا کلیسا کے قبضے سے بھاگنے کی کوشش کی، اُس کو محرومی کی سزا دی گئی۔ جیسا کہ فریڈرک ثانی کے ساتھ ہوا۔(۱۳۰)

یہ سارے فوائد کلیسا نے اس بدعتی خرابی کے سبب حاصل کیے۔ لیکن اس کے نتیجے میں جلد ہی اندھی سرکشی اور بغاوت کا طوفان کھڑا ہوا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا، لوگوں کو اللہ کے مقابلے میں کلیسا کا غلام بنایا گیا اور مسیح علیہ السلام کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیمات کے بجائے کلیسا کی تعلیمات مقدس بنائی گئیں؟ کلیسا غرور اور ظلم میں مبتلا ہو گیا کیونکہ اس نے معاشرے کو پیشانی سے پکڑا ہوا تھا۔ وہ لوگوں کے قلوب اور اجسام پر حاکم تھا۔ وہ جس کو چاہتا اعلیٰ علیین تک لے جاتا اور جس سے نفرت کرتا اُس کو جہنم کے گڑھوں میں پھینک دیتا۔ کلیسا مقدس دلی شمار کیا جاتا اور اس کے مخالف سرکش شیطان۔

یہ اُس خرابی کی ابتدائی حالت تھی جو کلیسا کو پیش آئی اور کلیسا کے آبا حالات کی نزاکت کو پوری طرح سمجھ نہ سکے۔ اُن کو غرور نے مجبور کیا کہ وہ قدم آگے بڑھاتے چلے جائیں اور زیادہ لوٹ مار کریں اور نتائج کی پرواہ نہ کریں۔

لیکن اللہ کی سنت کسی کو معاف نہیں کرتی۔ جب بھی کوئی چیز اپنی حد سے تجاوز کرتی ہے تو اس کے منفی نتائج پیدا ہو جاتے ہیں۔ جھاگ خشک ہو کر ختم ہو جاتا ہے اور اصل چیز باقی رہتی ہے۔ چنانچہ بخشش کے پروانے کلیسا کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔ کلیسا کا خسارہ بھی اتنا زیادہ تھا جتنا اس کا ظلم زیادہ تھا۔

اقتصادی پہلو سے دیکھیں تو پروانوں کی خرید و فروخت کے ساتھ ایک زبردست عوامی شوق ظاہر ہوا لیکن اس کے بعد عوام تھکاوٹ کا شکار ہو گئی، جیسا کہ کسی بھی بدعت کی ابتدا میں اور انتہا میں ہوتا ہے۔ جب کلیسا کی طمع عروج پر تھی تو عوام پروانوں کی خریداری سے اکتا گئی، مجبوراً پروانوں کو سستے داموں بیچنا پڑا۔ چنانچہ فادر اور پادری جاگیروں میں چکر لگاتے، پروانوں کو سستے نرخوں پر بیچتے اور پھر معاملہ حقیر معمولی قیمتوں تک پہنچ گیا۔ جب سامانِ تجارت زیادہ ہو تو طلب کم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے شعور میں یہ بات پیدا ہوئی کہ ان کا پروانے خریدنا مال کا ضیاع ہے یا کم از کم آخرت سے ہٹ کر کوئی فائدہ نہیں۔

اسی دوران اقتصاد کے اسٹیج پر ایک نیا گروہ ظاہر ہو رہا تھا جو سابقہ دو بڑے طبقوں کے مدّ مقابل تھا یعنی نواب جاگیرداروں اور دینی پیشواؤں کے طبقے، یہ نیا طبقہ بورژوائی تھا۔ اس دوران ایسی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں جو جاگیری نظام کے کلی خاتمے کا اشارہ دے رہی تھیں۔

دینی پیشواؤں کے دینی مقام کو دیکھیں تو وہ مقدس ہالہ جو ان کو گھیرے ہوئے تھا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بخارات بن کر اڑ رہا تھا۔ جب سے پروانوں کی خرابی پیدا ہوئی اور بعد ازاں لوگوں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ وہ اندھے جذبے اور بے وقوفانہ فرماں برداری میں ٹھوکر کھا چکے ہیں، تب سے پادریوں کے خلاف مزاحمت شروع ہو گئی۔ اس میں اضافہ اس طرح ہوا کہ پادریوں نے پروانوں کی فروخت میں مقابلہ شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ خود بُرے سیرت و کردار کے مالک تھے اور علی الاعلان ظلم کرتے تھے۔ لوگ حیران ہوتے کہ سارے شریر اور مجرم لوگ پروانوں کی برکت سے ملکوت میں جگہ حاصل کر رہے ہیں اور دینی پیشواؤں کو کوئی پروا نہیں۔ اِس چیز نے بذاتِ خود دینی پیشواؤں کی حیثیت کو مشکوک بنا دیا۔ اُن کی نیکی اور اپنی ذات سوالیہ نشان بن گئی۔

سیاسی اثر و رسوخ اور دنیوی مفاد کے اعتبار سے دیکھیں تو بخشش کے پروانے کلیسا اور بادشاہوں، امرا اور نوابوں کے درمیان رشک و حسد کا موجب بنے۔ بادشاہوں نے دیکھا کہ کلیسا کا قبضہ دن بدن مستحکم ہو رہا ہے اور وہ اور اُن کی عوام دینی پیشواؤں کے محض آلہ کار اور خریدار ہیں۔ وہ خوش ہوں تو احسان کر کے معاف کرتے ہیں اور ناراض ہوں تو محروم قرار دینے کی سزا دیتے ہیں۔ اسی طرح وہ دولت جو کلیسا نے حاصل کی، جاگیرداروں اور بڑے مالکان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے ایک طاقتور منافست کا باعث بنی۔ تمام لوگوں پر ایک ہی دشمنی اور کینے کا احساس غالب آ گیا جو کلیسا کے خلاف تھا۔

اسی وجہ سے کلیسا کے خلاف نفرت خصوصاً بخشش کے پروانوں کے خلاف کھلم کھلا ظاہر ہونے لگی۔ جب کلیسا کے خلاف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں تو ملوک اور امرا کو ایک زبردست موقع میسر آیا۔ انھوں نے تحریکوں کی زبردست حمایت کی اور ان کی آگ کو خوب بھڑکایا۔ اگر بعض کلیسائی مصلحین خصوصاً لوتھر کو اُمرا و نوابوں کی حمایت و ہمدردی حاصل نہ ہوتی تو لوگ کلیسا کے قبضے سے اور محروم قرار دیے جانے سے کبھی آزاد نہ ہوتے۔

دوسری طرف یورپی حکمرانوں اور عوام نے دیکھا کہ اسلامی مشرق کتنی پیاری زندگی گزار رہا ہے۔ جہاں نہ دینی پیشوائیت ہے اور نہ سرکشی اور اجارہ داری۔ چنانچہ اس منظر نے ان کو حیران کر دیا۔ اُن کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ مغفرت کے پروانے اور کلیسا کے ملکوت کے وعدے ان سے کھلا فریب ہے جس کے پس منظر میں کوئی حقیقت نہیں۔ یہ بے وقوفی اور جہالت کا کام ہے۔

یہ چند نتائج تھے جو پروانوں کی بدعت سے کلیسا پر خاص طور پر مرتب ہوئے۔ باقی رہا معاشرے کا عمومی دینی رویہ، تو بخشش کے پروانے اُس الاؤ کی پہلی چنگاری ثابت ہوئے جو بعد میں پورے یورپ میں لادینیت کی صورت میں بھڑک اٹھا۔ جس سے معاشرتی ضوابط تباہ ہوئے اور کلیسائی تعلیمات اور دینی روایات مکمل طور پر تباہ ہو گئیں۔ اس بات میں کوئی انصاف پسند انسان شک نہیں کر سکتا کہ کلیسا کی خرابیوں کے خلاف مہم میں اسلام کا براہ راست اثر تھا، اگرچہ اس مہم کے داعی اسلام سے سخت عداوت و کینہ رکھتے تھے۔ ہمارے لیے یہاں زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پروانوں کی خرابی نے دینی تعلیمات کو اُس کی بنیادوں سے منہدم کر دیا۔ لوگ دینی اعتقادات کا مذاق اڑانے لگے اور اصول ایمان کو کلی طور پر نشانہ بنانے لگے۔ آخرت اور جنت و دوزخ کا انکار ہر طرف پھیل گیا حالانکہ آخرت کے تصور کے بغیر کوئی دین قائم نہیں رہ سکتا۔

مغرب میں اُس وقت سے آج تک یہ بات ہر دشمنِ دین کے لیے قوی شہادت اور قطعی سند فراہم کرتی ہے کہ جس طرح دینی پیشواؤں کے ناجائز تصرفات کا کفر لازم ہے اسی طرح بذات خود دین اور اخلاق کا کفر بھی لازم ہے۔

لوگوں کے لیے یہ اختیار بے حد مشکل تھا جس کو دین کے دشمنوں خصوصاً یہود نے یورپی انسان کے سامنے پیش کیا کہ یا تو وہ مغفرت کے پروانوں پر ایمان لائیں اور اُس کے نتیجے میں اپنے آپ پر جمود، بیوقوفی اور رَجْعِیَّت کو ثابت کریں یا اُن پروانوں کا کفر کر کے پورے دائرے کا کفر کریں جو اُن کی زندگی پر محیط تھا یعنی دین کا دائرہ، غیبیات خصوصاً آخرت کا دائرہ۔

اسی لیے ہم وجودی یہودی فلسفی ''جان پال سارتر'' کو دیکھتے ہیں۔ وہ اس اختیار کو اپنی ایک مشہور روایت ''شیطان اور رحمان'' میں مجسم شکل میں پیش کرتا ہے۔ (۱۳۱)۔ قابل غور بات یہ ہے کہ کلیسا آج کل مغفرت کے سرٹیفکیٹ جاری نہیں کرتا بلکہ اس کے تذکرے سے شرماتا ہے اور جب بھی اس حوالے سے بات چھڑتی ہے تو خجالت و ندامت محسوس کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ دوم

یورپ میں سیکولرزم کے اسباب

باب ③ کلیسا کی سرکشی

باب ④ کلیسا اور علم کی باہمی کشمکش

باب ⑤ فرانسیسی انقلاب

باب ⑥ نظریہ ارتقا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۳

کلیسا کی سرکشی

کلیسا کے اکابرین کی سرکشی اور اُس کے اسباب:

سرکشی بذات خود ایک خطرناک مرض ہے جو انسانی نفس کو تباہ کر دیتا ہے اور اُس کی خوب صورتی کو مسخ کرتا ہے۔ وہ انسانی وجود کو شیطانی روح بنا دیتا ہے۔

اس مرض کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اُس شخص کو لاحق ہوتا ہے جو کمزور نفس کا مالک ہو اور اپنی طاقت سے بڑھ کر وسائل حاصل کر لے۔ اُس کے پاس کوئی اخلاقی جذبہ یا ایمانی ضمیر نہ ہو جو اس کی سرکشی کو قابو میں رکھ سکے اور اس کے کردار کو منضبط کر سکے۔

یہ سرکشی احساسِ کم تری کا مظہر ہوتی ہے کیونکہ وہ اس طرح اپنی تکلیف دہ داخلی کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے یا کسی ایسے ناروا مسلک کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتا ہے جس کو عقل سلیم کسی صورت جائز قرار نہیں دے سکتی۔

چنانچہ سرکشی خطا پر مبنی ایک طریق کار کا آغاز ہے اور اُس کی انتہا ایک تباہ کن مرض کی صورت میں ہوتی ہے جس کا علاج ممکن نہیں رہتا اور موت مقدر بن جاتی ہے۔

جب سرکشی کسی بت پرست حاکم یا دنیا پرست لیڈر سے صادر ہو تو وہ کسی نہ کسی حد تک سمجھ آتی ہے، اگرچہ اُس کی خرابی بھی عقل وضمیر کو کھٹکتی ہے۔ لیکن جب سرکشی ایسے افراد سے صادر ہوتی ہے جن کو لوگ خدا کا برگزیدہ (قدیس)، سلامتی کا پیامبر اور آخرت کے طالبین سمجھتے ہیں تو یہ بات لوگوں کے لیے ہضم کرنا مشکل ہو جاتی ہے۔ ذہن اُس کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ ایسے دین کے اکابر ہوں جن کا نعرہ محبت ہو ،معاف کرنا اُن کا امتیاز ہو اور وہ اپنے پیروکاروں کو کہتے ہوں:

''جو تمھارے ایک رخسار پر مارے، تم اُس کے لیے دوسرا رخسار پیش کر دو۔ جو تم سے جھگڑا کرے اور تمھارے کپڑے پکڑے، اُس کے لیے چادر بھی چھوڑ دو۔ جو تم سے ایک میل تک مزدوری کرائے، تم اُس کے ساتھ دو میل تک چلو''۔ (۱۳۲)

اس عجیب وغریب تضاد کے پیچھے کیا پوشیدہ اسباب تھے۔ اُس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دینی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیشواؤں کی طبعی کیفیت، دین عیسائیت کے طبعی حالات اور اُس خاص ماحول کو دیکھیں جس نے اُن کو ظلم واستبداد کا موقع فراہم کیا۔

عیسائیت میں دینی پیشوائیت ایک ایسے دور میں ممکن ہوئی جو انتظامی اعتبار سے بے حد اہم تھا۔ وہ ایک ایسے منظم ادارے کے حامل بنے جو انتہائی دقیق انتظامی ترکیب پر مشتمل تھا۔ ادارے کے ارکان مختلف علاقوں اور گوشوں میں پھیلے ہوئے چھوٹے کارندوں سے لے کر روم میں موجود چوٹی کے عہدے دار پوپ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس گہری انتظامی ترتیب نے اُن کو ایسی قوت بخشی جس کا مقابلہ نہ ہوسکتا تھا۔ اِسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ کلیسا کی طاقت کے خلاف کھڑے ہونے والے اکثر شہنشاہ اور بادشاہ شکست سے دوچار ہوئے اور بالآخر ذلیل ہوکر فرماں بردار بنے۔ اِسی طرح مغربی مسیحی دنیا کلیسا کے پنجے سے اس وقت تک خلاصی نہ پاسکی جب تک اُس کے اندر سے انقلاب نہ آیا جس کی قیادت خود کلیسا کے مصلحین نے کی۔ جس نے کلیسا کے تنظیمی ڈھانچے کو کھوکھلا کیا اور افراد کی باہمی قوت کو منتشر کیا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ دین کے اکابرین اس بہترین تنظیم سے فائدہ اٹھاتے اور اس کو دینی مصلحت کے لیے استعمال کرتے اور کوئی ظلم واستبداد واقع نہ ہوتا۔ لیکن اُس کے لیے بنیادی شرط حسن نیت اور اخلاقی تجرد کی ہوتی ہے اور یہ چیز کلیسا کے ہاں اُس وقت سے مفقود ہے جب سے اس نے صحیح ایمان اور سچا عقیدہ گم کیا ہے۔

انسانی نفس کی فطرت ہے کہ جب اسے اسباب میسر آئیں تو وہ سرکشی اختیار کرتا ہے۔ لیکن اللہ کی خشیت اُس کی نگرانی کا احساس اور انسان کا اللہ کے سامنے کمزور ہونا، یہ سب باتیں اُس کی سرکشی میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ چونکہ کلیسا اِس اعتبار سے مفلس تھا اِس لیے اُس کی تنظیمی قوت ایک دنیوی گٹھ جوڑ بن گئی جو معاشرتی اثر ورسوخ اور ادنی مال کے پیچھے بھاگتی تھی۔ پھر اُس کو ایسے وسائل بھی میسر آ گئے جس سے وہ ایک ظالم استبدادی قوت بن گیا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کے دینی مرکز نے ہی اُن کے لیے کامیابی کی راہ ہموار کی۔ لہٰذا ہمارے لیے ضروری ٹھہرتا ہے کہ ہم ان کے دین کے مزاج پر تحقیق کریں جس نے لادینیت کو موقع فراہم کیا۔

ہم یہ بات پہلے بیان کر چکے ہیں کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیروکاروں کو اُن کے بعد انتہائی تکالیف کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ابتلا کے دور میں مسیحی دعوت خفیہ دعوت میں تبدیل ہوگئی۔ اکثر داعی چھپ گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھ اناجیل کے نسخے بھی چھپا دیے۔ بلکہ مدون ہی اُس وقت کیے گئے اور اپنی خاص لغات میں لکھے گئے۔ وہ ان نسخوں کو خفیہ طور پر نقل کرتے کیونکہ انہیں روم کی طرف سے سزا اور جلائے جانے کا ڈر ہوتا۔ اُن کے دین میں نئے داخل ہونے والے اُن سے براہ راست تعلیم حاصل کرتے اور وہ نسخوں کا ترجمہ عوامی زبان میں کرتے۔ وہ لوگوں کے مسائل میں انجیل کی رائے یا اپنی خاص رائے ظاہر کرتے۔ داعی عام پیروکاروں کو اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ نسخوں کے ازخود مالک بنیں یا خود اُن کو دیکھیں۔ انہیں اپنی جان اور کتابوں کے ضائع ہونے کا ڈر ہوتا۔ اِس کے علاوہ پیروکاروں کی عقلی استعداد اور ماحول اِس قابل نہ تھا کہ وہ براہ راست احکام اخذ کرسکیں یا ذاتی اجتہاد واستنباط

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرسکیں۔اس کے علاوہ وہ انجیل کی زبان سے بھی واقف نہ تھے۔

ان سب باتوں نے مسیحی دینی مصادر کو چند لوگوں کے ہاتھوں میں محدود کر دیا۔اور وہ اُس کی شرح وتاویل کے مالک بن بیٹھے۔ جب ابتلا وآزمائش کا دور گزر گیا۔ رومی سلطنت نے کلیسا کے دین کو قبول کرلیا تو کلیسا کے اکابرین نے کتاب مقدس کی شرح وقرأت کے حق کو اپنے لیے محفوظ رکھا اور ریاست نے بھی اُن کا ساتھ دیا تاکہ اُن کی رعایا ایک عقیدہ پر جمع ہو۔کلیسا کو یہ موقع میسر آیا کہ اس نے نئے پھوٹنے والے فرقوں کا کام تمام کر دیا۔ہم دینی پیشوائیت کے بارے میں بیان کر چکے ہیں کہ کلیسا کے دینی پیشواؤں کو یہودی علما کا اندھا تعصب، ہوائے نفس کی پیروی اور رائے پر اجارہ داری وراثت میں ملی تھیں۔ چنانچہ کلیسائی دین کے مصادر ان تک محدود ہو گئے۔ دینی پیشواؤں کے علاوہ کوئی ناقد یا محقق اُن تک پہنچ نہ سکتا تھا۔کلیسا کا اختیار ثابت ہو گیا کہ وہ ہر چیز کو دین کے نام پر لاگو کرے اور کوئی اس پر اعتراض نہ کر سکے۔

اس طرح محرف دین نصرانیت کے مصادر کلیسا کے کونوں گوشوں میں چھپ گئے۔اُن کی تعلیمات براہ راست کلیسا کے توسط سے حاصل کی جاتیں جو خود مقدس اور معصوم ہونے کا دعویدار تھا۔ جب دین کے مصادر کھلے ہی نہ ہوں تو لوگوں کو دینی پیشواؤں کی سچائی کا کیسے پتہ چلے گا جو وہ اللہ کے بارے میں بیان کر رہے ہوں؟ وہ کلیسا کے بیان کردہ عقائد، قانون اور شریعت پر مناقشہ کیسے کر سکتے تھے؟ اُن کے لیے مطلق تسلیم اور اندھی اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

جب کلیسا مطمئن ہو گیا کہ اب کوئی زبان اُن کی بزرگی اور اُن کی رائے کے خلاف حرکت نہیں کر سکتی تو اس نے زیادتی کا آغاز کیا اور اپنے تسلط میں غلو کرنے لگا۔اس نے اپنی ہیبت کو قائم کیا اور ظلم واستبداد کا ایسا بازار گرم کیا جو کسی کو رعایت نہ دیتا تھا۔

یہ بتلانا باقی ہے کہ اس سرکشی کا ماحول کیسا تھا جس نے اِس سرکشی کو قبول کیے رکھا۔ہم دیکھتے ہیں روم کی اکثر آبادی ان پڑھ اور سادہ تھی جو ہمیشہ کسی بالادست قوت کے سامنے جھکنے اور غلامی کرنے کی عادی تھی۔ وہ انتہائی سطحی فکر کے حامل تھے۔اسی طرح یورپ کے اکثر باشندے وحشی قبائل تھے جو تاریخ کے بدترین حالات میں سے گزر رہے تھے۔خصوصاً قرونِ وسطی کے ابتدائی ادوار جو قرونِ مظلمہ کہلاتے ہیں۔انھوں نے امپیریلزم کے رسمی دین کو قبول کرلیا اور مسیح کی عبادت کو شہنشاہ کی عبادت کی جگہ پر رکھا۔لیکن اِن حالات میں حقیقی ایمان کی روح ویسے بیدار نہ ہو سکی جیسا کہ امت محمدیہ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اسلام کی بدولت پیدا ہوئی اور ان کا روحانی وعقلی معیار عظیم افقوں سے روشناس ہوا۔ یورپ کی ابتدائی عیسائی عوام اسی وحشت وانحطاط پر ہی گامزن رہی جو عیسائیت سے پہلے تھی حتی کہ جدید دور کا آغاز ہو گیا۔۔۔اِسی وجہ سے یہ طبعی بات تھی کہ عوام کا جم غفیر سطحی عقل اور سادہ جذبات کے پیچھے چلتا رہا۔انھوں نے جو سنا اس کی تصدیق کی اور اُس پر ایمان لے آئے۔ان کے نزدیک دین کا بزرگ سب کچھ تھا۔اُس کے علاوہ کسی عالم، مؤرخ کی کوئی حیثیت نہ تھی۔اس طرح جہالت کے گہرے بادل اُن کی زندگی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ہر گوشے پر چھائے رہے۔ دین کا سربراہ ہی وہ واحد شخص تھا جو کسی نہ کسی حد تک مدھم روشنی کا مالک تھا۔ یہ ماحول ایسا تھا کہ سرکش اپنی من مانی اور اپنی تسلط کی بھوک کو جیسے چاہے مٹائے۔

یہ عوامل اکٹھے ہو گئے یعنی دینی پیشواؤں کا گہرا اثر ورسوخ، بند اور محدود مصادر دین، ابتدائی دور کا جاہلی ماحول، اِن سب باتوں نے کلیسا کو سرکش، جابر اور ظالم طاغوت بنا دیا جو بقا کے تمام عناصر اور استبداد کے تمام لوازمات پر قابض تھا۔ وہ ہر چیز کو اپنے ارادے اور خواہش کے مطابق لانا چاہتا تھا۔

کلیسا نے زندگی کے ہر پہلو کو آہنی ہاتھوں سے پکڑا اور سخت بیڑیاں لگا دیں۔ وہ معاشرے پر دینی، سیاسی، اقتصادی اور علمی اعتبار سے غالب آ گیا۔ اس نے لوگوں کی عقلوں، مالوں اور تصرفات پر ایسا دباؤ ڈالا جس کی مثال نہیں ملتی۔ کلیسا کی تاریخ ظلم و جور کی داستان ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو لپیٹے ہوئے ہے۔ ہم اس سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

① دینی سرکشی:

جب سے رسمی مسیحیت نیقیہ کی مجلس (۳۲۵ء) میں ظاہر ہوئی اور کلیسا نے دینی سرکشی اور دہشت کی فضا کو قائم کیا۔ تب سے عقیدہ تثلیث زبردستی لاگو کیا گیا۔ اُس کے مخالفین کو محروم وملعون قرار دیا گیا بلکہ جو موحدین قابو میں آئے اُن کا خون بہایا گیا اور ان کو کئی قسم کے عذاب کا نشانہ بنایا گیا۔ کلیسا نے اپنی ذات کو مقدس مجالس کے ذریعے ایسا ''معبود'' بنا لیا جو حلال وحرام کا مالک تھا۔ جو چاہے منسوخ کرے اور جو چاہے اضافہ کرے۔ کسی شخص کو اعتراض یا رائے زنی کا حق نہ تھا ورنہ وہ محروم وملعون قرار دیا جاتا اور اس کی سزا کافر ''بدعتی'' والی سزا ہوتی۔

ختنہ واجب تھا تو حرام ہو گیا۔ مردار حرام تھا تو مباح کر دیا گیا۔ مجسمے شرک اور بت پرستی تھی تو وہ تقوے سے تعبیر ہو گئے۔ دینی پیشواؤں کی شادی حلال تھی تو وہ حرام ہو گئی۔ پیروکاروں سے مال طلب کرنا برائی تھی تو کلیسائی ٹیکس لازم ٹھہرا۔ کئی اُمور تھے جن کو عیسائی مجالس نے حلّت سے حرمت کی طرف منتقل کر دیا یا حرمت سے حلّت کی طرف حالانکہ اُن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل بھی نہ تھی۔ کلیسا نے تثلیث کے پیچیدہ مسئلے کے علاوہ دیگر کئی آرا جاری کیں جو بدیہی طور پر مستحیل تھیں لیکن کلیسا کی خواہش کے مطابق اُن پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ عشائے ربانی، موروثی خطا، مسیح علیہ السلام کی سولی اور سات رسومات کا عقیدہ وغیرہ، یہ سب اُمور پیروکاروں پر ایک ہی حجت سے فرض تھے کہ یہ بلند ترین راز ہیں، اِن میں غور وخوض یا ان کی صحت پر شک کرنا جائز نہیں۔ دینی سرکشی جس وجہ سے قائم ہوئی اور پھلی پھولی، اُس کی وجہ ہم نے ذکر کی کہ وہ دینی مصادر پر اجارہ داری تھی۔ اجارہ دار اللہ تک پہنچنے میں واسطہ تھے جن کے بغیر کوئی شخص ملکوت میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اُن کے بغیر اللہ تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ یہ کلیسا کا ایسا حق تھا جس میں کوئی شریک نہ تھا اور یہ کلیسا کا خود مقرر کیا ہوا تھا کیونکہ وہ خطا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے معصوم اور لغزش سے منزہ تھا۔ ویلز کلیسا کے اکابر کے حوالے سے بیان کرتا ہے:

انہیں اس چیز سے کوئی رغبت نہ تھی کہ وہ رب کی مملکت لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا کر تلاش کریں۔ وہ اِس کو بھول گئے اور کلیسا کی قوت کو ہدف بنانے لگے جو اُن کی اپنی قوت تھی۔ وہ انسانی معاملات پر مسلّط ہو گئے اور کسی بھی چیز کو خاطر میں نہ لائے حتی کہ بغض، خوف، انسانی خواہشات کا بھی لحاظ نہ کیا۔ چونکہ کلیسا کے اکابر کو اپنی بنیادوں کی صحت پر شک تھا لہٰذا انھوں نے لوگوں کو کسی مناقشے کی اجازت نہ دی۔ وہ سوالوں کو برداشت نہ کرتے تھے، اور مخالفت کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یہ اِس وجہ سے نہ تھا کہ وہ اپنے عقیدہ میں بااعتماد تھے بلکہ اس وجہ سے کہ انہیں اپنے عقائد پر اعتماد نہ تھا۔

تیرہویں صدی میں کلیسا کے بارے میں لوگوں کے شدید شبہات پیدا ہوئے جنھوں نے کلیسا کے تمام دعووں کو کھوکھلا کر دیا۔ اُس دور میں کلیسا ہر دم مضطرب اور بے چین رہتا تھا۔ وہ گمراہوں کو ہر دم ہر جگہ تلاش کرتا رہتا جیسے بوڑھی عورتیں چوروں سے خائف ہوتی ہیں اور رات کو اپنے بستر پر جانے سے قبل گھر والوں اور الماریوں کو ٹٹولتی رہتی ہیں۔ (۱۳۳)

کلیسا نے اپنے سرکش دینی اقتدار کو تقویت دینے کے لیے ایسے حقوق کا دعویٰ کیا جو صرف اللہ کے لیے مختص ہوتے ہیں۔ مثلاً بخشنے کا حق، محروم قرار دینے کا حق، شریعت سے آزاد قرار دینے کا حق وغیرہ۔ اسے اِن حقوق کے ناجائز استعمال میں کوئی تردد لاحق نہ ہوا۔ چنانچہ بخشنے کے حق سے ایک بہت بڑی تاریخی خرابی پیدا ہوئی یعنی لوگوں میں بخشش کے سرٹیفکیٹ بانٹنا جس کا تفصیلی ذکر گزر چکا ہے۔ حق حرمان ایک انتہائی موثر معنوی سزا تھی جو عیسائی افراد و معاشرے کے لیے ایک خوف ناک بلا تھی۔ جو لوگ اس سزا کے مستحق ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں۔ ان میں فریڈرک اور جرمن ہنری چہارم، انگریز ہنری دوم جیسے بادشاہ بھی تھے اور مخالف دینی راہ نما بھی جیسے آریوس۔ حتی کہ لوتھر اور کلیسا کی آرا کے مخالف محققین و علما بھی ہیں جیسے برونو (۱۶۰۰ء)، ارنسٹ رینان وغیرہ۔

کلیسا نے لوگوں کو اجتماعی طور پر بھی محروم قرار دیا۔ اِس کا شکار برطانیہ کے لوگ ہوئے جب پوپ اور انگریز بادشاہ یوحنا کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ پوپ نے بادشاہ اور اس کی قوم کو محروم قرار دیا۔ چنانچہ اُن کے کلیسا نماز سے معطل قرار دیے گئے، شادی کے انعقاد سے روک دیے گئے اور ان کے جسم قبروں میں بغیر نماز دفنائے گئے۔ لوگ ہیجان و اضطراب کا شکار ہو گئے حتی کہ یوحنا ذلیل و رسوا ہو کر اپنی خطا کا اقرار کرنے لگا اور پوپ سے بخشش کا طلب گار ہوا۔ جب پوپ نے اُس کی ذلت، عاجزی اور سچی توبہ دیکھی تو اُس کی اور اُس کی قوم کی محرومی کو دور کیا۔ (۱۳۴)

کلیسا کا ایک خاص حق یہ بھی تھا کہ وہ شریعت سے آزاد رہ سکتا ہے اور اس کے لیے ذاتی مصلحت کی بنیاد پر دینی تعلیمات سے خروج میں کوئی حرج نہیں۔ (۱۳۵)

غور کریں کلیسا نے فقط یہاں تک اکتفا نہ کیا بلکہ عملی طور پر اپنی سرکشی پر مصر رہا۔ اس نے اپنی آرا و عقیدے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کے مخالفین کے لیے لشکر جرار تیار کیا۔ مخالفین سے مراد مسلمان یا یہود نہیں بلکہ وہ نصرانی گروہ ہیں جنھوں نے عقیدے وشریعت کے کسی مسئلے میں کلیسا سے اختلاف کیا۔

عصور وسطیٰ میں اس کے واضح ترین شواہد وہ ہیں جو کاتاریوں اور والدونیوں کو پیش آئے، یہ لوگ دین سے الگ نہیں ہوئے تھے بلکہ مسیح علیہ السلام کی حقیقی زندگی کے قائل تھے اور اُس کو بذات خود کتاب مقدس سے ثابت کرتے تھے۔ انھوں نے کلیسا پر مال پرستی اور دنیا پرستی کا الزام لگایا۔ کلیسا نے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا اور پوپ 'انوسنٹ' نے جنگ کی ترغیب دی جیسا کہ ویلز کہتا ہے: اُس نے اِن گروہوں کے خلاف صلیبی جنگ کے لیے ہر کمینے اور بدمعاش کو اجازت دی کہ وہ فوج یا لشکر میں شامل ہوسکتا ہے، آتش وآہن کو استعمال کرسکتا ہے اور آزاد عورتوں کی لوٹ مار کرسکتا ہے۔ وہ حرمتوں کو پامال کرنے کے لیے ہر اُس چیز کا ارتکاب کرسکتا ہے جس کا عقل تصور کرے۔ انگریز مورخ اُس پر اضافہ کرتے ہوئے تعلیقاً کہتا ہے:

''ان صلیبی جنگوں میں خوف ناک سزاؤں اور تشدد کی وہ مثالیں ہیں جن کے سامنے بت پرستوں کے ہاتھوں مسیحیوں کے ابتلا کے اوّلین قصے بھی شرما جائیں۔ یہ انتہائی گندا خبیث تعصب مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے یکسر متعارض ہے۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ مسیح علیہ السلام نے لوگوں کے چہروں پر تھپڑ مارا ہو، اپنے مخالف شاگردوں کے لیے غصہ کیا ہو یا اُن کو کوئی چیز کھینچ ماری ہو۔ لیکن تمام پوپ اپنے اقتدار کے ادوار میں ہر اُس شخص کے خلاف مستقل کینے میں مبتلا رہتے تھے جو اپنے دل کے اندر کلیسا کے بارے میں معمولی اشکال بھی رکھتا۔ (۱۳۶)

معاملہ یہاں تک محدود نہ رہا خصوصاً اُس وقت جب کلیسا کے مخالفین کی آرا میں اسلامی اثر ظاہر ہونا شروع ہوا۔ کلیسا نے ایک دہشت ناک ادارہ پیدا کیا جس کو محکمہ تفتیش کا نام دیا گیا۔ ہم یہ بات کہنے سے نہیں رک سکتے کہ اِن محاکم تفتیش کی پہلی بھینٹ اندلس کے مسلمان تھے جو انتہائی وحشت ودرندگی کے ساتھ مکمل طور پر مٹا دیے گئے۔ پھر اِس کے بعد انھوں نے اپنی کارکردگی کلیسا کے اُن مخالفین کے لیے جاری رکھی جو مسلمان نہیں تھے لیکن اسلامی تہذیب سے کسی حد تک متاثر تھے۔ یہ محکمے اسپین سے باقی کلیسائی علاقوں کی طرف منتقل ہوئے۔ سب سے بڑا محکمہ روم کا مقدس محکمہ ٹھہرا۔ مغربی مؤرخین ابھی بھی اُس کا تذکرہ کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں۔ ان بھینٹ چڑھے ہوئے افراد کا کیا حال ہوگا جن کی روحیں نکل گئیں یا وہ قیدی جن کو انتہائی اذیت ناک سزاؤں کا مزا چکھایا گیا؟

اُس دور کا انسان مطمئن ہو کر اپنے گھر میں سوتا اور پھر رات کی کسی گھڑی اٹھا لیا جاتا۔ کئی مہینوں بلکہ کئی سالوں قید میں رہتا اور اسے معلوم تک نہ ہوتا کہ اُس پر الزام کیا ہے؟ اُس کے مخالف پڑوسی کا محکمہ تفتیش کے سامنے اتنا کہنا کافی ہوتا کہ اس نے فلاں کو رُویا، تثلیث یا معجزات کے بارے میں فلاں فلاں بات کہتے ہوئے سنا ہے۔ اگر ملزم اپنے الزام سے انکار کرتا تو محکمہ اُس کو سخت عذابوں سے دوچار کرتا۔ وہ اُس کے ایک ایک عضو کو اُس کی آنکھوں کے سامنے کاٹ دیتے، اُس کے گوشت کو قینچی کے ساتھ کاٹ دیتے اور آخر کار اس کو جلا ڈالتے۔ (۱۳۷)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ محکمے تاریک جیلیں تھیں جو زیرِ زمین عذاب کے خاص کمروں پر مشتمل ہوتیں۔ وہاں ہڈیاں توڑنے اور انسانی جسم کو پیسنے کے آلات ہوتے۔ داروغے پاؤں کی ہڈیاں پیسنے سے ابتدا کرتے پھر سینے کی ہڈیاں اور پھر بتدریج سر اور ہاتھ کی ہڈیاں، حتی کہ سارا جسم چورا چورا کر دیا جاتا۔ اور وہ دوسری جانب ٹوٹی ہوئی ہڈیوں، گوشت اور خون کے لوتھڑوں کی شکل میں باہر نکلتا۔ محکمہ کے پاس ایسے تابوت کی شکل میں آلات بھی تھے جس میں تیز چھریاں لگی ہوتی تھیں۔ وہ قربانی کے جانور کو تابوت میں ڈالتے پھر اس پر تابوت بند کر دیتے تو اس کے جسم کا ایک ایک ریشہ الگ ہو جاتا۔ پھر خم دار آنکڑوں والے آلات تھے جو زیرِ تعذیب شخص کی زبان میں گاڑے جاتے پھر اُن کو کھینچا جاتا۔ یہی آنکڑے عورتوں کے پستانوں میں پیوست کیے جاتے حتی کہ وہ کٹ جاتے۔

اِس کے علاوہ عذاب کی کئی ایسی صورتیں تھیں جن کے ذکر سے دل گھبراتا ہے۔ (۱۳۸)

اس خوف ناک دہشت کے باعث عرصہ دراز تک لوگوں کے جسم کلیسا کے ذکر پر کانپتے رہے۔ کئی بڑے فلاسفہ اور ناقدین خاموشی سے کلیسا کے مظالم دیکھتے رہے لیکن اُن میں اتنی جرأت پیدا نہ ہو سکی کہ وہ صراحت سے کہہ سکتے کہ وہ مسیحیت پر ایمان نہیں رکھتے حالانکہ اُن کی آرا مسیحیت کی تعلیمات کے بالکل نقیض ہوتی تھیں۔ اس دور کے نمایاں ترین علما جیسے **نیوٹن (۱۷۲۷ء)، بیکن (۱۶۲۶ء)، ڈیکارٹ، کانٹ** وغیرہ نے کلیسا کے کمزور عقائد کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں کی، خصوصاً تثلیث، پیدائشی گناہ گاری، استحالہ کے عقائد۔ وہ کم از کم اس کی اعلانیہ مخالفت بھی نہ کر سکے۔ عام طور پر اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو مسیحیت کے باطل عقائد کے بارے میں شعور ہی نہ تھا۔ لیکن یہ جواب درست نہیں کیونکہ یہ علما علم وفن کے دیگر میدانوں میں خوب ماہر تھے۔ اس موضوع کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کو ہم بعد میں لیں گے۔ ان شاء اللہ

برنٹن کہتا ہے: مغربی معاشرے میں کئی لوگوں کی یہ طاقت وہمت نہ تھی کہ وہ صراحت کے ساتھ اجتماعی طور پر الحاد یا لاادریت یا اللہ کے ساتھ اتصال کا اعتراف کر سکیں یا کوئی بھی ایسا عقیدہ جو مسیحیت کے خلاف ہو۔ ایسا صرف آخر کی چند مختصر صدیوں میں ممکن ہوا۔ چونکہ تمام لوگ مسیحی تھے، اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ مسیحیت تمام لوگوں کے لیے سب کچھ ہو۔ قدیس **فرانسس، ارازمس، بویولا، میکاولی، پاسکل، رزلی، نپولین، گلیڈسٹون، جون راک فیلر** یہ سب مسیحی ہی تو تھے۔ (۱۳۹)

② سیاسی سرکشی:

یہ بات طبعی ہے کہ دین کے اکابرین کا اپنی امت کے اندر سیاسی اثر ورسوخ ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ بات لازم ہے کہ تمام معاملات بالخصوص سیاست متدین مومن جماعت کے ہاتھ میں ہو جو اللہ کی شریعت کو نافذ کرے اور عملی زندگی میں قائم کرے۔ جو بات سرے سے غلط ہے وہ یہ ہے کہ دین کے اکابرین خود طاغوت اور پیشہ ور سیاست دان بن جائیں۔ وہ اللہ کی شریعت کو پھینک دیں اور لوگوں کو دین سے دور کر دیں۔ یہ کسی طرح درست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں کہ دین کے اکابر لوگوں پر اپنے تسلّط اور استبداد کا شوق پورا کریں۔ چنانچہ کلیسا پر اس بارے میں کوئی حرج نہ تھا کہ وہ بادشاہوں کے انحرافات درست کرتے اور ان پر دباؤ رکھتے، جب بادشاہ دینی تعلیمات کو پامال کرتے اور اللہ کے احکام سے تجاوز کرتے تو وہ اُن کو دین کے دائرے میں واپس لے آتے اور ایک اللہ کی عبادت پر پابندی کرواتے۔ یہ مسیحی اکابرین کی ذمہ داری تھی۔ لیکن معاملہ اس کے الٹ ہوا۔ کلیسا خود دین مٹانے لگا اور شریعت معطل کرنے لگا پھر اس پر دیدہ دلیری یہ تھی کہ بادشاہوں اور امرا پر بھی دباؤ ڈالنے لگے۔ وہ اُن سے عاجزانہ اطاعت کا مطالبہ کرتے اور اُن کی اہلیت کا معیار فقط اِس بات کو بناتے کہ وہ کلیسا کی خدمت و اطاعت کس قدر ادا کرتے ہیں۔ انہیں اللہ کی حدود کی حفاظت اور منہج کی کوئی پروا نہ تھی۔ یہ بڑا عیب ناک اور رسوا کن معاملہ تھا۔ لیکن یہ عملاً مسیحی کلیسا کے عین عروج کے زمانے میں ہوا۔

یورپی نفسیات نے ایک خوف ناک تکلیف کا سامنا کیا جس کے گہرے اثرات آج تک موجود ہیں۔ یہ ایک شدید کشمکش تھی جو کلیسا اور بادشاہوں کے مابین برپا ہوئی۔ ایک سخت مقابلہ کہ معاشرے اور افراد کی حمایت کس کو حاصل ہو۔

جنگ پوپ اور شہنشاہوں کے مابین نہ تھی جیسا کہ یورپی تاریخ بتلاتی ہے بلکہ یہ جنگ دو متصادم گروہوں کے مابین تھی جو کسی طرح ایک دوسرے سے مختلف نہ تھے۔ بس اُن کے نعرے جدا جدا تھے جن کے پس پردہ خالص دنیوی خواہشات ایک جیسی تھیں۔

یورپ کے بادشاہ اس بات سے تنگ دل ہوتے تھے کہ سخت گیر کلیسا ہر معاملے میں دخل اندازی کرتا ہے۔ وہ اس مداخلت کا کوئی جواز نہ سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں دین کے اکابرین کا فقط ایک امتیاز تھا کہ وہ بزرگی یا تقدّس کے مالک تھے۔ یورپی بادشاہ خود کو کلیسا سے کم مقدس نہ سمجھتے تھے۔ اگرچہ اپنے نفس کی پاکیزگی کے اعتبار سے مقدّس نہ تھے لیکن اپنے نسب کے اعتبار سے تو مقدّس تھے۔

فشر کہتا ہے: یورپ میں حاکم خاندان اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے اپنا نسبی تعلق بعض بزرگوں یا مقدس ہستیوں سے ملاتے تھے۔ اس طرح وہ تقدّس کے وارث بن جاتے تھے۔ پھر عوام اُن کے بے جا تصرفات کی پرواہ نہیں کرتی تھی کیونکہ وہ مقدس تھے۔ (۱۴۰)

انگلینڈ کا بادشاہ ایڈورڈ اول اور فرانس کا بادشاہ فلپ جمیل جرأت کر کے یہ کہ بیٹھے: ''بادشاہ کے ذمہ نہیں کہ وہ جنت کے حصول کے لیے پوپ کی اطاعت کرے۔ بادشاہ اور پوپ میں سے ہر ایک اپنی مملکت میں سردار ہے اور اُن کی عوام اُن کے ساتھ ہے''۔ (۱۴۱)

اس اعتبار سے بادشاہوں کی خواہش تھی کہ کلیسا اپنا سیاسی و دینی دباؤ بند کرے۔ وہ کلیسا کی بنیادوں کو نہیں توڑنا چاہتے تھے اور نہ ہی اُس کی تعلیم سے خروج کرنا چاہتے تھے۔

لیکن دونوں کا رُخ ایک دوسرے کے الٹ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بادشاہ کا کلیسا کے سامنے فرماں بردار ہونا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فقط نفلی کام نہیں بلکہ واجب ہے جو دینی مرکزیت اور روحانی غلبے کا تقاضا ہے۔

پوپ 'نکولا اول' کا اعلان شدہ بیان آیا، جس میں تھا: ''اللہ کے بیٹے نے کلیسا پیدا کیا کہ رسول پطرس اول کو اپنا رئیس بنایا اور روم کے اسقف پطرس مسلسل اور مستقل وارث بنے۔۔۔اسی لیے پوپ زمین کی سطح پر اللہ کا نمائندہ ہے۔ وہ اعلیٰ قیادت کا حق دار ہے اور اسی کے لیے تمام مسیحیوں پر سب سے بڑا اقتدار واجب ہے، چاہے وہ حاکم ہوں یا محکوم ہوں''۔(۱۴۲)

استبدادی مزاج کا حامل پوپ گریگوری ہفتم نے اعلان کیا کہ کلیسا اپنے الٰہی نظام ہونے کی وجہ سے اِس لائق ہے کہ وہ عالمی قوت کا مالک بنے۔ یہ پوپ کا حق ہے اور زمین میں اللہ کے نائب ہونے کا تقاضا کہ وہ نااہل بادشاہوں کو الگ کرے اور حالات کے تقاضوں کے مطابق حکام کو نصب کرے۔''

اس نے بادشاہ اور عوام کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا: کون نہیں جانتا کہ بادشاہ اور امرا اللہ کی معرفت نہیں رکھتے، وہ سخت گیر اور غدّار ہوتے ہیں اور ہر قسم کے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے حقوق کا اُس عوام سے مطالبہ کرتے ہیں جو لالچ، اندھے پن اور اکھڑپن میں اُن سے کسی طرح کم نہیں۔(۱۴۳)

اس میں کوئی شک نہیں کہ بالعموم کلیسا کو قرونِ وسطیٰ میں غلبہ رہا۔ کیونکہ وہ روحانی امور، گہرا تنظیمی ڈھانچہ اور مطلق استبداد کے مالک تھے۔

اسی وجہ سے پوپ بادشاہوں اور شہنشاہوں کی تاج پوشی کرتے تھے۔ وہ اپنی پسند وناپسند کے مطابق بادشاہوں کو معزول کرتے یا برقرار رکھتے۔ کسی بادشاہ کی کلیسا کے سامنے انکار کی گنجائش نہ ہوتی۔ جو تسلیم ورضا سے انکار کی کوشش کرتا اُس کی حکومت غیر قانونی قرار پاتی۔ پوپ کا یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے خلاف صلیبی جنگ کا اعلان کرے اور اُس کی عوام کو محروم قرار دے۔ اِس پر یورپی تاریخ سے گواہی لانا مشکل نہیں اِس کی کئی مثالیں ہیں۔ شاید اس کی بہترین مثال وہ مشہور واقعہ ہے جو جرمن شہنشاہ ہنری چہارم اور پوپ گریگوری کے درمیان پیش آیا۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ کسی مسئلے میں دونوں کے مابین اختلاف چھڑ گیا۔ شہنشاہ نے کوشش کی کہ پوپ کو اُس کے منصب سے علیحدہ کردے اور پوپ نے شہنشاہ کے خلاف علیحدگی کی کوشش شروع کردی۔ پوپ نے شہنشاہ کو محروم قرار دے دیا اور اُس کی عوام وامرا کو اُس کی اطاعت سے آزاد کردیا۔ عوام وامرا نے پوپ کے فیصلے پر لبیک کہا۔ امرا نے ایک مجلس منعقد کی اس میں یہ قرارداد پاس کی کہ جب تک شہنشاہ پوپ کے جرمنی آنے پر اُس سے معافی نہ مانگے تو اس کا اقتدار معطل رہے گا۔ شہنشاہ اپنی رعایا کے مابین خارش زدہ مریض کی طرح ہوگیا۔ اُس کے بس میں نہ رہا کہ وہ پوپ کے آنے کا انتظار کرے۔ اُس نے اپنی شان وشوکت کو دیوار پر مارا۔ رختِ سفر باندھا اور الپ کے پہاڑوں کو عبور کرکے سخت سردیوں کے موسم میں پوپ کے پاس پہنچا۔ وہ تین دن تک قلعے کے میدان میں برف میں کھڑا رہا۔ وہ راہبوں کے لباس میں تھا، معمولی کمبل کو اوڑھے ہوئے، پیروں اور سر سے ننگا۔ اس نے چھڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ وہ شرمندگی اور توبہ کی تمام نشانیاں ظاہر کررہا تھا۔ حتیٰ کہ اُس کو معافی مل گئی اور عظیم پوپ راضی ہوگیا۔(۱۴۴)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برطانیہ میں اس کے مثل ایک اور واقعہ ہوا: بادشاہ ہنری دوم اور تھامس بکٹ جو کنٹربری کے اساقفہ کا رئیس تھا، کے مابین نزاع واقع ہوگیا۔ بادشاہ نے ایک دستور مقرر کیا جس کے مطابق کلیسا کے اکابرین کے زیرِ استعمال کچھ گھوڑوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ رئیس اساقفہ بھی دھوکے سے قتل ہوگیا۔ اس واقعہ پر پوری مسیحیت گھبرا اٹھی اور اُس نے ہنری سے بدلے کی کوشش شروع کر دی۔ اُس کو محروم قرار دیا گیا۔ بادشاہ اپنے کمرے میں بند ہوگیا۔ وہ تین دن تک کوئی کھانا چکھ نہ سکا۔ اُس نے قاتلوں کو پکڑنے کا حکم صادر کیا اور پوپ سے درخواست کی کہ وہ اُس کو جرم سے بری کر دے اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے گناہ کا کفارہ اُس طریقے سے دے گا جس سے وہ راضی ہوگا۔ اُس نے سابقہ متنازعہ دستور کو لغو قرار دیا۔ کلیسا کو اُس کے تمام حقوق واپس کیے۔ لیکن اُس کو معافی نہ مل سکی۔ وہ نادم ہو کر کنٹربری زائر کی حیثیت سے آیا۔ آخری تین میل سخت پتھروں پر ننگے پاؤں چلا حتی کہ ان سے خون ٹپکنے لگا۔ وہ اپنے مردہ دشمن کی قبر کے سامنے لیٹ گیا، اُس نے راہبوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اُس کو کوڑوں سے ماریں۔ اس نے اس سزا کو برداشت کیا اور پوپ اور اس کے پیروکاروں کی رضا جوئی کے لیے ہر اہانت کو قبول کیا۔ (۱۴۵)

سب سے بڑا لیڈر جس نے کلیسا کی قوت کو چیلنج کیا اور لمبی مدت اُس کا مقابلہ کیا، شہنشاہ فریڈرک دوم تھا۔ اس کے غیر لچک دار رویے میں اسلامی اثرات نمایاں تھے جو اس کو تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئے تھے۔ وہ اسلامی تہذیب سیکھنے کے شوق میں عربی کا اچھا زبان دان بنا۔ حتی کہ کلیسا نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ کلیسا نے اُس کو زندیق اعظم قرار دیا۔ جدید معاصر مفکرین اس کو دنیا کا عجوبہ قرار دیتے ہیں اور بعض کے نزدیک وہ پہلا ماڈرن یا جدید انسان تھا۔

اس کے اور گریگوری ہفتم کے درمیان جھگڑا واقع ہوگیا کیونکہ اُس نے مشرق پر صلیبی حملہ کی مخالفت کی تھی۔ کلیسا بادشاہوں کو اپنا فرماں بردار لشکر شمار کرتا تھا چنانچہ پوپ نے اُس کو محروم قرار دیا اور ایک اعلانیہ رسالے میں اس کی بدعات و گناہوں کو گنوایا اور تشہیر کی۔ اب شہنشاہ پر بھی لازم تھا کہ وہ بھی اپنے رسالے یا اعلان کے ذریعے اس تہمت کا دفاع کرے۔ ویلز بیان کرتا ہے کہ شہنشاہ کا رسالہ تاریخ میں انتہائی اہمیت کا حامل دستاویز ہے کیونکہ وہ اولین صریح بیان ہے کہ پوپ اور سیکولر حکام کے درمیان جھگڑا اس دعوے میں تھا کہ عالم مسیحیت پر حاکم مطلق کون ہے؟ یہ جھگڑا راکھ میں دبی ہوئی ایک مستقل چنگاری تھی جو مختلف مواقع پر مختلف انداز میں بھڑک اٹھتی تھی۔ فریڈرک نے واضح طور پر معاملے کو عوام کے سامنے بیان کر دیا۔ عوام کے پاس طاقت آ گئی کہ وہ کلیسا کے خلاف اتحاد کو قائم کریں۔ (۱۴۶)

لیکن فریڈرک واحد مثال ہے جو محرومی کی قراردادوں اور باغی کلیسا کی سطوت کے سامنے نہ جھکا۔ یورپی تاریخ اس طرح کی دوسری مثالیں پیش نہیں کر سکتی۔ ہاں کئی نسلوں کے بعد اس طرح کی کئی مثالیں پیدا ہوئیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ مالی سرکشی:

انسان بغیر کسی مبالغے کے یہ کہہ سکتا ہے کہ مسیحی اناجیل نے کسی چیز سے اتنا نہیں روکا جتنا مال و دولت اکٹھا کرنے سے روکا ہے۔ اور کسی چیز سے اتنی نفرت نہیں دلائی جتنی دُنیا اور اس کی چمک دمک سے دلائی ہے۔ حتی کہ اناجیل میں تحریف کے باوجود اُن خوب صورت مثالوں کو دیکھا جا سکتا ہے جو مسیح علیہ السلام نے دنیا کی فانی زندگی کے متعلق بیان کیں۔ اس طرح مسیح علیہ السلام کی عملی زندگی بھی اُن کے بلیغ مواعظ کی تائید میں ہے۔ وہ اور ان کے حواری متقی و زاہد تھے۔ وہ اُن خزانوں کو حقارت و کراہت کی نظر سے دیکھتے تھے جو اُن کے ہم جنس یہود نے اکٹھے کیے ہوئے تھے۔

پھر آنے والی صدیوں میں لوگوں نے دیکھا کہ کلیسا کا دنیا کے بارے میں تصور اس کے عمل سے مختلف ہے۔ کلیسا نے اتنا تشدد کیا کہ اللہ کی حلال کردہ پاکیزہ چیزوں کو بھی حرام کر دیا اور دنیا کے متعلق بدھ مت کے منحوس رویے کو اپنا لیا۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ اِس دوران اُس کی اپنی سیرت دنیا پر مرمٹنے اور پیروکاروں کا خون چوسنے والی تھی۔ کلیسا اتنا مال دار ہو گیا کہ دولت مند یہودی اور بڑے بڑے جاگیردار بھی اُس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے جن کو کلیسا دنیا پرست قرار دیتا تھا۔

مسیح علیہ السلام نے کہا تھا: ''اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے بہ نسبت یہ کہ کوئی مال دار اللہ کی بادشاہت میں داخل ہو''۔ (۱۴۷)

وہ اپنے شاگردوں کو کہتے تھے: ''تم سونا چاندی اور تانبے کو اکٹھا نہ کرو، نہ اپنے علاقوں میں اور نہ راستے کے لیے زادِ راہ کے طور پر، اور نہ دو دو کپڑے، نہ جوتے اور نہ لاٹھی''۔ (۱۴۸)

جس وقت کلیسا اپنے پیروکاروں کو سادگی اور زُہد کی تعلیم دے رہا تھا، اُس وقت وہ بذات خود مسیح علیہ السلام کی وصیتوں اور اپنی دعوت و تبلیغ کے خلاف عمل کر رہا تھا۔

کرسون کہتا ہے: ''مسیحی نیکیاں جیسے فقیری، تواضع، قناعت، روزہ، ورع، نرم دلی، یہ سب باتیں مومنین، چھوٹے پادری، قدیس اور خطبات و مواعظ کے لیے بہترین تھیں لیکن شہروں کے بڑے بڑے اساقفہ اور دینی پیشواؤں کی صورت حال دوسری تھی۔ شان و شوکت، عورتوں کے ساتھ خوش طبعی، خاص مجالس میں نمود و نمائش، ساز و سامان کے چھکڑے، خدام، بڑے بڑے منافع، عہدے اور آمدنیاں اُن کو نصیب تھیں''۔ (۱۴۹)

کلیسائی سرکشی کے مظاہر:

ہم کلیسائی سرکشی کے مظاہر کا خلاصہ اِس طرح بیان کر سکتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① جاگیردارانہ املاک:

ڈیورانٹ کہتا ہے: اراضی کے مالکین میں کلیسا جاگیرداروں سے بھی آگے بڑھ گیا مثلاً 'فلدا' کا گرجا گھر ۱۵ ہزار چھوٹے محلات کا مالک تھا اور سانت جول کا گرجا دو ہزار زرعی غلاموں کا مالک تھا۔ اور کوین فیتور (ایک دینی پیشوا) ۲۰ ہزار زرعی غلاموں کا مالک تھا اور بادشاہ خود گرجوں اور پادریوں کے رئیس کی مدد کرتا تھا۔ کلیسا غلاموں کے حقوق کا ویسے ہی مالک بنتا جیسے جاگیردار بنتے تھے۔ دینی پیشواؤں کو ڈیوک اور کانٹ وغیرہ جیسے القاب عطا کیے جاتے جیسے جاگیرداروں کو دیے جاتے۔ اس طرح کلیسا جاگیردارانہ نظام کا ایک جزو بن گیا۔ ان کی دنیوی جائیدادیں اور جاگیردارانہ حقوق واُصول ہر دین دار مسیحی کو شرمندگی میں مبتلا کرتے۔ دین سے خارج لوگ ان دینی پیشواؤں کا مذاق اڑاتے۔ یہی دنیوی جاہ وحشمت شہنشاہ اور پوپ کے مابین جھگڑے کی بنیاد بنی رہتی۔ (۱۵۰)

② اوقاف:

کلیسا وسیع وعریض زرعی اراضی کا مالک تھا جو اُس کے لیے عام وقف تھی۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ وہ ان کی آمدن کو گرجا کے رہائشیوں، کلیساؤں کی تعمیر اور صلیبی جنگوں کے اخراجات پر خرچ کرتا ہے۔ لیکن اُس نے اوقاف کی ملکیت میں اسراف کیا حتی کہ کلیسا کی اراضی بعض ملکوں میں اتنی بڑھ گئی کہ اس کی تصدیق مشکل ہو جاتی ہے۔ کلیسا کا مصلح 'ویکلف' جو کہ اوائل مصلحین میں سے ہے کہتا ہے: ''کلیسا انگلینڈ کی ایک تہائی اراضی کا مالک ہے اور بھاری ٹیکس وصول کرتا ہے۔ اُس نے ان اوقاف کے ضبط کا مطالبہ کیا۔ اس نے دین کے سربراہان پر الزام لگایا کہ وہ قیاصرہ کے پیروکار ہیں، اللہ کے پیروکار نہیں''۔ (۱۵۱)

③ عشور:

کلیسا نے اپنے تمام پیروکاروں پر عشر کا ٹیکس لاگو کر رکھا تھا۔ کلیسا زرعی زمینوں اور جاگیر کی پیداوار کا دسواں حصہ لینے کا حق دار قرار پایا۔ وہ کسانوں کے علاوہ محنت کشوں اور اصحابِ حرفت سے بھی دسواں حصہ وصول کرتا تھا۔

ویلز کہتا ہے: ''کلیسا ٹیکس اکٹھے کرتا تھا اور اس کی فقط اپنی وسیع عریض ملکیت میں ہی مداخلت نہ تھی بلکہ اس نے اپنی رعایا پر بھی عشر کے ٹیکس لاگو کر رکھے تھے۔ وہ اس ٹیکس کو احسان اور صدقے کے طور پر نہیں لیتا تھا بلکہ اس کو ایک حق کے طور پر مانگتا تھا''۔ (۱۵۲)

کسی شخص کو انکار کی ہمت نہ تھی۔ عوام بذات خود اُس کے فرماں بردار تھے۔ اور بادشاہ اُس کے ساتھ لڑائی جھگڑے سے ڈرتے تھے اور اُن کے باہمی مشترکہ مفادات بھی ایسے تھے کہ وہ خود کلیسا کو اسبابِ بقا فراہم کرتے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹالسٹائی (۱۹۱۰ء) کہتا ہے:

کلیسا کے افراد کے دلوں پر اقتدار کی محبت اُسی طرح غالب تھی جیسے حکومت کے افراد پر غالب تھی اور دینی پیشوا جہاں ایک طرف کلیسا کی قوت کو مضبوط کرتے تو دوسری طرف حکومت کی قوت کو مضبوط کرتے۔ (۱۵۳)

اسی وجہ سے دونوں قوتوں کے مفاد کا تقاضا تھا کہ حالات جوں کے توں قائم رہیں۔

④ سال کا پہلا ٹیکس:

اوقاف اور عشور بھوکے کلیسا کی بھوک نہ مٹا سکے چنانچہ اُس نے عوام پر دیگر ٹیکس بھی لاگو کر دیے خصوصاً ہنگامی اور استثنائی حالات کے جیسے صلیبی جنگیں اور مقدس موسم۔ رعایا کے کندھے ٹیکسوں کے بوجھ سے جھک گئے۔ یوحنا بائیس پوپ کے منصب کا والی بنا تو وہ ایک نئی بدعت لایا یعنی سال کا پہلا ٹیکس۔ یہ دینی یا جاگیردارانہ امور میں سال کے پہلے داخلے پر مشتمل تھا۔ یہ کلیسا جبری طریقے سے وصول کرتا اور اس طرح کلیسا ایک نئی مالی آمدن کا مالک بن گیا۔ (۱۵۴)

⑤ تحائف وعطیات:

کلیسا بہت زیادہ تحائف وصول کرنے کا عادی تھا۔ جاگیردار یا مال دار لوگ خوش آمدید یا کے لیے تحائف پیش کرتے تھے اور بعض لوگ احسان وصدقے کے لیے بھی عطیہ دیتے تھے۔ یہ بات درست ہے کہ کلیسا اُس کا مطالبہ نہ کرتا تھا۔ لیکن اگر لوگوں کو پتہ نہ ہوتا کہ کلیسا دنیا کا حریص ہے اور اس کو عطیات کے ذریعے اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے تو وہ ایسا نہ کرتے۔ گویا وہ کلیسا کے غیض وغضب سے ڈرتے تھے کہ اُن کو کم از کم موت کے وقت بخشش سے محروم نہ کر دیا جائے۔ اور یہ محرکات بخشش کے پروانوں کے بعد مزید طاقتور ہو گئے۔ کلیسا پر پیش ہونے والے عطیات اور دینی پیشواؤں کی دولت خوب پھل پھول گئی۔ جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ کلیسا کے جشن اور مقدس موسم تھے جن کی وجہ سے کلیسا کے افراد پر زائد مال کی بارش ہوتی۔ مثلاً ۱۳۰۰ء میں یوبیل کا جشن منعقد ہوا اور زائرین کی ایک بھاری عوام روم میں جمع ہوئی۔ جس سے پوپ کے خزانوں میں اتنا مال جمع ہو گیا کہ اہل کار تحائف کو پھاوڑوں سے اکٹھا کرتے تھے۔ یہ تحائف **پطرس** ولی کی قبر کے پاس ڈالے گئے تھے۔ (۱۵۵)

⑥ بیگار:

یہ بات گزر چکی ہے کہ کلیسا جاگیروں کا غلاموں سمیت مالک ہوتا تھا۔ اور بعض دینی پیشوا ہزاروں کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعداد میں غلاموں کے مالک ہوتے تھے۔لیکن اس کے باوجود کلیسا مطمئن نہ ہوا۔اُس نے اپنے پیروکاروں کو کھیتوں اور دیگر منصوبوں میں مفت کام کرنے پر مجبور کیا جیسے کلیساؤں کی تعمیر، مینار وغیرہ۔لوگوں پر لازم تھا کہ وہ ان کے احکامات کی پابندی کریں اور کلیسا کے فائدے کے لیے محدود مدت کے لیے مفت کام کریں اور وہ عموماً ہفتہ میں ایک دن ہوتا تھا۔وہ اِس کے مقابلے میں کسی جزا یا شکریہ کے حق دار نہ ہوتے تھے۔

اسی طرح جمہور عوام کلیسا کے مالی و عملی بوجھ تلے دَب رہے تھے۔بادشاہ، شہنشاہ اور چھوٹے پادری اس کو محسوس بھی کرتے تھے اور اپنا احتجاج باور کرانے کے لیے موقع بھی تلاش کرتے تھے۔

جن لوگوں نے واویلا کیا اور ان کی جرأت نے ان کو اعلانیہ احتجاج پر مجبور کیا، اُن میں ایک فرانس کا بادشاہ لوئیس نہم تھا۔اُس نے پوپ کو اپنے دور کے لحاظ سے ایک اہم احتجاجی خط لکھا۔جس میں اس نے لکھا کہ جو شخص دودھ دوہنے میں سختی کرتا ہے تو بالآخر تھنوں سے دودھ کی بجائے خون نکلنا شروع ہو جاتا ہے۔

۱۲۴۶ء میں لیون مقام پر ایک دینی مجلس منعقد ہوئی جس میں دینی پیشواؤں نے ایک خاص شکایت پر غور و خوض کیا جو بعض افراد کی طرف سے پیش کی گئی جس میں پوپ اور کلیسا اعظم کے مطالبات کے خلاف استغاثہ کیا گیا۔(۱۵۶)

لیکن یہ احتجاج اور استغاثے ناکام ہوئے اور کلیسا کو اپنے موقف سے نہ ہٹا سکے۔معاملات اسی طریقے پر جاری رہے حتی کہ کلیسا کے خلاف دیگر عوامل بھی جمع ہو گئے جن پر اللہ کے حکم سے آگے گفتگو آئے گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:٤

کلیسا اور علم کی باہمی کشمکش

یورپ کی فکری تاریخ میں دین اور علم کی باہمی کشمکش سب سے گھمبیر مسئلہ رہی ہے۔ عہد بیداری سے لے کر عصرِ حاضر تک یہ کشمکش علم کے موید ین اور دین کے حامیوں کے درمیان پوری شدت سے قائم ہے۔ اگرچہ مغربی زندگی کے عام مظاہر یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ معرکہ ختم ہو چکا ہے اور علم اپنے دشمن پر مکمل غلبہ پا چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ دلائل بھی قوی ہیں کہ دین یا اُس کے بعض اعتقادی وسلوکی مسائل آج بھی پچھلے ادوار کی طرح طاقتور ترین ہیں۔ خاص طور پر جبکہ مغربی تہذیب نے انیسویں صدی کے اُن افکار کا انکار کر دیا ہے جو اطلاق وعموم اور عقلیت پر مبنی سمجھے جاتے تھے اور بیسویں صدی کے افکار قبول کر لیے ہیں جو اضافیت اور لامعقولیت پر مبنی سمجھے جاتے ہیں۔

اِس لیے بہت سارے مفکرین کا یہ خیال ہے کہ معرکہ نہ کبھی ختم ہوا ہے اور نہ ختم ہوگا۔ اور یہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک بنی نوع انسان باقی رہے گا۔ یورپ کی اِس فکر میں اُس کی دوئی والی نفسیات کا عمل دخل ہے جو فقط اِس لیے تشکیل پائی کہ وہ ہمیشہ دو متضاد طاقتوں کے سامنے جھکا رہا اور دو متناقض افکار پر لمبی مدت تک ایمان قبول کیے رکھا۔

بہت کم لوگوں نے اِس مستقل معرکہ کے پیچھے چھپے ہوئے راز کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ بھی کسی حتمی آخری نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مشکل مسئلے کے حقیقی سبب کو آسانی سے تلاش کرنا ممکن ہے۔ لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے ہر ایک اپنے فخر وغرور کو ترک کرے اور مسئلے پر خالص قدر و قیمت متعین کرنے والی نظر ڈالے۔ ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کے پاس نصف حقیقت موجود ہے۔ کوئی بھی فریق دوسرے پر مکمل طور پر غالب نہیں۔

اس بدیہی حقیقت کو علم و دین کی باہمی کشمکش پر لاگو کریں تو ہم محسوس کریں گے کہ علم نے دین کو جن پہلوؤں سے شکست دی ہے، وہ درحقیقت عقل ویقین کے بجائے خرافات اور وہم پر مبنی تھے۔ اسی طرح دین جن امور میں سخت حملوں کے باوجود ڈٹ گیا، یہ درحقیقت وہ مسائل ہیں جو دین کے وحی شدہ مضبوط حقائق ہیں، جو جدید علوم کے ظنون، تخمینات اور اہوا پر غالب آئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم نہایت اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ طرفین میں سے جس کے پاس جتنا حق تھا، وہ غالب آیا اور غالب آتا رہے گا۔ اگر یورپی دین خالص حق ہوتا اور یورپی علم مجرد یقین کا حامل ہوتا تو سرے سے معرکہ واقع ہی نہ ہوتا۔ وہ دین جو خالص الٰہی رنگ میں رنگا ہوا تھا، وہ تو اس معرکہ میں داخل ہی نہیں ہوا۔ یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ ہم یورپی کشمکش کو کلیسا اور علم کے مابین کشمکش قرار دیں نہ کہ دین اور علم کے مابین۔

یہ بات زیادہ افسوس ناک ہے کہ یورپی دینی پیشواؤں نے علم کے حامیوں پر جو ستم ڈھائے وہ زیادہ خوف ناک تھے۔ لیکن اس کشمکش کے افسوس ناک نتائج کے ذمہ دار دونوں فریق ہیں۔

اصل میں کلیسا نے ایک ہی وقت میں دو بھاری غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے:

ا۔ اول: وحی الٰہی کے حقائق میں تحریف اور اُس کو بشری کلام سے خلط ملط کرنا۔

ب۔ دوم: کلیسا کا اُن معاملات میں مداخلت کرنا جو اُس کا دائرہ اختصاص نہ تھا۔

پہلی غلطی سے یہ بات واقع ہوئی کہ وثنی خرافات اور بشری معلومات مسیحی تعلیمات میں داخل ہو گئیں۔ کلیسا نے ان کو الٰہی عقائد قرار دیا جن کا انکار دین کا انکار سمجھا گیا۔

دوسری غلطی کلیسا کی تنگ نظری سے پیدا ہوئی۔ کلیسا نے اپنی ملغوبہ تعلیمات کی خلاف ورزی پر اندھی سختی کی۔ پہلے کلیسا فقط اپنے دینی معاملات میں استبداد کا مظاہرہ کرتا تھا پھر اس نے لوگوں کے عام فکری امور میں مداخلت شروع کر دی۔ کلیسا نے لوگوں کے مخصوص اعتقادات پر ہی محاسبہ نہ کیا بلکہ اُن کے طبائع اور عمومی افکار پر بھی نگرانی شروع کر دی۔ کلیسا نے اس کو ممکن سمجھا حالانکہ یہ تو کسی بھی جابر قاہر قوت کے بس میں نہیں کہ وہ لوگوں کے سوچنے پر پابندی لگا سکے۔ یہ ایسی عام حقیقت ہے جو حسی تجربہ اور عقل سلیم سے تعلق رکھتی ہے۔ اس طرح کلیسا نے اپنے آپ کو بلاضرورت خطرناک میدانوں میں داخل کر دیا۔ اس نے اپنے اوپر خود ایک خوف ناک جنگ مسلط کر دی۔

اِس میدان میں کلیسا نے پہلا کام یہ کیا کہ علم پر قبضہ کرنے اور انسانی فکر پر تسلط قائم کرنے کی کوشش کی۔ برمحن کہتا ہے:

''عصور وسطی کے زمانے میں علمی سرگرمیوں کے حامل افراد دینی اداروں سے بھی کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوتے تھے۔ وہ کلیسا کا حصہ ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں کلیسا کی وہ حیثیت تھی جس کا آج ہم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کلیسا انسانی زندگی سے متعلق ہر سرگرمی میں مداخلت کرتا تھا۔ خاص طور پر عقلی سرگرمیوں پر اُس کا خاص تسلط تھا''۔۔۔ ''چنانچہ جو لوگ کلیسا سے تعلیم حاصل کرتے تھے، وہ لوگوں کی عقلی زندگی پر قابض ہوتے تھے۔ چنانچہ کلیسا خود ہی لیکچرز، صحافت، نشر و اشاعت، لائبریری، سکول اور کالج کے قائم مقام ہوتا تھا''۔ (۱۵۷)

روی علاقوں میں فلسفیانہ میلانات رکھنے والے، چاہے وہ کلیسا کے افراد ہوں یا عام مسیحی، وہ علم و فلسفہ کے میدان میں یونانی ورثے خاص طور پر ارسطو اور بطلیموس سے متاثر تھے۔ انھوں نے اپنے دینی عقائد اور فلسفیانہ آرا کے مابین تطبیق دینے میں اپنی کوششیں صرف کر دیں۔ اِس سے ایک خاص مرکب فلسفہ پیدا ہوا جو مسیحی فلسفہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہلاتا ہے۔ یہ یونانی نظریات، تورات وانجیل کے ظواہر اور قدیم مذہبی پیشواؤں کے اقوال کا مجموعہ تھا۔ اُس زمانے میں علم وفلسفہ ایک ہی شمار ہوتا تھا۔ مسیحی فلاسفہ نے اپنی فلسفہ کی عمارت میں ہر وہ چیز داخل کردی جوان کے زمانے میں انسانی علم کے واسطے سے پہنچی، چاہے وہ کوئی عقلی نظریات ہوں یا جغرافیائی وتاریخی نظریات۔ کلیسا نے اپنے مخلوط فلسفے کے ذریعے اپنے ناقدین اور معترضین کو دبانے کی کوشش کی۔(۱۵۸)۔ چنانچہ اس نے اپنے نظریات کو قانونی طور پر نافذ کردیا۔ مقدس کونسلوں نے اس کی اجازت فراہم کی حتی کہ یہ فلسفیانہ نظریات مسیحی عقیدے کا جزوقرار پائے اور تحریف کی کاریگری نے بعض معلومات کو مقدس کتابوں کے متن میں داخل کردیا۔

ابھی یورپ کے عہد بیداری کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ ارسطو کے فلسفہ، طب اور عناصر اربعہ کے نظریات، بطلیموس کا یہ نظریہ کہ زمین کائنات کا مرکز ہے، مسیحیت کے اُصول دین میں داخل ہوگئے۔ اس کے علاوہ سینٹ آگسٹائن اور کلیمان اسکندری اور تھامس اکوینی نے جو اضافے کیے، وہ بھی ایسے مقدس عقائد قرار پائے جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔

یہ مسیحی فلسفہ کائنات کے متعلق تفصیلی معلومات پر مشتمل تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اللہ تعالی نے اِس دنیا کی پیدائش ۴۰۰۴ ق م سے کی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کلیسا انیسویں صدی تک اسی رائے پر ڈٹا رہا۔ ۱۷۷۹ء میں اسقف آشر کی کتاب طبع ہوئی جس میں یہ نظریہ موجود تھا۔(۱۵۹)

طوفان کی تاریخ میں تورات کی تقویم کا اختلاف ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ مدت کے مطابق یہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے ۲۲۶۲ سال بعد واقع ہوا۔(۱۶۰)

اس کا مطلب ہے یہ واقعہ ۱۷۴۲ ق م ہوا۔ یہ ایک دلچسپ لطیفہ ہے کہ کلیسا کی مجلس نے دسویں صدی کے آغاز میں ہی یہ اعلان کردیا کہ یہ صدی اِس جہان کی آخری صدی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالی نے اپنے بیٹے کے نزول اور جہان کے خاتمے کے دوران فقط ایک ہزار سال کا وقفہ بنایا ہے۔(۱۶۱)

طبی معلومات کو دیکھیں تو علاج کا سب سے بہتر اور سب سے عمدہ طریقہ یہ قرار پاتا ہے کہ شیطانوں کو بھگانے کے لیے رسومات بجالائی جائیں کیونکہ شیطان ہی مرض کا سبب ہیں۔ اس طرح صلیب کی طرف اشارے کی رسم ادا کی جائے۔ اور کنواری مریم کی تصاویر اور سینٹ وغیرہ کی تصاویر کو مریض کے سر کے نیچے رکھی جائیں تاکہ وہ صحت یاب ہوجائے۔ یورپ نے اپنی بیداری اندلس، سسلی اور جنوبی اٹلی کے اسلامی تہذیبی مراکز سے حاصل کی۔ یہ اسلامی مراکز اِس براعظم پر علم ومعرفت کی برکھا برسا رہے تھے جو جہل وخرافات میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورپی عقل اپنی نیند سے بیدار ہوئی اور مسلمانوں سے بحث وتحقیق کے مناہج سیکھنے لگی جو کسی بھی خارجی دباؤ سے آزاد ہوکر علمی محنت وکاوش کے عادی تھے۔

کلیسا کے پیشواؤں کا غیض وغضب ان لوگوں پر ٹوٹ پڑا جو کفار (مسلمانوں) کے علوم حاصل کررہے تھے اور مقدس تعلیمات سے اعراض کررہے تھے۔ چنانچہ اُس نے ہر جگہ پر تفتیشی محکمے قائم کردیے جو لوگوں کا شکار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے اور اُن کو کئی طرح کا عذاب چکھاتے۔ کلیسا نے نئے پاپائی منشورات جاری کیے جو سابقہ عقائد کو مضبوط کرتے اور مخالفین کو محروم یا ملعون قرار دیتے۔ اس طرح معرکہ کا آغاز ہوا اور یہ آگ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھڑکتی چلی گئی۔

کلیسا کی بدقسمتی کہ کائنات کے متعلق نظریات، دیگر انسانی نظریات سے قبل ظاہر ہوئے اور اُن کی صحت کو وقت نے مجموعی طور پر صحیح ثابت کر دیا بخلاف دیگر نظریات جو صحیح ثابت نہ ہو سکے۔ اس طرح کلیسا کا مقدر ٹھہرا کہ وہ کھوٹے نظریات سے قبل صحیح و کھرے نظریات سے ٹکرایا۔ جب اس کا پہلا معرکہ ناکام ٹھہرا تو دیگر معرکوں میں شکست آسان ہوگئی۔ ہم اس کشمکش کو نہایت اختصار کے ساتھ تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

اول: جدید دور کا آغاز اور سترہویں صدی:

وہ نظریہ جس نے کلیسا کو پہلی دفعہ ہلا کر رکھ دیا، کاپرنیکس (۱۵۴۳ء) کا فلکیاتی نظریہ تھا۔ اِس نظریے سے قبل کلیسا علم و معرفت کا واحد مصدر تھا۔ اور اُس کا نظریہ کائنات بطلیموسی تھا جس کے مطابق زمین کائنات کا مرکز ہے اور تمام آسمانی اجرام اُس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ (۱۶۲)

جب کاپرنیکس کا نظریہ بطلیموس کے نظریے کے برعکس ظاہر ہوا تو اُس کے لیے محکمہ تفتیش کا سامنا لازم ٹھہرا۔ لیکن وہ اُس سے بچ گیا۔ اس لیے نہیں کہ وہ ایک پادری تھا بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنی کتاب کے چھپنے کی کچھ مدت بعد مر گیا۔ محکمہ کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اُس کو سزا دے سکتا۔ لیکن کلیسا نے اس کی کتاب 'حرکات الاجرام السماویۃ' کو ممنوع قرار دیا۔ کلیسا نے کہا کہ اِس کتاب میں جو کچھ ہے وہ شیطانی وسوسے ہیں جو انجیل کی روح کے منافی ہیں۔

کلیسا نے سمجھا کہ شاید یہ نظریہ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن ایک اور شخص 'جردانو برونو (۱۶۰۰ء)' نے کاپرنیکس کی وفات کے بعد اس کے نظریے کو زندہ کر دیا۔ چنانچہ محکمہ تفتیش نے اس کو پکڑ لیا اور جیل میں چھے سال تک ڈالے رکھا۔ جب وہ اپنی رائے سے باز نہ آیا تو کلیسا نے اس کو ۱۶۰۰ء میں جلا دیا۔ اُس کی راکھ ہوا میں اڑا دی اور اس کو دوسروں کے لیے عبرت کا نشان بنا دیا۔

کچھ سالوں بعد 'گلیلیو' نے ایک دوربین ایجاد کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اُس نے تجربات سے وہ کچھ ثابت کر دیا جو پہلے نظریاتی طور پر ثابت تھا۔ چنانچہ اس کو گرفتار کر کے محکمہ تفتیش کے سامنے پیش کیا گیا۔ کچھ مدت کے لیے اُس کی قید کا بندوبست کیا گیا اور تین سال کے لیے ہر ہفتہ میں سات مرتبہ ندامت کے اشعار پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ (۱۶۳)۔ جب اُس نے اپنی زندگی پر خوف محسوس کیا اور اسے اپنا انجام برونو جیسا ہوتا محسوس ہوا تو اُس نے اپنی رائے سے پھرنے کا اعلان کیا۔ وہ محکمے کے رئیس کے سامنے قدموں کے بل جھک کر یہ کہہ رہا تھا:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''میں گلیلیو ہوں، میں عمر کے ستر سال گزار چکا ہوں، میں آپ کی عزت، شان وشوکت کا اقرار کرتا ہوں۔ کتاب مقدس میرے سامنے ہے اور میں اس کو اپنے ہاتھ سے چھوتا ہوں۔ میں زمین کی گردش کے غلط الحادی قول کو حقیر ملعون اور مردود قرار دیتا ہوں۔'' اس نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ محکمہ کو ہر ملحد کے بارے میں رپورٹ کرے گا جو شیطان کے اس گمراہ کن نظریے کا حامل ہوگا''۔(۱۶۴)

یہ لوگ اِس نظریے کے راہنما تھے اور کلیسا نے اِن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ یہ بات عجیب وغریب نہیں کہ کلیسا نے ان کو عذاب کا نشانہ بنایا اور ان کے افکار سے جنگ کی بلکہ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ انھوں نے اِس نظریے کی تکذیب کے لیے جو دینی دلائل پیش کیے، وہ تاریکی اور خرافات پر مبنی تھے۔

کلیسا کہتا تھا: ''زمین کے لیے لازم ہے کہ وہ کائنات کا مرکز ہو کیونکہ اقنوم ثانی یعنی مسیح علیہ السلام اسی زمین پر انسانی جسد میں تشریف لائے ہیں۔ اور یہیں پر اُن کی نجات اور فدیہ کا عمل مکمل ہوا اور اسی زمین میں عشائے ربانی تناول کیا گیا۔ تورات کہتی ہے کہ زمین ہمیشہ قائم رہے گی اور سورج طلوع وغروب ہوتا رہے گا۔ وہ اپنے طلوع کے مقام کی طرف دوڑتا رہے گا''۔(۱۶۵)

کلیسا نے زمین کے گول ہونے اور اُس کے دوسری طرف آبادی ہونے کا رد اس دلیل سے کیا: ''یہ کتنی بے ہودہ رائے ہے کہ انسان یہ عقیدہ رکھے کہ کچھ لوگ زمین کے ایک طرف آباد ہیں جن کے پاؤں زمین کی دوسری طرف دوسروں کے سروں سے اوپر ہیں۔ اسی طرح نباتات اور درخت ہیں جو نیچے کی طرف اگتے ہیں۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو لازم تھا کہ مسیح زمین کی دوسری سمت بھی تشریف لاتے اور ان کی نجات کے لیے بھی سولی پر وفات پاتے''۔(۱۶۶)

اسی طرح جونہی سترہویں صدی کا آغاز ہوا تو کوپرنیکس، برونو اور گلیلیو کے اثرات پھیلتے چلے گئے اور یورپ کے عمومی فلسفے میں راسخ ہوتے چلے گئے۔ کئی لوگوں کا اعتماد کلیسا پر سے اٹھ گیا اور وہ اُس کی معلومات پر شک کرنے لگے۔ اِس نظریے کو بڑی اہمیت دی گئی کیونکہ اِس کی بدولت تجربہ اور عقل کو حقائق تک پہنچنے کا اعلیٰ ذریعہ شمار کیا گیا۔ اس طرح نت نئے فلسفیانہ مسائل کو اپنی جگہ بنانے کے لیے موقع میسر آیا۔ یہ سوچ وفکر کہ اصول واقدار ہمیشہ مطلق اور مستقل ہوتے ہیں پورے یورپ کی عقلیت پر غالب تھی، لیکن اب وہ اپنا مقام کھونے لگی اور انسان کی قدر وقیمت اور وجود کا مقام ومرتبہ بھی گرنے لگا۔

سترہویں صدی میں جھگڑے نے ایک نئی صورت اختیار کی۔ گلیلیو کی دوربین اور کلیسا کے دلائل کا جھگڑا، نصوص اور عقل ونظر کا جھگڑا قرار پایا۔

تجدید کے داعی اور علما عقل کی تقدیس کا مطالبہ کرنے لگے اور یہ کہ وہ وحی سے الگ تھلگ معرفت کا ایک مستقل ذریعہ ہے۔ شروع شروع میں عقلی مذہب کے داعیوں نے وحی کے کلی انکار کی جرأت نہ کی بلکہ دونوں کے لیے ایک خاص دائرہ مقرر کیا جس میں وہ اپنے طور پر عمل کریں گے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس زمانے میں ڈیکارٹ کا مذہب فلسفیانہ مذاہب میں سب سے زیادہ واضح تھا۔ اس نے عقلی منہج کو فکر وحیات میں تطبیق دینے کی دعوت دی اور کسی وجہ سے دین، عقائد کلیسا اور نصوص مقدسہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ اس کا خیال تھا: ''علم کا میدان فطرت ہے اور اس کا موضوع فطری قوتوں کا استعمال ہے۔ اس علم کے آلات 'ریاضت وتجربہ' ہیں۔ جبکہ دین کا تعلق عالم آخرت سے ہے اور وہ اعتقاد وتسلیم پر اعتماد کرتا ہے۔ چنانچہ علم ودین میں کوئی تنازعہ نہیں اور دونوں ایک دوسرے کے خلاف کوئی حجت نہیں رکھتے۔(۱۶۷)

ڈیکارٹ کی یہ دوئی (ڈوئلزم) بیکن کے تجرباتی منہج میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اُس کے حوالے سے اینڈرسن کہتا ہے: ''بیکن کے کارناموں میں سب سے بڑا کارنامہ بشری علم کو وحی الٰہی سے الگ کرنا ہے۔'' بیکن کہتا ہے: ''عقلی اعتبار سے مکمل غلط قضیہ، دین کی نظر میں مکمل طور پر صحیح ہوسکتا ہے۔''(۱۶۸)

حقیقت یہ ہے کہ دوئی کا یہ نظریہ وحی کے مطلق ایمان سے مطلق انکار کی طرف ایک تدریجی فطری مرحلہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر کچھ فلسفی ایسے بھی تھے جن کو دوئی کا نظریہ پسند نہ تھا۔ کلیسا کی بے ہودہ آرا اور اس کے خلاف غیض وغضب نے ان کو براہ راست دینی تعلیمات پر حملہ کرنے پر مجبور کیا۔

سپائی نوزا اپنے یہودی ہونے کے سبب ان سب سے زیادہ سخت تھا۔ اس نے عقلی منہج کو بذات خود کتاب مقدس پر لاگو کیا۔ اور ایسی بنیادیں وضع کیں جن پر تاریخی نقد کے مکتب فکر کا قیام برپا ہوا۔ اس مکتب فکر کا خیال تھا کہ دینی کتب کو بھی اُسی انداز سے پڑھنا واجب ہے جس طرح تاریخی اسناد یا تاریخی کتب پڑھی جاتی ہیں یعنی یہ انسانی ورثہ ہیں، وحی الٰہی نہیں۔ اس طرح سپائی نوزا نے کچھ ایجابی نتائج بھی ثابت کیے۔

مثلاً اس نے نتیجہ نکالا کہ تورات کے اسفار کو موسیٰ علیہ السلام نے نہیں لکھا۔ اس نے دلیل دی کہ تثنیہ کے باب میں موسیٰ علیہ السلام کی موت کا ذکر آیا ہے اور اس باب کا کاتب کہتا ہے: اس جیسا نبی اس کے بعد نہیں آیا''۔ اسی طرح اس نے ثابت کیا کہ تورات نے کچھ ایسی جگہوں کے نام لیے جو موسیٰ علیہ السلام کے صدیوں بعد مقرر کیے گئے''۔(۱۶۹)۔ اسی طرح پاسکل نے ابدی گناہ کے عقیدہ پر تنقید کی۔ وہ کہتا ہے: ''انسانی عقل کے لیے کوئی بات اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوسکتی کہ وہ پیدائشی گناہ گار ہے۔ یہ عقل کے خلاف ہے کہ انسان کو ایسی غلطی کی سزا دی جائے جو اس کے اسلاف میں سے کسی نے چار ہزار سال پہلے کی تھی۔(۱۷۰)

جان لاک نے ڈیکارٹ سے اگلا قدم اٹھایا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ تعارض کے وقت وحی کو عقل کے تابع کیا جائے۔ وہ کہتا ہے: ''جس نے عقل کو پابند کرنے کی کوشش کی تاکہ وحی کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ اُس نے دونوں کی روشنی کو بجھا دیا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص کسی کو اس بات پر راضی کرے کہ وہ دونوں آنکھیں پھوڑ ڈالے اور بدلے میں اس مدھم روشنی سے استفادہ کرے جو ایک دوربین کے واسطے سے ایک دور دراز ستارے سے حاصل ہو رہی ہو''۔(۱۷۱)

اسی طرح جان لاک نے یورپی زندگی میں ایک نئے اصول کو لاگو کرنے کی دعوت دی۔ یہ دینی رواداری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا اصول تھا یعنی ہر شخص کو یہ حق دینا کہ وہ جو چاہے دین یا مذہب اختیار کرے اور جس کا چاہے انکار کرے۔

لیکن ان قائدین کی تنقید وحی اور آسمانی کتابوں کے صریح انکار تک نہ پہنچی۔ وہ تفتیشی محکموں کی پکڑ دھکڑ سے خاموش ہو گئے یا کم از کم مسیحی معاشرے کے دباؤ کے تحت چپ سادھ لی کیونکہ مذہب بہر حال عوام کو عزیز تھا۔

ڈیکارٹ، سپائی نوزا، اور لوک جیسے لوگوں کی کتابوں کو جلایا اور ضائع کیا گیا۔ اسی طرح کلیسا کی طرف سے اُن کو شخصی طور پر ایذا اور تکلیف کا نشانہ بنایا گیا۔ پھر ہر جگہ علم کا جوالہ مکھی پھٹ پڑا اور مسیحی اندرونی اختلافات کی وجہ سے ملحدین پر وہ توجہ نہ دی جا سکی جو ان پر پہلے دی جاتی تھی۔

اس طرح کائنات کے متعلق جدید نظریات نے فلسفیانہ افکار سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی اور دینی و علمی طبقے کو برابر متاثر کیا۔ اِن نظریات میں سب سے اہم اسحاق نیوٹن کا قانون کششِ ثقل تھا۔

اسحاق نیوٹن اُس سال پیدا ہوا جس سال گلیلیو فوت ہوا (۱۶۴۲ء)۔ اس کا کام گلیلیو کے کام کا تتمہ شمار ہوتا ہے۔ گلیلیو نے ۱۶۰۴ء میں پنڈولم کے قانون کو دریافت کر کے اس بات کو ممکن بنایا کہ فطری مظاہر کی تفسیر خارجی قوتوں کی مداخلت کے بغیر بھی ممکن ہے (۱۷۲)۔ یہ انکشاف مذہب فطرتیت (Naturalism) کی جڑ کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اِسی طرح میکانکیت کے نظریے کا بعد میں بڑا وسیع اثر ہوا۔

کلیسا نے اِس نظریے سے جنگ کی اور اِس کے حاملین پر طعن و تشنیع کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اشیا بذات خود عمل نہیں کرتیں بلکہ اللہ کی عنایت و توفیق اُن کو چلاتی ہے۔ اُس وقت کلیسا کا اُفق اتنا تھا کہ وہ لوگوں کو یہ حقیقت سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ اللہ تعالیٰ افعال کے اعتبار سے فاعل حقیقی ہے اور اسباب محض واسطہ ہیں اور اُن میں کوئی منافات نہیں۔ لیکن کلیسا نے ہر نئی چیز کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا۔ اِس طرح مخالف نظریے والے دوسری انتہا پر پہنچ گئے۔ اُن کی تعبیر کے مطابق ہر عمل مستقل بالذات ہے اور علت و معلول کا نتیجہ ہے۔ اُس میں اللہ تعالیٰ کے تعلق کی کوئی ضرورت نہیں اور نہ اس کی مداخلت فرض کرنے کی۔

جب نیوٹن نے نظریہ کششِ کو ریاضی کے قانون کے ساتھ پیش کیا تو پڑھے لکھے گروہوں کی عقلیں حیران ہو گئیں۔ دین کے دشمنوں نے اس کو ایک طاقتور اسلحہ کے طور پر استعمال کیا حتیٰ کہ اس کا نام نیوٹونین انقلاب رکھا گیا۔ انھوں نے اس کو ایک عظیم کامیابی قرار دیا۔ ان کے نزدیک اِس خارق قانون کے ساتھ پوری کائنات کی تفسیر ممکن تھی جیسا کہ کوپرنیکس، برونو اور گلیلیو کے نظریات بھی یہی دلالت کرتے تھے۔ اسی دوران کلیسا کا موقف ہل گیا۔ اس کے کمزور دلائل پہلے سے زیادہ کسمپرسی کا شکار ہو گئے۔ وہ سختی پر مجبور ہو گیا۔ اُس کے افراد نے نیوٹن پر دھاوا بول دیا جو اللہ کے وجود پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کے خلاف یہ دلیل دی گئی کہ اُس کا نظریہ اللہ کے انکار تک پہنچاتا ہے۔ اِس نظریے سے یہ لازم آتا ہے کہ اللہ کی کائنات پر کوئی توجہ نہیں۔ نیوٹن نے ثابت کیا کہ وہ اس توقع میں حق بجانب ہیں لیکن نظریے کے بارے میں اُن کا موقف غلطی پر مبنی ہے۔ اور غلط موقف نے ہی غلط نتیجے تک پہنچنے میں مدد کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ نیوٹن کا نظریہ اپنے دور کے لحاظ سے یورپی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہونے والا علمی نظریہ تھا۔ اس نے مغربی مادی فکر کی بنیاد ڈالی اور **طبعی و عقلی مکتب فکر** کا راستہ ہموار کیا۔ اللہ پر ایمان لیکن وحی کے انکار جیسا الحاد بذات خود اس نظریے کو قریب یا دور سے چھو کر گزرتا ہے۔ لیکن اس طرح کے آثار بعد میں ظاہر ہوئے۔

سترہویں صدی کے نتائج نے مفکرین کے لیے ممکن بنا دیا کہ وہ اُن سے کلیسا دشمنی پر مبنی علمی نظریات کو تشکیل دیں۔ کوپرنیکس اور نیوٹن کے نظریات سے تین نتائج پیدا ہوئے جو برٹرینڈ رسل کے خلاصے کے مطابق اس طرح ہیں۔

① حقائق کی بنیاد مشاہدہ پر رکھی جائے نہ کہ روایت پر جو غیر تائید شدہ ہوتی ہے۔ (روایت سے مراد نصوص ہیں)

② غیر حیوانی جہان اپنے اندر ایک متفاعل نظام ہے جو بذات خود جاری وساری ہے۔ اس میں تمام تر تغیرات قوانین طبعی کے تحت ہوتے ہیں۔

③ زمین کائنات کا مرکز نہیں۔ اگر زمین کے وجود کا کوئی ہدف ہو تو بھی انسان اُس زمین کا ہدف نہیں۔ مزید یہ کہ ہدف سوچنے کی فکر ایسی فکر ہے جس کا علمی اعتبار سے کوئی فائدہ نہیں۔ (۱۷۳)

سترہویں صدی کلیسا اور اس کی مبادیات کے خلاف سخت ردعمل کی صدی تھی۔ اس طرح یہی صدی تفتیشی محکموں کی صدی تھی۔ جدید مفکرین وعلما نے کئی قسم کی ابتلاؤں اور وحشیانہ سلوک کا سامنا کیا۔ ایسی فہرستیں تیار کی گئیں جن میں ممنوع کتابوں کے نام ہوتے تھے۔ اِن کتابوں میں سے کسی کا انسان کے ساز وسامان میں پایا جانا تفتیشی محکمے کی ایذا رسانیوں کا سبب بنتا تھا۔

کلیسا نے تجدید کی ہر کوشش کا مقابلہ کیا اگرچہ وہ نفع بخش اور خیر پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اُس نے جرمنی کے بلدیاتی صدر کو کافر قرار دیا کیونکہ اُس نے روشنی کی گیس ایجاد کی تھی۔ کلیسا نے دلیل دی کہ اللہ نے رات کو رات بنایا اور دن کو دن بنایا۔ وہ اپنی ایجاد کے ذریعے خالق کی مشیت کو تبدیل کرنا چاہتا ہے کہ رات کو دن بنا رہا ہے۔ (۱۷۴)

جدید فکر کی روح ظاہر ہوتے ہی کلیسا کا اثر ورسوخ مضمحل ہونے لگا۔ اسے پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے اپنے دلائل کا پورا زور لگانا پڑا جبکہ عام حالات میں اُسے اِس کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ تعلیم یافتہ لوگوں نے اِس موقع کو غنیمت سمجھا۔ انہیں محسوس ہوا کہ تقدیر نے اُن کے سامنے ایک جادوئی کنجی پھینک دی ہے جس کے ذریعے وہ کلیسا کی جیل اور بیڑیوں سے آزاد ہو سکتے ہیں اور یہ کنجی 'علم و تجربہ' کی کنجی تھی۔

لوگوں کا مسیحیت پر اس قدر مضبوط ایمان تھا کہ اس کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا تاہم لوگ دینی پیشواؤں کے سخت خلاف ہو گئے جو واضح طور پر سرکش تھے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ سترہویں صدی میں مفکرین وفلاسفہ دین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ حقیقت میں اندھے انتقام کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ ایک ردعمل تھا جس کی کوئی واضح سمت نہ تھی۔ اس کا واحد ہدف کلیسا کی غلامی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے آزادی تھی۔ لیکن ہم نے کہاں جانا ہے؟ ہم کیسے بھاگیں گے؟ یہ اُن کو معلوم نہ تھا۔

نظریہ نیوٹن کے فلسفیانہ اثرات کے تحت ایک منظم لادین فکر ظاہر ہونے لگی۔ جو کلیسا اور اس کے عقائد کے خلاف تعصب وسلبیت کی حامل تھی۔

شاید ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نظریہ نیوٹن نے فکری طور پر فقط فرانسیسی انقلاب کی ہی راہ ہموار نہیں کی بلکہ ڈارون تک پہنچنے کا نصف راستہ بھی طے کیا۔

نیوٹن کے اثرات اٹھارویں صدی تک پھیلے ہوئے ہیں جو کلیسا کے زوال اور نئے معبودان کی پیدائش کی صدی تھی۔

دوم: اٹھارویں صدی:

اٹھارویں صدی اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں ہر چیز پر عام شک کی فضا پیدا ہوئی۔ ایسے متنوع ایجابی فلسفے ظاہر ہوئے جن کا مرکز ومحور فقط دو لفظ 'عقل' اور 'فطرت' تھے۔ درحقیقت یہ دو بت تھے جن کو کلیسا کی قید سے بھاگنے والوں نے گھڑ لیا تا کہ وہ خوف ناک خدا کی جگہ اِن کو پوج سکیں۔

عقل ڈیکارٹ کی دوئی (ڈوئلزم) کی پابند نہ رہی، اُس نے اپنی ذات کی تلاش شروع کر دی تا کہ اپنے الگ رستے پر ویسے چل سکے جیسے کوئی بالفعل الٰہ ہوتا ہے۔ فلاسفہ اور محققین کی آوازیں بلند ہوئیں کہ عقل ہی واحد فیصلہ کن اتھارٹی ہے۔ عقل کے سوا سب کچھ وہم اور خرافات ہے۔ وحی عقل کے مخالف ہو تو وہ لازماً جھوٹی خرافات ہے۔ معجزات عقل کے مطابق نہیں ہوتے لہٰذا ان پر ایمان ممکن نہیں۔ اسی طرح فدائیت، صلیب، رہبانیت وغیرہ گمراہ کن رذیل عقائد ہیں کیونکہ یہ عقل کے ساتھ منسلک نہیں۔ اس صدی کا دوسرا بت فطرت تھا۔

سول کہتا ہے: ''جن لوگوں نے ایمان باللہ کو مکمل طور پر ترک کر دیا تھا، ان پر لازم تھا کہ وہ اس کا کوئی متبادل تلاش کریں۔ چنانچہ انھوں نے اُس کو فطرت میں پایا''۔ (۱۷۵)

مغربی فکر کی کتابیں اُس دور کو فطرت کی عبادت ومعبودیت کا دور قرار دیتی ہیں۔ یہ محض مجازی اعتبار سے نہ تھا بلکہ حقیقت تھی۔ چنانچہ اللہ کی وہ تمام صفات جن کو لوگوں نے مسیحیت سے نقل کیا تھا، اُن کو فلاسفہ اپنے جدید الٰہ کے لیے استعمال کرنے لگے۔ اُن کی نظر میں دونوں الٰہوں کے مابین بہت بڑا فرق بھی تھا۔

کلیسا کا خدا سخت گیر کینہ پرور تھا جس نے نسل انسانی کو عذاب میں ڈالا۔ اس نے اپنے بیٹے کو قتل کیا صرف اس وجہ سے کہ پہلے انسان نے اُس کے باغ کا پھل کھایا تھا۔

وہ غصے والا معبود ہے جو انسان کی آزادی پر بیڑیاں لگاتا ہے، اُس کو پابندیوں سے دوچار کرتا ہے، اُس پر رہبانیت لاگو کرتا ہے اور زمین پر اپنے نمائندوں کی ذلت آمیز غلامی کو لازم قرار دیتا ہے۔

اس کے مقابلے میں فطرت کا معبود پرکشش اور کشادہ دل تھا جس کا کوئی کلیسا تھا اور نہ کوئی پابندی۔ وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسومات اور نمازوں کا مطالبہ نہ کرتا تھا۔ جس انسان سے فطری ہونے کا مطالبہ کیا جاتا وہ فوراً اُس مطالبے پر لبیک کہتا تھا۔

نئے معبود کے کوئی دینی پیشوا نہ تھے جو لوگوں کو اپنا غلام بنا کر رکھتے ہوں، نہ کوئی متناقض کتاب مقدس تھی، اور نہ ہی کوئی مقدس راز تھے۔ اِس دین کے داعی روسو، والٹیر اور دیدرو (Diderot) جیسے تھے جن کی علمی کتب تھیں جیسے انسائیکلو پیڈیا، عقد اجتماعی یا روح القوانین۔

کشش ثقل کا طبعی قانون کائنات کو منظم و مربوط قرار دیتا تھا جس میں علت و معلول کی کوئی خلاف ورزی نہ تھی۔ اسی طرح فطرت کا قانون تھا جو انسان کے لیے سعادت تامہ کا ضامن تھا۔ انسانی رسوم و رواج اور ادیان نے اِس قانون کو مٹا ڈالا تو انسان مشکلات کا شکار ہو گیا۔

یہ فطری مذہب کی مبادیات تھیں جو نکھرتی گئیں حتی کہ انیسویں صدی میں کامتے نے انسانی دین کی بنیاد رکھی۔ جس سے متعدد مادی اُصول نکلتے تھے جو کائنات کی مادی یا آلاتی تفسیر کرتے تھے جن کو قوانین فطرت کا نام دیا گیا۔

چنانچہ اٹھارویں صدی میں عقل و فطرت کی عبادت زمانے کا امتیاز ٹھہری اور اس دور کا نام عصرِ تنویر یا روشن خیالی کا دور قرار پایا۔

برنٹن اِس زمانے میں علم اور دین کی کشمکش کے مظاہر میں سے کچھ چیزیں بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''عصرِ تنویر میں عام آدمی کے لیے 'عقل' جدید دنیا کا سب سے بڑا راز تھا۔ عقل وہ چیز تھی جو لوگوں کو فطرت کے فہم کی طرف لے جاتی تھی۔ اور فطرت دوسرا سب سے بڑا راز تھا۔ فطرت کو سمجھنے کے بعد ہی اس کا رویہ و سلوک اُس کے مطابق ہو سکتا تھا۔ اور اس طرح وہ ان فضول کوششوں سے بچ سکتا تھا جن کو لے کر وہ غلط روایتی مسیحی افکار کے سائے میں کھڑا رہا اور فطرت کے اخلاق و سیاست کی خلاف ورزی کرتا رہا''۔ (۱۷۶)

''عقل بتلاتی ہے کہ رہبانیت انسان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کے ساتھ ظلم عظیم ہے۔ صحیح البدن انسانی جسم کے لیے غیر فطری ہے کہ وہ جنسی تعلق سے یکسر علیحدہ رہے۔ اس قسم کے غیر فطری رویے کو دین کی طرف سے درست قرار دینا ویسا ہی ستم ہے جیسے شیاطین مجنون کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں''۔

روایتی مسیحیت کے بس میں نہ تھا کہ اپنے ماننے والوں کو کائنات کا نظریہ عطا کر سکے۔ چنانچہ لوگ جیالوجی (علم الارض) جاننے لگے جو بتلاتی تھی کہ اسقف آشر نے تخلیق اور طوفان نوح کی جو تاریخ متعین کی ہے، وہ بعید الاحتمال ہے۔ لوگوں کو اِس انتظار کی ضرورت نہ تھی کہ وہ جیالوجی کے نشو و نما کا انتظار کرتے۔ مسیحیت میں تثلیث کا اصول ریاضی کے اُصول کے الٹ تھا۔ ریاضی کا کوئی بھی قاعدہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ تین کا عدد بیک وقت تین بھی ہو اور ایک بھی ہو۔ پھر معجزات موقوف کیوں ہو گئے جب مردوں کا احیا پہلی صدی میں ممکن تھا تو پھر اٹھارویں صدی میں مردہ زندہ کیوں نہیں ہو سکتے؟ (۱۷۷)

شاید اس دور میں کلیسا کا سب سے بڑا دشمن والٹیر تھا۔ اس نے دین اور اس کے پیشواؤں پر جو نقد اپنی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتاب ''القاموس الفلسفی'' میں کی ہے اس کی چند مثالیں حسب ذیل ہیں۔

والٹیر نے سب سے پہلے جن مسیحی عقائد پر تنقید کی وہ تثلیث، الٰہ کی تجسیم اور مقدس تصاویر تھیں۔ اُس نے پولس کو ہدف تنقید بنایا جس نے مسیحیت کو مٹا ڈالا اور اُس کی تحریف کی۔ اُس کے نزدیک مسیحیت پر ایمان ناممکنات یا ناقابل فہم امور پر عقیدہ رکھنا تھا۔ مثلاً سانپ کلام کرتا ہے، گدھا گفتگو کرتا ہے وغیرہ۔ ارازم کے بقول اِس قسم کی باتوں پر ایمان لانا جنون ہے۔

والٹیر موروثی خطا کا انکار کرتا ہے اور اُس کو اللہ کے لیے اہانت، بربریت اور تناقص قرار دیتا ہے۔ وہ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہے کہ اُس نے انسانی نسل کو پیدا کر کے عذاب میں مبتلا کر دیا صرف اس وجہ سے کہ اُن کے باپ نے اُس کے باغ سے پھل کھالیا تھا۔ (۱۷۸)

والٹیر ساتوں رسومات پر بھی کڑی تنقید کرتا ہے اور کتاب مقدس کا سخت مذاق اڑاتا ہے۔ وہ تورات میں مذکور ایک مقام کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے: اِس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ جغرافیا میں ماہر نہ تھا۔ (۱۷۹) ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے: مسیحیت کے روزے فقرا کے لیے دوا ہیں جس کو امیر نہیں لے سکتے''۔ اس کا خیال تھا: ''رسومات، شعائر، عبادات اور دینی محافل مختلف علاقائی جرائم ہیں جن کی سزا ہر دین دار شخص کو بھگتنا پڑتی ہیں۔ یہ معاشرے کے لیے نقصان دہ ہیں خصوصاً اس وقت جب وہ تقرب کی خاطر قربانیوں کی شکل میں ہو۔ اس کی سیاسی آرا اِس قول سے واضح ہیں:

''دین اور سیاست کا ایک ہونا بدترین ظلم ہے۔ اسی لیے دینی سیاست کا خاتمہ اور متبادل نظام کا قیام واجب ہے۔ دین کے اکابرین ریاست کے نظم کے پابند ہوں اور راہب قاضی کا پابند ہو''۔ اس کا کہنا تھا:

''اللہ کی اطاعت کے نام پر انسان کی اطاعت ممکن نہیں۔ انسان کی اطاعت ریاست کے قوانین کے نام سے ہونی چاہیے''۔ کلیسا ان تنقیدوں سے شدید برافروختہ ہوا۔ اس نے والٹیر اور ان کے ہم نواؤں کو ملعون اور کافر قرار دیا۔ اُن کی کتابوں پر پابندی لگائی گئی۔ والٹیر کو دینی پیشواؤں کی طرف سے اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے دور کے انسان کو مخاطب ہو کر کہا: ''تو تفتیشی محاکم کے پنجروں کا پرندہ ہے۔ تفتیشی محاکم نے تیرے پَر کاٹ دیے ہیں''۔ (۱۸۰)

انگلینڈ میں جیبون نے اپنی کتاب ''روی امپیریلزم کا زوال'' میں مسیحیت پر تاریخی نقد کو پروان چڑھایا۔ ہیوم نے تشکیک کے مکتب فکر کی بنیاد رکھی۔ اور یہ گزشتہ صدیوں کے طویل اندھے ایمان کا نفسیاتی انتقامی ردعمل تھا۔

یہ ذکر کرنا مناسب ہے کہ عصرِ تنویر میں طبعی و عقلی مکتب فکر اور نظریہ نیوٹن سے مسیحی دنیا میں دو نئے مکاتب فکر پیدا ہوئے جو انسان کی ایمانی محرومی، خجلت اور زیاں کا پتہ دیتے تھے:

اولاً: ڈی ازم یعنی معبود کو فقط رب ''پرورش کنندہ'' ماننا' لیکن وحی کا انکار کرنا۔ یہ مذہب درحقیقت الٰہ کے انکار کی طرف ایک قدم تھا کیونکہ مسیحی کے لیے الٰہ سے عدم الٰہ کی طرف ایک دم منتقل مشکل تھا۔ برمن کہتا ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''یہ مذہب نیوٹن کے بیان کردہ طبعی عالم کی قریب ترین تصویر تھا جو ایک نظام اور قانون کے تابع چلتا تھا۔ اس مذہب میں الٰہ وہ مسئول شخصیت تھی جو اس آلاتی دنیا کی تدبیر، تعمیر اور تحریک کی ذمہ دار تھی''۔

اس مذہب کے زعما میں سے 'والٹیر اور باب' کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ تھے جو عوام کے سامنے ایمان باللہ کو ضروری سمجھتے لیکن وحی کا انکار کرتے تھے۔ کیونکہ وحی کے اثبات کا مطلب اپنے دشمن کلیسا کی تعلیمات کو صحیح قرار دینا تھا۔ اور اُن کے ایمان باللہ کا مطلب حقیقی ایمان نہ تھا۔ ان کے نزدیک اِس الٰہ کا کام فقط اتنا تھا کہ اُس نے کائنات کو پیدا کیا پھر اُس کو چھوڑ دیا جو اپنے تشکیل کردہ قانون کے مطابق چلنے لگی۔ اِسی کو نیوٹن نے اس سے پہلے واضح کیا تھا۔ یہ الٰہ گھڑی ساز کے مشابہ قرار دیا گیا جو گھڑی کو چلا کر چھوڑ دیتا ہے اور وہ خود بخود چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح انسان کو عقل دی گئی اور اُس کے معاملات کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ وہ عظیم کائنات کی مشین کا ایک جز ہے مگر اُس پر لازم ہے کہ اپنی عقلی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے اور قانون فطرت کے قدم بقدم چلے۔''

اس مذہب کے نزدیک گھڑی ساز کے مشابہ الٰہ کے لیے نماز کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ اپنے ارادے کے باوجود یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اپنی تخلیق میں مداخلت کر سکے۔

اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ یہ الٰہ صحرائے سینا میں موسیٰ کے لیے ظاہر نہیں ہوا اور نہ اُس نے اپنا بیٹا زمین میں بھیجا تاکہ گناہ گار انسانوں کو نجات دے۔ بلکہ اُس کے لیے بیٹا ہونا ممکن ہی نہیں۔ (۱۸۱)

ثانی: الحادی مادی مذہب: الٰہوں والے مذہب کی کمزوری نے بعض معاصرین کو اس بے کار اور ٹھنڈے الٰہ کے انکار پر اشارہ دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ ایسے الٰہ کے اختراع کی کوئی ضرورت نہیں جس کا کوئی اثر نہ ہو۔ چنانچہ والٹیر کی حکمت اسی مذہب کے مطابق الٰہ کے وجود کو نہیں مانتی لیکن فرضی طور پر اس کو تسلیم کر لیتی ہے۔ فطرت الٰہ کے وجود سے مستغنی ہے۔ اُس کے وجود کا اعتراف کلیسا کے دعووں کو صحیح قرار دینے کے مترادف ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ ہم اُس کے وجود کو بعید قرار دیں تاکہ کم از کم کلیسا کی ناک خاک آلود ہو سکے۔

ایک گروہ نے اللہ کو شر ایجابی قرار دیا۔ خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا کا الٰہ

کرسون کہتا ہے: بعض لوگ الٰہ کے اِس حد تک منکر ہوئے کہ انھوں نے ہمیں اللہ کا نام حذف کرنے کی دعوت دی۔ اس بارے میں دولباخ کہتا ہے:

''اللہ کا روایتی عقیدہ تناقض سے لبریز ہے۔ یہ نوع انسانی کی مشترکہ فکر ہے جو گمراہی پر مبنی ہے'' (۱۸۲)

یہ وہ عام نکات ہیں جو اٹھارویں صدی میں کلیسا اور دین کے مابین کشمکش سے متعلق ہیں۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ یہ کشمکش فلاسفہ اور پڑھے لکھے طبقوں تک محدود تھی۔ ابھی یہ عوام تک نہ پہنچی تھی۔ انقلابِ فرانس جو اِس صدی کے آخر (۱۷۸۹ء) میں قائم ہوا، کے بعد یہ عوام کا قضیہ بن گیا۔ اس انقلاب کے ساتھ ہی یورپی تاریخ کے نئے نشانات واضح ہوئے۔ دین اور لادینیت کے مابین کشمکش کا نیا دور شروع ہوا۔ اس پر الگ ایک باب میں گفتگو کی جائے گی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۵

فرانسیسی انقلاب

قرون وسطیٰ میں یورپی زندگی پر جو اجتماعی نظام غالب رہا وہ جاگیروں کا نظام تھا۔ شاید یہ تاریخ کا ظالم ترین اور خوف ناک ترین اجتماعی نظام ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ظلم ایک جاہلی طریقہ ہے جو کسی بھی زمان ومکان میں پیدا ہوسکتا ہے۔ لیکن مغربی یورپ میں یہ اپنی مکمل شکل وصورت میں ظاہر ہوا۔ (۱۸۳)۔ جس دور میں مشرقی مسلمان تاریخ کے بہترین عادلانہ معاشرے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اُس وقت مسیحی مغرب قابل نفرت مکروہ نظام سے دوچار تھا۔

اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ انسانی فطرت ظلم وجبر سے انکار کرتی ہے چاہے جتنا لمبا عرصہ ظلم کی حکمرانی رہے۔ اُسے جب بھی انقلاب اور ظلم کی کمر توڑنے کا موقع ملتا ہے، وہ اُس موقع کو ضائع نہیں کرتی۔

یورپی انسان نے پہلی دفعہ جاگیردارانہ مظالم کے خلاف اس وقت ردعمل ظاہر کیا جب مسلمان یورپ میں اسلامی فتوحات کے واسطے سے داخل ہوئے اور انہیں مسلمانوں سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ یہ صلیبی جنگوں کی ابتدا کا دور بھی تھا۔

یہ عجیب بات نہیں کہ فرانس کے غلام ہی جاگیرداروں کے خلاف انقلاب کے قائد بنے۔ فرانس کا جغرافیائی محل وقوع یورپی اسلامی 'اندلس' کے ساتھ متصل تھا۔ پھر تابڑتوڑ صلیبی حملے یورپ کے مرکز روم سے روانہ ہوتے تھے۔ ان باتوں نے فرانس کو آزادی اور حریت کی روح کے قریب کردیا۔

اسی طرح فرانس میں کسانوں کا پہلا انقلاب 'جاکریہ' سترہویں صدی میں واقع ہوا۔ اگرچہ یہ ناکام ہوا جیسا کہ پہلی کوششیں بالعموم ناکام ہوتی ہیں۔ لیکن اُس نے مستقبل میں کامیاب کوشش کے لیے ذہن تیار کردیا۔ پورے براعظم میں انقلابیوں کی ایک فضا تیار ہوئی۔

انقلابیوں کی کوشش فقط اس وجہ سے ناکام ہوئی کہ کلیسا بذات خود سب سے بڑا جاگیردار تھا۔ اور وہ اُن کے خلاف کھڑا ہوگیا۔

کلیسا نے لوگوں کو صرف اسلام کے نور سے ہی نہیں روکا بلکہ محبت اور درگزری کی انجیلی تعلیمات کی بھی خلاف ورزی کی۔ جاگیردارانہ امرا عوام کو دبانے اور ذلیل کرنے کے لیے مقابلہ بازی پر اتر آئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسیحیت نے جاگیردارانہ غلامی کو قدیس تھامس اکوینی کے ہاتھوں درست قرار دینے کی کوشش کی جس نے اِس کو آدم کی خطا کا نتیجہ قرار دیا۔ (۱۸۴) گویا دینی پیشوا بنی آدم میں سے نہ تھے۔ کسانوں کے انقلابیوں سے متعلق یہ حقیقت ذہنوں سے اوجھل نہ رہنی چاہیے کہ یہ انقلاب کلیسا کے خلاف نہ تھا بلکہ اُس کی جاگیردارانہ حیثیت کے خلاف تھا۔

ویلز کہتا ہے: عوام کا کلیسا پر غیض وغضب یا انقلاب دینی تھا۔۔۔ انہیں کلیسا کی قوت پر اعتراض نہ تھا بلکہ اُس کی خرابیوں اور کمزوریوں پر اعتراض تھا۔ کلیسا کے خلاف تحریکات ایسی نہ تھیں جو دین سے آزادی چاہتی ہوں بلکہ وہ دین کی مکمل پابندی طلب کرتی تھیں۔۔۔ انھوں نے پاپ پر اعتراضات کیے، اِس وجہ سے نہیں کہ وہ مسیحی دنیا کا رئیس تھا بلکہ اِس وجہ سے کہ وہ ویسا نہ تھا جیسا ہونا چاہیے۔ وہ ایک دنیا پرست مال دار راہنما تھا جبکہ اُن کے قائد کو روحانی ہونا چاہیے۔ (۱۸۵)

اس کے بعد یورپی زندگی میں واضح تبدیلیاں ہوئیں۔

مرکزی بادشاہوں نے کوشش کی کہ وہ نوابوں کو اپنی رعایا میں جذب کرلیں۔ وہ اُن کی جاگیروں کو ریاست میں مدغم کرلیں اگرچہ اُن کے لیے کئی امتیازات اور تخصصات بھی برقرار رہیں۔ یہ کارگزاری اس طرح مکمل ہوئی کہ مشرق کے راستے سے بارود کی ایجاد حکومت کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ ایک ایسا اسلحہ تھا جس کے سامنے نوابوں کے قلعے لمبے عرصے تک قائم نہ رہ سکے۔

سرداروں نے اپنے غلاموں کو خوب استعمال کیا تاکہ وہ مرکزی حکومت کے ٹیکس پورے کرسکیں جو جاگیروں پر لاگو کیے جاتے تھے۔ بادشاہوں کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ وہ غلاموں کی حالت پر غور کریں۔ اُن کی کوشش تھی کہ ٹیکس مکمل آئے چاہے جس طریقے سے آئے۔

دوسری تبدیلی جس نے تحریک کی شکل اختیار کی وہ **لوتھر، کالون، ہس** اور ان جیسے دیگر رہنماؤں کی تحریک تھی۔ اُس نے مغربی مسیحی دنیا کی ظاہری وحدت کو توڑ کر رکھ دیا۔ مرکزی کلیسا کی قوت اِس قدر کمزور ہوگئی کہ بے شمار فرقے اور مذاہب بن گئے۔

یہ تبدیلی اور سابقہ تبدیلی مل کر یورپی معاشرہ کو ادھیڑنے لگی اور بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہونے لگیں۔ یورپی شہروں کی نشوونما کی ابتدا ہوئی۔ **بورژوا طبقہ** ظاہر ہوا۔ جاگیرداروں اور شہر کے بورژوائی تاجروں کے مابین طاقتور مقابلہ شروع ہوگیا۔ بورژا طبقہ آنے والے سرمایہ کاروں کا ہراول دستہ تھا۔ (۱۸۶)

اس کے ساتھ ساتھ وہ بیداری ہوئی جو ہم نے پچھلے باب میں پیش کی ہے۔ نوٹ اور چھاپے خانے ظاہر ہوئے جو انقلاب کی نشر واشاعت میں فعال عنصر تھے۔

یہ ساری تبدیلیاں بتلاتی تھیں کہ برّ اعظم میں ایک بڑی تبدیلی کی ہوا چلنے والی ہے۔ ایک نئے زمانے کا آغاز ہے جو اپنے معیار، تصورات اور ضابطوں میں ماضی سے مختلف ہوگا۔ فرانس کے تہذیبی ومعاشرتی حالات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بات کے اہل تھے کہ وہ نئے زمانے کا افتتاح کریں۔

انقلاب سے پہلے کے سالوں میں فرانس کی سیاسی و اقتصادی بدحالی انتہا کو پہنچ گئی حتی کہ کالون قومی وزیرخانہ نے اس کا ۱۷۸۷ء میں اعتراف کیا۔ حکومت نے ارادہ کیا کہ اس میزان کو عوام پر نئے بھاری ٹیکس عائد کر کے پورے کرے۔ پسے ہوئے طبقات کے حالات زیادہ برے ہو گئے۔ شہروں میں بھوک اور بے روزگاری عام ہو گئی۔

ایک وقت آیا کہ عوام کا صبر و وبھر ہو گیا، بھوک و پریشانی اُن کو مارے جا رہی تھی۔ لیکن اُس وقت دو طبقے عیش و عشرت میں مصروف تھے اور لذتوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ دینی پیشوا اور امرا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مالک خاندان جو عوام پر بھاری بوجھ تھے۔

عوام تمام گروہوں ''کسان، محنت کش اور چھوٹے پادری'' سمیت ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے اور دوسری طرف دو اجارہ دار طبقوں ''دینی پیشواؤں اور اشراف'' کا اتحاد تھا۔

اللہ کی سنت نے فیصلہ کیا کہ عوام جلادوں پر غلبہ حاصل کرے اور قیدیوں کے سر قلم کرنے والی تلوار عیش پرست ظالم طبقے کے سر پر چلائی جائے۔

انقلاب نے نہایت دور رس نتائج پیدا کیے۔ تاریخ یورپ میں پہلی مرتبہ ایک ڈیموکریٹ لادین ریاست پیدا ہوئی۔ جس کا فلسفہ عوام کی حاکمیت تھا نہ کہ اللہ کی حاکمیت، جس کا مذہب حریت تھا نہ کہ کیتھولک ازم، جس کا اخلاق شخصی آزادی تھا نہ کہ دین کی پابندی اور جس کا دستور وضعی تھا نہ کہ کلیسائی ضوابط۔

انقلاب نے اپنے زمانے کے اعتبار سے عجیب و غریب مظاہرے قائم کیے۔ اُس نے دینی جماعتوں کو ختم کر دیا، راہب اور راہبات کو کھلا چھوڑ دیا اور کلیسا کے اموال لوٹ لیے گئے اور اس کے ہر امتیاز کو ختم کر دیا گیا۔ اس مرتبہ دینی عقائد کو اعلانیہ شدت کے ساتھ رد کیا گیا اور دینی پیشوا حکومت کے ملازم قرار پائے۔ (۱۸۷)

یہ بڑی گہری تبدیلیاں تھیں جو ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم اِن کے اسباب و محرکات پر غور کریں۔ بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد عوامل مل کر انقلاب کو کامیاب بنا رہے تھے۔ جن میں سے تین اہم تھے۔

① لادینی فکر جس نے تنویری دور کو پیدا کیا :

اس دور کا نام اس کے مخصوص مزاج کے سبب سے تھا۔ لادینی فکر کے تمام مکاتب فکر آپس میں دست و گریباں ہونے کے باوجود ایک نتیجے پر متفق تھے کہ دین کو توڑا جائے اور اُس کے اصولوں کو لوگوں کے اذہان سے باہر نکالا جائے۔ ہر مکتب فکر نے اِس مقصد کو پانے کے لیے اپنا خاص رخ اختیار کیا۔ لادینی فکر کے مشہور مکاتب یہ ہیں۔

① **علمی مکتب فکر:** جس کے لکھاریوں نے دیدرو کے زیر نگرانی انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا۔ ویلز کے بقول وہ ادیان کے اندھے دشمن تھے۔

② **معاشرتی و سیاسی مکتب فکر:** اس کا قائد روسو تھا جو عقد اجتماعی کا مصنف تھا جس کو فرانسیسی انقلاب کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انجیل کا لقب دیا جاتا ہے۔ دوسرا قائد مونٹیسکو تھا جو روح القوانین کا مصنف تھا۔ ان لوگوں کی کتابوں نے انقلاب کے زعما کو اصول وقواعد مہیا کیے۔

عقد اجتماعی کی فکر لوگوں کے لیے واضح تھی۔ اِس کا ہدف معاشرتی مفاد پر مبنی تعلق قائم کرنا اور دینی نظم واخلاق کو ہٹانا تھا۔ اس کا مقصد اللہ کی عبادت کی بجائے وطن اور قوم کے نام پر معاشرہ کی عبادت قائم کرنا تھا۔ انقلاب نے اس ہدف کو کلی طور پر حاصل کر لیا۔

یہ اشارہ دینا مناسب ہے کہ یہ فکر روسو کی ذاتی نہیں تھی۔ اس پر مثالی فلاسفہ "مدینہ فاضلہ" میں گفتگو کر چکے تھے جیسے افلاطون کی جمہوریت، تھامس مور کی یوٹوپیا اور کامپانیلا کی مدینۃ الشمس۔ افراد کے مابین اتحاد اور مفاہمت کی بنیاد لادین زندگی ہوگئی، اِس کو روسو نے عقد اجتماعی سے تعبیر کیا۔ اس کے دیگر ماخذات میں ہوبز اور میکیاولی بھی شامل تھے جنھوں نے انسان کے اندر شر کو خیر سے زیادہ طاقتور قرار دیا۔ اِسی وجہ سے روسو فلسفی سے زیادہ تخریب کار انسان تھا۔ (۱۸۸)

③ تخریبی فلسفیانہ مکتب فکر: عقل پرست فلاسفہ نے فرد و ریاست کے باہمی تعلق پر سب سے پہلے بحث کی اور ایسے معاشرے کی فکر و دعوت دی ہے جس میں دین اور ریاست ایک دوسرے سے جدا جدا ہوں۔ اُن کی فکر میکیاولی کے تصورات سے زیادہ وسیع تھی کیونکہ اِن کے نزدیک دین کو لغو کرنا واجب ہے اور اس کی جگہ پر فطری دین یا فطری قانون کی پیروی کرنی چاہیے۔ یہودی فلسفی سپائی نوزا جو کہ سیکولر فکر کا راہنما ہے اور سیکولرزم کو زندگی کا منہج قرار دیتا ہے۔ اپنی کتاب "رسالة فی اللاهوت والسیاسة ۔ مذہب اور سیاست میں ایک اہم رسالہ" میں کہتا ہے:

"یہ بات دین اور ریاست دونوں کے لیے برابر خطرناک ہے کہ کسی بھی دینی پیشوا کو ضوابط جاری کرنے اور ریاستی معاملات میں دخل اندازی کا حق دیا جائے۔ اس کے برعکس امن واستقرار اس وقت بہتر ہوگا جب وہ پوچھے گئے سوالات کے جواب پر ہی اکتفا کرے اور قدیم دینی ورثے کی پابندی کرے جو لوگوں کے ہاں زیادہ قابل اعتماد ہے اور وسیع قبولیت کا حامل ہے"۔ (۱۸۹)

والٹیر نے فطری دین کی فکر کو تکمیل تک پہنچایا جو اُسے سپائی نوزا اور لائبنتز (Leibniz) سے حاصل ہوئی تھی۔ اُس نے طبعی دین سے طبعی قانون کی فکر نکالی۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

اہل فکر وفلسفہ کا دین عمدہ دین ہے جو خرافات اور متناقض کہانیوں سے خالی ہے۔ یہ کمزور عقائد سے خالی ہے۔ فطری دین نے ہزاروں مرتبہ ہم وطنوں کو جرائم سے روکا لیکن مصنوعی دین ہر قسم کی سختی پر حوصلہ افزائی کرتا ہے وہ سازشوں، فتنوں، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار جیسے اعمال پر ابھارتا ہے۔ ہر فرد اپنے بزرگ ولی کے زیر حمایت مسرور ہو کر جرم کی طرف چلتا ہے۔"

وہ کہتا ہے: "کچھ طبعی قوانین بھی ہوتے ہیں جو انسانی اتفاق سے قائم ہوتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ اکثر لوگ فطرت سے حاصل کردہ مشترکہ حس کے مالک ہیں جن سے قوانین جاری ہو سکتے ہیں۔(۱۹۰)

روسو اور والٹیر انقلاب فرانس کے وقت زندہ نہ تھے لیکن جرمن فلسفی کانٹ (۱۸۰۴ء) زندہ تھا اور اس کی تائید میں مشہور تھا۔ اس نے عقد اجتماعی کی فکر کو اپنی کتاب "الدین فی حدود العقل وحدہ۔ دین فقط حدود عقل میں ہے" کے اندر ترقی دی۔(۱۹۱)

اسی طرح اُس کے ایک ہم عصر انقلابی مصنف "ولیم گاڈوِن" نے ۱۷۹۳ء میں کتاب "العدالة السياسية سیاسی عدل" نشر کی جو سیکولرزم کی صریح دعوت تھی۔(۱۹۲)

اس طرح اس لادینی فکر کے تحت فرانسیسی انقلاب نے قدیم فلسفیانہ فکر کو مجسم شکل دی کہ ایسا معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے جو دینی اخلاق و معیار کو رد کر دے اور خالص مفاد پرستانہ تعلقات کو رابطے کی بنیاد بنائے۔

② کلیسا کا عوامی مطالبات کی راہ میں حائل ہونا:

یہ ممکن تھا کہ مسیحی عوام اِن سیکولر مصنفین کے افکار کو قبول نہ کرتے اور اپنے راسخ عقائد کو ترک نہ کرتے۔ لیکن کلیسا اُن کے جائز مطالبات کے سامنے رکاوٹ بن گیا۔

ممکن ہے کہ کلیسا کے شکوک انقلابیوں کے بارے میں بجا ہوں لیکن اب معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ کیونکہ ہلاک ہونے والے، بھوکے اور مظلوم عوام اِس قسم کے شور و شغب والے موقعوں پر مہلت نہیں دیتے کہ کوئی مضبوط حکمت عملی بنائی جا سکے۔ عوام پر صدیوں بھر کی ظالمانہ و جابرانہ سرکشی کا قرض تھا جس کو چکانا لازم تھا۔

کسان کا سادہ ذہن روسو کے افکار اور والٹیر کے نقد کو سمجھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ آسانی سے اشراف کے سیکنڈل اور پادریوں کے رسوا کن کردار کو سمجھ سکے۔ وہ اُن کے عیوب اور بھاری بھر کم دولت کو دیکھتا تھا۔ کسانوں نے اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھا جو تھامس جفرسن نے کہا تھا:

"پادری ہر علاقے اور ہر دور میں آزادی کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ استبدادی حاکم کے حلیف ہوتے ہیں، وہ حکام کی برائیوں پر اُن کی مدد یا حمایت کرتے ہیں"۔(۱۹۳)

یہی سبب تھا کہ عوام کے ہجوم نے اپنا سارا غصہ کلیسا کے خلاف نکالا۔ وہ میرابو (ایک فرانسیسی انقلابی لیڈر) کی زیر قیادت نعرے لگاتے: "آخری بادشاہ کو آخری پادری کی انتڑیوں کے ساتھ سولی پر لٹکا دو"

③ خفیہ شیطانی قوتیں (۱۹۴):

یہ ممکن تھا کہ عوام کلیسا سے انتقام لیتے، اُس کے اموال لوٹ لیتے، اُس کا اقتدار ختم کر دیتے لیکن اس کے باوجود ان کی دین کے خلاف بغاوت نہ ہوتی اور اُس کی بنیادی تعلیمات کو تھامے رکھتے۔ لیکن ایک اور عامل ایسا تھا جس نے انقلاب کے اہداف کو موڑ دیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب عوامی حلقوں نے باستیل (ایک مخصوص شاہی قلعہ) کو گرانے کے لیے خود کو مجبور پایا جو غلامی اور استبداد کی علامت تھا، تو ان کا فقط ایک ہی نعرہ تھا ''روٹی'' اور فقط روٹی۔

لیکن جب انقلاب کے ابتدائی نتائج حاصل کرنے کا وقت آیا تو کئی دیگر نعرے بھی شامل ہو گئے جیسے **حریت، مساوات، اخوت**۔ یہ نعرے بذات خود عوام کے ذہن میں ڈالے گئے۔ ایک ایسے نعرہ کا ظہور ہوا جو جاہل عوام کبھی بھی خود نہ بنا سکتے تھے اور وہ تھا ''**رجعت پسندی ختم کی جائے**'' یہ لگا لپٹا جملہ تھا جس کا مطلب تھا دین کو زائل کیا جائے۔

جب انقلاب کی چھری مسلسل قربانیوں کے گلے کاٹ رہی تھی تو اُس کی ایک ہی دلیل تھی کہ یہ لوگ ''قوم'' کے دشمن ہیں حالانکہ جاہل قوم اس کارروائی کی منصوبہ بندی سے مکمل بری تھی۔ قوم خود دہشت زدہ ہو جاتی جب وہ قوم کے نام پر ہونے والے یومیہ قتل وغارت کی رپورٹ سنتی۔ وہ دیکھتی کہ قوم کے نام پر اقدامات کرنے والے خود فساد کے علم بردار ہیں۔ ان اچانک حادثات اور عجیب وغریب فیصلوں کے پیچھے کون تھا؟

یہود مکمل فخر اور غرور سے کہتے ہیں کہ وہ فرانسیسی انقلاب کے اصل کاریگر اور منصوبہ ساز ہیں۔ پروٹوکولز کہتا ہے: فرانسیسی انقلاب کو یاد کرو جس کو ہم انقلابِ کبریٰ کہتے ہیں۔ اِس کے ابتدائی تنظیمی اسرار ہمارے ہاں معروف ہیں کیونکہ وہ ہمارے ہاتھوں سے ہی تشکیل پائے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

''ہم اولین لوگ ہیں جنھوں نے **حریت، مساوات اور اخوت** کا نعرہ لگایا۔ اس وقت سے یہی کلمات جاہل طوطے دہراتے چلے آ رہے ہیں، ہر علاقے کے لوگ ان نعروں کے گرد اکٹھے ہیں''۔ (۱۹۵)

ولیم کار جیسے مصنفین نے اپنی کتاب ''شطرنج کی بساط پر پتھر'' میں اس کی تصدیق کی ہے۔ نیز **سپریدونیتش** نے ''دنیا کی خفیہ حکومت'' میں اس کی تصدیق کی ہے۔ (۱۹۶)

حقیقت یہ ہے کہ یہ دعویٰ مبالغہ پر مبنی ہے۔ جس شخص کو تاریخ کی معمولی بصیرت حاصل ہو اور وہ اللہ کی سنتوں کو جانتا ہو، وہ اِس کو بخوبی پہچان سکتا ہے۔

یہود مسیحیوں کی طرف سے شدید حقارت اور نفرت کو برداشت کرتے تھے۔ وہ اللہ کی طرف سے دی گئی ذلت کے سبب ہر جگہ رذیل وحقیر قوم شمار ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو یورپی معاشرہ کے الگ تھلگ حصے **جیتو** (Ghetto) میں محصور کیے ہوئے تھی۔ انھوں نے عزت دار زندگی کا مزہ فقط اسلامی حکومت کے زیر سایہ چکھا۔

کتنی عجیب بات ہے کہ یہ حقیر اور ذلیل گروہ ایک مضبوط ورثے کا مالک تھا جو اُن کے اندر جھوٹی عظمت کی روح پھونکتا رہتا اور مذموم فخر پر ابھارتا رہتا۔ چنانچہ اُن کی ایک اہم کتاب **تلمود** کہتی ہے: ''یہود کی روحیں دنیا کی باقی ارواح سے منفرد ہیں کیونکہ یہ اللہ کا اسی طرح سے جز ہیں۔ جس طرح بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے۔ وہ اللہ کی پسندیدہ قوم ہیں''۔ دوسری اقوام کے بارے میں تلمود کہتی ہے۔ ''یہود کے دین سے خارج لوگ حیوان ہیں۔ اُن کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کتے، گدھے یا خنزیر کہا جاسکتا ہے۔ اُن کا نطفہ حیوانوں کا نطفہ ہے''۔ (۱۹۷)

ہم یہود کو دیکھتے ہیں وہ خود کو اللہ کی پسندیدہ قوم سمجھتے ہیں اور اُن کا خیال ہے کہ اُن کے لیے کائنات کے خزانے پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ نے اُن پر واجب کیا ہے کہ وہ یہود کے علاوہ سب اَن پڑھ قوموں کو فنا کر دیں کیونکہ وہ کافر بت پرست ہیں۔ اور اُن کا خاتمہ ایسے ہوگا کہ اُن کے ادیان اور اُن کے اخلاق کو تباہ کیا جائے۔

اِس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے مابین دشمنی ڈال دی۔ یہ دشمنی روایتی ہے جو کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ یہود کیتھولک فرانس کے سایہ میں ایک حقیر اقلیت تھی جس کا اصل باشندوں کے مقابلے میں کوئی شمار نہ تھا۔ انہیں شہریت یا وطنیت کا بھی حق حاصل نہ تھا۔ یہود کو یقین تھا کہ اُن کے تلمودی خواب اُس وقت پورے ہو سکتے ہیں جب وہ ذلت کے طوق توڑ ڈالیں اور جیتو (یورپی معاشرے میں یہود کے لیے الگ تھلگ مخصوص علاقے) سے نکل کر اَن پڑھ عوام پر غلبہ حاصل کریں۔ اور یہ مقصد اُس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کلیسا کے اندر کچھ بھی جان باقی ہے۔ چنانچہ وہ اُس کا کام تمام کرنے کے لیے موقع کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ نہایت بیتابی سے اُس دن کا انتظار کر رہے تھے جب وہ کلیسائی دین اور اخلاق کے خلاف حملہ آور ہوسکیں اور کلیسائی عوام پر غلبہ پاسکیں۔

جب اقتصادی تنگی نازل ہوئی اور کلیسا پر انقلاب واقع ہوا تو یہود نے اِس کو سنہری موقع جانا۔ یہ موقع تقدیر نے اُن کو فراہم کیا تھا، انھوں نے اس کو خود ایجاد نہیں کیا تھا۔

فشر کہتا ہے: دولت مند لوگ اُس عوام کے ساتھی تھے جو انقلاب قائم کرنے والے تھے۔ ہم جان سکتے تھے کہ یہ دولت مند یہودی ساہوکاروں کے علاوہ کوئی نہ تھے کیونکہ اِن کے علاوہ سب دولت مند خود انقلاب کا ہدف تھے''

یہود کے پاس طاقت تھی کہ وہ انقلاب کی مختلف تنظیموں میں گھس جائیں جیسے جمعیت تاسیس اور مجلس یعاقبہ اور پیرس کی بلدیہ۔ یہود نے اپنے نعروں کو پھیلا دیا جن کو عوام نے اپنی بے وقوفی کے سبب دہرانا شروع کر دیا۔ خصوصاً انقلاب کے واضح نعرے ''آزادی، مساوات، اخوت''۔ ان نعروں پر انقلاب فرانس برپا ہوا اور انہی اہداف کو بالآخر حاصل کرلیا گیا۔ لیکن اِن نعروں کی یہود کے ہاں دوسری حقیقت تھی:

آزادی سے اُن کی مراد اخلاقی پابندیوں اور وراثتی رواجوں سے آزادی تھی جو قوموں کے لیے ہلاکت کا سامان ہوتی ہیں۔ مساوات اور اخوت کا نعرہ معاشرتی و نفسیاتی رکاوٹوں کے خاتمے کے لیے تھا تاکہ یہود کو ریاست اور اُس کے اداروں تک پہنچنے کا موقع مل سکے۔ اِن نعروں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مذہبی فرق مٹا دیا جائے تاکہ یہود کے ساتھ حقارت و اہانت کا سلوک زائل ہو سکے۔ www.KitaboSunnat.com

وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو گئے، انھوں نے دینی پیشواؤں کے خلاف اٹھنے والے انقلاب کو خود دین کے خلاف انقلاب سے بدل دیا۔ یورپی اقوام کے نزدیک 'دین' ظلم، پس ماندگی اور استبداد کے مترادف بن گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاملہ جو بھی ہو، یہ بات ضرور ہے کہ فرانسیسی انقلاب تاریخ یورپ میں جدید دور کا آغاز ہے۔ کیونکہ اس کے بعد پورے براعظم یورپ میں انقلابات جوالہ مکھی کی طرح اُبل پڑے اور یورپ نے پہلی مرتبہ حقوقِ انسانی کے لفظ کو استعمال کیا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک یہ حقوق انقلاب فرانس کے ساتھ ہی منسوب کیے جاتے ہیں۔ اِس انقلاب کی کامیابی سمجھی جاتی ہے کہ جاگیردارانہ نظام اور کلیسا کا اثر ورسوخ ختم ہوگیا۔ اس کے نتیجے میں عقائد واقدار کا ایک خوف ناک خلا بھی پیدا ہوگیا۔ جب ہم جان لیں کہ کن لوگوں نے یہ خلا پیدا کیا تا کہ انسان کی انسانیت کا خاتمہ کرسکیں اور اُس کی اقدار کو تباہ کرسکیں تو ہم حریت کا حقیقی مفہوم بھی سمجھ لیں گے جس کا نعرہ اِن انقلابات میں لگایا گیا۔

وہ تمام چمک دار نعرے جو دینی ایمان کے متبادل کے طور پر لگائے گئے وہ مطلوبہ غرض کو پورا نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح تمام دساتیر اور نظام اِس براعظم کا امن واستقرار لانے میں ناکام رہے۔ یورپ آنے والے دور میں بے شمار فکری ومعاشرتی رجحانات کا شکار ہوا جن کو شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح اُس نے ایسی خوف ناک جنگوں کا عذاب جھیلا جنھوں نے یورپ کے نقشے کو مستقل طور پر تبدیلی کا نشانہ بنائے رکھا۔ دین، اخلاق اور روایات پر ایسی بڑی آفتیں نازل ہوئیں کہ یہ چیزیں عوام کے لیے قابل نفرت ماضی کا حصہ بن گئیں۔

اصطلاحات: ۵

مذہب کے زوال پر پیدا ہونے والے فلسفیانہ مکاتب

دہریت/الحاد (Atheism)

مافوق الفطرت باتوں (روح، دیوتا، حیات بعد الموت وغیرہ) پر ایمان کو مسترد کرنے والا نظامِ فکر جس کے تحت کائنات کا سائنسی انداز میں مطالعہ کرنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کائنات میں کوئی الٰہ نہیں۔ مادہ ازلی وابدی ہے۔ معجزات، حیات اخروی اور اخلاقی نظام کا کوئی وجود نہیں۔ تاریخ انسانی جرائم، حماقتوں اور ناکامیوں کی داستان ہے۔ قدیم دور میں الحاد فقط بعض اقوام یا افراد میں نادر ہوتا تھا۔ جدید ملحدین میں کمیونسٹ، وجودی، ڈارونسٹ، مارکسٹ، دورخائم اور فرائڈ نطشے کے پیروکار ہیں۔

مغرب میں الحاد عیسائیت میں تحریف کی وجہ سے پیدا ہوا جبکہ عالم اسلام میں الحاد استعمار کے غلبے کی وجہ سے وجود میں آیا۔ عالم اسلام میں الحاد کے مقابل اصلاحی تحریکیں اٹھیں جیسے محمد عبدہ، محمد اقبال، جمال الدین افغانی وغیرہ کی تحریکیں۔ یہ تحریکیں اگرچہ اہل سنت وجماعت کی نمائندہ نہ تھیں تاہم انھوں نے اسلام کو کلی زوال سے بچانے میں موثر کردار ادا کیا۔

وحدانیت (Monotheism)

ایک خدا کے وجود پر ایمان۔ اس کی مختلف شکلیں ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ا۔ وحدت الوجود (Pantheism): یہ نظریہ کہ خدا دنیا سے الگ نہیں بلکہ خدا دنیا ہے اور دنیا خدا ہے۔ خدا کائنات کے اندر جاری وساری ہے۔ اس کو ہمہ اوست بھی کہتے ہیں۔

ب۔ ڈی ازم (ربوبیۃ۔Deism): یہ نظریہ کہ خدا کائنات کا خالق تو ہے لیکن اسے قائم اور برقرار رکھنے والا نہیں۔ خدا کی حیثیت گھڑی ساز کی طرح ہے جو کائنات بنانے کے بعد اُس کے معاملات سے معطل ہے۔ یہ نظریہ سترہویں صدی کے بعد مقبول ہوا۔ والٹیر اور روسو اسی نظریے کے قائل تھے۔

اسلام کا نظریہ توحید وحدۃ الوجود اور ڈی ازم دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کا خدا کے بارے میں یہ عقیدہ ہے کہ وہ کائنات کا خالق، مدبّر الامر اور مخلوق سے منفصل ہے۔ اسلام کی توحید اللہ کیلئے پر ایمان لانا ہے، لیکن یہ مطلق ایمان نہیں بلکہ نفی واثبات کے ساتھ تمام معبودوں کی نفی اور فقط اللہ پر ایمان لانے پر مشتمل ہے۔

لادینی فکر/لادینیت (Irreligion)

لادینیت کے کئی مکاتب ہیں جن میں سے ہر ایک کا دین کی مخالفت میں مخصوص نظریہ ہے تاہم تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ ادیان انسان کے پیدا کردہ ہیں، خالق کے فرض کردہ نہیں۔ لادینوں کے نزدیک دین زندگی کا مرجع یا مرکزی نظام نہیں بن سکتا اور دینی نصوص پر مناقشہ جائز ہے۔

لادینیت کی دو اقسام ہیں۔ ضعیف لادینیت یعنی کسی بھی دین پر ایمان نہ لانا، مذہب سے لاتعلقی اختیار کرنا۔

قوی لادینیت یعنی خالق کے وجود کا انکار کرنا۔ دین سے عداوت اختیار کرنا۔

دین مسیحیت کے زوال کے بعد نئے پیدا ہونے والے فلسفیانہ مکاتب فکر

ان مکاتب فکر میں تجربیت، لاادریت، فطرت پسندی، اثباتیت، منطقی اثباتیت، عضویت، عقلیت وغیرہ ہیں جن کی تفصیل باب ۱۰ کے آخر میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ تمام مکاتب فکر وحی کو حجت نہیں سمجھتے بلکہ اُس سے استفادے کے بھی روادار نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۶

نظریہ ارتقا

ڈارون کے نظریہ ارتقا سے قبل مسیحی ایمان واخلاق کئی قسم کی شکست وریخت کا شکار ہو چکا تھا۔ مسیحیت کا نظریہ کائنات ساقط ہو چکا تھا۔ سپائی نوزا اور والٹیر کی مسیحیت پر شدید تنقیدیں منظر عام پر آ چکی تھیں۔ فرانسیسی انقلاب، نیوٹن کا نظریہ میکانکیت، عقل پرستوں کا فطری دین، کومتے کا فکری ارتقا کا نظریہ مسیحیت کو گرانے میں اپنا کردار ادا کر چکے تھے۔ لاادری مذہب، ڈی ازم، خفیہ جماعتیں اور ان کے وبائی افکار، نت نئے فکری واجتماعی واقعات، یہ سب کلیسا کے جسم کو نوچ رہے تھے۔ کلیسا کی عمارت ایک ایک اینٹ کر کے گر رہی تھی۔

لیکن ان سب کے باوجود کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ مسیحیت مکمل طور پر انحطاط پذیر ہو جائے گی۔ کلیسا کی عمارت سخت حملوں کے باوجود قائم تھی اور کلیسا عوام کی ہمدردیوں کا حامل تھا۔ لوگوں کی جڑوں میں کلیسا کی اقدار، امثال اور رسومات اتری ہوئی تھیں۔

یہ بات درست ہے کہ لوگوں کی نظر کلیسا کے متعلق بدل چکی تھی لیکن اس کے باوجود ابھی تک بذات خود دین لوگوں کو قابل برداشت تھا بلکہ عزیز بھی تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ فلاسفہ کو اپنا مزعومہ فطری اور انسانی دین تشکیل دینے میں سخت محنت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ بات بھی درست ہے کہ انسان کا کائنات اور اس میں اپنی حیثیت کے متعلق نظریہ بدل چکا تھا لیکن وہ ابھی تک انسانیت کی فضیلت کا قائل تھا۔ اُسے یقین تھا کہ انسان ایک منفرد ہستی ہے اور کائنات میں موجود ہر شے سے افضل ہے کیونکہ وہ روحانی وجود رکھتی ہے۔ اگر وہ اپنے جسم کے ساتھ افضل نہیں تو اپنی عقل وروح کے ساتھ ضرور افضل ہے۔ لوگوں کا تاریخ کی حرکت اور زندگی کے سفر کا نظریہ بھی بدل چکا تھا لیکن ابھی تک کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ یہ عقیدہ رکھے یا اس بات کا اعلان کرے کہ دنیا میں کوئی قدر، اخلاق یا معاشرتی رواج مستقل نہیں۔

بہت سارے لوگ والٹیر، ہیوم اور دولباخ جیسے دین دشمنوں کی باتوں پر ایمان لا چکے تھے لیکن ابھی بھی یہ لوگ (فلسفی) ملحد اور گمراہ قرار پاتے تھے۔

۱۸۵۹ء میں ایک انگریز محقق چارلس ڈارون نے اپنی کتاب ''اصل الانواع'' شائع کی۔ (۱۹۸) اُس نے ایک ایسا شور وغوغا برپا کر دیا جو اس سے پہلے پوری یورپی تاریخ میں نہ ہوا تھا۔ فکری وعملی میدان میں اس کے ایسے اثرات مرتب ہوئے جو کسی کے وہم وگمان میں نہ تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈارون ازم کا فنی تعارف اور علمی حیثیت

کتاب اس نقطہ نظر کے گرد گھومتی تھی کہ جانداروں کی زندگی کا ارتقا سادہ اور ادنیٰ حیاتیاتی مخلوق سے دقیق اور پیچیدہ مخلوق کی طرف جاری وساری ہوتا ہے۔ کسی ایک نوع کے اندر تخلیقی طور پر ایسے فرق موجود ہوتے ہیں جس سے صدیوں کے گزرنے کے بعد کئی انواع جنم لے سکتی ہیں۔ اسی وجہ سے ڈارون نے فرض کرلیا کہ جانداروں میں لاکھوں اقسام کے مخلوق کی اصل محض ایک حقیر یک خلوی جاندار ہے۔

طبعی انتخاب اور بقائے اصلح کے قانون کے مطابق وہ انواع ترقی کر گئیں جو اپنے طبعی ماحول کے ساتھ مطابقت اور حادثاتی مصائب کا مقابلہ کرنے کی زیادہ ہمت رکھتی تھیں۔ چنانچہ وہ انواع ترقی کے زینے چڑھتی گئیں جبکہ دیگر انواع ہلاک ہوگئیں جو یہ قدرت نہ رکھتی تھیں۔

ڈارون کی تعبیر کے مطابق اس کی علت یہ تھی کہ فطرت نے بعض اجسام کو اپنی بقا اور اپنی نوع کی حفاظت کے لیے بعض اہلیتیں بخشی ہیں جن کے ذریعے وہ اپنے اعضا یا اوصاف میں اضافہ کرتے ہیں اور حالات سے مطابقت اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح ایک نوع بتدریج بہتر ہوتی چلی جاتی ہے جس سے کئی ترقی یافتہ انواع پیدا ہوتی ہیں جیسے بندر اور اس سے زیادہ ترقی یافتہ نوع جیسے انسان۔ بعض دیگر انواع کو فطرت نے بعض اہلیتوں سے محروم رکھا چنانچہ وہ کمزور ہوکر فنا ہوگئیں۔ فطرت جب کسی نوع کو کوئی اہلیت دیتی ہے یا محروم رکھتی ہے تو وہ کسی مقرر لائحہ عمل کی پیروی نہیں کرتی بلکہ وہ اندھی بہری ہوکر چلتی ہے (یہ ڈارون کے لفظ ہیں)۔ اسی طرح ارتقا کا خط ٹیڑھا میڑھا ہے جو کسی منطقی قاعدے کے مطابق نہیں۔

یہ ڈارون کے نظریے کا انتہائی اختصار ہے جو اس نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ جوہری اعتبار سے یہ فقط بیالوجی کا مفروضہ ہے اور کوئی عمومی فلسفیانہ نظریہ نہیں۔ اسی طرح یہ کوئی مضبوط ثابت شدہ علمی حقیقت بھی نہیں۔

اس نظریے کے بارے میں پچھلی صدی کے اندر بیالوجی کے دو بڑے اساطین علم نے اپنی رائے دی۔ ایک انگلینڈ کا اوین، اور دوسرا امریکہ کا اغاسیز۔ دونوں کہتے ہیں:

''ڈارون کے افکار محض علمی خرافات ہیں اور جلد بھلا دیے جائیں گے۔'' (۱۹۹)

ہم اس سبب کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کریں گے کہ ان دونوں اصحاب فن کی توقع کیوں پوری نہ ہوئی۔ بلکہ ہم اُس حقیقت پر روشنی ڈالیں گے جس کی توقع ڈارون کے ہم نوا اصحاب فن کی طرف سے ظاہر ہوئی۔ ڈارون کے نظریے کی علمی حیثیت جو بھی ہو، حقیقت یہ ہے کہ ڈارون جو نئی چیز لے کر آیا وہ ارتقا کا تصور نہیں تھا بلکہ ارتقا کا عملی قانون تھا جس کے مطابق وہ جاری وساری رہتا ہے۔

ارتقا کے تصور کو علمائے ارضیات پہلے ہی استقرائی طریقے کے ذریعے جان چکے تھے کہ زمین پر زندگی کی پیدائش ایک ہی دفعہ نہیں ہوئی جیسا کہ لوگ گمان کرتے ہیں۔ بلکہ وہ ایک تاریخی تدریج کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انھوں نے ملاحظہ کیا کہ دیر سے ظاہر ہونے والی انواع، پہلے ظاہر ہونے والی انواع سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان لوگوں میں ''رامی، بارکنسون اور لینو'' ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اِن لوگوں کے نتائج کیوں نظرانداز کر دیے گئے؟ اِس کی وجہ وہ تشریح تھی جو انھوں نے بیان کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ارتقا ایک لگے بندھے اصول پر چلتا ہے جو اِس جہان کے لیے رحمت ہے۔ (۲۰۰) اسی لیے اِس نظریے کو لاہوتی نظریہ (مذہب کا موید نظریہ) قرار دیا گیا۔ یہی وجہ تھی وہ بھلا دیا گیا حتی کہ تجربہ گاہوں سے بھی بے دخل ہو گیا۔

اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُس وقت علم اور دین کے درمیان کشمکش انتہائی عروج پر تھی اور حالات کسی ایسے نظریے کو پھیلانے کی اجازت نہیں دیتے تھے جو کلیسا کے مظالم اور اس کے کینہ پرور الٰہ کی تائید کرتا ہو۔

نیوٹن کے علم نے کلیسا کے دشمنوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ فطرت کے مظاہر کی تفسیر میکانکی سطح پر کی جاسکتی ہے اور کسی مدبّر کی ضرورت نہیں۔ کشمکش کا تقاضا تھا کہ جس طرح نیوٹن نے فلکیات میں میکانکی قانون بیان کیا ہے اسی طرح زندگی کے متعلق بھی کوئی فکر تلاش کی جائے۔

چنانچہ بہت سارے لوگوں نے اس قانون کو تلاش کرنے کی عملاً کوشش کی جیسے بوفون، لیمارک (۱۸۲۹ء)، کوفیہ، بترس کامبر۔ لیکن ڈارون اس مزعومہ قانون سے واقفیت پر کامیاب ہو گیا۔ ڈارون کا قانون حیاتیات کے دائرے سے الگ تھا، اُس نے اپنا قانون ایک دوسرے علم ''علم آبادیات'' سے حاصل کیا جو مالتھس کا مشہور نظریہ تھا۔ (۲۰۱)

ڈارون نے یہ نتیجہ نکالا کہ فطرت قوی کے فائدے کے لیے کمزور کو فنا کر دیتی ہے۔ ارتقا میں اس قانون کو ''فطری انتخاب اور بقائے اصلح'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اِس قانون اور لیل کے ارضیاتی تحقیق سے وہ ارتقا کے میکانکی نظریے پر قادر ہو سکا۔ اور دین کے دشمنوں کو بھی اپنی گمشدہ متاع حاصل ہو گئی۔

اس سے پہلے کہ ہم اس نظریے کے مختلف میدانوں پر اثرات کا جائزہ لیں۔ بہتر ہے کہ پہلے ہم اس نظریے کی علمی حیثیت کا جائزہ لے لیں۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ نظریہ ڈارون اور اُس سے منسلک فلسفیانہ موشگافیوں کے مابین فرق کرنا چاہیے۔ بعض آرا ایسی ہیں جو ڈارون کے وہم وگمان میں نہ ہوں گی اور وہ اس نظریے کی تشریح میں بیان ہوتی ہیں حالانکہ وہ علمی و تحقیقی نہیں۔ ڈارون کے نظریے کو علمی حقیقت کے طور پر تسلیم کر بھی لیا جائے تو بھی وہ ایک مخصوص تجرباتی دائرے میں ثابت ہوتا ہے جس کے مخصوص احوال وظروف ہیں۔

سب سے پہلے جن لوگوں نے اِس نظریے کو علمی سطح پر نقد کا نشانہ بنایا، وہ خود ڈارون کے ہم عصر علما تھے۔ آغاسیز اور اوین کا قول قریب گزر چکا ہے۔ اسی طرح فلکیات کے مشہور محقق ''ہرشل'' اور پچھلی صدی میں یونیورسٹیوں کے اکثر اساتذہ نے تنقید کی۔ ہم اِن محققین کا تذکرہ ترک کرتے ہیں کیونکہ ان کے بارے میں کہا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاسکتا ہے کہ انھوں نے نظریہ ڈارون کی مخالفت دینی ونفسیاتی اسباب کے تحت کی۔ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس نظریے کے اکثر حامی کس طرح کے جوش وجذبہ اور تعصب کے حامل تھے۔

جدید ڈارون ازم کے اصحاب نے اِس نظریے پر اس قدر ترمیمات کی ہیں کہ اب یہ نظریہ علمی سطح پر نیا نظریہ کہلانے کا مستحق ہے۔

وہ اس بات کے اعتراف پر مجبور ہوئے کہ فطری انتخاب کا قانون، ارتقائی عمل کی تفسیر بیان کرنے سے عاجز ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس پر اضافے کیے اور عملی طور پر تبدیل کر کے ایک نیا قانون بنایا جس کا نام انھوں نے ''اچانک تبدیلیوں کا قانون'' یا ''حادثات کا قانون'' رکھا۔ اس قانون کی محض اتفاقات کے علاوہ کوئی سند نہیں۔

پھر وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ زندگی جس اصل سے وجود پذیر ہوئی، وہ کوئی ایک نہیں جیسا کہ ڈارون کا خیال ہے۔ بلکہ کئی متعدد اصول ہیں جن سے مستقل فروعات پھوٹی ہیں۔

اسی طرح پھر وہ اس بات پر بھی مجبور ہوئے کہ انسان بیالوجی کے اعتبار سے منفرد ہے اگرچہ اس کی ظاہری مشابہت بعض حیوانوں کے ساتھ ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں ڈارون اور اس کے معاصر گمراہ ہی ہوئے۔ جولیان ہکسلے انسان کی منفرد خصوصیات بیان کرنے کے بعد کہتا ہے: ''اسی طرح بیالوجی انسان کو ایک مثالی مقام دیتی ہے، ایک ایسا مقام جہاں اُس پر انعامات کی بارش ہوئی ہے۔ وہ سیّد المخلوقات ہے جیسا کہ ادیان کہتے ہیں۔ (۲۰۳)۔ متعصب ڈارون پرست مفکرین میں سے ایک آرتھر کیتھ ہے جو اس نظریے کو نئے سرے سے لکھنے پر مجبور ہو گیا اور وہ اِس اعتراف پر بھی مجبور ہوا کہ یہ نظریہ ابھی تک بغیر دلائل و براہین کے ہے جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

جدید ارتقا پسند مفکرین میں سے ایک مشہور مفکر لیکونٹ ڈی نائے، جو حقیقت میں ایک مستقل نظریہ ارتقا کا حامل ہے، کہتا ہے:

''زندہ اجسام کا ارتقا جامد مادہ کے علم کے مکمل طور پر مناقض ہے۔ اس کے علاوہ وہ دیگر اصولوں کے بھی منافی ہے جیسے حراری قوت کا اصول۔ لہٰذا ہمارے موجودہ علم کے مطابق ارتقا کا کوئی سبب نہیں اور نہ ہی کوئی حقیقت۔ اس کا کوئی عالم انکار نہیں کر سکتا''۔ (۲۰۵)

یہ نظریہ ارتقا کے حامی مفکرین کا موقف ہے، تو اس صدی کے مخالف علما کا کیا حال ہوگا؟

کریسی موریسون کہتا ہے: نظریہ ارتقا کے قائلین وراثت کی اکائیوں یعنی جینز کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ وہ اُس جگہ ٹھہر گئے جہاں ارتقا حقیقت میں شروع ہوتا ہے یعنی خلیہ۔ (۲۰۶)

انتھونی ستاندن اپنی کتاب ''علم مقدس گائے ہے'' میں مناقشہ کرتا ہے اور گمشدہ کڑی کے مسئلے پر بحث کرتا ہے۔ یہ کڑی اس نظریے کا ایسا خلا ہے جس کو بھرنے سے ڈارون کے حامی عاجز آ گئے۔ وہ کہتا ہے:

یہ بات حقیقت کے زیادہ قریب ہے کہ ارتقائی زنجیر کا ایک بہت بڑا حصہ مفقود ہے۔ صرف ایک کڑی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفقود نہیں۔ بلکہ ہم تو پوری زنجیر کے وجود پر ہی شک کرتے ہیں۔ (۲۰۷)

سٹیوارٹ تشیس کہتا ہے: ''علمائے حیاتیات جزوی طور پر آدم وحوا کے قصے کی تائید کرتے ہیں جیسا کہ ادیان روایت کرتے ہیں۔ تورات کے باب تکوین کی تواریخ میں کئی قسم کی خطائیں واقع ہوئی ہیں اور اس میں حذف، تہذیب اور شاعری سے بھی کام لیا گیا ہے۔ تاہم یہ فکر مجمل طور پر صحیح ہے''۔ (۲۰۸)

کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ شخص کیا کہتا ہے اگر یہ قرآن میں موجود قصے کو پڑھ لیتا؟ مجلہ علوم مصورہ کہتا ہے: ''علم'' آدم وحوا کے قصے کی کسی نہ کسی حد تک تائید کرتا ہے۔ یقیناً ہم اس فکر کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسانی خاندان کی اصل ایک ہے''۔ (۲۰۹)

آسٹن کلارک کہتا ہے۔ ''کوئی علامت ایسی نہیں جو ہمیں اس عقیدے پر مجبور کرے کہ اعلیٰ درجے کے حیوان ایک دوسرے سے اخذ شدہ ہیں۔ بے شک ہر مرحلے کا اپنا الگ تھلگ وجود ہے جو خاص تخلیق کے عمل کا نتیجہ ہے۔ انسان زمین پر اچانک ظاہر ہوا اور اُسی شکل میں ہوا جس میں ہم اسے آج دیکھ رہے ہیں''۔ (۲۱۰)

یہ علمی نقطہ نظر تھا۔ اگر ہم خالص منطقی نقطہ نظر سے دیکھیں کہ اس نظریے کا کیا حکم ہے تو اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ارتقا کا نظریہ دو اصولوں پر قائم ہے جن میں سے ہر ایک دوسرے سے جدا ہے۔

اوّل۔ زندہ مخلوقات کا وجود زمین پر مختلف تاریخی مراحل میں بتدریج واقع ہوا ہے۔ ایک ہی دفعہ نہیں ہوا۔

دوم۔ یہ مخلوقات وراثتی طور پر مسلسل ہیں۔ ایک دوسرے کے نتیجے میں ایک طویل ست ارتقائی عمل کے دوران پیدا ہوئی ہیں۔

ڈارون تھیوری نے یہ کام کیا کہ دونوں اصولوں کو باہم مدغم کر دیا۔ اُس نے پہلے اصول کے دلائل وشواہد جمع کیے تاکہ اس کے ساتھ دوسرے اصول کو تقویت دے۔ یہ غیر علمی خلط مبحث ایسا ہے کہ بعض علما اس کو سمجھ نہ سکے اور انھوں نے اس کو قبول کر کے اس پر علمی رنگ چڑھا دیا۔ یہ علمی رنگ پہلے اصول پر تو چڑھ سکتا تھا لیکن دوسرے اصول پر یہ خالص خطا ہے۔ کیونکہ یہ بات بدیہی طور پر معلوم ہے کہ موجودات کی تاریخی ترتیب، وراثتی تسلسل کو لازم قرار نہیں دیتی۔ بلکہ عقل تو اس سے زیادہ دور کی بات ممکن سمجھتی ہے اور وہ یہ کہ منطقی ترتیب، تاریخی ترتیب کو لازم قرار نہیں دیتی۔ زندہ اجسام کی منطقی ترتیب تو صعودی ہے یعنی پودے، پھر حیوان اور پھر انسان۔ لیکن اس ترتیب میں ایسی کوئی دلیل نہیں جو دلالت کرے کہ ان اجناس کا تاریخی وجود بھی اسی طرح ہے۔ اس کے اثبات کے لیے خارجی دلیل کی ضرورت ہے۔ یہ اعداد کی منطقی ترتیب سے مکمل طور پر مشابہ ہے جیسے (۱، ۲، ۳، ۴) اور یہ بات بدیہی ہے کہ ان کی کوئی تاریخی ترتیب نہیں اور نہ ان کے درمیان وراثتی تعلق ہے۔

ہم اس نظریے پر اس سے زیادہ مناقشہ نہیں کر سکتے لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے: جب اس نظریے کا علمی وعقلی اعتبار سے اتنا اہم مقام نہیں اور اس کو ہر طرف سے اعتراضات کا سامنا ہے تو مغربی مفکرین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سے چمٹ کیوں گئے۔ مخالف نظریے سے چشم پوشی کیوں اور اس پر اندھا اصرار کیوں؟

ہمارے خیال میں اس کا ممکنہ جواب اس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ غیر فطری ماحول میں دین اور علم کی باہمی خوف ناک جنگ کا نتیجہ تھا۔ سر آرتھر کیتھ نے اپنی رائے پیش کر کے ہمارے جواب کی مشقت دور کر دی ہے:

''ارتقا کا نظریہ ہمیشہ سے آج تک بغیر براہین کے ہے اور رہے گا۔ ہم اس پر فقط اس وجہ سے ایمان لاتے ہیں کہ یہ براہ راست تخلیق کا واحد متبادل نظریہ ہے''۔ (۲۱۱)

اس پر اضافہ کرتے ہوئے **والسن** کہتا ہے:

''علمائے حیوان یا علمائے حیات ارتقا کے نظریے پر اس لیے ایمان نہیں لائے کہ اس پر اُن کا مشاہدہ، تجربہ یا منطقی استدلال ہے بلکہ اس وجہ سے کہ براہ راست تخلیق کی فکر تصور سے بعید ہے''۔ (۲۱۲)

ھسکوت کہتا ہے: ''نظریہ ارتقا باقی رہنے کے لیے آیا ہے اور اس سے علیحدگی ممکن نہیں حتی کہ یہ عقیدہ جیسا مقام حاصل کر گیا ہے۔ (۲۱۳)

یہ ڈارون کے حامی مفکرین کا واضح اور صریح موقف ہے۔ **لیکونٹ ڈی نائے** پر اعتراض کیا گیا کہ اس نے اپنی کتاب میں ''اللہ'' کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ اس نے جواباً کہا کہ قرونِ وسطی میں پھیلی ہوئی عدم رواداری ابھی تک ختم نہیں ہوئی بلکہ اُس نے اپنا کیمپ بدل لیا ہے۔ **لیکونٹ ڈی نائے** کا یہ بیان اس نظریے کی نشر واشاعت کی وجہ سمجھنے کے لیے ہے۔'' (۲۱۴) اور یہ بات برحق ہے۔ غیر علمی موقف جو ان مفکرین نے اختیار کیا ہوا ہے بعینہٖ اُس غیر علمی موقف کی طرح ہے جو کلیسا نے اپنے عقیدے میں اختیار کیا ہوا تھا کہ اللہ نے آدم علیہ السلام کو ۴۰۰۴ ق م میں مستقل وجود بخشا۔ یہاں فرق صرف یہی ہے کہ کلیسا علمیت کا دعویٰ نہیں کرتا جیسے یہ متعصب لوگ کرتے ہیں۔ یہ چیختے اعترافات اُن بے وقوف لوگوں کے لیے بڑی عبرت کا سامان ہیں جو مشرق میں ہیں، کاش وہ سمجھ جائیں!!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈارون ازم کے اثرات

① دینی عقیدے کا انہدام:

مغربی مسیحی دنیا میں ڈارون سے پہلے بھی الحاد (Irreligion) موجود تھا۔ فرانسیسی انقلاب نے حریت اعتقاد کے نعرے کے پردے میں حریت الحاد کو جائز قرار دے رکھا تھا اور نیوٹن کی میکانکیت نے ملحدین کے لیے بڑی عظیم خدمت سرانجام دی تھی۔ لیکن یہ الحاد ۱۸۵۹ء تک فقط فلسفیانہ دائرے میں محدود تھا۔ مسیحی عقیدہ اپنے قوی مرکز میں محفوظ تھا، فقط عوامی طبقے ہی میں نہیں بلکہ جامعات کی علمی اکیڈمیوں میں بھی جو بالعموم کلیسائی اکابرین کے اثر ورسوخ کے ماتحت تھیں۔

۱۸۵۹ء کے بعد دنیا میں ایمان کو حقیقی زخم پہنچایا گیا۔ ویلز کی تعبیر کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ دین دشمنوں نے نظریہ ارتقا کو باطل تفسیرات کے ساتھ نشر کیا، مفاد پرستوں نے اس کو ظالمانہ طریقے سے استعمال کیا اور اس نظریے کا غیر معمولی جوش کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ کلیسا کے موقف کا شروع سے ہی مذاق اڑایا جا رہا تھا خصوصاً جبکہ اس کا سابقہ نظریہ کائنات غلط ثابت ہوا۔ اسی وجہ سے کئی لوگوں نے ڈارون نظریے کے ساتھ نرم گوشہ رکھا تاکہ ممکنہ غلطی میں واقع نہ ہو جائیں۔ لوگوں کا ذہن تھا کہ اُن دشمنوں سے دور رہنا چاہیے جو دین کے نام پر مشہور ہیں۔

فکری معرکوں کی تاریخ کا سب سے بڑا معرکہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نظریہ ارتقا کے اصحاب نے اپنے موقف میں اِس قدر غلو کیا کہ دینی تصورات کا کلی طور پر انکار کر دیا اور صریح ملحد بن گئے۔ اِسی طرح کلیسا اور اس کے ہم نواؤں نے بھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا اور ہر اُس شخص پر بے دینی اور کفر کا اعلان کیا جو ان کے ہم نوا نہ تھا۔

معرکہ ایک خوف ناک نتیجے پر انتہا پذیر ہوا۔ دینی عقائد کلی طور پر متزلزل ہو گئے، ہر طرف الحاد کی وبا عجیب وغریب طریقے سے پھیل گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسیحی فلسفے کا مزاج اِس قابل ہے کہ اگر نظریہ ڈارون ثابت ہو جائے تو وہ دیگر ادیان کی بہ نسبت سب سے زیادہ مسیحیت کو نقصان پہنچائے۔ یہ بات درست ہے کہ تمام ادیان مستقل تخلیق کے عقیدے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر ایمان رکھتے ہیں لیکن مسیحیت اِس پر یہ اضافہ کرتی ہے کہ وہ اس کو مسیحی ایمان کا مرکز ومحور بناتی ہے۔

پولسی مسیحیت عقیدہ رکھتی ہے کہ اللہ نے آدم وحوا کو پیدا کیا اور ان دونوں کو خیر وشر کے معرفت والے درخت کا پھل کھانے سے روک دیا۔ سانپ نے اُن دونوں کو ابھارا اور دونوں نے درخت سے کھالیا۔ انھوں نے ایسی خطا کا ارتکاب کیا جو بخشی نہ جاسکتی تھی۔ انسانی جنس موروثی خطا کی بیڑیوں میں جکڑی گئی۔ اللہ تعالی نے جہان پر رحم کیا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو بھیجا (نعوذ باللہ من ذالک) جو تالوث میں سے دوسرا اقنوم تھا۔ وہ صلیب پر قتل کیا گیا تا کہ بشریت کو خطا سے نجات دلائے۔

یہ عقیدہ کلیسا کی تعلیمات کا محور ہے۔ کوئی شخص اس وقت تک مسیحی مومن نہیں ہوسکتا جب تک اِس کا عقیدہ نہ رکھ لے۔ اس سے بدیہی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ ڈارون نظریے نے دینی پیشوائیت کی قبریں تیار کیں۔ غیرت مند مسیحیوں نے ٹھیک سمجھا کہ نظریہ ڈارون کی تصدیق سے لازم آتا ہے کہ کوئی آدم علیہ السلام نہیں، کوئی حوا نہیں، نہ عدن ہے اور نہ کوئی خطا۔ چونکہ کوئی خطا نہیں ہوئی، تو مسیحیت کا تاریخی بنیادی ڈھانچہ یعنی پہلی خطا کا قصہ اور کفارہ، سب کچھ بچوں کے کھلونا گھروں کی طرح گر جاتا ہے۔ (۲۱۵)

چونکہ مغرب میں مسیحیت کے علاوہ کوئی دین نہیں چنانچہ وہ خود کو ملحد قرار دیتا ہے۔

ویلز کہتا ہے: ''یہ بات درست ہے کہ مسیحیت کا کوئی دور متشککین سے خالی نہیں رہا۔ لیکن یہ لوگ غیر معمولی تعداد میں نہ ہوتے تھے۔ لیکن نظریہ ڈارون کے بعد ساری مسیحی دنیا اجمالی طور پر متشکک ہو چکی ہے۔ کیونکہ اب جھگڑا ہر اُس انسان کے ساتھ واقع ہو چکا ہے جو کتاب پڑھتا ہے یا ذہین لوگوں کا مکالمہ سنتا ہے''۔ (۲۱۶)

حقیقت یہ ہے کہ اگر اس نظریے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جاتا یا مخصوص حالات وظروف نہ ہوتے تو اس کی اتنی حیرت انگیز شان وشوکت نہ ہوتی، کم از کم اس کے اشارات پر مذاکرے نہ ہوتے، لوگوں کی فکر وحیات اتنی تیزی سے تبدیل نہ ہوتی۔ نظریہ ڈارون کو اتنا بڑا حجم عطا کرنے والے دو خارجی عوامل ہیں۔

اوّلاً۔ برے تاریخی حالات: یہ نظریہ ایسے حالات میں پیدا ہوا جبکہ علم ودین کی باہمی کشمکش اپنے عروج پر تھی اور صنعتی انقلاب یورپی معاشرے کی خصوصیات کو مٹاتا چلا جارہا تھا۔ وہ اسے دین واخلاق سے آزاد نیا رنگ دے رہا تھا۔ یورپی انسان ہر جگہ کلیسا کے افراد سے انتقام لینے اور انقلاب کے لیے بے چین تھا۔ کلیسا نے اُس کو انواع واقسام کی ذلتوں اور غلامیوں سے دوچار کیا تھا، چنانچہ اِس نظریے کا ظہور اس کے لیے ایک عظیم فتح تھی۔ یہ بات درست ہے کہ پہلے پہل عوام نظریہ ڈارون کے مقابلے میں کلیسا کے ساتھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اس کا موقف بعد میں تبدیل ہوگیا۔ اس پر یہ بات تو گراں گزری کہ ڈارون نے اُن کی انسانیت سلب کر لی ہے اور اُن کو حیوانی اصل کا حامل قرار دیا ہے۔ لیکن وہ کلیسا اور اس کے افراد کی مصیبت پر خوش ہوتا تھا۔ اس نے موقع غنیمت جانا کہ کلیسا کے جوئے سے جان چھڑائے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسیحی ایمان جذبات پر مبنی تھا نہ کہ عقلی تسکین پر، چنانچہ تعلیم یافتہ شخص کے لیے برابر تھا کہ کلیسا کے الٰہ نے لوگوں کی نجات کے لیے اپنے بیٹے کو قتل کیا ہو یا نہ کیا ہو، یہ بات اصولی طور پر غلط ہے کہ رب کے لیے بیٹا ہو۔ اسی طرح عقیدہ تثلیث اور دیگر مسیحی اساطیر اُس کی عقل کو مسلسل جھنجھوڑنے کا سبب بنے۔ چنانچہ اُس نے ظالم کلیسا سے چھٹکارے کے لیے اپنا بوسیدہ عقیدہ قربان کر دیا۔

دوم: نظریہ ڈارون اور تخریبی قوتوں کا ظالمانہ استعمال۔

یہ بات کہنے کی نہیں کہ یہود عام انسانوں کا دشمن گروہ ہے۔ اُس کی کوشش تھی کہ لوگوں کی روایات، اخلاق اور دین کا خاتمہ کر کے ان کو نقصان پہنچایا جائے۔

اِس پر مغرب کے اکثر دانش وروں کا ایمان ہے۔ وقت نے گاہے بگاہے نسل انسانی کے خلاف اِن کی مکروہ سازشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ چنانچہ نظریہ ڈارون جیسا مہلک ہتھیار اُن کے ہاتھ لگا جو اُن کے وہم و گمان میں نہ تھا۔

پروٹوکولز کہتے ہیں: ''یہ نہ سمجھو کہ ہماری تصریحات کھوکھلے کلمات ہیں۔ غور کرو کہ ڈارون، مارکس اور نطشے کی کامیابی ہم پہلے حاصل کر چکے ہیں۔ ان علوم کے غیر اخلاقی اثرات قوموں کی فکر و شعور میں عنقریب لازمی ظاہر ہوں گے''۔ (۲۱۸) اس دعوے کی حقیقت کو با آسانی جانچا جا سکتا ہے، جب ہم نظریہ ڈارون کے حیرت انگیز اثرات کو علوم و فکر کے مختلف میدانوں میں ظاہر ہوتا دیکھتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نظریہ ڈارون کی مختلف شعبوں پر تطبیق میں زیادہ عمل دخل یہودی فلاسفہ کا ہے۔ اب ہم جان سکتے ہیں کہ اوین اور آغاسیز نے ڈارون ازم کے مستقبل کے بارے میں جو خبر دی تھی، وہ کیوں ناکام ہوئی۔

نظریہ ڈارون کی غیر معمولی مقبولیت اور نشر و اشاعت میں کئی اسباب ہیں۔ مثلاً

لاہوتی ارتقائی نظریات کو مکمل نظر انداز کرنا حتیٰ کہ ''والاس'' جو ڈارون کا ساتھی اور نظریے کے دریافت میں شریک تھا، غیر متخصص لوگوں کے ہاں سرے سے پہچانا ہی نہیں جاتا۔ اس کی وجہ اِس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اُس نے کہا تھا کہ ارتقا کے عمل کے پیچھے ایک مدبّر قوت ہے۔ (۲۱۹)

اس نظریے کو خوب پھیلایا گیا۔ لوگوں نے اِس کو ایسے ہاتھوں ہاتھ لیا گویا یہ کوئی علمی نظریہ نہیں بلکہ عملی طور پر کوئی نیا دین ہے اور یہ مسیحیت کا صرف مناقض ہی نہیں بلکہ اُس کا بدل ہے۔

ڈارون کو جو افسانوی شہرت حاصل ہوئی ہے، وہ شہرت انسانیت کے عظیم ترین محسن سائنس دان جیسے **پاسچر (۱۸۹۵ء)، فلیمنگ (۱۹۵۵ء)** اور **ایڈیسن** بھی حاصل نہ کر سکے۔ مغربی فکری مؤرخین ڈارون کو انسانی فکر کا سب سے بڑا آزادی دہندہ قرار دیتے ہیں، بلکہ بعض اس کو مسیح سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ اس کے بارے میں **ارنسٹ ہیکل** کہتا ہے: ''وہ اٹلس ہے جس نے ایک فکری جہان کو اپنے کندھوں پر اٹھایا ہوا ہے۔ بعض اس کو ''فطرت پر غلبہ پانے والا'' کہہ کر پکارتے ہیں''۔ (۲۲۰)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نظریے کے خلاف جس نے بھی لب کشائی کی کوشش کی، اس پر میڈیا نے یلغار کر دی۔ کلیسا کے مقابلے میں ڈارون کو میڈیا میں مکمل موقع فراہم کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صحافت سودخور یہود کے قبضے میں تھی اور یہ اس مالی مرکزیت کے سبب تھی جو صنعتی انقلاب نے اُن کو عطا کیا تھا۔

یہ سب دلائل بتلاتے ہیں کہ معرکہ فطری نہ تھا اور ایک اجنبی عنصر اندھیرے میں اپنی مداخلت ڈال رہا تھا تاکہ دینی و اخلاقی اقدار کو ملیامیٹ کیا جائے۔ اور یہی مقصد پروٹوکولز کے مدنظر بھی تھا۔

ڈارون ازم کے غلبے کے ساتھ ہی مغربی معاشروں میں ہر طرف الحاد کی موج پھیل گئی اور وہاں سے دنیا کے دیگر علاقوں میں منتقل ہوئی۔ پڑھے لکھے طبقے کی عقلوں پر مادی افکار چھا گئے اور لوگوں کے بڑے بڑے گروہ ایمان باللہ سے مکمل خالی ہو گئے یا خالی ہونے کے قریب ہو گئے۔ اور یورپی زندگی پر عقائدی ابتری چھا گئی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ڈارون کے بعد یورپ نے شیطان کی پوجا شروع کر دی جبکہ اس سے پہلے وہ مسیح کی عبادت کرتا تھا۔ پہلے اُس نے فطرت کی عبادت اپنائی جو ایک غیر علمی کلمہ تھا۔ ڈارون کہتا ہے: ''فطرت ہر چیز کو پیدا کرتی ہے اور تخلیق پر اس کی قدرت کی کوئی حد نہیں''۔ اور کہتا ہے: ''ارتقا کی تشریح اللہ کی مداخلت سے کرنا ایسا ہے کہ جیسے ایک خالص میکانکی نظم میں خارق فطرت عنصر کو ڈالنا''۔ (۲۲۱)

یہ بات صحیح ہے کہ فطرت کو ڈارون سے پہلے بھی پوجا گیا لیکن ڈارون اس کا نیا مبلغ ثابت ہوا۔ انسان اللہ کو چھوڑ کر شیطان کی پوجا میں لگ گیا۔ یورپ نے شیطان کی پوجا اس طرح کی کہ انسان کو معبود بنالیا۔ اِس فکر (انسان پرستی) کا داعی یہودی فلسفی ''نطشے'' تھا۔ اُس کا کہنا تھا: آسمانوں کا الٰہ مر چکا ہے اور اعلیٰ انسان (سپرمین) اس کی جگہ لے چکا ہے۔ اسی وجہ سے پروٹوکولز نے نطشے کو ڈارون اور مارکس کے ساتھ ملایا ہے۔ یہی بات ایک اور ڈارون نواز ملحد ''دولیان ہکسلے'' دہراتا ہے، جس کی مشہور کتاب ''انسان جدید دور میں'' ہے۔ اُس نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان نے اللہ کی فکر اور سوچ اُس وقت تخلیق کی جب وہ عاجزی اور جہالت کے دور میں زندگی گزارتا تھا۔ لیکن اب وہ فطرت سے آگاہ بھی ہے اور اُس پر غالب بھی۔ اب اُسے الٰہی فکر کی ضرورت نہیں، اب وہ بذات خود عابد بھی ہے اور معبود بھی۔

یورپ نے شیطان کی عبادت کا ایک طریقہ یہ بھی اپنایا کہ مادے کو معبود بنایا۔ اس عبادت (مادہ پرستی) کا داعی ایک یہودی تھا۔ یہ مارکس کا دین تھا جس کو آج لاکھوں انسان اپنائے ہوئے ہیں۔

یورپ نے شیطان کی عبادت کا ایک طریقہ یہ اپنایا کہ جنسیت کو معبود بنایا۔ اس عبادت (جنس پرستی) کا مبلغ فرائڈ یہودی ہے۔ شیطان کی پوجا کئی طریقوں سے کی گئی جو سب ڈارون کے نظریے سے استفادہ کرتے ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نظریہ ارتقا نے دینی عقیدے کے انہدام اور تخریب میں بہت بڑا حصہ لیا اور یہ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ دین کی تباہی میں جتنا کردار اس نظریے کا ہے کسی اور نظریے کا نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

② غایت ومقصد کی نفی:

جس حقیقت پر تمام ادیان متفق ہیں اور جس قضیے کو تمام قدیم عقلا مانتے چلے آرہے ہیں، یہ ہے کہ زمین پر انسانی وجود کا مقصد اور غایت ہے۔ خالق نے اس کو خاص ارادے اور حکمت سے پیدا کیا۔ اُس غایت کی ماہیت میں آرا و مذاہب جس قدر مختلف ہوں لیکن عام حقیقت میں کوئی جھگڑا نہیں۔

اس حقیقت نے آنے والی انسانی نسلوں کو مسلسل اس ایمان میں پروئے رکھا۔ یہ اس وجہ سے نہیں کہ یہ فکر مستقل تخلیق کی فکر سے پھوٹتی ہے، جیسا کہ ارتقا کے داعی وہم کرتے ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ یہ دونوں فکریں انسانی تصور اور فطرت میں انتہائی گہری سطح پر پیوست ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آسمانی رسالتیں اِس غایت کے اثبات کے لیے نہیں آئیں بلکہ اس کی یاددہانی اور توضیح کے لیے آئی ہیں۔ ہم فلسفیانہ مباحث پر غور کرتے ہیں، وہ اپنے نظریات کی تشکیل کے لیے کائنات وحیات کی علل غائیہ پر ضرور غور کرتے تھے اور صوری علتوں کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے تھے۔ فلاسفہ کی خاصی محنت ہوتی تھی کہ انسانی تخلیق کی غایت اور اس کے وجود کے وظیفہ پر بحث کریں۔ وہ کیفیت تخلیق اور براہ راست علل پر زیادہ سوچ وبچار نہ کرتے تھے۔

جب **عضویاتی ارتقا** کا نظریہ ظاہر ہوا اور اس نے اعلان کیا کہ انسان مسلسل ارتقائی مراحل کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ انسان ایک بدبودار جوہڑ میں ایک جرثومے کی شکل میں ظاہر ہوا اور ایک بے ربط اور بے ہنگم ارتقائی خط کا سفر طے کر کے موجودہ صورت میں پہنچا۔ اس نظریے کے بعد انسانی تخلیق کی غایت میں غور وفکر کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

یہ نظریہ ارتقائی عمل کو خالص فطرتی عوامل کی طرف منسوب کرتا ہے اور فطرت ڈارون کے بقول اندھی اور بہری ہے۔ ڈارون کے الفاظ اس طرح ہیں: تخبط خبط عشواء، فطرت بے سوچے سمجھے اور بغیر ہدایت وبصیرت کے کام کرتی ہے۔ لہٰذا یہ ایک بے کار کوشش ہوگئی کہ ہم تخلیقی عمل اور انسانی وجود کی مستقل غایت اور مقصود ہدف کے بارے میں بحث کریں۔ مثال کے طور پر اگر فطرت مینڈک کو ارتقا پر قدرت بخشتی اور اُس کو وہ عنایت کرتی جو اتفاقاً انسان کو عطا کیا تو وہ سید المخلوقات ہوتا۔ **دولیان ہکسلے** کہتا ہے: ''یہ بات مسلّم ہے کہ انسان عصرِ حاضر میں سید المخلوقات ہے لیکن اب وہ بلی اور چوہوں کے مرتبے پر اتر آیا ہے''۔ (۲۲۳)۔

اس نظریے کا ظہور اس وقت ہوا جب نظریہ **میکانیت** کا عروج تھا۔ یہ دونوں نظریے کائناتی حوادث کو اندھے قوانین فطرت کی طرف لوٹاتے ہیں تاکہ کلیسا کے الٰہ کی ضرورت نہ رہے۔ چنانچہ اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

ملحد فلسفی برٹرینڈ رسل ڈارونی اثرات کو مزید مضبوط کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

اگرچہ فلسفی یا الٰہیات کے عالم کے امکان میں ہمیشہ یہ بات ہوتی ہے کہ وہ ہر شے کی کوئی نہ کوئی غرض

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈھونڈے۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ فکر علمی قوانین کی بحث میں مفید نہیں۔انجیل میں کہا گیا ہے کہ چاند اس لیے پیدا کیا گیا تا کہ رات کو روشن کرے۔لیکن علما چاہے جو بھی دین اختیار کیے ہوئے ہوں، اِس کو چاند کی علمی توضیح قرار نہیں دے سکتے۔ڈارون کا کام اس حوالے سے فیصلہ کن تھا۔جو کام گلیلیو اور نیوٹن نے فلکیات کے موضوع میں کیا، وہی کام ڈارون نے زندگی کے بارے میں کیا۔

اُس نے ممکن بنایا کہ غرض پر گفتگو کیے بغیر کیفیت کی تفسیر کرے۔فقط ارتقا کی حقیقت نہیں بلکہ **ڈارونی میکانزم** بیان کیا، جیسا کہ **تنازع للبقا** اور **بقاء الاصلح** سے واضح ہے۔چنانچہ اتفاقی اختلافات اور فطرت کا چناؤ فقط ظاہری صوری علل کی تشریحات ہیں۔(۲۲۴)

اس سے یہ ظاہر ہوا کہ مغربی علوم نے غایت کی فکر کو سرے سے نظر انداز کر دیا اور یہ دلیل دی کہ یہ علمی محقق کی ذمہ داری نہیں اور نہ اُس کے دائرہ عمل میں ہے۔علوم طب، فلکیات، جیالوجی، حیاتیات اور دیگر علوم دینی اثرات سے مکمل طور پر آزاد ہو گئے۔اس کی تفصیل علم کے سیکولرزم کے باب میں آئے گی، ان شاء اللہ۔

نظریہ ڈارون کی صورت میں ایمان نے ایسی کمزور فکر کو تسلیم کیا جو علمی اعتبار سے بے قدر و قیمت اور بے وزن تھی۔یہ محض اتفاقات کی فکر تھی۔جب سے **پاسچر** نے **ازخود پیدائش** (Abiogenesis) کے افسانے کو ہمیشہ کے لیے باطل کیا، الحاد کے داعیوں اور دین کے بھگوڑوں کے لیے کوئی چیز نہ تھی جس سے وہ اپنی شرم گاہ چھپاتے چنانچہ انہیں یہی کمزور نظریہ ملا۔

یہ بات بڑی وہشت ناک ہے کہ بہت سارے انسان جو علما کہلاتے ہیں، یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ کائنات اپنی حیرت ناک وسعت اور عظمت کے ساتھ اتفاقاً وجود میں آئی ہے۔

﴿ذَلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ﴾ (ص۔۳۸/۲۷)

یہ گمان تو کافروں کا ہے سو کافروں کے لیے خرابی ہے آگ کی۔

یہ ڈارون ازم کا نظری معیار تھا جو یہاں بیان کیا گیا، رہا واقعاتی عملی معیار تو اُس سے کئی خوف ناک نتائج پیدا ہوئے۔اس نظریے نے زندگی کی قدر و قیمت ملیامیٹ کر دی۔خصوصاً حساس لوگوں پر قنوطیت و محرومی چھا گئی۔یورپ میں مضطرب اور بے چین نسلیں ظاہر ہوئیں جو کسی مقصد کی حامل تھیں اور نہ ہی کسی ہدف پر سوچ و بچار کرتی تھیں۔روحانی مفلسی نے خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں پر ڈیرے ڈال دیے۔اُن کا واحد شغل یہ ٹھہرا کہ اپنی گمشدہ ذات کو تلاش کریں اور نفس کے حقائق و اسرار تلاش کریں۔یہود کے لیے یہ بہترین موقع و محل تھا جس کو انھوں نے اپنے تخریبی نظریات کے لیے استعمال کیا۔چنانچہ **فرائڈ تحلیل نفسی** لے کر آیا۔برگساں روحانیت لے کر آیا اور سارتر وجودیت لایا۔

فلسفی جوڈ "زندگی کی لایعنیت" کے تحت بیان کرتا ہے:

جب مادیت برحق ہے تو ہم زندگی کو کائنات میں کوئی بھی معتبر مقام نہیں دے سکتے، ہم اِس کو دیگر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موجودات کی تفسیر کی اساس نہیں بنا سکتے۔ زندگی فقط ایک ثانوی چیز قرار پاتی ہے جس کو اتفاقات نے ارتقائی سفر کے دوران کہیں سے لا پھینکا۔ زندگی مادے کی عرضی شکل ہے نہ کہ جوہری، جس کے تحت انسان شعور کا مالک بنا۔

زندگی کی بے مائیگی کا شعور سب سے زیادہ یورپی ادب میں ظاہر ہوا۔ جس میں محرومی وضیاع کا احساس عام ادبی مکاتب فکر کی واضح خصوصیت بنا جو خاص طور پر **جنگ عظیم اوّل** کے بعد ظاہر ہوا۔

اگرچہ یورپ میں انتہا درجے کی مادی خوش حالی ہے تاہم اس کی خوف ناک نفسیاتی تباہی اور احساس محرومی کی بنیادی علّت ایمان کا فقدان ہے۔ اسی وجہ سے یہ دور ''**قلق واضطراب کا دور**'' ہے۔

ایک عالم نے سچ کہا ہے: تمام لوگوں میں سب سے زیادہ بدنصیب وہ شخص ہے جو اس دنیا میں آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور وہ نہیں جانتا کہ کیوں آیا اور کیوں گیا۔

③ انسان کی حیوانیت و مادیت:

جب **کاپرنیکس** کا نظریہ فلکیات ظاہر ہوا کہ زمین کائنات کا مرکز نہیں تو یورپی ضمیر نے محسوس کیا کہ اُس کے شرف اور مرکزی مقام کو ٹھیس پہنچی ہے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس نظریے پر ایمان رکھنا براہ راست انسان کے ''سید المخلوقات'' ہونے کی توہین ہے۔ لیکن جب ڈارون اپنا نظریہ لے کر آیا تو معاملہ فقط گھمبیر ہی نہ ہوا بلکہ ایک بہت بڑی آفت آ گئی۔ اس نے دعویٰ کیا کہ انسان دیگر حیوانی مخلوقات کی طرح ایک حیوان ہے۔ اُس نے انسانی عظمت کو تاریخ کا سخت ترین تھپڑ رسید کیا اور انسانی شعور کو سرے سے الٹ کر رکھ دیا۔ اُس نے محسوسات، عقاید واقدار کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا جو تاریخ کی ابتدا سے راسخ چلے آ رہے تھے۔ **جولیان ہکسلے** کے بیان کے مطابق حالات سرے سے بدل گئے:

''ڈارون کے نظریے کے بعد انسان کے بس میں نہ رہا کہ وہ خود کو حیوان شمار نہ کرے''۔ (۲۲۷)

ڈارون نے فقط اس بات پر اکتفا نہ کیا کہ انسان اور بندر کے درمیان نسب قائم کیا بلکہ اس نے دعویٰ کیا کہ انسان کا حقیقی دادا وہ چھوٹا جرثومہ ہے جو کئی لاکھوں سال پہلے ایک ٹھہرے ہوئے جوہڑ میں پیدا ہوا۔ حقیقت میں یہ نسل انسانی کے لیے انتہائی ہولناک صدمہ اور خطرناک موڑ تھا۔

ہاں! ڈارون نے انسان پر براہ راست احکام صادر نہیں کیے اور یہ اس کا حق بھی نہ تھا۔ لیکن جو اُس کے بعد آئے، انھوں نے احکام بھی صادر کیے اور غور کریں کون سے احکام صادر کیے!

اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے نظریے کو اصلاً مفاد پرستی کے تحت لیا اور ایسی توجیہات پیش کیں جو ان کے خفیہ اہداف کے لیے مفید تھیں۔ یہ بات عجیب نہیں کہ ڈارون کے **جدید حامیان**، خوشی سے یا ناخوشی سے، لوگوں کی راہنمائی کے لیے اپنے سابقہ موقف سے رجوع کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انسان ساری مخلوقات سے منفرد ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفاد پرست بھی اپنے تخریبی افکار کو پھیلاتے ہیں جو انسان کو محض

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک حیوان کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ انسان کے مطالب کو فقط حیوانی مطالب تک محدود رکھتے ہیں۔ وہ انسان کا مطالعہ ایسے کرتے ہیں جیسے حیوان کا کیا جاتا ہے۔

انسان کی حیوانیت ڈارون کا واحد نتیجہ نہیں جس نے اُس کو قدر و منزلت سے گرا دیا بلکہ اِس کے ساتھ ایک دوسرا نتیجہ بھی ہے جو کم خطرناک نہیں۔ یہ انسان کی مادیت کا نتیجہ ہے یعنی انسان کا مادی قوانین کے ماتحت ہونا، اُس پر انہی اصولوں کا لاگو ہونا جو ٹھوس جامد مادے پر لاگو ہوتے ہیں۔

چنانچہ ڈارون کی نظر میں انسان اپنے اختیار اور پسند سے ارتقا پذیر نہیں ہو رہا بلکہ اس کا ارتقا مطلق طور پر فطرت کے ماتحت ہے یعنی خارجی حتمی عوامل کے ماتحت۔ یہ درست ہے کہ یہ ارتقا انسان کی مصلحت کے لیے تھا لیکن وہ اُس کے ارادے سے نہ پھوٹتا تھا۔

ڈارونزم سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اپنے دور کے حالات میں یہ کہہ سکتا کہ اللہ نے ہی انسان کے لیے پسند کیا جو پسند کیا کیونکہ اس سے ''میکانیکیت'' کا وصف ضائع ہوتا تھا۔

ارتقائی عمل میں اللہ کی کاریگری کے اعتراف سے دیگر باتوں کا اقرار بھی لازم آتا جیسے روح کا وجود، انسانی وجود کی غرض و غایت وغیرہ جیسا کہ کلیسا ان باتوں کا اقرار کرتا تھا۔ چنانچہ اس وقت یہ بات کہے بغیر چارہ نہ تھا کہ ارتقائی عمل میں فقط فطرتی عوامل ہی مؤثر ہیں اور اُنہوں نے ہی انسان کو ارتقائی عمل کے نتیجے میں تشکیل دیا ہے۔ انسان فقط ایک آئینہ ہے جس میں فطرت کے اچانک ظاہر ہونے والے بے ربط اور بے ہنگم واقعات بغیر کسی ضابطے کے منعکس ہوتے ہیں۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ارتقائی فکر نے بذات خود انسان کی حیوانیت کا نتیجہ نکالا اور مادیت کے عمل کی تفسیر کی جس پر ارتقا کا سفر جاری ہوا۔

ان دو نتائج کا واضح اثر اجتماعی و نفسیاتی مطالعہ جات پر ظاہر ہوا جو انسان کو فقط ایک مجموعے کا جزو یا فرد شمار کرتے ہیں۔

مختلف نظریات پر مبنی یہ مطالعہ جات ایک نقطے پر متفق ہیں کہ انسان حیوان اور مادہ ہے۔ البتہ فروع و نتائج میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

معاشرتی افکار کی مثالوں میں واضح ترین دو نظریے ہیں: کمیونزم اور گروہی عقل کا نظریہ۔ پہلے نظریے کا قائل یہودی کارل مارکس انسان کی حیوانیت سے وہ نتائج نکالتا ہے جو کمیونسٹ بیانات میں واضح ہیں۔ اُس نے بنیادی انسانی مقاصد کو فقط روٹی، مکان اور جنسی شہوت تک محدود کر دیا ہے۔

اس نے اپنی مادیت جو ارتقا کی جبریت سے اخذ شدہ ہے، سے تاریخ کی مادی تفسیر نکالی اور اقتصادی جبریت کا نظریہ وضع کیا۔ اس کا خیال ہے کہ مادی اقتصادی قوتیں ہی انسانی زندگی کی کیفیت اور مخصوص مزاج متعین کرتی ہیں۔ انسانی ارتقا کے مختلف مدارج کے مطابق مختلف انسانی افکار، نظریات اور عقائد پیدا ہوتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب نسل انسانی جابر اور مسلط ارتقائی قوت کے تحت ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہوتی ہے تو زندگی کی شکل وصورت بدلتی ہیں۔ لوگوں کے احساسات، مزاج اور عقائد بدلتے ہیں، معاشرتی اخلاق، عادات اور رسوم ورواج حتمی تغیر سے دوچار ہوتے ہیں۔ (۲۲۸)

دوسرا یہودی مفکر دورخائم نے انسان کی حیوانیت اور مادیت کو اپنے نظریے ''گروہی عقل'' میں جمع کیا۔ اُس کا کہنا ہے کہ انسان معاشرتی جبر کے تحت زندگی گزارنے والا حیوان ہے۔ ہر معاشرہ میں ایک خاص جبر وتسلط ہوتا ہے جسے گروہی عقل انسانی ریوڑ پر لاگو کرتی ہے۔ اُس نے اپنے نظریے کے شواہد گروہوں میں رہنے والے حیوانات کے مطالعہ سے حاصل کیے۔ (۲۲۹)

نفسیاتی مکاتب فکر کی واضح ترین مثال **تحلیل نفسی** کا مکتب فکر ہے۔

یہودی سگمنڈ فرائڈ (Siqmund Freud) نے انسان کی حیوانیت سے اپنا نظریہ اخذ کیا۔ اُس نے کہا کہ ولادت سے وفات تک انسانی رویے اور سلوک کی تمام تر تفسیر خالص حیوانی ہوگی۔ اس کا خیال ہے کہ جنسی محرک ہی انسان کا واحد محرک ہے۔ چنانچہ بچہ اپنی ماں کے پستان جنسی جذبے سے چوستا ہے اور پیشاب بھی جنسی جذبے سے کرتا ہے اور اسی بنیاد پر دوسروں سے مختلف رویے اختیار کرتا ہے۔ انسان کے دین واخلاق سے متعلق بلند پایہ مثالیں بھی جنسی محرک کا شاخسانہ ہیں۔ فرائڈ کے نزدیک انسان فقط حیوان ہی نہیں بلکہ جنسی حیوان ہے۔ اس کی تمام تر سرگرمیوں کے پس پردہ جنسی شہوات ہیں، چاہے وہ ظاہر ہوں یا خفیہ۔ (۲۳۰)۔ اُس نے انسان کی مادیت سے **نفسیاتی جبریت** کو اخذ کیا یعنی انسان اپنی جبلتوں کے تحت بلا ارادہ حرکت کرنے والا انسان ہے۔ انسان اپنی جبلی احکام کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں۔ انسان جبلی احکام سے انحراف کی صورت میں تباہ کن اعصابی امراض کا نشانہ بنتا ہے۔ (۲۳۱)

یہودی دورخائم اور **نفسیات بالعموم** انسان کا ایسے مطالعہ کرتے ہیں جیسے کوئی بھی پستان والا جانور ہو۔ **پاولوف (Pavlov)**، سورانڈیک، واٹسن، ہال وغیرہ نے اپنے جو بھی نفسیاتی نظریات پیش کیے ہیں، وہ اُن تجربات کے نتائج ہیں جو کتوں، بندروں اور چوہوں وغیرہ پر آزمائے گئے۔ (۲۳۲)

اِس طرح نظریہ ڈارون نے فکر ونظر کی ہر سطح پر انسان کی حیوانیت ومادیت سے متعلق فکری اثرات چھوڑے۔ نظریہ ڈارون ہر میدان میں مادی محققین کی خواہش نفس کے عین مطابق تھا۔

④ مطلق ارتقا کی فکر

قرونِ وسطی بھر میں یورپی زندگی سکون اور جمود کا شکار رہی۔ گوشہ نشین یورپی عقلیت نے اُس وقت یہ نتیجہ نکالا کہ ہر چیز کی اصل ثبات مطلق ہے۔ کلیسا نے اپنی جامد رسوم کے ساتھ ہر جدید کا انکار کر کے اس فکر کو راسخ کیا۔ (۲۳۳)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اِس فکر کو سب سے پہلا بھونچال بغیر کسی قصد کے کاپرنیکس کے ہاتھوں آیا۔ چنانچہ زمین کی گردش کا نظریہ اُس دور کے مسلمہ بدیہی امر کے مخالف تھا۔ کلیسا کا نظریہ تھا کہ زمین ساکن ہے اور اُس پر ہر چیز ساکن ہے۔ پھر دریافت اور تحقیق کے میدان میں ترقی ہوئی، بیداری کے دور کا آغاز ہوا جس میں تہذیب یافتہ مشرق کا حصہ بھی تھا۔ یہ نیا ماحول بھی کلیسائی نظریہ کائنات پر ایمان کی کمزوری میں اضافہ کر رہا تھا۔

ارتقا کی فکر کئی اصحاب کے نظریات میں ظاہر ہوئی۔ جیسے اگسٹ کامتے جو عقلی ارتقا کا قائل تھا یعنی انسانی فکر خرافات سے ارتقا پذیر ہو کر دین کی شکل میں ظاہر ہوئی پھر دین سے عقلی اثباتیت کی طرف منتقل ہوئی۔ اسی طرح ہوبز کی فکر میں ارتقا کارفرما ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ انسانی معاشرہ جنگلی وحشیانہ زندگی سے اجتماعی معاشرتی زندگی کی طرف ارتقا پذیر ہوا۔ اسی طرح روسو معاشرتی ارتقا کا قائل تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان طبعی حالت سے لاقانونیت کی طرف منتقل ہوا پھر انسانوں کے مابین عقد اجتماعی کی تشکیل ہوئی۔

لیکن یہ نظریات اس قدر طاقتور اور عام نہ تھے کہ ثبات کی فکر کلی طور پر متزلزل ہوتی تاہم اِن کا اثر ضرور تھا۔

ثبات کی فکر میں زلزلہ ''ڈارون اور اس کے عضویاتی ارتقا'' کے ہاتھوں واقع ہوا۔ ڈارون کے بعد یورپ ثبات مطلق کے ایمان سے منتقل ہو کر ارتقا مطلق کے اعتقاد میں داخل ہوا۔

انیسویں صدی میں پوری یورپی زندگی میں ایک ہمہ گیر تبدیلی واقع ہوئی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ صنعتی انقلاب نے لوگوں کو زرعی ماحول سے صنعتی ماحول کی طرف منتقل کر دیا جس کا لوگوں کے اخلاق، عادات اور معاشرتی طور طریقوں پر بڑا گہرا اثر تھا۔ یہ معاشرتی و اقتصادی ارتقا، تعلیمی و فکری ارتقا کے پہلو بہ پہلو تھا۔

تبدیلی کا شکار ہونے والے اِن حالات میں نظریہ ارتقا پر مبنی ڈارون کی کتاب ''اصل الانواع'' ظاہر ہوئی۔ جس کے بارے میں وسٹ کہتا ہے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کے اثرات انتہائی دور رس ہیں۔ یہ اثرات مطالعہ کا نیا اصول وضع کرنے سے ظاہر ہوئے ہیں۔ یہ نیا اُصول تحرک پر مبنی ہے نہ کہ ثبات و استقرار پر۔ اِس کتاب میں اتنی طاقت ہے کہ اس نے علوم کی تمام اقسام میں انقلاب پیدا کر دیا ہے، فلکیات سے تاریخ تک، آثار قدیمہ سے نفسیات تک اور علم جنین (embryology) سے علم دین تک۔ (۲۳۴)

حقیقت یہ ہے کہ دین میں ممکنہ ارتقا جس کا تصور نظریہ ڈارون سے پیدا ہوا، علمی میدان سے تجاوز کر کے زندگی کے تمام معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی شعبوں وغیرہ تک پہنچ گیا۔ اُس نے دین و اخلاق پر ایک جان لیوا ضرب لگائی۔

یہ بات درست ہے کہ ڈارون نے صراحت کے ساتھ یہ بات نہیں کہی کہ مطلق طور پر کوئی شے ثابت نہیں اور انسانی زندگی متباین حلقوں میں چلتی رہتی ہے جس کا ہر لاحقہ سابقہ سے مکمل طور پر مختلف ہوتا ہے۔ لیکن اُس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا نظریہ اِس کا اشارہ ضرور دیتا ہے۔ ڈارون کی شرح کے مطابق ارتقا دو واضح اجزا پر مشتمل ہوتا ہے یعنی ''حتمیت اور اضطراب''۔ چنانچہ ارتقا کا ہر مرحلہ حتمی طور پر دوسرے مرحلے میں داخل ہوتا ہے اور خارجی عوامل اُس مرحلے کی نوعیت کو متعین کرتے ہیں جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔ جبکہ ارتقائی سفر کا خط تمام مراحل میں بے ہنگم اور مضطرب رہتا ہے، وہ کسی مقرر غایت یا ہدف بعید کے لیے کوشاں نہیں ہوتا۔ فطرت جو اِس ارتقا کو وجود میں لاتی ہے، وہ نہ عاقل ہے اور نہ باشعور، وہ اندھی بہری ہو کر بے بصیرت اور بے ہدایت چلتی ہے۔

حتمیت اور اضطراب کے اصول کے تحت نظریہ ڈارون نے ایسے ارتقا کا پتہ دیا جو مطلق اور ناگزیر ہے اور جس کی نہ کوئی غایت اور نہ کوئی حد۔ 'حتمیت' بتلاتی ہے کہ کوئی بھی چیز مستقل اور دائمی نہیں، اگرچہ وہ دین، اقدار، جامد و رجعت پسند رسوم رواج کیوں نہ ہوں۔ اِن میں سے کسی بھی چیز پر مستقل ڈٹے رہنے کی کوشش، تقدیر سے جنگ ہے جو کبھی نہیں جیتی جا سکتی۔ ارتقائی خط کا اضطراب تمام مستقل اصولوں اور غیر متغیر معیاروں کو لغو قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقط ایک ہی معیار معتبر ہے یعنی کسی بھی چیز کا زمانی اعتبار سے متاخر ہونا۔ چنانچہ ہر بعد والا عقیدہ، نظام اور اخلاق اپنے پچھلے عقیدے، نظام اور اخلاق سے افضل اور مکمل ہے۔

لوبون کہتا ہے: یقیناً زمانہ معبود ہے۔ کیونکہ وہی عقائد پیدا کرتا ہے، اُن کو نشو و نما دیتا ہے اور پھر ان کو مار دیتا ہے۔ زمانے سے ہی عقائد قوت حاصل کرتے ہیں اور اُسی کے زیر اثر ضعف و تحلیل کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمارا حقیقی قائد زمانہ ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم زمانے کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں اور دیکھیں کہ ہر چیز کیسے تغیر کا شکار ہوتی ہے۔ (۲۳۵)

اِس طرح یورپ ارتقائے مطلق پر ایمان لے آیا اور اُس نے ہر تغیر کو، اگرچہ وہ انحطاط کیوں نہ ہو، ارتقا گمان کیا۔

چنانچہ کمیونزم وسعت کے اعتبار سے دنیا کا سب سے بڑا نظریہ ہے۔ وہ اپنی تاریخ کی مادی تفسیر اسی فکر (ارتقا کی حتمیت) سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ کمیونسٹ فلاسفہ کے نزدیک انسانی معاشرہ پانچ حتمی مراحل سے گزرا ہے۔ ہر مرحلے کے اپنے عقائد، اخلاق اور رسوم و رواج ہیں جو اقتصادی حالات اور مادی طور طریقوں کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً زرعی معاشرہ کے اندر انسان دین دار ہوتا تھا کیونکہ زراعت ایک غیبی عمل ہے جس میں انسان کی ذاتی محنت کا زیادہ عمل دخل نہیں ہوتا اور وہ 'غیبی قوتوں' کے اعتقاد پر مجبور ہوتا ہے تاکہ اُس کی کھیتی باڑی جاری اور کامیاب رہے۔

زرعی معاشرہ خاندانی معاشرہ ہوتا ہے جو مختلف رسوم و رواج کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس میں آدمی بنیادی پیداوار کا اصل ذمہ دار ہوتا ہے اور وہی عورت کا بوجھ اٹھاتا ہے، اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ اُسے عورت پر ملکیت کا حق ہے۔ چنانچہ وہ اُس پر اخلاقی قیود لگاتا تھا جس سے زرعی رواج و اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

پھر انسانی معاشرے نے حتمی طور پر ترقی کی اور صنعتی دور کی طرف منتقل ہوا۔ حالات بدل گئے، پیداوار کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عمل غیبی نہ رہا۔ پیداوار کا سارا عمل انسانوں کا قائم کردہ قابل مشاہدہ بن گیا لہٰذا اللہ اور غیب پر ایمان کی ضرورت نہ رہی۔ ارتقا نے انسانی معاشرے پر لازم قرار دیا کہ وہ دین سے آزاد زندگی گزارے۔

عورت اقتصادی طور پر مستقل بالذات ہوئی تو آدمی کے غلبے اور قیود سے بھی آزاد ہوگئی۔ یہ عورت کا حق قرار پایا اور فرض ٹھہرا کہ وہ زرعی دور کے اخلاق و رواج کو اٹھا پھینکے اور ترقی کے ہم رکاب سفر کرے جو آزادی، اباحیت اور جنسیت پر مائل کرتی ہے۔

مختصراً کمیونزم کا خیال ہے کہ ہر زمانے کا اپنا دین، اخلاق اور رواج ہوتے ہیں۔ ہر زمانے کا دین و اخلاق بدل جائے تو اس میں حرج نہیں۔ حرج یہ ہے کہ آدمی صنعتی ترقی کے دور میں جی رہا ہو اور زرعی دور کے جامد رواج اور دین پر ڈٹ جائے۔ معاملہ فقط کمیونزم پر ہی محدود نہیں بلکہ نفسیاتی و معاشرتی علوم یا صحیح قول کے مطابق ان دونوں علوم کے زعما ''یہود اور اُن کے پیروکار'' ہر چیز میں ارتقا پر ایمان لاتے ہیں حتیٰ کہ خود دین میں بھی۔ بلکہ شاید اُن کے ہاں اس سارے عمل کا ہدف ہی دین ہے۔

چنانچہ دور خائم کی عمرانیات نسل انسانی میں دین، شادی، اور خاندانوں کے رواج کو فطری تسلیم نہیں کرتی۔ وہ ان کو گروہی عقل کا جابرانہ تسلط قرار دیتی ہے جو عام افراد پر قائم ہوتا ہے۔ عقل ہمیشہ تبدیلی، ارتقا اور تغیر کا شکار رہتی ہے (یہاں تغیر کا عنصر قابل غور ہے)۔ جب گروہی عقل کسی مرحلے میں کہتی ہے کہ دین، شادی اور خاندان کا وجود ضروری ہے تو اُن کی ضرورت تسلیم کرنی چاہیے۔ اور جب وہ اپنی خواہش کے مطابق یہ کہنے لگے کہ کسی دین، شادی اور خاندان کا وجود نہیں ہونا چاہیے تو افراد کو جلدی سے اس کے تابع ہو جانا چاہیے اور دین، اخلاق، رواج سے نکل جانا چاہیے۔ (۲۳۶)۔ نفسیات، عمرانیات کے ساتھ اس بات میں تو متفق ہے کہ دین فطری نہیں لیکن وہ دونوں اس کے ارتقا کی تفسیر میں اختلاف کرتے ہیں۔

عمرانیات کا خیال ہے کہ دین کی اصل ایک خارجی چیز ہے جو ارواح، کائنات کی غیر معمولی قوت یا قدیم مصنوعی پابندیوں (تابو) وغیرہ سے پیدا ہوا۔ انسان نے اپنی دین داری کی ابتدا جادو اور شعبدہ بازی سے کی، پھر وہ متعدد معبودوں کی عبادت پر ترقی کرتا گیا، پھر وہ توحید کا قائل ہوا جو دین کے دور کی آخری کڑی ہے۔ ارتقائی عمل کے نتیجے میں اُس کے فوراً بعد سائنٹفک دور آیا جس نے دین کی مکمل طور پر نفی کر دی۔

اسی طرح نفسیات یا فرائڈ کا مکتب فکر دین کی ایک گندی تشریح پیش کرتا ہے۔ اُس کے مطابق دین کی اصل ندامت کا احساس ہے جو اولین انسانی معاشروں کے افراد پر مسلط رہتی تھی کیونکہ اُنہوں نے اپنے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ باپ کو قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اُن کے جنسی تعلق کی راہ میں رکاوٹ بنتا تھا جو وہ اپنی ماں کے ساتھ قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ دین کی ابتدا اپنی اولین صورت میں باپ کی عبادت تھی۔ پھر وہ ترقی پا کر ''طوطم'' کی عبادت میں منتقل ہوگئی پھر ترقی پا کر آسمانی دین کی صورت میں خفیہ طاقتوں کی عبادت میں ڈھل گئی۔ ان تمام صورتوں میں ایک ہی پیچیدگی تھی جو کہ اودیب کی پیچیدگی کہلاتی ہے۔ اِن سب باتوں کی صراحت اس کی کتاب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''انسانی نفس اور جبلتیں'' میں موجود ہے۔(۲۳۷)

اخلاق بذات خود کئی مراحل میں ارتقا پذیر ہوئے کیونکہ وہ دین کا جز ہوتے ہیں یا اُس سے حاصل شدہ ہوتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل کے خیال کے مطابق انسانی اخلاق تین مراحل میں ارتقا پذیر ہوئے یعنی قدیم توہمانہ پابندیوں کا اخلاق (تابو کا اخلاق) پھر اطاعت الٰہی کا اخلاق (دین کا اخلاق) اور پھر سائنٹفک معاشرے کا اخلاق (جدید علوم کا اخلاق)۔(۲۳۸)

ولیم جیمس اخلاق پر ڈارونی اثرات کے متعلق کہتا ہے:

ارتقا کے فلسفے نے گزشتہ تمام اخلاقی معیاروں کو لغو کر دیا ہے کیونکہ وہ اُن کو ذاتی شخصی معیار سمجھتا ہے۔ وہ اس کے بدلے میں ایک دوسرا معیار پیش کرتا ہے جس کے ساتھ ہم خیر کو شر سے الگ کر سکتے ہیں۔ چونکہ سابقہ معیارات کسی خاص زمان و مکان کی نسبت سے تھے، اِس لیے وہ قلق و اضطراب کا سبب بنتے تھے۔ اور جس معیار سے یہ راضی ہوئے ہیں، یہ ہے کہ اچھی چیز فقط وہی ہے جو بقا اور غلبہ پر سب سے زیادہ قدرت رکھتی ہو۔ یہی اصل مقرر موضوعی معیار ہے۔

مختصراً یورپ اِس بات پر ایمان لایا کہ مطلق طور پر کوئی چیز ثابت اور مستقل نہیں۔ اِس ایمان کو برٹرینڈ رسل اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے:

ایسا کوئی بلند ترین کمال اور حکمت نہیں جس کے بعد ترقی کی گنجائش نہ ہو۔۔۔ ہم جو بھی عقیدہ اختیار کریں اور اُس کو بلیغ ترین اہمیت کا حامل سمجھیں، وہ وقت کے ساتھ ہمیشہ باقی نہیں رہتا۔ اگر ہم یہ خیال کریں کہ ہم ابدی حقیقت کو جان چکے ہیں تو مستقبل اس بات کا ضامن ہے کہ ہم پر ہنسا جائے گا۔(۲۴۰)

یہ بات درست ہے کہ کچھ ایسے مفکرین بھی تھے جنھوں نے مطلق ارتقا کی فکر کا معارضہ کیا لیکن اُن پر کڑی تنقید کی گئی، انہیں رجعت پسند، پس ماندہ اور تہذیبی ارتقائی سفر میں رکاوٹ قرار دیا گیا۔

کارل بویر کہتا ہے: ''مجھے اُن لوگوں سے شدید خوف محسوس ہوتا ہے جو ارتقائی فکر کے حامل ہیں۔ وہ اپنے موقف کے مخالفین کو اصلاح و روشن خیالی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ وہ نظریہ ارتقا کو روایتی فکر کے مقابلے میں ایسا انقلاب سمجھتے ہیں جو حتمی اور لازمی ہے''۔(۲۴۱)

لوبون کہتا ہے: ''بادشاہت کے حامی عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ بندر کی اولاد نہیں اور جمہوری مکمل طور پر اُن کے الٹ ہیں''۔

اس طرح 'مطلق ارتقا کی فکر' نظری علوم کی تمام اقسام میں راسخ ہوئی اور زندگی کے ہر میدان میں لاگو ہوئی۔ یہ موجودہ تہذیب کی سب سے بڑی نشانی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصطلاحات: ٦

وحدت (Monism)

یہ نظریہ کہ دنیا کی ہر شے ایک ہی بنیادی شے کے مختلف مظاہر ہیں۔ ثنویت کے برعکس۔

مادہ پرستوں کے نزدیک یہ مادہ ہے اور مثالیوں کے نزدیک ذہن، شعور، روح یا نفس۔

مادیت (Materialism)

وہ نظریہ جس کی رو سے مادہ حقیقت اولیٰ ہے۔ یعنی مادہ اولین حیثیت کا حامل ہے اور نفس و شعور کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کی دو بڑی اقسام ہیں: میکانکی مادیت اور جدلیاتی مادیت۔

مادیت کے مقابلے میں مثالیت (Idealism) ہے۔

مثالیت کے مطابق حقیقت اولیٰ ذہن، روح اور اس کے تصورات ہیں۔ مادی دنیا کی حیثیت ثانوی ہے یا غیر حقیقی۔

مادیت کا غلبہ پندرہویں صدی کے بعد ہوا۔ پانچویں صدی سے پندرہویں صدی تک جاگیری نظام اور مذہب کی حاکمیت رائج تھی جس کے نمائندے آگسٹائن، ابیلارڈ، اکیوناس، ابن رشد وغیرہ تھے اور فلسفہ مذہب کا غلام تھا۔ پندرہویں صدی کے بعد فلسفہ مذہب کی غلامی سے آزاد ہوا۔

مثالیت مادیت کی بہ نسبت دین سے قریب ہے لیکن مکمل طور پر دین کے مطابق نہیں۔

غائیت / مقصدیت (الغائیۃ۔Teleology)

یہ نظریہ کہ نظام کائنات ایک منصوبہ بندی، مقصد اور غایت پر مبنی ہے اور کسی مخصوص منزل کی جانب محوِ سفر ہے۔ اس کے الٹ میکانیت یا آلیت (Mechanist Philosophy) ہے۔ یورپ میں دین کے زوال کے بعد آلیت یا میکانیت کا نظریہ عروج پکڑ گیا۔

نظریہ ارتقا (تطوّر۔Evolution theory)

یہ نظریہ کہ موجودہ زندہ اجسام بتدریج سادہ بسیط اجسام سے مرکب اور پیچیدہ اجسام کی طرف ترقی کرتے ہوئے وجود میں آئے۔ لیمارک کے نزدیک ارتقا کے پیچھے کسی مقصد اور منصوبہ بندی کا ہاتھ ہے لیکن ڈارون کے نزدیک یہ فطرت کی اندھی بہری قوتیں ہیں۔ ڈارون کی کتاب اصل الانواع ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ سوم

یورپی زندگی میں سیکولرزم

باب ⑦ سیاست اور قانون کا سیکولرزم

باب ⑧ اقتصاد کا سیکولرزم

باب ⑨ علم کا سیکولرزم

باب ⑩ معاشرت واخلاق کا سیکولرزم

باب ⑪ یورپ میں عورت کی آزادی اور حقوق

باب ⑫ ادب وفن کا سیکولرزم

باب ⑬ دین کے لیے باقی کیا بچا؟

باب: الحاقی۔ ا

سرمایہ دارانہ نظام، بنیادی تعارف

(مغربی تہذیب پر ایک جامع نظر)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۷

سیاست وقانون کا سیکولرزم

بحث اوّل: مسیحی دور میں سیاست وقانون

یہ بات پہلے باب میں گزر چکی ہے کہ مسیحی شریعت عملی دنیا میں لاگو نہیں کی جا سکی۔ ہم وہاں یہ ذکر بھی کر چکے ہیں کہ بعض تاریخی رکاوٹوں نے کس طرح اُس معاشرہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالی جو مسیحی شریعت پر قائم ہونا تھا۔

یہ بات درست ہے کہ یورپ کی عملی زندگی مسیحی شریعت پر قائم نہ ہو سکی اور مسیحی حکام کا ذاتی کردار بھی مثالی مسیحی نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسیحی شریعت کا یورپ کی سیاست، اقتصاد اور معاشرت پر سرے سے کوئی اثر نہ تھا۔ مخلص مبلغین مثالی مسیحی اخلاق کو پورے ذوق وشوق سے لوگوں میں پھیلاتے اور اس طرح دینی پیشواؤں کا عوام کے اندر طاقتور اثر ورسوخ قائم ہوتا جس سے وہ بھرپور فائدہ اٹھاتے۔

کلیسا کی کچھ سیاسی آرا تھیں جن کے مجموعے سے اُس کا سیاسی نظریہ اخذ کرنا ممکن ہے۔ یہ نظریہ کلیسا کا ذاتی نقطہ نظر ہے، دین کے وہ احکام نہیں جو اللہ کی طرف سے صراحتاً نازل ہوں۔

کلیسا کا نظریہ اپنی کامل صورت میں اُن خیالی نظریات کے مشابہ ہے جو فرضی مثالی شہروں (یوٹوپیا) کی صورت میں بیان کیا گیا۔ یہ آگسٹن کا نقطہ نظر ہے۔ وہ ایک مسیحی دینی بزرگ ہے کوئی رومی فلسفی نہیں۔ اس نے اپنا نظریہ اپنی کتاب ''خدا کا شہر'' میں بیان کیا ہے۔ آگسٹن کی فکر بنیادی طور پر درست ہے کہ دنیا میں فقط دو قسم کے شہر ہوتے ہیں، تیسری قسم نہیں ہوتی۔ یا اللہ کا شہر یا شیطان کا شہر۔

لیکن اس سے جو غلطی واقع ہوئی، یہ ہے کہ وہ ہر شہر کی الگ خصوصیات بیان کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ اللہ کا شہر وہ ہوتا ہے جس کی حکومت کو کلیسا کے فادر چلاتے ہیں اور شیطان کا شہر وہ ہے جس کو دنیا کے افراد چلاتے ہیں۔ پھر اللہ کے شہر کی ایسی تخیلاتی تصویر کشی کرتا ہے کہ اس نظریہ کی عملی تطبیق اگر ناممکن نہیں تو نادر ضرور ہے۔ (۲۴۲)

کلیسا کے اثر ورسوخ کے طویل دور میں جو نظریہ سب سے زیادہ رائج رہا، یہ تھا کہ کلیسا کی نظر میں حکام کے لیے دینی پیشوا ہونا ضروری نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ دینی پیشواؤں کے اختیارات کے ماتحت ہوں۔

کلیسا اپنی تحریف اور شریعت الٰہی سے غفلت کے سبب زندگی کے مکمل شعبوں کی تنظیم بذات خود نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرسکتا تھا۔ پھر اُس کا دنیا کی زندگی کے متعلق نظریہ بھی غلط تھا۔ کلیسا کا ایمان اِس قاعدے پر تھا: ''قیصر کو وہ دو جو قیصر کا ہے اور اللہ کو وہ دو جو اللہ کا ہے''۔ وہ اس عبارت سے ایک خاص مفہوم لیتے تھے۔ چنانچہ قرونِ وسطیٰ کے بادشاہ اور شہنشاہ کسی نہ کسی طرح دینی پیشواؤں کے ماتحت ہوتے تھے۔ وہ خود کو فقط مسیحی شمار نہ کرتے تھے بلکہ مسیحیت کے سپاہی سمجھتے تھے جیسا کہ صلیبی جنگوں میں ہوا۔ کلیسا سے خطرناک غلطی یہ ہوئی کہ اُس نے اُن کے دینی جذبات کو اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل میں استعمال کیا، اُن کو شریعت الٰہی کے بجائے پاپاؤں کی خواہشات کے تابع کر دیا۔ (۲۴۳)

یہ بات درست ہے کہ اُن کا دین پر ایمان اس تنگ دائرے میں محدود تھا جو کلیسا نے مقرر کیا اور جو قدیم بُت پرستانہ تصورات سے آلودہ تھا۔ لیکن وہ خود کو سیاسی اُمور میں دینی اخلاق کا پابند سمجھتے تھے، اگرچہ وہ فقط ظاہری پابندی ہو، کیونکہ یہ اُن کے مسیحی ہونے کا تقاضا تھا۔

سیاسی عمل کی ضرورتوں نے، جیسا کہ ان کا دعویٰ تھا، اُن کو مجبور کیا کہ وہ مسیحی روح کی مخالفت کریں۔ چنانچہ وہ معاہدے توڑتے، بے قصور لوگوں کو ہلاک کرتے، اور دھوکے جھوٹ کو اپنی سیاسی مصلحتوں کی تکمیل میں جائز قرار دیتے۔ لیکن انھوں نے اِس کو عام مسلک نہیں بنایا اور دینی تعلیمات کے منافی امور کے لیے کوئی عقلی جواز نہیں تراشا۔

بسا اوقات ان میں سے کوئی شوق رکھتا تھا کہ اسے کوئی جواز حاصل ہو جس کے تحت وہ اپنے نفسیاتی دباؤ اور ضمیر کی سزا دور کر سکے۔ لیکن ایسے جواز کا تاریخی طور پر پتہ لگانا ناممکن ہے۔

یہ بات درست ہے کہ کلیسا نے ریاست کے معاملات کی تنظیم کو نظر انداز کیا اور رومی قانون اُن کی آنکھوں کے سامنے لاگو کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ صرف حکام کے ذاتی کردار کے بارے میں سخت تھے اور اس بارے میں عوام کے جذبات اور قوم کا ضمیر بھی اُن کے ساتھ تھا۔ شہنشاہ مسیحی اخلاق کو تھامنے پر مجبور تھے تاکہ کلیسا کی رضا حاصل کر سکیں کیونکہ اُن کی بادشاہت کا جواز اُس کی رضا کے مرہونِ منت تھا۔ کلیسا اُن کی تاج پوشی کرتا، اُن کی حکومت کو مقدس قرار دیتا اور برکت کی دعا کرتا۔ کلیسا کا یہ بھی حق تھا، جیسا کہ پوپ گریگوری ہفتم نے کہا ہے، کہ وہ بُرے بادشاہوں کو معزول کرتا اور رعایا کو اُن کی اطاعت سے آزاد کرتا۔

اِس اعتبار سے دیکھیں تو یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ معاصر مفہوم کے مطابق سیاست اور دین و اخلاق کی علاحدگی قرونِ وسطیٰ کے سیاست دانوں کے ہاں معروف نہ تھی۔ اگرچہ یورپ واقعاتی طور پر تاریخ کے کسی دور میں اللہ کی شریعت کو قانونی طور پر نافذ کرنے والا نہ تھا۔

قبل جدید سیاسی نظریات:

کلیسا کے سیاسی نظریے سے آگے بڑھیں تو موجودہ لادین سیاسی فکر تک پہنچنے سے پہلے کئی دیگر نظریات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظر آتے ہیں۔ان میں زیادہ مشہور تین نظریات ہیں:

① خیالی نظریہ۔
② عقد اجتماعی کا نظریہ۔
③ نظریہ حق الٰہی۔(Divine Right of Kings)(۱۶۵۰ء۔۱۷۷۵ء)

① خیالی نظریہ:

یہ نظریہ قدیم دور سے یونانی فکر میں معروف ہے۔کیونکہ فلاسفہ اپنے دور کے بُرے حالات سے بھاگ کر خیالات کی وسیع دنیا میں چلے جاتے۔وہ اپنے ٹیڑھے خواب وخیال سے ایسے مثالی معاشرے اور شہر تشکیل دیتے جو امن وسکون، ایثار اور مساوات کے خواب ناک ملائکی ماحول پر مبنی ہوتے!

اس کی قدیم مثالوں میں **افلاطون** کی ''جمہوریہ'' (۲۴۴) ہے۔اِس نظریے کی عملی تشکیل کے لیے مسیحیوں کی نمایاں ترین کوشش **یوٹوپیا از تھامس مور** (۱۵۳۵ء) اور **مدینۃ الشمس از کامپانیلا** (۱۶۳۹ء) ہے۔

ہمارے لیے اہم بات یہ ہے کہ یہ نظریہ دین کو ایسا لائحہ عمل اور بنیاد نہیں بناتا جس پر زندگی قائم ہو اور اُس کے تمام تصورات واقدار پھوٹیں۔یہ نظریہ اپنے عقلی تانے بانے کے مطابق خالص دنیوی مصلحت کو ایسی بنیاد بناتا ہے جس پر لادین معاشرہ تعمیر ہو سکے۔اگرچہ اس نظریے کے بعض خیالی مفکرین جیسے تھامس مور نے اپنے شہر میں دین کا وجود تسلیم ضرور کیا ہے لیکن یہ بے کار شخصی دین ہے جس کا عملی سیاسی زندگی پر کوئی اثر نہیں۔(۲۴۵)

یہ خطرناک فکر لاشعوری طور پر اُن تعلیم یافتہ ذہنوں میں جم گئی جو اس قسم کی عقلی کتب پڑھنے کے شوقین تھے۔اُن میں اس اِحساس نے جنم لیا کہ زندگی فقط اُس وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب دین کو عملی دنیا سے الگ کر دیا جائے اور وہ فقط جامد رسومات کی شکل میں باقی رہ جائے۔بلکہ اِس نظریے نے یہ امکان ظاہر کیا کہ خوش حال کامل زندگی کا قیام بغیر دین کے ممکن ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے افکار کو ایسے ماحول میں قبول کرنا آسان ہے جو کلیسا کی اندھی سرکشی اور سخت گیر پالیسی کے تابع ہو۔

② نظریہ عقد اجتماعی:

قرونِ وسطیٰ کے فلسفیانہ مکاتب میں دوسرا مشہور ترین فلسفہ ''مدرسی فلسفہ'' تھا جو **ارسطو، افلاطون** کے فلسفے اور پورے یونانی ورثے کو مقدس سمجھتا تھا، اگرچہ یہ وثنیت سے لبریز تھا۔**ارسطو** کی فکر یہ تھی کہ انسان معاشرتی حیوان ہے۔(۲۴۶)۔یا عربی مصادر کے مطابق مدنی الطبع ہے یعنی انسان قدیم زمانے سے ایک معاشرے کی شکل میں رہتا چلا آرہا ہے۔یہ نظریہ اُن مسلمات میں سے جس کی دلیل کی ضرورت نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن ایک مفکر ''ہوبز'' کا خیال ہے کہ انسان اصلاً بھیڑیا ہے جو دوسرے انسانوں سے کینہ وعداوت رکھتا ہے۔ ہوبز کی تعبیر کے مطابق انسان اپنی ابتدائی طبعی حالت میں ایک مسلسل جنگ کی کیفیت میں تھے پھر لوگ ایک معاہدے پر مجبور ہوئے تا کہ ایک دوسرے کے حقوق امن وسلامتی کے ساتھ پورے کر سکیں۔

ہوبز کے خیال کے مطابق انسان طبعاً شریر ہے۔ لہٰذا ایک ایسی قوت نافذہ کی ضرورت تھی جو معاہدہ سے اعلیٰ ہو۔ اور اُس کی ذمہ داری ہو کہ وہ معاہدے کو افراد پر جبری طور پر نافذ کرے۔ یہ قوت ریاست یا حکومت کہلاتی ہے۔ (۲۴۷)

اس نظریے سے ہوبز ایک غلط نتیجے پر پہنچا۔ وہ معاہدہ کی جبری تنفیذ کی خاطر ریاست کی سرکشی کو جائز قرار دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہوبز کا نظریہ بعد والے محققین کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ (۲۴۸)

ہوبز کے بعد جان لاک (۱۷۰۴ء) آیا۔ جو اُس کے ساتھ اِس بات میں متفق ہے کہ افراد و ریاست کے مابین ایک **عقد اجتماعی** ہونا چاہیے لیکن وہ عقد کی تنفیذ پر نگران حکومت کے اقتدار کو مطلق قرار نہیں دیتا۔ اُس کا خیال ہے کہ یہ اقتدار لوگوں کی قبولیت کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لیے جب اس اقتدار پر اعتماد ختم ہو جائے تو اقتدار کو بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ (۲۴۹)

آخر کار یہ فکر جان جاک روسو (۱۷۷۸ء) کے ہاتھوں تکمیل تک پہنچی لیکن اُس کا اور ہوبز کا ایک اساسی فرق یہ ہے کہ روسو کے نزدیک انسان کی طبعی حالت اُس کی تاریخ کا سنہری دور ہے لیکن انسان عملاً اپنے مفادات اور ''ادیان'' کے اثرات کے تحت اِس فطری پاکیزگی سے عاری ہو گیا اور انارکی میں مبتلا ہو گیا۔ اس طرح ایک عقد اجتماعی کی ضرورت پیش آئی تا کہ لوگوں کی زندگی منظم ہو سکے اور ان کو طبعی حالت کی طرف لوٹایا جا سکے۔ (۲۵۰)

اس نظریے پر عام اشکال یہ ہے کہ اس میں عام اور خاص ہر طرح کی صورت حال کے لیے دین کے کردار کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ روسو دینی اثر کو معاشرے کی راہنمائی کے لیے فقط نظر انداز ہی نہیں کرتا بلکہ دین الٰہی کو اُن عوامل میں سے ایک شمار کرتا ہے جو صحیح فطری حالت کی طرف لوٹنے میں ایک رکاوٹ ہے۔

جب روسو دین اور سیاست کی علیحدگی کا مطالبہ کرتا ہے تو وہ **ادیان** پر تہمت لگاتا ہے کہ یہی اُس علیحدگی کا سبب ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ قدیم عوام بادشاہوں کی عبادت کرتے تھے۔ ہر ریاست کا بادشاہ بذات خود معبود بھی تھا۔ اُس وقت سیاست اور دین ایک تھا۔ لیکن ادیان نے، جن میں سے ایک مسیحیت ہے، مادی دنیا اور روحانی دنیا میں تفریق ڈال دی۔ ادیان روحانی دنیا سے متعلق ہو گئے اور معاشرے کی سیاسی قانونی ضرورتوں کو نظر انداز کر دیا تو ایسے معاشرے کا اپنا الگ خاص سیاسی دین کیوں نہ ہو؟

روسو کا دین پر بڑا سخت حملہ تھا۔ اُس کا مطالبہ تھا کہ دین کو عملی زندگی سے الگ کیا جائے۔ اِسی وجہ سے بعض مغربی محققین نے کہا ہے کہ اس کی کتابیں معاشرہ اور اللہ کے خلاف اعلان جنگ ہیں۔ (۲۵۱)

اس نظریے کو تقویت دینے والا ایک عامل **فرانسیسی انقلاب** ہے جو اِس نظریے کے بنیادی اُصولوں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلاسفہ خصوصاً روسو کی آرا پر مرتب ہے۔ روسو کی کتاب جو اسی نظریے ''عقد اجتماعی'' کے نام پر مشتمل ہے، فرانسیسی انقلاب کی انجیل شمار ہوتی ہے۔

عقد اجتماعی یا معاہدہ عمرانی کے نظریے نے لوگوں کو وطنیت اور قومیت کی ایک نئی راہ دکھائی۔ کیونکہ یہ معاہدہ انسان اور اُس معاشرے کے درمیان تھا جس میں وہ زندگی گزارتا تھا۔ یہ نظریہ انفرادیت پسندی کے موافق تھا نہ کہ اجتماعیت پسندی، چنانچہ اس میں فرد کی کسی معاشرے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، چاہے اُس کے ساتھ اُس کا دینی تعلق کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو۔ یہ نظریہ فرد کی محبت اور وفاداری کو کلیسا سے توڑ کر ریاست کے سپرد کرتا ہے۔ وہ دینی تعلقات کاٹ کر اُن کی جگہ وطنی تعلقات قائم کرتا ہے۔ اسی طرح وہ مادی دنیوی مصلحت کو سب سے بڑی قدر و قیمت دیتا ہے کیونکہ اسی کی خاطر تو معاہدہ کا وجود عمل میں آیا۔ سب سے اعلیٰ قدر وہ اخروی مقام نہیں جس کی بشارت ''مسیحیت'' نیکیوں اور فضائل اختیار کرنے کے ساتھ دیتی تھی جس کو معاشرہ سب سے قیمتی ترین ہدف قرار دیتا تھا۔

اسی وجہ سے یہ بعید نہیں جو ویلز نے کہا ہے کہ روسو جتنا عقد اجتماعی کی ضرورت پر زور دیتا ہے، اُس سے زیادہ اس کے توڑنے اور گرانے پر عذر تلاش کرتا ہے۔ (۲۵۲)

③ نظریہ حق الٰہی:

عہد ماقبل اسلام میں بادشاہ عوام کو اپنا غلام سمجھتے تھے۔ اُن کا گمان تھا کہ وہ عام انسانی عنصر سے بلند ہیں اور خاص نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض سرکش بادشاہوں نے یہاں تک غلو کیا کہ الٰہوں کی نسل سے ہونے یا بذات خود الٰہ ہونے کا دعویٰ کیا جیسا کہ روم کے شہنشاہ۔ اُن میں سے کسی کے دل میں یہ خیال تک نہ تھا کہ اُن کے ذمے عوام اور خدا کی طرف سے کچھ واجبات بھی ہیں، کرسی و منصب فقط ایک شان و شوکت ہی نہیں بلکہ ذمہ داری بھی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ عوام اُن کے سامنے جو مراسم خدمت، جذبہ وفاداری اور جان مال کی قربانی پیش کرتے ہیں، وہ ایک مقدس واجب ہے جو معزز تخت شاہی کے لیے ادا کیا جاتا ہے۔

دین اسلام آیا اور اُس نے اِس فکر کو بنیادوں سمیت اکھاڑ دیا۔ اُس نے ہر قسم کی عجز و انکسار اور بندگی اللہ اکیلے کے لیے مختص کی اور حکمرانوں پر امت کا مرکز ہونے کے ناطے پابندیاں اور ذمہ داریاں لاگو کیں۔ آباد دنیا جانتی ہے کہ مسلمان حکمران لوگوں کی بھلائی کا خیال رکھتے تھے اور ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھاتے ہیں اور اُن کا اپنی امت سے زیادہ بڑا فرق بھی نہیں تھا۔

لیکن وہ خطے جہاں اسلام کی روشنی داخل نہ ہو سکی، خصوصاً وحشی دور کا یورپ، وہ سرکش حکمرانوں کے جوتے تلے دبے رہے۔ یورپی معاشرہ صدیوں تک معمولی انسان کی عبادت میں لگا رہا یعنی شہنشاہ یا پوپ۔ پہلے کا دعویٰ تھا کہ اُسے لوگوں پر حسب منشا اور حسب خواہش حکومت کا حق ہے۔ دوسرا اپنے نقش قدم کو بابرکت گردانتا تھا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور عوام پر اپنی ذاتی اطاعت لازم قرار دیتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہی اللہ نے حکم دیا۔

اسی طرح یورپ کے شاہی تختوں پر مخصوص خاندان اور نسلیں ایک دوسرے کی وارث بنتی رہیں۔ کسی شخص کو اُن سے مقابلے کی جرأت نہ تھی اور نہ کسی انسان کے لیے یہ گنجائش تھی کہ وہ پوچھ سکے کہ یہ لوگ کیوں حکومت کرتے ہیں؟ اور کس قانون کے تحت حکومت کرتے ہیں؟ سارے عوام اس پر مکمل طور پر مطمئن تھے کہ اُن کی حکومت براہ راست اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اخذ شدہ ہے۔

ایسے فلاسفہ اور محققین ظاہر ہوئے جو اِس استبداد اور غلامی کو جائز قرار دیتے تھے اور اُس کو کئی طرح کی فلسفیانہ تشریح و تعبیر کے ساتھ پیش کرتے۔ چنانچہ ہوبز آیا تا کہ اپنے دور کے بادشاہوں کی خوش آمد کر سکے، اُس نے مطالبہ کیا کہ بادشاہوں کے لیے مطلق اقتدار کا حق ہے، البتہ وہ عقد موہوم کی تنفیذ کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اسی طرح **جان بودان** (۱۵۹۶ء) اور **گروٹیس** (۱۶۴۵ء) بھی اسی مطلق استبداد کا دفاع کرنے والے تھے۔ بودان اس کی علّت یہ بیان کرتا تھا کہ غیر مطلق اقتدار انقلابات، فتنوں اور مختلف پارٹیوں کی کشمکش کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ وہ عقد **اجتماعی** کا انکار کرتا تھا کیونکہ وہ فرد کو ریاست کی تشکیل میں شرکت کا شعور بخشتا ہے۔

گروٹیس استبدادیت کا دفاع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ قانون طبعی کو معاشرہ پر لاگو کرنے کا سب سے افضل راستہ ہے۔ اس کے نزدیک جب لوگ ایک دفعہ اِس قسم کی حکومت پر راضی ہو جائیں تو پھر ہمیشہ کے لیے اُن کا حق رجوع ختم ہو جاتا ہے۔ (۲۵۳)

انیسویں صدی میں یہ افکار اپنی پیچیدہ فلسفیانہ فکر میں **ہیگل** (۱۹۰۰ء) کے ہاتھوں ڈھلے۔ اس کا مکتب فکر ایک ایسا پل تعمیر کرتا ہے جو مسیحی عقائد اور خالص فلسفیانہ نظریات کو آپس میں ملاتا ہے۔ اس فکر کے اساتذہ نے جس بات کو سب سے زیادہ ثابت کیا ہے وہ دین کو فکر و منطق میں تبدیل کرنا ہے۔

چنانچہ اللہ، مطلق میں تبدیل ہو گیا، وحی معرفت مطلق میں، مسیح توسط میں بدل گیا، شریعت قانون مجرد میں بدل گیا۔ یعنی عقیدہ بذات خود زندگی ہے اور عقائد بذات خود وہ رموز ہیں جو حقائق کو واضح کرتے ہیں۔ (۲۵۴)

ہیگل کا خیال تھا کہ تاریخ اس چیز کا نام ہے کہ ترقی کے مفہوم کی بنیاد پر قائم کوئی منطقی تصور جیسے نظام، عقلیت اور حریت وغیرہ کیسے وجود پذیر ہوتا ہے۔ ریاست فقط **عقد اجتماعی** وغیرہ کے طریقے سے تشکیل نہیں پاتی بلکہ یہ ایک الگ تھلگ طبعی وجود ہے جو حریت کو مجسم شکل دیتی ہے اور تاریخی ارتقا کا بغور مشاہدہ کرتی ہے۔

ہیگل کے نظریہ تاریخ کے مطابق تاریخ جدلیت کے قانون کے تحت ایک ارتقا کا نام ہے جو پروسیا (Prussia) کی سلطنت میں اپنے انتہائی عروج کو پہنچا۔ یہ سلطنت ہیگل کی ہم عصر تھی جس میں مطلق حریت اور الوہیت کو مجسم شکل دی گئی۔ (۲۵۵)

دیگر نظریات کی طرف سے اس نظریے پر سخت تنقید کی گئی کیونکہ یہ بدمعاش استبداد کو مقدس قرار دیتا تھا۔ اور اس کا بعض لوگوں خصوصاً جرمنوں پر بڑا گہرا اثر تھا جو ڈکٹیٹر شپ کی اطاعت، وفاداری اور خدمت کے لیے تیار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے۔ وہ اس فکر میں اپنے اعلیٰ قومی اوصاف کو مجسم دیکھتے تھے۔ چنانچہ بسمارک (۱۸۹۸ء) ماضی کی صدی میں مقدس تھا اور ہٹلر بیسویں صدی میں۔

اس سے ماکس ویبر (۱۹۲۰ء) نے اپنا نظریہ کاریسما اخذ کیا۔ اس کے ہاں اس کا مطلب یہ تھا کہ فطرت ایک مخصوص چنی ہوئی اقلیت کو خاص قوت عطا کرتی ہے جو اپنے مخصوص لیڈروں کو پہچانتی ہے۔ پھر ان لیڈروں کا اثر ورسوخ لوگوں کے ہاں اِس عام عقیدے کے ساتھ پھیل جاتا ہے کہ یہ اللہ کی روح سے ہیں جیسے پولیوس قیصر اور نپولین۔ (۲۵۶)

یہ نظریہ، اگرچہ سابقہ نظریات کی طرح دین کا دشمن نہ تھا، لیکن اس نے دین کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس نے اپنی لفظی نسبت دین سے جوڑی اور یہ دعویٰ کیا کہ بادشاہ اپنے اقتدار کو اللہ کی تفویض سے حاصل کرتے ہیں۔ اس نظریے کی وجہ سے دین کے خلاف ایک سخت ردِّعمل پیدا ہوا۔ جو لوگ حریت کے داعی تھے، انہیں دین پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ انھوں نے دلیل پیش کی کہ یہ نظریہ استبداد کو بابرکت قرار دیتا ہے اور ڈکٹیٹرشپ کو مقدس سمجھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جبر واستبداد کے حامل حکمران جو نظریہ حق الٰہی کی آڑ لیتے تھے، قانون الٰہی کی تنفیذ میں سب سے زیادہ دور تھے۔ پھر اُن کے پاس کوئی دلیل نہ تھی کہ اللہ نے اُن کو امتوں پر مسلّط ہونے اور قوموں کو اُس کے نام پر ذلیل کرنے کا حق عطا کیا ہے۔

تاریخی حقیقت تاکید اً ثابت کرتی ہے کہ عدل ربانی اور انسانی سرکشی ایک دوسرے کے منافی ہیں جو کبھی اکٹھے نہیں چل سکتے۔ جو حکمران عملاً قانون الٰہی کے مطابق حکومت کرتے ہیں اور اپنے اقتدار میں وحی الٰہی سے سند پکڑتے ہیں۔ حقیقت میں وہ سب سے زیادہ عدل وانصاف اور رحمت وتواضع والے ہوتے ہیں۔ انھوں نے کامیابی کے ساتھ عملی دنیا میں وہ سب کچھ ثابت کر دکھایا جو فلاسفہ فقط خیالی طور پر پیش کرتے ہیں۔ دیکھیے انبیا کی سیرت جنھوں نے بنی اسرائیل پر حکومت کی اور نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کی سیرت اور جو اُن کے نقش قدم پر چلے۔ ان میں اعلیٰ اور مثالی حکومت کی واضح تصویر نظر آئے گی۔ اس کے برعکس سرکش حکمران جو نظریہ حق الٰہی کے ساتھ پھولے نہیں سماتے، جبر واستبداد کی بدترین مثال پیش کرتے ہیں۔

حکمران قانون الٰہی کے جتنا قریب ہوگا، اس کی حکومت اتنی صاف ستھری اور راہ راست پر ہوگی، اللہ کی خشیت اُس کو ظلم سے روک دے گی۔ اور قانون الٰہی سے دور ہونے والا حکمران ظلم کی گھاٹیوں میں جا گرے گا اور اُس کی حکومت انواع واقسام کے ظلم وجور سے آلودہ ہو جائے گی۔

خلاصہ کلام یہ کہ نظریہ حق الٰہی درست نہیں کیونکہ یہ حکام کی طرف ایک من گھڑت تقدس منسوب کرتا ہے اور یہ تاثر دیتا ہے کہ وہ اللہ کے حکم وارادے سے اعمال بجالاتے ہیں۔ اِسی طرح حریف ثانی بھی درست نہیں جو کہتا ہے کہ دین سرکشی پھیلاتا ہے اور استبداد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث دوم: جدید و معاصر نظریات

سیاسی مفکرین نے انیسویں اور بیسویں میں سابقہ سیاسی نظریات پر نقد و جرح کی اور اُن کے خلاف اپنے نظریات ظاہر کیے۔

انھوں نے یہ تنقید نہیں کی کہ یہ نظریات حاکمیت کا حق غیر اللہ کو دیتے ہیں اور دین کو سرے سے نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ مکمل زندگی کو دین کی تعلیمات پر قائم کرنے کے قائل نہیں، یہ اپنے تمام تر معیارات و تصورات دین کے مبادی و احکام سے اخذ نہیں کرتے۔ اُن کی تنقید اس قسم کی نہ تھی۔

ہرگز نہیں! اُن کی یہ بات سرے سے نہ تھی۔ اپنے مخصوص تاریخی مرحلے میں اُن کے نظریات پہلے لوگوں سے زیادہ انحراف پر مشتمل تھیں۔ نظریہ خیالیہ کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ اس پر تنقید کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ اس پر اتنی تنقید کافی ہے کہ یہ نظریہ خیالی ہے جبکہ وہ خود **واقعیت اور عملیت پسند** ہیں۔

کلیسا کا نظریہ جو اپنے اختیار کردہ نام کے مطابق اللہ کی مملکت یا مسیح کی مملکت پر قائم ہے۔ اس پر تنقید و ملامت کتنا آسان ہے کہ یہ **رجعیت کا نظریہ** ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ یہ دین کی حقیقت کے مخالف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یہ اُن کی نظر میں دین کی حاکمیت پر کھڑا ہے۔

دین کی چاہے جو بھی صورت ہو، اِن علمی محققین کے نزدیک ایک جھگڑالو دشمن ہے۔ اُن میں سے کچھ کا خیال ہے کہ دین محض ایک وجدانی جذبہ یا روحانی تعلق ہے جس میں انسان کا دل اپنی زندگی کے کچھ حصوں میں آسمان سے جڑ جاتا ہے۔ دین کو کبھی بھی ایسے معاملہ میں داخل نہیں کرنا چاہیے، جہاں اس کا تعلق نہ ہو جیسے فرد کی روزمرہ کی عملی زندگی، ریاست یا عام معاشرہ تو دور کی بات ہے، وگرنہ بربادی اور استبداد واقع ہوگا۔

وہ تاریخ سے گواہی لاتے ہیں، **کیتھولک کلیسا** کی تاریخ سے، جس کے افراد سب سے سرکش اور ظالم و جابر تھے۔

بعض مفکرین اس قدر غلو کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک **دین** خالص شر اور ناقابل علاج بیماری ہے۔ اس کو جڑ سے اکھاڑنا ضروری ہے۔ یہ عوام کو نشے میں مبتلا کرتا ہے اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ استبداد کے حاملین اس کو اپنے استبداد کا ذریعہ بناتے ہیں اور اجارہ دار لوگ اس کو پریشان حال مزدور طبقوں کے وسائل چوسنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔

نظریہ حق الٰہی پر بھی ملامت تھوپی جاتی ہے کہ یہ دین سے اخذ ہونے کی بنا پر گہری علت کا شکار ہے، اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ نسبت بذات خود ملمع سازی ہے۔

ہم ہارولد لاسکی کو لیتے ہیں جو جدید مصنفین میں ایک واضح سیاسی مصنف ہے:

لاسکی ان دونوں نظریات کا خلاصہ بیان کرتا ہے پھر اُن پر علمی نقد کرتا ہے، وہ کہتا ہے: ''ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم انسان کے ابتدائی تجربات کے مطابق مروج نظریے کو لاہوتی نظریہ قرار دیں۔ قانون الٰہی قواعد کے وہ مجموعے ہیں جن کو ایک الٰہ یا کئی الٰہ عطا کرتے ہیں اور جن کے زیر سایہ لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ قابل اطاعت سمجھا جاتا ہے کیونکہ یہ وحی مقدس سے حاصل شدہ ہے۔ اس کی واضح مثال موسیٰ کے قوانین اور حمورابی کی شریعت ہے۔۔۔''

یہ نظریہ ہیگل کے ہاں کائناتی نظریہ بن جاتا ہے جب وہ تاریخ کے سفر پر نظر دوڑاتا ہے کہ یہ ایک فکر ہے جو انسانی حریت کو وجود میں لاتی ہے اور اس کو بڑھاتی چلی جاتی ہے۔ اور بالآخر اپنے وجود کو ریاستی ارتقا کے ذریعے ثابت کرتی ہے۔

یہ نظریات سب کے سب ایک خاصیت پر متفق ہیں کہ یہ عقد کو انسانی اختیار سے خارج سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قانون کا جوہر ہمیشہ انسان سے بعید ہوتا ہے۔ اُس پر لازم ہے کہ وہ قانون کو خارج سے حاصل کرے اور اُس کی بہتری اسی میں ہے کہ شریعت کی پیروی کرے جس کی وضع وتخلیق میں اُس کا کوئی کردار نہیں۔

اس قسم کے نظریات کی غلطی واضح ہے۔ تاریخی تحقیقات نے ہر نظام کی غلطیاں واضح کر دی ہیں۔ جو دعویٰ کرتا تھا کہ وہ الٰہی سزاؤں کو نافذ کرتا ہے اور الٰہ نے ہی ان سزاؤں کا حکم دیا، وہ ایک ایسی پیچیدہ کلام کرتا تھا جس کا جادوئی اثر صرف اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو خود کو الٰہ کا پیروکار بناتے ہیں۔ (۲۵۷)

ان افکار کا اجمالی مناقشہ دوسرے مقام پر ہوگا۔ اس قسم کے کلام پر بلا تمحیص گزرنا مناسب نہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ مصنف کی لغزش نہیں بلکہ مغربی سیاسی فکر کا عام مظہر اور رجحان ہے۔

یہ اور اس جیسا دیگر کلام غیر علمی ہے جن کو اکثر لادین محققین دین کے کسی بھی قضیے کے مقابلے میں کھڑا کرتے ہیں۔ غیر متعصب محقق کے لائق نہیں کہ ایسی بات کرے جبکہ وہ اپنی تحقیق میں دقت نظری کا حامل اور موضوعیت کا متلاشی ہے۔

اس میں دو ہری جہالت ہے، تاریخی حقائق سے جہالت اور علم کے حقائق سے جہالت۔ تاریخی حقائق سے جہالت یہ ہے کہ وہ عام حکم لگاتے ہیں اور یہ ایسی غلطی ہے جو ہر مغربی مصنف سے صادر ہوئی ہے۔ وہ تمام ادیان اور شرائع پر جاہل بن کر یا جان بوجھ کر ایک ہی حکم لگاتے ہیں۔ حالانکہ دین کی حقیقی الٰہی صورت (اسلام) پر وہ مطلق حکم نہیں لگ سکتا جو دیگر ادیان ونظریات پر لگتا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں اسلام پر وہ عیب جوئی ممکن نہیں جو رسی یورپی مسیحیت پر عائد ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کے وہ اوصاف نہیں جو محرف تورات کی شریعت کے ہیں جس کو لاسکی موسیٰ (علیہ السلام) کے قوانین کہہ کر پکارتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ لاسکی کے توہمات کے برعکس امت اسلامیہ کو اُس دور میں جبکہ وہ مکمل شریعت کی حامل و عامل تھی، تاریخ انسانی کا بہترین اور روشن ترین زمانہ قرار دیتی ہے۔ جب سے انسانیت نے عدل وخوش حالی کا مزا چکھا ہے، ایسا دور نہ پہلے گزرا ہے اور نہ بعد میں۔ وہ دور تاریخ کے صفحات میں مطلق طور پر خوب صورت ترین ہے۔ لیکن لاسکی جن تاریخی تحقیقات کا حوالہ دیتا ہے وہ مغرب کے کینہ پرور متعصب لوگوں کی تحقیقات ہیں!

لاسکی کی علمی جہالت دیکھیں تو وہ اُس کے اِس دعوے سے ظاہر ہوتی ہے کہ مثالی قانون وہ ہے جو انسان خود اپنے لیے وضع کرتا ہے، وہ نہیں جو اللہ وضع کرتا ہے۔

یہ دعویٰ فقط مقام الوہیت سے جہالت کے سبب پیدا نہیں ہوا بلکہ انسان کی حقیقت سے بھی انتہائی جہالت اور کوتاہ علم سے پیدا ہوا۔ انسان کا ادراک اور معرفت انتہائی عاجز اور محدود ہے، اُس کی طبیعت اور تخلیق میں جہالت و عجز کی ناقص صفات ہیں جن کے سبب وہ اپنے لیے خود قانون سازی نہیں کر سکتا۔

وہ جس قدر کائنات کے نوامیس اور وجود کے اسرار کا انکشاف کر لے، وہ کسی بھی حالت میں خود اللہ نہیں بن سکتا۔ یہ جدید علم کے متوالوں کا وہم ہے کہ انسان اپنا خود قانون ساز بن سکتا ہے۔ قانون سازی، الوہیت کے ایسے اوصاف میں سے ہے جو فقط اسی کے ساتھ خاص ہے اور اسی کے لیے واجب ہے۔

انسان اپنے وجود کے مراحل میں سے ہر مرحلے میں مخلوق ہے۔ اُس کے ذمے اللہ کی عبادت ہے نہ کہ اپنے نفس کی عبادت۔ اُس کی دلیل یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو بھی الٰہی قوانین وسنن کا پابند پاتا ہے۔ وہ جتنا بھی بڑا بن جائے وہ ان پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

انسان کی ارادی قوت کو دیکھیں جو انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز بناتی ہے تو وہ فقط ایک امتحان ہے، اللہ نے حریت اختیار فقط اس لیے دیا ہے تاکہ یہ دیکھیں کہ انسان کفر کرتا ہے یا شکر۔ اس میں انسان کے لیے تکریم بھی ہے اور دیگر مخلوقات پر فوقیت و برتری بھی۔ اگر وہ اس معاملے میں شریعت الٰہی کی پیروی کرتا ہے تو وہ اپنے نفس کے ساتھ اور ساری کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی خواہش نفس کے پیچھے چلتا ہے اور اپنے خالق پر سرکشی اختیار کرتا ہے تو اُس کے درمیان اور فطرت و کائنات کے درمیان تصادم واقع ہو جاتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی تنگ زندگی گزارتا ہے اور آخرت میں اُس کا حتمی انجام زیادہ خوف ناک ہوتا ہے۔ (۲۵۸)

ہم زیادہ دور کیوں جائیں؟ یہ لاسکی بذات خود سیاست کے قدیم و جدید نظریات پر عیب لگاتا ہے۔ جیسا کہ اس کا بیان عن قریب آگے آئے گا۔ وہ ڈیموکریسی پر شدید تنقید کرتا ہے جو اُس کی قوم کی دیوی ہے۔ پھر وہ کوئی ایسا متبادل عادلانہ سیاسی نظریہ پیش کرنے سے بھی عاجز ہے جو کسی خاص فرد یا طبقے کے ساتھ جانبداری اختیار نہ کرتا ہو یا مخالفین پر ظلم نہ کرتا ہو۔ (۲۵۹)

اس کمزور سیاسی موقف کو معاصر سیاسی مصنفین میں سے ہر ایک جانتا ہے۔ عصرِ حاضر کا انسان اپنی آنکھوں سے اس سخت بحران کا مشاہدہ کر سکتا ہے جو ملکوں کی سیاست میں جاری ہے اور سیاسی نظریات کی تعداد کا تو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی شمار نہیں۔

عقد اجتماعی کے نظریے کو دیکھیں تو یہ جدید مطالعہ جات کا مرکز و محور ہے یعنی یہ فکر کہ حاکم و محکوم کے مابین تعلق باہمی مفادات کی مصلحت پر مبنی ہے۔ حاکم کے اقتدار اعلیٰ کے لیے اس کے سوا کوئی سند اور دلیل نہیں کہ عوام اپنے مفادات کے لیے حکمرانوں کو اقتدار باہمی رضامندی سے تفویض کرتے ہیں۔ اس نظریے کا عیب یہ ہے کہ اس میں عقد کا تصور محض خیالی ہے جس کو اس نظریے کے قائلین تاریخی طور پر ثابت نہیں کر سکتے۔

یہ ایک ذہنی عقد ہے جس کو اوائل سیاسی مصنفین نے چارونا چار اختیار کیا۔ یا تو وہ اپنے دور کے حاکم مقتدرین اعلیٰ کا صریح سامنا کرنے سے گھبراتے تھے یا ان کا تقرب چاہتے تھے۔

لیکن جب عوام نے بادشاہوں اور دینی پیشواؤں کی غلامی سے نجات حاصل کر لی اور اس درجے کو پہنچ گئے کہ سیاسی شعور میں کوئی مشکل نہ رہی، اور اسی دوران مصنفین نے بھی رومانیت سے نجات حاصل کر کے واقعیت پسندی کو اختیار کر لیا تو ایسے نظریات کو فرض کرنے کی ضرورت نہ رہی جس کی کوئی تاریخی بنیاد نہ ہو۔

آخر جدید علم سیاست نے اپنی گمشدہ میراث کو ایک اور مصنف کے ہاں پا لیا جو عصری نظر کے ساتھ بعض امور کو خوب واضح کرتا تھا، اگرچہ اس کا تاریخی وجود دیگر نظریات کے مشاہیر سے پہلے تھا۔ یہ **نکولا میکیاولی** ہے۔ جس پر پہلا ماڈرن انسان کا لقب بولا گیا۔ اُس کی کتاب ''دی پرنس'' جدید دور کے حکام و سیاست دانوں کے لیے یکساں طور پر الہام کا مصدر ہے۔ (۲۱۶)

۱۹ویں صدی میں لادینی نظریات اور خصوصاً نظریہ ارتقا کا میکیاولی ازم کی بحث میں سب سے بڑا حصہ ہے۔ اُس کو نہایت خوش نما علمی لباس پہنایا گیا جبکہ اس سے پہلے یہ قابل مذمت گردانا جاتا تھا اور اس کو قبول کرنے والے نفرت کا نشانہ بنتے تھے۔

مسیح کی مملکت جس کے متعلق **کیتھولک کلیسا** کے پوپ گفتگو کرتے ہیں، دو قسم کی تنظیموں پر مشتمل تھی:

① روحانی تنظیم، اس کے نمائندے دینی پیشوا تھے۔ اس کا دائرہ کار کلیسا اور عبادت گھر تھے۔ اس کا وظیفہ وعظ، راہنمائی اور خطا سے نجات کی کوشش تھی۔

② دنیوی تنظیم، اس کی نمائندگی ریاست کے شہری و عسکری ادارے کرتے تھے۔ اس کا میدان دنیوی زندگی کے معاملات تھے۔

دونوں تنظیمیں اپنی سرگرمیوں کو مسیحی اخلاقی روح کے تحت سرانجام دیتے تھے، اگرچہ اس کے التزام میں تفاوت تھا۔

علمی اعتبار سے دین اور سیاست کے مابین علیحدگی موجود تھی یعنی موضوعی سیکولرزم کی ایک قسم یورپی زندگی میں قرونِ وسطیٰ بھر میں رائج رہی۔ اور یہ ایک طبعی امر ہے جب تک معاشرے میں قانون الٰہی نافذ نہ ہو، سیکولرزم کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے گا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن سب سے پہلا شخص جس نے بذات خود سیکولرزم کی دعوت کو اختیار کیا اور صراحت کے ساتھ سیاست جیسے زندگی کے اہم شعبے کو دین سے دور کرنے کی دعوت دی، وہ میکاولی تھا۔ میکیاولیت حکومت کا ایک عملی منہج ہونے کے اعتبار سے تین بنیادوں پر قائم ہے جیسا کہ میکیاولی نے ''دی پرنس'' میں بیان کیا ہے۔ یہ بنیادیں خالص لادینی تصورات پر مبنی ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① انسان طبعاً شریر ہے۔ اس میں خیر کی رغبت مصنوعی ہوتی ہے جس کو خالص مادی مفاد کے تحت اختیار کیا جاتا ہے۔ (۲۶۲)۔ چونکہ شر انسان کی بنیادی اصلی طبیعت ہے لہٰذا اس کے پیچھے چلنے میں کوئی حرج نہیں اور یہ قابلِ ملامت نہیں۔

② سیاست اور دین واخلاق کے مابین مکمل علیحدگی: میکیاولی نے سیاست کے لیے ایک مستقل مخصوص دائرہ بنایا جس کے اپنے معیار، احکام اور رویے تھے جو دین واخلاق کے دائرے سے الگ تھے۔ میکاولی نے سیاسیات کو اخلاقیات سے مکمل طور پر الگ کر دیا۔ اُس نے اُن کے درمیان کسی بھی تعلق کے عدم وجود پر زور دیا۔ (۲۶۳) یہ بات درست ہے کہ میکیاولی نے دین واخلاق کا سرے سے انکار نہیں کیا جیسا کہ بعض معاصر نظریات کی حالت ہے۔ لیکن وہ حاکم کو دین واخلاق کی پابندی سے آزاد قرار دیتا ہے اور اُن کو فقط عام افراد تک محدود کرتا ہے۔

③ مقصد طریق کار کو جائز قرار دیتا ہے: یہ عملی قاعدہ ہے جس کو میکیاولی نے دینی واخلاقی قواعد کے مقابلے میں وضع کیا۔ اُس کے ہاں اِس قاعدے کی مخصوص تشریح ہے۔

قدیم دور سے سیاسی لکھاری اور اُن میں سے یونانی فلاسفہ جیسے افلاطون، ارسطو وغیرہ نے ریاست کی غایت اور مقصد وجود پر تفصیلی بحث کی ہے۔ (۲۶۴)۔ اُن میں سے بعض کا خیال ہے کہ ریاست بلند اوصاف کو عملاً لاگو کرتی ہے اِس لیے انھوں نے حاکم کے لیے فلسفی ہونے کی شرط لگائی۔ اسی طرح دیگر افراد نے یہ مذہب اختیار کیا کہ ریاست کا مقصد قانون الٰہی یا قانون طبعی کی تطبیق ہے۔

لیکن میکیاولی عملی رجحان کا حامل ہے۔ اُس کا مذہب ہے کہ ریاست بذات خود غایت ہے اور حکومت کی زمام کو قبضے میں رکھنا بذات خود ہدف ہے۔ اس کے ماوراکسی غور وخوض کی ضرورت نہیں۔

اس غایت کو حاصل کرنے میں کوئی بھی ایسا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے جس سے غایت حاصل ہو جائے اور کوئی بھی ایسا وسیلہ اختیار کیا جاسکتا ہے جس سے غایت آسان ہو جائے، اگرچہ یہ وسائل اور طریقے غیر اخلاقی اور دین کے منافی کیوں نہ ہوں۔

وہ معیار جس کے ساتھ کسی طریق کار کے درست یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے وہ موضوعی معیار نہیں بلکہ وہ ذاتی شخصی معیار ہے۔ سیاست دان کو بذات خود کسی خاص طریقے پر صحت یا خطا کا حکم لگانے کا حق حاصل ہے۔

یہ میکیاولیت کی مختصر تصویر ہے جو عصر بیداری میں ظاہر ہوئی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے لا اخلاقی ظاہری میلان کی وجہ سے فکری و دینی حلقوں میں شدت سے مخالفت کی گئی۔ کلیسا نے "دی پرنس" کتاب پڑھنے پر پابندی لگا دی۔ مؤلفین نے اس پر سخت اعتراض کیے اور میکیاولی کا لفظ سب سے بُرا وصف قرار پایا جو کسی بھی دین و اخلاق سے آزاد شخص پر بولا جا سکتا تھا جو انسانیت اور ضمیر سے عاری انسان ہو۔

یہ نظریہ تین صدیوں تک نفرت و کراہت کا موقع و محل بنا رہا۔ اس کے بعد وہ نظریات پروان چڑھے جن کا معارضہ اب موجودہ دور میں ہو رہا ہے۔

۱۹ ویں صدی دین و اخلاق کے خلاف فکری اور واقعاتی اعتبار سے ہمہ گیر انقلاب کی صدی تھی۔ ڈارون کے ہاتھوں عضویاتی ارتقا کا نظریہ ظاہر ہوا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی ایک کشمکش ہے اور بقا فقط اصلح کے لیے ہے یعنی جو طبعی ماحول میں زیادہ قوی اور بہتر ہے۔

اس وقت لوگ اس عملی بنیاد پر ایمان لے آئے کہ بقا فقط قوت اور طاقت سے منسلک ہے اور بقا کی کشمکش کسی خاص وسیلے پر منحصر نہیں۔ وسیلہ جو بھی ہو، مطلوبہ نتیجہ حاصل ہونا چاہیے جو کہ بذات خود بقا ہے۔

میکیاولیت بھی یہی کہتی ہے کہ حق قوت کا دوسرا نام ہے!

ڈارونیت کہتی ہے کہ وجود قوت ہی پر منحصر ہے۔

ڈارونیت علمی نظریہ ہے۔ لہٰذا میکیاولیت بھی اسی طرح علمی ہے۔

اُس دور کے حالات نے اِس قسم کے موازنے کو ممکن بنا دیا کیونکہ کلیسا اپنا سرکش اقتدار کھو چکا تھا۔ بُراعظم یورپ سیاسی و معاشرتی کشمکش، ہولناک جنگوں، تباہ کن عداوتوں سے لبریز تھا۔ یہ صورت حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو دیکھیں تو اِس صدی میں سیاست اقتصاد کے ساتھ مضبوطی سے جڑ گئی۔ چنانچہ وہ دینی اثرات سے زیادہ آزاد ہو گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ سیاست و اقتصاد اور زندگی کے تمام پہلو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ اُن کو ایک دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔ لیکن اقتصادیات ایک مخصوص طریقے سے ملکی سیاست کا بنیادی مرکز و محور بن گئی۔ یہ ان ظروف و حالات کا نتیجہ تھی جن کے تحت براعظم یورپ زندگی گزار رہا تھا۔

اسی زمانے میں یورپی زندگی نے معاشرتی نظام کے انہدام کا تجربہ کیا اور اس کی جگہ دوسرا نظام قائم ہوا۔ جاگیریں ختم ہو گئیں اور سرمایہ داری نے جنم لیا۔

جاگیرداری نظام جس کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، انسانی عزو شرف کی تباہی کے لیے بدترین نظام تھا۔ یہ انسان کی قدر و قیمت کو گراتا اور اُس کو نہایت ظالمانہ طریقے سے اپنے اُن ہم جنس انسانوں کا غلام بناتا تھا جو اعلیٰ اوصاف سے عاری ہوتے۔

اس نظام کے تحت انسان دو ظالمانہ اقتدار کا غلام بن گیا۔ ایک جاگیرداروں کا اقتدار اور دوسرا دینی پیشواؤں کا اقتدار۔ چنانچہ جاگیردار اپنی جاگیر کے ساتھ ساتھ محنت کار کسانوں کا بھی مالک ہوتا تھا۔ وہ اُن کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے جیسے چاہتا قوانین بناتا اور اُن پر سزائیں لاگو کرتا۔ چنانچہ وہ بیک وقت دو اختیارات کا مالک تھا قانون سازی کا اختیار اور اُس کی تنفیذ کا اختیار۔

اِس کے مقابلے میں دینی پیشوا غلامی کو بابرکت قرار دیتے اور یہ دلیل دیتے کہ یہ پہلی خطا کا نتیجہ ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر غلاموں کو تابع بنانے میں جاگیرداروں کے شریک ہوتے۔ جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ کلیسا جاگیرداری نظام کا جزو لاینفک تھا۔ اس بری صورت حال میں دو تحریکیں اٹھیں جن کا تاریخ یورپ میں نہایت اہم مقام ہے۔

① علمی تحریک (Renaissance)

② اصلاح مذہب کی تحریک (Reformation)

اِن دونوں تحریکوں پر بعض پہلوؤں کے اعتبار سے اسلامی اثر مخفی نہیں۔ اسی طرح بورژوائی طبقہ ظاہر ہوا جو لوتھر اور کالون کے اقوال سے سند لیتا اور تجرباتی علمی ترقی کے ثمرات سے مستفید ہوتا تھا۔ اس طبقے کا کردار محدود رہا حتی کہ وہ انقلاب ظاہر ہوا جس کو صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔ صنعتوں نے وہ طاقت ور حیثیت حاصل کرنا شروع کر دی جو پہلے زمین کو حاصل تھی۔ شہروں میں صنعت کاروں اور زرعی میدانوں میں جاگیرداروں کے مابین مقابلہ سخت ہو گیا۔

اُس وقت صنعتوں کو وافر اور سستے مزدوروں کی ضرورت محسوس ہوئی اور مزدور رواج کے مطابق کھیتوں دیہاتوں میں جاگیردارانہ تسلّط کے تحت زندگی گزارتے تھے۔ چنانچہ ضروری تھا کہ مزدوروں کو جاگیردارانہ تسلّط سے چھڑایا جائے اور قدیم بیڑیوں سے آزاد کیا جائے۔ مزدوروں کی آزادی کی مہم خود ان کی ذاتی مصلحت کی خاطر نہ تھی بلکہ نئے بورژوائی آقاؤں کے حق میں تھی۔

اس وقت طبعی مذہب یا فزیوکریسی ظاہر ہوا جس کا ایک ہی نعرہ تھا کہ لوگوں کو چھوڑ دو کہ وہ جو چاہیں عمل کریں، جہاں سے چاہیں گزریں۔ یہ یورپی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

رزق حلال کی خاطر انسان کی حریت اور اللہ کی زمین میں کسی بھی جگہ منتقل ہونے کا حق ''اسلامی مشرق'' میں کسی بھی انسان کا بدیہی حق تھا جیسے پانی اور ہوا۔ لیکن جاگیردار مغرب میں اس کا حصول ایک بہت بڑی کامیابی شمار کیا جاتا تھا۔

فرانسیسی انقلاب کی کامیابی نے یورپ کی باقی عوام و اقوام کے لیے ایک طاقتور انگیخت کا سامان پیدا کر دیا چنانچہ پے در پے انقلابات پھوٹ پڑے۔ اور اُن مفکرین کی آوازیں بلند ہو گئیں جو حریت کے داعی کے نام سے مشہور تھے، جو معاشرے میں موجود برائیوں کی مذمت کرتے اور جس بوجھ تلے افراد دبے ہوتے، اُس کے خلاف آواز اٹھاتے۔

عوام دینی گروہوں خصوصاً کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی ہولناک جنگوں کا شکار رہی، دینی پیشوائیت کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظلم وستم جھیلتی رہی اور اپنے صلیبی کینے کے سبب اللہ کی ہدایت اور دین حق سے محروم رہی، اِس لیے اُس نے جس حریت کا مطالبہ کیا وہ لادین حریت تھی اور جس بنیاد پر جدید معاشرہ کو تعمیر کیا وہ بھی لادین تھی۔ اسی طرح محققین نے اسی حریت کو یونانی فلسفیانہ ورثے، سپائی نوزا، جان لاک اور فرانسیسی موسوعاتی مفکرین کی کتابوں سے اخذ کیا جو معاشرہ کو سیکولر تنظیم اور لادین ڈھانچے کے مطابق تشکیل دیتی تھی۔

تلمودی تنظیمیں بھی کبھی خفیہ اور کبھی اعلانیہ کینے کی آگ بھڑکاتیں، دین کے خلاف دشمنی کا الاؤ تیز کرتیں اور لوگوں کو اباحیت والحاد کی طرف دھکیلتیں۔

لوگوں کے احساسات اور جذبات ایک ایسے سحر انگیز پرکشش لفظ پر فریفتہ ہو گئے جو جدید اصولوں کی نشاندہی کرتا تھا اور اُس پر تمام **طبعی، نفعی مکتب فکر، اجتماعیت پسند** (Collectivist) اور **انفرادیت پسند متفق** تھے۔ یہ ڈیموکریسی کا اصول تھا۔ ابتلا میں گھرے عوام اور بیڑیوں میں جکڑی عقلوں کے لیے ڈیموکریسی ایک دل موہ لینے والی چیز تھی۔ کیسا سہانا تصور تھا کہ عوام اپنی ذات کے خود سردار ہوں گے، اختیارات واقتدار کے خود مالک ہوں گے اور اُن پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہ ہوگا۔

کسی نسل اور عقیدے کے حامل شہریوں کے لیے ایسی آزادیاں اور **حقوق** ہوں گے جو اس سے پہلے کسی نے تصور نہ کیے ہوں۔ عمل کی حریت، آزادی نقل وحرکت، آزادی اظہار رائے، آزادی سلوک، آزادی عقیدہ، مظاہرے واحتجاج کا حق۔۔۔

اسی طرح ڈیموکریسی کے سائے تلے ایسی ضمانتیں اور تحفظات حاصل ہوئے جو جاگیروں کے سائے میں کسی کے وہم وگمان میں نہ تھے: تہمت سے تحفظ کی ضمانت، تحقیق کی ضمانت، مقدمہ کرنے کی ضمانت، احکام جاری کرنے کی ضمانت۔ (۲۶۵)

تمام لوگ اِن نعروں سے متاثر ہوئے اور خوابوں کے نشہ میں مدہوش ہو گئے۔ انھوں نے خوف ناک ماضی کو بھولنے کی مکمل جدوجہد کی اور تمام اقدار اور اعلیٰ اوصاف کو گرا پھینکا جن میں دین واخلاق کے اقدار و اوصاف بھی شامل تھے۔ وہ ایک روشن اور خوب صورت مستقبل کے شوق میں بے تاب ہو گئے۔ فکر وادب پر ایک ایسا رجحان چھا گیا جو امیدوں سے لبریز تھا جس نے ترقی وخوش حالی پر ایسے اعتماد کا اظہار کیا جس کی کوئی حد نہ تھی۔

یہاں **طبعی** طور پر ایک گروہ ایسا بھی تھا جو حقیقی انجام کا ادراک رکھتا تھا اور ساری کارگزاری کا گہرا نتیجہ جانتا تھا۔ یہ گروہ **سرمایہ کاروں کا طبقہ** تھا جو بورژوائی طبقے کا ترقی یافتہ نمائندہ تھا۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس طبقے میں بڑے بڑے سود خور یہودی تھے۔ (۲۶۶)

ہم یہ سارا قصہ ایک مغربی سیاسی محقق کی زبانی سنتے ہیں:

کارل بیکر اپنی کتاب ''افضل جہان کی طرف راستہ'' میں کہتا ہے: فرد چاہے جس مملکت میں بھی زندگی گزار رہا ہو، وہ کلیسا کے لیے اطاعت اور وفاداری کو اختیار کرتا تھا، وہ دینی امور میں دینی پیشواؤں کی پیروی کرتا،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلیسا کو مقرر ٹیکس ادا کرتا لیکن اُسے کلیسا کی عدالتوں سے کچھ مطالبہ کی اجازت نہ تھی جبکہ انہیں مخصوص جرائم کی سزائیں لاگو کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ اسی طرح فرد اپنے شہری مسائل کے حل کیے لیے شہری عدالتوں کا بھی پابند تھا اور اُسے جاگیردار یا بادشاہ کے لیے مخصوص ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا۔ اسی طرح اُس سے عبادت گھروں یا بادشاہ کی عدالتوں کے ذریعے تقاضا کیا جاتا اور یہ عدالتیں مخصوص جرائم پر سزائیں بھی لاگو کرتیں۔ معاملہ یہ ہوا کہ دونوں طاقتوں، کلیسا اور بادشاہوں کے درمیان جھگڑا چھڑ گیا۔ اُن میں سے ہر ایک لوگوں پر اپنے لیے فرماں برداری اور وفاداری کا مطالبہ کرنے لگا۔ اس طرح قرونِ وسطیٰ کا یورپ کلیسا و ریاست کے مابین مسلسل کشمکش کی تاریخ بنا رہا۔

بالآخر کلیسا کی قوت اُن سو سالوں میں ریاست کی طرف منتقل ہوگئی جو دینی جھگڑوں کے سبب اندرونی ریاستی جنگوں میں بیت گئے۔ دین کے نام پر یہ جنگیں کوئی نرمی یا رعایت نہ کرتی تھیں بلکہ خون ریز وحشیانہ کشمکش پر مشتمل تھیں۔

اس طرح بالآخر مغربی یورپ سے متحد و یک جان مسیحی معاشرہ غائب ہوگیا۔

اِن ریاستوں کی خود مختاری اور علیحدگی ایک حقیقتِ واقعہ بن گئی۔ اُس کے بعد ایسے نظریات پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اِس حقیقت کی تائید کی۔ میکیاولی نے اپنی مشہور کتاب ''وی پرنس۔ ط۱۵۱۳ء'' میں سب سے پہلے اعلان کیا کہ امرا و حکام کی واحد ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے اقتدار کو حاصل کریں اور اُس کو استعمال میں لائیں۔ وہ اپنے اختیارات کے استعمال میں آزاد ہیں کہ خود ہی اغراض طے کریں، خود راستے متعین کریں اور اس معاملے میں دین و اخلاق کے قواعد کی کوئی پابندی اُن پر لازم نہیں۔

اٹھارویں اور انیسویں ویں صدی میں ڈیموکریٹک انقلاب نے اس حکم مطلق کو لغو کر دیا جو بادشاہوں کے لیے مخصوص تھا۔ اور اُس کی جگہ ایسی حکومت کو لا کھڑا کیا جس کو پارلیمنٹ چلاتی تھی اور پارلیمنٹ کو عوام منتخب کرتے تھے۔ اِس انقلاب کے تحت ریاستوں نے مختلف سطح کے مطابق لوگوں کی مادی و دنیوی سہولیات کا بندوبست کیا اور نتیجے میں وہ پہلے سے زیادہ آزاد ہوگئے اور اسی طرح ''عوام کا ارادہ'' حق الٰہی کی جگہ اتر آیا۔

اس سے پہلے لوگ تیار ہوتے تھے کہ دین اور کلیسا کی راہ میں لڑیں مریں۔ اب وہ ریاست و قوم کی راہ میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ (۲۶۷)

ہم پھر ڈیموکریسی سے متعلق بیکر کی کلام کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ کہتا ہے: ''موجودہ ڈیموکریسی فکر اور واقعہ کے اعتبار سے اُس معاشرتی و حکومتی نظام کے مقابلے میں کھڑا ہوا جو یورپ کے اکثر ملکوں میں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں رائج تھا۔

اُس وقت ریاستوں پر بادشاہ حکومت کرتے تھے جو مطلق اختیارات کے مدعی تھے اور حق الٰہی سے سند لیتے تھے۔ ان بادشاہوں کا اقتدار، سربراہ طبقے اور طاقتور کلیسا کی تائید سے سند لیتا تھا۔ لوگوں کی اکثریت خصوصاً مزدور اور کسان ظلم کا مزہ چکھتے اور اُن کا استحصال کیا جاتا۔ اُن کے کچھ حقوق مقرر نہ تھے۔ وہ حریتِ سیاست،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حریت عبادت، حریتِ کلام، حریت صحافت اور حریتِ عمل سے متمتع نہ ہو سکتے تھے۔''

شہریوں کا ظلم، پکڑ دھکڑ، قید، گھروں کی تلاشی وغیرہ کے مقابلے میں کوئی تحفظ بھی نہ تھا۔ برطانوی انقلاب اور فرانس و امریکہ کے انقلاب اس قسم کی استبدادیت کے مقابلے میں تھے تاکہ اُس کی جگہ آزاد ڈیموکریسی آ سکے۔

آزاد ڈیموکریسی کا فلسفہ اِس بنیادی فکر کے گرد گھومتا ہے کہ لوگ اپنے اوپر حکومت کرنے کی خود طاقت رکھتے ہیں جو بادشاہوں، اشرافیہ اور دینی پیشواؤں کی حکومت سے افضل ہے۔

مصنفین اِن دو لفظوں کو استعمال کرتے تھے (laisser-faire)۔ وہ اپنی فکر کی تعبیر کرتے تھے کہ لوگوں کو اپنے اعمال میں آزاد چھوڑ دیں۔ اُن کا خیال تھا کہ حکومت کا وظیفہ فقط یہی ہے کہ وہ انسانی جانوں، ذاتی جائیدادوں اور نظام کی حفاظت کرے اور خارجی حملے کے مقابلے میں شہروں کی حفاظت کرے۔

اُس وقت عام فکر یہ تھی کہ جو شخص اپنی ذاتی منفعت کی خاطر جدوجہد کرتا ہے تو قوم کے مختلف مصالح کے مابین ایک فطری میکانزم کے تحت بڑی تیزی سے نظم وضبط ظاہر ہوتا ہے یا کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اِس فکر کو مختصراً اس طرح بیان کیا جاتا ہے: لوگوں کے ذاتی منافع بالآخر عوام کے منافع تک پہنچ جاتے ہیں۔

یہ بسیط نظریہ درحقیقت ضعیف کے مقابلے میں طاقتور کے مفاد کو عمل میں لاتا تھا۔ اور اٹھارویں صدی کے معاشرے کی پیچیدگی ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ یہ نظریہ اُن محدود افراد کے حق میں کام کرتا تھا جن کو دولت جمع کرنے کا وافر حصہ میسر آیا تھا۔

مشینی آلات کی ایجادات ظاہر ہونے کے ساتھ ہی آزاد صنعتی مقابلہ شروع ہو گیا اور وہ نتیجہ ظاہر ہونے لگا جس کی توقع اقتصادی ماہرین اور سیاسی فلاسفہ کر رہے تھے۔ سارا منافع صنعتی مالکان کی طرف لوٹنے لگا، آلات نے مزدوروں کا بہت بڑا بوجھ خود اٹھا لیا جس کے نتیجے میں شہر بے روزگار مزدوروں سے بھر گئے۔ صنعتوں کے آزاد مالکان نے محسوس کیا کہ اُجرتوں کو سستا کرنے اور مزدوری کے اوقات لمبا کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ مزدوری تلاش کرنے کے مواقع کم تھے اور محنت کے اوقات لمبے تھے، چنانچہ مزدور معمولی اجرتوں کی قناعت پر مجبور ہو گئے جو اُن کے بوجھ کو نہ اُٹھا سکتی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کے گروہ در گروہ بھوک اور کمزوری سے نڈھال ہو کر بارہ بارہ گھنٹے گندی دکانوں اور خطرناک غیر صحت بخش ماحول میں مصروف رہتے اور اتنی اجرت نہ ملتی جو اُن کی بنیادی ضروریات کو پورا کر سکے۔ (۲۶۸)

اس طرح خوش نما ڈیموکریسی کے اردگرد لپٹے ہوئے سنہرے خواب بکھر گئے۔ صنعتی انقلاب نے جو ڈیموکریٹک انقلاب کے دوش بدوش تھا، اُس سیاہ چہرے کو روشن کر دیا جو جاگیردارانہ تصویر سے کم ہولناک اور بھیانک نہ تھا۔ حریت جس کو مزدوروں اور کسانوں نے بخوشی قبول کیا تھا، ایسی بھاری بیڑیوں میں تبدیل ہو گئی جو اُن کے کندھوں کو نڈھال کر رہی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نئے سرے سے مختلف آوازیں اٹھنے لگیں کہ انفرادی طبعی نظام کو رد کیا جائے اور اجتماعی ڈیموکریسی کے نظاموں کو لاگو کیا جائے۔ اس طرح اوائل اشتراکیوں کی آواز واضح طور پر ظاہر ہوئی۔ چنانچہ مزدوروں، کسانوں اور تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی تعداد اُن کی طرف مائل ہوئی اور انھوں نے سرکش سرمایہ داروں کے خلاف محاذ کو تشکیل دیا۔

اس کشمکش کے دوران جو انفرادیت پسند سرمایہ دارانہ ڈیموکریسی اور اجتماعی اشتراکی ڈیموکریسی کے حامیوں کے مابین جاری ہوئی، نظریہ ارتقا پیدا ہوا جس نے مغربی فکر کے بہاؤ کو مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا۔

اِس نظریہ نے رسمی مسیحیت کا کام تمام کر دیا، دین کو زندگی کے تمام شعبوں سے بے دخل کیا بلکہ دین کے کلی انکار تک پہنچا دیا کہ وہ وجدان اور شعور کا حصہ بھی نہ رہے۔

قانون انتخاب طبعی، بقائے اصلح اور تنازع البقا پر مبنی نظریہ ڈارون نے میکیاولی میلانات کو زندہ کر دیا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جدید دور میں قومی ریاستوں کی باہمی کشمکش اپنے مظاہر میں زندہ اجسام کی کشمکش کی طرح ہوتی ہے، اِس نظریے نے میکیاولیت کو جواز فراہم کیا بلکہ اُس کو اپنانا لازم قرار دیا۔ اس کی تاکید کرستیان غاؤس نے کتاب 'دی پرنس' کے مقدمہ میں کی ہے۔ وہ کتاب کے متعلق کہتا ہے:

موسولینی نے اپنے دور طالب علمی میں ڈاکٹریٹ کے مقالے کے لیے اس کتاب کو موضوع بنایا، ہٹلر اس کتاب کو سوتے وقت اپنے قریب رکھتا تھا، وہ سونے سے پہلے اس کا کچھ حصہ ضرور پڑھتا تھا اور ہمیں ماکس لیزر کا یہ قول حیران نہیں کر سکتا جو اُس نے ''ماڈرن مصنفین'' کے مقدمے میں کہا ہے کہ لینن (Lenin) اور سٹالن نے بھی میکیاولی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ (۲۶۹)

میکیاولی روح انجلز کے اِس قول سے بھی واضح ہوتی ہے: ''ہم اِس اخلاق پر ایمان لاتے ہیں کہ ہر وہ عمل درست ہے جو ہمارے اُصولوں کو غلبے تک پہنچا دے، چاہے یہ عمل مروجہ اخلاق کے کتنا ہی منافی کیوں نہ ہو۔''

اور لینن کا قول ہے: سچے جانباز کمیونسٹ پر واجب ہے کہ وہ انواع واقسام کے دھوکے، فریب اور فراڈ کو استعمال کرے۔ کمیونزم کی خاطر جدوجہد ہر ایسے وسیلے کو بابرکت سمجھتی ہے جس سے کمیونزم عملاً واقع ہوتا ہو۔ (۲۷۰)

رہا سرمایہ دارانہ نظام تو اُس کی میکاولی حقیقت بھی کبھی مخفی نہیں ہو سکتی بلکہ مائیلز کو پلانڈ جو 'لعبۃ الامم۔ قوموں کا کھلونا'' کا مصنف ہے، ثابت کرتا ہے کہ یہ امریکی سیاست کا منہج ہے۔ (۲۷۱)

میں نے پہلے پیش کیا ہے کہ کشمکش میں برسرپیکار دونوں چھاونیوں نے نظریہ ارتقا کو اپنے لیے سند کے طور پر پیش کیا ہے کہ وہی اکیلے باقی رہنے کے لائق ہیں، دوسرا نہیں۔

سرمایہ داری سمجھتی ہے کہ وہی اکیلی اس اہل ہے کہ ترقی وعروج حاصل کرے کیونکہ وہی جدید دور میں عنصر قوی ہے، قانون انتخاب طبعی اور تنازع البقا کے تحت اُس کا حق ہے کہ ضعیف عناصر کا خاتمہ کرے یا اقتصادی طور پر ہلاک کر دے۔ اسی وجہ سے سرمایہ دار ریاستیں بدرجہ اولی استعماری ریاستیں تھیں۔ (۲۷۲)۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ملاحظہ کریں کہ آخری دھائیوں میں استعمار کی شکل وصورت ماضی کی صدی سے بالکل مختلف تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نظریہ ارتقا کا مارکسزم پر اثر مخفی نہیں۔ اُس نے اور اُس کے طبقے نے نظریہ ڈارون کا خوب استعمال کیا، کیونکہ وہ طبقاتی کشمکش سے متفق ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مارکسزم نے ایک اور زاویے سے بھی نظر دوڑائی، وہ فقط اقوی کی بقا کا ہی قائل نہ تھا بلکہ اپنے **فلسفہ جدلیات** پر بھی اعتماد کرتا تھا کہ بقا فقط نئے تصور کے لیے ہے۔ اور نظریہ ارتقا بھی اسی چیز کا قائل تھا۔

اُس کی نظر میں **سرمایہ داری** ایک پٹی ہوئی جنس ہے جس کے بقا کا کوئی جواز نہیں کیونکہ اُس سے نیا تر اور قوی تر عنصر ظاہر ہو چکا ہے اور وہ مارکسزم ہے۔

ہم اس سے یہ نتیجہ بھی نکال سکتے ہیں کہ معاصر لادین حکومتی نظاموں کے مابین ایک مشترک عنصر ہے جو اس بات پر متفق ہیں کہ دین کو پھینک دینا چاہیے اور اخلاق کو سیاسی عمل کے دائرے سے کلی طور پر الگ کر دینا چاہیے۔ یہ مشترکہ عنصر تین بنیادوں پر مشتمل ہے:

① **میکاولیت**، جو موجودہ سیاست کا عملی منہج ہے۔

② **فلسفہ ارتقا**، جو فقط بقا و استمرار کو ہی جواز بخشتا ہے۔

③ **ڈیموکریسی**، جو انسانی وضعی نظام ہے جس کو لبرل و کمیونسٹ دونوں لشکروں نے اختیار کیا ہوا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث سوم: جدید دور پر ایک نظر

موجودہ سیاسی صورت حال سے یورپی جاہلیت کی واضح اور قطعی تصویر سامنے آتی ہے جو تناقضات سے لبریز ہے۔ پتہ چلتا ہے کہ اُس معاشرے کا انجام نہایت خطرناک ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتا اور شریعت کو حاکم نہیں بناتا۔

عالمی سٹیج پر تواتر سے خوف ناک مفاسد اور مظالم ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ دہشت، سختی اور مصائب کا ماحول گرم ہے۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارے نزدیک اِس کی وجہ غیر اللہ کی عبادت ہے جو غیر اللہ کی حاکمیت کی شکل میں ظاہر ہو رہی ہے۔

ہمارے نزدیک نتیجہ واضح ہے، یہی ہمارا بنیادی حکم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جزئیات کے مناقشے اور مظاہر کے علاج کی ضرورت نہیں۔ ہمارا یورپ سے فرق بالکل اصولی اور بنیادی ہے۔

ہم معاصر جاہلیت کے فکر و عمل کو پیش کر رہے ہیں، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مکمل چہرہ پیش کریں جیسا کہ بعض مفکرین دیکھتے ہیں تا کہ ایک مکمل تصویر سامنے آ سکے۔

ایک مسلمہ حقیقت ہے جس پر تمام قدیم و جدید مفکرین ایمان لائے ہیں۔ کریستیان غاؤس کی زبانی اس طرح ہے: ''ریاست ہمارے انسانی جہان کے دائرے سے خارج نہیں۔ ریاست کی معین شکل جس کے زیر سایہ انسان زندگی گزارتا ہے، اللہ کی تخلیق نہیں اور نہ شیطان کی تخلیق ہے اور نہ ان دونوں کی عائد کردہ چیز ہے۔ یہ کسی نہ کسی حد تک ایسی چیز ہے جس کو انسان نے پیدا کیا ہے۔ اس لیے واجب ہے کہ ریاست بھی تابع ہو جیسے دیگر انسانی امور تابع ہیں تا کہ اُس میں بار بار غور و فکر اور گہرا مطالعہ کیا جا سکے۔ (۲۷۴)۔ ہمارے خیال میں ریاست معاصر جاہلیت میں علّت العلل ہے۔

انسان اپنی ذات، اقدار، نظام اور معیار کی تلاش میں ہانپتا ہے، وہ ان کو ارضی حدود میں تلاش کرتا ہے اور اپنی نظر ایک دفعہ بھی آسمان کی طرف نہیں اٹھاتا۔ اِسی وجہ سے اُس کی گمراہی اور بدبختی لازم آتی ہے۔ وہ چیختا چلاتا ہے اور مدد طلب کرتا ہے۔

مغرب میں آوازیں بلند ہو رہی ہیں جو چیخ چیخ کر خطرے کا اعلان کر رہی ہیں اور جو نقد و جرح اور تنبیہ و تحذیر سے لبریز ہیں۔ ذیل میں بعض مغربی مصنفین کی آرا پیش کی جاتی ہیں جو انھوں نے یورپی سیاسی نظام یعنی سرمایہ داری اور کمیونزم کے عیوب کے حوالے سے بیان کی ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① لبرل ڈیموکریسی:

مغرب میں لوگ ہر موضوع پر مناقشہ اور مکالمہ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں ماسوائے ڈیموکریسی کے۔ چنانچہ ڈیموکریسی اپنے اُصول ''حریت ومساوات'' اور ''حقوق وضمانات'' سمیت ایک ایسا مقدس جہان ہے جو مناقشہ ومباحثہ کا موضوع نہیں بن سکتا۔ یورپ کے نزدیک ڈیموکریسی کا متبادل فقط ڈکٹیٹرشپ جو بذات خود ایک خوف ناک بلا ہے۔

اِس کے باوجود ڈیموکریسی پر مفکرین کے اعتراضات اور تنقید متعدد پہلوؤں سے واقع ہوئی ہے۔ ذیل میں ڈیموکریسی کی تنقید کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے جو خود ڈیموکریٹک مصنفین نے بیان کیا ہے۔

① اصطلاح کا سیال ہونا: ڈیموکریسی اصطلاح کے صحیح استعمال کی ہر کوشش مزید پیچیدگیوں کا سبب بنتی ہے۔ ڈیموکریٹک ممالک اور کمیونسٹ ممالک دونوں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ حقیقی ڈیموکریٹک ہیں اور ان کا فریق مخالف تناقضات اور عیوب سے بھرا ہوا ہے اور وہ ڈیموکریسی کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ (۲۷۵)

آرنلڈ ٹوینی کہتا ہے: ''ڈیموکریسی کی اصطلاح کو استعمال کرنا محض ایک دھوکے کا نعرہ ہے۔ کیونکہ بذات خود حریت ومساوات کے اصولوں میں کشمکش جاری رہتی ہے''۔ (۲۷۶)

رسل اس کے بارے میں کہتا ہے (۲۷۷): ڈیموکریسی کا مطلب ہے اکثریت کا حاکم ہونا۔ اِس کے ساتھ ساتھ شخصی حریت کا ایک مبہم معمولی حصہ بھی نصیب ہوتا ہے۔ پھر اس کا مطلب یہ ہوگیا کہ سیاسی پارٹی اپنا ہدف فقرا کی مصالح کو بنائے کیونکہ فقرا ہر جگہ بہ کثرت ہوتے ہیں۔ پھر آنے والے مرحلے میں ڈیموکریسی اُس پارٹی کے ذاتی اہداف کی نمائندہ بن گئی جو سرمایہ داروں پر مشتمل تھی۔ اور آج یہ مشرقی یورپ اور ایشیا کے بڑے حصے میں اُس استبدادی حکومت پر بولی جاتی ہے جو کبھی فقرا کے مددگار ہوتے تھے۔ اور اب وہ فقیروں کی مدد اُن مالداروں کو تباہ کر کے کرتے ہیں جو جدید معنی کے لحاظ سے ڈیموکریٹک ہوتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ڈیموکریسی کا لفظ عوام کی حکومت پر بولا جاتا ہے۔ لیکن اس حکومت کی کیفیت، انتخاب کی نوعیت، ووٹرز کی شروط اور سیاسی گروہوں کی تحدید میں کئی آرا ہیں جو ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔

کمیونزم سمجھتا ہے کہ سرمایہ دار ممالک صحیح معنی میں ڈیموکریٹک نہیں کیونکہ اُن میں حکومت مال دار طبقے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اِن کی حقیقی اصطلاح ''سرمایہ کی ڈکٹیٹرشپ'' ہے۔

اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام کہتا ہے: کمیونسٹ ممالک ڈیموکریٹک نہیں کیونکہ اس میں اقتدار پر تمام تر قبضہ ایک محدود گروہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسے کمیونسٹ پارٹی کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے کمیونسٹ ممالک آزاد دنیا میں شمار نہیں ہوتے۔

اس کے علاوہ لبرل ڈیموکریٹک ممالک کے اندر کئی قسم کی تقسیمیں موجود ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

② **باہم دست وگریبان پارٹیاں جو قوم کے ارادہ کی نمائندہ نہیں ہوسکتیں:**

حالات واقعات بتلاتے ہیں کہ ڈیموکریسی کا نظام قوم کی وحدت کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ اس کو متخاصم ٹکڑوں اور کینہ پرور پارٹیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اگر نظام بذات خود اس کی حوصلہ افزائی نہ کرے اور اس کی راہ ہموار نہ کرتا تو ایسی پارٹی بازی ممکن نہ تھی۔ ڈیموکریسی کا نظام قوم کو ٹکڑوں میں تبدیل کرتا ہے جس کے عوامی مصالح پر خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

مغربی ڈیموکریٹک ممالک میں دو قسم کے نظام ہوتے ہیں:

دو پارٹی سسٹم یا کثیر پارٹی سسٹم۔ ان نظاموں کے عیوب کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے بات کو **ہارولد لاسکی** کے سپرد کرتے ہیں جس کا اشارہ گزر چکا ہے: ''انگلینڈ میں روایت پسندوں اور مزدوروں کی فقط دو ہی پارٹیاں ہیں چنانچہ سارے لوگ ان دونوں میں سے کسی ایک کو چننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی مکمل اور بہترین صلاحیت کی حامل نہیں۔ اس سے یہ دعویٰ پیدا ہوتا ہے کہ متعدد پارٹیوں کا نظام متعدد آرا کے ساتھ زیادہ فاعلی صورت اختیار کرتا ہے اور زیادہ بہتر ہے۔

لیکن کثیر پارٹی نظام جیسا کہ فرانس اور جرمنی میں مروج ہے، کے متعلق ہماری معلومات یہ بتلاتی ہیں کہ اس کے اندر دو خطرناک عیب ہمیشہ لگے رہتے ہیں۔ ایک عیب جو زیادہ اہمیت کا حامل ہے، یہ ہے کہ اس نظام میں جب عملی طور پر حکومت سازی اور قانون سازی کا مرحلہ آتا ہے تو وہ کئی چھوٹے بڑے گروہوں سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔۔۔ اس سے ایک قسم کی ظاہری نمائش، جوڑ توڑ اور نورا کشتی سامنے آتی ہے اور 'سیاست' اتفاق واتحاد اور وسعت افق سے عاری ہوگئی۔

دوسرا عیب جو فرانس میں واضح طور پر ظاہر ہوا، یہ ہے کہ کثیر پارٹی نظام میں سیاسی اثر ورسوخ شخصیات کے اردگرد جمع ہو جاتا ہے، اُصول ومبادی کے گرد جمع نہیں ہوتا۔ (۲۷۸)

③ **سرمایہ دار ڈکٹیٹر طبقے کا تسلط:** یہ خطرناک عیب مغربی ڈیموکریٹک نظاموں کا لازمی جز ہے اور یہ سب سے بڑا اور واضح عیب ہے۔ اِسی کے ساتھ کمیونزم لبرل دنیا پر حملہ کرتی ہے۔ اور بائیں بازو کی مقامی جماعتیں بھی اِس کو نشانہ بناتی ہیں۔

یہ بات عالمی سطح پر ثابت شدہ حقائق میں سے ہے کہ سیاسی عمل کے لیے بنیادی محرک اور واحد ہدف مادی مفادات اور ظاہری خوشحالی ہے۔ ڈیموکریٹک دنیا کے تمام ممالک اس حقیقت کو چھپاتے نہیں کہ وہ اپنے عروج اور اقتصادی ترقی کے لیے محنت کر رہے ہیں۔ وہ اپنی قوم کی مادی خوشحالی بڑھاتے ہیں۔ یہ ظاہری پردہ ہے جس کی آڑ میں ان ملکوں کے اندر **مالی امپیریلزم** پروان چڑھتا ہے جو براہ راست داخلی وخارجی سیاسی امور میں لاگو ہوتا ہے اور حاکم طبقے پر دباؤ ڈالتا ہے۔

عوام یہی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے ذات کے خود مالک ہیں اور اپنے راستے خود مقرر کرتے ہیں۔ جبکہ اجارہ دار

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سرمایہ دار طبقہ قوانین کو اپنے مفادات میں وضع کرتا ہے۔ وہ ملکی سیاست کو اپنے ذاتی مفاد اور اغراض میں ہانکتا ہے اور قید کر کے رکھتا ہے۔

لاسکی کہتا ہے:

ڈیموکریٹک ملک اپنے شہریوں کو مختلف فلاحی سیکورٹیز فراہم کرنے میں بہت مال خرچ کرتے ہیں۔ اُن کے قوانین ذاتی ملکیت کی حمایت کرتے ہیں اور اُس کو محفوظ بناتے ہیں لیکن خوشحالی ہر خاص عام تک نہیں پہنچ پاتی۔ چنانچہ جب معاشرہ امیر و غریب طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے تو ریاستی اقتدار سرمایہ دار طبقے کے مفاد کے لیے کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔۔۔ کیونکہ اُس کا اثر و رسوخ ریاست کے ممبران اسمبلی اور اصحابِ اختیار کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اُن کی خواہشات کو پہلے درجے میں معتبر قرار دیں۔

ریاست بھی ان کی خواہشات کو معتبر قرار دیتی ہے کیونکہ وہ اقتصادی نظام پر غالب ہوتے ہیں چنانچہ قانون و نظام ایک ایسا پردہ ہوتا ہے جس کے نیچے اقتصادی مفادات غالب ہوتے ہیں جو سیاسی اثر و رسوخ سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ریاست اپنے اقتدار کے دوران عام عدل و انصاف یا عام خوش حالی کا قصد نہیں کرتی بلکہ وہ ایک غالب یا مسلّط طبقے کے مفاد کو پورا کرتی ہے۔

حریت و مساوات جن کو ہم نے سب سے پہلے بیان کیا ہے، وہ یہی حریت و مساوات ہیں جن سے سب زیادہ دولت مند مستفید ہوتا ہے۔ (۲۷۹)

اس پر واقعاتی مثالیں بالکل روشن ہیں۔ وہ جنگیں جن میں امریکہ ماضی میں شریک رہا یا حال میں شریک ہے، اس بات کی صریح ترین دلیل ہیں کہ ڈیموکریٹک سیاست اجارہ دار طبقے کے دباؤ کے تحت ہوتی ہے۔

چنانچہ پہلی عالمی جنگ، دوسری عالمی جنگ پھر ویت نام کی جنگ، اِن سب جنگوں میں امریکہ بغیر کسی براہ راست مصلحت کے داخل ہوا اور نہ ہی اُس کی قوم کو کوئی خطرہ لاحق تھا۔ اِن جنگوں کے محرکات و نتائج سے قطع نظر امریکی عوام ان جنگوں میں حکومتی مداخلت کو روکنے کی کوشش کرتی رہی۔ بڑے بڑے عوامی مظاہرے اور مسلسل احتجاج منظر عام پر آتا رہا کہ اِن جنگوں میں جان و مال کا نقصان بلا فائدہ ہو رہا ہے۔

لیکن سرمایہ دار طبقہ جو اسلحہ کی صنعتوں اور بڑی بڑی کمپنیوں کا مالک تھا، اپنے مال کا نکاس کرنا چاہتا تھا۔ اُس کی مصلحت اِسی میں چھپی تھی کہ جنگیں مسلسل بھڑکیں اور جاری رہیں۔ وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا آیا کہ اُس محدود سرمایہ دار طبقے کی خواہش پوری ہوئی اور پوری قوم کا مطالبہ ایک طرف رہا۔

جب صدر کینڈی نے قومی مصلحت کو مقدم کرنے کی کوشش کی اور ایک بین الممالک وفاق کے معاہدہ پر معاہدہ کیا تو اُس سے جان چھڑا لی گئی اور اُس کو ایک دہشت گرد حملے میں قتل کرا دیا گیا اور اُس کا راز آج تک چھپا ہوا ہے۔

بات صرف اتنی نہیں کہ مالی ایمپائر دہشت گرد تنظیموں اور مسلح جتھوں کے مالک ہوتے ہیں بلکہ اس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ساتھ وہ میڈیا کے وسائل پر بھی قابض ہوتے ہے اور اُس کو اخلاقی، مالی، سیاسی سکینڈلز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ سب راستے کبھی قوت وتسلط کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں اور کبھی فقط انگیخت وترغیب کے لیے۔(۲۸۰)

اس معاملے میں جو حقیقت ہماری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے، یہ ہے کہ غالب سرمایہ دار طبقہ یہودی اجارہ دار سود خور تنظیموں کے سوا کوئی نہیں۔ یہ تلمود کے احکام اور پروٹوکولز کے مطابق پوری دنیا پر غلبے کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔

④ رائے عامہ کو ہموار کرنا اور بگاڑنا۔

ڈیموکریسی کی یہ خرابی اور پچھلی خرابی لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ غالب دولت مند طبقے کا وجود میڈیا کے وسائل کو طبعی طور پر اپنے قبضے میں رکھتا ہے۔ جو رائے عامہ کو بنیادی طور پر تشکیل دیتا ہے۔ اس طرح میڈیا کے وسائل ایک معین گروہ کے تابع ہوتے ہیں جو رائے عامہ کو تشکیل دے کر یا گمراہ کر کے اُس کی سیاسی قوت اور مالی اثر ورسوخ کو مضبوط کرتے ہیں۔ یہی چیز دوست امیدوار قومی اسمبلی کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے۔ میشل اسٹیوارٹ ڈیموکریسی کی مشکلات وخرابیوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: ''رائے عامہ کی تشکیل پر دولت کا بڑا اثر ورسوخ ہوتا ہے۔ ڈیموکریسی اُن تمام لوگوں کو برابر مواقع فراہم کرتی ہے جو اپنی رائے کو بیان کرنا چاہتے ہیں اور لوگوں کو مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔ ڈیموکریسی نے حریت کلام وتحریر سے قانونی رکاوٹوں کو دور کر کے یہ مواقع فراہم کر دیے ہیں۔

ایک نیا پہلو یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ میڈیا پر ایک چھوٹا گروہ قابض اور مالک بن بیٹھا ہے۔ چونکہ میڈیا کے بھاری بھرکم اخراجات میدان صحافت میں نئے مالکوں کے داخلے کو مشکل بنا دیتے ہیں، اس لیے سابقہ مالکوں کی اجارہ داری مستحکم ہو جاتی ہے۔ پھر صنعتی وتجارتی مفادات کی کشمکش ریڈیو اور ٹی وی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

نفسیات، پروپیگنڈہ اور میڈیا کے جدید مطالعہ جات سے یہ جائز قرار پایا ہے کہ کچھ لوگوں کی قوت میں اضافہ کیا جائے جو میڈیا کے وسائل پر بھرپور اخراجات کے ساتھ قبضہ حاصل کریں اور ہر اس شخص کی عقل کو مسخر کریں جو غور وفکر کی قدرت رکھتا ہے، اس طرح وہ لوگوں کی عقلوں کو ہم آہنگ کریں۔ یہ ڈیموکریسی کی اساسی غرض بھی ہے اور اُس کی خطرناک شکل بھی۔ یہ ماضی کے بچے کھچے آثار نہیں بلکہ یہ جدید پلوٹو کریسی (دھن راج۔ Plutocracy) ہے جو جدید دور میں ظاہر ہوئی ہے۔

میڈیا رائے عامہ بگاڑنے میں مضبوط کردار ادا کرتا ہے، اس حوالے سے لاسکی کہتا ہے: خبروں کو اکٹھا کرنا، نشر کرنا اور واقعات کو پیش کرنے کا عمل موضوعی طریقے پر نہیں ہوتا۔ خبریں جلد ہی پروپیگنڈہ بن جاتی ہیں، خصوصاً جب اُن کے مواد کا اثر سیاست پر پڑتا ہے۔ اِسی طرح مختلف معاشروں میں خبروں کے مضامین اُن لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اقتصاد کی کنجیاں ہوتی ہیں۔

اکثر افراد اپنی معلومات کو درست کرنے کے لیے اخبارات پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور یہ اخبارات اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجود کے بقا کے لیے اشتہارات کے اوپر اعتماد کرتے ہیں۔ اور یہ اشتہارات با آسانی کنٹرول ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اخبارات کا اجرا نہایت مشقت طلب کام ہے جن کو فقط مالدار ہی برداشت کر سکتے ہیں۔

چونکہ اخبارات اشتہارات پر اعتماد کرتے ہیں، اسی لیے یہ ایسی خبریں اور تجزیے لازمی طور پر پھیلاتے ہیں جن سے سرمایہ دار طبقہ راضی ہو۔

چنانچہ اُن صریح واقعات کو نقل کرنے میں واضح جانب داری دکھائی دیتی ہے، جو سرمایہ دار طبقے کو پریشان کر سکتی ہے یا حرج میں مبتلا کر سکتی ہیں۔ (۲۸۲)

⑤ انتخابی عمل میں شہریوں کی عدم دل چسپی۔

ڈیموکریسی دعویٰ کرتی ہے کہ وہ عوام کی حکومت ہے اور اس کے ممبران وارکان عوام کے ارادے سے چنے جاتے ہیں جو عوام کے سچے نمائندے ہوتے ہیں۔

لیکن یہ دعویٰ کئی اعتبار سے قابل گرفت ہے۔ چند ایک درج ذیل ہیں:

وہ ممالک جو حق انتخاب کو بعض نسلی یا گروہی اسباب کے تحت کسی معین گروہ پر محدود رکھتے ہیں، اُن کی ڈیموکریسی سے نسبت سچی نہیں۔ اسٹیوارٹ کا یہی خیال ہے اور وہ اس کی مثال سوئٹزرلینڈ سے دیتا ہے جہاں عورتوں کو حق انتخاب نہیں اور وہ ممالک جہاں رنگ دار اور دینی گروہ حق انتخاب کے ساتھ کوئی خاص قدم اٹھا سکتے ہیں جیسے بعض ولایات متحدہ اور آئرلینڈ۔

اس کے مقابلے میں وہ ممالک جو اس قسم کی رکاوٹوں کو عائد نہیں کرتے بلکہ تمام شہریوں کو میڈیا کے تمام وسائل کے ساتھ ابھارتے ہیں کہ وہ ووٹ ڈالیں۔ وہاں بھی انتخابی عمل کی شرکت سے عوام کی اکتاہٹ اور سستی معمولی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو فرد یا پارٹی انتخابات میں کامیاب ہوتی ہے، وہ فقط اس وجہ سے کامیاب نہیں ہوتی کہ اس نے عوام کے اکثر ووٹ حاصل کیے ہوتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ووٹنگ میں عملاً شریک ہونے والے ووٹ اُس کو زیادہ ملے ہوتے ہیں۔

اگر ہم انتخابات سے علیحدہ ہونے والوں کو اُن لوگوں میں شامل کریں جنھوں نے معارض ووٹ ڈالے تو انتخابات میں کامیاب اکثریت حاصل کرنے والے، عوام کے مجموعے کے مقابلے میں ایک قلیل نسبت کے سوا کچھ نہ ہوں گے۔

اس لیے یہ کہنا کسی حالت میں درست نہیں کہ حکومت عوام کی سچی و کامل نمائندگی کر رہی ہے۔ یہ وہ عیب ہے جس کا اعتراف ڈیموکریٹک ملک خود بھی کرتے ہیں اور کوئی ملک اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس بارے میں بڑا سخت مقابلہ ہوتا ہے کہ ووٹ سے انکار کرنے والوں کی شرح کم کی جائے تا کہ شرکت کرنے والوں کی شرح خود بخود بڑھ جائے۔

ہم اس کی مثال ایک کتاب ''نظام الحکم والسیاسۃ فی الولایات المتحدۃ۔ امریکہ میں نظام حکومت وسیاست''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے پیش کرتے ہیں جس کا مصنف ذکر کرتا ہے کہ سن انتخاب کی عمر کو پہنچنے والے ووٹرز کی شرح ۶۶ فیصد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بعض اوقات یہ شرح ۵۵ فیصد سے کم ہوتی ہے اور ۱۹۵۶ء میں یہ ۶۰٫۵ فیصد تھی۔ (۲۸۳)

⑥ انفرادی امتیازات کا خاتمہ

ڈیموکریسی جوہری اعتبار سے انفرادی نظام ہے۔ لیکن یہ اصل میں اُن انفرادی حقوق کی پامالی کا ردعمل ہے جو جاگیردارانہ نظام کے تحت واقع ہوئے۔ ڈیموکریسی میں فرد اس لیے ممتاز قرار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ حکومتی اختیار کردہ قراردادوں کی تشکیل میں حصہ دار ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود اُس کی حق تلفی پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہے۔

اس خرابی نے ڈیموکریسی کے بعض ناقدین کو متوجہ کیا۔ جن میں سے ایک الیکسس کاریل ہیں۔ ڈاکٹر کاریل اس بات سے تعجب کرتے ہیں کہ انسانیت اِس نظام کے جوئے تلے دبنے پر کیسے راضی ہو گئی جو انفرادی امتیازات کو ختم کر دیتا ہے۔ وہ قابل ترین اور ممتاز ترین افراد کو حالات و واقعات کے تناظر میں کوئی وزن دینے کو تیار نہیں ہوتا۔ اُس کی نظر میں اہل و نااہل اور قابل و نا قابل برابر ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

ایک اور غلطی ہے جو فرد سے متعلق مختلف آرا کا نتیجہ ہے، یہ ڈیموکریسی کی مساوات ہے۔ یہ نظریہ قوموں کے تجربات کے تحت زوال پذیر ہے۔ چنانچہ اب اس کمزور نعرے کو پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ڈیموکریسی کی کامیابی نے اِس کی عمر حیران کن حد تک طویل کر دی ہے۔ حیرت ہے کہ انسانیت نے اتنے لمبی مدت کے لیے اس قسم کے نظریے کو کیسے قبول کر لیا ہے؟! حقیقت یہ ہے کہ ڈیموکریسی کا نظریہ ہمارے شعور کی تشکیل پر توجہ نہیں دیتا۔ یہ فرد پر لاگو ہونے کے لیے مناسب نہیں۔

یہ بات درست ہے کہ لوگ برابر ہیں لیکن افراد برابر نہیں ہوتے کہ اُن کے حقوق برابر ہو جائیں جبکہ وہ وہمی ہوں۔ اِسی وجہ سے قانون کی نظر میں ضعیف العقل انسان کو عبقری انسان کے برابر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ یہ لغو رائے ہے کہ بے وقوفوں کو بھی اُسی قوت انتخاب کا حامل بنایا جائے جو مکمل نشوونما والے افراد کو بنایا جائے۔ یہ دو جنسیں برابر نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ مساوات کو ختم کرنے میں غفلت کرنا انتہائی خطرناک معاملہ ہے۔ ڈیموکریسی کے اصول نے تہذیبی انہدام کے اندر بہت بڑا حصہ ڈالا ہے کہ ممتاز افراد کی نشوونما کو روک دیا گیا۔ چونکہ ادنی طبقوں کو بلند کرنا ممکن نہیں ہوتا لہٰذا اعلی ذہنی طبقوں کو گرا دیا گیا۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے ڈیموکریٹک مساوات کو لوگوں کے مابین لاگو کیا گیا۔ ڈیموکریسی تمام افراد کو ادنی معیار پر گرا دیتی ہے جس سے اعلی شخصیت دب جاتی ہے۔

ڈیموکریٹک ملکوں کی عملی صورت حال اس رائے کی تائید کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ان ممالک میں جب کسی اقتصادی مسئلے پر ووٹنگ ہوتی ہے، تو بھاری بھرکم اقتصادی دنیا کا فقط ایک ہی ووٹ ہوتا ہے جو بالعموم ایک متوسط یا جاہل فرد کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح عوام کی طرف سے عام طور پر نامور لیکن غیر مناسب افراد کو چنا جاتا ہے کیونکہ عوام اپنے جذبات کے پیچھے چلتے ہیں اور پروپیگنڈہ کی گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

⑥ ذاتی مصلحت کا دیگر افراد و جماعت سے تعارض

یہ عیب اس کسوٹی پر روشنی ڈالتا ہے جو کسی بھی ارضی انسانی نظام کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ ڈیموکریسی دعویٰ کرتی ہے کہ وہ انفرادی واجتماعی مصالح کے لیے بہترین مثالی نظام ہے کیونکہ وہ قانونی طریقے سے اپنے مفادات کے حصول پر مواقع فراہم کرتی ہے۔

لیکن مشکل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فرد اور جماعت کی مصلحت میں تعارض پیدا ہوتا ہے۔ کہ فلاں قرارداد کو چنا جائے یا اُس کی ضد کو۔ کیونکہ وہاں ڈیموکریسی باہمی موافقت کو ممکن نہیں بنا پاتی، اس طرح وہ اس بات کو بھی یقینی نہیں بنا پاتی کہ قرارداد کا نتیجہ مطلوبہ مقاصد کو پورا کرے گا یا نہیں۔

ہم بطور مثال قیمتوں کی تعیین کے مسئلے کو پیش کرتے ہیں:

مزدوروں کے لیڈر ہمیشہ اجرتوں میں اضافے کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ اُن کے ووٹ حاصل کیے جاسکیں۔ جب وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں تو آپ کو یقینی طور پر معلوم ہوگا ایک اعتبار سے مزدوروں کو تو فائدہ ہوگیا لیکن دوسری طرف سے نقصان بھی ہوگا کیونکہ اس کے ساتھ فوراً مہنگائی بڑھ جائے گی۔

دوسری طرف سے **بیکر** کہتا ہے:

تمام طبقوں کی اپنی اپنی مصلحتیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے کسی کی مصلحت کو بغیر قانون سازی پایہ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں ہوتا لیکن یہ قانون سازی دوسروں کے نقصان پر مبنی ہوتی ہے۔ مثلاً کسان اور مزدور بیک وقت پیدا کار بھی ہیں اور صارف بھی ہیں۔ پیدا کار ہونے کی حیثیت سے وہ چاہیں گے کہ ان کی پیداوار اعلیٰ نرخ پر بکے لیکن صارف ہونے کی حیثیت سے وہ کم ریٹ پسند کریں گے تاکہ وہ اپنی ضروریات مکمل کرسکیں۔

یہ بعض عیوب ہیں جو ڈیموکریٹک مصنفین نے ڈیموکریسی کے اصول وتطبیق کے حوالے سے ملاحظہ کیے ہیں۔

دو فرانسیسی مصنفین نے ڈیموکریسی کی خرابیوں کو مختصر عبارات میں اس طرح پیش کیا ہے۔

① پارٹی بازیاں اور اُن کی مسلسل باہمی کشمکش۔

② کمزور حکومتیں جو زیادہ دیر تک حکومت نہیں کرسکتیں۔

③ شہریوں کے درمیان احمقانہ مقابلہ وکشمکش۔

④ طویل مدت کے لیے کسی یکساں سیاست کا عدم وجود یعنی حکومتی پالیسوں کا عدم تسلسل۔

⑤ عوام کے ترقیاتی کاموں میں مسلسل سست رفتاری، جیسے عوامی رہائشی منصوبے، اسی طرح شہری، اقتصادی، معاشرتی تربیت کا کافی نہ ہونا۔ (۲۸۶)

ان خرابیوں کو دیکھ کر انگریز مصنف یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ''ڈیموکریسی کے عظیم نظریات جو کتابوں میں مذکور ہیں اور جو عملی سیاسی واقعات کی شکل میں ہیں، اُن کے مابین بہت خوف ناک خلا ہوتا ہے۔ (۲۸۷)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان تمام تنقیدوں کے باوجود کوئی بھی شخص حقیقی مشکل کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔ سیاست کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ شریعت الٰہی کی حاکمیت چھوڑ کر خواہشات اور شہوات کی عبادت کی جائے۔ یہ وہ خطرناک اور تباہ کن غلطی ہے جو مغربی معاشرے سے واقع ہوئی ہے۔ وہ حق کو پہچانتا نہیں اور اللہ پر غرور و تکبر کرتا ہے۔ ہم حکم بما انزل اللہ (شریعت الٰہی کی حاکمیت) پر آخری باب میں تفصیل سے مناقشہ کریں گے۔ ان شاء اللہ

② کمیونزم:

سرمایہ داری اور اس سے منسلک ڈیموکریسی جاگیروں کی خرابیوں کا ردِ عمل ہے تو کمیونزم کی بہترین تفسیر یہ ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ خرابیوں کا ردِ عمل ہے۔

کمیونزم یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس نے تاریخ کے سفر اور زندگی کی حرکت کا علمی قانون دریافت کر لیا ہے، جو **جدلیت** (dialectics) کے اصول کی شکل میں ہے۔ وہ اس پر مطلق ایمان لایا ہے لیکن اُس کا ''تصورِ ریاست'' اس اُصول سے موافق نہیں۔

کمیونسٹ فلاسفہ نے مستقبل کی ریاست کا جو خواب دیکھا تھا وہ خیالی جنت یعنی یوٹوپیا تھا۔ کمیونزم کا نظریہ اس بات پر ایمان لایا تھا کہ جیسے جیسے انسانیت کمیونسٹ افکار کو زیادہ سے زیادہ لاگو کرتی چلی جائے گی، ریاست کی ضرورت بتدریج کم ہوتی چلی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ کشمکش ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔ لیکن جدلیت کا قانون اس کو تسلیم نہیں کرتا کہ کشمکش کبھی ختم ہو سکتی ہے۔

لیکن کمیونزم پر مبنی موجودہ ریاستیں، اگرچہ ایک عارضی حالت میں ہیں۔ لیکن یہ ایک ضروری مرحلہ ہے جس میں کمیونزم اپنے مرحلے کے تقاضے کے مطابق ظاہر ہو رہا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ کمیونسٹ ریاست **عوامی ڈیموکریٹک ریاست** ہے۔ یہ ڈیموکریسی کی اُس خاص تعریف کے مطابق ہے جس کو کمیونسٹ پیش کرتے ہیں۔ وہ ایک کمیونسٹ معاشرے کی سیاسی شکل ہے جس میں پیداوار کے وسائل عام ملکیت پر قائم ہیں، کسی خاص فرد یا شخص کی ملکیت پر نہیں اور معاشرہ ہر قسم کے استحصال سے آزاد، مضبوط منصوبہ بندی پر مشتمل ہے۔ (۲۸۸)

کمیونزم مزدور طبقے کی سیادت کے اصول پر ایمان لاتا ہے۔ جس کو **پرولتاری ڈکٹیٹرشپ** کہا جاتا ہے۔ یہ **سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹرشپ** کے مقابلے میں ہے جو لبرل ڈیموکریسی کہلاتی ہے۔

کمیونسٹ ریاست کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے نظریے کو ایک ہمہ گیر عقیدہ کے طور پر اختیار کرتی ہے جو زندگی کی تمام سرگرمیوں اور شعبوں کی تشریح اور مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ یہ عقیدہ سب کو زندگی کے ایک ہی موثر عامل کے ساتھ جوڑ کر رکھتا ہے، جو کہ اقتصادی عامل ہوتا ہے اور جس کے وسائل پیداوار کی ملکیت خاص شکل کی ہوتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہاں مناسب ہے کہ کمیونسٹ ریاست کے تعارف پر ایک نظر ڈالی جائے۔ کمیونسٹ ریاست ایک اقتصادی طریق کار ہے جو قانون سازی اور انتظامی اختیارات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا مطلق کنٹرول کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی خود کو مزدوروں و کسانوں کے ارادے کی مجسم شکل سمجھتی ہے۔ اس طرح وہ بزعم خود عوامی ارادے کی سچی تعبیر ہوتی ہے۔ ریاست کی قانونی مشینری اُس ارادے کی تنفیذ میں پیچیدہ طریقوں پر مشتمل ہوتی ہے جو کمیونسٹ پارٹی کی قیادت سے ظاہر ہوتا ہے۔

پارٹی عقیدہ رکھتی ہے کہ وہی حقیقت میں عوام ہے۔ اسی لیے اُس کے پاس داخلی و خارجی سیاست وضع کرنے کا کامل و ہمہ گیر اختیار ہے۔ وہی نظریات کی صحت کو ثابت کر سکتی ہے اور سیاسی حکمت عملی کی توجیہ کر سکتی ہے۔ سیاست میں ہر نظام و سسٹم کی قیادت و نگرانی کا حق اسی کے پاس ہے۔ (۲۸۹)

ایک کمیونسٹ مصنف لکھتا ہے: ''اس قسم کی منظم اور خاص ہدف والی قوت کے ہاتھوں میں ملکوں کی قیادت چلی جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ پر ایک ہی جیسی یکساں تصویر کی چھاپ ہوتی ہے اور وہ کمیونسٹ پارٹی کی چھاپ ہے۔ اس قسم کی کامیابی کا حصول ایسے ممکن ہوتا ہے کہ خارج سے مداخلت کی کوششوں کو روکا جاتا ہے اور ملک کی بڑی بڑی مشکلات کو کمیونسٹ اعلیٰ اقدار کے مطابق حل کیا جاتا ہے''۔ (۲۹۰) یہ کمیونسٹ عوامی ڈیموکریسی کی خصوصیات ہیں جن کو لے کر کمیونسٹ لیڈر آوازیں لگاتے ہیں اور اُس کی خوبیوں میں مبالغہ کرتے ہیں۔

اس قسم کی منفرد ڈیموکریسی کا حق و عدل کے بارے میں بیلنس کیا ہے؟ اس کی ایجابیت اور کارنامے کیا ہیں؟ اور یہ اپنی نظیر سرمایہ داروں کی ڈیموکریسی کے مقابلے میں کس قدر عیوب سے سلامت ہے؟

اس سلسلے میں صورت حال کا عملی مشاہدہ کافی ہے، کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کمیونسٹوں کا عوامی ڈیموکریٹک نظام حکومت استبدادیت کی تاریخ میں بدترین اور ظالم ترین نظام ہے جو خالص ڈکٹیٹرشپ پر مشتمل ہے۔ معاصر کمیونسٹ ممالک فی الواقع انسانوں کے لیے وسیع و عریض قید خانے ہیں جن کے داروغے کمیونسٹ پارٹی کے ارکان ہیں۔ اس قید خانے کے مہمان پورے کے پورے عوام ہے۔ اِن ملکوں نے اس حقیقت کو چھپانے کے لیے جو آہنی پردے ڈالے ہوئے ہیں، وہ بذات خود ایک رسوا کن دلیل ہے۔ یہ حکم ہم اپنی طرف سے نہیں لگا رہے اور نہ ہی کمیونسٹ کے خلاف اٹھنے والے مصنفین کی رائے نقل کر رہے ہیں۔ بلکہ یہ اُن سیاسی راہ نماؤں کا بیان ہے جن میں ایک کمیونسٹ ملک میں نائب صدر کے عہدے تک پہنچا اور دوسرے صوبائی و ملکی سطح پر کمیونسٹ پارٹی کے رکن تھے۔

اس طرح اس حقیقت کو مغرب کے اُن نمایاں مفکرین نے بھی ظاہر کیا ہے جو سرمایہ دارانہ ڈیموکریٹک معاشرے کی خرابیوں سے تنگ آ کر کمیونزم کا عقیدہ قبول کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔ جب اُن پر اس نظام کی کڑوی حقیقت کھلی تو وہ اس سے بھی تائب ہو گئے۔ اب اُن کے پاس کوئی متبادل نہیں۔ چنانچہ مثلاً **میلوفان وجیلاس** جو یوگوسلاویہ کا سابق نائب صدر ہے کمیونسٹ حکومت کو تین مراحل میں تقسیم کرتا ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① فرد واحد کی انقلابی ڈکٹیٹرشپ: لینن

② مذاہب کے خلاف دہشت گرد ڈکٹیٹرشپ: سٹالن

③ سیاسی بیوروکریسی: خروتشوف یا دیگر

وہ کمیونسٹ انتخابات کے متعلق کہتا ہے: یہ ایک ایسا مقابلہ جس میں ایک ہی گھوڑا دوڑتا ہے۔ اُس کا کمیونسٹ پارٹیوں کے متعلق کہنا ہے: اس جدید طبقے نے واضح طور پر ثابت کر دیا ہے کہ وہ تاریخ کے سٹیج پر کسی بھی دوسرے طبقے سے زیادہ جبر و تسلّط والا ہے۔ اس طرح اُس نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ وہ عظیم ترین اہرام کا مالک ہے جس نے جدید طبقاتی معاشرے میں ظلم کے سخت ترین انواع کی بنیاد رکھی ہے۔ (۲۹۱)

وہ اعلان شدہ اور غیر اعلان شدہ قوانین کے مابین موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے: تمام شہری جانتے ہیں کہ حکومت مخصوص پارٹی کے ذیلی گروہوں کے ہاتھوں میں، خفیہ پولیس کی نگرانی میں ہوتی ہے۔ ادارتی معاملات میں کمیونسٹ پارٹی کا کردار غیر اعلانیہ ہوتا ہے۔ اس کا اختیار تمام اداروں، تنظیموں اور خطوں میں لاگو ہوتا ہے۔ ریاست میں کوئی ایسا قانون نہیں جو خفیہ پولیس کو شہریوں کی نگرانی کا حق دے لیکن اس کے باوجود وہ مطلق اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کوئی ایسی قانونی نص نہیں جو اس ضرورت کا تقاضا کرے کہ خفیہ پولیس کی نگرانی ہونی چاہیے اور پارٹی کی ذیلی کمیٹیاں عدالتی اختیارات کے تحت کام کر سکتی ہیں۔ مگر یہ دو ظالمانہ قوتیں ہیں جو ان امور کے عملی تسلّط اور نگرانی پر قائم ہیں۔ (۲۹۲)

آرتھر کوسٹلر، نامور ناول نگار اور کمیونسٹ پارٹی کا سابق رکن، کہتا ہے: کومنترن عنوانات اور نعروں کی تجارت کرتا ہے جیسے ممنوع شرابوں کو رواج دینے والے، روایتی کھوٹی قسم کی تجارت کرتے ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے کارندے زیادہ سادے ہوں، ویسے ویسے وہ انواع و اقسام کی فکری شرابوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ یہ شرابیں سلامتی، ڈیموکریسی، ترقی اور ان جیسے دیگر نعروں کے تحت بیچی جاتی ہیں۔ (۲۹۳)

اندریہ جید کمیونزم سے رجوع کرنے کے بعد بتلاتا ہے: روس میں لوگوں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ حکومت جو کچھ بھی کرے، اُن کی موافقت و تائید کا مظاہرہ کریں۔ معمولی سا تعارض یا تنقید بھی سخت ترین سزاؤں کا باعث بن سکتی ہے، چنانچہ تعارض کو سرے سے ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس جدید اجتماعی سیڑھی میں نیچے سے اوپر تک رپورٹ کے مطابق سب سے اچھا وہ ہے جو سب سے زیادہ ذلت و غلامی میں جکڑا ہوا ہے۔ وہ لوگ جن سے کسی قسم کا نظریاتی استقلال ظاہر ہوتا ہے، انہیں کاٹ دیا جاتا ہے یا جلاوطن کر دیا جاتا ہے۔ ایسی جرأت مند اور بہادر جنس جو ہماری تمام تر محبت و فخر کی حق دار ٹھہرتی ہے، میں سے کوئی باقی نہیں رہتا۔ باقی رہنے والوں میں مفاد پرست، جلاد یا مجبور و بے بس لوگ ہوتے ہیں۔ چھوٹے آزاد رائے والے معمولی مزدور دھتکارے ہوئے جانور کی طرح ہوتے ہیں جو بھوک، ٹوٹ پھوٹ اور پھر ہلاکت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں: ہٹلر دور کے جرمنی سمیت دنیا میں کوئی دوسری ایسی ریاست ہے جس میں عقل و روح کی حریت اس بری طرح سے سلب کی گئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو؟اور اس قدر ذلت ، غلامی، بزدلی اور خوف کو مسلّط کرنے والی ہو؟ مجھے سوویت یونین کے علاوہ کوئی ایسی ریاست نظر نہیں آتی۔(۲۹۴)

لوئس فشر، جس نے کمیونزم کا بذات خود تجربہ کیا ہے، وہاں کا فکری مسخ بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

''حکومت کے تمام سابقہ معیار و پیمانے ضائع ہو گئے ہیں۔اب معلوم نہیں کہ کیا قبول کیا جائے اور کس کا انکار کیا جائے۔ شام نہیں آتی کہ صبح کے فرشتوں کے بارے میں اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ شیاطین ہیں۔اس سے ایسا خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے جو ہر اُس نئی وحی کو مشینی غلامی کے ساتھ قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے جو کریملین کے آسمان سے اترتی ہے۔ یہ کمیونسٹ ریاست میں رہنے والے شخص کے اطمینان نفس کی کم از کم حالت ہے۔(۲۹۵)

کمیونسٹ ڈیموکریسی سے متاثر ہونے والوں میں ایک برٹرینڈ رسل ہے جس نے حقیقت کا انکشاف کیا۔ وہ لکھتا ہے: روس میں سن ۱۹۱۷ء میں مزدور کل رہائشیوں کی کمزور ترین اقلیت تھا اور بھاری بھرکم اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی۔ اُس وقت یہ منظور ہوا کہ بالشویک پارٹی اس مزدور طبقے پر مشتمل ہو جو طبقاتی شعور سے بہرہ ور ہے۔ چنانچہ لیڈروں کی ایک چھوٹی کمیٹی کو بالشویک پارٹی میں طبقاتی شعور کا حامل قرار دیا گیا۔ اس طرح مزدوروں کی ڈکٹیٹرشپ، چھوٹی کمیٹی کی ڈکٹیٹرشپ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر معاملہ یہاں پر اختتام پذیر ہوا کہ وہ ایک آدمی کی ڈکٹیٹرشپ میں تبدیل ہوگئی یعنی سٹالن، جیسا کہ اُس نے دعویٰ کیا کہ وہ خود ہی مزدور طبقے میں طبقاتی شعور کا حامل ہے۔ پھر اُس نے لاکھوں کسانوں کو بھوک سے مار ڈالنے اور لاکھوں کو قید کی چھاونیوں میں بیگار پر لگانے کا فیصلہ کیا۔(۲۹۶)

ہم اپنی بات کو لوئس فشر کے اس بیان سے ختم کرتے ہیں: بعض لوگ اپنی نیند اس لیے حرام کرتے ہیں کیونکہ سرمایہ داری کا جہان جرائم و آثام سے لبریز ہے اور وہ اندھے ہو جاتے ہیں جب بالشویک کے جرائم و افلاس کو نہیں دیکھتے۔ وہ ماسکو کی ہول ناک خرابیوں سے توجہ ہٹانے کے لیے مغربی یورپی دنیا کے نقائص سامنے لاتے ہیں۔لیکن میں تو یہ کہوں گا: اللہ دونوں پر لعنت کرے۔

یہ اُن عالمی نظاموں کی موجودہ صورت حال کا بیان تھا جو غیر شرعی حکومتوں پر مشتمل ہیں۔

اصطلاحات:۷

مغرب کی بنیادی معاشرتی وسیاسی اقدار

آزادی(Freedom)

انسان کا یہ حق ماننا کہ وہ خیر و شر کی جو تعبیر کرنا چاہے کرنے کا مکلّف ہے۔مغربی نظام زندگی کی کلیدی قدر اور قرآنی اصطلاح کے مطابق آزادی کا معنی بَغْی ہے یعنی انسانی خودمختاریت کا دعویٰ، عبدیت کا ردّ۔

خوداختیاریت، خودمختاری(Autonomy)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعین خیر وشر کے معاملہ میں وحی الٰہی کو بنیاد ماننے سے انکار کرنا۔ انسان کی صمدیت کا اقرار یعنی یہ ماننا کہ انسان خود مختار اور قائم بالذات ہے۔

مساوات (Equality)

یہ تصور کہ سب انسانوں کا حق خود ارادیت برابر ہے۔ دوسرے لفظوں میں تمام تصورات خیر وشر برابر معاشرتی حیثیت کے حامل ہیں۔ مساوات مغربی نظم اور انفرادیت کی بنیادی قدر ہے اور یہ نظام ہدایت کا مکمل ردّ ہے۔

ترقی (progress)

یہ مغربی نظام زندگی اور انفرادیت کی تیسری اہم قدر ہے یعنی خود مختار انسان کے ارادے کا کائنات پر تسلّط تاکہ زیادہ سے زیادہ انسانی خواہشات ولذات کی تکمیل ہو۔ ترقی کا مطلب تصرف فی الارض کو بطور مقصد حیات قبول کرنا ہے اور اس کا ذریعہ سرمایہ کی بڑھوتری ہے۔ ترقی کا مغربی تصور اسلامی تصور آخرت کا ردّ ہے جو دُنیا کی ترقی کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے جب وہ عبدیت الٰہی سے ہم آہنگ ہو اور غلبہ دین کا سبب بنے۔

عدل (Justice)

مغربی تصور کے مطابق عدل کا تقاضا یہ ہے کہ مساوی آزادی کے حصول کو دیگر تمام مقاصد زندگی پر فوقیت دی جائے یعنی معاشرے میں آزادی ومساوات کو تمام افراد کے لیے یقینی بنایا جائے۔ شہریوں کے حقوق وفرائض کی تقسیم اِس بنیاد پر ہو کہ شہری کے کس عمل کے نتیجے میں سرمائے میں کتنا اضافہ ممکن ہوتا ہے۔ اسلامی تصور کے مطابق عدل شریعت اسلامی ہے۔

رواداری (Tolerance)

مغربی تصور کے مطابق اس سے مراد زندگی گذارنے کے تمام طریقوں کو مساوی معاشرتی حیثیت دینے کا رویہ ہے۔ مغرب کا تصور رواداری اسلامی تصور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا انکار ہے۔

ہیومن (Human being)

وہ فرد جو اپنے قائم بالذات یعنی آزاد ہونے کا اقرار کرے۔ اسلام میں قائم بالذات (الصمد) فقط اللہ ہے، انسان نہیں۔

انسانیت پرستی (Humanity)

وہ تصور جس کے مطابق انسان قائم بالذات یعنی الصمد ہے اور جو ارادہ انسانی کی تکمیل کو زندگی کے اصل مقصد کے طور پر قبول کرتا ہے۔ یہ جدیدیت کا کلیدی تصور ہے اور عبدیت الٰہی سے انکار ہے۔

انسانی حقوق (Human rights)

مغربی سرمایہ دارانہ نظام فرد کو تین بنیادی حقوق تفویض کرتا ہے جو ہر قسم کی مداخلت سے ماورا سمجھے جاتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① زندگی کا حق، یہ تصور کہ فرد اپنی زندگی اور بدن کا خود مالک ہے۔

② اظہار ذات کا حق، یہ تصور کہ تمام تصورات خیر مساوی ہیں اور ہر فرد کو حق ہے کہ اپنی خواہشات جیسے چاہے مرتب کرے۔

③ سرمایہ دارانہ ملکیت کا حق، یہ تصور کہ دیگر تمام مقاصد کے مقابلے میں سرمایے کی بڑھوتری کی فوقیت بدیہی شے ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ہے کہ وہ جمہوری دستوری قانون کا نفاذ قائم کر کے ان حقوق کو اپنے شہریوں پر مسلّط کرے۔ یہ حقوق درحقیقت مساوی آزادی اور سرمائے کی بڑھوتری کے لیے ہوتے ہیں۔

معاہدہ عمرانی (Social contract)

citizen اور حکام کے درمیان ایک فرضی عمرانی معاہدہ جس کا مقصد سرمایہ دارانہ ریاست کا قیام ہے جو مساوی آزادی یعنی سرمائے کی جدوجہد کو دیگر تمام مقاصد زندگی پر فوقیت دیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرت (Capitalist socialization)

سرمایہ دارانہ اشرافیہ کی کوشش ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ اخلاق (حرص وحسد) فقط مارکیٹ میں ہی نہ ہو بلکہ خاندان، رشتہ ازدواج، بچوں کی تربیت، برادریوں کے تعلقات، مذہبی ادارے، قبائل اور قوم کی سطح تک نفوذ کر جائے۔ فرد صرف مارکیٹ میں ہی سرمایہ دار نہ ہو بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہو۔ اس کو سرمایہ دارانہ معاشرتی عمل کہتے ہیں۔

شہری (citizen)

ایسی عوام جو اصولاً حاکم ہو۔ یہ اسلامی تصور رعایا کی ضد ہے جس پر اپنے شرعی حکام کی سمع وطاعت واجب ہے۔

مغرب کے بنیادی معاشی وسیاسی نظام

جاگیرداری نظام (Feudalism)

ایسا نظام جس میں زمین کی ملکیت بڑے جاگیرداروں کے پاس ہو اور عوام چھوٹے کسانوں اور مزارعوں پر مشتمل ہو۔ یورپ میں سرمایہ داری سے قبل جاگیرداری نظام رائج تھا۔

صنعتی انقلاب (Industrial Revolution)

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں مشینوں کی ایجادات سے برپا ہونے والا انقلاب جس کے زیر اثر بڑی صنعتیں اور سرمایہ دار اور مزدور طبقہ معرض وجود میں آیا۔

طبعی مکتب فکر (Physiocracy)

یہ سیاسی ومعاشی نظریہ کہ حکومت یا نظم ونسق کو بے روک ٹوک قدرتی قوانین (مثلاً طلب ورسد کا قانون)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مطابق ہونا چاہیے۔ یہ ۱۸ویں صدی کے بعض معاشی مفکرین نے پیش کیا۔ یہ نظریہ صحیح نتائج پیش نہ کر سکا اور رد کر دیا گیا۔

سول معاشرہ (Civil society)

افراد کی اغراض پر مبنی تعلقات سے ابھرنے والی معاشرتی صف بندی۔ سول سوسائٹی درحقیقت مارکیٹ سوسائٹی ہوتی ہے اور یہ محبت اور صلہ رحمی پر مبنی مذہبی معاشرت کی ضد ہوتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism)

سرمایہ دارانہ نظام کی اہم خصوصیت سرمایہ دارانہ یعنی کارپوریٹ ملکیت کا فروغ اور نظام قدر کا فنانشل مارکیٹ کے تابع ہو جانا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ لبرلزم اور سوشلزم۔

سرمایہ داری (راس مالية۔Capitalism)

مخصوص لادینی اعتقادات پر مشتمل معاشرتی و معاشی نظام جو جاگیرداری کے بعد وجود میں آیا۔ پندرہویں صدی میں بورژوا طبقہ (Bourgeois) یعنی سرمایہ دار طبقہ پیدا ہوا اور سولہویں صدی میں سرمایہ داری پیدا ہوئی۔ سرمایہ دارانہ معاشرتی نظم میں عبدیت کو رد کر کے آزادی کو بطور آفاقی قدر قبول کیا اور فروغ دیا گیا۔ حریت کے مفہوم کے تحت انفرادی ملکیت کے تحفظ و نشوونما کو فروغ ہوا۔ اس نظام میں کارپوریٹ ملکیت کو فروغ ہوا اور نظام اقدار کو سرمایہ دارانہ اغراض کے تحت مرتب کیا گیا۔ بیسویں صدی میں اس نے سامراجی روپ اختیار کیا۔ اجارہ داریاں اور مالی چند سری حکومتیں پیدا ہوئیں۔ ریاست سرمایہ دار بن گئی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم نے سرمایہ دارانہ بحران کو ظاہر کیا۔

لبرلزم (لبرالية۔Libralism)

یہ نظریہ انسان کی انفرادی آزادی کا قائل ہے نہ کہ اجتماعی آزادی کا۔ انفرادی آزادی آزادی کا منفی تصور بھی کہلاتا ہے جبکہ اجتماعی آزادی کو آزادی کا مثبت تصور بھی کہا جاتا ہے جو سوشلزم و نیشنلزم کی حمایت کرتا ہے۔

سیاست میں انفرادی آزادی کا حامل نظام لبرل ڈیموکریسی کہلاتا ہے۔ اقتصاد میں انفرادی آزادی کا نظام کیپٹلزم کہلاتا ہے۔ اسی طرح تعلیم و کلچر میں بھی انفرادی آزادی ہوتی ہے۔

لبرلزم سرمایہ دارانہ ملکیت اور انسانی حقوق پر مبنی جمہوری ریاست کو فلسفیانہ جواز فراہم کرتا ہے۔ لبرلزم کا فروغ سولہویں صدی سے شروع ہوا اور اس کا غلبہ انقلاب فرانس کے بعد پورے یورپ پر قائم ہو گیا۔

نیشنلزم (Nationalism)

ایک ایسی اجتماعیت جس میں افراد کے اشتراک عمل کا مقصد قوم کی اجتماعی آزادی کی بڑھوتری اور زیادہ سے زیادہ مادی وسائل اور قوت کا ارتکاز ہے۔ قوم پرستی کی بنیاد پر لوگ اپنے اعلیٰ ارفع جذبات کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس کی بنیاد محبت، اصول پسندی اور عالمگیر اخلاق کی بجائے نفرت، تشدد اور مادیت ہوتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈیموکریسی (دیموقراطیہ۔Democracy)

وہ سیاسی نظام جس میں قانون کا مصدر عوام کا ارادہ ہو، کسی بادشاہ، مذہبی اتھارٹی یا آمر کا ارادہ نہ ہو۔ اس کا بڑا پرچارک روسو تھا۔ ڈیموکریسی کی دو بڑی اقسام ہیں۔ براہ راست ڈیموکریسی اور بالواسطہ ڈیموکریسی۔

موجودہ دور میں ایک اہم سیاسی نظام آمریت (Dictatorship) ہے جو ڈیموکریسی کی ضد ہے۔ اسلام کا نظام ڈیموکریسی اور آمریت دونوں سے مختلف ہے۔

اشتراکیت (اشتراکیۃ۔Socialism)

تاریخی مادیت اور جدلیاتی مادیت پر مبنی ترقی پسند نظام جو استحصالی جاگیرداری اور سرمایہ داری کی مخالفت کرتا ہے اور اجتماعی ملکیت، مساوات اور پرولتاری طبقہ (Proletariat) یعنی مزدوروں کے مفادات کی حمایت کرتا ہے۔ یہ نظام سرمایہ داری کی ایک اہم شکل ہے جس کے مطابق مساوی آزادی کے حصول کے لیے مارکیٹ نظم نہیں بلکہ ذرائع پیداوار کو ریاستی تحویل میں دینا ضروری ہے۔ اس کا ایک اہم مفکر کارل مارکس تھا۔

اشتمالیت (شیوعیۃ۔Communism)

مادیت والحاد پر قائم ایک معاشرتی، معاشی اور سیاسی مکتب فکر جو مارکس کے بعد ظاہر ہوا۔ اس مکتب فکر کے نزدیک ذرائع پیداوار کو اجتماعی تحویل میں دیا جائے۔ اس نظریہ کے مطابق ۱۹۱۷ء میں لینن نے روسی انقلاب برپا کیا۔

کمیونزم وجود الٰہی اور دین کا ابطال کرتا ہے، اس کے نزدیک تمام تر اخلاق اضافی ہیں، یہ انفرادی حریت کے بجائے اجتماعی حریت کا قائل ہے۔ کمیونزم خاندان کے خاتمے اور جنسی انارکی کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک کمیونسٹ پارٹی مقدس ہوتی ہے جو اکیلی ہی اقتدار کے لائق ہوتی ہے۔

مارکسی فلسفے میں اشتمالیت کا ظہور اشتراکیت کے بعد ہے۔ اس منزل پر معاشی فراوانی اس قدر ہوتی ہے کہ ریاست کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ اشتمالیت کا مرحلہ ہے۔ اشتمالیت پسند ممالک خصوصاً روس کا اب یہ خیال ہے کہ ریاست کے بغیر گذارہ ممکن نہیں۔

کمیونزم نے ہیگل کی عقلی مثالیت، کومت کی اثباتیت، فیورباخ کے الحاد اور باکونن کے انارکزم سے استفادہ کیا ہے۔ یہ نظام مشرقی یورپ پر غالب ہوا لیکن بغیر کسی خونی انقلاب کے ۱۹۹۱ء میں ختم ہوگیا۔ اکثر مسلمان عرب ممالک میں کمیونسٹ پارٹیاں موجود ہیں۔

جبریت (Determinism)

یہ نظریہ کہ ہر عمل کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور انسانی عمل مخصوص اسباب کے زیر اثر پیش آتا ہے۔ اس نظریے کی انتہائی شکل میکانکی جبریت ہے۔ مارکسزم اسی کا قائل ہے۔ مارکس کے نزدیک سوشلزم انسانی تاریخ کی جبریت سے پیدا ہوتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جدلیات (Dialectics)

وہ نظریہ جس کے مطابق دنیا کی ہر شے میں تضاد موجود ہے اور تضاد کے نتیجے میں ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ مارکسزم اسی کا قائل ہے۔ اُس کے خیال میں اشتراکیت سرمایہ دارانہ خرابیوں کے نتیجے میں جدلیات کے اُصول کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ جدلیات کا نظریہ مابعد الطبیعیاتی نظریہ کے برعکس ہے۔

جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism)

جدلیات اور مادیت پر مبنی سائنسی اور فلسفیانہ نظریہ حیات جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں صرف مادہ کا وجود ہے جو حرکت میں رہتا ہے اور اس حرکت کی وجہ سے تبدیلی جاری رہتی ہے۔ روح، شعور اور دین کا کوئی وجود نہیں۔ مارکسزم اسی کا قائل ہے۔

سامراجیت/شہنشاہیت (امبراطوریۃ۔Imperialism)

سرمایہ داری نظام کی موجودہ شکل جس کی بنیادی خصوصیت اجارہ دارانہ سرمایہ داری ہے اور جس میں چند سرمایہ دار طاقتوں نے دنیا کے مختلف ممالک پر اپنا معاشی اور سیاسی تسلّط قائم کیا۔ مارکس کے نزدیک یہ سرمایہ داری کی آخری کڑی ہے۔

فوضویت (Anarchism)

ہر قسم کی آمریت کے خلاف بغاوت کا نظریہ اگرچہ وہ پرولتاری کیوں نہ ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۸

اقتصاد کا سیکولرزم

بحث اوّل: مسیحی دور میں اقتصاد

اقتصاد موجودہ یورپی جاہلیت کا بلا اختلاف سب سے بڑا معبود ہے۔ یورپی جاہلیت، تاریخ کی دیگر جاہلیت کی طرح کسی متوسط متوازن خط کو منہج نہیں بناتی بلکہ اس پر مختلف ردِعمل مسلّط رہتے ہیں۔ اُس کے تصرفات میں غلو اور انتہا واضح نظر آتی ہے۔ یورپی زندگی ایک ٹیڑھے خط پر سفر کرتی ہے جو دائیں بائیں ڈگمگاتا رہتا ہے۔ کسی بھی چیز کو دیکھنے کے لیے یورپی جاہلیت کے پاس دو قسم کی عینکیں ہیں، ایک ہر چیز کو اس کے حقیقی حجم سے بڑا کر کے پیش کرتی ہے اور دوسری ہر چیز کو اس کے حقیقی حجم سے چھوٹا کر کے پیش کرتی ہے۔ اور اصل تصویر ان دونوں کے درمیان ضائع ہو جاتی ہے۔

یورپ کا یہ مظہر زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے لیکن سب سے زیادہ اقتصاد میں واضح ہے۔ یورپ دنیا کی زندگی کو حقیر جانتا تھا اور اللہ کی حلال کردہ طیبات کو حقارت سے دیکھتا تھا۔ وہ فقیری اور سادگی کو مقدس جانتا اور بے چارگی اور مشقت کو بابرکت سمجھتا۔ کیونکہ یہ خطا سے خلاصی کا وسیلہ تھیں اور انسانی وجود کی واحد غرض۔ (۲۹۷)

پھر معاملہ اس کے بالکل الٹ ہو گیا۔ یورپ ایک خوں خوار وحشی جانور میں تبدیل ہو گیا۔ اُس نے اپنی تمام قوتوں سمیت حسی لذات اور فانی شہوات پر حملہ کر دیا۔ اُس کی کوشش رہی کہ ہر مزہ کو ہڑپ کر سکے اور ہر لذت کو لوٹ سکے حتی کہ دنیا میں غرق ہو گیا اور آخرت کو بھول گیا بلکہ اُس کو مکمل طور پر ترک کر دیا۔ معاملہ یہاں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ یورپ نے، حقیقی طور پر نہ کہ مجازی طور پر، مادی پیداوار اور طواغیت کی پوجا کی جو سرمایہ دار طبقہ یا کمیونسٹ پارٹی کی شکل میں مسلّط تھے۔ تصویر ویسی کی ویسی رہی یعنی ذلت ناک غلامی، فقط طاغوت کی شکل بدلی۔ پہلے مقدس جاگیردار سردار یا دینی پیشوا ہوتے تھے، اب اُن کی جگہ سرمایہ داروں یا ارکانِ پارٹی نے لے لی۔!

فکر و سلوک کے اعتبار سے یورپ کا مادیت کی طرف کلی رجحان ظاہر ہوا۔ اِس طرح معاصر جاہلیت کسی بھی لیپا پوتی یا ملمع کاری سے الگ ہو کر اپنی کھوٹی شکل میں واضح ہو گئی۔

ہم یہاں یورپ کی اقتصادی تاریخ کے بہاؤ پر غور کریں گے اور جاگیرداری دور سے اب تک، بڑے بڑے نظریات پر ایک گہری نظر ڈالیں گے تاکہ اس طرح واضح حقائق پر بتدریج آگاہ ہو سکیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① جاگیردارانہ نظام اور کلیسا کا نظریہ:

اگرچہ کلیسا نے مسیحی معاشرہ کی عمارت میں تبدیلی کی کوئی بڑی کوشش نہیں کی یا کم از کم زندگی کے بعض اہم شعبوں کو سرے سے منظم نہیں کیا، لیکن اس کے باوجود نظریاتی اعتبار سے کلیسا قرونِ وسطیٰ کی اقتصاد میں ایک لازمی فعال اثر رکھتا تھا۔

کلیسا غالب اور رائج جاگیرداری نظام کے وجود کو برقرار رکھتا تھا بلکہ وہ اس کے ثابت شدہ اداروں میں سے ایک ادارہ تھا۔ اُس نے اُس خوف ناک عذاب کو بھی تبدیل کرنے کی کوشش نہ کی جو معاشرے کے غلاموں کو درپیش تھا حالانکہ وہ انجیل کی تعلیمات کے یکسر منافی تھا۔ لیکن کلیسا بعض دیگر مواقع میں بہت زیادہ متشدد تھا خصوصاً سود کا مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ سود ایسا جرم ہے جس کی حرمت میں تمام آسمانی رسالتیں مشترک ہیں اور تمام مقدس کتابیں اِس سے جنگ کرتی ہیں۔ یہ ایسا مظہر ہے جس کی معنویت بہت گہری ہے۔

ول ڈیورانٹ اس بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: سود کا مسیحی عقیدہ، بنکاری نظام کی نشوونما اور ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ **جیروم** سمجھتا تھا کہ ہر قسم کی کمائی حرام ہے۔ **آگسٹن** کا خیال تھا کہ تمام مالی سرگرمیاں گناہ ہیں کیونکہ یہ لوگوں کو حقیقی راحت یعنی تعلق باللہ سے دور کر دیتی ہیں۔ **پوپ لیو اول** نے ان غالی عقائد کے انکار کی کوشش کی لیکن کلیسا تجارت کے بارے میں کوئی نرمی اختیار کرنے پر تیار نہ تھا۔ وہ مضاربت اور کسب کی تمام انواع کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ سود، ٹیکس اور ذخیرہ اندوزی کی تمام اقسام کا مخالف تھا۔ ''سود'' کا لفظ قرونِ وسطیٰ میں ہر مالی منافع پر لیا جاتا تھا چاہے وہ بالکل معمولی کیوں نہ ہو۔ اس بارے میں امبروز کہتا ہے: سود ہر وہ مال ہے جو سرمایے میں اضافہ کرے۔ **جرایتان** نے اس جامد تعریف کو مذہبی قانون کا حصہ بنا دیا جس پر کلیسا تادیر چلتا رہا۔

پھر لاتران کی مجلس ثالث (۱۱۷۹ء) میں اِس حرمت کی تجدید کی گئی۔ قرارداد منظور ہوئی کہ جو لوگ اعلانیہ سود لیتے ہیں وہ عشائے ربانی میں نہیں آسکتے۔ اور جب وہ اپنے اسی گناہ پر مریں گے تو وہ مسیحیوں کے ساتھ دفن نہیں ہو سکتے اور پادری اُن کے صدقات قبول نہیں کرے گا۔

پوپ گریگوری نہم نے کہا: سود ہر وہ چیز ہے جس کو انسان قرض جیسے معاملات سے کمائے۔ یہ رائے ۱۹۱۷ء تک رومی کلیسا کا قانون رہی۔ کئی طویل صدیوں تک یہ سمجھا جاتا رہا کہ سود خود یہود ہیں۔

حکومتی قانون سازی طویل دور تک کلیسا کی اس پہلو سے تائید کرتی رہی۔ دینی عدالتیں بذات خود سود کو حرام قرار دیتی تھیں۔ لیکن آہستہ آہستہ لوگوں نے یہ سمجھا کہ تجارت کی ضرورت جیل یا جہنم کے خوف سے زیادہ طاقتور ہے۔

پھر اکثر یورپی ممالک نے ۱۴۰۰ کے بعد سود کی حرمت کے تمام قوانین لغو کر دیے۔ کلیسا کی حرمت ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مہمل کلام قرار پائی جس کو نظر انداز کرنے پر تمام لوگ متفق ہو گئے۔(۲۹۸)

جارج سول کا خیال ہے کہ کلیسا سود کو دینی محرک کی بہ نسبت، اپنے ایک خاص مفاد کے تحت حرام کرتا تھا۔ سول کہتا ہے: ''سود کا فساد اور اس کے شر کی تاکید ایک مجرد فکر نہیں بلکہ یہ اپنے وقت میں ایک اہم غرض کو پورا کرتی تھی جو قدیم اور معاصر دور کے اکثر مذاہب کو لاحق تھی۔ یہ فکر اُن لوگوں کے حق میں تھی جو سود کی حرمت کی فکر کو ترویج دے رہے تھے۔''

قرونِ وسطیٰ میں کلیسا اور اس کے جاگیردار حلیفوں نے محسوس کیا، اور درست محسوس کیا، کہ اُن کی سلامتی اور بالادستی کو سرمایہ داری کی نشوونما کے نتیجے میں کوئی خطرہ لاحق ہونے والا ہے۔ اگرچہ انھوں نے اِس خطرے کا نام نہیں لیا۔ سود کو ناپسندیدہ قرار دینا دلالت کرتا تھا کہ جدید وسائل اور پیداوار جاگیرداری نظام کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔(۲۹۹)

قرونِ وسطیٰ کی ''اقتصاد'' کلیسا کی تعلیمات سے چمٹنے کی ہمت نہ رکھتی تھی جو کہ مسیحی اخلاقی نظام کا ایک حصہ تھیں اور مروج جاگیری رسوم ورواج کی بھی پابند تھیں۔ اسی وجہ سے لازم تھا کہ قرونِ وسطیٰ کی ''اقتصاد'' کلیسا و جاگیر کے انہدام کے ساتھ ہی منہدم ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیسا نے برے حالات کو برقرار رکھ کر خطرناک غلطی کا ارتکاب کیا۔ اس نے عمومی عادلانہ اقتصادی سیاست کو وضع نہ کیا جو دین کے اصولوں سے حاصل شدہ ہو۔ اِسی طرح اُس کا ذاتی کردار اور خوف ناک مالی بدعنوانی بھی ظالموں کے لیے نمونہ تھی۔ چنانچہ وہ مظلومین کی نفرت اور کراہت کا نشانہ بنا۔

جب ہم کلیسا کے عام اقتصادی نظریے کو جاننے کی کوشش کریں تو وہ ہمیں جاگیرداری کا طبعی نظریہ نظر آتا ہے۔ یہ جاننا بھی آسان ہے کہ یہ نظریہ کسی مستقل منہج کا حامل نہ تھا بلکہ عام اخلاقی بنیادوں سے اخذ شدہ تھا۔

جاگیرداری نظام کی اجمالی تصویر:

قرونِ وسطیٰ میں یورپی زندگی پر جو نظام غالب رہا اور مسیحیت کے شباب کا ہم عصر رہا وہ یہی جاگیری نظام تھا۔ اِس نے یورپی برّ اعظم کے نقش ونگار کی تشکیل دی۔ یورپی جاگیری نظام اُن جاہلی نظاموں کا ہراول دستہ ہے جو مستقبل میں ہمیشہ ظلم وسرکشی پر مبنی رہے۔ جاگیری نظام کے تحت انسان بے اختیار، عزت وشرف سے عاری اور حقوق سے محروم تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ممالک جن سے براعظم یورپ کی تشکیل ہوتی ہے، جاگیروں کا مجموعہ ہی تھے جو کسی بادشاہ یا مرکزی شہنشاہ کے ماتحت ہوتے تھے۔ جن کا بڑا مقصد یہ ہوتا تھا کہ وہ جاگیری مالکان سے ٹیکس اور سپاہی وصول کریں۔ اسی طرح جاگیروں کے اندرونی حالات کی تصویر بھی خاصی خوف ناک تھی۔

یہ نظام مختلف زمانوں اور خطوں میں مختلف صورتوں میں رائج رہا لیکن اس کی عام خصوصیت یہ تھی کہ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرہ کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا تھا: ایک خوشحالی کی انتہا میں ہوتا تھا اور دوسرا غربت و افلاس کے پاتال میں۔ پھر ہر طبقہ مزید دو طبقوں سے مرکب تھا۔ بلند طبقہ جو آقاؤں، سرداروں اور کلیسا کے پیشواؤں پر مشتمل ہوتا تھا اور ادنی طبقہ جو غلاموں پر مشتمل ہوتا تھا۔ چھوٹے پادری اور کلیسا کے راہب درویش بھی اسی طبقے میں شمار ہوتے تھے۔

ان طبقات میں سے ہر فرد کے حقوق اور واجبات تھے، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① **مالک آقا:** وہ اس نظام میں عملی قوت اور نفوذ کے مالک تھے۔ وہ ایسے حقوق کے مالک تھے جن کا کوئی شمار نہ تھا جبکہ اُن کے ذمے واجب کوئی نہ تھا۔ اُن کا حق تھا کہ زمین کے غلاموں کو زدوکوب کریں اور بعض اوقات وہ بلاخوف وخطر اُن کو قتل بھی کر دیتے تھے۔ اُن کو اپنی جاگیروں کے اندر مکمل عدالتی و عسکری اختیارات تھے۔ وہ جاگیری عدالتوں کے مقرر کردہ جرمانوں سے زائد بھی وصول کر لیتے تھے۔ ہر جاگیر میں جاگیردار کا مضبوط قلعہ ہوتا تھا۔ جاگیردار کا محل مقامی باسیوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ عیش و آرام کا گہوارہ ہوتا تھا۔۔۔ اُس کے اردگرد گہری چوڑی خندق اور ایک بلند فصیل ہوتی تھی جس میں لوہے کے دروازے گڑے ہوتے۔ محل کے وسط میں پتھر کا ایک گول برج ہوتا تھا جس میں آقا اور اُس کا خاندان رہائش پذیر ہوتا تھا۔ محل کی مضبوط پتھریلی دیواریں مزدوروں اور نوکروں کے مقابلے میں آقاؤں کی قوت کا مظہر ہوتی تھیں۔

وہ شخص جس کا احساس خودداری اُس کو زمین کا غلام بننے سے روکتا تھا، لیکن وہ اپنے ذاتی دفاع کے لیے عسکری قوت کا حامل نہ ہوتا تو وہ جاگیر کے معزز مالک کے لیے دوستی کے مراسم بجالاتا۔ وہ اُس کے سامنے ننگے سر جھکتا تھا، اپنے دونوں ہاتھ معزز مالک کے ہاتھ میں رکھتا اور اعلان کرتا کہ وہ اِس گرامی قدر کا آدمی ہے۔ پھر وہ قسم اٹھاتا تھا کہ وہ زندگی کے آخری ایام تک سردار کا وفادار رہے گا، پھر اُس کو سردار اٹھاتا اور اس کو بوسہ دیتا۔ (۳۰۰)

انسان اپنی ذاتی کوشش اور محنت سے بلند رتبے کا حامل نہ بن سکتا تھا۔ معزز وہی ہوتا جو پیدائشی معزز ہوتا اور وہ مرتے دم تک معزز ہی رہتا۔ غلام پیدائشی غلام ہوتا تھا اور اس کی ساری زندگی غلامی کی بیڑیوں میں ہی گزرتی تھی۔ یعنی جاگیری معاشرہ کے تمام ارکان وراثتی مناصب کے ہی حق دار ہوتے تھے، الا یہ کہ کسی کی زندگی میں کوئی اچانک بڑی تبدیلی واقع ہوتی تو اُس کی زندگی کا کام تمام کر دیا جاتا اور اُس پر ضابطوں اور قوانین کو فوری طور پر لاگو کیا جاتا تھا۔

② **دینی پیشوا:** دینی پیشوا اپنے روحانی اثر ورسوخ کے باعث کسی نہ کسی حد تک جاگیری سردار ہوتے تھے اور وہ جاگیروں کے مالک بھی ہوتے۔ اُن کو جاگیری القاب عطا کیے جاتے اور وہ اپنے مرتبے کو اپنی اولاد میں بھی منتقل کرتے تھے۔ اس پر پہلے گفتگو گزر چکی ہے۔ (۳۰۱)

③ **غلام:** کلیسا نے مسلمانوں کو غلام بنانے کی اجازت دی اور ان یورپی اقوام کو بھی جو دین مسیحی کو قبول نہ کر سکے۔ ہزاروں سلاوی قیدی یا مسلمان گرجا گھروں پر تقسیم کیے جاتے تھے۔ کلیسا کا قانون کلیسا کی اراضی کی ثروت کا اندازہ اِس بات سے لگاتا کہ اُس کے ماتحت غلاموں کی تعداد کتنی ہے۔ وہ مال واسباب سے اندازہ نہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لگاتا تھا۔ غلام کو سامان تجارت شمار کیا جاتا اور مروج قانون بھی غلام کو یہی حیثیت دیتا تھا۔ کلیسا کے غلاموں پر حرام تھا کہ وہ اپنے املاک کے بارے میں کسی شخص کو وصیت کریں۔ پوپ گریگوری اول نے غلاموں پر حرام قرار دیا کہ وہ پادری بن سکیں یا آزاد مسیحی عورتوں سے شادی کر سکیں۔ قدیس تھامس اکوینی نے غلامی کی تفسیر اس طرح کی کہ یہ آدم علیہ السلام کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ (۳۰۲) یہ کلیسا کی نظر تھی جو محبت و رحمت کی تبلیغ کرتا تھا تو اُس آقا کا کیا حال ہوگا جو دنیا دار تھا اور جاگیری غلاموں کا مالک تھا؟

④ زمین کا غلام (رقیق): لفظی اعتبار سے زمین کا غلام، غلام نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا حال غلام سے مختلف بھی نہیں تھا۔ اُن دونوں کے درمیان فرق صرف اتنا تھا کہ غلام، اصل میں، یا تو مغلوب قیدی ہوتا تھا یا دین نسل مذہب میں آقا کے مخالف ہوتا تھا۔ رقیق اِس کے برعکس تھا۔ وہ جاگیرداری میں مقامی ہوتا، اور سردار کے ساتھ دین، نسل اور مذہب میں ایک جیسا ہوتا تھا۔

زمین کا رقیق اصل میں وہ آدمی ہوتا تھا جو زمین کے کچھ حصے میں کھیتی باڑی کرتا جس کا مالک جاگیردار ہوتا۔ مالک کو اختیار ہوتا کہ وہ جب چاہے بھگا دے۔ فرانس میں مالک کا یہ بھی حق تھا کہ وہ زمین سے ہٹ کر فقط رقیق کو ہی بیچ ڈالے۔ لیکن انگلینڈ میں اُس کو زمین چھوڑنے کی اجازت نہ تھی۔ زمین کے جو رقیق بھاگ جاتے تھے۔ اُن کو اسی شدت سے پکڑا جاتا، جس شدت سے غلاموں کو پکڑا جاتا۔ اور یہی صنف (زمین کے غلام) جاگیردارانہ دور میں زیادہ ہوتی تھی بلکہ وہ حقیقت میں یورپ کی مجموعی آبادی کی عکاس تھی، تھوڑی تعداد میں یورپی اشراف اور دینی پیشوا ہوتے تھے۔ حقیقت میں دہشت ناک بات یہ ہے کہ واجبات کی ایک طویل فہرست تھی جو رقیق مالک کے لیے ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے مطلق احکام کا بھی فرماں بردار ہوتا تھا، وہ جاگیر کے ساتھ مستقل طور پر جڑا ہوتا تھا۔

① تین نقد ٹیکس سالانہ
② اُس کی ذاتی پیداوار یا آمدنی کا ایک حصہ۔ نیز اس کے ریوڑ کا ایک حصہ۔
③ سال کے ایام میں بہت سارے دنوں میں بیگار کام
④ کھانے پینے میں مالک کا سامان استعمال کرنے کا کرایہ
⑤ مچھلی یا خشکی کے جانور کے شکار کی اجازت پر فیس۔
⑥ جب کوئی شخص اپنا قضیہ مالک کی عدالت میں پیش کرے تو اُس کی فیس۔
⑦ وہ مالک کے لشکر میں شامل ہوگا جب جنگ چھڑے گی۔
⑧ وہ اپنے سردار یا آقا کو فدیہ دے گا جب وہ قید کیا جائے گا۔
⑨ وہ مالک کے بیٹے کو تحفہ پیش کرے گا جب وہ گھوڑ سواروں کے مرتبے پر پہنچے گا۔
⑩ ہر اُس سامان پر ٹیکس ادا کرے گا جس کو وہ بازار میں بیچتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

⑪ وہ اپنا سامان نہیں بیچ سکتا جب تک وہ دو ہفتے پہلے مالک کا سامان بیچ نہ لے۔

⑫ وہ سردار کے بعض سامان تجارت کو لازم خریدے گا۔

⑬ تاوان یا جرمانہ جب وہ اپنے بیٹے کو تعلیم کے لیے بھیجے یا کلیسا کے سپرد کرے۔

⑭ تاوان جب وہ مالک کی اجازت کے ساتھ خود یا اس کا بیٹا جاگیر سے باہر شادی کرے۔

⑮ **پہلی رات کا حق!** وہ یہ ہے کہ سردار اپنے غلام کی دلہن کے ساتھ پہلی رات گزارے گا۔ کبھی کبھار وہ اجازت دیتا کہ وہ اس کے بدلے کوئی اجرت دے دے۔ یہ صورت **بوفیریا** میں اٹھارویں صدی تک جاری رہی۔

⑯ اس کی موت کے بعد اس کے ترکے کی وراثت۔

⑰ کلیسا کا سالانہ ٹیکس۔ انتظامی علاقے کے محافظ نگران کے وراثتی مال کا ٹیکس (۳۰۳)

یہ وہ جاگیردارنہ نظام ہے جس کا کام تمام کر کے لادین معاصر زندگی قائم ہوئی۔ محققین اس کے مظالم و مفاسد کو جس قدر بھی بیان کریں پھر بھی اُس کا حیات و فکر کے دو معاملوں میں بہت بڑا اثر تھا۔

① جاگیرداری نظام کا دین سے تعلق:

تاریخی اعتبار سے جاگیری نظام عنفوان شباب میں تھا جب مسیحیت بھی اپنے تاریخی اوج کمال میں تھی۔ پھر اِس نظام کا انہدام مسیحیت کے انہدام کے ساتھ ساتھ ہوا۔ اِس سے جدید جاہلیت نے ایک غلط نتیجہ نکالا:

جاگیرداری معاشرہ ظالم طبقاتی معاشرہ ہے۔ چنانچہ معاشرے سے ظلم کو ختم کرنے کے لیے دین کو کلی طور پر پھینکنا ضروری ہے۔ یا کم از کم اس کو واقعات کے بہاؤ میں اثر انداز ہونے سے روک دیا جائے۔ یہی فطرت پسند **مصنفین** کا نظریہ ہے جنھوں نے جدید سرمایہ دار فکر کی بنیاد رکھی۔

کمیونزم نے اس سے بھی زیادہ غلو کیا۔ اُس نے دین سے منسوب کیا کہ وہ جاگیردارانہ ظلم کے قواعد مضبوط کرنے میں طاقت ور کردار ادا کرتا ہے بلکہ اُس نے ساری ذمہ داری دین پر ڈالی کہ وہ طبقاتی شعور کی پس ماندگی کا ذمہ دار ہے اور اُسی نے محنت کش طبقے کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالی ہے۔ اُس نے فقط اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ دین ظلم کو برقرار رکھتا ہے بلکہ اُس نے دین کو عوام کے لیے افیون قرار دیا جو اُن کے سرفروشانہ جذبے کو شل کرتا ہے اور اُن کے حقوق کے مطالبے میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔!

② جمودِ مطلق کی خرابی

جاگیردارانہ نظام ایک انتہائی جامد قسم کا نظام تھا۔ جاگیردارانہ معاشرہ طبقاتی تقسیم، حقوق و واجبات، اخلاق اور رسوم و رواج، افکار و علوم اور معیشت کے احوال میں انتہائی جمود کا شکار تھا۔ اللہ کی سنت کے مطابق، جو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ نے کائنات میں اور دنیا کی تاریخ میں جاری کر رکھی ہے، یہ نظام اس لائق تھا کہ اس کا تصادم ہو۔ چنانچہ یہ جمود یورپ کی علمی بیداری اور اصلاح مذہب کی تحریک سے اپنی بنیادوں سمیت ہل کر رہ گیا۔ پھر سن ۱۸۵۹ء و مابعد ارتقاء کا زوردار دھما کا ہوا اور یہ نظام اپنی بنیادوں سمیت ملیامیٹ ہو کر رہ گیا۔ تاریخ بشریت کے مصنف نے یورپ کے علمی جمود سے ترقی کی طرف سفر کو ایک ایسی کشتی کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو ایک بندرگاہ پر لنگر انداز تھی پھر وہ کھلے متلاطم سمندر میں بغیر کسی منزل کے اور بغیر کسی نقشے کے داخل ہو گئی۔ (۳۰۴)

جب اقتصادی نظریات کو بالتفصیل پیش کیا جائے گا تو یہ دونوں نتائج بالکل روشن ہو کر سامنے آئیں گے۔ یہ دونوں نتائج زندگی کے دیگر پہلوؤں کو بھی محیط ہیں۔ کچھ پہلوؤں پر گفتگو گزر چکی ہے اور کچھ پر عنقریب آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث دوم: لادین اقتصادی نظریات

فطرت پرستی کا نظریہ (Physiocracy):

یورپ کے تنویری دور میں مفکرین اور فلاسفہ کو جس مشکل کا سب سے زیادہ سامنا تھا، وہ اقتصادی مشکل تھی۔ یہ وہ دور تھا جس میں علوم اور لٹریچر ایک قابلِ لحاظ حد تک دینی اثرات سے آزاد ہونے لگے تھے۔

اس دور میں جاگیر اور کلیسا کی سختیوں سے بھاگنے والا یورپ نئے نظاموں اور طریقوں کو تلاش کر رہا تھا، جو عام زندگی کے معاملات میں رسوم و رواج اور قرونِ وسطیٰ کے اخلاقی قوانین سے آزاد ہو۔

پیچھے گزر چکا ہے کہ علوم اور دین کے درمیان گہری خلیج واقع ہو چکی تھی، اسی وجہ سے اقتصادی نظریات دینی اقدار اور آئیڈیل سے بالکل آزاد ہو گئے۔ عصرِ تنویر میں ایسا معبود پیدا ہوا جس کو کمال سادگی کے ساتھ اپنایا گیا اور ''نیچر و فطرت'' کے نام سے پکارا گیا۔

زندگی کے تمام شعبوں میں **مذہبِ فطرت** کو اختیار کیا گیا اور اس کے لکھاری ''فطرت پسند'' کہلائے:

چنانچہ سیاست میں ہم نے دیکھا کہ ڈیموکریسی کو فطری مذہب کی بنیادوں پر کیسے قائم کیا گیا، اور علوم و فلسفے میں فطرت کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لفظ کی جگہ پر رکھا گیا۔ اس کا مقصد فقط لفظی تبدیلی نہ تھی، بلکہ اجتماعی معاملات میں ایسے لکھاری ظاہر ہوئے جو سمجھتے تھے کہ **فطری معاشرہ**، ہی حقیقی مثالی معاشرہ ہوتا ہے اور اُس کی طرف لوٹنا پوری انسانیت کے لیے ضروری ہے، اخلاق میں **فطری اخلاق** کا تصور پیدا ہوا بلکہ بڑے بڑے فلاسفہ نے ''**فطری دین**'' کے موضوع پر کتابیں لکھیں! شاید کہ فطری مذہب کی تطبیقوں میں سے سب سے زیادہ واضح تطبیق معیشت کے میدان میں ظاہر ہوتی ہے جس کو ہم بیان کرنے چلے ہیں۔

''بڑے اقتصادی نظریات'' کا مصنف اس نظریے کی عمومی تاریخ میں بیان کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

پچھلی صدیوں میں لوگوں نے قدیم لوگوں پر اعتماد کیا جیسے ارسطو اور کلیسا کے آبا و اجداد، وہ ان سے ظاہری زندگی سے ماورا اُمور کے بارے میں علم و معرفت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان اکابر کی کتابوں سے مختلف مظاہر کی تفسیر حاصل کرتے تھے۔ انھوں نے گہرے غور و خوض اور تجربے کی جگہ پر منطقِ استنباطی کو رکھ دیا۔

کچھ عقل مند لوگوں نے زیادہ گہرائی سے جدید علوم حاصل کرنا شروع کر دیے، انھوں نے بذاتِ خود فطرت کا مطالعہ انتہائی محنت اور موضوعی اسلوب کے ساتھ شروع کر دیا، مثلاً یہ زمین کائنات کا مرکز نہیں بلکہ سورج

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اردگرد گھوم رہی ہے۔ ہاروے نے انکشاف کیا کہ انسان کی رگوں میں دورانِ خون کا ایک خاص نظام ہے، نیوٹن نے کشش ثقل اور حرکت کے نظریات پیش کیے، اس کے علاوہ کئی اہم اور پُر مغز افکار پیش کیے گئے لیکن وہ اپنے درجے میں کم تر تھے۔

چونکہ قدیم مصادر طبعی دنیا کے متعلق اپنے نظریات میں ٹھوکر کھا گئے لہٰذا یہ نتیجہ نکالا گیا کہ وہ انسانی اخلاق اور رویوں کے بارے میں بھی یقیناً غلط ہیں۔

ہر چیز کے بارے میں سولات اور شکوک شبہات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ ٹھوس اور مضبوط علم کے میدان میں اور فلسفے کے میدان میں فرق کو مٹا دیا گیا۔ لکھاری اور فلسفی انسانی نظم کے بارے میں ویسے ہی بحث کرنے لگ گئے جیسے وہ غیر انسانی اشیا کے بارے میں بحث کرتے تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انسان کائنات کا فقط ایک جز ہی ہے، وہ باقی مخلوقات سے الگ تھلگ کوئی ایسی مخلوق نہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے خصوصی توجہ سے پیدا کیا ہو اور خاص مقام دیا ہو۔

مختلف واقعات کے اچھے برے نتائج اور انسانی اخلاق کے اسباب پر ویسے ہی بحث ہونے لگی جیسے طبعی قوانین پر ہوتی ہے۔ واقعات کے اندر اصل کارگر حقیقی قوت کو اللہ تعالیٰ کے ارادے کے بجائے طبعی قوانین کی طرف منسوب کیا گیا۔ اِس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کلیسا اور مقدس کتابوں کی راہنمائی کی بجائے اپنی عقل پر انحصار کریں۔ (۳۰۶)

عصر تنویر یعنی یورپ کا روشن خیالی کا مخصوص دور اپنی عام زندگی کے نظم وضبط میں اللہ اور شریعت کی حاکمیت کا صراحت سے انکار کرتا ہے۔ یا کم از کم وہ قوانین فطرت کی آڑ میں دین سے منہ موڑتا ہے۔ (جیسا کہ اس کی وضاحت بعض فلاسفہ نے کی ہے) وہ کلیسا اور وحی سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کو 'قانون طبعی' قرار دیتے ہیں۔

اِس طرزِ فکر کے اقتصاد پر بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے جیسے کہ سول نے اس کی وضاحت کی ہے:

''درمیانی ادوار میں یورپ کے مختلف جاری افکار پر آخرت کی فکر حاوی تھی، اگرچہ وہ انسانوں کی عام عادات اور رسوم رواج پر حاوی نہیں تھی۔ اِس فکر کے مطابق انسان کی دنیاوی زندگی فقط ایک ایسی جگہ ہے جس میں انسان موت کے بعد والی زندگی کے لیے تیاری کرتا ہے تاکہ وہ عذاب سے بچ سکے اور ثواب حاصل کر سکے۔ انسان دکھ اور تکلیف اس لیے برداشت کرے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ اس کی مستقبل کی زندگی کے لیے ایک مقدمہ ہے۔ لیکن یہ فکر بتدریج کمزور ہو گئی اور اس کی جگہ پر یہ فکر پیدا ہوئی کہ معاشرتی رسوم ورواج کو درست کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ دنیاوی خوشحالی کو حاصل کیا جائے۔

اب سارا زور اس بات پر تھا کہ زمین پر زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت کیا جائے اور زمین کے فوائد حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ علوم پیدا کیے جائیں اور ایجادات سامنے لائی جائیں۔ ہر چیز میں مادی منافع کو ہی مقصد بنایا گیا اور پیداوار میں اضافے کے لیے بہتر سے بہتر اسلوب تلاش کیا گیا۔ لوگ مقابلے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اِسی میدان میں آگے بڑھنے لگے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا کہ کیا 'فلسفہ' انسانی نظاموں کی اصلاح اس طرح سے نہیں کرسکتا جس طرح سے مادی اشیا کا مطالعہ کیا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ تھا: اصل بات یہ ہے کہ انسان 'عقل' کو ایسے طریقے سے استعمال کریں کہ وہ خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔ چنانچہ انھوں نے اس مقصد کے لیے ایسی منصوبہ بندیاں اور طریقے بھی وضع کرنے شروع کردے جو ایک آئیڈیل زندگی یا یوٹوپیہ کو تشکیل دے سکیں۔

وہ لوگ جو ایمان باللہ کو مکمل طور پر پھینک چکے تھے، ان پر لازم تھا کہ وہ اِس کا متبادل تلاش کریں، اور انھوں نے اس کا متبادل فطرت یا نیچر کو تلاش کیا۔ وہ لوگ جو دین کے ساتھ چمٹے رہے، اگرچہ زبانی کلامی سہی اور ان کی اکثریت بھی نہیں تھی، انھوں نے یہ عقیدہ بنایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادے کو فطرت اور اس کے قوانین کے ذریعے سے ظاہر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارادہ براہ راست نہیں ہوتا۔ اس طرح سے فطرت یا نیچر کا فقط وجود نہ تھا بلکہ وہ ایک مستقل قابل اطاعت چیز بن گئی جس کی مخالفت تقویٰ اور اخلاق کے منافی سمجھی گئی۔ (۳۰۷)

نیچر پرست فلاسفہ کی نظر معاشرے کے نظم کے حوالے سے مختلف تھی۔ خصوصاً دولت کا معاشرے میں عادلانہ طریقے سے تقسیم ہونا کیسے ممکن ہے، ایک مشکل امر تھا۔ تاہم تمام فطرت پسند فلاسفہ نے ''آزادی عمل'' کو اپنے افکار کا مشترکہ نقطہ بنایا، جس کی تفصیل پچھلے ابواب میں گزر چکی ہے۔ فلاسفہ کا مشہور نعرہ تھا ''لوگوں کو محنت کرنے دو اور لوگوں کو اپنا رستہ بنانے دو'' یا دوسرا شعار یہ تھا ''معاملات کو بغیر کسی رکاوٹ کے کھلا چھوڑ دو، فطرت بذات خود اعتدال پیدا کردے گی''

فطرت پسند فلاسفہ کا خیال تھا کہ عملی طور پر بچا کھچا جاری جاگیری نظام کا حل یہ ہے کہ آزادی عمل کے نعرے کو بلند کیا جائے، اس سے دولت کی غلط تقسیم سے پیدا ہونے والا معاشرتی ظلم حل ہو جائے گا،

انھوں نے اپنے اقتصادی نظریے کی علمی بنیاد نیوٹن کے نظریے سے اخذ کی جو کہ ایک سراسر غلط طریق کار تھا۔ نیوٹن کا نظریہ، اجرام فلکی کی طبعی حرکات پر مشتمل تھا، ستارے اپنے طبعی قانون کے مطابق اپنے اپنے مداروں میں کیسے گردش کرتے ہیں اور اُن میں کسی قسم کا تصادم کیوں واقع نہیں ہوتا۔ فطرت پرست فلاسفہ نے ان باتوں سے یہ نتائج نکالے کہ اجرام فلکی کی طرح لوگوں کو اُن کی طبیعت کے مطابق چھوڑ دیا جائے اور اُن پر خارجی قوانین لاگو نہ کیا جائیں تو اُن کے احوال خود بخود منظم ہو جائیں گے اور طبعی قانون کے مطابق چلنے لگیں گے۔ طبعی قانون کسی تعارض اور اضطراب کے بغیر افراد اور معاشرے کو مثالی زندگی پر گامزن رکھنے کی ضمانت ہے۔ ہم پچھلے باب میں یہ معلوم کرچکے ہیں کہ منڈیوں اور کارخانوں کے مالکان نے اِس طبعی و فطرتی مذہب کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے کیسے استعمال کیا۔ وہ جاگیروں کے پابند مزدور طبقے کو اِس نظریے کے نام پر حاصل کرنا چاہتے تھے اور ریاست کے واسطے سے اپنی نجی ملکیتوں کا قانونی تحفظ چاہتے تھے، اِس کے لیے انھوں نے فطرت کے قانون کا سہارا لیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رین ڈال اس بارے میں کہتا ہے:

''اس طرح سے یہ علم یعنی سیاسی اقتصادی علم بظاہر ایک مصلحت کی کوشش میں نمودار ہوا تا کہ دولت کی معاشرتی تقسیم پر مبنی فزکس حاصل کی جا سکے لیکن حقیقت میں وہ اُن اہداف کے حصول کا منظم جواز تھا جس کے ذریعے سے مال کو جمع کرنے میں زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو سکے۔ اور اس مقصد کے لیے جدید بشری دفطری علوم سے فائدہ اٹھایا گیا۔'' (۳۰۸)

کلاسیکل سرمایہ دارانہ مکتبِ فکر:

یہ مکتب فکر، فطرت کے مکتب فکر کی ارتقائی شکل تھی جو مختلف اقتصادی و معاشرتی حالات کے تحت پیدا ہوا۔ اِس کی منطقی غرض و غایت تو یہ تھی کہ غریب طبقے کو زیادہ سے زیادہ آسانی اور اعتدال حاصل ہو اور ایسے مفید منصوبے اور طریقے اختیار کیے جائیں جو دولت مند طبقے کے مقابلے میں غریبوں کے لیے بھی منصفانہ حقوق کے ضامن ہوں۔

لیکن عملاً اس کے برعکس صورت حال واقع ہوئی۔ اس مکتب کے لیڈروں نے مکمل صراحت کے ساتھ لالچ اور استحصال کی دعوت دی۔ مال دار طبقہ جن غیر انسانی طریقوں سے غریبوں کو لوٹتا تھا، اُن کو درست قرار دیا گیا۔ اُن کے نعرے یعنی حریت فرد اور حریت عمل، فرد کی ذاتی مصلحت کے لیے نہ تھے بلکہ سُناروں، تاجروں اور کارخانے دار ذخیرہ اندوزوں کی آزادی کے لیے تھے۔

فطرت پرستی کا مکتب فکر اقتصادی لحاظ سے زمین کو بڑی قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن کلاسیکی سرمایہ دار مکتب نے محنت و مزدوری کو اعلیٰ قدر و قیمت دی۔ اُس کا مقصد فقط یہ نہ تھا کہ معاشرہ زراعت کے دور سے نکل کر صنعت کے دور میں داخل ہو بلکہ یہ مکتب فکر جدید طبقے کی خواہشات کا ترجمان تھا جو اپنے مالی اثر و رسوخ کو معاشرے پر لاگو کرنا چاہتا تھا اور مزدور طبقے کو زراعت سے ہٹا کر اپنے زیر استعمال لانا چاہتا تھا۔

انھوں نے معاشرے کی خوشحالی اور ترقی کا نعرہ لگایا اور علمی اصول و قواعد کے پردے میں ایک ایسے رجحان کی دعوت دی جو کسی بھی اخلاقی پابندی سے آزاد تھا۔ اُن کے لا اخلاقی میلانات کوئی ڈھکے چھپے نہ تھے، یہ باتیں ان کی مشہور کتابوں میں واضح ہیں، جن کو آج بھی سرمایہ دار دنیا اپنا قیمتی ورثہ شمار کرتی ہیں۔ اگرچہ اس مکتب کے اکثر نظریات تبدیل ہو چکے ہیں یا ارتقا پذیر ہو چکے ہیں اور کچھ نظریات کو ناممکن قرار دیا جا چکا ہے۔

کلاسیکل سرمایہ دارانہ مفکرین میں سب سے زیادہ مشہور آدم سمتھ، مالتھس اور ریکارڈو ہیں۔ ان کے بل بوتے پر انفرادیت پسند سرمایہ داری قائم ہوئی اور جوان ہوئی۔ اِن میں سے ہر ایک کے افکار کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(الف) آدم سمتھ (۱۷۹۰ء):

آدم سمتھ استعمار کا فلسفی اور سرمایہ داری کا کاہنِ اعظم تھا۔ اس کی کتاب ''ثروۃ الامم'' اقتصادیات پر سب سے اہم کتاب ہے جس کا آنے والے ادوار پر سب سے زیادہ اثر پڑا۔ روبرٹ ڈاونز اپنی کتاب ''وہ کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی'' میں لکھتے ہیں:

ثروۃ الامم کتاب کے اندر بنیادی نظریہ، مکیاولی کے نظریہ کا عکس ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانی سرگرمی کا بنیادی عامل فقط اس کی ذاتی منفعت ہے۔ دولت جمع کرنے کے لیے محنت کرنا انسانی ذاتی مفاد کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ انسان کی جتنی بھی سرگرمیاں ہیں ان کے پس پردہ انانیت اور ذاتی غرض چھپی ہوتی ہے۔ آدم سمتھ نے لوگوں کے سامنے یہ عقیدہ ظاہر کیا کہ ذاتی غرض اور مفاد پرستی کوئی قابل نفرت صفت نہیں جس سے بچنا واجب ہو بلکہ اِس کے برعکس یہ ایک ایسی چیز ہے جو معاشرے میں خیر اور بھلائی کو عام کرتی ہے۔ پوری قوم کی خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی ذات کو مضبوط کرنے کے لیے بغیر کسی پابندی کے آخری حد تک کوشش کریں۔ ہمیں اپنی غذا کے حصول کے لیے شراب فروش، نان بائی یا گوشت فروش کے رحم و کرم پر انحصار نہیں کرنا ہوگا بلکہ وہ اپنے ذاتی فائدے کے لیے غذا پیش کریں گے۔ جب ہم ان سے مخاطب ہوں گے تو کسی انسانی ہمدردی کا سوال نہیں کریں گے بلکہ ہم اُن کا مادی فائدہ پیش کریں گے۔ ہم اپنی ضروریات پر گفتگو نہیں کریں گے بلکہ ان کے ذاتی فائدے اور نفع کو بیان کریں گے۔ (۳۰۹)

آدم سمتھ کے افکار کے اثرات:

آدم سمتھ کے افکار میں غیر اخلاقی روح بھری ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود اس کو وہ وسیع شہرت حاصل ہوئی جو اُس کے کسی ہم عصر کو حاصل نہ ہو سکی۔ مفکرین اور مصنفین نے اُس کو ''جدید اقتصادیات کا باپ'' قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سمتھ نے سرمایہ دار طبقے کو اپنی خدمات سے نوازا۔ اُس نے سرمایہ داروں کو مختلف وسائل استعمال کرنے کی تجاویز پیش کیں جبکہ اُس وقت کسان اور مزدور انتہا درجے کے مسائل کا شکار تھے۔

سمتھ کی کتاب فقط انگلینڈ اور یورپ کے مسائل حل کرنے کے لیے نہ تھی بلکہ وہ استعمار کی انجیل گردانی گئی، جس نے پوری دنیا کے برّ اعظموں میں اودھم مچا دیا، قوموں کے وسائل کو لوٹا گیا اور نسلوں کو غلام بنایا گیا۔ آدم سمتھ کی کتاب میں سب سے زیادہ مشہور باب وہ ہے جو استعمار سے متعلق ہے۔

مارکس لرز کہتا ہے اس کتاب کے اکثر قارئین وہ تھے جنھوں نے اس کتاب کی آرا سے شخصی طور پر فائدہ اٹھایا۔ یہ وہ لوگ تھے جو جدید قسم کے تاجر، مختلف ارکان پارلیمنٹ کے احباب اور جامعات کی ثقافتی انتظامی کمیٹیوں کے دوست تھے۔ کتاب نے اردگرد کی قوموں پر بہت زیادہ اثر ڈالا اگرچہ انھوں نے کتاب کو براہ راست

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں پڑھا۔اس کتاب کے عالمی سیاسی اور اقتصادی افکار پر گہرے خوف ناک اثرات واقع ہوئے۔(۳۱۰)

سمتھ نے دینی میلانات رکھنے والے معارض افکار کو قبول نہ کیا چنانچہ اس کے بارے میں رسکن کہتا ہے:

سمتھ بیوقوف اور کمزور عقل کا انسان تھا جس نے جان بوجھ کر لوگوں کو دین کی گستاخی اور استہزا کی اجازت دی۔ وہ کہتا تھا کہ لوگوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے بے عقل خدا سے نفرت کریں، اس کی نصیحتوں کی نافرمانی کریں اور اپنے قریبی رشتے داروں کے مال کو لالچ سے دیکھیں۔آزاد مفکرین نے انسانی بنیادوں پر سمتھ کا معارضہ کیا، اُن کا خیال تھا کہ سمتھ کارخانوں اور محنت کاروں کے مالکین کا آلہ کار ہے۔کیونکہ انھوں نے حریتِ تجارت کا اُصول و منہج سمتھ کی آرا سے لیا ہے۔سرمایہ داروں نے موقع کو غنیمت جانا اور ہر اس اصول کو بگاڑ ڈالا جو مزدور کاشت کاروں اور عام معاشرے کی رعایت پر مبنی تھا۔انھوں نے حریت کی یہ تشریح کی کہ انسان اپنے ذاتی مفاد کے لیے مطلق طور پر آزاد ہے وہ حکومت کی طرف سے کسی مداخلت یا پابندی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔(۳۱۱)

(ب) مالتھس (۱۸۳۴ء):

سمتھ سرمایہ داری کا باپ تھا اور مالتھس اُس کا بہت بڑا وکیل تھا۔سمتھ نے مفلسوں اور استحصال کے شکار طبقوں کے بارے میں سلبی موقف اختیار کیا لیکن مالتھس نے اِس طبقے کے بارے میں ایجابی کردار ادا کیا، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ایجابی کردار ان کی حمایت کی بجائے سراسر ان کے خلاف تھا۔

اٹھارویں صدی کے اندر کونڈورسی، گاڈون، تھامس پین جیسے مصنفین کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوئی جو حالات کے بارے میں بہت خوش امید تھی انھوں نے ایک فطری معاشرتی مکتبہ فکر کی تشکیل کی۔اُن کا ایمان تھا کہ جب ہر شخص اپنے مخصوص حقوقِ انسانی سے متمتع ہونا شروع کردے اور لوگوں کے درمیان مصنوعی رکاوٹوں کو دور کر دیا جائے تو ایک خیالی جنت یا یوٹوپیا وجود میں آسکتی ہے۔اُن کے بیان کے مطابق فطرت یا نیچر نے نوعِ انسان کے لیے تمام لوازمات وافر مقدار میں تیار کیے ہیں، اب انسانوں پر فقط یہی لازم ہے کہ وہ اس کو اچھے طریقے سے تقسیم کریں۔

مالتھس کے منحوس نظریے کو اُس کے معاصر لکھاریوں نے اعتراض کا نشانہ بنایا، جس کی وجہ سے مالتھس کو اُن کا رد لکھنا پڑا جو ۱۷۹۸ء میں ایک چھوٹی کتاب کی شکل میں شائع ہوا جس کا عنوان تھا ''آبادی میں اضافے کے قواعد پر چند باتیں''۔اس کتاب میں اُس نے متعلقہ موضوع پر اپنی صریح رائے پیش کی۔

سول کہتا ہے؟ مالتھس کا نظریہ جوہری اعتبار سے نہایت سادہ تھا۔اس کا کہنا تھا کہ آبادی میں اضافہ ضرب کے قوانین کے مطابق بڑھتا ہے یعنی ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲۔۔۔۔جبکہ غذائی پیداوار میں اضافہ اتنی تیزی سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے بڑھنے کی رفتار سادہ اعداد کے مطابق ہوتی ہے یعنی ۲، ۴، ۶، ۸، ۱۰، ۱۲، ۱۴،۔۔۔(۳۱۲)

مالتھس نے حقوقِ انسانی پر اپنا اعتراض واضح کیا، اس نے تھامس پین پر رد کرتے ہوئے کہا: جب کوئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسان دنیا میں آتا ہے تو اس سے پہلے دنیا پر کچھ لوگ قابض ہوتے ہیں اور وہ دنیا کے وسائل کو ملکیت بنا چکے ہوتے ہیں، اسے اپنے والدین سے بھی کوئی طبعی مدد حاصل نہیں ہوتی، جب تک معاشرہ اس کی خدمات سے بے نیاز ہو، تو وہ اپنے حق کے لیے ایک روٹی کے ٹکڑے کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے دنیا میں موجود رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ مالتھس نے اُس پروگرام پر بھی تنقید کی جس کو حکومت انگلینڈ نے فقرا کی مدد کے لیے تشکیل دیا تھا، مالتھس کا کہنا تھا کہ فقرا کے متعلق حکومت کے قوانین فقرا کی حالت کو مزید سنگین کر دیں گے اور اس کی دو وجوہات ہیں:

① یہ قوانین آبادی میں اضافے کا سبب بنیں گے جبکہ زمین کی پیداوار آبادی کے مقابلے میں زیادہ نہ ہو گی۔

② رقم کی وہ مقدار جو فقرا کی بہبود و ترقی پر خرچ ہو گی وہ ضائع ہو جائے گی کیونکہ یہ غیر پیداواری طبقہ ہے اور مزدوروں کو دی جانے والی رقم کم ہو جائے گی، جو کہ پیداواری سرمایہ ہے۔ (۳۱۳)

مالتھس نے احسان پر مبنی رویوں کو مکمل طور پر ممنوع قرار دیا۔ اس کے نزدیک احسان چاہے حکومت کی طرف سے ہو یا افراد کی طرف سے پسندیدہ رویہ نہیں۔ وہ کہتا ہے: ہر وہ رقم جو معاشرے کی حالت درست کرنے کے لیے خرچ کی جائے، وہ کوئی نہ کوئی مصیبت لاتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معاشرہ ان خاندانوں کے ساتھ احسان و تعاون سے انکار کر دے جو اپنی معیشت کے وسائل حاصل کرنے سے عاجز آ جاتے ہیں۔ (۳۱۴)

مصیبت یہ تھی کہ مالتھس جو اِن افکار کو پیش کر رہا تھا، سیکولر انسان نہ تھا بلکہ پادری کے درجے کا دینی راہنما تھا۔ وہ دین کا نمائندہ تھا جو سرمایہ دار طاغوتوں کے رویوں کو درست قرار دے رہا تھا۔ وہ محروم طبقوں کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کو حرام قرار دے رہا تھا۔ وہ اپنے افکار کو **فطرت کا قانون** قرار دیتا تھا جو اللہ تعالیٰ کے ارادے پر مبنی ہوتے ہیں۔ کیا ہم سوچ سکتے ہیں کہ اس خطرناک فکر کا کتنا گہرا اثر واقع ہوا ہو گا، خصوصاً اُن لوگوں پر جو دین سے آزاد تھے یا دینی پیشواؤں سے بے زار تھے۔

مالتھس کے افکار کے اثرات:

ڈاؤنز کہتا ہے: مالتھس کے نظریات کا بڑی خوش دلی اور جوش و خروش کے ساتھ استقبال کیا گیا، مالدار اور صاحب اقتدار لوگوں نے اِس کو ہاتھوں ہاتھ لیا، انھوں نے اِس بات کو رد کر دیا کہ معاشرے میں فاقہ کشی کا وجود معاشرے کے لیے سب سے بڑا دھبہ ہے۔ اب فاقوں کی توجیہ یہ کی گئی کہ جلد شادی کرنا اور زیادہ بچے پیدا کرنا اس کا سبب ہے۔ اور معاشرے میں دولت کی غلط تقسیم کا کوئی منفی کردار نہیں اور وہ لائق ملامت بھی نہیں۔ (۳۱۵)

سول کہتا ہے: مالتھس کا نظریہ اُن لوگوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا جو سرمایہ داری کی ترقی کے سبب بے تحاشا منافع حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ مزدوروں اور اجیروں نے سرمایہ داروں کے خوب لتے لیے۔

مالتھس اُن کے دفاع میں کھڑا ہوا۔ اُس نے اعلان کیا کہ انسانوں کی بدبختی کا سبب یہ ہے کہ وہ فطرت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے قوانین کو نظر انداز کرتے ہیں یعنی آبادی میں اضافے کا قانون۔ اِس قانون سے جہالت کے سبب کوئی بھی معاشرتی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا، چاہے جو بھی اقتصادی نظام لاگو کیا جائے، انسانوں کی بدبختی کا علاج اُن کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ معاشرے کے ادنیٰ طبقوں کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کو حقیقی موقف کی پہچان کرائیں۔ مالتھس کے ان نظریات نے علم اقتصاد کو خونی علم بنا دیا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ مالتھس اور سمتھ جیسے مفکرین کے نظریات یورپی فکر کا محض ایک جز ہیں جو کہ ہمارے لیے دہشت اور تعجب کا باعث ہیں۔ اس کی وجہ جاننا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ یورپی فکر نے ہمیشہ شاذ نظریات اور لا اخلاقی انتہا پسند افکار کو ہی گلے سے لگایا، حالانکہ نسبتاً معتدل اور موضوعی نظریات بھی وافر مقدار میں موجود تھے۔

یورپ کے یہی مظاہر ہم نے پچھلے ابواب میں بھی دیکھے جیسے میکیاولی، مارکس، فرائیڈ کے نظریات اور اسی طرح دیگر ادبی رجحانات۔

ہمارے خیال کے مطابق یورپ کے غلو کا زیادہ بڑا سبب اُس کی جاہلی نفسیات ہے جو اس کی جڑوں میں اتری ہوئی ہے۔ ایک چھوٹا سبب اِس کے غیر فطری معاشرتی افکار و نظریات بھی ہو سکتے ہیں۔ (۳۱۶)

حالات چاہے جو بھی ہوں مالتھس نے اقتصادی اور معاشرتی علوم پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے اور بعض باتوں پر مفکرین نے بہت جھگڑا بھی کیا۔ مالتھس کا سب سے گہرا اثر یہ ہے کہ اس نے **فطرت کے چناؤ کا قانون** پیش کیا یعنی فطرت ہمیشہ بہتر چیز ہی چنتی ہے۔ یہ وہ بات تھی جس کی بنیاد پر ڈارون نے زندہ اجسام کے ارتقا کا نظریہ پیش کیا۔ بالواسطہ طور پر مالتھس نے ان لوگوں پر بھی اثر ڈالا جو نظریہ ارتقا کے باعث فکری انقلاب سے دوچار ہوئے۔ (۳۱۷)

برٹرینڈ رسل بڑے وثوق سے یہ بات کہتا ہے کہ مارکس نے مالتھس کے نظریہ آبادی سے کچھ چرایا ہے۔ (۳۱۸)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کمیونزم کا نعرہ ''مَنْ لا یَعْمَلُ لا یَأْکُلْ. یعنی جو کام نہیں کرسکتا، اُسے خوراک نہیں ملے گی'' اُس وقت ظاہر ہوا جب مارکسزم مالتھس پر اس لیے لعنت کر رہا تھا کیونکہ وہ محنت کش طبقے کے مفادات کا دشمن تھا۔

(ج) ریکارڈو:

ڈیوڈ ریکارڈو کلاسیکل اقتصادی فکر کا تیسرا مرکز و محور ہے۔ یہ یہودی تھا اور ایک کمپنی کا مالک تھا جس کی وجہ سے وہ نہایت مالدار طبقے میں شمار ہوتا تھا۔ جب وہ پینتیس سال کا ہوا۔ (۳۱۹)

یہاں ہم کچھ دیر ٹھہرتے ہیں۔

''سود سرمایہ داری کا ستون اور مرکز و محور ہے۔ اسی طرح سود یہودیوں کا ایسا لازمی وصف ہے جیسے سایہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے اصل سے جڑا ہوتا ہے۔کلیسا کا یہ نظریہ درست تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ تمام سود خور یہودی ہوتے ہیں۔ یہود سود کھاتے تھے اور لوگوں کی ضروریات زندگی پر قبضہ جما کے بیٹھ جاتے تھے تاکہ سونا اکٹھا کر سکیں۔ یہود کی یہ حرکت فقط اُن کے ساتھ خاص نہیں، یہ حرص تمام انسانوں سے ممکن ہے۔ یہود کی اصل خرابی یہ تھی کہ وہ اِس کو دینی فریضہ سمجھتے تھے جیسا کہ اُن کی مقدس کتاب 'تلمود' اُن پر لازم کرتی تھی کہ وہ اَن پڑھ لوگوں (غیر یہود) کے ساتھ ایسے ہی سلوک کریں۔

یہود بھاری بھرکم رہن کے ساتھ بڑے بڑے سود لیتے تھے جیسا کہ ''اسلحے کے تاجر'' میں مذکور ہے۔ یہود کا یہ کردار محدود رہا حتی کہ یورپ کی مشہور **اصلاحِ مذہب کی تحریک** (Reformation) کے ساتھ ساتھ دو بڑے انقلاب بھی پیدا ہو گئے یعنی

علمی انقلاب (Renaissance) اور **فرانسیسی انقلاب** (French Revolution)۔

اُس وقت یہود نے اجتماعی واقتصادی تبدیلی کے مرحلے کو ایک اچھا موقع جان کر موقع سے فائدہ اٹھایا تاکہ وہ ''**جیتو**'' سے نکل سکیں اور کلیسا اور جاگیروں کا نظام تباہ کر سکیں۔

کلیسا یہود کا دینی دشمن بھی تھا اور سود کو برا سمجھنے کی وجہ سے اُن سے نفرت بھی کرتا تھا۔ اسی طرح جاگیردار بھی یہود سے نفرت کرتے تھے کیونکہ وہ اپنی جاگیروں سے خوب کما رہے تھے۔

معاشرے کو گرانا اور اُس کی بنیادوں کو ملیامیٹ کرنا یہود کا اپنے ہدف کی طرف پہلا قدم تھا۔ یہود کی منزل مقصود یہ تھی کہ وہ ساری انسانیت کو اپنا ماتحت بنانا چاہتے تھے۔ کلیسا اور جاگیرداری کی تبدیلی نے انہیں موقع فراہم کیا کہ وہ جاگیرداروں کے مقابلے میں ایک طاقت ور حریف کا کردار ادا کریں کیونکہ صنعتی دور کی ابتدا ہو چکی تھی اور مال فقط دو طبقوں کے ہاتھوں میں محصور تھا۔

① جاگیروں کے مالکان، چاہے وہ کلیسا کے نمائندے ہوں یا کوئی اور۔

② سود خور یہودی۔

صنعت کاروں کو اپنا صنعتی نظام جاری رکھنے کے لیے ایک بڑی مقدار میں سرمایے کی ضرورت پیش آئی پھر اُس کو چلانے کے لیے مزدوروں کے طبقے کی ضرورت ہوئی۔ مزدوروں کے حصول کے لیے **فطرت پسندی** کے نظریے کو اجاگر کیا گیا جس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ مزدوروں کی بڑی مقدار حاصل کرنے کے لیے **حریت عمل** کا نعرہ لگایا گیا اور اُس کو انسان کے فطری حقوق میں سے ایک حق قرار دیا گیا۔

مال کے حصول کے لیے صنعت کاروں پر لازم تھا کہ وہ دو طبقوں میں سے کسی طبقے سے قرض طلب کریں چنانچہ انھوں نے عملاً اس کی کوشش یہود کے واسطے سے کی۔

نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ جاگیرداروں نے صنعتی مقاصد کے لیے سرمایہ کاری اور قرض فراہمی سے ہاتھ روک لیا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی کہ وہ اپنے تعاون کے ذریعے اپنے مالی اور اجتماعی مرکز کو توڑنے اور ایک طاقت ور حریف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ صنعت کاری کی نشوونما جاگیروں کی کمزوری کی بنیاد پر تھی۔ ایک اعتبار سے دیکھیں تو صنعت کاری اپنے ابتدائی مرحلے میں تھی، یہ ضروری نہ تھا کہ وہ اپنے مطلوبہ نتائج دے سکے چنانچہ جاگیردار مشکوک نتائج کے حامل معاملے میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

دوسرا طبقہ یعنی یہود صنعت کاری پر سرمایہ خرچ کرنے کے لیے تیار ہو گئے، وہ برے نتائج سے خوف زدہ نہ تھے۔ لیکن یہ سرمایہ کاری سونے کے پجاریوں کی طرف سے محض ایک احسان نہ تھا اور نہ ہی ان کی نظر محدود تھی بلکہ وہ اپنی سرمایہ کاری کے نتائج کے بارے میں باوثوق تھے۔

اوّلاً: وہ زراعتی جاگیردار معاشرے پر اپنے کینے کی تسکین چاہتے تھے کیونکہ یہ معاشرہ اُن کی تذلیل وتحقیر کرتا تھا۔ انھوں نے ایک نئے طبقے کی فضا تیار کی جو قیادت سنبھال سکے اور وہ ان کی شفقت ونگرانی کے تحت ہو۔

ثانیاً: وہ اپنے قرض کے نتائج سے بھی مطمئن تھے کیونکہ یہ قرض ایک طرف بھاری بھرکم رہن کے بدلے تھے اور دوسری طرف خاصے بڑے منافع کے حامل تھے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بعض صنعتوں کے مالکان خود یہودی تھے اور ان میں سے ایک ریکارڈو تھا۔ اس طرح صنعتی ترقی یہودی سرمائے کے قبضے میں واقع ہوگئی۔ بتدریج یہ قبضہ مستحکم ہوتا گیا حتی کہ عالمی صنعت کاری پر اُن کا اقتصادی غلبہ اِس حال تک پہنچا جس سے آج کوئی بھی غافل نہیں۔ (۳۲۰)

اب ہم دوبارہ ریکارڈو پر بات کرتے ہیں۔

سمتھ نے یہودیوں کے لیے بہت بڑی خدمت سرانجام دی۔ اُس نے اقتصادی اعتبار سے زمین کی قدر و قیمت گھٹا کر صنعتی محنت کو بلند تر قرار دیا۔ لیکن اس کے باوجود عملی طور پر جاگیرداروں کا اثر ورسوخ کم نہ ہوا، ایک ایسے علمی نظریے کی ضرورت تھی جو جلد بازوں کو بڑی تیزی کے ساتھ آگے دھکیل سکے، کیونکہ اس وقت کے لوگ ہر علمی چیز کی تصدیق کے لیے تیار رہتے تھے اور آخری حد تک اس سے مرعوب رہتے تھے۔

یہ علمی نظریہ یہودی ریکارڈو کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا:

ریکارڈو کا خیال تھا کہ اقتصادی مشکلات اور معاشرتی اتار چڑھاؤ کا بڑا سبب زمین کا پیداواری منافع ہے نہ کہ تجارتی نفع۔

زمین کا پیداواری منافع، پیداوار کا وہ حصہ ہے جو زمین کا مالک اپنی زمین کے کرایہ کی صورت میں لیتا ہے جب کہ اصل کاروباری نفع، صنعتی سرمایہ کاری کی کمائی ہے۔ ریکارڈو سمتھ کے نظریے پر اعتماد کرتا ہے اور صنعتی محنت کو بلند قدر و قیمت دینے کی یہ علّت بیان کرتا ہے کہ زمین کا پیداواری نفع محنت مزدوری کی قیمت نہیں ہوتا بلکہ وہ دولت کے ایک قدرتی مرکز (زمین) کی ملکیت سے پیدا ہوتا ہے۔

ریکارڈو نے مالتھس سے اجرتوں کا قانون اخذ کیا جس کے مطابق ریکارڈو کا خیال تھا کہ جب جاگیردار زیادہ منافع حاصل کرنا چاہیں تو وہ زمین کا استحصال نہیں کر سکتے بلکہ وہ اُس ٹھیکے دار کا استحصال کریں گے جو کھیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مزدوروں کو بھاری اجرتیں دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی پیداوار کی اچھی قیمت لگانے سے بھی عاجز ہوں گے کیونکہ منڈی میں مقابلہ بازی کی فضا ہوتی ہے جو انہیں اچھی قیمت لگانے سے روک دے گی۔

ریکارڈو اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ زمین کا پیداواری منافع اپنے جوہر کے اعتبار سے کاروباری منافع کا دشمن ہے۔ کاروباری منافع ایک لمبی مدت کے دوران بتدریج زوال پذیر ہوتے ہیں اور بالآخر صفر تک پہنچ جاتے ہیں جب کہ اس دوران اراضی کے مالکان اقتصادی بہاؤ کے مالک بن جاتے ہیں۔

ریکارڈو کے نظریے کا پہلا ثمرہ یہ نکلا کہ سرمایہ داروں نے انگلینڈ کی حکومت کو اس بات پر مطمئن کیا کہ وہ ایسے قوانین کا اجرا بند کرے جو زمین کے پیداواری نفع کے لیے جاری کیے جائیں اور باہر سے غلہ منتقل کرنے کے لیے میدان کو وسیع کیا جائے۔ چنانچہ مقامی زراعتی مالکان کے نفع کی مقدار گر گئی، ان کا بازار مندا ہو گیا اور نتیجے میں صنعت کاری کی مشکلات کم ہو گئیں۔ سرمایہ داروں نے غلے کی قیمتوں میں کمی کے باعث صنعتی مزدوروں کی اجرتوں میں بھی کمی کر دی، اس طرح انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے اور اپنے مالی مفادات کو معاشرتی نقصان کی قیمت پر مضبوط کیا۔ اس سے بڑی خطرناک صورت حال پیدا ہوئی، غریب اور بے بس عوام کی ایک بہت بڑی تعداد مصائب سے دوچار ہوئی۔

ایک اور اعتبار سے بھی ریکارڈو نے اپنا حلقہ اثر بڑھایا اس نے زرعی اراضی کو قومیانے کا مطالبہ کیا یا کم از کم اُن پر بھاری ٹیکس عائد کیے جائیں۔ ریکاڈو اور سرمایہ داروں سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی جو ان کے مقصود کے خلاف تھی۔ انھوں نے انجانے میں ابتدائی اشتراکیت پسندوں کو اپنے حربوں سے قبل از وقت متنبہ کر دیا۔

کلاسیکل معاشی مکتبہ فکر کے عام اثرات

نیچر یا فطرت کے پرستار طبقہ نے کلیسا کے خدا سے بھاگ کر فطرت کے دامن میں پناہ لی۔ وہ حق اور عدل کو فطرت کے ابدی قوانین میں تلاش کرتے رہے! اور آخر کار ان پر یہ ظاہر ہوا کے وہ ایک وہم کے پیچھے بھاگ رہے ہیں کیونکہ فطرت یا نیچر ایک ایسا اندھا اور گونگا خدا ہے کہ ہر شخص اس کے ذمے کوئی بھی بات جڑ سکتا ہے۔

کلاسیکل مفکرین نے اپنی بات کو وہاں سے شروع کیا جہاں پر فطرت پسندوں نے انتہا کی تھی، وہ اپنی ذاتی مصلحت پر مبنی معیار مقرر کرتے اور کہتے کہ ہم فطرت کے قانون کے عین مطابق چل رہے ہیں، پھر وہ اس بات کو بھول جاتے اور مادی منفعت بذات خود قانون اور ہدف بن جاتی۔ چونکہ اقتصادی سیاست کے لیے کوئی نہ کوئی نعرہ ضروری تھا، لہٰذا یہ نعرہ لگایا گیا کہ ''سب سے زیادہ منافع کا حصول، اگر چہ کسی بھی ذریعے سے''۔ یہ درحقیقت اقتصاد کے میدان میں مکیاولی ازم کی پیروی تھی۔

اس دور میں اقتصاد کسی بھی خارجی مؤثر سے یکسر آزاد ہو گئی، چاہے وہ دینی رنگ ہو یا اخلاقی۔ اقتصاد کا میدان بالکل الگ تھلگ قرار پایا جس میں علمی و نظری احکام و طریقہ کار کے اپنے مصادر قائم کیے گئے۔ اقتصاد کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مباحث اور معیارات میں حق اور عدل جیسے کلمات ہلکے قرار پائے اور حلال حرام جیسے الفاظ کی گنجائش تو ممکن ہی نہ تھی۔ اقتصادی مفکرین کی آرا اور نظریات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے اور وہ ایک دوسرے کی نفی یا اثبات کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی مفکر اپنی رائے کی تائید میں دین کا حوالہ پیش کرتا تو اس کو انتہائی مذاق اور تحقیر کا نشانہ بنایا جاتا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو رجعت پسند سمجھ کر شرمندہ ہو جاتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی جاہلیت اس بات پر مکمل طور پر مطمئن ہو چکی تھی کہ دین ہر شخص کا ذاتی و نجی معاملہ ہے اس کا زندگی کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں ایک حقیقت کا بیان ضروری ہے جو بار بار پیش آئے گی کہ یورپی جاہلیت کسی بھی ایسے قانون کو مکمل طور پر رد کرتی تھی جو اللہ تعالیٰ کی ذات سے لیا جائے۔ وہ اپنے من گھڑت طاغوتی معبودوں کی عبادت پر اصرار کرتی تھی، چاہے وہ جس قسم کے عذاب سے دوچار کریں۔

یہ یورپی جاہلیت کا اساسی اور بنیادی انحراف ہے جس کی اصلاح کے بغیر یورپ سے کسی فرعی یا جزوی مسئلے پر بحث و مباحثہ عبث و بے کار ہے۔

حالت چاہے جو بھی ہو کلاسیکل مفکرین نے جب نعرہ لگایا کہ ''زیادہ سے زیادہ نفع، چاہے کسی بھی ذریعے سے'' تو اس کے دو خطرناک نتائج نکلے۔

① ایک ایسی عالمی معیشت کا قیام جس میں سود اور ذخیرہ اندوزی ریڑھ کی ہڈی اور بنیادی اصول قرار پائے حالانکہ ان دونوں کو تمام شریعتوں نے حرام قرار دیا ہے۔ اس معیشت نے پوری انسانیت پر ایک ہولناک مصیبت کھڑی کر دی، اس کے عواقب اور نتائج عملی طور پر اس وقت سامنے آئے جب سود خوروں نے بڑی بڑی ریاستوں پر اثر و رسوخ حاصل کر لیا، انھوں نے ملکوں کی سیاست اور قومی منصوبوں میں اپنے مفادات کے حصول کے لیے دخل اندازی شروع کر دی۔ انھوں نے کئی ممالک کو اپنے زیر اثر کر لیا۔

② جن قوموں کے عوامی طبقوں پر یہ اقتصادی نظریہ لاگو کیا گیا، وہ اپنی بھوک، غربت اور دردناک مسائل میں انتہا کو پہنچ گئے۔ اس دور میں غریبوں کے لیے کوئی تنظیم بھی نہ تھی اور نہ ہی وہ اپنے حقوق کے مطالبے کے لیے کوئی دباؤ کا طریقہ کار استعمال کر سکتے تھے۔ یہ وہ خرابی تھی جو پچھلی خرابی کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔

ہم یہاں دو بڑے ملکوں کی مثال دیتے ہیں جو ماضی میں بہت مال دار رہے ہیں یعنی انگلینڈ اور امریکہ۔ یہ صنعتی انقلاب میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے، یہاں عام لوگوں اور مزدوروں کو وہ فاقہ کشی، بدحالی اور بے چارگی لاحق ہوئی جس پر یقین کرنا مشکل ہے۔

وہ عورتیں اور بچے جو کوئلے کی کانوں میں کام کرتے تھے اور زمین کے نیچے تنگ راستوں پر ریل کے ڈبے دھکیلتے تھے، وہ ایک دن میں سولہ گھنٹے کام کرتے اور بدلے میں انہیں انتہائی معمولی اجرت نصیب ہوتی۔ وہ کپڑا بننے کے کارخانوں اور دوسری فیکٹریوں میں کام کرتے، ان پر طاقت سے زیادہ بوجھ لادا جاتا اور مزدوری کے مقامات صحت کے لیے انتہائی نقصان دہ ہوتے۔ بدلے میں انہیں صرف اتنی اجرت ملتی جس سے بمشکل جسم اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جان کا رشتہ قائم رہتا۔ (۳۲۲)۔ صنعتی انقلاب سے متعلق جتنی بھی بحثیں پڑھنے کو ملتی ہیں وہ سب اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں۔ بلکہ اس کا اثر تو انگریزی ادب میں بھی موجود ہے، جیسے چارلس ڈکنز (۱۸۶۳ء) جو کہ نامور انگریزی ناول نگار ہے، اپنی ایک کہانی 'اولیفر ٹوسٹ' میں فقرا اور ان کے کیمپوں کی صورت حال بیان کرتا ہے۔ وہ اپنے ایک اور ناول کا موضوع اس طرح قائم کرتا ہے کہ کارخانے دار اور مزدوروں کے درمیان کس قسم کا تنازعہ پیدا ہوتا ہے اور صنعتی انقلاب سے کس قسم کی معاشرتی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔ (۳۲۳)

جب ہم امریکہ کی صورت حال دیکھیں تو وہاں بھی یہی دردناک تصویر ہے۔ وہاں کا ایک مصلح بیان کرتا ہے:

ہم سب شمال اور جنوب کے لوگ سفید غلاموں کی تجارت میں مشغول رہتے ہیں اور ہم میں سے جو شخص جتنا زیادہ کامیاب ہوتا ہے اتنا ہی اس کا احترام کیا جاتا ہے۔

''کارخانوں کے اندر مزدور اپنی یومیہ محنت کے بعد آزاد ہو جاتا ہے لیکن اس کی گھریلو زندگی کی مشکلات اور خاندانی بوجھ اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ اُس کی آزادی ایک خالی خولی، کھوکھلی بات رہ جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کارخانے کا مالک عملاً آزاد ہوتا ہے، وہ دوسروں کی محنت کے بل بوتے پر نفع کماتا ہے اور مزدوروں کی آسانی اور خوشحالی کو خاطر میں نہیں لاتا''۔۔۔''اس میں کوئی تعجب نہیں کہ لوگ پیسے کو غلام بنانا پسند کرتے ہیں اور سیاہ فام انسانوں کو غلام بنانا پسند نہیں کرتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پیسہ مزید نفع لاتا ہے اور انسان کو ذمہ داریوں سے نجات دیتا ہے جبکہ سیاہ فام غلاموں کا مالک، غلاموں کی دیکھ بھال میں جکڑا ہوتا ہے''۔ (۳۲۴)

اس طرح مغربی جاہلیت نے ایک بھاری قیمت ادا کی اور ایک نئے طاغوت (سرمایہ) کی پوجا میں مصروف ہوگئی۔ یہ نیا طاغوت خرابی اور تذلیل میں جاگیروں کے طاغوت سے کم تر نہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی سنت نے تقاضا کیا کہ سرمایہ داروں کی خوشی طویل ثابت نہ ہو کیونکہ اُن کا ظلم واستحصال لوگوں کے دلوں میں آگ بھڑکا رہا تھا اور دشمنی کی آگ مخالفین میں بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ چنانچہ اجتماعیت پسند مفکرین کے ہاتھوں پہلی چنگاری پھوٹی اور مارکس ازم کی شکل میں اپنی انتہا کو پہنچی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ کیمونزم کا اقتصادی نظام

کیمونسٹ فکر کے مصادر پر مبادیات

فطرت پسند مفکرین نے فرد کے انفرادی مفاد پر انتہائی زور دیا جبکہ اس کے مقابلے میں اجتماعیت پسند مفکرین نے فرد کو سرے سے کوئی بھی اہمیت دینے سے انکار کر دیا اور اُس کو ایک بڑی اجتماعی مشین کا کل پرزہ ہی قرار دیا۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اجتماعیت پسندی کی فکر اپنی اصل کے اعتبار سے قدیم ہے اور یورپ کا دور تنویر اس کو دوبارہ زندہ کرنے پر جدوجہد کرتا رہا۔ کیمونزم مارکس اور انجلز سے صدیوں پہلے عملی طور پر لاگو کی گئی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ افلاطون کی جمہوریت ایک ایسی امت کا نظریہ تشکیل دیتی ہے جس کی بنیادی روح خالص اجتماعی ہے اور فرد مجموعے کے دائرے میں داخل ہو کر اپنا شخصی وجود کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح مزدکیت بھی کیمونسٹ اجتماعی معاشرے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ مزدکیت ایک کیمونسٹ فکر تھی جو فارس کے علاقوں میں اسلام سے پہلے پیدا ہوئی۔ (۳۲۵)

حقیقت یہ ہے کہ جاہلیت اپنی عادت کے مطابق ہمیشہ تذبذب اور غلو کا شکار رہی ہے، یہ فرد اور معاشرے کے باہمی تعلق کے بارے میں افراط اور تفریط میں مبتلا رہی اور کوئی درمیانہ حل تلاش نہیں کر سکی۔ جدید یورپ میں آزاد انفرادیت پسند مکتبہ فکر (Individualism) کی تطبیق سے ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کی وجہ سے بعض نیک نیت لوگوں نے ایک ایسے معاشرے کو قائم کرنے کی فکر دی جس میں دولت کی تقسیم عادلانہ اور منصفانہ ہو جس کو پہلی مرتبہ اشتراکیت (Socialsim) کا نام دیا گیا۔

اس فکر کی نسبت بہت سارے مفکرین کی طرف کی جاتی ہے جن میں بڑے نام روبرٹ اوین (۱۸۵۸ء)، سینٹ سائمن (۱۸۲۵ء)، اور فوریئر (۱۸۳۷ء) ہیں۔ یہ مغرب میں اشتراکیت کے پہلے مفکرین ہیں، ان کی اشتراکیت کو تخیلاتی اشتراکیت بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ محض خیالات پر مبنی تھی جب کہ مارکس کی اشتراکیت کو علمی اشتراکیت کہتے ہیں جو تاریخ میں بالکل الگ تھلگ مقام رکھتی ہے!

اس کے باوجود مارکس کی اشتراکیت، تخیلاتی اشتراکیت کے مفکرین کا احترام کرتی ہے اور اُن کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فضیلت کا اعتراف کرتی ہے۔ انجلز کہتا ہے ''نظریاتی اشتراکیت اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتی کہ وہ سینٹ سائمن، فوریئر اور اوین کے کندھوں پر کھڑی ہوئی ہے۔ یہ تینوں مفکرین اگرچہ خیالی باتوں کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود وہ تمام ادوار کے بڑے مفکرین میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی عبقریت نے اُن کو بہت ساری ایسی باتیں سوجھا دیں جو بعد میں علمی سطح پر صحیح ثابت ہوگئیں''۔ (۳۲۶) یہ کیمونسٹ فکر کا اوّلین مصدر ہے۔

کیمونسٹ فکر کا دوسرا مصدر جرمن کا فلسفہ مثالیت (Idealism) ہے جس سے کیمونزم نے بہت کچھ حاصل کیا، خاص طور پر جدلیت کا بنیادی اصول جو کیمونزم کی مادیت کو دوسری مادیت سے الگ کرتا ہے۔ انجلز کہتا ہے:

''جرمنی علمی اشتراکیت وہ واحد علمی اشتراکیت ہے جو وجود رکھتی ہے، جرمنی فلسفہ خاص طور پر ہیگل کے بغیر اس کا وجود ممکن نہ تھا''۔ (۳۲۷)

کیمونزم کا تیرا مصدر وہ ہے جس نے کیمونزم کو ایک خالص نظریاتی فلسفے سے بدل کر علمی رنگ دیا اور وہ ڈارون کے نظریے سے ممکن ہوا۔

جب مارکس یہ کہتا ہے کہ اقتصادی مظاہر کو اُسی طرح سے منضبط طریقے سے دیکھنا، بیان کرنا اور غور وفکر کرنا ممکن ہے جس طرح کسی بھی طبعی علم کو ملاحظہ کیا جاتا ہے، تو یہ بات ڈارون سے اثر پذیری پر دلالت کرتی ہے۔ انجلز نے اس کی مزید وضاحت اس طرح سے کی ہے ''جیسے ڈارون نے انسان کی طبعی تاریخ کے اندر قانون ارتقا کو دریافت کیا، اسی طرح سے مارکس نے انسانی تاریخ میں قانون ارتقا کو دریافت کیا ہے۔

ڈاونز اس کی وضاحت اس طرح سے کرتا ہے:

''مارکس نے جس علمی طریقے کی طرف اپنی مختلف بحثوں میں اشارہ کیا ہے اور جس کی وجہ سے عوام نے اس کی آرا کو قبول کیا ہے، وہ ڈارون کا تنازع للبقا کا نظریہ ہے۔ انیسویں صدی کے اندر لوگوں کے ذہنوں میں نظریہ ارتقا کا اتنا اثر تھا کہ انھوں نے اس کو زندگی کے ہر مظہر میں لاگو کرنا ممکن سمجھا۔ جب مارکس نے اپنے تاریخی نظریے کو مختلف طبقات کے مابین تنازع للبقا سے مربوط کیا جیسا کہ ڈارون نے اپنا تنازع للبقا کا نظریہ پیش کیا تھا تو اس کے لیے علمی دنیا میں وہ احترام واقع ہوگیا جو اعتراض اور شکوک سے پاک تھا۔ (۳۲۸)

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کیمونسٹ مفکرین نے ڈارون سے استفادہ کیا لیکن وہ اس کا زیادہ اشارہ نہیں دیتے بلکہ مورس مورجان کی کتاب المجتمع القدیم کا حوالہ دیتے ہیں، حالانکہ یہ کتاب ڈارون کے نظریے کی تطبیق ہے، شاید اس کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے مصادر میں سرمایہ داری کے ساتھ شرکت گوارہ نہیں کرتے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کیمونزم ایک ہمہ گیر تصور ہے جو وجود اور تاریخ کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات رکھتا ہے اور یہ مختلف منتشر افکار کو جوڑ کر بنایا گیا ہے:

فلسفیانہ دائرے میں یہ ہیگل سے ماخوذ ہے لیکن اس کو مکمل طور پر پیچھے کی طرف الٹ دیا گیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تطبیقی عمل کے اعتبار سے یہ ڈارون سے ماخوذ ہے اور اُس میں خاص فلسفیانہ اضافے بھی کیے گئے ہیں۔ قیمت کا نظریہ اور قومیانہ کا نظریہ ریکارڈو سے منقول ہے اور سینٹ سائمن و مالتھس کے ملکیت و عمل کے کچھ نظریات بھی حاصل کیے گئے۔ اس کا الحاد بالعموم فیور باخ، دول باخ اور میکانکیت پرست مادہ پرستوں سے حاصل شدہ ہے۔

لیکن سب سے عجیب بات یہ کہ کیمونزم اِن سب پر لعنت کرتا ہے، جیسا کہ رسل کہتا ہے کہ کیمونزم ان کے رجعت پسندانہ بورژوائی نظریات سے برأت کا اعلان کرتا ہے۔ (۳۲۹)

حقیقت یہ ہے کہ کیمونزم کا ایک اہم مصدر یہودی ورثہ اور یہودی نفسیات ہے جس کی طرف بہت کم لوگوں نے اشارہ کیا ہے۔ یہودی نفسیات یہ ہے کہ مال کی محبت پوجا کی حد تک ہو اور مادے کو احمقانہ حد تک معبود قرار دیا جائے اور پوری انسانیت، اُن کی اقدار، ورثے اور مقدسات کو ایک مستقل شدید کینہ کے ساتھ دیکھا جائے۔ (۳۳۰)

یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ کیمونزم، تمام ادیان اور اخلاق کا انتہا پسند دشمن ہے اور یہ فطرت سے بھی متصادم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فکر و تحریک کو انتہائی غلو کے باوجود قبولیت کیسے حاصل ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یورپی فضا تنگ نظری سے لبریز تھی۔ کلیسا کا کٹرپن، مذہبی پیشواؤں کی ناجائز سختی، کمزوروں کے مقابلے میں ظالموں اور سرکشوں کا ساتھ دینا، تجرباتی مادی علوم کے مقابلے میں خرافات اور قصے کہانیوں کے ساتھ چمٹے رہنا۔۔۔ یہ وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے کیمونزم جیسا غیر عقلی اور غیر فطری نظام بھی دنیا میں کامیاب ہو گیا۔ کیمونزم نے لوگوں کے ہیجان خیز غصہ کو استعمال کیا، سادہ عقل والے لوگوں تک رسائی حاصل کی اور کلیسا کے خلاف گہری دشمنی کو تمام ادیان کے خلاف ایک زبردست انقلاب میں تبدیل کر دیا۔

اگر کوئی شخص کیمونسٹ اقتصادیات کو کیمونسٹ فلسفے سے الگ تھلگ کر کے پڑھنا چاہے تو ایسا ممکن نہیں، کیونکہ یہ دونوں آپس میں گھلے ملے ہوئے ہیں۔ علمی اعتبار سے یہ بہت بڑا خلل ہے بلکہ ایک طرح سے وقت کا ضیاع ہے۔

عملی صورت حال یہ ہے کہ کیمونسٹ الحاد کی کتابیں ہی کیمونسٹ اقتصاد کی کتابیں ہیں۔ اسی طرح سے کیمونسٹ اقتصاد کی کتابیں بدرجہ اُولیٰ کیمونسٹ الحاد کی کتابیں ہی ہیں، ان دونوں میں علیحدگی ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے کیمونسٹ اقتصادی فکر اس کے عام فلسفے سے گھلی ملی ہے۔

کیمونزم اپنے طریقے کار میں سب سے پہلے دین کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتا ہے۔ دین کی دشمنی الحاد ہے لیکن کیمونزم اپنے الحاد کو ایک خاص قسم کا الحاد قرار دیتا ہے جو اس کی نظر میں ایجابی ہے۔ غارودی کہتا ہے:

''مارکس کا الحاد اپنے جوہر کے اعتبار سے خالص انسانی ہے، یہ صرف انکار نہیں بلکہ تاکید بھی ہے یعنی انسان کے مستقل بالذات ہونے کی تاکید۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ الحاد ہر اُس کوشش کا انکار کرتا جو انسان کو اس کی غیر معمولی قدرت سے محروم کرے۔ اس الحاد کے نزدیک انسان کی غیر معمولی قدرت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُس کی ذاتی صلاحیت ہے''

پھر وہ اس کی تفصیل میں کہتا ہے مارکس کا الحاد پچھلے تمام الحادوں سے مختلف ہے۔ اِس نے دین کو فقط ایک دھوکہ ہی قرار نہیں دیا بلکہ دین کو ظلم کا آلہ کار بھی قرار دیا۔ اُس نے دین کو ایک ایسا وہم قرار دیا جو جہالت سے جنم لیتا ہے۔ مارکس اور انجلز نے ان تمام انسانی ضروریات سے بحث کی جن کو ادیان اپنے دھوکہ دہی سے پورا کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ وہ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ بقول مارکس تمام ادیان انسان کی عملی بے بسی، لاچاری اور بدبختی کا عکس ہوتے ہیں۔ انسان اپنی ناکامیوں اور تباہ حالیوں پر مذہب سے تسکین حاصل کرتا ہے۔

مارکس کے نزدیک یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ادیان انسانوں کی مایوسیوں کا عکس ہوتے ہیں، مارکس اس کو مختصر لفظوں میں ایسے بیان کیا کہ دین عوام کے لیے ایک نشہ ہوتا ہے۔ (۳۳۱)

کیمونزم جدلیاتی مادیت کا حامل ہے اور تاریخ کی فقط اقتصادی تشریح کرتا ہے، اس کے نزدیک فکر اور وجود کا آپس میں ایک گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسانی فکر انسان کے مادی حالات کا عکس ہوتی ہے۔ مادہ ہی اصل بنیاد ہے، اسی سے فکر پھوٹتی ہے، اور اسی سے احساسات اور جذبات جنم لیتے ہیں۔ انہی احساسات میں سے ایک دین ہے۔

یعنی دین لوگوں کے احساسات سے جنم لیتا ہے نہ کہ خارج سے انسان کو عطا کیا جاتا ہے۔

دین کی اس تشریح کے مطابق انجلز کہتا ہے:

''انتہائی قدیم زمانے کے اندر جب لوگ اپنی جسمانی ماہیت وحقیقت سے غافل تھے اور خوابوں کے اثرات کے تحت رہتے تھے، تو اُن کی فکر یہاں تک پہنچی کہ اُن کے افکار واحساسات ان کے جسم کا فعل نہیں بلکہ یہ اُن کی روح کا فعل ہیں جو جسم میں رہائش پذیر ہوتی ہے اور موت کے وقت جسم سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت سے انسان مجبور تھے کہ وہ اپنی ذات کے لیے ایسے افکار گھڑ سکیں جو روح اور خارجی دنیا کے باہمی تعلق کی وضاحت کریں۔

فطرت کی قوتوں کو پہچاننے سے ابتدائی دور کے خداؤں نے جنم لیا جو ارتقائی مراحل کی وجہ سے شروع شروع میں غیر ارضی تھے اور کثرت پر مشتمل تھے، لیکن بالآخر وہ تجرید کے مرحلے میں داخل ہوئے۔ اس طرح سے ایک فطری طریقے پر عقلی ارتقا جاری رہا۔ لوگوں کے ذہن میں پہلے متعدد کمزور خداؤں کا تصور آیا جو ایک دوسرے کے ساتھ یا آمنے سامنے کی قوت کے حامل تھے۔ پھر اُس کے بعد توحیدی ادیان کے اندر ایک اکیلے خدا کا تصور پیدا ہوا۔ (۳۳۲)

یہاں سے انجلز نتیجہ نکالتا ہے کہ درحقیقت جسم کے مطالبات ہی فکری اعتقادات کا سبب ہوتے ہیں۔ اور دین انسانی دماغ کے اندر دیگر انسانی اشیا کی طرح ایک خیالی عکس ہوتا ہے۔ (۳۳۳)۔ چونکہ اقتصادی ضابطے انسان کے جسمانی مطالبات کو بھی محدود کرتے ہیں چنانچہ اس کے نتیجے میں دین پیدا ہوتا ہے جو اقتصادی ضابطوں کے اندر سے جنم لیتا ہے۔ دین کی اس کے علاوہ کوئی تشریح درست نہیں۔ رہے انسان کے دیگر اعلیٰ افکار ومقاصد جیسے فلسفہ وغیرہ۔ یہ بھی ایسے عناصر سے مل کر بنے ہیں جن کی جڑیں قبل از تاریخ میں جاتی ہیں۔ انسان کی معلوم تاریخ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے نامعلوم تاریخ سے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہ غلطی پر مبنی مختلف تصورات تھے جو فطرت، انسانی پیدائش، ارواح اور جادوئی قوتوں وغیرہ کے متعلق تھے لیکن ان تصوارت کے بھی کوئی نہ کوئی اقتصادی اسباب ضرور تھے۔ قبل از تاریخ ضعیف اقتصادی ارتقا کی وجہ سے فطرت کے بارے میں غلط تصورات قائم ہوئے۔ (۳۳۴)

چنانچہ معاش یا کھانے پینے کی تلاش ہی درحقیقت ہر عقیدے اور تصور کی جڑ ہے اور یہی ہر اصول وقدر کی بنیاد ہے۔ کیمونزم اس کو انسانی زندگی کے ہر رویے اور سلوک پر لاگو کرتا ہے مثلاً انسانی علوم، جنگ وجدل، احساسات اور فنون، معاشرتی تعلقات وغیرہ۔ مثلاً تجرباتی علوم کی اصل وجہ حقیقت کی دریافت کا حقیقی جذبہ نہیں بلکہ کیمونزم کی ڈکشنری میں کوئی بھی چیز فطری نہیں۔ انجلز کہتا ہے کہ تجرباتی اور عقلی علوم قرونِ وسطیٰ کی تاریک رات کے بعد اچانک ایک زبردست قوت کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک معجزاتی تیزی کے ساتھ نشوونما پانے لگے، یہ سب پیداوار کے جدید معجزے کے مرہونِ منت ہے۔ (۳۳۵)

جنگوں کے متعلق کیمونزم کہتا ہے: جن جنگوں کو دینی قرار دیا جاتا ہے۔۔۔ وہ بھی درحقیقت ایک مخصوص طبقے کی ایجابی مادی مفادات کی حامل تھیں، یہ جنگیں مکمل طور پر طبقاتی جنگیں تھیں۔۔۔ یہ طبقاتی کشمکش دینی نعروں کے غلاف میں لپٹی ہوئی تھیں۔ مختلف طبقوں کے مفادات اور حاجات دین کے پردے میں چھپے ہوئے تھے، اِن میں سے کوئی بھی چیز نہیں بدلی، ہر چیز کی تفسیر اس دور کے حالات وواقعات کے مطابق مکمل وضاحت سے کی جاسکتی ہے۔ (۳۳۶)

کیمونزم **اخلاق** کے بارے میں کہتا ہے: لوگ شعور کے ساتھ یا بغیر شعور کے، اپنے اخلاقی تصورات اُن عملی تعلقات سے اخذ کرتے ہیں جن پر ان کا طبقاتی رواج قائم ہوتا ہے، ہر اخلاقی تصور کا آخری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ اقتصادی تعلقات سے ماخوذ ہوتا ہے، انہی تعلقات کی بنیاد پر پیداوار حاصل ہوتی ہے اور لین دین کیا جاتا ہے۔ (۳۳۷)

ان افکار کے اندر کوئی بات عجیب وغریب نہیں۔ البتہ انجلز کا یہ قول بڑا معنی خیز ہے: ''انسانی افعال نے ہی انسان کو پیدا کیا ہے۔ کوئی ایسا الٰہ نہیں جس نے انسان کو پیدا کیا ہو، الٰہ کا تصور رجعت پسند بورژوائی اور جاگیردار طبقے کی پیداوار ہے۔'' ہم انجلز کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھ سکتے کہ اس کے کلام کو مجاز پر محمول کریں، اس نے اپنی عبارت کی خود تشریح کی ہے جو ڈارون کے نظریے سے زیادہ سادہ استدلال اور بڑا عجیب استنباط ہے۔ وہ کہتا ہے: کئی سیکڑوں ہزاروں سال پہلے، انسان خط استوا کے قریب کسی جگہ پہ رہتا تھا۔ پھر بندر سے انسان نما کسی جانور کی پیدائش ہوئی جو بتدریج ایک خاص بلند مقام تک جا پہنچی۔ ڈارون نے اس بندر کا قریبی وصف بیان کیا ہے جو ہمارا قدیم باپ دادا ہوسکتا ہے۔

اس بندر نے بلاشک وشبہ ابتدا کے اندر اپنی معیشت کے حصول کے لیے اپنے مزاج کے مطابق ہاتھوں کو زیادہ استعمال کیا اور ٹانگوں کو کم استعمال کیا جس کے نتیجے میں زمین پر چلنے پھرنے کے لیے ہاتھوں کی عادت ختم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگئی اور وہ زیادہ سے زیادہ عموداً کھڑا ہو کر چلنے لگا۔ اس طرح سے بندر سے انسان کی طرف فیصلہ کن مرحلہ طے ہوا۔ (۳۳۸)

جب اقتصاد کا مسئلہ اتنا اہم تھا تو لوگوں نے اس سے ہٹ کر کسی اور چیز کو تاریخ اور افکار کے اتار چڑھاؤ میں اتنی اہمیت کیوں دی؟ یہ حقیقت اُن کی نظروں سے کیوں اوجھل ہوگئی کہ آخر کیمونسٹ فلاسفہ نے آ کر اس کو زندہ کیا؟ کیمونسٹ مفکرین اس کا جواب بڑی سہولت سے دیتے ہیں: اس میں کوئی تعجب نہیں کہ انسان کی اصل بندر ہے لوگ اس حقیقت سے غافل تھے، وہ سمجھتے تھے کہ خدا کی عنایت خاص نے ان کو تخلیق کیا ہے، لیکن بالآخر وہ جان گئے۔

انجلو اس کو اس طرح سے بیان کرتا ہے: لوگ بھولے ہوئے تھے کہ انسانی زندگی کے اقتصادی حالات ہی ان کے حقوق کا ماخذ ہیں، وہ یہ بھی بھول چکے تھے کہ وہ حیوان کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں۔ (۳۳۹)

کیمونسٹوں نے اقتصاد کو خدا بنالیا اور انسانی تاریخ کو روٹی کی تلاش تک محدود کر دیا۔ انھوں نے انسان کو الٹا کر دیا، اس کے پیٹ کو بلند کر دیا اور اس کی روح و عقل کو نیچے کر دیا۔

انھوں نے تاریخ کی اقتصادی تشریح کی جو چند نظریاتی اصولوں پر قائم ہے، جس کی اہم تفصیل درج ذیل ہے:

① **مناقض امور میں کشمکش کا حتمی ہونا:** یعنی انسانی معاشرے کے اندر طبقات اور مادی مفادات کے مابین کشمکش حتمی ہے جو کبھی بھی ٹھنڈی نہیں ہوتی، اس کی وجہ سے ہی خوراک کی تلاش اور پیداواری وسائل کی ملکیت جنم لیتی ہے۔ کیمونسٹ فلاسفہ ہیگل کی مثالی جدلیت کے نتیجے میں حتمی کشمکش پر ایمان لے آئے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز کے ساتھ اُس کا متضاد نقیض بھی جڑا ہوتا ہے۔ پھر دونوں نقیضوں کے مابین کشمکش سے ایک تیسرا طاقت ور جامع تصور سامنے آتا ہے۔ پھر اس کے بعد اس کا بھی ایک نقیض نمودار ہوتا ہے اور وہ دوبارہ کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

② **تاریخ انسانی میں خوراک کی تلاش:** کیمونزم نے انسانی تاریخ کو پانچ بڑے مراحل میں تقسیم کیا ہے جو مورس مورجان کے افکار کا خلاصہ ہے۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

① پہلا مرحلہ: کیمونزم کا ابتدائی دور
② دوسرا مرحلہ: غلامی کا دور
③ تیسرا مرحلہ: جاگیرداری کا دور
④ چوتھا مرحلہ: سرمایہ داری کا دور
⑤ پانچواں مرحلہ: کیمونزم کا دوسرا اور آخری دور۔ (۳۴۰)

③ **تاریخ کے ادوار میں جب بھی کوئی بڑی تبدیلی رونما ہوئی تو اس کی وجہ ہمیشہ کسی نہ کسی مادی دریافت پر مبنی تھی،** جس کی وجہ سے پیداوار کے وسائل تبدیل ہو گئے۔ مثلاً زراعت کی دریافت سے انسانیت پہلے مرحلے سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلامی کے مرحلے کی طرف منتقل ہوئی، ''ہل'' کی دریافت سے انسانی معاشرہ غلامی سے جاگیرداری کی طرف منتقل ہوااور صنعتی آلات کی دریافت سے انسانی معاشرہ جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف منتقل ہوا۔

④ **انسانی تاریخ میں ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے کی طرف تبدیلی حتمی ہے، اُس میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں:** کیمونزم کے پچھلے تین اصول خالص نظریاتی تھے لیکن یہ اصول اور اس کے بعد والے اصول عملی تطبیق ہیں اور انہی پر کیمونزم کا زیادہ زور ہے۔

انجلز نے کیمونزم کے اصول حتمیت کی تشریح، اپنی کتاب ''فیور باخ اور جرمن کلاسیکل فلسفے کا عروج'' میں کی ہے۔(۳۴۱)۔ فیور باخ جرمن مادہ پرست فلسفی تھا جو ہیگل اور مارکس کا مدمقابل تھا۔ مارکس ازم نے اپنے فلسفے کی بنیاد اس کی کتابوں پر رکھی ہے۔

انجلز نے ذکر کیا ہے کہ کیمونزم نے جان بوجھ کر ہیگل کے مخالف دعویٰ کو قبول کیا۔ ہیگل کا دعویٰ تھا کہ لوگوں کے افکار ہی ان کے حالات وواقعات کو تبدیل کرتے ہیں یعنی انسانی ارادہ، انسانی زندگی کی تبدیلی میں کارگر ہوتا ہے۔ انجلز نے واضح کیا کہ ان کے درمیان اور ہیگل و دیگر مثالیت پسند مفکرین کے درمیان فرق ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ فطرت کے بارے میں تین بڑی دریافتیں ہو چکی ہیں۔

① خلیے کی دریافت جو کہ ایک مستقل اکائی ہے، جس سے ارتقاء کے مراحل کے مطابق کثیر خلیاتی حیوانی اور نباتاتی نامیاتی وجود کا ظہور ہوا۔

② توانائی کا اپنی شکلیں بدلنے کی دریافت۔ اس نے ہمارے لیے واضح کیا کہ ہمیں غیر نامیاتی اجسام کے اندر جو اول درجے کی فاعلی قوتیں نظر آتی ہیں، یہ سب کی سب ایک حرکت کی مختلف تجلیات ہیں جو بعض مقداری نسبتوں کے تحت ایک شکل سے دوسری شکلوں میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

③ اجمالی دلیل جو پہلی دفعہ ڈارون کے ہاتھوں ثابت ہوئی یعنی تمام طبعی نامیاتی وجود خواہ وہ انسان ہوں یا کچھ اور، وہ سب ایک طویل ارتقا کے عمل کا نتیجہ ہیں۔(۳۴۳)

یہ بات واضح ہوگئی کہ کیمونزم کا نظریہ جبر مکمل طور پر ڈارون تھیوری سے ماخوذ ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ڈارون تھیوری کے مطابق انسان لاشعوری طور پر ارادے کے بغیر ایک طویل اور سست ارتقا کے سامنے مجبور ہے۔ ارتقاء کے عمل نے انسان کو ایک عارضی بناوٹ عطا کی جس میں انسان کا کوئی عمل دخل نہیں۔(۳۴۳)

⑤ **انسانی تاریخ کا ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہونے سے لازمی طور پر افکار، عقائد اور سلوک میں بھی تبدیلی آتی ہے:** یہ اصول کیمونزم فلسفے کا سب سے خطرناک اصول ہے اور یہ ڈارون تھیوری کے ارتقا پر مبنی ہے۔ اس اصول کی تطبیق سے کیمونزم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ہر تاریخی مرحلے میں ایک خاص دین، اخلاق، رواج اور تعلقات ہوتے ہیں جو اقتصادی حالات سے پھوٹتے ہیں۔ جب وہ مرحلہ گزر جاتا ہے تو نئے اقتصادی مرحلے سے نئی تبدیلیاں جنم لیتی ہیں۔(۳۴۴)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انجلز کہتا ہے: جب سے جائیداد کی انفرادی ملکیت نے ترقی کی تو تمام ایسے معاشرے جن میں انفرادی ملکیت رائج تھی، وہاں ایک ہی مشترکہ اخلاقی نصیحت کی جاتی تھی کہ چوری نہ کرو۔ کیا چوری نہ کرنے کی نصیحت کوئی ابدی اخلاقی نصیحت ہوسکتی ہے؟ ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔ وہ معاشرہ جس میں چوری کے تمام اسباب ختم کردیے جائیں تو نتیجے میں چوری کا ارتکاب کرنے والے دیوانوں کے سوا کوئی نہ ہوں گے۔ لوگ اس اخلاقی ناصح پر کتنا ہنسیں گے جو تمام لوگوں کے سامنے یہ اعلان کرے کہ چوری نہ کرو۔

اسی لیے ہم مکمل بصیرت کے ساتھ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ ہم پر کوئی بھی عقیدہ، اخلاق اور ابدی قانون نام کی کوئی چیز لاگو نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ کہنا کتنا غلط ہے کہ اخلاقی دنیا کے کچھ دائمی اصول ہوتے ہیں جو تاریخ اور اقوام سے ماوراء ہوتے ہیں۔

ہم اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ ہر اخلاقی نظریہ آج تک معاشرے کے اقتصادی حالات کا نتیجہ رہا ہے۔ معاشرہ ہمیشہ طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں ارتقا پذیر رہا، تو اخلاق بھی ہمیشہ طبقاتی نوعیت کے حامل رہے۔ وہ غالب طبقے کے مفادات اور تسلط کو جائز قرار دیتے رہے یا جب بے بس اور لاچار طبقہ قوت پکڑ گیا تو غالب طبقے کے خلاف انقلاب کی ترجمانی کرتے رہے تاکہ مستقبل کمزور طبقوں کے مفاد کے مطابق ڈھل سکے۔ (۳۴۵)

مارکس کہتا ہے معاشرتی تعلقات اور پیداواری قوتیں ایک دوسرے سے منسلک ہوتی ہیں۔ ہماری تحقیق کے مطابق جدید پیداواری قوتیں لوگوں کے پیداواری طریقوں کو بدل دیتی ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں کے کسب معاش کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں اور اس طرح معاشرتی تعلقات بھی بدل جاتے ہیں۔ (۳۴۶)

اس سے یہ ثابت ہوا کہ کمیونسٹوں کے نزدیک کچھ اخلاق و رواج جاگیری زراعتی ہوتے ہیں، کچھ بورژوائی ہوتے ہیں اور کچھ کمیونسٹ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دین زراعتی دور کی پیداوار ہے جبکہ الحاد صنعتی ماحول وعقیدہ کی نشانی ہے۔ اسی طرح سے خاندان اور عزت کا خاص تصور، دین کے زراعتی دور کی علامت ہے۔ یہ انسان کی رجعت پسندی ہے کہ وہ صنعتی معاشرے کے اندر زندگی گذارے اور اس کا دین واخلاق زراعتی معاشرے کے مطابق ہو اس قسم کا انسان اس لائق ہے کہ کمیونزم اُس کو مذموم ترین القاب اور بدترین ہجو سے پکارے بلکہ وہ اس پر ایک جابرانہ قسم کی سختی کو درست سمجھتا ہے۔

درج بالا تفصیلات کمیونزم کی فلسفیانہ تشریح تھی۔ اگر ہم اس کی تطبیقی تشریح دیکھیں تو کمیونزم پہلے دن سے تمام تر شر اور فساد کی جڑ ایک ہی چیز کو قرار دیتا ہے اور وہ ہے ''**انفرادی ملکیت**''۔ اس لیے اُس کا اندھا ایمان ہے کہ انفرادی ملکیت کو سرے سے ختم کردیا جائے۔ پیداوار کے وسائل پر ریاست کا قبضہ ہی دنیا میں جنت قائم کرنے کا ضامن ہے، اس سے وہ تمام شر اور برائیاں ختم ہوجائیں گی جن سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔

کمیونزم ہر انفرادی ملکیت کا دشمن ہے، چاہے وہ عورت کیوں نہ ہو۔ ہر جگہ پر جنسیت اور اباحیت مطلقہ کو پھیلانا کمیونسٹ انقلاب کا صریح ہدف ہے۔ شادی خاندان کو جنم دیتی ہے اور خاندان ان کی نظر میں غیر طبقاتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرے کا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ خاندان قائم ہونے سے انسان اپنی ذاتی ملکیت اور جائیداد اکھٹی کرتا ہے۔انفرادی ملکیت استحصالی جاگیردارانہ نظام کی رسم ہے۔اگر اس کو ختم نہ کیا جائے تو معاشرہ حقیر تاریخی دور کا حامل رہے گا!

کیمونسٹ معاشرے میں دین کا کردار:

یہ بات معلوم ہونا ضروری ہے کہ کیمونزم دین کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے:

کیمونزم بغیر کسی لحاظ کے اس بات کا انکار کرتا ہے کہ کائنات کا کوئی خدا ہے۔کیمونزم کا نعرہ ہے کہ دنیا میں کوئی الٰہ نہیں اور زندگی فقط مادہ ہے۔یہ نعرہ محض نعرہ نہیں بلکہ سویت یونین کے دستور میں ایک باقاعدہ شق ہے۔

کیمونزم کی نظر میں دین محض اوہام وخیالات ہوتے ہیں جو اقتصادی طور طریقوں کا عکس ہوتے ہیں۔ ظالم غالب طبقات مزدور پیشہ عوام اور بدحال لوگوں کو مست کرنے کے لیے دین گھڑ لیتے ہیں۔دین دار لوگ دنیا کی ہر مصیبت کو صرف اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ اس کے بدلے آخرت ملے گی۔کیمونزم اسی وجہ سے دین کا دشمن ہوتا ہے اور معاشرے کو استحصال سے بچانے اور طبقاتی جبر سے آزاد کرنے کے لیے دین کا خاتمہ ضروری سمجھتا ہے!

کیمونزم کے نزدیک دین انسان کا فطری معاملہ نہیں۔یہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گا۔بلکہ یہ تاریخ کا عارضی مرحلہ ہے جو انسانی تاریخ کے ارتقا میں ایک مخصوص گروہ کی خواہشات کی تکمیل کے لیے وضع کیا گیا۔جب سائنسی آلات کی دریافت شروع ہوئی تو انسانیت دین کے مرحلے سے گزر گئی۔اب دین تھامنے کی کوشش بے کار اور فرسودہ ہے جو قابل حقارت ونفرت ہے۔

باقی رہا خاندان،شادی،اخلاق اور نیکی کی باتیں۔۔۔تو یہ بورژوائی بے ہودگی ہے!اسی طرح ابدی حق اور ابدی عدل کی باتیں خالی خولی ہیں،ان کا وجود صرف مثالی مفکرین کے تخیلات اور اوہام میں ہوتا ہے۔

کیمونسٹ ممالک قانونی طور پر دین کی دشمنی کو اختیار کرتے ہیں،الحاد اور مادیت ایسے ہی پڑھائی جاتی ہے جیسے مومنین کو دین پڑھایا جاتا ہے۔دین کو معاشروں سے اکھاڑنے کے لیے میڈیا کے وسائل بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور براہ راست تشدد کا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔یہ سب اس لیے ہوتا ہے تاکہ اخلاق اور نیکی کی چھوٹی موٹی باتیں بھی ختم کی جاسکیں۔

کیمونسٹوں کا خیال ہے کہ جو انسان جاگیردارانہ اوہام کو ختم کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور مزدور طبقے میں الحادی شعور کو پھیلاتا ہے،وہی درحقیقت بہادر اور جانباز انسان ہے۔یہ انسان اپنے عوام کو روشن خیالی اور ترقی دلانے کے لیے محنت کرتا ہے اور جو داعی یا مصلح ''اخلاق'' کی بات کرتا ہے وہ ترقی کی راہ میں ایک بھاری پتھر ہے اور عالمی امپریلیزم کا آلہ کار ہے،یہ بورژوائی طبقے اور رجعت پسندوں کا ایجنٹ ہے۔بلکہ ہر وہ شخص جو کیمونسٹ پارٹی کا مخالف ہو اگرچہ وہ چپ چاپ زندگی کیوں نہ گزارتا ہو،مزدور طبقے کا دشمن ہے اور استحصالی قوتوں کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کارندہ۔ ایسے کسی شخص سے دین کی خوشبو محسوس ہو تو اس نے اپنی ذات کو بدترین سزاؤں کے لیے پیش کر دیا۔ جس کا کم از کم درجہ یہ ہے کہ اسے تربیتی چھاؤنیوں میں بیگار کے لیے تیار رہنا چاہیے تا کہ اس کے دماغ سے تمام رجعت پسند افکار پگھل سکیں۔

کیمونسٹ نظریہ ایک متعصب قانونی دین ہے جو مدمقابل کو بحث مباحثے یا مقابلہ کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونسٹ ملک میں ہر چیز کا مارکس کے عقیدے سے پھوٹنا اور لاحق ہونا ضروری ہے۔ تجرباتی علوم اس لیے حاصل کیے جاتے ہیں تا کہ مادی فکر مضبوط ہو سکے اور کائنات کی ازلیت اور زندگی کی مادیت کو پروان چڑھایا جا سکے۔ ادب اور فن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اشتراکی واقعات کو لازماً بیان کرے۔ میڈیا کے وسائل کا بنیادی شغل یہ ہو کہ وہ کیمونزم کی حمد و ثنا کریں، نظام کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں، انقلابی کارناموں کی شرح میں مبالغہ کریں اور مخالفین کو بدنام کریں۔

اس طرح سے کیمونزم اپنے آپ کو ایک ہمہ گیر نظام زندگی کے طور پر لاگو کرتا ہے یعنی عقیدہ، طرز زندگی، قانون، علم و فکر، فن و ادب کے تمام پہلو۔ یہ ایک مکمل جاہلی فکر ہے جو دین کے حقیقی جامع مفہوم کے مدمقابل کھڑی ہے۔ یہ چاہتی ہے کہ دینی عقائد کو زندگی کے تمام شعبہ جات اور سرگرمیوں سے ہٹا کر اُس کی جگہ خود لے سکے۔

جدید جاہلیت کی معاصر صورت حال

یورپ نے اللہ تعالیٰ کا انکار کیا اور مادے کو معبود قرار دیا۔ اُس نے مسیحی زہد کو ترک کر دیا اور یہودی حرص و ہوس پر ایمان لے آیا۔ اُس نے اپنے اقتصادی نظام کو اللہ کے ماتحت کرنے سے انکار کر دیا اور اقتصادی فلسفیوں کی عبادت پر راضی ہو گیا۔ اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے خراج کے طور پر اپنا امن و سکون سپرد کرنا پڑا اور بہیمانہ معیار زندگی پر اترنا پڑا۔ یورپ کے جلاّد یورپ کو انواع و اقسام کے عذاب اور دردناک عبرتوں کا نشانہ بناتے رہے۔

مہلک اجتماعی امراض، مادے پر احمقانہ حد تک مرمٹنا، ہولناک محرومی کا احساس، چہروں پر چھائی ہوئی مایوسی اور بے قراری، یہ سب غیر اللہ کی عبادت اور حاکمیت کی فطری نشانیاں ہیں۔ خاص طور پر مادے کی پوجا اور طواغیت کی عبادت، انسان کو اپنا آپ بھلا دیتی ہے۔ اس کا دل تاریک ہو جاتا ہے اور احساسات پیٹ اور جسد کے مطابق بے وقوف بن جاتے ہیں۔ وہ حسی دنیا میں ایسا کھو جاتا ہے کہ اپنی تخلیق کی حکمت سے غافل ہو جاتا ہے، اپنے وجود کا مقصد بھول جاتا ہے اور آخرت میں اپنے حتمی انجام سے دور ہو جاتا ہے۔

استاذ محمد اسد کہتے ہیں: ''عام یورپی انسان چاہے وہ ڈیموکریٹک ہو یا فاشسٹ، سرمایہ دار ہو یا بالشویک، صنعت کار ہو یا مفکر، وہ فقط ایک ہی ایجابی دین کو مانتے ہیں اور وہ ہے مادی ترقی کی عبادت یعنی اُن کے عقیدے میں اس کے سوا کوئی ہدف نہیں کہ اِس زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان بنایا جائے۔ مختصر لفظوں میں اس طرح سے کہ فطرت کے ظلم سے آزاد ہوا جائے۔ اس دین کے عبادت خانے بڑی بڑی فیکٹریاں، سینما گھر، کیمیائی لیبارٹریاں،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رقصِ سرود کے اڈے اور بجلی پیدا کرنے کے مقامات ہیں۔ اس دین کے راہنما اور پیشوا بنکار، انجینئر، فلمی ستارے، صنعتی قائدین، ہوائی جہازوں کے پائلٹ ہیں۔ اِس کا قطعی نتیجہ قوت اور لذت حاصل کرنے کے لیے جان توڑ محنت ہے۔ اِس کے لیے بے شمار مسلح طاقتور جتھے اور گروہ ہیں جو ایک دوسرے کو صرف اس لیے فنا کے گھاٹ اتارنے پر تلے ہوئے ہیں کیونکہ اُن کے مفادات آپس میں ٹکراتے ہیں۔

ثقافتی پہلو سے دیکھیں تو اس کا نتیجہ ایک ایسے نوع انسان کی پیدائش ہے جس کا اخلاقی فلسفہ فقط ذاتی فائدہ اور عملی منفعت پر منحصر ہے۔ اُس کے نزدیک خیر و شر میں سب سے بڑا فرق فقط مادی ترقی ہے۔ (۳۴۷)

① سرمایہ دار مغرب میں جدید معاصر جاہلیت کی صورت حال:

مغرب کے بہت سارے مفکرین مادیت کے خوف ناک تسلّط سے خوف زدہ ہو گئے اور وہ انسانوں پر آلات کی حکمرانی سے گھبرا گئے۔ اکابر مفکرین اس پر نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔ مثلاً جارج برنانوس مشینوں کی خوفناک عمل داری کو انسانوں کی داخلی زندگی پر دنیا کی بہت بڑی سازش قرار دیتا ہے۔ اسی طرح جول رومان ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے خوف زدہ ہے اور معاشرتی اداروں (خاندان، قبیلہ، برادری وغیرہ) کے زوال پر پریشان ہے، اُس کے خیال میں انسانی فطرت مشینوں کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے لیکن معاشرتی اداروں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اِن مشکلات پر غم زدہ، متفکر اور ملول خاطر ہے۔ آلبر کا مومایوس ہو کر آہیں بھرتا ہے، جب وہ انسان پر مسلّط خوف اور بے چینی کی دہشت ناک کیفیت دیکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم ایک ایسے جہان میں زندگی گزار رہے ہیں جس میں انسان انسان پر بھروسہ نہیں کرتا لیکن وہ اپنے آلات اور خیالات پر اندھا اعتماد رکھتا ہے۔

بعض نے اس پر اضافہ کرتے ہوئے کہا: ''کیا تم موجودہ صنعتی نظام کو نہیں دیکھتے جس نے مزدوروں کے طبقے کو جانوروں کی طرح بنا دیا ہے، جو اندھی جبلت کے تحت چلتے جا رہے ہیں، وہ آدم کی اولاد نہیں رہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عقل کے استعمال کا شرف بخشا تھا۔۔۔ یہ جانوروں جیسے انسان ہیں جو مشینوں کے غلام ہیں!؟ (۳۴۸)

فلسفی جوڈ کہتا ہے: ''جب ہم کسی بھی حالت میں پُر یقین نہیں ہوں گے تو پھر ہماری آنے والی نسلیں نقد فائدے کے نظریے کو تھام لیں گی اور بعد میں آنے والی زندگی کے یقین سے محروم ہو جائیں گی۔ اس طرح اُن کی زندگی کا دائرہ بڑا محدود اور عملی رہ جائے گا۔ ایک تجربہ کار حکیم کہتا ہے کہ اس دور کے نوجوان ان حدود و قیود کو ہلکا سمجھتے ہیں جو اخلاق کا مرکز و محور ہیں اور جن سے علیحدگی فقط انیسویں صدی میں ہوئی ہے۔ یہ اخلاقی روایتی پابندیاں اپنی معروف قوت کھو چکی ہیں کیونکہ اُن کی نسبت کسی مافوق طبعی اتھارٹی سے نہیں رہی۔ ہم سنا کرتے تھے کہ فلاں نیکی کا کام اچھا ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ اپنے نیک بندے کو معتدل اور قناعت والی زندگی پر گامزن دیکھیں۔ نیکی کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا کا کسب ہوتا ہے، نیکی کا محرک نعمتوں والی جنت کا حصول اور جہنم سے نجات کی رغبت ہوتی ہے۔ اب لوگوں کے اندر آخرت کے ثواب کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طمع اور جہنم کے سزا کی وعید اس طرح سے طاقت ور نہیں رہی جس طرح سے پہلے تھی، لوگ اب ان باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جب لوگ جنت کی نعمتوں اور اس کی لذتوں کی امید ہی نہ رکھیں تو وہ لازماً دنیا کی سہولتوں اور عیاشیوں میں منہمک ہو جائیں گے۔(۳۴۹)

مفکر ٹونی اس بے راہ روی کا ذکر کرتا ہے جو مادیت پر ایمان لانے اور دین کو زندگی سے الگ کرنے کے نتیجے میں مغربی زندگی پر ظاہر ہو چکی ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ اخلاق کے پابند معاشرے اور بے راہ رو معاشرے میں فرق ہوتا ہے۔ پابند اخلاق معاشرے میں ہر انسان معاشرے کی خاطر اپنی افادیت اور اپنے کام کی قدر و منزلت پہچانتا ہے، جبکہ بے راہ رو معاشرہ کسی سعادت مندی کا قائل نہیں ہوتا، وہ کسی شخص کی قدر و قیمت اور اُس کے کام کی عظمت کو نہیں پہچانتا۔ بے راہ رو معاشرے میں کامیابی کی پیمائش دولت کے حصول کی بنیاد پر کی جاتی ہے، انفرادی مسئولیت یا کسی دوسرے معاشرتی معیار پر نہیں۔ وہ کہتا ہے: صنعتی انقلاب نے نسلوں کے اخلاقی بگاڑ میں انتہا درجے کی خرابی پیدا کر دی ہے۔ ٹونی بیان کرتا ہے: ''اخلاق کی تبدیلی خاص طور پر اٹھارویں صدی میں معاشرہ اور دین کے باہمی تعلق میں واقع ہوئی ہے۔ کلیسا اور ریاست اپنے اپنے دائرے کے اندر عوام کو معاشرتی اخلاق میں رہنے پر مجبور کرتے تھے، لیکن اب دونوں اپنے اس خاص وصف سے نیچے اتر آئیں ہیں'' وہ کہتا ہے: ''کلیسا ریاست کی بہ نسبت انسان کے روزمرہ حالات سے زیادہ بے دخل ہو چکا ہے۔ فلسفہ ہیومنزم کی محبت بڑھ گئی ہے اور دین جو ایک عظیم اجتماعی قوت تھا، ایک خالص انفرادی معاملہ بن گیا ہے جیسے کسی شخص کی انفرادی جائیداد یا کسی مزدور کے ذاتی مشاغل''(۳۵۰)

اِس کا نتیجہ فرد اور معاشرے کی تباہی و بربادی کی صورت میں نکلا جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مغرب کی مادیت قلق، بے چینی اور اضطراب کے جہنم تک پہنچ گئی۔

'الیکسیس دو توکفیل' امریکی معاشرے کے بارے میں کہتا ہے جو ایک واضح سرمایہ دار معاشرے کی مثال ہے: ''میں نے امریکہ کے اندر آزادی اور ثقافت کا وہ بلند معیار دیکھا جس کو دنیا پیش کرنے سے عاجز ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں نے غم اور الم کے بڑے بڑے بادل اُن کے سروں پر سایہ فگن دیکھے، حتی کے مجھے گمان ہوا کہ قلق اور غم ان کی عیدوں اور خوشیوں کے مواقع میں بھی ان کو چمٹے رہتے ہیں۔

امریکہ کا فرزند اس دنیا کے مال و متاع سے چمٹا رہتا ہے۔ شاید اسے اعتماد ہے کہ وہ کبھی نہیں مرے گا وہ جلدی جلدی ہر چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے، شاید وہ خوف زدہ ہے کہ اس کی زندگی اس کو اتنی مہلت نہیں دے گی کہ وہ ہر چیز سے لطف اندوز ہو سکے، وہ ہر چیز کو تھوڑی دیر کے لیے پکڑتا ہے اور پھر فوراً اس سے الگ ہو جاتا ہے تاکہ نت نئے تعیشات کا تجربہ کر سکے۔

میں پہلی دفعہ اُن مال داروں پر مسلط بے چینی کو دیکھ کر بڑا حیران ہوا جو دولت کے اندر کھیلتے ہیں۔ یہ چیز پرانے دور سے چلی آ رہی ہے لیکن اس میں نئی بات یہ ہے کہ اب اس بیماری میں پورے کا پورا معاشرہ گرفتار ہو چکا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور وہ ہمارے لیے ایک نئی مثال قائم کر رہا ہے۔

اہل مغرب کا جسمانی لذتوں کے ذائقے چکھتے پھرنا اس چیز کی علامت ہے کہ ان کے اندر ایک بہت بڑی بے قراری چھپی ہوئی ہے جس پر قابو پانے کے لیے امریکیوں کے نت نئے مشاغل اور مظاہر ہیں۔ امریکیوں کا دل اس چیز میں اٹکا ہوا ہے کہ دنیا کی ظاہری خوشیاں جن کا حصول ممکن ہے، کو جلد از جلد حاصل کرنا چاہیے اور لطف اندوز ہونا چاہیے کیونکہ وقت بڑا محدود ہے۔ دنیا کی زندگانی کا مختصر اور زوال پذیر ہونا ایک ایسا کانٹا ہے جو ان کے دلوں میں مسلسل چبھتا رہتا ہے'' (۳۵۱)

یہی ڈاکٹر الیکسس کارل ان لوگوں پر ملامت کرتا ہے جن کا گمان ہے کہ دنیا میں روپیہ پیسہ ہی سب کچھ ہے اور اقتصادی منصوبہ بندیوں اور دولت و پیداوار کی افزائش سے فرد اور معاشرے کا امن وسکون حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''کیا نصیب ہے کہ ایک ایسا حادثہ واقع ہو چکا ہے کہ جس کا خطرہ انجینئرز، اقتصادی اور سیاسی ماہرین کے دلوں میں کبھی پیدا نہ ہوسکا۔ امریکی مالیات کا عظیم الشان مینار اچانک گر چکا ہے، اکثر عوام نے شروع شروع میں اس مصیبت کے بالفعل واقع ہونے پر یقین نہ کیا لیکن اقتصاد کے ماہرین مسلسل اس اُمید کے ساتھ کوششوں میں جتے رہے کہ خوشحالی کا دور لوٹ آئے گا۔ لیکن کئی ذہین سرمایہ دار اس میں شک کرتے ہیں، وہ پوچھتے ہیں کہ تمام تر اقتصادی مشکلات کی وجہ فقط مالیاتی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی؟

کیا یہ درست نہیں کہ ہم فسادی اور کند ذہن سیاست دانوں کو الزام دیں یا سرمایہ داروں اور اقتصادی ماہرین کی جہالت کو الزام دیں؟ کیا موجودہ زندگی، عوام کی عقل واخلاق سمیت زوال پذیر نہیں ہو چکی؟!

ہم کیوں لاکھوں کروڑوں ڈالر مجرموں کے پیچھے بھاگنے میں خرچ کرتے ہیں؟!

جرائم پیشہ لوگ مسلسل بنکوں پر کامیاب حملے کرتے ہیں، پولیس کے آدمیوں کو قتل کرتے ہیں، لوگوں کو اغوا کرتے ہیں اور تاوان لیتے ہیں، یا بچوں کے بدلے میں بھاری بھرکم رقوم حاصل کرنے کے باوجود ان کو قتل کر دیتے ہیں؟!

اتنی مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کے درمیان کمزور عقل اور مجنونوں کی اتنی بڑی تعداد کیسے پیدا ہوگئی؟!

عالمی ایشوز پر غور وفکر کرنے والے انفرادی اور معاشرتی عوامل پر زیادہ غور وخوض کیوں نہیں کرتے وہ فقط اقتصادی عوامل پر ہی کیوں اکتفا کرتے ہیں'' (۳۵۲)

ڈاکٹر کارل نے بھانپ لیا کہ معاملہ اقتصادی مشکلات سے کہیں گہرا ہے لیکن وہ اِن مشکلات کے حقیقی سبب تک نہیں پہنچ سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ موجودہ انسان غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے اور شریعت سے ہٹ کر حکومت چلاتا ہے!

مغرب کا انسان فخر کرتا ہے کہ وہ ایسے جہان میں زندگی گذارتا ہے جو آزاد کہلاتا ہے وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے کہیں افضل سمجھتا ہے جو کیمونزم کے پنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ وہ بذات خود

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لاشعوری طور پر استحصالی سرمایہ دار طبقے کے سامنے بے بس اور مجبور ہے، وہ آزادی کی زندگی نہیں بلکہ خبط کی زندگی گزار رہا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل پیچھے گزر چکی ہے۔ ہم یہاں پر وہ باتیں ذکر کریں گے جس سے پتا چلتا ہے کہ سیاست اور اقتصاد کا آپس میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

ر۔م مائیکفر اور اس کا ساتھی کہتا ہے: جدید معاشرہ وسیع پیمانے پر بڑی بڑی تنظیموں، اداروں اور اقتصادی و سیاسی ڈھانچوں پر تشکیل پا چکا ہے جن کے فرائض اور مہارتیں آپس میں تقسیم شدہ ہیں، اس صورت حال میں فرد ایک بہت بڑی معاشرتی مشین کے اندر کسی نہ کسی گراری کا حصہ بن چکا ہے، اب اس کی ذمہ داری ایک مخصوص دائرے کے اندر مخصوص مشینی پرزے کی شکل میں اپنے کام کو ادا کرنا ہے، وہ اپنی انفرادیت کے اظہار کے لیے بہت کم مواقع پاتا ہے۔

اکثر لوگ اس وقت بے چین ہو جاتے ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ مہذب انسان کے خیالات اور آرا معاشرے کی ایک خاص نہج پر تشکیل پا رہے ہیں۔ متحدہ ریاست ہائے امریکہ کے اندر معاشرتی زندگی کے معیار میڈیا کے اشتہارات، وسیع عریض پروپیگنڈہ اور مسلسل فکری غذا کے ذریعے پابند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ریڈیو، ٹی وی اور ہالی وڈ سینما وغیرہ کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ لوگوں کی عقلوں پر اتنا مضبوط تسلط قائم کیا جاتا ہے کہ پروڈیوسر، رائٹر، مزدور اور فنکار کے لیے وسیع دائرہ عمل برقرار ہی نہیں رہتا۔ اسی طرح عوام کے اخلاق اور رجحانات پر ایسے پردے حائل کیے جاتے ہیں کہ وہ ان سے تجاوز نہیں کر سکتے۔ (۳۵۳)

ڈاکٹر کارل کہتا ہے کہ سرمایہ داری کا مسلط کردہ پروپیگنڈہ ایک قسم کا فکری استعمار ہے۔ ہماری زندگی میڈیا پر آنے والے تجارتی اشتہارات سے بہت متاثر ہوتی ہے۔ یہ پروپیگنڈہ صارفین کے مفاد کے بجائے اشتہار بازوں کے مفادات کو ہدف بناتا ہے۔ مثال کے طور پر اس پروپیگنڈے نے عوام کو وہم میں ڈال دیا کہ سفید روٹی گندمی روٹی سے افضل ہوتی ہے حقیقت یہ ہے کہ آٹے کو بار بار چھان کر اس کے مفید غذائی اجزا الگ کر لیے جاتے ہیں اور آٹا ایک طویل مدت تک محفوظ رہنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے اور اس سے روٹی تیار کرنا آسان ہوتا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی وجہ سے چکی والوں اور ہوٹل والوں نے خوب کمائی کی اور صارف عوام کو ناقص روٹی استعمال کرنی پڑی۔ عوام یہی سمجھتے رہے کہ وہ بہتر روٹی استعمال کر رہے ہیں۔ اس طرح شہروں کی ایک بہت بڑی آبادی جو روٹی کو بنیادی غذا کے طور پر استعمال کرتی ہے، کمزوری اور خرابی کا شکار ہوئی۔

پروپیگنڈے پر رقوم کی ایک بہت بڑی مقدار خرچ کی جاتی ہے حالانکہ بہت ساری غذائی اور طبی پیداواروں کا زیادہ فائدہ نہیں ہوتا اور اکثر وہ نقصان دہ بھی ہوتی ہیں، لیکن وہ پڑھی لکھی عوام کے لیے ایک بنیادی ضرورت بن جاتی ہیں۔ اس طرح لالچی موقع پرست طبقہ اپنے سامان تجارت کو بیچنے کے لیے عوام کو خوب استعمال کرتا ہے۔ عوام یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ فلاں چیز کا استعمال موجودہ زندگی میں بنیادی کردار کا حامل ہے۔ (۳۵۴)

مغربی سرمایہ دار دنیا میں بعض ایسے مصنفین ہیں جنھوں نے انسانیت کے اُس پُرخطر مستقبل کے بارے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں خصوصی مہارت کے ساتھ تحریریں لکھی ہیں جو بڑے بڑے سرمایہ دار طاغوتی طبقے کے ہاتھوں لاحق ہوسکتا ہے۔ یہ ایک مٹھی بھر مقتدر طبقہ ہے جو ٹیکنالوجی اور جدید نفسیاتی و معاشرتی تحقیق کی بدولت انسانوں پر حاوی ہے۔ مستقبل میں انسان گزرے ہوئے جاگیردارانہ نظام کو دیکھے گا اور اسے اپنے موجودہ نظام سے ہزار گنا افضل قرار دے گا۔ موجودہ نظام کی شکل میں اسے حقیقی تباہی اور خوف ناک استبداد کا سامنا ہے۔

یہاں ہماری مراد وہ کتابیں نہیں جو یہود کے متعلق لکھی گئیں کیونکہ یہ تالیفات انتہائی مضبوط حقائق پر مشتمل ہونے کے باوجود بعض لوگوں کے ہاں شک وشبہ کا محل ہوسکتی ہیں۔ ہماری مراد وہ مصنفین ہیں جو عام فہم زبان استعمال کرتے ہیں اور اپنے خوف ناک اندیشوں کو ثابت کرنے کے لیے علمی وادبی اسلوب استعمال کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مغربی مصنف جارج اورویل ہے جس نے اپنی کتاب ''۱۹۸۴'' کے عنوان سے لکھی۔ اس کتاب کے اندر اُس نے انسان کے مستقبل کے بارے میں ایسی خوف ناک منظر کشی کی کہ رسل کے بیان کے مطابق پڑھنے والا تھرا اٹھتا ہے۔ اگرچہ اُس کے نظریات پر اعتراضات بھی کیے گئے لیکن عملی صورت حال اس کی تائید کرتی ہے اور بہت سارے مفکرین اس کے حامی ہیں چنانچہ رسل نے بھی اس کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ دنیا آہستہ آہستہ، قدم بقدم اُس دہشت ناک صورت کی طرف بڑھ رہی ہے جس کو اورویل نے بیان کیا لیکن یہ رفتار اتنی ہلکی ہے کہ لوگوں کو اپنے حتمی انجام کا احساس نہیں ہو رہا۔ ہماری صورت حال سولہویں صدی کے طاقت ور بادشاہی دور کے مشابہ ہے۔ بادشاہوں کا غلو اور سرکشی مختلف روایتی تحریکوں کو کھڑا کرنے کا سبب بنی لیکن جب بادشاہوں کی قوت کمزور ہوئی اور اُس کی جگہ دوسری قوتیں پیدا ہوئیں تو وہ پہلے سے کم خطرناک نہیں تھیں۔ (۳۵۵)

امریکہ میں ایک یونیورسٹی کا پروفیسر انتہائی محنت کے ساتھ اعداد وشمار اور واقعاتی شواہد کو استعمال کر کے اورویل کے بیان کردہ خطرات کو مزید واضح کرتا ہے۔ اُس نے پوری قوت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ امریکہ میں مالیاتی امپیریلزم انسان پر اتنا گہرا تسلط حاصل کر چکا ہے جو اورویل کے وہم گمان میں بھی نہ تھا لیکن خفیہ اسلوب، گہری منصوبہ بندی اور میڈیا پر شدید قبضے نے اِس خرابی پر گہرے پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ اس نظام کے خوف ناک پنجوں کا احساس لوگوں کو شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ پروفیسر فینس بیکارڈ کہتا ہے: ''ایک معاشرہ وہ ہے جس کی کوشش ہے کہ لوگوں کو چاند پر لے جائے جب کہ اُسی معاشرے کے لاکھوں شہری اپنے گھروں کے قریب واقع باغوں اور سڑکوں پر اکیلے پیدل چلنے کی جرأت نہیں رکھتے''۔ (۳۵۶)

وہ اپنی کتاب ''ننگا معاشرہ'' میں اُن پوشیدہ وسائل وذرائع کا ذکر کرتا ہے جن کو استعمال کر کے مالیاتی امپیریلزم نے انسان کی آزادی کو ٹھیس پہنچائی اور اُس کے سلوک وشعور پر قبضہ کیا۔ وہ اُن ذرائع کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

① الیکٹرونک ذرائع سے لوگوں کی گفتگو چوری کرنا۔ یہ وہ ذرائع ہیں جن کے ذریعے سے لوگوں کے ٹیلی فونک مکالموں کو ریکارڈ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے کچھ آلات انتہائی باریکی اور دقت کے ساتھ تصویر کشی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتے ہیں۔ کچھ نہ نظر آنے والی آنکھیں، کان اور عقلیں اپنے شکار کی سانسوں پر بھی حیران کن باریک بینی کے ساتھ گھات لگائے ہوتی ہیں۔

② لوگوں کے جھوٹ ظاہر کرنے کے لیے خصوصی آلات۔ کچھ بھاری بھرکم کمپنیاں اپنے اہل کاروں کا شخصی سامنا کرنے اور ان کے کام کا جائزہ لینے کے لیے یہ آلات استعمال کرتی ہیں۔

③ انسانی آنکھوں کے ساتھ براہ راست یا ٹیل فون کالز کے ساتھ خفیہ جاسوسی۔

④ نفسیاتی آزمائش اور اعداد و شمار کے ساتھ جمہور عوام کو دھوکا دینا۔ کچھ ذخیرہ اندوز کمپنیاں اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے بہانے کئی اہم قواعد اور معلومات حاصل کرتی ہیں اور اس کی روشنی میں مستقبل کے منصوبے بناتی ہیں۔

⑤ بنک اور انشورنس کمپنیاں اور ذرائع رسل کے ادارے۔ یہ فرد کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی، دولت اور تعلقات کے بارے میں وافر معلومات پیش کرے اور وہ ان معلومات کو لاعلمی میں ذاتی اغراض کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

⑥ افراد اور اداروں کی جاسوسی و معلومات کے لیے کئی قسم کی خصوصی کمپنیاں۔ یہ کمپنیاں اپنی معلومات کے تحت لسٹیں تیار کرتی ہیں جن کو کمپنیاں اور تجارتی ادارے بھاری رقوم کے ساتھ خریدتے یا ادھار لیتے ہیں۔ (۳۵۷)

اس دہشت ناک صورت حال کا ادراک بہت سارے لوگوں نے کیا، جن کو امریکہ میں اجتماعی مصلح کے نام سے پکارا جاتا ہے، حتی کے معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ ان میں سے ایک مصلح ہ۔ل۔منکن متوفی ۱۹۵۶ء کہتا ہے:

یہ بات ظاہر ہو چکی ہے کہ اب بعض لوگوں کے لیے شہروں میں زندگی گزارنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو گئی ہے۔ اُن کی مشکلات اور پریشانیوں سے ہفت روزہ رسائل بھرے پڑے ہیں۔ نیویارک سے چلنے والے بحری جہاز جو لوگوں سے بھرے ہوتے ہیں، پاریس، لندن، میونخ اور روم وغیرہ جیسے علاقوں کی طرف رخ کرتے ہیں جو راستے میں واقع ہیں۔ یہ لوگ راستے میں کسی بھی جگہ اتر جاتے ہیں تا کہ وہ اُن بڑی بڑی لعنتوں اور خوفناک گناہوں سے بھاگ سکیں جنھوں نے اپنے وطن کے اندر اُن کی زندگی اجیرن کی ہوتی ہے۔

پھر منکن اُس کی وجہ بیان کرتا ہے کہ امریکہ کی حکومت اپنے قانونی و انتظامی اسلحے سمیت جاہل اور نادان ہے جو لوگوں کے دلوں میں گھٹن پیدا کر رہی ہے۔

امریکی وزارت عدل غافل اور ناکام ہے جو ہر معقول اور عدل والے کام کے الٹ کام کرتی ہے۔

امریکہ کی خارجی سیاست دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں، چاہے وہ دوست ہوں یا دشمن اپنے عمومی اسلوب کے تحت ریاکاری، دھوکہ دہی اور مکر و فریب کی سیاست پر عمل کرتی ہے۔

امریکی عوام ان سب باتوں کو قبول کر کے ایک بہت بڑا مجموعہ تشکیل دیتے ہیں جو معمولی درجے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بزدل، حقیر اور غلامانہ ذہنیت کے حامل لوگ ہیں اور یہ بزدلی، ذلت اور حقارت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ میں اپنے اس شہر میں کسی بھی دوسرے شہر کی بہ نسبت عام اور خاص قسم کا جنون زیادہ دیکھتا ہوں۔ میں ایسے بھاری بھرکم گروہوں کو بھی دیکھتا ہوں جن کے سلبی اعمال کی کوئی حد نہیں، حکومت کو دھوکہ دینا، تجارتی چور بازاری، پھانسیاں، مذہبی دیوانگی، شعور کی کمی، چھینا جھپٹی، قانونی طور پر جائز زنا، قسم قسم کے ہتھکنڈے، تذلیل نفس، بے وقوفی، مسخرہ پن اور عیش وعشرت وغیرہ۔ یہ ایک بہت بڑا غیر معقول جلوس ہے جو ایک بڑی قوت کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اور اُس کو ایسی جرأت اور غیر معمولی پن کی غذا دی جاتی ہے جس کی تصدیق کرنا مشکل ہے۔ (۳۵۸)

یہ وہ بات ہے جس کو سرمایہ دار مصنفین اپنے سرمایہ دارانہ مصادر کے مطابق صدفی صد (۱۰۰٪) قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ اعترافات ہیں جن کو انسان پہلی نظر میں بالشویک پروپیگنڈے کا حصہ سمجھتا ہے۔

جو کچھ بیان ہوا، یہ سب ہر اس معاشرے کی علامات ہیں جو ذکر الٰہی سے اعراض کرتا ہے۔ مادی خواہشات پر حریص کتوں کی طرح جھپٹنے کا یہی نتیجہ ہے۔ یہ ایک ایسی بدبختی ہے جس کو نفسانی خوشحالی اور دنیوی عیش وعشرت مدہم نہیں کر سکتی اور نہ ہی تہذیبی وصنعتی ترقی کے پردے اس کو چھپا سکتے ہیں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جو قابو سے باہر ہے اور اسے جڑ سے اکھاڑنا مشکل ہے۔

مغرب کے عقلا جو زیادہ سے زیادہ ادراک کر سکتے ہیں اور اپنی عوام کو بتلا سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ان کی تہذیب کا قلعہ منہدم ہو رہا ہے اور مادے کا روح پر خوف ناک غلبہ ہو رہا ہے۔ لیکن وہ یہاں پر رک جاتے ہیں، وہ کوئی علاج تجویز نہیں کر سکتے، کچھ مسکن ضعیف ادویات مرض کا مقابلہ کرنے کے لیے ضرور بتائی جاتیں ہیں۔ انسان کی محدود عقل جب اللہ تعالیٰ سے تعلق توڑ ڈالے اور اُس کے نور سے روشنی لینے پر راضی نہ ہو تو یہی حال ہوتا ہے۔

اگر اُن لوگوں کو جو گاہے بگاہے مغربی تہذیب کے خاتمے پر چیختے چلاتے رہتے ہیں، کہا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو وہ اپنی مخلوق میں جاری کرتا ہے، اگر لوگوں کو کہا جائے کہ وہ پوشیدہ بیماری پر اپنا ہاتھ رکھیں تو صورت حال مکمل طور پر بدل سکتی ہے لیکن

وَأَنَّىٰ لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍۭ بَعِيدٍ (سبا۔ ۳۴/۵۲)

لیکن اس قدر دور جگہ سے (مطلوبہ چیز) کیسے ہاتھ آسکتی ہے۔

② کیمونسٹ مشرق میں سیکولر اقتصاد کے نتائج:

مغرب کے سرمایہ دار، مشرق کے کیمونزم کو ظالم وجابر باور کراتے ہیں اور یہ بات درست ہے کہ کیمونسٹ نظام کے آہنی پنجوں کے نیچے ایک بہت بڑا طبقہ مظالم کی چکی میں پس رہا ہے۔ کیمونسٹ دنیا اللہ تعالیٰ کی دشمنی، ایمان سے جنگ اور انسان کی فطرت واخلاق دشمنی میں جتنی آگے بڑھی ہوئی ہے، اتنا ہی یہ بدبختی اور بربادی میں انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سیکولر نظام میں انسان کی عزت اور کرامت فقط حیوان کے درجے تک نہیں پہنچی بلکہ بے جان مادے تک پہنچ گئی ہے اور یہی کیمونسٹ جاہلی نظام کا جوہر ہے، یہی اس کے پروگراموں اور منصوبہ بندیوں کا اصل ہدف ہے۔ جس کفر پر یہ پہلے تھا اور اب ہے، ایسا ہونا ہی تھا۔

کیمونزم زندگی کے ہر شعبے میں انتہائی گہرے شر اور فساد کا حامل ہے لیکن اس کا اقتصادی شعبہ کیمونسٹ ملکوں میں سب سے زیادہ بہتر اور لائق ہونا چاہیے تھا کیونکہ کیمونزم کے وجود کا فکری و عملی تاریخی سبب ہی سرمایہ داری کے مظالم اور فسادات تھے لیکن جب کیمونزم آیا اور اُس نے بھی سرمایہ کے طاغوتوں اور جاگیری سرداروں پر شفقت کی تو یہ واقعی حیران کن چیز تھی۔

چونکہ کیمونزم لوگوں کے درمیان خیالی مساوات کا علمبردار تھا اور ہر قسم کے طبقات، امتیازات اور اونچ نیچ کو مذموم گردانتا تھا لہٰذا اس مذہب کے لائق تھا کہ یہ کم از کم دنیا کے تمام نظاموں سے زیادہ مساوات کا حامل ہوتا اور اس کے اندر طبقاتی فرق کم سے کم ہوتا۔ لیکن جنتِ ارضی کے دیکھے گئے خواب پورے نہ ہوئے، کیمونسٹ ملکوں کی عملی صورت حال اس کے بالکل الٹ نکلی۔ **میلوفان دجیلاس** جو کہ صدر ٹیٹو کا نائب ہے اپنی کتاب ''نیا طبقہ'' میں لکھتا ہے: ''کیمونسٹوں کا جدید بیوروکریٹ طبقہ بڑے بڑے امتیازات کا حامل ہے، وہ ریاست کے وسائل کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لیے خوب استعمال کرتا ہے۔ اور جب ہم کیمونسٹ ملکوں میں ملکیتوں کی صورت حال دیکھتے ہیں تو وہ نفع کے حقوق اور تسلّط سے آزادی کی صورت میں گنوائے گئے۔ اور جب کوئی انسان ان حقوق اور حریت کے واسطے سے ایک مخصوص طبقے کے نفع کو محدود کرنا چاہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کیمونسٹ حکومتوں نے بالآخر ایک نئی قسم کی ملکیت کو تشکیل دیا ہوا ہے اور ایک نیا سرمایہ دار حاکم طبقہ وجود پذیر ہے۔

کیمونسٹ نظام کی طغیانی اور **حکومتی دہشت گردی** نے اس نئے طبقے کو امتیازات کی ضمانت بخشی ہے جو سیاسی اسٹیج پر نیا ظاہر ہوا ہے۔

یہ بات گزر چکی ہے کہ اسٹالن نے جب ۱۹۳۶ میں سویت یونین کے نئے دستور کا اعلان کیا تو محسوس ہوتا تھا کہ سرمایہ دار طبقے کا وجود مکمل طور پر مٹا دیا جائے گا اور یہ حقیقت ہے کہ کیمونسٹ فوجی چھاونیوں میں مقامی سرمایہ دار قوتوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی عین کیمونسٹ معاشرے میں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

اس طبقے نے ثابت کیا کہ یہ تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہونیوالے کسی بھی دوسرے طبقے سے زیادہ حکومتی تسلّط کا حامل ہے۔ اس نے جدید طبقاتی معاشرے میں ظلم کے زیادہ بھیانک طور طریقے رائج کیے۔

مادی ساز و سامان اور شعبوں کو قومی ملکیت میں لایا گیا لیکن اس کی تقسیم عوامی شہریوں پر عمل میں نہ آسکی بلکہ یہ ایک مخصوص حاکم طبقے کے لیے ملکیت بن گئی جو کیمونسٹ پارٹی کے قائدرکن تھے اور سیاسی بیوروکریٹ تھے۔

ممتاز چنے ہوئے افراد جو پارٹی کے بڑے ممبر تھے، نے بہترین رہائش گاہیں اور گھر سنبھال لیے ان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے مخصوص کالونیاں اور گیسٹ ہاؤس مقرر کیے گئے۔ پارٹی کے راز داں امین اور خفیہ پولیس کے بڑے افسر فقط اعلیٰ اقتدار کے مالک ہی نہیں تھے بلکہ وہ عالیشان خوبصورت گھروں میں رہتے، شان وشوکت والی گاڑیوں میں گھومتے اور کروفر والے تمام امتیازات استعمال کرتے، جبکہ باقی ممبران جو مرتبے میں کم تر ہوتے، اپنے مرتبے کے مطابق پارٹی کے مراکز استعمال کرتے۔

تاریخ میں کوئی بھی طبقہ اس جدید طبقے کے مشابہ نہیں ہے کیونکہ یہ اپنی قوت کے ارتکاز، وحدت فکر وعمل اور ذاتی دفاع میں منفرد تھا۔ یہ عوام پر ایسے گہرے تسلط اور استبدادی قوت کا حامل تھا جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

یہ نیا طبقہ بھی بورژوائی حرص وہوس سے لطف اندوز ہوتا تھا لیکن اس کی خوبیوں سے مکمل طور پر محروم تھا۔ ایک اور طرح سے دیکھیں تو یہ طبقہ اپنے بعض خاص امور میں اور انفرادی مزاج میں ارسٹوکریسی (طبقہ اشرافیہ کی حکومت) کے طبقے کے مشابہ تھا لیکن اُس جیسی رقت، شرافت اور بلند اخلاق سے کوسوں دور تھا۔ (۳۵۹)

ایک فرانسیسی مصنف اندریہ جید جو سوویت یونین کی زیارت کرنے گیا اور کمیونزم سے سخت مایوس ہو کر واپس لوٹا، اپنی کتاب ''سوویت یونین سے واپسی'' میں بہت ادبی پیرائے میں صورت حال کی وضاحت کرتا ہے:

''میں ہوٹل سینوب کے بارے میں کیا کہوں جہاں میں سوکوم کے پڑوس میں رہتا تھا یہ ہر چیز سے زیادہ خوبصورت اور شان وشوکت والا تھا۔ یورپ کے بڑے قابل فخر ہوٹل بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس ہوٹل کے پڑوس میں ایک ماڈل فارم تھا جو ہوٹل کے منافع سے چلایا جاتا تھا۔ فارم گھوڑوں، گائیوں، سوروں اور مرغیوں کے ماڈل مویشی گھروں پر بھی مشتمل تھا۔ یہ سب کچھ جدید وسائل سے آراستہ تھا لیکن جب آپ اس نہر کو عبور کریں جو کھیتوں کے لیے حد بندی کا کام کرتی ہے تو آپ کو حقیر گھونسلوں کی ایک لائن نظر آئے گی۔ یہ چھ مربع گز کے چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں سے ہر ایک کے اندر چار افراد رہتے ہیں اور ہر ایک کو چند روبیل ماہانہ اجرت ملتی ہے''

مخفی سرمایہ داری نے سوویت یونین کے مزدور کو مکمل آزادی نصیب نہیں کی۔ ہر علاقے کے مزدور طبقے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ سرمایہ دار مالکین مزدوروں کا اس وقت تک استحصال نہیں کر سکتے جب تک وہ خفیہ اور غلط طریقے استعمال نہ کرلیں اور مزدوروں کو پتہ نہ چلے کہ اُن ملامت کا مستحق کون ہے؟

ایک غالب اکثریت فقیری کے معیار پر زندگی گزارتی ہے، اُن کی معمولی اجرتیں اُن بڑے مزدوروں کی جیبوں کو بھرنے کا سبب بنتی ہیں جو نظام کے ساتھ مکمل خوش آمدانہ تعلقات اختیار کرتے ہیں اور اپنی ذاتی شخصیت مٹا ڈالتے ہیں۔ انسان حیران اور ششدر رہ جاتا ہے جب شان وشوکت والا طبقہ معمولی طبقے کی پروا نہیں کرتا اور معمولی طبقہ عاجزی اور غلامی کی تصویر بنا ہوتا ہے۔

یہ بات ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سوویت یونین میں طبقات یا طبقاتی امتیازات کا وجود نہیں رہا لیکن وہاں فقرا ہمیشہ فقیر ہی رہے اور ان کی ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شاید میں ایک نئی قسم کا مزدور بورژائی طبقہ دیکھ رہا ہوں جو اُس حقیر بورژوائی طبقے کے مشابہ ہے جو میرے ملک میں موجود ہے۔ میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے عملاً اس کی ساری علامات بھی دیکھیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سارے لوگوں کے نزدیک انقلاب کے باوجود بورژوائی طبقے کی تمام خرابیاں موجود ہیں اگرچہ وہ پس پردہ ہیں۔

انسان کی ظاہری اصلاح ممکن نہیں جب تک اُس کی جوہری اور قلبی اصلاح نہ ہو، اِس لیے مجھے شدید قلق ہوا جب میں نے بورژوائی جذبات کو مکمل آزادی اور مبالغے کے ساتھ سویت یونین میں پروان چڑھتے دیکھا۔

یہ بات درست ہے کہ جس مزدور طبقے کی آمریت کا دعویٰ کیا جاتا تھا وہ ابھی تک روبہ عمل نہیں بلکہ اس کی جگہ پر ایک خاص قسم کی آمریت ہے جو سوویت بیوروکریسی کی استبدادی حکومتی آمریت ہے۔ غریب مسکین روسی مزدور اپنی فیکٹری کیساتھ بندھا ہوتا ہے اور زراعتی مزدور اپنے اجتماعی زرعی فارم کے ساتھ ایسے بندھا ہوتا ہے جیسے پہیہ کا ایکسل پہیہ کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ جب کوئی مزدور اپنے موجودہ کام سے مطمئن نہ ہو اور وہ کسی دوسری جگہ پر بہتر کام کی امید رکھتا ہو یا معمولی تبدیلی کا خواہش مند ہو تو اس کی رجسٹریشن اس کے لیے ایک خطرہ بن جاتی ہے کہ وہ کسی بھی جگہ کام تلاش نہیں کرسکتا بلکہ اگر وہ فیکٹری چھوڑ دیتا ہے اور اسی شہر میں رہنا چاہتا ہے تو اس کے لیے فیکٹری کی رہائش استعمال کرنا ممنوع ہو جاتا ہے اگرچہ وہ اُس کی اجرت بھی ادا کرتا ہے، اسے کسی دوسری جگہ رہائش ملنا بھی مشکل ہے۔۔۔ اسی طرح اگر ریاست بذات خود اس کو کسی سبب سے دوسری جگہ منتقل کرنا چاہے، تو وہ انکار کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ وہ کسی جگہ رہنے اور دوسری جگہ جانے میں آزاد نہیں، چاہے اُس کے جذبات اور ذاتی مصلحت جتنا بھی تقاضا کریں۔ (۳۶۰)

ایسے ڈھیروں قطعی شواہد ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ انسان جو کیمونسٹ جابلیت کے زیر سایہ زندگی گزار رہا ہے، انتہائی خوف ناک صورت حال سے دوچار ہے۔ اسے فقط ذہن اور روح کے زخموں سے ہی دوچار نہیں ہونا پڑتا بلکہ وہ دن بدن جسمانی قوت کے انحطاط کا شکار بھی ہے۔ کیمونزم کے بعض متوالے کیمونسٹ صنعتی انقلاب اور اس کی حیرت انگیز ترقی سے ششدر رہ جاتے ہیں۔ نام نہاد ترقی ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے اور وہ بعض تلخ حقائق دیکھ نہیں پاتے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی عقیدے یا مذہب کی کامیابی کا حقیقی معیار اولاً انسان کی سعادت اور طمانیت ہے مادی پیداوار نہیں، چاہے وہ جہاں تک پہنچ جائے۔ اس حقیقت کا اعتراف ایک ایسے شخص نے کیا ہے جو کیمونزم سے مرتد ہوگیا۔ وہ افسانہ نگار مصنف لوئس فیشر ہے۔ وہ اپنے آپ کا مذاق اُڑاتا ہے جب وہ انسانوں کی بجائے کلوگراموں کو فضیلت دیتا تھا اور بعض تعمیر و ترقی کے میدان میں کیمونسٹ انقلاب کی کامیابیوں سے متاثر تھا۔ (۳۶۱)

دوسری حقیقت یہ ہے کہ بعض شہری میدانوں میں مغرب نے بے تحاشہ ترقی کی ہے، اُن میں کیمونزم کی ترقی بہت کم ہے۔ مشرق کا کیمونسٹ جس میدان میں ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ ایک مخصوص قسم کا جنگی ساز و سامان ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اُس صورت ممکن ہوا ہے کہ کیمونزم نے عوام پر آہنی ہاتھ ڈالا اور اُن کو اس درجہ دہشت زدہ کیا کہ وہ بیرونی مدد کی ہر امید اور سوچ کھو بیٹھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تیسری حقیقت یہ ہے کہ کیمونسٹ ترقی کے تمام تر فوائد استبدادی حکمران طبقے کو ہی حاصل ہوئے ہیں اور عوام فقط قربانی کی بھینٹ ہے۔ اگر فوجیوں کے بیگار کیمپ نہ ہوتے تو یہ کبھی بھی ممکن نہ ہوتا۔

دجیلاس کہتا ہے: ''زراعت اور مویشوں کے محصولات کے جدید ملکیتی نظام میں خساروں کو اعداد و شمار میں گننا ممکن ہے لیکن وہ اعداد و شمار گننا بہت مشکل ہے جو مزدور طبقے کے ہاتھوں خسارے کی صورت میں ظاہر ہوئے، لاکھوں کسانوں کو نظر بندی کے مقامات پر قید کیا گیا اور فوجی کیمپوں میں جبراً بیگار لی گئی۔ (۳۶۲)

''دو انسانی نظام، ڈیموکریسی اور کیمونزم'' کا مصنف ہمیں اس حقیقت کے قریب کرنے کے لیے اعداد و شمار فراہم کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

''۱۹۲۸ کے اندر روس میں تیس ہزار بیگار مزدور تھے۔ اور جب اسٹالن نے پانچ سالہ منصوبے کا اعلان کیا کہ وہ روس میں نئی صنعتیں قائم کریں گے تو بیگار کیمپ بڑی تیزی سے ابھرنے لگے حتیٰ کہ ۱۹۳۳ میں پانچ لاکھ بیگار مزدور تھے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ تعداد دس لاکھ سے پندرہ لاکھ تک با آسانی شمار ہو سکتی ہے۔ آغاز میں بیگار فوجی کیمپوں میں صرف اُن لوگوں کو بھیجا جاتا تھا جو سویت یونین کے حقیقی دشمن ہوتے تھے لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ ایک بہت بڑی تعداد عام لوگوں کی صفوں سے نکل کر بیگار مزدوروں کی صفوں میں داخل ہو گئی، فقط اس وجہ سے کہ وہ حکومت کے لیے کسی نہ کسی دن خطرہ بن سکتے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب حکومت نے دور دراز کے علاقے میں اپنے کچھ پروجیکٹ شروع کرنے کا ارادہ بنایا اور وہاں پر مزدور اپنی خوشی سے جانے کے لیے تیار نہیں تھے۔

چین کے اندر بھی اسی طرح ۱۹۴۹ء میں، داخلی جنگ اور کیمونزم کے غلبے کے فوراً بعد بڑی تیزی سے فوجی بیگار کیمپ قائم کیے گئے۔ سرخ چین کے اندر بیگار مزدوروں کی تعداد کا اندازہ بیس ملین سے زیادہ ہے۔ (۳۶۳)۔ یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ صنعتی ترقی کوئی کافی شافی معیار نہیں۔ صنعتی عمل کا مزاج ہے کہ یہ آسانی کے ساتھ خفیہ پولیس کی نگرانی میں جاری رہتا ہے کیونکہ ہر مزدور کی ذمہ داری معروف ہوتی ہے اور اس کی کوتاہی سہولت سے پکڑی جا سکتی ہے۔ صنعتی عمل بڑی باریک بینی سے مزدوروں کے درمیان تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن زراعتی عمل اس قسم کی آلاتی نگرانی میں جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ زراعتی ترقی کے میدان میں کیمونزم کی اصل صورت حال لوگوں کے سامنے آ گئی۔ روس کے قیصری دور میں روس کی گندم کی پیداوار پوری دنیا میں سب سے زیادہ تھی بلکہ اس کا صرف ایک حصہ یوکرائین پورے یورپ کی غذائی کفالت کے لیے کافی تھا لیکن اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ سویت یونین اپنے نظریاتی مخالف یعنی لبرل سرمایہ دار ملکوں سے گندم کا عطیہ مانگتا ہے اور ان کو بھاری بھرکم قیمت ادا کرتا ہے۔ یہ اقتصادی نظام کی صورت حال تھی جو کیمونزم کا سب سے اہم اور ترقی یافتہ پہلو تھا۔ یہ کیمونسٹ نظام کی کامیابی یا ناکامی پرکھنے کا حقیقی پیمانہ بن سکتا ہے۔

لوئس فیشر روس کے قومی اجتماعی زرعی فارموں کی صورت حال پر بعض اہم حقائق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''یہ اجتماعی زرعی فارم اجتماعی غلامی کی نئی اور انوکھی مثال ہیں جو بیسویں صدی کے ہی لائق تھیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسانوں کو بستی کے کمیونسٹ وڈیروں کی زیر نگرانی اور اُن کے نیزوں کی انیوں کے زیر سایہ مزدوری پر مجبور کیا جاتا ہے۔ وہ مستقل طور پر اپنے بیج، آلات، ڈھور ڈنگر اور دیگر معاملات میں ریاست کے سامنے مجبور محض ہیں۔

جب بڑی سختی کے ساتھ زراعت کو قومیانے کا عمل جاری ہوا تو فطری طور پر اس کا شدید ردعمل ظاہر ہوا لیکن حکومت نے اس کو سختی سے کچل دیا۔ کئی لاکھ مال دار کسان ''کولاک'' مقام سے اجتماعی بیگار کیمپوں میں منتقل کیے گئے۔ بستی کو تباہ کرنے کے لیے فقط اجتماعی جلا وطنی کو ہی کافی نہیں سمجھا گیا۔۔۔ ذمہ داروں نے کسانوں کو اجتماعی زرعی فارموں میں داخل کرنے کے لیے قوت کا استعمال کیا۔ سرخ کمیونسٹ فوج کے سپاہی عموماً بستی میں ظاہر ہوتے، ایک جھونپڑے سے دوسرے جھونپڑے میں منتقل ہوتے اور پوری آبادی کو اجتماعی زرعی فارم تشکیل دینے کا حکم جاری کر دیتے۔

کسانوں کو سائبیریا اور ترکستان کی طرف جلا وطنی کی دھمکی دی جاتی تھی جیسے ''کولاک'' مقام پر ان کسانوں کے ساتھ سلوک کیا گیا جو اپنی ذاتی نجی کھیتی باڑی سے چمٹ گئے۔

اس طرح سے روسی کسانوں کی بھاری اکثریت کو اجتماعی زرعی فارموں میں دھکیل دیا گیا لیکن وہ اس کے باوجود اپنی کوششوں میں لگے رہے، وہ اب تک یہی امید کرتے ہیں کہ حکومت اجتماعی زرعی فارم کے نظام کو ایک ناکام اور مسترد فکر تسلیم کر لے اور اس سے پیچھے ہٹ جائے۔ ان معاملات کی وجہ سے یوکرائن میں ۱۹۳۱ اور ۱۹۳۲ میں ایک عام قحط سالی ہوئی جس میں کئی ملین لوگ مارے گئے۔ بستیاں اپنے تمام افراد سمیت ہلاک ہو جاتی تھیں۔ یہ بالشوزم کی جلد بازی اور تعصب کی قیمت تھی''

اندریہ جید کہتا ہے: ''مجھے ایک دفعہ ایک اجتماعی زرعی ماڈل فارم دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ فارم سویت یونین کا سب سے انوکھا اور مالدار فارم تھا۔ میں کئی گھروں میں داخل ہوا، کاش میں وہ چھاپ اور تکلیف دہ عکس آپ لوگوں تک منتقل کر سکتا جو میں نے ان گھروں میں داخل ہو کر محسوس کیا۔ ان گھروں میں انسان کی انفرادیت کو سرے سے کچل دیا گیا، ہر گھر میں معمولی ساز و سامان تھا یا سٹالن کی بے جان تصویر تھی، اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی شخص کی کوئی ذاتی ملکیت یا تحفے کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ اگر کوئی انسان بھول کر کسی دوسرے گھر میں داخل ہو جائے تو اسے کسی تبدیلی کا احساس تک نہ ہو۔ (۳۶۴)

کمیونزم کی عملی تطبیق کی واضح مثالیں بیان ہو چکیں، ان کی روشنی میں کمیونزم پر صحیح حکم لگانا ممکن محسوس ہوتا ہے۔ یہ کمیونزم کے خوفناک اقتصادی نتائج ہیں، اس کے سیاسی نتائج اس سے زیادہ خوف ناک ہیں جو پچھلے باب ''سیاست کے میدان میں سیکولرزم'' میں گزر چکے ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ استبدادی حکومتیں عوام پر کس طرح قبضہ جماتی ہیں، اُن کے امن کو خطرات سے کیسے بھر دیتی ہیں اور اُن کو کیسے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔

ہم تفصیل سے بہت کچھ بیان کر سکتے ہیں لیکن ہمارے خیال میں سابقہ اجمالی بیان کافی ہے کیونکہ موجودہ واقعاتی صورت حال ہر چشم بین انسان کو گہرے غور و فکر کا موقع فراہم کر رہی ہے۔ ان حقائق کا ادراک بے شمار لوگوں پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مخفی نہیں لیکن جو چیز عملاً مشرق اور مغرب کے تمام لوگوں کے ذہنوں سے غائب ہے، وہ اس بیماری کا حقیقی علاج ہے۔ ایک مستقل اور دائمی مرض نے مغربی جاہلی دنیا کو اپنے جبڑے میں لیا ہوا ہے اور اُسے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

اصطلاحات۔۸

پیداواری نظام (Mode of Production) زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل کرنے کا طریقہ کار جس کی بنیاد پر کسی معاشرے کے سیاسی، معاشی، قانونی اور ثقافتی ادارے اور نظریات قائم ہوتے ہیں جیسے غلامانہ نظام، جاگیرداری نظام، سرمایہ داری نظام، سوشلسٹ نظام۔

جاگیرداری نظام (Feudalism) ایسا نظام جس میں زمین کی ملکیت بڑے جاگیرداروں کے پاس ہو اور عوام چھوٹے کسانوں اور مزارعوں پر مشتمل ہو۔

پدرانہ نظام (Patriachy) ایسا معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام جس میں مرد کا مقام عورت سے بلند ہو۔ مادرانہ نظام کے برعکس۔

صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں مشینوں کی ایجادات سے برپا ہونے والا انقلاب جس کے زیر اثر بڑی صنعتیں اور سرمایہ دار اور مزدور طبقہ معرض وجود میں آیا۔

طبقاتی نظام (Class System) ایسا معاشرہ یا نظام جو کہ مختلف معاشی، معاشرتی اور سیاسی طبقوں یا گروہوں میں بٹا ہوا ہو اور ان گروہوں کے مفادات میں اختلاف یا تضاد ہو۔

پرولتاری طبقہ (Proletariat) محنت کش طبقہ

بورژوا طبقہ (Bourgeois) سرمایہ دار طبقہ

پیٹی بورژوا (Petit Bourgeois) چھوٹا سرمایہ دار۔ یہ طبقہ چھوٹے زمین دار، تاجر، مالکان جائیداد اور کاریگروں پر مشتمل ہے اور سرمایہ داروں اور مزدور طبقے میں درمیانی حیثیت رکھتا ہے۔

بورژوا انقلاب (Bourgeois Revolution) پندرہویں اور اٹھارویں صدی کے درمیان یورپ میں رونما ہونے والے انقلابات جنھوں نے جاگیردار طبقے کا اقتدار ختم کر کے بورژوا طبقے کا اقتدار قائم کیا۔

ترقی پسند (Progressive) اُس نظریے کا پیروکار جس کے نزدیک معاشرے کے ہر شعبے میں ترقی ناگزیر ہے۔ قدامت پسند اور رجعت پسند کے برعکس۔

رجعت پسند (Reactionary) یہ نظریہ کہ انسان کو ایسے آئیڈیل نظام کو اپنانا چاہیے جو کبھی ماضی میں قائم تھا۔ اس نظریے کے پیروکار۔ ترقی پسند کے برعکس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدامت پسند (Conservative) اس نظریے کا پیروکار جس کے مطابق معاشرے کے موجودہ معاشی، سیاسی اور معاشرتی اداروں اور نظریات میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں لانی چاہیے۔ ترقی پسند کے برعکس

مادیت (Materialism) فلسفے کا وہ نقطہ نگاہ جس کے مطابق مادے یا جسم کی حیثیت بنیادی ہے۔ جبکہ شعور، ذہن، خیال یا روح مادے سے پیدا ہوئے ہیں اور مادے کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ مثالیت کے برعکس۔ مارکسزم خالص مادیت پسند مکتب فکر ہے۔

تاریخی مادیت (Historical Materialism) وہ سائنس جو معاشرتی زندگی کے اصول اور اس کی مادی بنیادیں ظاہر کرتی ہے۔ دیکھیے پیداواری نظام

جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) جدلیات اور مادیت پر مبنی سائنسی اور فلسفیانہ نظریہ حیات جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دنیا میں صرف مادہ ہے جو کہ حرکت میں ہے اور اس حرکت کی وجہ سے تبدیلی جاری ہے۔

جدلیات (Dialectics) فطری مظاہر اور معاشرے کے اصول کی سائنس جس کے مطابق دنیا کی ہر شے میں تضاد موجود ہے اور تضاد کے نتیجے میں ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔ مابعد الطبیعیاتی کے برعکس

جبریت (Determinism) یہ نظریہ کہ ہر عمل کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور انسانی عمل مخصوص اسباب کے زیر اثر پیش آتا ہے۔ اس نظریے کی انتہائی شکل میکانکی جبریت ہے۔ غیر جبریت کے برعکس

سوشلسٹ نظریات (Socialist Ideas) تاریخی مادیت اور جدلیاتی مادیت پر مبنی ترقی پسند نظریات جو کہ استحصالی جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کی مخالفت اور اجتماعی ملکیت، مساوات اور مزدور طبقے کے مفادات کی حمایت کرتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام (Capitalism) وہ معاشرتی اور معاشی نظام جس کی بنیادی قوتیں سرمایہ دار اور مزدور طبقہ ہے، پیداوار کے ذرائع سرمایہ دار طبقے کی ذاتی ملکیت ہیں، اور وہ اجرت پر کام کرنے والے مزدور طبقے کا استحصال کرتا ہے۔

سامراجیت (Imperialism) سرمایہ داری نظام کی ایک شکل جس کی بنیادی خصوصیت اجارہ دارانہ سرمایہ داری ہے اور جس میں چند سرمایہ دار طاقتوں نے دنیا کے مختلف ممالک پر اپنا معاشی اور سیاسی تسلط قائم کیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۹

علم (Science) کا سیکولرزم

چوتھے باب میں گزر چکا ہے کہ کلیسا اور جدید علم کے مابین کشمکش کیسے شروع ہوئی، ہم غور کر چکے ہیں کہ اس خطرناک معرکہ کے کتنے بُرے نتائج سامنے آئے۔ ہم نے انیسویں صدی تک کی صورت حال پیش کی اور ہم نے چھٹے باب میں دیکھا کہ ڈارون ازم نے کیسے کلیسا کی عمارت کو مکمل طور پر منہدم کر دیا؟

بحث اوّل: انیسویں صدی میں دین کے متعلق جدید علم کا موقف:

اس سے پہلے کہ ہم دین کے متعلق جدید علم کا موقف پیش کریں، یہ زیادہ مناسب ہے کہ ہم گذشتہ ادوار میں اُس کے مؤقف پر ایک سرسری نظر ڈال لیں کیونکہ ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ''تشکیل عقل جدید'' کا مصنف جدید علم اور دین کے مابین کشمکش کو مختصراً اس طرح بیان کرتا ہے۔: ''میکانکی علم کی نشوونما، تورات پر کی جانے والی علمی تنقید، ۱۸۵۹ میں نظریہ ارتقا کا بم دھماکہ۔۔۔ یہ سب باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ دینی رسوم اور جدید علم کے اندر گہرا اختلاف ہے۔''

اُس نے ایک اور جگہ پر تفصیل پیش کی ہے: ''تاریخی نقد کے طریقہ کار نے بہرطور سارے عقائد کو بیکار قرار دیا اور اسی طرح میکانکی علم نے اس سے بھی بڑھ کر نقصان پہنچایا۔ اور جب سے ڈیوڈ ہیوم نے اٹھارویں صدی کے اندر معجزات پر تنقید کی تو آزاد خیال طبقے نے ہر خرقِ عادت چیز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جو طبعی قانون اور نظام کے خلاف ہو۔ انھوں نے معجزات کی تشریح اس طرح کی کہ یہ انسانی طبیعت کی مختلف کیفیات کا نتیجہ ہیں مثلاً سادگی، خیالی باتیں اور خرافات پر اعتماد۔ پھر جب جیالوجی اور بیالوجی نے گذشتہ ادوار کی تشریح پیش کی تو وہ سب حوادثات اور لفظی عقائد بے کار قرار پائے جو تورات کے باب تکوین کی ابتدا میں وارد ہیں۔

آخر کار انیسویں صدی نے بڑی تاکید کے ساتھ اس عقیدے کو رد کر دیا کہ اللہ تعالیٰ علمی طور پر ہر چیز کا مبدا ہے۔ ڈی ازم کا تصور کردہ خالق وصانع جو گھڑی ساز کے مشابہ تھا، جس کا تصور و رتنویر میں عقلی اور علمی تشریح کے ساتھ کیا گیا اور کائنات کی تشکیل بیان کی گئی، دُور کہیں چھپ گیا۔

دین دار لوگ کائنات کے طویل عملیات کے پیچھے کسی نہ کسی خالق کے وجود کا عقیدہ رکھتے تھے۔ یہ عقیدہ دینی بنیادوں پر تھا لیکن اسکی علمی حیثیت کچھ نہ تھی''۔ (۳۶۵)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادہ پرست لوگ اس وقت بڑے خوش ہوئے جب بظاہر تجرباتی علم نے انسان کی اصلیت کے معرکہ میں کلیسا کے خلاف ایک فیصلہ کن کامیابی حاصل کر لی اور کلیسا بالآخر کشمکش کے اکھاڑے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس صورت حال سے نظری فلاسفہ بھی بہت خوش تھے حالانکہ واقعیت اور مثالیت میں وہ خود مادہ پرستوں سے کشمکش کا شکار تھے۔

اسی چیز کا ہنٹر میڈ نے فلسفے کے متعلق اپنی ایک کتاب میں ذکر کیا ہے: ''قرونِ وسطیٰ کے اکثر ادوار میں دین اور فلسفے کے مابین تعلق اس طرح سے تھا کہ فلسفی اپنے آزاد تفکر کے تحت کسی بھی نتیجے تک پہنچ سکتا تھا بشرطیکہ وہ نتیجہ وحی اور مقدس الٰہیات کے متعارض نہ ہو۔ فلسفے کو ان بیڑیوں سے آزاد ہوئے دو صدیوں سے زیادہ وقت نہیں گزرا۔ یہ آزادی مخصوص میدانوں میں حاصل کی گئی لیکن جب ایک طویل کشمکش کے بعد یہ آزادی نصیب ہوئی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ فلاسفہ کے گروہ کے نزدیک یہ ''آزادی'' شہری آزادیوں میں سب سے اہم تھی اور اس کا تحفظ کسی بھی قیمت پر کیا جانا ضروری تھا۔ (۳۶۶)

ہاں یہی حال تھا اور یہی نتیجہ تھا۔

کلیسا کی بیڑیوں سے بھاگ نکلنا، اُس کے تسلّط سے چھٹکارے کا گہرا احساس، اُس کی بے جا نصیحتوں سے بچ نکلنا۔۔۔ آپ کا اُس غلام کے بارے میں کیا خیال ہے جو اپنے آقا سے بھاگا ہوا ہو اور اس نے اپنے بندھنوں سے آزادی کی خوشبو سونگھ لی ہو؟

یورپ کے اندر تمام فکری اور علمی راہوں میں ایک تند و تیز سیلابی ریلا بہہ نکلا جس نے ہر اس چیز کا صفایا کر دیا جس کا نام دین تھا یا دین کے نام سے تعلق تھا، اُس نے دین کے تمام تر نشانات مٹا ڈالے۔ جن لوگوں کو آزاد مفکرین کے نام سے پکارا جاتا تھا، وہ انتہائی تیزی کے ساتھ اس ریلے کے ساتھ بہتے چلے گئے۔

یہ سب کچھ علمی منہج اور حریت فکر کا تقاضا نہ تھا جو عقل اور موضوعی نظر سے لبریز ہوتی ہے بلکہ یہ کلیسا کے خلاف ایک احمقانہ ردعمل کا نتیجہ تھا جس کی حدّت کسی صورت کم نہ تھی۔ لوگوں کی کمر پر کلیسا کے کوڑوں کے نشانات اُس کو مزید بھڑکاتے تھے۔

لوگوں نے جان لیا اور ہویٹ کے اس قول کی تصدیق کر دی کہ علم اور معرفت کی تلاش میں آگے بڑھنے والا ہر قدم دین کے نام کے ساتھ تصادم اختیار کرتا چلا گیا۔ (۳۶۷)۔ انھوں نے الفریڈ ہویٹ ہوڈ کی اس بات کو بھی درست تسلیم کیا: ''جس مسئلے میں جدید علم کا دین کے ساتھ تعارض ہو جائے اس میں لازمی طور پر جدید علم درست ہوگا اور دین غلطی پر ہوگا'' (۳۶۸)

وہ اس کی تصدیق کیوں نہ کرتے جبکہ انھوں نے جدید علم کے مقابلے میں کلیسا کی ہزیمتوں کا مشاہدہ اپنی آنکھوں کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلیسا کی وہ نفرت انگیز طغیانی بھی اُن کے سامنے تھی جو اس نے علمی کامیابیوں کے مدمقابل اختیار کی۔ جدید علم سے زندگی کے روزمرہ وسائل میں جو آسانیاں حاصل ہوئیں وہ بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگوں کی نظر میں تھیں۔

کلیسا کہتا ہے: زمین چپٹی ہے اور یہ نجات کے عمل کی بدولت کائنات کا مرکز ہے۔ کاپرنکس نے کہا کہ زمین گول ہے اور سورج کے اردگرد گھومتی ہے۔ لوگوں کے لیے ثابت ہو گیا کہ کلیسا جھوٹا ہے اور علم سچا ہے!

کلیسا نے کہا کہ تین مل کر ایک بنتے ہیں یعنی (1+1+1=3)، ریاضی نے اس کو بدیہی طور پر غلط قرار دیا اور تین کا مجموعہ تین ہی قرار دیا۔ کلیسا نے ارسطو کی اتباع میں کہا کہ کائنات چار عناصر سے مل کر بنی ہے۔ جدید علم نے بتلایا کہ بنیادی عناصر کی تعداد نوے سے بھی زیادہ ہے۔ (۳۶۹) کلیسا جھوٹا ثابت ہوا اور جدید علم سچا نکلا۔

کلیسا نے کہا: کہ کائنات اور انسان سن ۴۰۰۴ ق م میں عام چھے دنوں کے اندر پیدا کیے گئے جب کہ لیل اور ڈارون نے کہا کہ کائنات کی عمر کئی سینکڑوں ملین سال ہے اور اسی طرح انسان بھی کئی ملین سال کی عمر رکھتا ہے۔ لوگوں کے لیے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ دونوں حق پر تھے اور کلیسا باطل تھا۔

کلیسا نے کہا: تورات، انجیل اور خطوط اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کردہ کتابیں ہیں جب کہ تاریخی نقادوں نے ثابت کیا کہ یہ انسانی مؤلفین کی کاوشیں ہیں جو معروضی حقائق کی حامل نہیں، لوگوں نے دیکھا کہ تاریخی نقاد درست تھے۔ کلیسا نے کہا کہ عشائے ربانی میں روٹی اور شراب حقیقی طور پر مسیح کے جسم اور خون میں تبدیل ہو جاتی ہے جب کہ علم اور عقل نے اس کو بدیہی طور پر محال قرار دیا۔

کلیسا نے کہا کہ رہبانیت طہارت کا وسیلہ ہے اور عظیم خوبی ہے جب کہ نفسیات اور سماجیات نے کہا کہ یہ فطرت سے متصادم ہے جو نسل انسانی کو یقینی ہلاکت کی طرف لے جاتی ہے۔

کلیسا نے کہا کہ شیطانی امراض کا مقابلہ صلیب کو چھونے کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جبکہ طب نے کہا کہ مرض کا سبب وہ جراثیم ہیں جن کو کیمیائی ادویہ کے ساتھ فنا کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے میں بھی کلیسا ہار گیا اور جدید علم کامیاب ہو گیا اور اس نے اپنی افادیت بھی ثابت کر دی۔

یہ ایک طویل غم ناک سلسلہ تھا جس سے ایک عام انسان نے یہ قطعی نتیجہ نکالا کہ علم ہمیشہ درست ہو گا اور دین ہمیشہ غلط ہو گا۔ کلیسا نے عام انسان کو یہ تعلیم دی کہ دین فقط کلیسا کی تعلیمات ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تجربی علوم کے ماہرین اور دیگر افراد نے کلیسا کے مقابلے میں آواز اٹھائی کہ علم کو دین کی بیڑیوں سے آزاد ہونا چاہیے اور دین کی تعلیمات کو جہنم بھیجنا چاہیے۔

علم واحد سچ ہے اور نور کا منبع ہے۔ یہ خوشحالی لاتا ہے۔ جبکہ ''دین'' جمود، رجعت پسندی، خرافات اور جھوٹے افسانوں کا نام ہے۔

علم پر کوئی بھی مسئلہ پیش کرو، علم بولتا ہے جب کہ دین گونگا بن کر رہ جاتا ہے!

تجربی علوم کے ماہرین فطرت کے قوانین کو تلاش کرتے ہیں اور دین سے آزاد ہو کر کھلی فضا میں کائنات کے راز ڈھونڈتے ہیں! دین ایک چیز ہے جبکہ علم ایک الگ چیز ہے، ان دونوں کا باہمی تعلق مخالفت کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوا کچھ نہیں۔ اِن میں سے جب کوئی ایک دوسرے کے لیے جھکے گا تو وہ دین ہوگا۔ دین کے تمام حقائق جیسے وحی، معجزات، روح وغیرہ کو انسانی لیبارٹریوں اور تجربہ گاہوں میں پرکھا جائے گا وگرنہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جائے گا!

تجرباتی علم کا ماہر اس چیز سے پرہیز کرے کہ اُس کے مباحث اور تجربات میں دین کی کوئی اصطلاح داخل ہو یا کائنات کے مظاہر کی تشریح میں دین کی کوئی تشریح داخل ہو کیونکہ اس طرح علمی روح برباد ہو جائے گی۔

جب کوئی علمی انسان کسی شخصی جذبے کے تحت کوئی دینی عقیدہ اختیار کرتا ہے تو بوتر و کے قول کے مطابق اُس پر لازم ہے کہ وہ تجربہ گاہ میں داخل ہو تو اُس کے دروازے پر دینی عقائد کو ترک کر دے اور واپس لوٹتے وقت دوبارہ اختیار کر لے۔ (۳۷۰)

اس بحث سے ظاہر ہوا کہ کلیسا کا موقف، جدید علم اور دین کی باہمی دشمنی میں سب سے بڑا عامل بنا اور اس طرح لوگ دینی مسائل اور مذہبی محرکات سے مکمل آزاد ہو گئے۔

یہاں ایک اور عامل بھی ہے جو پچھلے عامل کے ساتھ مل کر چلتا ہے اور اس کو تقویت دیتا ہے یہ یورپی جاہلیت کا داخلی عامل ہے جو اس کی طبیعت اور نفسیات میں داخل ہے، اس کے شعور اور لاشعور میں پیوست ہے۔ اگر کلیسا کا موقف درست ہوتا تو پھر بھی اُس کا واضح اثر قائم ہونا ممکن تھا۔

یہ عامل دینی اور وثنی ورثے کی شکل میں تھا جو یورپی نفسیات میں داخل ہے اور جو الٰہ اور مخلوق کے درمیان علم و معرفت کے حوالے سے تعلق کو واضح کرتا ہے۔ یورپی قدیم وثنی روایات کے مطابق الٰہ اور مخلوق کے درمیان ایک شدید اور زوردار کشمکش جاری رہتی ہے۔ الٰہ انسان پر جہالت مسلط کرنا چاہتا ہے اور اس کو ہمیشہ کے لیے جان بوجھ کر جاہل رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ الوہیت کے مقام تک پہنچنے کی کوشش نہ کرے۔ اور انسان مختلف وسائل استعمال کرتا ہے تاکہ الٰہ کو غافل پا کر اس کے پوشیدہ علم میں سے کچھ نہ کچھ اچک لے اور اپنی آزادی کو ممکن بنا سکے۔

محرف عیسائیت کا دینی ورثہ بھی اسی کی تائید کرتا ہے مثلاً آدم علیہ السلام کا قصہ عہد عتیق کے باب تکوین میں اس طرح مروی ہے: ''رب الٰہ نے انسان کو پکڑا اور اس کو جنت عدن میں ڈال دیا تاکہ وہ وہاں کھیتی باڑی کرے۔ رب الٰہ نے انسان کو حکم دیا: تم جنت کے تمام درختوں سے کھا سکتے ہو لیکن خیر اور شر کے معرفت والے درخت سے نہیں کھا سکتے جس دن تم اس سے کھاؤ گے تم مر جاؤ گے)۔ (سانپ خشکی کے تمام جانوروں میں سے سب سے زیادہ حیلہ باز جانور ہے، چنانچہ اس نے عورت کو کہا: کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے یہ کہا ہے کہ تم دونوں جنت کے تمام درختوں سے پھل نہیں کھا سکتے؟ عورت نے جواب دیا: جنت سے کھا سکتے ہیں لیکن جنت کے درمیان ایک درخت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اس سے کچھ نہ کھانا اور نہ اس کو چھونا وگرنہ تم دونوں مر جاؤ گے۔ سانپ نے عورت کو کہا: تم ہرگز نہیں مرو گے!! اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ جس دن تم نے اس سے کھا لیا تو تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تم معبودوں کی طرح بن جاؤ گے جو خیر اور شر کو پہچانتے ہیں۔ عورت نے دیکھا کہ درخت کھانے کے لیے عمدہ ہے اور آنکھوں کے لیے پسندیدہ ہے اور عقل نے بھی اس کی تمنا کی ہے چنانچہ اس نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

درخت کا پھل لیا اور کھا لیا اور اپنے خاوند کو بھی دیا اور اس نے بھی کھا لیا چنانچہ اُن کی آنکھیں کھل گئیں! ان دونوں نے جان لیا کہ وہ ننگے ہو چکے ہیں ان دونوں نے انجیر کے پتے سیے اور اپنے لیے ازار بنایا۔ رب الٰہ نے کہا: یہ آدم ہے جو ہم میں سے ایک بن چکا ہے، یہ خیر اور شر کو پہچانتا ہے، اب یہ حیات کے درخت کو بھی حاصل کرے گا اور اس سے کچھ کھائے اور ہمیشہ کی زندگی جیے گا چنانچہ رب الٰہ نے اس کو جنت عدن سے نکال دیا۔''

دینی ورثہ یعنی بت پرستوں سے حاصل شدہ ورثہ اس کی بہترین مثال مشہور یونانی افسانہ ہے: زیوس جو تمام انسانوں اور دیوتاؤں کا رب تھا، کے درمیان اور دیگر معبودوں کے درمیان مسلسل کشمکش جاری رہتی تھی۔ چنانچہ اس کی اور ایک الٰہ بروی توس کی آپس میں دشمنی تھی۔ بروی توس نے مٹی سے انسان کی تخلیق کی جب وہ اس کی تشکیل سے فارغ ہوا تو اس کے اندر اتھنس کے معبودوں نے روح پھونکی۔ زیوس نے انسانی نسل سے کینہ رکھنا شروع کر دیا اور ان کو دنیا کی ہر بھلائی سے محروم رکھنے کا ارادہ کیا اور ان کو آگ سے محروم کر دیا جو انسان کے لیے بہت ضروری چیز تھی۔ بروی توس نے آسمان سے آگ چرائی یا ''ہیفایستوس'' جو کہ جہنم حرفتوں اور لوہے کا معبود تھا کی بھٹی سے آگ چرائی۔ اس طرح انسان نے مختلف فنون اور حرفتوں کی معلومات حاصل کیا اور سب سے بڑے الٰہ کو چیلنج کرنے لگا۔ جب انسان نے یہ سب کچھ سیکھ لیا تو زیوس اس کی ہلاکت پر قادر ہونے سے مایوس ہو گیا لیکن انتقام کے لیے ہمیشہ کوئی نہ کوئی موقع تلاش کرتا رہا اور انسان کی معلومات کے مواقع کم کرنے لگا تا کہ وہ اپنی حدوں سے تجاوز نہ کرے اور الٰہ بننے کی کوشش نہ کرے۔ (۳۷۱)

یہ واقعات یورپی نفسیات کو ظاہر کرتے ہیں، کوئی شخص ان واقعات کو یہ کہ کر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ مغربی مفکرین نے دین اور اس کے قصے کہانیوں پر ایمان اور عقیدہ ترک کر دیا ہے اب یہ فقط تاریخی ادبی بکھیڑے ہیں۔ یہ بات درست نہیں کیونکہ نفسیات کے علم میں مشہور ہے کہ انسان اپنے بچپن کے زمانے میں حاصل شدہ تمام دینی عقائد کو بھول سکتا ہے لیکن بعض خرافات اتنی مظبوط ہوتی ہیں جو انسان کے تمام ادوار میں انسان کی تمام عقلی تعلیلات کو متاثر کرتی رہتی ہیں۔ (۳۷۲)

اس طرح یورپ کی نفسیات میں یہ شعور جڑ پکڑ گیا کہ علم اور معرفت کے میدان میں انسان کی ہر کامیابی الٰہ کے ارادے کی شکست ہے۔ اور جو کچھ اس کے لیے منکشف ہوتا ہے وہ ایک بڑے ممنوع جہان سے چوری اور چھینا جھپٹی ہے۔ اس لیے انسان کی سب سے بڑی خواہش صرف یہ نہیں کہ وہ معبود کی بیڑیوں سے آزاد ہو جائے بلکہ مغربی مفکرین کی مشہور الفاظ کے مطابق وہ کائنات کو زبردستی مسخر کرنا چاہتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یورپ زیوس اور جیوپیٹر کی عبادت ترک کر چکا ہے اور کلیسا کے معبود کی عبادت سے انکار کرتا ہے اور اس نے فطرت کی عبادت شروع کر دی ہے لیکن ابھی بھی اس کا سب سے بڑا خواب اور خواہش کائنات کو زبردستی مسخر کرنا ہے۔

تاریخ بشریت جس کو یونیسکو نے شائع کیا ہے کہتی ہے: ''ماضی کے اندر اکثر معاشروں کی عام فکر یہ تھی کہ نیچر اور فطرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے اور بدلتی نہیں، اس کی طاقتور قوت کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقابلے میں انسان نے اپنی ضروریات مطیع کرنے کی کوشش کی لیکن بیسویں صدی کے انسان نے فطرت کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا تا کہ وہ اس کے راز حاصل کر سکے اور اس کے فوائد استعمال کر سکے اور اس کی پُر خطر نشانیوں پر قابض ہو سکے۔(۳۷۳)

سویت ماہرین کی ایک تعداد نے اپنی ایک شائع کردہ کتاب میں کہا ہے: ''فطرت انتہائی بخیل ہے جو اپنے راز ظاہر نہیں کرتی یہ اپنے قوانین کو انتہائی پوشیدہ نظام کے تحت لکھتی ہے، پھر اس کو سختی سے بند کر دیتی ہے اور مضبوط گوداموں میں چھپا دیتی ہے یہ ہمیشہ اپنے راز زبردستی کرنے پر کھولتی ہے۔ اکثر حالات میں یہ ماہرین کو اپنے راز نہیں بتاتی سوائے اس راز کے جس کی حقیقت پرانی ہو چکی ہو۔(۳۷۴)

یہی بات ڈارون بھی یاد دلاتا ہے جس نے کہا تھا کہ فطرت نے اس کے ساتھ کئی دفعہ جھوٹ بولا۔(۳۷۵)

فطرت اور نیچر جو مفکرین کے نزدیک بہت خوبصورت معبود ہے جس کی گود میں جانے کے لیے وہ کلیسا کے معبود سے بھاگے تھے، اللہ کا متبادل تصور کی جاتی تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیا سوچتے ہونگے؟ اللہ کا لفظ جب بھی بولا جاتا ہے تو اُن کے ذہن میں کلیسا کا سرکش اور کینہ پرور معبود آجاتا ہے جو نسل انسان کو جان بوجھ کر جاہل بناتا ہے اور اُس کو علم و معرفت سے محروم رکھتا ہے۔ اُن کا غلو اس حد تک پہنچ گیا کہ وہ کسی بھی علمی مسئلے میں اللہ کا نام استعمال کرنے سے انکار کرتے ہیں اگر چہ وہ فقط تبرک کے لیے کیوں نہ ہو۔

ہم ایک لاوین مفکر فرض کرتے ہیں جس کو اُس کی فکر و نظر نے بہت شاندار اور حیرت انگیز حقائق ڈھونڈنے کی توفیق دی، تو اُس کی فطرت کہ اٹھی کہ یہ سب کچھ اللہ نے بنایا ہے اور ہمارے لیے مناسب نہیں ہے کہ ہم اُس کو کسی اندھی بہری قوت مثلاً فطرت، نیچر یا اتفاق وغیرہ کی طرف منسوب کریں۔۔۔الخ آپ کا کیا خیال ہے کہ آزاد خیال علمی مفکر اس بات پر کیا ردعمل ظاہر کریں گے؟

لیکونٹ ڈی نوے کہتا ہے: لاادری اور ملحد اس قلق کو بالکل نہیں پہچانتے کہ ہمارے زندہ نامیاتی جہان کی تشریح اللہ کے وجود کو فرض کیے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ وہ اپنا ایمان بعض طبعی عناصر کے متعلق خوب ظاہر کرتے ہیں جن کو وہ زیادہ جانتے نہیں اور زیادہ عقلی معلومات بھی نہیں رکھتے لیکن ان پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ بعض مفکرین سادہ لفظوں کے غلام ہوتے ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات کا پتا اس وقت چلا جب میری ایک کتاب شائع ہوئی اور مجھے ایک صاحب نے انتہائی ملامت بھرا خط لکھا کیونکہ میں نے کائنات میں ظاہر ہونے والے اتفاقات کو حذف کر دیا تھا اور اس کی جگہ اللہ کا لفظ لکھا تھا، اس شخص کو یہ بات پسند نہ آئی، اس کی کوشش تھی کہ اللہ کا لفظ تمام لغات سے مٹا دیا جائے اور اس کا استعمال ممنوع کر دیا جائے۔ اس کے اعتراض سے پتا چلتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں ہونے والا تشدد ابھی ختم نہیں ہوا اور وہ ایک کیمپ (کلیسا) سے دوسرے کیمپ (آزاد خیال مفکرین) میں منتقل ہو گیا ہے۔ خوش قسمتی سے خط لکھنے والا اتنے اختیارات کا مالک نہیں تھا کہ عقل کے نام پر اپنے بچگانہ عقائد دوسرے لوگوں پر زبردستی لاگو کر سکتا۔ بعض آزاد مفکرین آزادی کو اُسی طرح زبردستی لاگو کرتے ہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسے آمریت پسند اپنی آمریت لاگو کرتے ہیں۔(۳۷۶)

علمی منہج کے بعض حامیوں نے دیکھا کہ کائنات کی حیرت انگیز مضبوطی اور شاندار نظم وضبط اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے۔ کائنات کے تمام افعال اللہ کی طرف منسوب ہونے چاہیے۔ کائنات ایک معین اور مقرر غرض و غایت ہے اور مقصود ہدف ہے، چنانچہ ہمیں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا چاہیے۔ جب وہ اس نتیجے کے قریب پہنچنے لگے تو انھوں نے اس سے بچنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ انہیں اس پر تعصب قول کے سوا کوئی بات نہ ملی کہ وجود کے لیے اصلاً کوئی غرض و غایت نہیں ہوتی اور غرض و غایت کا قائل ہونا فنی و علمی اعتبار سے غلط ہے۔ بعض لوگوں نے اس بات کو اس طرح سے بیان کیا: ''ماہرین پر لازم ہے کہ وہ کیفیت کی چھان بین کریں نہ کہ سبب کی چھان بین کریں۔ سبب کی چھان بین کا مطلب یہ ہے کہ ٹھوس اور بے جان اشیا کے پیچھے کوئی نہ کوئی عاقلانہ غرض موجود ہے اور فطرت سے ہٹ کر کچھ عوامل ایسے ہیں جو افعال کو معین انجام کی طرف پھیر دیتے ہیں یہ غایت پسند مفکرین (Teleological) کا نقطہ نظر ہے۔ موجودہ علم اس نقطہ نظر کا انکار کرتا ہے، اس کے نزدیک فطرت کے تمام ظواہر کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے نہ کہ اغراض و مقاصد کو۔ فون بروکا نے ایک مرتبہ اس کی طرف اس طرح اشارہ کیا: غایت نظریات کی ملکہ ہوتی ہے، کوئی بھی مفکر غایات کو تسلیم کیے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا لیکن اس کے باوجود وہ اس حقیقت کو لوگوں کے سامنے تسلیم کرنے سے شرماتا ہے''

فطرت کے اتفاقات کا نظریہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ دین کے دشمن اس نظریے کی خلاف ورزی پر تشدد کے مرتکب ہونے لگے۔ یہ وہی فکری و معنوی تشدد تھا جس کا ارتکاب کلیسا کے مذہبی غلبے کے دور میں رائج رہا تھا۔ آزاد مفکرین اُسی طرح سے فکری سرکشی کے حامل ہیں جیسے کلیسا اپنے غلبے کے دور میں رہا تھا۔ ایسا کیوں نہ ہوتا آزاد مفکرین دراصل کلیسا کے تشدد کا ردعمل ہی تو تھے۔ جب کلیسا پوری قوت کے ساتھ لوگوں پر جبر کرتا کہ وہ تثلیث پر ایمان لے آئیں اگرچہ انہیں ناپسند ہی کیوں نہ ہو، اسی طرح سے آزاد مفکرین نے لوگوں کو ملحد ہونے کا پابند کر دیا اگرچہ انہیں ناپسند کیوں نہ ہو۔ دونوں فریقوں نے لوگوں پر جبر کیا اگرچہ جبر کی وجہ مختلف تھی۔

ولیم جیمس کہتا ہے: ''**وضعی مکتبہ فکر** کے بعض لوگ یہ اعلان کرتے ہیں کہ مقدس معبود فقط ایک ہے جو تمام معبودوں اور بتوں کے کھنڈرات پر اپنی عظمت اور جلالت کے ساتھ کھڑا ہے، اور وہ علمی حقیقت (فلسفہ وضعیت) ہے۔ یہ واحد قول اور واحد حقیقت ہے جو بتلاتی ہے کہ دنیا میں کسی معبود کو ماننے کی ضرورت نہیں'' (۳۷۷)

جب کوئی علمی مفکر علمی دنیا میں تنگی محسوس کرے اور وہ کسی مظہر کی نسبت اللہ کی طرف کیے بغیر نہ رہ سکے جیسا کہ زندگی کی ابتدا اور کائنات کی ابتدا کا مسئلہ ہے۔ کیا اس کے لیے ایسا کرنا درست ہوگا۔ کیا وہ عقلاً اور فطرتاً اس کی صراحت کر سکتا ہے۔ کیا اس طرح وہ علمی بحث میں علمی اسلوب کا حامل رہے گا یا نہیں۔ کیا وہ اپنی بحث میں اللہ کا تذکرہ شامل کرے یا نہ کرے؟

آزاد مفکرین کے قائدین نے اس مشکل کو حل کرنے میں سب سے پہلا قدم اٹھایا۔ انھوں نے محقق کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مختلف اسالیب اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ اِن اسالیب میں سب سے زیادہ میٹھا اُسلوب بھی کڑوا ہے۔ اُن کے خیال میں اللہ کا ذکر شامل کیے بغیر علمی منہج کو برقرار رکھا جا سکتا ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

① فعل لازم کا صیغہ استعمال کیا جائے اور وہ افعال جو حقیقت میں (اللہ کے) مفعول ہیں، انہیں بدون فاعل بیان کیا جائے۔ اِس کی واضح مثال جیمز جیٹر کے اسلوب میں ہے۔ وہ زندگی کی اوّلین ابتدا پر گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: ''زمین مکمل طور پر بادلوں سے ڈھکی ہوئی تھی، سورج کی روشنی نیچے نہیں پہنچتی تھی، رات کو سخت سردی کے باوجود دن کا درجہ حرارت برقرار رہتا تھا۔۔۔

کاربن ڈائی اکسائیڈ ہوا میں موجود تھی اور وہ پانی کے بخارات کے ساتھ مل کر اپنا عمل کر رہی تھی۔ پانی کے بخارات سورج کی گرمی سے گرم چشموں سے اٹھ رہے تھے۔

اِس طرح کاربو ہائیڈریٹ کے مواد سے جیلی نما کوئی چیز پیدا ہوئی جس نے نوشادر کے مرکبات سے نائیٹروجن کو جذب کیا۔

سب سے پہلا فرضی وجود بیریثیون پیدا ہوا۔ اتفاقاً وہ گھسٹتا ہوا خوراک کے کسی ٹکڑے پر واقع ہوا اور اس سے چمٹ گیا۔

اس طرح سے پہلا پروٹوزون پیدا ہوا جو موجودہ حیوانات میں سب سے ادنیٰ درجے کا ہے۔ (۳۷۸)

اوپارین کہتا ہے: زمین پر زندگی کی ابتدا ایسے ہوئی کہ مختلف غیر نامیاتی مادے ایک مسلسل کیمیائی تفاعلات کے نتیجے میں زندہ اجسام میں تبدیل ہو گئے۔ (۳۷۹)

② جیسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اہل مغرب نے فطرت اور نیچر کو اپنے مخصوص حالات میں معبود کا درجہ دیا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی جگہ پر، جو کہ فاعل حقیقی تھا، فطرت کا لفظ استعمال کیا جیسے ڈارون کا مشہور قول ہے۔ ''فطرت ہی ہر چیز کو پیدا کرتی ہے، مخلوق پر فطرت کی قدرت کی کوئی حد نہیں''

اسی طرح جدلیت کا مفکر ہیگل کہتا ہے: ''فطرت اپنی ذات میں اتنی زیادہ قوتوں پر مشتمل ہے کہ وہی وجود کی تمام صورتوں کو پیدا کرتی ہے۔ مختلف انواع، تبدیلی کے قوانین کے تحت ایک خاص ترتیب سے ایک دوسرے سے پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں جس کو بیان کرنا اب ممکن ہو چکا ہے۔۔۔ فطرت کی کوئی چیز ایسی نہیں جس کی تشریح فطرت کے ذریعے نہ کی جا سکے، فطرت پر کوئی چیز مقدم نہیں، کوئی چیز غالب نہیں۔ جو شخص فطرت کے قوانین پہچانتا ہے خاص طور پر طبعی انتخاب اور ارتقا، وہ جانتا ہے کہ فطرت نے اپنے آپ کو خود پیدا کیا'' (۳۸۰)

یہ اسلوب سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ تمام علمی کتابیں بھری ہوئیں ہیں، تمام درجوں کی درسی کتب اسی اُسلوب کو ترجیح دیتی ہیں۔

③ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے بغیر فعل مجہول کے صیغے استعمال کرنا تاکہ فعل کی نسبت کسی بھی فاعل کی طرف نہ کرنی پڑے اس کی مثال جولیان ہکسلے کا یہ قول ہے: ''ایسے مجموعے پائے گئے جن کے لیے مختلف حالات وظروف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھے، لیکن وہ زندگی کی پیدائش کے لیے مناسب تھے۔ اور یہ قول: ''جس مضبوط طریقے اور ترکیب پر انسان کی پیدائش کی گئی، اُس کو اس کے ماحول کی نسبت سے سمجھنا ممکن ہے''۔ (۳۸۱)

④ اس کے علاوہ دیگر الفاظ کا استعمال ہے۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کا استعمال اللہ تعالیٰ کے لیے درست نہیں۔ مثال کے طور پر **ایڈمک ٹن اللہ** کے لفظ کے بجائے اتفاق کا لفظ بطور اصطلاح بولتا ہے حالانکہ اتفاق کے مدمقابل چیز حکمت وتدبیر ہے۔

زندگی کی ابتدا کی پیچیدگی آزاد مفکرین کے لیے کوئی واحد گنجلک مسئلہ نہیں لیکن یہ تمام مشکلات سے زیادہ حل طلب ہے۔ یہ لادین طرز فکر کی بہترین مثال ہے جو کسی بھی غیر مادی قوت کو تسلیم نہیں کرتی۔

انیسویں صدی کی علمی دنیا میں زندگی کے بارے میں **ازخود پیدائش کا نظریہ** رائج تھا جس کو آغاسیز اور اس کے حامیوں نے پیش کیا اور مادہ پرست تخلیق الٰہی کے مقابلے میں اِس کے ساتھ انتہائی ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ چمٹ گئے حتی کہ **پاسچر** نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں اس نظریے کو باطل ثابت کر دیا۔ اس کا اپنا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔

ملحدین کو اپنی شرمگاہ چھپانے کے لیے نظریہ اتفاق کے باریک شفاف پردہ کے سوا کچھ نہ ملا، تو انھوں نے اسے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نظریے کے مشہور نامور مفکر انگلینڈ کے **جیمس جینز** اور برٹرینڈ رسل ہیں۔ یہی نظریہ، جدید ماہرین حیاتیات میں خصوصاً امریکہ میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔

لیکن اس نظریے نے ڈھیر سارے سوالیہ نشان پیدا کر دیے ہیں جن کی وجہ سے یہ مسلسل تنقید کی زد میں ہے اور اس کے خلاف تحقیقات کی بھرمار ہے، حتی کہ اس صدی کے وسط میں ایک مشہور سوئس مفکر **شارل اوجین جی** نے ایک فیصلہ کن ضرب لگائی ہے۔ اس نے علم ریاضی سے ثابت کیا ہے کہ یہ نظریہ مطلق طور پر غیر علمی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ وہ کائنات جس میں اتفاقات کے تحت زندگی کے ادنیٰ درجے کی پیدائش ممکن ہو سکے، وہ ہماری اِس کائنات سے لاکھوں کروڑوں گنا بڑی ہونی چاہیے جیسا کہ **البرٹ آئن سٹائن** نے ریاضی کے کلیوں سے وہ بات سمجھائی جو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتی۔

اس طرح مادہ پرست لوگ زیادہ سخت قسم کی مشکل میں پڑ گئے۔ اُن پر لازم تھا کہ وہ حقیقی مرجع کی طرف منتقل ہوتے اور مان لیتے کہ ہر چیز کو اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے۔ لیکن غرور اور تعصب کے تحت وہ دوبارہ اسی قول پر اوندھے منہ گرے کہ ابتدائی طور پر زندگی کا آغاز اتفاقات سے ہوا۔ وہ اپنے تناقضات سے بچنے کے لیے مایوس کوششوں اور نت نئی تشریحوں میں لگ گئے۔ وہ جس چیز پر آج ایمان لا رہے ہیں وہ گذشتہ کل میں باطل ہو چکی ہے۔

اس الٹی سمت فکر کی مثال میں ہم دو بڑے آدمیوں کو پیش کرتے ہیں جن میں سے ایک مغرب میں حیاتیات کا نامور ماہر ہے اور دوسرا سوویت کی علمی اکیڈمی کا رئیس۔

پہلا مفکر **جارج والڈ** ہے، اُس نے **ازخود پیدائش** کے نظریے پر بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے اور اُس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمزوری وخرابی کا قصہ شرح وبسط سے بیان کیا ہے لیکن آخر میں اُس نے بھی یہی کہا: ''ہم حیاتیات کے ابتدائی طالب علموں کو یہ قصہ اس لیے بیان کر رہے ہیں تا کہ وہ عقیدے پر عقل کے غلبے کی مثال سمجھ سکیں۔ حقیقت میں درست نظریہ ازخود پیدائش کا ہے۔ اس کے مدمقابل واحد عقیدہ، ایسی تخلیق کا ہے جو فطرت کے لیے خارق ہو اور بنیادی طور پر ایک انوکھا حادثہ ہو۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا نظریہ نہیں۔ مختلف علوم کے مفکرین نے ماضی کے اندر ازخود پیدائش کے نظریے کو ایک فلسفیانہ ضرورت قرار دیا تھا۔ اور موجودہ دور میں ہماری فلسفیانہ عاجزی کی یہ نشانی ہے کہ ہم اس ضرورت کی حیثیت کھو رہے ہیں''۔

اگرچہ جدید حیاتیاتی ماہرین کے نزدیک ازخود پیدائش کے نظریے کے خاتمے سے اُن کے سینے ٹھنڈے ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ متبادل عقیدے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ زندگی کی پیدائش خاص الخاص طریقے سے ہوئی۔ کیونکہ اس طرح سے وہ دیگر احتمالات کو ضائع کر بیٹھیں گے!

میرا خیال ہے کہ حیاتیاتی ماہر کے لیے یہ کوئی پسندیدہ بات نہیں کہ وہ زندگی کی اصل کو فقط ازخود پیدائش کے طریقے سے ہی سمجھے۔ ہم اس کا تعارض پہلے پیش کر چکے ہیں، اگر ہم مان لیں کہ زندہ نامیاتی اجسام خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں تو ہمیں اس سے کئی علمی مشکلات کا سامنا ہوگا مثلاً یہ کیسے ممکن ہے کہ گذشتہ دور میں مختلف احوال کے اندر زندہ اجسام خود بخود پیدا ہو گئے اور بعد میں وہ اِس طاقت سے محروم ہو گئے۔ (۳۸۵)

والڈ کا خیال ہے کہ اگر جدید علم تجربہ گاہوں کے اندر زندہ اجسام کا ابتدائی مادہ پیدائش (DNA) کو وجود میں لے آئے تو ازخود پیدائش کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور یہ بات مفروضات سے نکل کر علمی حقیقت کے درجے تک پہنچ جائے گی۔

اور آخر کار۔۔۔ جب اس نے بے کار بحثوں کا انبار لگا دیا تو اس نے اپنی عاجزی کا اعتراف کیا لیکن صحیح بات تک نہ پہنچ سکا بلکہ اپنے آپ کو مختلف امیدیں دلانے لگا اور نتائج کا انتظار کرنے والوں کو یہ آس دلانے لگا کہ ازخود پیدائش علمی طور پر ممکن ہے لیکن آنے والی نسلوں کے لیے اُس کی ایک شرط بھی ہے کہ تجربہ اس زمین کے علاوہ کسی اور سیارے پر کیا جائے۔ وہ کہتا ہے: ''ہم اپنی تمنا پوری کرنے سے عاجز آ گئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مکمل طور پر محروم ہیں۔ جو ہر انسانی ایک دفعہ پھر اس زمین کے علاوہ کسی اور جگہ پر نمودار ہونے کی کوشش کرے گا''۔ (۳۸۶)

اسی نتیجے کی گواہی ایک دوسرے شاہد اوبارین نے بھی دی ہے۔ سٹالن نے اس کی ذمہ داری لگائی تھی کہ وہ مادے سے خود بخود زندگی کے پیدائش کا نظریہ علمی طور پر ثابت کرے تا کہ ریاست کا قانونی عقیدہ مضبوط ہو سکے۔

اوبارین اور اُس کی اکیڈمی نے بیس سال تک مسلسل کوشش کی جو بار آور نہ ہو سکی اور بالآخر انھوں نے ۱۹۵۵ میں کہا: ''سوویت یونین کے حیاتیاتی علوم نے جس کامیابی کو حاصل کیا ہے، وہ یہ ہے کہ بسیط زندہ اجسام کو مصنوعی طریقوں سے پیدا کرنا صرف ممکن ہی نہیں بلکہ عن قریب واقع بھی ہو جائے گا''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لوگ اس وعدے کا انتظار کرتے رہے اور اسٹالن کی آنکھیں بھی مرتے دم تک ٹھنڈی نہ ہوسکیں۔

۱۹۵۹ میں نیویارک میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں اوبارین نے ماہرین کے سامنے یہ اعتراف کیا: ''غیر نامیاتی مواد سے زندگی کی پیدائش کی تمام کوششیں، چاہے وہ طبعی حالات میں ہوں یا تجربہ گاہوں میں، وہ ناکام ہو چکی ہیں'' (۳۸۷)

اس ناکامی کے باوجود وہ اپنی گمراہی سے باز نہ آیا اور تخلیق الٰہی کا قائل نہ ہوا بلکہ اس نے ایک اور وعدہ کیا، زندگی کی پیدائش اس شرط کے ساتھ ممکن ہے کہ یہ کوشش زمین کے علاوہ کسی اور سیارے پر کی جائے کیونکہ موجودہ ارضی ماحول ابھی سازگار نہیں۔ (۳۸۸)

ان دونوں ماہرین کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ: ''انسان پر لازم ہے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ازخود پیدائش کے نظریے پر ایمان لے آئے۔ اگر اُسے اس کی صحت میں شک لاحق ہو اور وہ تسلی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ اپنا سامان سمیٹے اور کائنات کی وسعتوں میں سفر کی تیاری کرے حتی کے وہ کسی ایسے سیارے کو ڈھونڈ لے جس کے حالات زمین کے مشابہ ہوں اور وہاں زندگی کی پیدائش ممکن ہو یا وہ آنے والی نسلوں کا انتظار کرے جو اس قسم کا سفر کرسکیں۔ اس طرح سے اُس کی تسلی ہو جائے گی کہ تخلیق الٰہی کا نظریہ رجعت پسندانہ نظریہ ہے اور ازخود پیدائش کا نظریہ موفیصد درست اور علمی ہے''!!

ایک بہت بڑی حقیقت جوان ذہین وفطین ماہرین کے بارے میں اوجھل نہیں ہونی چاہیے، اگر وہ بالفرض تجربہ گاہ کے اندر غیر نامیاتی مواد سے زندہ مادے کو وجود میں لانے پر قدرت حاصل کر لیتے تو وہ یہ نہ کہتے کہ یہ اتفاق سے ہوا ہے یا ازخود پیدا ہوا ہے یا فطرت نے اس کو پیدا کیا ہے بلکہ وہ بڑے فخر سے یہ کہتے کہ یہ ہماری مسلسل تحقیق اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔

زندگی کی اصل کا مسئلہ مادہ پرستوں کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتا ہے جو وہ اپنے تمام علمی مسائل میں اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ اصول ہے جو اپنے پیروکاروں پر لازم کرتا ہے کہ وہ دین سے حاصل شدہ تمام اشارات کو رد کر دیں، چاہے وہ تجرباتی علم کی تائید کے ساتھ کیوں نہ ہوں اور فطرت اس کی تلقین کیوں نہ کرتی ہو۔ وہ ایمان باللہ سے بھاگنے کے لیے ایسی ایسی حماقتوں کا ارتکاب کرتے ہیں جو اُن کے بڑے بڑے علمی القاب کے شایان شان نہیں۔

یورپ کا بیسویں صدی کا عمومی علم، دین کا حلیف ہونے کا انکار کرتا ہے۔ ریاست کے آہنی پردوں کے اندر جو کارگزاری اختیار کی گئی، وہ استحصال اور انتہا پسندی میں آخری درجے کی ہے۔ مغربی جمہوری ماہرین جس وقت علم برائے علم کا نعرہ لگاتے ہیں تو ہم سوویت ماہرین کو دیکھتے ہیں کہ وہ علم برائے عقیدہ کا نعرہ لگاتے ہیں اور بعض اوقات زیادہ صراحت سے علم برائے کمیونسٹ پارٹی کا نعرہ لگاتے ہیں۔ روس کا ایک ماہر نہایت صراحت سے کہتا ہے: ''سوویت کا علم فقط ایک مخصوص پارٹی کا علم ہے یا ایک مخصوص طبقے کا علم ہے۔ وہ علم کے دیگر نعرہ جات کو یہ کہہ کر رد کرتا ہے کہ علم کا قومی ہونا اور اس کا کلی ہونا بے کار چیز ہے۔ اس کا دعویٰ فقط بورژوائی یا اُس کا ہم نوا طبقہ کرسکتا ہے''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوویت علوم کی اکیڈمی کا رئیس ۱۹۲۹ میں کہتا ہے:

سوویت فزکس سوویت علم کی طرح بڑے طویل عرصے سے ریاست کی زندگی میں داخل ہو چکی ہے۔ اور اس نے اپنے ملک کی خدمت اور کمیونسٹ معاشرے کی تعمیر میں مکمل طاقتیں صرف کر دی ہیں۔

کمیونسٹ فزکس نے اپنے عمل کی بنیاد اس چیز پر رکھی ہے کہ دنیا **منطقی مادیت** کو قبول کر لے۔ اس طرح سے **لینن، سٹالن** اور دیگر عبقری انسان پیدا ہوں گے۔ (۳۸۹)

کمیونسٹ ماہرین کا معاملہ عجیب ہے، اُن کی تحقیقات کے نتائج پہلے سے معروف ہوتے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ اِن انکشافات میں سے کوئی چیز اُس دائرے سے باہر چلی جائے جس کو کمیونسٹ پارٹی نے تشکیل دیا ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی رائے مارکس اور **انجلو** کی آرا سے متصادم ہو۔ حالانکہ زندگی کے ہر میدان میں علوم اور فنون کے اندر بے تحاشہ ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن **لینن** اور **سٹالن** کے ہاتھوں ہونے والی بعض رسمی ترمیموں کے علاوہ کوئی فکری علمی تغیر و تبدل نظر نہیں آتا۔

اسی وجہ سے یہ اندھا جمود کئی کمیونسٹ مفکرین کی طرف سے تنقید کا نشانہ بنا، خاص طور پر ان لوگوں کے ہاں جو آہنی پردوں سے باہر رہتے تھے۔

روجیہ غارودی نے اِس قسم کی فکری غلامی کو عقیدہ پرستی اور الٰہیاتی فکر کے نام سے پکارا۔ غارودی کہتا ہے:

ہم نے تمام تر جوش و جذبے کے ساتھ **اسٹالن** کی عقیدہ پرستی کو قبول کیا۔ **اسٹالن ازم** بیس صفحوں پر مشتمل ایک خلاصہ ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ تمام فلسفیانہ حکمتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کچھ صفحات فلسفے کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے تین سبق ہیں:

① امور عامہ یعنی انتھالوجی کے بارے میں، مادیت کے تین اُصول۔

② منطق میں، جدلیات کے چار قوانین۔

③ تاریخ کا فلسفہ، طبقاتی کشمکش کے پانچ مراحل۔

یہ مکمل دور جس میں غور و فکر کا یہ اسلوب غالب رہا، یہ مارکس کا فلسفہ نہیں بلکہ مدرسی فلسفہ تھا جو قرونِ وسطیٰ میں رائج رہا۔ (۳۹۰)

یہ فلسفہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کے پاس زندگی کے ہر سوال کا جواب ہے، حالانکہ یہ حیاتیات سے لے کر جمالیات تک کچھ نہیں جانتا اور نہ زراعت اور کیمیا کو جانتا ہے۔ (۳۹۱)

اسٹالن ماہرین پر کچھ معین نتائج لازم کرتا تھا جس کو علمی طور پر ثابت کرنے کے لیے جدوجہد لازم ہوتی جیسا کہ زندگی کے اصل کے حوالے سے ایک مثال گزر چکی ہے۔ اسی طرح کمیونسٹ انسانی خصوصیات کے وراثتی تسلسل کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مارکس ازم وراثتی عوامل اور اُن کے اثرات کا شدت سے انکار کرتا ہے، اس کا خیال ہے کہ وراثت کے ماہرین **بورژوائی** ہیں اور وہ بیرونی ماحول کے اقتصادی عامل کو کمزور کرنا چاہتے ہیں حالانکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اقتصادی عامل ہی سب کچھ ہے۔ رسل کے بیان کے مطابق اسٹالن نے حد سے تجاوز کیا اور ایک قرارداد جاری کی کہ طبعی وراثت کے قوانین آج سے بدل جانے چاہیے۔ وہ خلیے جو وراثت کو منتقل کرتے ہیں، وہ سوویت قوانین کے پابند ہو جائیں نہ کہ رجعت پسند پادری کے۔ (۳۹۲)

آرتھر کسٹلر، کیمونسٹ پارٹی کا ایک رکن، سوویت ماہرین کو لاحق ایک پریشانی واضح کرتا ہے۔ بعض ماہرین کے تجربات اُن کو ایسے نتائج تک پہنچاتے جو مقامی سیاسی پارٹی کے نتائج سے مختلف ہوتے۔ وہ خالص علمی مہارتوں کے حامل ماہرین تھے جیسے فزکس اور کیمسٹری، لیکن اس کے باوجود اُن کو سوویت کی طرف سے پریشانی کا سامنا تھا۔ آپ کا اُس شخص کے بارے میں کیا خیال ہوگا جس کی فکر و تحقیق اُس کو ایمان باللہ یا دین تک پہنچاتی ہو؟! اِس قسم کے بد بخت کو ایک ہولناک سزا کا سامنا ہوگا اور اُس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی چاہے اس نے اپنی ساری زندگی کیمونسٹ پارٹی کی خدمت میں کیوں نہ گذاری ہو۔ (۳۹۳)

ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ مغربی سرمایہ دار ممالک میں علم و تحقیق کے لادین طریق کار پر کچھ مخصوص نفسیاتی اور تاریخی عوامل مسلّط ہیں اور مشرقی کیمونسٹ ملکوں کے اندر بھی یہی صورت حال ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ خفیہ پولیس کی متشدد قوت بھی موجود ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث دوم: جدید علم کی دین سے جدائی اور معاشرے پر اثرات

جدید علم کلیسا کی خرافات اور قرونِ وسطیٰ کے افسانوں پر غالب آ گیا اور اُس نے روایتی مدرسی بحث و تحقیق کے طریقوں کو منہدم کر دیا، اِس میں کوئی شک نہیں کہ اس لحاظ سے اُس نے انسانیت کی عظیم خدمت سرانجام دی کہ خرافات اور افسانہ کے مقابلے میں معقولیت کی بنیاد رکھی، لیکن یہ کامیابی اُس ظلم وستم کے نیچے چھپ گئی جو جدید علم نے دین کے مقابلے میں اختیار کیا۔ جدید علم نے دین اور اُس کی بنیادوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

جدید علم اور خرافات کی باہمی تاریخی کشمکش اس بات کا وہم دلاتی ہے کہ شاید یہ علم اور دین کا باہمی جھگڑا ہے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں دونوں فریقوں کے مابین ایک ابدی دشمنی پیدا ہو گئی ہے حالانکہ اس قسم کا جھگڑا پہلے کبھی پیدا نہ ہوا اور عام حالات میں یہ ممکن بھی نہ تھا کہ یہ جھگڑا پیدا ہوتا۔

معاملہ چاہے جو بھی ہو کلیسا کے ستم اور دشمنانِ انسانیت کی منفی کوششوں کے نتیجے میں مفاد پرست اور فساد پسند لوگ کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ اس بدبخت جھگڑے کو جان بوجھ کر کھڑا کیا گیا۔ دین کے حقائق اور اقدار کو علم و تحقیق کے نام پر جڑ سے ہلا دیا گیا۔ جدید علم ایک ایسے دائرے میں خبطی ہو کر گردش کرنے لگا جس کا دین اور اخلاق سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی اُس کا کوئی بلند و برتر ہدف تھا۔ چنانچہ نتیجہ کیا نکلنا تھا؟

بعض کارکنان بہت خوشی سے یہ اظہار کرتے ہیں کہ انھوں نے علم اور دین کو الگ کر کے بہت اچھا کام کیا۔ دین کو جدید علم کا سامنا کرنے سے بچانا، درحقیقت دین کی خدمت تھی تاکہ دین مکمل طور پر مٹنے سے بچ جائے۔ بعض دین دار لوگ بھی اس بات کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یورپ کی عملی صورت حال اِس دعوے کو جھٹلاتی ہے۔ علم کو دین سے الگ کرنا، دین کی حفاظت کی نیت سے نہ تھا بلکہ دین سے جہالت کی بنیاد پر تھا۔ بوترو نے بہت اچھی بات کہی ہے جب اُس نے اِس رجحان پر پچھلی صدی میں سخت تنقید کی:

''علم اور دین میں سے کوئی ایک بھی فقط اپنے دائرہ کار میں محدود نہیں رہتا۔ مسیحیت کی ابتدا میں یہ بات کہی گئی کہ قیصر کو قیصر کا حصہ دو اور اللہ کو اللہ کا حصہ دو، اُس وقت بھی یہ مراد نہیں لیا گیا کہ انسان کے دینی معاملات کا علمی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا'' (۳۹۴)

بلکہ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اشیا کے دو جہان ہوتے ہیں، ایک فکری جہان اور دوسرا مادی جہان یا ایک روحانی جہان اور دوسرا زمانی۔ اُن میں سے کسی ایک کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی بھی طرح دوسرے کے معاملات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں دخل اندازی کرے لیکن یہ اُس وقت تھا جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی احترام والی مطابقت میں ہوتے تھے لیکن اب عملی صورت حال یہ ہے کہ علم اور دین ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔(۳۹۵)

اس رجحان کے حاملین نے ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا اور یہ جدید جاہلیت کی سب سے بڑی غلطی بھی ہے۔ انھوں نے گمان کیا کہ انسانی نفس قابل تقسیم ہے یعنی انسانی زندگی کے مختلف شعبے بنائے جا سکتے ہیں اور ہر شعبہ اپنے اپنے دائرے میں آزاد ہو سکتا ہے۔ انسانی زندگی کی اس تقسیم سے ایسا خوفناک الحاد پیدا ہوا جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ دین کی بنیادوں کو ملیامیٹ کیا گیا، اُس کے تصورات اور اخلاقیات کو علم اور معرفت کے نام پر جڑ سے اکھاڑ دیا گیا۔ یورپ نے عملاً اُس نصیحت پر عمل کیا جو ہیگل نے جاری کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کسی بھی معاشرے کو جو دین سے آزادی کا خواہاں ہو، کے لیے سب سے کارگر عمل ''تعلیم'' ہے۔(۳۹۶)

تعلیمی نظام اور بحث و تحقیق کو ہر دینی رنگ سے الگ کر دیا گیا اور تعلیم کے میدان میں خالص سیکولرزم کا آغاز ہوا۔ پڑھے لکھے نوجوانوں کے لیے یہ نفسیاتی تناقض پیش کیا گیا کہ وہ ایمان باللہ اختیار کر کے رجعت اور جمود جیسے خطرناک عیوب کے حامل بن جائیں یا روشنی اور حریت فکر سے لبریز ہو کر الحاد کے حامل بن جائیں۔ نوجوانوں کی ایک بھاری اکثریت نے الحاد کو پسند کیا تاکہ وہ مومنین پر چسپاں تہمتوں سے بری ہو سکیں اور ترقی و جدت کے ہم رکاب ہو سکیں۔

جاؤ کہتا ہے: ''جن لوگوں کو میں جانتا ہوں، اُن میں سے مسیحیت پر ایمان لانے والوں کی تعداد چھے بھی نہ ہوگی البتہ ملحدین کی تعداد ایک سو سے زیادہ ہوگی۔۔۔ بہت مشکل ہے کہ آپ کسی پڑھے لکھے انسان کو دیکھیں اور وہ دین دار بھی ہو۔۔۔ کلیسا کی طرف جانے والے اکثر وہ لوگ ہوتے ہیں جو بوڑھے ہوں یا ان پڑھ خواتین، اور ان کی تعداد برطانیہ کی آبادی کا دسواں حصہ بھی نہیں۔''(۳۹۷)

بعض لکھاریوں نے اس عنوان پر بحث کی ہے کہ بیسویں صدی میں لوگوں کا اپنے معبودوں سے کیا سلوک ہوگا۔ چنانچہ تاریخ بشریت جس کو یونیسکو کی عالمی تنظیم نے صادر کیا ہے، کے مصنفین کہتے ہیں: ''انیسویں صدی میں نیوٹن کا علم یقینیات پر مشتمل سمجھا جاتا تھا لیکن اب اس کی جگہ اضافیت اور لایقین نے لے لی ہے۔ جدید علم جسم اور جان کے ان حصوں میں پیوست ہو گیا ہے جہاں کسی دور میں دین کا قبضہ تھا۔ بیالوجی اور کیمیا کے ماہرین نے زندگی کی طبیعت کو سمجھنے کا دعویٰ کیا، فلکیات کے ماہرین نے آنے والے دور کے متعلق نت نئے انکشافات کیے اور نفسیات کے ماہرین نے انسانی جذبات کی گہرائیوں اور تحت شعور میں داخل ہو کر دین کے عمل کو دریافت کرنے کا دعویٰ کیا۔ صنعتی شہروں کا حجم بڑھ گیا اور ایک ایسا معاشرہ وجود پذیر ہوا جو دینی اعتبار سے ناکارہ تھا اور دنیا کی بڑی آبادی کو متاثر کرنے سے قاصر تھا۔ وہ علاقے جہاں کمیونزم مسلط کیا گیا وہاں انسانی جہان اور معاشرے کے متعلق ایسے علوم اور معارف نشر کیے گئے جو دینی عقائد کے دشمن تھے۔ دینی اداروں کو اس نظر سے دیکھا گیا کہ یہ بورژوائی استحصال کا پردہ ہیں جس کی جدید معاشرے میں جگہ ہی نہیں۔ تو اس طرح سے علوم اور دین کے مابین علیحدگی واقع ہو گئی''(۳۹۸)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تجرباتی علم کے میدان میں جو نتیجہ ظاہر ہوا، وہی نتیجہ نظریاتی فلسفے کے میدان میں ظاہر ہوا۔ ڈیکارٹ عقیدے کی اس غلطی میں واقع ہوا کہ علم اور دین کے مابین دوئی کا نظریہ پیش کیا۔ اُس کا خیال تھا کہ اس کا نظریہ مسیحیت کو مٹنے سے بچالے گا اور دین وعلم کو اپنے اپنے میدان میں آزادی فراہم کرے گا لیکن معاملہ اس کے برعکس نکلا، جیسا کہ جدید فلسفہ کہتا ہے: ''فلسفی کا موقف ہمیشہ اُس وقت ممتاز ہوتا ہے جب وہ دینی موقف کے خلاف ہوتا ہے۔ اور خالص فکر ونظر اور تجرد کا حامل ہوتا ہے۔ فلسفی یہ سمجھتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کا مسئلہ مکمل طور پر اپنے وجود اور اپنی طبیعت سمیت انسانی عقل کی وسیع جولان گاہ ہے''

فلسفہ کسی ایسے مقدس مقام کا قائل نہیں ہوتا جس کے قریب جانا ممکن نہ ہو۔ میٹا فزکس کا مفکر جب عظیم الشان کائنات کو لیتا ہے تو وہ اس کو دیگر کسی بھی مسئلے سے زیادہ اہم نہیں سمجھتا جس پر ہمیشہ انسان غور وخوض کرتے رہے۔

فلسفے کے طالب علم کو سب سے پہلے یہی سبق دیا جاتا ہے کہ فلسفے کا میدان ایک عقلی سرگرمی کا میدان ہے جس کی اپنی دلالتیں ہوتی ہیں، فلسفہ کا حق ہے کہ وہ کسی بھی فکر، تصور، قدر، قانون، سرگرمی اور نظام کا مناقشہ کرسکتا ہے جو انسانی دائرے میں ہو۔ کبھی کبھی مزاح کے طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلسفے کے میدان میں اللہ کو بھی اپنے وجود کے ثبوت کے لیے کاغذات پیش کرنے ہوتے ہیں۔ (۳۹۹)

یہاں ایک نئی مشکل پیش آتی ہے جو پچھلی مشکل کا ہی حصہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ ماہرین نے غرض وغایت کی تلاش کو بحیثیت ایک اصول ومنہج، قبول کرنے سے انکار کردیا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اس نے اپنا دائرہ اس حد تک وسیع کرلیا ہے کہ لوگ یہ بات سننے اور ماننے کے عادی ہیں کہ اس زمین پر ان کے وجود کی کوئی غرض وغایت نہیں۔ ایک طویل اور سست رفتار ارتقا نے اُن کو اِس زمین پر پھینک دیا۔ ہیگل کی رائے کے مطابق ''انسان'' علمی فلسفے کی روشنی میں کبھی بھی کائنات کا مرکز اور غایت نہیں بن سکے گا بلکہ وہ کائنات کی زنجیر میں فقط ایک کڑی ہے، جیسے کیڑے غیر فقاریہ جان داروں کا تسلسل ہیں یا مچھلیاں کیڑوں کا تسلسل ہیں، اسی طرح انسان بھی کسی نہ کسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انسان دیگر فقاریہ جانور کی اقسام میں سے ایک قسم ہے، جو عام ارتقا کے نتیجے میں دیگر جان داروں سے بہتر ہے۔ (۴۰۰)

اِس سے اُن اقدار اور اخلاق پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوئے جن کو نسل انسانی نے اُس وقت سے محفوظ کر رکھا تھا جب سے وہ زمین پر موجود تھی۔ یورپ میں ایسی نسلیں پیدا ہوئیں جو بے مقصدیت، عدمیت، انارکی اور وجودیت جیسے بے کار اور عجیب وغریب فلسفوں پر ایمان لانے لگیں۔ یورپ میں ایک طاقت ور لہر پیدا ہوئی جو زندگی سے اکتائی ہوئی تھی اور زندگی کے سفر سے بھاگتی تھی۔ غور وفکر سے چھٹکارا حاصل کرنا عام لوگوں کی روش بن گئی، خصوصاً وہ لوگ جو نرم ونازک احساسات کے مالک تھے۔

لوگوں کی زندگی قلق اور گھبراہٹ سے بھر گئی اور وہ اس کی وجہ بھی نہیں جانتے تھے۔ لوگوں پر حیرت اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محرومی کا شدت سے قبضہ ہوگیا۔ جب وہ یہ یاد کرتے کہ اس دنیا میں ان کے وجود کا کوئی ہدف اور مقصد نہیں اور وہ ادنیٰ کیڑے مکوڑوں اور حشرات الارض کے برابر ہی اہمیت رکھتے ہیں۔ افراد اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگے، زندگی معنویت اور قدر و قیمت ختم ہوگئی، خودکشی اس قدر پسندیدہ عمل قرار پایا کہ اس کی خاطر متعدد وسائل اور طریقے ایجاد کیے گئے۔ اپنی جان کو خطرات میں ڈالنا بدرجہ اولیٰ انفرادی و اجتماعی مقابلوں کا حصہ بن گیا۔ لوگ تشدد اور دہشت ناک مناظر کو اہتمام سے پیش کرنے لگے، خواہ وہ قدرتی ہوں یا میڈیا کے تخلیق کیے گئے۔

بہت سارے محققین اس خوف ناک اور گھمبیر صورت حال سے متفکر ہیں۔ اُن میں چند بڑے نام ڈاکٹر الیکسس کارل اور ان کے شاگرد لیکونٹ ڈی نوئے کے ہیں۔ لیکونٹ نے اس موضوع پر اپنی مشہور کتاب ''انسان کا انجام'' بھی تالیف کی ہے جس کے مقدمے میں سے چند اقوال درج ذیل ہیں: ''مادیت کی نشوونما تہذیب وتمدن کے اعتبار سے انیسویں صدی کے نصف سے شروع ہوئی جس میں انسان پر زیادہ سے زیادہ زور دیا گیا۔ انسان کی اہمیت اتنی زیادہ کردی گئی جیسے اچانک کوئی معجزہ ظاہر ہوگا اور لوگوں کے لیے انسان کی مشکلات حل کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں بچے گا۔ چنانچہ ایک کے پیچھے دوسری حیرت انگیز اور دہشت ناک ایجاد کا سلسلہ شروع ہوا ہے، جو ۱۸۸۰ء سے لے کر اگلی صدی تک مسلسل جاری رہا۔ لوگوں کی عقلیں اتنی حیران وششدر رہ گئیں جیسے بچے تلوں میں سے نکلنے والے تیل کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں اور کھانا پینا بھول جاتے ہیں۔ سائنس کی بھاری بھرکم ایجادات عملی زندگی کی علامت بن گئیں اور لوگ اپنی حقیقی اقدار کو بھلا بیٹھے۔ نئے ستارے کی روشنی نے ہر چیز کو بجھا دیا۔ بہت سارے لوگوں نے ایک ہمہ گیر خطرے کا احساس کیا اور لوگوں کو ڈرایا لیکن کوئی بھی اس پر توجہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا، ایک نیا اور عجیب وغریب معبود پیدا ہو چکا تھا۔ ایجادات کی پرستش عوام پر ایک نئی پوجا کی شکل میں چھا چکی تھی''۔۔۔ ''بتدریج وہ ادب واحترام ختم ہوتا چلا گیا جو مذہبی پیشواؤں کو دوسروں کی بہ نسبت حاصل تھا۔ اُن کی جگہ پر وہ لوگ فائز ہوئے جو فطرت کی قوتوں کو تسخیر کر رہے تھے اور اس کے اسرار ورموز ظاہر کر رہے تھے۔ افسوس مادیت فقط مادے کے ماہرین کے درمیان ہی نہیں پھیلی بلکہ عوام کے اندر بھی پھیل گئی''

جدید دور میں بے چینی اس لیے پھیلی ہوئی ہے کیونکہ عقل نے انسان کو اپنے وجود کے جواز سے محروم کر دیا ہے۔ علم کے نام پر انسان کے وجود کو توڑ دیا گیا۔ انسان ابتدائی دور سے لے کر آج تک اپنی تعلیمی بنیادوں میں یہی سیکھتا سیکھاتا رہا کہ انسان کی زندگی جدوجہد سے عبارت ہے اور اس کے لیے ایک بلند ہدف تک پہنچنا ضروری ہے۔ یہ ادیان کا علم تھا''

''انسانی ارادے کی آزادی کا انکار اور اخلاقی پابندی کا انکار، انسان کو محض ایک فزیکل اور کیمیکل وجود سمجھنا اور ایسا زندہ مادہ تصور کرنا جو اپنی زندگی کو واضح سمجھ نہ سکے۔۔۔ ان سب باتوں نے انسان کی اخلاقی موت کو لازم کر دیا، اُس کی روحانیت وامیدوں کا گلا گھونٹ دیا اور اُس کے شعور کو کمزور اور خوف ناک شعور میں بدل دیا''

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے انسان ہونے کے اعتبار سے ایک فکر اور اخلاقی روح کا حامل ہے۔ اگر وہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان چیزوں پر فخر کرے تو وہ فخر کر سکتا ہے۔ ان باتوں کی اہمیت اس کے وجود کی اہمیت سے کم تر نہیں بلکہ یہی باتیں انسانی جسم کو قدر و قیمت دیتی ہیں، اِن کے بغیر انسانی وجود کی کوئی حیثیت نہیں۔ (۴۰۱)

''تاریخ بشریت''، جس کا ذکر گزر چکا ہے، کے مصنفین ایک اور بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''انسان کا فطرت پر قبضہ اس وجہ سے ہے کہ اسے انسانی زندگی کی غرض و غایت کے متعلق یقین کی قوت سے محروم کر دیا گیا ہے۔ انسان سمجھتا تھا کہ اسے اپنے لکھے ہوئے پر راضی رہنا چاہیے اور اس کا اچھا یا برا انجام کچھ ایسے بلند اخلاقی قوانین پر منحصر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ انسان سمجھتا تھا کہ وہ ایک بلند غرض کی خدمت کر رہا ہے اور وہ بلند اخلاق پر مبنی ہدایت کا حامل ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان نے فطرت کی بعض قوتوں پر غلبہ حاصل کیا تو اس کے اپنی قوت کے بارے میں احساسات بڑھ گئے لیکن اس قوت کے اچھے استعمال میں وہ کوئی اخلاقی ضابطہ حاصل نہ کر سکا۔

ہر نئی ایجاد نئی بیماریوں کو پیدا کرتی رہی جو انسان کو گھیرتی چلی گئی۔ انسان کو بڑی بڑی امیدوں نے گھیر لیا جیسے اس نے کوئی ایسی جنت بنالی ہو جو اس کے وہم و گمان میں نہیں تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ کئی ایسے خوفناک خطرات نے بھی گھیر لیا جن کا امکان جان بوجھ کر تباہی اور بربادی پھیلانے میں نہ تھا۔

لوگ ایک دوسرے سے پوچھنے لگے: ''کیا ان کی زندگی کا کوئی ہدف ہے یا انسانیت آگے سے آگے بغیر بصیرت کے بڑھتی چلی جائے گی۔ اس کی حرکت مسلسل جاری ہے کیونکہ اس کا قلق اور اس کی عقل اس کو کسی پل چین نہیں لینے دیتے۔ انسان کا اپنے انسانی بھائیوں کے مقابلے میں کیا فریضہ ہے؟ وہ کون سے اخلاقی مبادیات ہیں جو انسان کی راہنمائی کرتے ہیں کہ وہ اپنی نئی طاقتوں کو اچھے راستے میں استعمال کرے؟ وہ ان طاقتوں کے استعمال میں انسانی بھلائی کا راستہ کیسے تلاش کر سکتا ہے۔ (۴۰۲)

علم اور دین کی باہمی جدائی سے نہایت خوف ناک اثرات مرتب ہوئے، خصوصاً اُن ماہرین پر جو بعض فکری مسائل کی گہرائیوں کو محض اپنی عقل سے حل نہیں کر سکتے۔

مثلاً کائنات کی ابتدا کے متعلق اتنے نظریات ہیں کہ قاری پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی نفس، سلوک، نفسیات، شعور، حریت ارادہ پر کئی قسم کے نظریات ہیں۔ آج مغرب میں سیکڑوں نفسیاتی اور فلسفیانہ مکاتب فکر ہیں جن میں سے ہر ایک انسان کو ایک خاص نظر سے دیکھتا ہے اور ایک خاص نظر سے ہی علاج کرتا ہے جیسے تحلیل نفسی، سلوکیت، روحانیت، عبثیت، وجودیت، پریگماٹزم وغیرہ

یہی صورت حال دیگر معاشرتی مطالعہ جات اور تحقیقات کی ہے۔ یہ بڑے مکاتب فکر ہیں جن کے تحت چھوٹے رجحانات کا کوئی شمار نہیں۔ بڑے بڑے مکاتب فکر میں اہم یہ ہیں: **انتہا پسند معاشرتی مکتبہ فکر از دور خائم، نفسیاتی مکتبہ فکر از جبریل ٹارڈ، عضویت از سپنسر، آلیت از بارکلے، حیوانیت از ڈارون، انارکزم از باکونین۔۔۔** یہ تمام مکاتب فکر ایک دوسرے پر لعنت کرتے ہیں۔ (۴۰۳)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق فلاسفہ کا فکری اضطراب حد وحساب سے باہر ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایتھر عام کو معبود سمجھتے ہیں۔ (۴۰۴)

بعض سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا مرکز ہے اور اس سے مختلف جہان ایسے پھوٹ رہے ہیں جیسے کسی بہت بڑے گچھے سے مختلف میزائیل نکلتے ہیں اور مرکز بذات خود کچھ نہیں بلکہ ایک مسلسل اور جاری منبع ہے۔ (۴۰۵)

اسی طرح قدیم صوفی فلسفے خاص طور پر وحدۃ الوجود بھی موجود ہے۔ جیسے کسی سے سوال ہوا تو اس نے دعویٰ کیا کہ انسان حقیقت میں خود ہی الٰہ ہے۔ (۴۰۶) اسی طرح بعض لوگوں نے فطرت کے لفظ کو بار بار اللہ تعالیٰ کے بدلے میں دہرایا اور بعض نے شک کے اندر اس قدر غلو کیا، کہنے لگے کہ کائنات ساری کی ساری وہم ہے ذہن سے باہر کچھ نہیں ہوتا مطلق طور پر کوئی بھی حقیقت موضوعی نہیں۔ (۴۰۷) اور بعض لوگوں کا جنون اس حد تک پہنچا کہ وہ خود کو الٰہ قرار دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ فرمائے۔ (۴۰۸)

اور جو لوگ فکری انتشار کا شکار ہیں اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

دین سے شدید نفرت کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ نام نہاد مغربی مفکرین ایسی باتوں میں گھس گئے جو اُن کے دائرہ کار سے خارج تھیں۔ وہ اپنے جھوٹے غرور میں یہ سمجھنے لگے کہ وہ بعض ایسے مسائل میں قطعی فیصلے کر سکتے ہیں جن میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں۔ وہ انسانی علم سے یہ توقع رکھنے لگ گئے کہ یہ غیب وحاضر دونوں جہانوں پر محیط ہے۔

رسل کہتا ہے: ''یہ قول کہ انسان بعض غیر مقصود اسباب کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا یا اس کی سرگرمیاں، امیدیں، خدشات، میلانات، اعتقادات وغیرہ۔۔۔ یہ سب کچھ ایٹمی ذرات کی مختلف ترکیبوں سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ کوئی جوش وجذبہ، بہادری اور غور وفکر ایسا نہیں جو انسان کی زندگی کو مرنے کے بعد محفوظ کر سکے۔ انسان کی تمام کوششیں جو اس نے مختلف ادوار میں سرانجام دیں، ساری عبادتیں، الہام، ذہانتیں، ساری انسانیت اس کائنات کے اختتام کے ساتھ ہی بالآخر زوال پذیر ہو جائیں گی۔ یہ تمام اشیا کسی نہ کسی حد تک مناقشے کا نشانہ رہی ہیں لیکن اُن کا امکان اتنا مضبوط ہے کہ کوئی بھی فلسفہ اُن کا کلی انکار کر کے زندہ نہیں رہ سکتا'' (۴۰۹)

ہکسلے کہتا ہے: ''مجھے سمجھ نہیں آتا کہ جب انسان کی دوسری زندگی کا وجود ممکن ہے تو پھر ہم اس کے انکشاف پر قادر کیوں نہیں۔ کوئی بھی چیز جو انسان سے متعلق ہو، انسان سے نہیں چھپ سکتی'' (۴۱۰)

ہیگل کہتا ہے: ''اگر مجھے وقت اور کیمیائی مواد دے دیا جائے تو میں انسان کو بنا سکتا ہوں'' (۴۱۱)

اس قسم کے احمقانہ غرور کی بہت ساری مثالیں ہیں جس کو اِس سوچ نے پیدا کیا کہ انسان خالق کا حریف مخالف ہے، اُس کے امکان میں ہے کہ وہ ہر چیز کا علم چرا لے۔ اگر یہ ماہرین حقیقت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے ہوتے تو یہ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خشوع اور اعتراف کرنے والے ہوتے۔

مغربی ماہرین کا غرور اور تکبر اِس حد تک پہنچ گیا کہ مغربی تہذیب پر تنقید کرنے والے اور اُس کے زوال کی خبریں دینے والے بذات خود اس مغربی علم سے ہی کوئی کامیاب دوا اور فوری حل تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماہرین انسانی نسل کو مستقبل سے ڈراتے ہیں، مختلف کوششوں پر توجہ دلاتے ہیں اور بین الاقوامی سطح پر کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ اِس طرح یورپ خبطی بنا پھرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے اُصول وقواعد اُس کے قریب بھی ہیں اور میسر بھی!

یہاں ہم جدید علم اور دین کے مابین جدائی کے ایک اور نتیجے پر بھی اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو عام مغربی لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ بُرا نتیجہ ہے حالانکہ ہمارے نزدیک یہ فقط مرض کی ایک علامت ہے، بذات خود مرض نہیں۔ یہ تباہ کن ایٹمی اور جنگی میدان میں ایجادات کی دوڑ ہے جو پوری انسانیت کو تباہی کے خطرے سے دوچار کررہی ہے۔ یہ جدید علم کے بُرے استعمال کی ایک واضح مثال ہے۔ کتاب ''علم اور اُس کے اسرار'' کے اندر ایک محقق کہتا ہے: ''علم کو گہری کھائی کا سامنا ہے۔ علم حقیقت کی تلاش کا نام ہے۔ علم کی اساس یہی ہے کہ حقیقت کو لازمی طور پر منکشف ہونا چاہیے۔ حقیقت کی تلاش، انسان کی روحانی صفات میں سب سے معزز ہے۔ اِس کے باوجود حقیقت کی تلاش بذات خود ہماری تہذیب کو تباہی کے کنارے تک پہنچا رہی ہے''

ہم جتنی چیزیں تسخیر کرتے ہیں وہ بالآخر ایک مصیبت میں بدل جاتی ہیں اور جیسے جیسے ہماری معرفت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، ویسے ویسے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اِس کرہ ارضی پر انسانی زندگی کا مکمل خاتمہ ہمارے بالکل قریب ہوتا جارہا ہے۔

حقیقت کے پیچھے بھاگنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے آلات کے ساتھ خود اپنے معاشرے کو گراتے ہیں اور نسل انسانی کی خوبصورت امیدوں کا کام تمام کرتے ہیں۔

کیا ہم علم کی بے لگام دوڑ کو روکیں یا حقیقت کی تلاش جاری رکھیں، چاہے اس میں ہمارے معاشرے کو جتنی تباہی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ (۴۱۲)

ڈی نائے نے مرض کی صحیح تشخیص پر ہاتھ رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''عقل بذات خود ایک خوف ناک خطرہ بن جاتی ہے جب وہ معقول بدیہی اخلاقی اقدار کی پابند نہ رہے۔ عقل فقط مادیت کی گہرائی تک نہیں اتری بلکہ یہ بدترین اعمال تک جا پہنچی ہے۔ اُس نے یہ بات اُس وقت لکھی تھی جب ابھی ایٹم بم ایجاد نہیں ہوا تھا۔ ماہرین کی اکثریت جانتی ہے کہ علم کی زبردست ترقی پوری انسانیت کے اطمینان وسکون کو چیلنج کررہی ہے۔ وقت تھوڑا ہے، ہمیں حمایت کا کوئی راستہ نہیں مل رہا، کچھ اُمور پر اتفاق ضرور ہے لیکن تمام لوگ جانتے ہیں کہ اِن اتفاقی نکات کی کوئی قدر وقیمت نہیں۔ جب تک انسان ان کی کامل پیروی نہ کرے، جب تک انسان مخلص اور راست رو نہ ہو اور جب تک عوام انسانوں کے باہمی اتحاد کا احترام نہ کرے، اُس وقت تک کسی بھی چیز کا کوئی فائدہ نہیں''۔

تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ اخلاقی اقدار اور خالص عقل کے درمیان ایسی جنگ چھڑی ہے جو موت وحیات کی کشمکش پر مبنی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انسانیت اس سے عبرت پکڑے گی لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اس پر مکمل وثوق کے حامل نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ڈھیروں بُرے نتائج میں سے چند ایک کا بیان ہے جو یورپی دین اور جدید علم کے مابین منحوس کشمکش کے نتیجے میں ظاہر ہوئے۔ ان کی طرف دھکیلنے والے وہ لادین داعی ہیں جو تعصب سے بھرے ہیں۔ علم کا میدان تو ایسا تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والے سب سے بڑے راستے کی نشان دہی کرتا تھا اور یہ اللہ تعالیٰ کی خشیت کا سب سے بڑا محرک تھا۔

یہ مختصر بیان ہمیں ایک قطعی دلیل دیتا ہے کہ یورپ میں علم اور دین کے مابین جدائی کے کچھ خاص اسباب اور حالات تھے۔ اور یہ ہمارے لیے ڈھیروں شواہد میں سے ایک شاہد ہے کہ جدید جاہلیت علم اور عقل کے ساتھ جتنی زیادہ چمٹ جائے پھر بھی اس پر کئی متعارض اُمور کا ردعمل مسلّط ہے۔ اُس نے ابھی تک سکون اور استقرار کی لذت ایک دفعہ بھی نہیں چکھی۔

اصطلاحات: ۹

علمیت (Epistemology)

ماخذات علم، حاصل شدہ معلومات کی درستگی کے معیارات کی جانچ پڑت اور معلومات کی حد بندی دریافت کرنے کا عمل۔ مغرب میں دین کے زوال کے بعد علم کا بنیادی ماخذ عقل، وجدان، تجربہ قرار پائے اور وحی، کتاب الٰہی اور مذہب کو رد کر دیا گیا۔ اسلام میں وحی الٰہی علم کا منبع ہے تاہم وحی کے دائرے میں رہ کر عقل، وجدان اور انسانی تجربات سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

تجربیت (Empiricism)

یہ فلسفیانہ نظریہ کہ علم کا واحد ذریعہ حسی تجربہ ہے۔ اس نظریہ سے سائنسی ترقی ہوئی۔ یہ نظریہ وحی کو ماخذ علم کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔

عقلیت پرستی (Rationalism)

انسانی عقل کو علم کے بنیادی منبع کے طور پر قبول کرنا۔ عقلیت پرستی وحی اور کتاب الٰہی کو حجت نہیں مانتی۔

لاادریت (Agnosticism)

یہ نظریہ کہ خدا یا کائنات کی ابتدا یا کسی اور چیز کے بارے میں کوئی بھی علم نفیاً یا اثباتاً ممکن نہیں۔ ہیوم اور کانٹ نے اس کو فلسفیانہ حیثیت دی۔ نتائجیت اور اثباتیت نے اس کو مزید گہرا کیا اور مارکسیت نے لاادریت سے بڑھ کر انکار خدا تک بات پہنچائی۔

فطرت پسند نظریہ (Naturalism)

وہ نظریہ جس کی رُو سے مظاہر فطرت اصل حقیقت ہیں ان کے پیچھے کوئی ابدی ہاتھ کارفرما نہیں ہے۔ یہ نظریہ کہ انسانی معاشرہ اور انسان کے ذہنی اعمال اور رویے فطری اصولوں کے ماتحت ہیں اور انسان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خودفطرت پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔

نظریہ تشکیک (Skepticism)

یہ نظریہ کہ علم بطور کیفیت یقین کا حصول ناممکن ہے۔ یہ نظریہ ایمان وعقیدے کا ضد ہے جو دین کے بنیادی اُمور پر مکمل یقین کا طالب ہوتا ہے۔

سائنس (Science)

علت ومعلول اور کائناتی ہم آہنگی (uniformity) کے قوانین کی روشنی میں کائنات کی تفہیم حاصل کرنا۔ مغربی تصور سائنس کا مقصد کائنات کے وسائل کو انسانی خواہشات کے ماتحت کرنا ہے تاکہ اُس کی خودمختاری (صمدیت) قائم ہوسکے۔ جدید سائنس کا بانی راجر بیکن کو سمجھا جاتا ہے۔

انسانی علوم (Human sciences)

وہ علوم جو ہیومن ازم کی تحریک کے نتیجے میں پیدا ہوئے۔ جن کا مقصد انسانی آزادی کا زیادہ سے زیادہ حصول ممکن بنانا تھا۔ یہ علوم وحی سے کلی طور پر آزاد ہوکر مدون کیے گئے۔ کیونکہ ان کے ماہرین کے نزدیک انسان خودمختار ہے۔ انسانی علوم کے مقابلے میں شرعی علوم ہوتے ہیں جو وحی الٰہی سے ماخوذ ہوتے ہیں اور انسان کو رب کا غلام بناتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب: ۱۰

یورپی معاشرت واخلاق کا سیکولرزم

بحث اوّل: قرونِ وسطیٰ کا معاشرہ واخلاق

قرونِ وسطیٰ کا یورپ، وحشت اور انحطاط کی ایسی زندگی گزارتا تھا جس کی مثال دنیا کے کسی حصے میں نہیں ملتی، خصوصاً پہلی تین صدیاں جن کو مغربی مؤرخین کی اصطلاح میں تاریک ادوار کا نام دیا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات پورے قرونِ وسطیٰ کو بھی تاریک دور کہا جاتا ہے جو لگ بھگ دس صدیوں پر محیط ہے۔ (۴۱۴)

یورپ کی تاریک زندگی میں سب سے پہلے اخلاقی پستی اور معاشرتی انتشار کا غلبہ اُس وقت ہوا، جب جنوبی یورپ کے وحشی قبائل نورماندیین کے حملے ہوئے اور خاص طور پر اٹلی کا سقوط ہوا۔ لیکن جب تاریخ اُس دور کا اخلاقی اور معاشرتی انحطاط تفصیل سے بیان کرتی ہے تو پھر بھی وہ اہل یورپ کو انسانیت کی صفت سے خارج نہیں کرتی۔ یورپ اپنے تمام تر انحطاط کے باوجود اُس حیوانی سطح تک نہیں پہنچا تھا جس سطح پر موجودہ یورپ پہنچ چکا ہے۔ دونوں معاشروں کے مابین واضح اختلاف ہے ایک پسماندہ انسانی معاشرہ ہے اور دوسرا نچلے درجے کا حیوانی معاشرہ!

قرونِ وسطیٰ کے معاشرے کی اپنی مخصوص اقدار، ضابطے اور اخلاق تھے۔ یہ اقدار، رواج اور اخلاق قائم بذات تھے اور خارجی حالات کے اتار چڑھاؤ یا موضوعی سند کے پابند نہیں تھے۔ اگر ہم اُن کی عملی تطبیق سے چشم پوشی کریں تو اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اخلاق مضبوط حقائق تھے، جن کو لازم پکڑنا عزت کا سبب اور انحراف قابل نفرت تھا جو مردانگی اور اخلاقی خوبی کے منافی سمجھا جاتا تھا۔

اِن اقدار و اخلاق کا تحفظ اور عوام میں اِن کی اثر پذیری کلیسا کے سپرد تھی۔ معاشرے کے بزرگ اور راہب معاشرے کے لیے بلند مثالیں پیش کرتے تھے لیکن کلیسا نے دینِ الٰہی میں تحریف کی اور اُس میں بدعات داخل کر دیں۔ اس طرح وہ اپنے اور اپنے عوام کے حق میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ اُس نے لاشعوری طور پر اُن اخلاقی بنیادوں کو گرانے میں اپنا کردار ادا کیا جن پر قرونِ وسطیٰ کا معاشرہ قائم تھا اور جن کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔

کلیسا کے اخلاق کی کہانی عجیب تناقض اور تضاد سے لبریز ہے:

تصورات کے اعتبار سے کلیسا اخلاقی خوبیوں میں غلو کرتا تھا اور ایسی شرطیں مقرر کرتا تھا جو انسانی نسل کے لیے بہت بھاری تھیں۔ اُن کو پورا کرنا یا فرشتوں کے لیے ممکن تھا یا ایک محدود انسانی گروہ کے لیے جو عام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خصوصیات کے حامل نہیں ہوتے اور اُن کو بنی نوع انسان کے لیے ایک معیار نہیں بنایا جا سکتا۔

عملی ردیوں کے اعتبار سے کلیسا کے پیشواؤں اور ارکان کی سیرت نجاست اور رذائل کے ساتھ ایسی لت پت تھی کہ عام انسان بھی اُن میں ملوث نہیں ہو سکتے اور عام فاسق و فاجر بھی اُن سے دور بھاگتا ہے۔ اس بارے میں کچھ گفتگو پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ جب کلیسا کی تعلیمات آسمان کو چھو رہی تھیں تو اُس کی عملی صورت حال غلیظ کیچڑ میں لت پت تھی! مثلاً عفت و عصمت ایک شریف انسان کا عام وصف ہے، اس پر پوری انسانیت کی فطرت قائم ہے، تمام ادیان اس کی دعوت دیتے ہیں لیکن کلیسا نے اس کے تصور میں غلو کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے حلال کو حرام کر دیا اور فطرت کے جواز کو برا سمجھنا شروع کر دیا۔ انسانی وجود کی غرض و غایت ایک فطری عفت و عصمت کی طرف بلاتی ہے لیکن رہبانیت کی بدعت پیدا کی گئی اور عورت کے تعلق سے شدید نفرت دلائی گئی۔ چنانچہ کلیسا کی تعلیمات کہتی تھیں کہ جب تو اپنی آنکھ کے ساتھ کسی نافرمانی کو دیکھے تو اُس کو نکال پھینک کیوں کہ تیرے کسی عضو کا ضائع ہو جانا اس بات سے بہتر ہے کہ تیرا سارا جسم جہنم میں جلے۔ (۴۱۵)

اسی وجہ سے دینی پیشواؤں پر شادی حرام تھی کیونکہ یہ عقیدہ رکھا جاتا تھا کہ دینی پیشوا عوام کی سطح پر نہیں گر سکتا اور ذلیل لذتوں میں اُن کا شریک نہیں بن سکتا!

یہ نظری اعتبار سے تھا لیکن عملی اعتبار سے صورت حال بالکل مختلف تھی گرجا گھر فسق و فجور سے آلودہ تھے اور بدکاری و فحش کاری اپنے عروج پر تھی۔ پوپ اور پادری کی اپنی معشوقائیں اور عیاشیاں اس قدر ہوتی تھیں جو دنیادار بادشاہوں کو بھی نصیب نہ ہوں۔ پوپ کے منصب پر غیر قانونی بچوں کی ایک تعداد فائز ہوئی۔ (۴۱۶)

مصیبت یہ تھی کہ یہ حقائق عوام پر مخفی نہیں تھے بلکہ یہ زبان زد عام تھے اور بحث و مناقشہ کا عام موضوع تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مال و دولت کی لالچ اور عیاشی ایک بُرا اخلاق ہے۔ لیکن کلیسا نے اس کی مذمت اور حرمت میں غلو کیا اور زہد و تقشف کی دعوت دی اور اس میں اتنا مبالغہ کیا کہ حلال مال کو بھی حرام قرار دے دیا، فقیری کو مقدس سمجھا گیا اور سہولتوں کے ذرائع کو سرے سے حرام قرار دیا گیا۔ انا جیل یہ کہتی ہیں: اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گذرنا آسان ہے لیکن کسی دولت مند کا اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔۔۔ لیکن اسی دوران کلیسا کے اپنے پیشوا عام لوگوں سے زیادہ لالچی، بادشاہوں سے زیادہ دولت مند اور طبقہ اغنیا سے زیادہ خوش حال ہوتے تھے۔

کسی کی غلطی معاف کرنا ایک عمدہ اخلاق اور عظیم وصف ہے اور اس پر تمام عقول و فطرتیں متفق ہیں لیکن کلیسا نے اس کی فضیلت میں اتنا مبالغہ کیا کہ اپنے پیروکاروں پر ذلت اور ظلم کی برداشت لازم کر دی۔ اُس نے کہا: ''جو تیرے دائیں رخسار پر تھپڑ مارے تو اُس کے لیے دوسرا رخسار بھی آگے کر دے۔ جو تجھے ایک میل تک چلائے تو اُس کے ساتھ دو میل چل، اور جو تیری ایک چادر چھینے تو اُس کو دوسری چادر بھی دے دے۔''

اُس نے کہا: ''اپنے اوپر لعنت کرنے والوں کو بھی برکت کی دعا دو اور جو تمھارے ساتھ بُرا سلوک کریں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان پر رحمت کی دعا کرو"۔

یہ سب کچھ عقیدے اور تصور کے اعتبار سے تھا لیکن عملی زندگی میں کلیسا ایسے خوف ناک مظالم کا ارتکاب کرتا تھا کہ بڑے بڑے جابر بادشاہ اور سرکش حکمران بھی شرما جائیں۔ وہ نہ اپنے پیروکاروں کے لیے نرم دل تھا اور نہ اپنے مخالفین کو معاف کرنے کا قائل تھا۔

یہی صورت حال دیگر اعلیٰ اخلاق اور عمدہ اوصاف کی تھی۔

تصور میں انتہا درجے کا غلو جبکہ عملی زندگی میں انتہائی پتلی اور کمزور صورت حال۔ اِس کھلے تضاد کا لوگوں کی زندگی پر بڑا واضح اثر تھا حتی کہ اُس دور میں بھی جب کلیسا اپنی عزت اور شان وشوکت کے عروج پر تھا۔ پھر جب اُس کے دشمنوں نے انقلاب برپا کیا اور کلیسا کے ارکان ہر جگہ پسپا ہوئے تو بھی یہی صورت حال برقرار رہی۔

کلیسا کے پیروکار قرونِ وسطیٰ کے پورے دورانیہ میں مثالی اور نظری اخلاق کے اعلیٰ مرتبے پر فائز نہ ہو سکے اور اُس میں ان کے لیے معقول عذر بھی تھا۔ وہ شادیاں کرتے، مال جمع کرتے اور اپنے مخالفین سے ظلم کا بدلہ لیتے۔ وہ اپنے رویے اور سلوک میں کلیسا کی اُن تمام پابندیوں سے آزاد تھے جن کی وہ طاقت نہیں رکھتے تھے۔ وہ کلیسا کے قواعد اور طرز پر اپنے نفسوں کو نہ ڈھال سکے اور تاریخ شاہد ہے کہ کلیسا کے اخلاق اپنی نظری شکل میں کبھی بھی وسیع پیمانے پر نہ اپنائے جا سکے۔ لوگ اسی صورت حال پر گامزن رہے لیکن وہ اپنے دل ودماغ میں تضاد محسوس کرتے اور مثالی صورت سے دور ہونے کی بنیاد پر اپنے آپ کو کوتاہ اور خطا کار قرار دیتے۔ وہ اپنی ضمیر کی گہرائیوں میں مسلسل ملامت کا شکار رہتے۔ نفساتی طور پر یہی شعور اُن کے ساتھ چمٹا رہا لیکن عملی زندگی میں وہ عام زندگی کا مظاہرہ کرتے رہے۔

اس طرح یورپی نفسیات ایک مستقل احساس گناہ کا شکار ہوئی۔ وہ جب بھی کسی مباح چیز کا شوق رکھتے یا کسی پُر لطف چیز سے لطف اندوز ہوتے تو خالص حلال ہونے کے باوجود احساس جرم کا شکار رہتے۔ یہی احساس نسل در نسل منتقل ہوتا رہا حتی کہ اس درجہ راسخ ہو گیا کہ اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کسی بڑے ہیجان خیز نفسیاتی انقلاب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جدید یورپ کی صورت میں ایک یک طرفہ ردعمل ابھر کر سامنے آیا۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔

تصویر کے دوسرے رخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کا معاشرہ اپنی بناوٹ کے اعتبار سے خاندانوں پر مشتمل تھا، حرفت کے اعتبار سے زراعت پیشہ تھا اور طبقات ومراتب کے اعتبار سے جاگیردارانہ تھا۔ اِن سب خصوصیات کا اجتماعی اخلاق پر بڑا گہرا اثر تھا۔

خاندانی نظام عزت کے تحفظ کو راسخ کرتا ہے اور ازدواجی تعلقات کی پاکیزگی کو اہمیت دیتا ہے حتی کہ خائن بیوی اور عزت پر حملہ کرنے والے کے لیے قتل کی سزا مقرر کرتا ہے۔

یورپ کے زراعتی مزاج نے انفرادی ذمہ داریوں کے تحفظ میں حصہ لیا اور قدیم دور سے منتقل ہونے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والے رسوم و رواج کو اہمیت دی۔ یہ رسوم دینی تعلیم اور معاشرتی رواجوں کا مجموعہ تھیں جن سے معاشرتی اخلاقی قواعد تشکیل پاتے تھے۔

لیکن اسی دوران کلیسا کی غفلت کے سبب معاشرہ اُن پرانے افکار اور بوسیدہ خرافات کا حامل ہوتا چلا گیا جو قدیم اساطیر کا حصہ تھیں یا من گھڑت سادے اقوال تھے۔ جہالت اور عوام وخواص کے عقلی انحطاط نے اس کو مزید رواج دیا۔ یہ افکار اُس دور کے اخلاقی قواعد کے ساتھ گھل مل گئے اور ایسا مجموعہ تیار ہوا کہ لادین معاشرتی محققین یہ نظریہ قائم کرنے پر مجبور ہو گئے کہ اخلاق ہمیشہ خرافات کا نتیجہ ہوتے ہیں یا خرافات کے ہم قدم قائم ہوتے ہیں۔

یورپ کے جاگیری نظام اور طبقاتی تقسیم نے ایسا جمود قائم کیا کہ وہ اُس دور کی بنیادی خصوصیت قرار پایا۔ جب یورپ میں ترقی کا بم دھماکہ ہوا تو محققین یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ اخلاق اور عادات کبھی بھی ذاتی اور مستقل نہیں ہوتے بلکہ یہ اقتصادی یا معاشرتی حالات کا عکس ہوتے ہیں۔

یہ قرونِ وسطیٰ کے اخلاق اور معاشرے کی مختصر نشانیاں تھیں۔ اِن کی مزید تفصیل لادین معاشرتی نظریات کے موقع پر بیان ہوگی۔ یہ نظریات یورپ کی معاشرتی صورت حال کا ردِعمل تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث دوم: یورپ کے لادین معاشرتی مکاتب فکر اور نظریات

مقدمہ:

لادین معاشرتی فکر اپنے اصولوں کے اعتبار سے قدیم ہے۔ ارسطو اپنے ایک مشہور بیان میں کہتا ہے کہ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ اسی طرح افلاطون کے بھی مخصوص معاشرتی نظریات تھے جن کو اُس نے اپنی کتاب ''جمہوریت'' میں مدون کیا ہے، اگر چہ یہ نظریات اُس کے ذاتی وضع کردہ تھے۔

جب یورپ میں بیداری کا عمل شروع ہوا اور یونانی فلسفہ وادب دوبارہ زندہ کیا گیا تو لادین معاشرتی فکر بھی دور جحانوں کے ساتھ بیدار ہوئی۔ ایک خیالی تصوراتی، جو یوٹوپیا یا مثالی شہروں کی عکاسی کرتی تھی اور دوسری عملی واقعاتی، جو فلسفے اور عقل سے کشید کردہ تھی اور کلیسا کی تعلیمات کے مدمقابل تھی۔

اس میدان کی قیادت میکیاولی اور ہوبز کے حصے میں آئی، اِن دونوں پر ہم پچھلے ابواب میں اشارہ دے چکے ہیں۔ ان دونوں کی آرا کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ''عقائد'' اخلاقی وشرعی اصولوں سے انحراف کرتے ہیں تو اُن کا خلا افکار کی دنیا سے پورا ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تشدد کی فکر اُس وقت غالب آتی ہے جب کسی شرعی ضابطے کا وجود نہ ہو۔ ان دونوں مصنفین کے نزدیک معاشرتی زندگی قوت کے استعمال پر قائم ہوتی ہے اور معاشرتی نفسیات کا خلاصہ اُن کے اِس مشہور بیان سے واضح ہوتا ہے: کہ انسان دوسرے انسان کے مقابلے میں بھیڑیا ہے اور میکیاولی کے قول کے مطابق انسان کا میلان شر اُس کے میلان خیر پر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

میکیاولی کے متعلق **بوطول** تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اِس فلورنسی مؤرخ کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس نے فلسفہ تاریخ اور سیاسی علم کو ایک مستقل وجود بخشا۔ (۴۱۷)

جدید افکار کے قائدین میں سے ایک اہم فلسفی یہودی النسل اسپائی نوزا ہے۔ یہ ہوبز کا ہم عصر تھا اور ادیان اور اخلاق کی دشمنی میں مشہور تھا۔ اِس کی رائے تھی کہ لوگ ہمیشہ اپنی شہوات کے زیر تسلط محکوم زندگی گزارتے ہیں اور لوگوں کے حقوق ہمیشہ مختلف قوتوں کے ساتھ دائمی نزاع میں رہتے ہیں۔ سپائی نوزا قرونِ وسطیٰ میں رائج علم اخلاق کو بھی حملے کا نشانہ بناتا جو قربانیوں کو عظیم قرار دیتا، ندامت وشرمندگی کو مستحسن قرار دیتا۔ وہ کہتا ہے: ''لذت بذات خود خیر ہے اور الم بذات خود شر ہے۔۔۔ 'عقل مندی' زندگی میں غور وخوض کا نام ہے نہ کہ موت میں''۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسرا مصنف جو کلیسا اور اُس کے اخلاق کی دشمنی میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے، ماندیفیل ہے جس نے اپنی کتاب ''اقصوصۃ النحل'' میں یہ سب کچھ بیان کیا ہے۔ اِس کتاب نے ایک فضیحت کھڑی کر دی اور لوگ چہ مہ گوئیاں کرنے لگے۔ اُس نے یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ نقائص جن کو خاص طور پر اخلاقی ماہرین بُرا سمجھتے ہیں جیسے لالچ، بڑائی جتانا، فسق و فجور وغیرہ، یہ سب باتیں تہذیب، فنون اور ٹیکنیک کے پھیلاؤ کا ذریعہ بنتی ہیں۔ یہ رجحانات جو مذموم شمار کیے جاتے ہیں، ایک عظیم ڈائنامک (متحرک) زندگی کا حصہ ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو اِنسان کمزور ہو جائے اور اُس کی زندگی حیوانوں کے قریب ہو جائے۔ (۴۱۸)

یہ ابتدائی افکار علمی دنیا کا حصہ رہے، اگرچہ کسی مستقل علم کا حصہ نہ بن سکے۔ حتیٰ کہ معاشرتی علم کی پیدائش ہوئی اور اُس کو ایک الگ تھلگ علم شمار کیا گیا۔ اُس میں معاشرتی مظاہر اور تعلقات کو ایک خاص معیار اور قواعد کے تحت تفصیل سے پڑھا اور پڑھایا گیا۔

علم معاشرہ (عمرانیات) کی پیدائش:

اس علم کی ابتدا فرانس کے ایک مفکر مونٹیسکو (۱۶۸۹۔۱۷۵۵) سے ہوئی ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''روح القوانین'' میں فلسفہ سیاست پر گہری بحث کی ہے۔ اُس نے معاشرے کی طبیعت اور معاشرے کی بنیاد کے مابین فرق کیا ہے۔ وہ کہتا ہے، معاشرے کی طبیعت سے مراد اُس کی خاص بناوٹ اور امتیاز ہے اور معاشرے کی بنیاد سے مراد وہ انسانی خواہشات اور مرغوبات ہیں جو کسی انسان کو محنت و عمل پر مجبور کرتی ہیں۔

پھر اُس کے بعد سینٹ سائمن آیا جو دورِ تنویر کا حقیقی فرزند تھا اور علم و ترقی پر شدید ایمان رکھتا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ معاشرتی تعلقات کے لیے کوئی انسانی وضعی قانون پیدا کیا جائے۔

اس کے شاگردوں میں سب سے مشہور شاگرد اگسٹ کومت ہے پھر دورخائم اور اس کے شاگرد اور لیفی بریل۔ یہ سب کے سب اس بنیادی ڈھانچے کے پیروکار تھے جو سینٹ سائمن نے وضع کیا۔

برطانیہ میں ڈیوڈ ہیوم، آدم سمتھ اور ہوبز تھے۔ یہ سب فلاسفہ معاشرے کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ ایک فطری نظم و نسق ہے جو بذات خود انسانی طبیعت سے پیدا ہوا ہے اور یہ کوئی معاشرتی معاہدہ نہیں اسی لیے وہ طبعی اخلاق، طبعی دین اور طبعی فقہ جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ (۴۱۹)

اس اجمال کو نتائجی انتھراپالوجی کے مؤلف نے بیان کیا ہے جس میں معاشرے کے حوالے سے مختلف مناہج، افکار اور رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

① عقد اجتماعی کا نظریہ:

کامت سے پہلے جو نظریہ رائج تھا وہ نظریہ عقد اجتماعی یا معاہدہ عمرانی کہلاتا ہے اس کا پیش کار جان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاک روسو تھا۔اس کی کچھ تفصیل پہلے گزر چکی ہے، یہاں پر ہم اُس کے اخلاقی نظریات پر روشنی ڈالیں گے کہ معاشرے کے افراد کے مابین تعلق کیسا ہونا چاہیے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ روسو دین کو چیلنج کرنے اور اپنے دور کے اخلاق ورواج سے نکلنے میں بڑا دلیر تھا۔اس نے اخلاق کے اندر ایمانی عنصر کی نفی کی اور اخلاق کا دارومدار فقط دنیاوی مصالح کو قرار دیا یعنی معاشرے کے ساتھ تعاون کا سب سے بڑا وسیلہ دنیا کی حدود میں کسی خاص یا عام ممکنہ مفاد کے لیے ہے۔اس طرح تاریخ مسیحیت میں پہلی دفعہ اخلاقی ماہرین نے یہ نظریہ اختیار کیا کہ اخلاق فقط خارجی تعلقات کی ظاہری شکل وصورت کا نام ہے یہ کوئی مستقل حقائق اور اقدار نہیں جو انسان کے ضمیر سے پھوٹتے ہوں اور انسان کا ایمانی وجدان اُس کی تلقین کرتا ہو۔

روسو نے اپنے عقائد کی براہ راست تصریح نہیں کی بلکہ اُس نے اپنے خیالات کے ذریعے اپنے فلسفے کی ایسی منظر کشی کی جس سے اُس کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ہم اُس کے مفروضات کو بیان کرتے ہیں تاکہ ہم اس کے نتائج کو واضح کر سکیں: ''انسان کی اصل یہ ہے کہ یہ انفرادیت پسند ہے اور یہ شروع شروع میں اچھی زندگی گزارتا تھا اور قانون طبعی کا پابند تھا۔لیکن معاشرے کے مختلف اسباب اور مسائل نے اُس کو مجبور کیا کہ وہ زبان سیکھے اور معاشرے سے محبت کرے۔اس طرح وہ انسان جو طبعاً اچھا تھا معاشرتی سطح پر شریر بن گیا۔

چونکہ معاشرہ ایک ضرورت ہے، اُس کو توڑنے کی کوشش کرنا اور انسان کی طبعی حالت کی طرف واپس لوٹانا بے کار ہے اس لیے ہماری کوشش ہے کہ ہم معاشرتی فساد کو درست کریں، اچھی حکومت کو قائم کریں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطن ساتھیوں کی تربیت کریں۔(۴۲۰)

معاشرہ کیسے قائم ہوگا اس بارے میں روسو کہتا ہے: ''یہ غرض اس طرح ممکن ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت اس بات پر اکٹھی ہو جائے کہ قانون انفرادی دائرے اور انفرادی خواہشات پر حاوی ہوگا، یعنی ہر فرد اپنی انانیت چھوڑ کر معاشرے کی خاطر اپنے نفس اور حقوق سے دست برداری اختیار کرے گا۔یہی معاہدہ عمرانی کی واحد قانونی شکل ہے جس کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا کیونکہ اسی طرح تمام لوگ قانون کے سائے میں برابر ہوں گے۔قانون ایک اجتماعی ارادہ ہوتا ہے جو ایک کلیے یعنی عام منفعت کا اقرار کرتا ہے۔

ان مفروضات کے بعد روسو معاہدہ عمرانی پر مبنی معاشرے کے متعلق اپنی ترجیحات بیان کرتا ہے:

''اس معاشرے کا ایک خاص شہری دین ہے جو فرد کی زندگی کا کوئی شعبہ خالی نہیں چھوڑتا۔یہ معاشرہ ریاست پر لازم کرتا ہے کہ وہ مسیحیت جیسے دین کا انکار کرے جو روحانی اور سیاسی معاملات میں علیحدگی کا قائل ہے، اور ریاست کلیسا کے اثر ورسوخ کو بھی مضبوط نہ ہونے دے کیونکہ اُس چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہونی چاہیے جو اجتماعی وحدت کو توڑے۔دین لازم ہے کیونکہ جو بھی ریاست قائم ہوتی ہے اُس کی بنیاد میں کوئی نہ کوئی دین ہوتا ہے لیکن یہ دین زندگی کے ضروری عقائد پر محدود ہونا چاہیے جن کو قوانین کی طرح لاگو کیا جا سکے حتی کہ اُس کے نہ ماننے والے کو جلاوطن کیا جا سکے یا پھانسی دی جا سکے، اِس وجہ سے نہیں کہ وہ کافر ہو گیا بلکہ اِس وجہ سے کہ وہ معاشرتی زندگی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لیے مناسب نہیں رہا''!

یہ عقائد قانون طبعی کے عقائد ہیں: اللہ تعالیٰ کا وجود، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا، آخرت میں ثواب اور سزا، معاہدہ عمرانی اور قوانین کا مقدس ہونا اور ہر شخص کو اجازت کہ وہ اپنے ضمیر میں جو نظریات چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اخلاق کے متعلق روسو کہتا ہے کہ جس چیز کا نام اخلاق اور حقوق لیا جاتا ہے اور اُس کے لیے عقل سے کوئی سند تلاش کی جاتی ہے، وہ خالص مصنوعی چیز ہے اور ایسی اجتماعی زندگی سے حاصل شدہ ہے جو بذات خود مصنوعی ہے۔ انسان کی طبعی حالت میں کسی اخلاق اور حقوق کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ کسی کے ساتھ تعلق کی حالت میں نہیں ہوتا۔ (۴۲۱)

ان باتوں سے روسو کا موقف واضح ہوتا ہے جو دو چیزوں پر قائم ہے:

① مسیحی کلیسا، عقائد و اخلاق سے اندھا فرار، خاص طور پر جب اُس جیسے لوگ کلیسا کے ظلم و تشدد کا شکار ہوئے۔

② رومانویت، جس کا سب سے بڑا قائد روسو شمار ہوتا تھا۔ یہ عقل کے تقدس کے ردعمل میں پیدا ہوئی جو کہ عصر تنویر کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ رومانویت کا سب سے زیادہ اثر ادب و فن کے میدان میں ظاہر ہوا۔

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ فرانسیسی انقلاب کا قیام روسو کے اجتماعی افکار پر ہوا حتیٰ کہ اُس کی کتاب ''عقد اجتماعی'' کو فرانسیسی انقلاب کی انجیل شمار کیا جاتا ہے۔

② طبعی مکتبہ فکر (Physiocracy):

جدید علم کی تاریخ میں ایک فکر یہ پیش کی جاتی ہے کہ جدید علم پر تین انقلاب وارد ہوئے ہیں۔ ہر انقلاب کا اپنے دور میں کئی میدانوں پر اثر ظاہر ہوا۔ مثلاً نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل دوسرا علمی انقلاب ہے جو تاریخ میں ظاہر ہوا اور اس کا اثر ہمہ گیر تھا۔ (۴۲۲)۔ (پہلا نظریہ کاپرنکس کا تھا اور تیسرا نظریہ ڈارون کا تھا)

نیوٹن نے یہ ثابت کیا کہ کائنات یا فطرت کسی منتشر یا بے قاعدہ اصولوں پر نہیں چل رہی بلکہ وہ انتہائی باریک اور دقیق نظم و نسق کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ اُس کے اجزا کے درمیان ریاضی قوانین کے مطابق ایسا ربط ہے کہ کوئی بھی چیز اُس سے جدا نہیں۔ اِس فکر نے اُن مفکرین اور محققین کو راہ دکھلائی جو کلیسا کے ہاتھوں پریشان تھے اور کلیسا اُن کے نتائج کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ نیوٹن کے نظریے کے نتیجے میں وہ کلیسا کے پٹے سے بھاگ نکلے، کلیسا کے الٰہ کا انکار کر دیا اور نئے الٰہ پر ایمان لائے جس کا نام انھوں نے فطرت یا نیچر رکھا۔ لیکن جب وہ کلیسا کے 'خلاف عقل' عقائد سے خلاصی پا گئے تو انہیں محسوس ہوا کہ مسیحی اخلاق سے خلاصی پانا زیادہ دشوار ہے کیونکہ ہر عاقل انسان اِس اخلاق کو معاشرتی بقا کے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ اس دعوے سے نہ گھبرائے کہ نئے الٰہ کے لیے اپنا اخلاقی قانون اور اجتماعی شریعت ہے جو ہمیں کلیسا کی شریعت اور اخلاق سے مکمل طور پر بے نیاز کرتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔اس دعوے میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو کلیسا کے خدا کا مکمل طور پر انکار کرتے تھے، جو خدا کو فقط ایک گھڑی ساز کی حیثیت سے مانتے تھے اور وحی و ادیان کا انکار کرتے تھے۔ان سب کو فطرت پسند یا نیچر پسند کی اصطلاح کے تحت اکٹھا کیا گیا۔

یہ سب لوگ سمجھتے تھے کہ انسانی عقل بذات خود اپنے آپ پر اعتماد کر سکتی ہے۔وہ اجتماعی قانون طبعی کو ایسے ہی دریافت کر سکتی ہے جیسے نیوٹن نے کائنات کا نظام طبعی دریافت کیا۔لہٰذا اخلاق دین کے ساتھ مربوط نہیں اور نہ ہی اصلاً وحی، آسمانی کتب اور مذہبی پیشواؤں اور اُن کے اداروں کی ضرورت ہے۔بلکہ یہ سب رکاوٹیں ہیں جو عوام اور قانون طبعی کے درمیان حائل ہیں حالانکہ قانون طبعی واحد حق دار ہے کہ معاشرے کی قیادت کرے۔

رینڈال کہتا ہے:

''عقلی دین'' کے تین بنیادی ارکان میں سے ایک رکن یہ عقیدہ ہے کہ نظام کائنات میں اخلاق کا بھی ایک طبعی قانون ہے جس کی معرفت اور اتباع واجب ہے جیسا کہ نیوٹن کے تصور کے مطابق ساری دنیا ایک مشین کی طرح کچھ لگے بندھے قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ و ثواب، عدل و ظلم اٹھارویں صدی میں علم و عقل کے منہج پر ترتیب شدہ تھے اور اُن کو تسلیم کرنے والا مذہبی بنیادوں سے آزاد ''علم اخلاق'' کا قائل تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اخلاقی اصول بھی ویسے بنائے ہیں جیسے قانون ثقل کا اصول۔اور ان اُصولوں کو قوانین قدرت کے اندر عقلی اور تجرباتی طریقے سے دریافت کیا جا سکتا ہے جیسے نیوٹن نے کیا تھا۔''

''بعض دلیر انسانوں نے موٹیسکو کی طرح یہ محسوس کیا کہ اگر دنیا میں کوئی الٰہ نہیں اور ہم دین کی غلامی سے آزاد ہو جائیں تو پھر بھی ہم پر واجب ہے کہ ہم عدل و انصاف سے بے نیاز نہ ہوں کیونکہ انسانی علم کے مناہج، سیاست، اقتصاد اور معاشرت اپنی عمومی صورت میں اخلاق کے دائرے میں داخل ہیں'' (۴۲۳)

کلیسا کی اخلاقیات سے آزادی حاصل کرنے کے لیے **فطرت پسند مفکرین** نے ایک پیچیدہ طریقہ اختیار کیا۔وہ کہنے لگے: اللہ تعالیٰ نے کائنات کے اندر فقط اخلاقی اصول پیدا ہی نہیں کیے بلکہ اس نے ہر انسان کے اندر اس اخلاقی اصول کے لیے ایک کشش اور روشنی بھی بھر دی ہے۔اگر ہم اپنے ضمیر کی آواز سنیں اور طبعی عقل کے تحت اس واضح نور کو محسوس کریں تو طبعی اخلاق کی دریافت ممکن ہے۔اٹھارویں صدی کے مفکرین کے مطابق یہ بات عین ممکن ہے کہ ہم ان احکامات کو بذات خود دریافت کریں جو کتاب مقدس میں وارد ہوئے ہیں اور کلیسا کے آبا کی کتابوں میں درج ہیں۔اس طرح وحی ضمیر کو تقویت دیتی ہے اور ضمیر وحی کو تقویت دیتا ہے، چنانچہ ہمارے لیے ممکن ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو کتاب مقدس اور قانون کلیسا سے ہٹ کر دوسرے مصادر سے حاصل کریں۔(۴۲۴)

فطرت پسند مفکرین نے اُس وقت مسیحی اخلاق پر شدید تنقید کی جب کلیسا کی طرف سے اُن کی تکفیر و تشہیر کی گئی۔انھوں نے مسیحی اخلاق کی خطاؤں اور سلبیت کو عقلی، تاریخی اور واقعاتی پیمانوں پر ثابت کیا۔ہم اُن کو تین نکات میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① **کلیسائی اخلاق من گھڑت ہیں فطری وطبعی نہیں:** اُن کے لیے بہت آسان تھا کہ وہ اس رائے کے اثبات کے لیے وافر دلائل دیتے۔ کرسون اور دیگر اخلاقی مفکرین نے ذکر کیا ہے کہ اخلاقی تباہی میں عقلی نظریات سے زیادہ دینی پیشواؤں کی بدکرداری اور بُرے سلوک کا ہاتھ تھا۔ عقل پرست لوگ کہتے تھے کہ عفت، ایثار اور رحم دلی جیسے مسیحی اخلاق تکلف اور تصنع پر مبنی ہیں۔ وہ اس معاملے میں روسو کے ساتھ مل جاتے۔ اُن کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مسیحی اخلاق کی خلاف ورزی کرنے والے سب سے پہلے خود دینی پیشوا ہیں۔ اگر یہ اخلاق فطرتی اور طبعی ہوتے یعنی قانون فطرت کے موافق ہوتے تو عملی مشاہدے میں یہ تضاد نظر نہ آتا۔ اسی لیے جو معاشرہ خیر اور کاملیت کو چاہتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ مسیحی اخلاق کے نفاق اور بگاڑ کی نفی کرے اور اُس کے بدلے طبعی اخلاق کو پسند کرے۔ طبعی اخلاق انسان کے ضمیر کی آواز ہے جو نظام فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

② **یہ اخلاق پر تکلف اور غیر عقلی ہیں:** 'فطرت پسند ماہرین' کے خیال میں مسیحی اخلاق محض ایک جامد اطاعت کا نام ہے، وہ مسیحیت کی طرف سے بیان کردہ تشریح پیش کرتے ہیں۔

''اخلاقی زندگی کا جوہر کسی نہ کسی قانون کی اطاعت ہوتا ہے لیکن یہ قانون انسانی عقل سے دریافت نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیں وحی الٰہی کی اطاعت کرنی چاہیے اگرچہ وہ معقول ہو یا غیر معقول، منطقی ہو یا غیر منطقی، عادلانہ ہو یا ظالمانہ۔ ہم پر اُس کی اطاعت واجب ہے فقط اس وجہ سے کہ یہ الٰہی ارادے سے تعبیر ہے نہ کہ اس وجہ سے کہ اس کا ہماری سعادت میں براہ راست دخل ہے۔ طبعی طور پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ وہ قوت جو قانون الٰہی کی تنفیذ پر قائم ہوتی ہے وہ خیر کی قوت ہے اور اسی وجہ سے قانون الٰہی خیر کا قانون ہے جو اعلیٰ حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ہماری نجات فقط اس قانون کی اطاعت پر موقوف ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ہماری ذمہ داری واجبات کی ادائیگی ہے قطع نظر اس بات سے کہ ہماری اپنی رائے کیا ہے۔

مسیحی اخلاق کی پیروی آج تک ایک فرمان برداری کا مسئلہ ہے نہ کہ بصیرت کا۔ بعض لوگوں نے اس کو بہت اچھے طریقے سے بیان کیا، انھوں نے کہا کہ اس فرمان برداری کے اچھا ہونے یا لازم ہونے کا سبب، ایک ایسا معاملہ ہے جس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہمیں فقط یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لازم ہے۔ (۴۲۵)

③ **یہ اخلاق خودغرضی اور موقع پرستی پر مبنی ہیں:** وہ سمجھتے تھے کہ مسیحی اخلاق اگلے جہان کی جزا و سزا اور جنت و دوزخ کے تصور پر مبنی ہیں جن کا مسیحی اخلاق میں بڑا گہرا اثر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق ایک مشہور حجت ہے کہ ''اگر اللہ تعالیٰ کا وجود نہ بھی ہو تو بھی اس کا گھڑنا ضروری ہے''۔ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ اس رویے کے حاملین نے لازمی طور پر یہ حجت بھی گھڑی ہوگی کہ ''اگر جنت اور دوزخ موجود نہیں تو بھی ان کا گھڑ لینا ضروری ہے'' تاکہ لوگ اپنے مسیحی واجبات ادا کرنے پر متوجہ ہوں''

فطرت پسند مفکرین نے اس رائے کو رد کیا۔ اُن کے خیال میں اخروی جزا و سزا کی دلیل اخلاق کو موقع پرستی، عیاری اور مکاری میں تبدیل کرتی ہے۔ یہ دلیل بتلاتی ہے کہ اخلاق فقط ایک حکیمانہ سیاست ہے اگر ہم الٰہی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

برکت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس دنیا میں اور اگلی دنیا میں مشکلات سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم پر اخلاقی احکام خاص طور پر مسیحی اخلاق کی اطاعت لازم ہے۔ مسیحی اخلاق کی مذکورہ دلیل فقط مسیحی عوام پر محدود نہ رہی بلکہ وسیع پیمانے پر پھیل گئی لوگ فقط اس لیے معبود بناتے ہیں، اُن کو راضی کرتے ہیں اور ان سے خوش ہوتے ہیں تا کہ سادہ لوح ذہن اس بات کی طرف مائل رہیں کہ وہ دینی عبادت کو ایک تبادلے کا نظام سمجھیں جس میں بندہ اپنے رب کے لیے کوئی اطاعت یا قربانی کا عمل کرتا ہے یا اعتراف کرتا ہے تو وہ اس کے بدلے رب سے معین نعمتوں کی توقع رکھتا ہے۔ (۴۲۶)

یہ کچھ بنیادی باتیں تھیں جن پر ارتکاز کر کے فطرت پسند مفکرین نے مسیحی اخلاق پر حملہ کیا۔ اور ہم دیکھیں گے کہ یہ حملہ اپنی شکلیں اور طریقے بدلتا چلا گیا اور آنے والے نظریات میں زیادہ قوی اور گہرا ہوتا گیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ عقلی وضعی مکتبہ فکر

(الف) آگسٹ کامتے:

اٹھارویں صدی کا نصف اول کئی قسم کی فکری اکھاڑ پچھاڑ اور معاشرتی اضطراب پر مشتمل رہا۔ کئی صدیوں سے متواتر قائم طور طریقے اور نظام منہدم ہو گئے۔ وہ قواعد اور مبادیات ختم ہو گئے جو معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔ عصر تنویر کا ماضی منہدم ہو گیا لیکن اُس کی جگہ پر حاضر و مستقبل کے لیے کوئی عمارت وجود میں نہ آئی۔ کئی مفکرین نے محسوس کیا کہ سابقہ افکار اور وسائل کا انہدام مکمل ہو چکا ہے اب اِن افکار سے کوئی نئی چیز نہیں بن سکتی۔

جس نئی کامیابی نے لوگوں کے قلوب واذہان کو مسحور کیا وہ طبعی تحقیق کے میدان میں علمی ترقی تھی۔ لیکن وہ تمام تر کامیابی کے باوجود یورپی معاشرے کو لاحق امراض اور مسائل کو حل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ معاشرتی اقدار کا ایسا خوف ناک انحطاط اور تنزل واقع ہوا کہ فلاسفہ کلیسا کی مضمحل اقدار کا متبادل لانے سے عاجز آ گئے۔

بہت سارے فکری راہنماؤں نے سوال اٹھایا کہ جب انسانی عقل کلیسا کی مذموم روشنی سے آزاد ہو چکی ہے اور فطرت کے میدانوں میں کامیابیاں حاصل کر رہی ہے تو وہ کوئی ایسا دین کیوں نہیں ایجاد کر سکتی جو جدید وضعی علم کے متوازی ہو اور کلیسا کی مابعد الطبیعاتی جگہ پر اتر سکے؟

اِس سوال کا عملی جواب فرانس کے نامور مفکر آگسٹ کامتے نے دیا جو فکر و زندگی میں وضعی مکتبہ فکر (Positivism) کا قائل تھا۔ وہ ایک تند و تیز لہر تھی جس نے کلیسا کی سرکشی اور حماقتوں کا سامنا کیا۔

کامت اپنے وضعی فلسفے میں یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس نے انسانی ترقی کے لیے ایک بنیادی قانون دریافت کر لیا ہے۔ اور وہ قانون تین مراحل پر مشتمل ہے:

۱۔ خرافات کا مرحلہ ۲۔ دین کا مرحلہ ۳۔ وضعی علم کا مرحلہ (۴۲۷)

کامتے کا خیال ہے کہ اگر ہم دوسرے مرحلے کی غلطیوں سے بچنا چاہتے ہیں اور علمیت والے تیسرے مرحلے میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو ہم پر لازم ہے کہ ہم غیب کی باتوں اور اوہام سے الگ تھلگ ہو جائیں اور اپنی ساری توجہ عملی نفع بخش امور پر لگائیں۔ یہ وضعی مکتبہ فکر کی بنیاد ہے۔

کامت کے نزدیک فکر کا عملی ہونا اس لیے ضروری ہے کیونکہ معاشرتی مفکرین دینی پیشواؤں کے مقام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم دینی پیشواؤں کے بجائے فقط واقعاتی زندگی اور عقل پر اعتماد کریں۔

اُس کی نظر میں اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ انسانی وضعی عنصر کو اُن تمام ضعیف اور سلبی عناصر سے پاک کیا جائے جو ہمیں رواجی ادیان سے لاحق ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اس وضعی عنصر کو ایک مستقل اصول بنایا جائے تا کہ وضعی مکتبہ فکر پایہ تکمیل تک پہنچ سکے اور وضعی دین وجود پذیر ہو سکے۔

وضعی دین واقعیت اور افادیت پر قائم ہوتا ہے۔

کامت کا خیال یہ تھا کہ تمام ادیان کا خلاصہ دو عقیدوں پر مشتمل ہے یعنی اللہ اور ہمیشہ کی زندگی۔ وضعی دین اِن دونوں عقیدوں کے اندر سے اپنا مخصوص مضمون چنتا ہے چنانچہ وہ 'الوہیت' کی فکر سے یہ بات اخذ کرتا ہے کہ اس سے مراد ہر وہ فکر ہے جو موجود ہو، کلی ہو، عظیم ہو اور ازلی ہو، انسانوں کے نفوس اس کے ساتھ متصل ہو سکیں اور اُس کے ذریعے سے اپنی انسانی انانیت اور تنافر کا قلع قمع کر سکیں۔۔۔ اسی طرح ہمیشہ کی زندگی سے اخذ ہونے والا وضعی مضمون اہل حق اور اہل عدل کے ساتھ شریک ہونا ہے۔۔۔ یعنی الٰہی وجود کے ساتھ معیت والی ہمیشہ کی زندگی۔ ان دونوں مضمونوں سے کامت نے ایک جامع اور ہمہ گیر فکر یعنی 'انسانیت' کو اخذ کیا۔ چنانچہ اس کے نزدیک 'انسانیت' ایسی وضعی فکر ہے جو اللہ اور ہمیشہ کی زندگی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اللہ اور ہمیشہ کی زندگی کی فکر انسانوں کے لیے دوسرے مرحلے کی فکر تھی۔ کامتے یہ خیال کرتا ہے کہ جب انسانیت کو اس انداز سے سمجھا جائے تو پھر یہ بذات خود الٰہ کا درجہ اختیار کر لیتی ہے جس کو لوگ پکارتے ہیں یعنی ایسی عظیم برحق ازلی ذات جس کے ساتھ براہ راست تعلق رکھا جائے اور اس سے وجود، حرکت اور زندگی کے تمام مسائل حل کیے جائیں۔

اس طرح کامتے اپنے مقصد تک پہنچ گیا یعنی غیبی عقائد کو لغو کرنا اور دین سے متصل اجتماعی اخلاق و نظم کو رد کرنا اور اُن کو غیر عملی اور غیر نافع اوہام و افکار قرار دینا۔ وہ ادیان کو انسانی ارتقا کے مراحل میں سے ادنیٰ درجے کا مرحلہ قرار دیتا ہے۔

جدید علمی اسلوب یہ قرار پایا کہ لوگ وضعی دین کو اختیار کریں اور غیر مشخص الٰہ کی عبادت کریں جو 'انسانیت' کے نام سے پکارا گیا۔ اُن پر لازم ہے کہ وہ اپنی اعلیٰ اقدار، اخلاق اور انتظامی قوانین اسی واحد ذخیرے سے تلاش کریں۔ اسی ذخیرے سے وہ اخلاقی قوتیں حاصل ہوں گی جو کئی نسلوں پر محیط ہو سکیں گی اور دلوں کو عظیم افکار اور بہترین احساسات مہیا کر سکیں گی۔ انسانیت وہ عظیم چیز ہے جس کے ذریعے ہم اپنے انفرادی وجود سے بلند ہوتے ہیں۔ اسی انسانیت سے ہماری باہمی ہمدردی کو وہ زبردست قوت نصیب ہوتی ہے جس سے انسانیت کا میلان بلند ہوتا ہے اور دیگر میلانات کمزور ہوتے ہیں۔ انسانیت کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے سے بھائی چارہ قائم کرتے ہیں اور اس چیز پر قادر ہوتے ہیں کہ ہمیشہ کی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں جس کا اُن کو ہمیشہ اشتیاق ہوتا ہے (۴۲۸)

یہ وضعی مکتبہ فکر کی بنیادیں ہیں جن کے ذریعے کامتے نے دین کی تعلیمات اور عقیدے و سلوک کو چیلنج

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا۔ کامتے کا خیال تھا وہ زندگی کا ایک مستقل منہج ایجاد کر سکتا ہے جو مسیحیت کا نعم البدل ہو۔ غرور پر مبنی یہ وہ حماقت تھی جس سے 'سماجیات' کا لادین علم پیدا ہوا اور جس کو بعض مفکرین علم قرار دینے سے ہچکچاتے ہیں۔ (۴۲۹)

کامتے کی آرا اور فلسفہ اتنا مشہور نہ ہوتا اگر اُس کا یہودی شاگرد دور خائم اُس کے مکتبہ فکر کو پروان نہ چڑھاتا اور اُس کے قواعد اور اصول وضع نہ کرتا۔ دور خائم نے اِس کی عملی مشکلات کو حل کیا اور اس میں دین کے خلاف بغض اور دشمنی کو بھر دیا۔

(ب) دور خائم:

وضعی مکتبہ فکر کی خوش قسمتی تھی اور زیادہ گہرائی سے دیکھیں تو یہودی تلمودی فتنہ پرور لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں تیسرا فکری انقلاب نظریہ ارتقا کی شکل میں ظاہر ہوا۔ لیکن یہ انقلاب یورپ کے اخلاق کے لیے ایک بہت بڑی بدنصیبی تھی۔

زندگی کی ابتدا اور ارتقا کی میکانکی تشریح نے نیوٹن کے آلاتی تصور کائنات کو تقویت دی اور اُن لوگوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیا جو کلیسا سے انتقام لینے کے درپے تھے تاکہ وہ اپنی ذاتی کوششوں کے نتائج کو کائنات کے آلاتی نظریے کے مطابق ظاہر کر سکیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ علوم انسانی میں ڈارونزم کا اثر فزکس و بیالوجی سے کم تر نہیں۔ خاص طور پر یہ دو پہلو کہ انسان حیوان ہے اور اس کے وجود کی کوئی غرض و غایت نہیں نیز وہ ارتقائے مطلق کا نتیجہ ہے۔ مغرب میں کوئی ایسا معاشرتی مصنف نہیں جس کے اندر یہ دونوں پہلو واضح طور پر موجود نہ ہوں۔

عملی صورت حال یہ بنی کہ 'سماجیات' بے شمار رکاوٹوں اور سخت تنقیدوں کا نشانہ بنا اور وہ نظریہ ارتقا کے بغیر اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکا۔ نظریہ ارتقا نے اُس کو وجود بخشا لیکن نظریہ ارتقا کو جس حیرت انگیز طریقے سے پھیلایا گیا اُس پر بذات خود بے شمار سوال اٹھے ہیں!

دور خائم بذات خود اِن مشکلات کو بیان کرتا ہے اور امید کرتا ہے کہ معاشرے کا یہ علم کامیاب ہوگا جیسے دیگر طبعی نظریات کامیاب ہوئے:

کوئی علم ایسا نہیں جس نے انسانی جذبات کی طرف سے رکاوٹوں کا مقابلہ نہ کیا ہو۔ یہ انسانی جذبات فطرت کے ظواہر سے تعلق رکھتے ہیں۔ 'سماجیات' کو بھی اپنے موجودہ دور تک شدید رکاوٹوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ قدیم دور میں فطرت کے ظواہر کی تشریح، دین اور اخلاق کی علامات کے ساتھ کی جاتی تھی۔ طبعی مکتبہ فکر دین کے متبادل کے طور پر ظاہر ہوا۔ جیسے دیگر علوم ایک ایک کر کے اس مکتبہ فکر سے آزاد ہوئے اسی طرح امید ہے کہ 'سماجیات' بھی اس مکتبہ فکر سے آزاد ہو جائے گا پھر ماہرین کے سامنے راستہ بالکل واضح ہو جائے گا (۴۳۰)

دور خائم اپنی توقعات کی وجوہات بیان کرتا ہے جن کے مطابق وہ سمجھتا ہے کہ 'سماجیات' کو دین سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الگ ہو جانا چاہیے۔اُن میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اجتماعی ومعاشرتی میدان کو کائنات کے دیگر میدانوں کی طرح سمجھتا ہے البتہ اِس میں پیچیدگی زیادہ ہے اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ فطرت کے عناصر میں اصول کا اپنی فرع سے اختلاف محال ہے(۴۳۱)

اس کا مطلب یہ تھا کہ انسانی دائرہ کار میں ہم ذاتی طور پر وہ قوانین دریافت کر سکتے ہیں جو نیوٹن نے فطرت کے اندر دریافت کیے اور ڈارون نے کائنات کی متغیر آلاتی حرکت کے متعلق دریافت کیے۔

دور خائم اپنے مکتبہ فکر کی نوعیت کو واضح طور پر متعین کرتا ہے تا کہ اسکے نظریات دیگر نظریات سے خلط ملط نہ ہوں، وہ کہتا ہے: ہم فقط اس بات پر راضی ہیں کہ ہم عقل پرست ہیں، نہ مادہ پرست اور نہ روح پرست، کیونکہ ہمارا اصل ہدف جس کا ہم عملی میدان میں قصد کرتے ہیں وہ خالص عقلی دائرہ کار ہے۔ہم انسانی رویوں کو تاریخی اعتبار سے بعض اسباب وعلل کے ساتھ جوڑتے ہیں۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان اسباب وعلل کے ساتھ کچھ دیگر قوانین بھی دریافت کرلیں جن کو مستقبل میں عملی طور پر لاگو کرنا ممکن ہو سکے گا۔ ہمارے مکتبہ فکر کو بعض لوگوں نے وضعی مکتبہ فکر کا نام دیا ہے ہمارے خیال میں یہ عقلی مکتبہ فکر کی ایک شاخ ہے۔

اگر ہم دور کائم کے نظریے کو اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کریں تو اس کا مرکز ومحور تین بنیادی اصول ہیں:

① کسی بھی گروہ کی عقل، افراد کے شعور سے الگ تھلگ ہوتی ہے جو بے سوچے سمجھے کام کرتی ہے۔

② یہ گروہی عقل، اجتماعی مظاہر کی شکل میں اپنے احکامات صادر کرتی ہے جو غیر منطقی طریقے سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

③ یہ مظاہر افراد پر مسلّط ہوتے ہیں اور اُن کو اپنے سامنے بے بس کر لیتے ہیں اگر چہ انہیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اجتماعی مظاہر کو موضوعی اشیا شمار کیا جاتا ہے جن کی اپنی مستقل خارجی حقیقت ہوتی ہے۔دور خائم کہتا ہے کہ ہمارا طریقہ موضوعی طریقہ ہے جو مکمل طور پر اس بنیاد پر قائم ہے کہ اجتماعی مظاہر بے جان اجسام کی طرح ہوتے ہیں اور ان کو بے جان اجسام کی طرح ہی نمٹایا جائے گا۔

جب لوگ تسلیم کرلیں کہ یہ منفرد مجموعہ جو معاشرہ کہلاتا ہے بعض جدید مظاہر کو وجود میں لاتا ہے جو اپنی طبیعت میں اُن نفسیاتی مظاہر سے مختلف ہے جو افراد کے ذہنوں میں ہوتے ہیں، تب یہ بات تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ جدید مظاہر افراد کے اندر موجود نہ تھے اور معاشرے نے اُن کو وجود بخشا۔اور اسی بنیاد پر یہ مظاہر افراد کے شعور سے بھی خارج ہو جاتے ہیں جب افراد منتشر ہو جاتے ہیں۔

اجتماعی مظاہر انسانی سلوک ورویے کی ایک ایسی قسم ہے جو افراد پر ایک قسم کا خارجی تسلّط رکھتا ہے، یہ مکمل معاشرے پر پھیلا ہوتا ہے اور یہ افراد کے حالات سے ہٹ کر اپنا خاص وجود رکھتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ظواہر مستقل اور دائمی شکل کے مالک نہیں ہوتے اور نہ ہی اُن کی کوئی مخصوص معین شکل وصورت ہوتی ہے:

جب بھی کوئی اجتماعی ماحول انتہائی پیچیدہ صورت اختیار کرتا ہے اور اس کے ارتقا کی رفتار تیز ہوتی ہے تو روایتی رسوم رواج اور نسل در نسل منتقل ہونے والے عقائد کمزور پڑ جاتے ہیں، وہ غیر معین شکلیں اختیار کرتے ہیں اور بلا تکلف تبدیلی کے عمل سے گذرتے ہیں۔

معاشرتی ظواہر سے متعلق جذبات کا مصدر و ماخذ فقط اللہ یا دین نہیں ہوتا جیسا کہ ہم لوگ تصور کرتے ہیں۔ یہ جذبات جو معاشرتی ظواہر سے تعلق رکھتے ہیں دیگر ظواہر سے مختلف نہیں ہوتے بلکہ یہ سب انسانی تجربات کا نتیجہ ہی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تجربات کیسے ہیں اِن کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔

یہ تجربات انتہائی گہرے اور فساد سے بھرے ہوتے ہیں اور کسی مثالی اعلیٰ فکری کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتے جو اِس حسی دنیا کے وجود میں آنے سے پہلے واقع ہو چکی ہو۔ یہ تجربات اور جذبات مختلف انسانی وارداتوں اور انفعالات کا مجموعہ ہوتے ہیں جو بغیر کسی نظم وضبط کے ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اُن کی کوئی ترتیب، قاعدہ یا صحیح سالم منہج نہیں ہوتا۔ (۴۳۲)

دور خائم کے نظریے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے اخذ کردہ وہمی اصولوں کو دین پر لاگو کرتا ہے اور دینی عقائد واخلاق کو پرکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کی عملی تطبیق کا خلاصہ تین باتوں پر مشتمل ہے۔

① دین کسی الٰہ کا نازل کردہ نہیں ہوتا کیونکہ اُلوہیت کی فکر دور خائم کے نظریے میں کسی مخصوص اجتماعی ماحول کا بیان ہے جو ارتقائی مراحل سے گزر رہا ہو۔ الٰہ کسی بھی معاشرتی ماحول میں ایک خاص درجے کی علامت ہوتا ہے جو وہ اپنے ارتقا کے نتیجے میں حاصل کر چکا ہوتا ہے:

جب ہم کسی فکر کو سمجھنے کا ارادہ کریں جو کسی معاشرے میں رائج ہو یا دنیا بھر میں رائج ہو تو ہمیں اس معاشرے کی طبیعت کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ یہ مطالعہ معاشرے کا ہوگا نہ کہ افراد کا، کیونکہ جن علامات اور رموز کو معاشرہ اختیار کرتا ہے اُن کی بنیاد پر معاشرے کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ رموز وعلامات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب معاشرہ اپنے آپ کو کسی قدیم افسانوی حیوان کی نسل سے سمجھتا ہے اور اُس حیوان کو اپنے لیے شعار بنالیتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن خاص مجموعوں میں سے ایک ہے جن پر ہمارے ہاں خاندان کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اور جب وہ اُس خاص افسانوی حیوان کی جگہ کوئی افسانوی انسانی جدّ امجد کو اختیار کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب خاندان کا طریقہ بدل گیا۔ اور جب کوئی معاشرہ کچھ خاص معبودوں کو اختیار کرتا ہے جو مقامی معبودوں اور خاندانی معبودوں سے ہٹ کر ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ معبود دیگر تمام معبودوں پر غالب آجائے گا تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے نے مرتکز ہونا شروع کر دیا ہے اور وہ ایک اجماعی وحدت کی شکل اختیار کر رہا ہے۔ کسی معاشرے میں موجود کوئی عبادت خانہ جو ڈھیروں دیوتاؤں کا اجتماعی مندر ہے، اُس معاشرے کے درجہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارتکاز پر دلالت کرتا ہے۔

جب کوئی معاشرہ کسی خاص سلوک یا رویے سے راضی نہیں ہوتا تو اِس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ سلوک یا رویہ معاشرے کے اساسی جذبات کو نقصان پہنچاتا ہے اور یہ اساسی جذبات معاشرے کی طبیعت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ معاشرتی جذبات اپنی طبعی ترکیب اور عقلی تشکیل کی طرف ایسے ہی لوٹتے ہیں جیسے فرد کے جذبات لوٹتے ہیں۔

اس بارے میں جس فرض کو ادا کرنا ہمارے ذمہ واجب ہے، یہ ہے کہ ہم تلاش کریں، اجتماعی تصورات ایک دوسرے کو کیسے تقویت دیتے ہیں، کیسے متحد اور متفرق ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس طرح سے ہوسکتا ہے کہ ہم قدیم دیومالائی ادیان کے قصوں اور عوامی رسوم ورواج کا باہمی موازنہ کریں۔

② سابقہ تشریح کے مطابق **دین ایک اجتماعی مظاہرہ ہے جس کو اجتماعی عقل بعض خاص حالات اور مراحل میں افراد پر اپنی قوت قاہرہ کے ساتھ لاگو کرتی ہے۔** افراد کا اپنا ذاتی کوئی اختیار نہیں ہوتا کیونکہ اگر مخصوص حالات میں اُن پر دین اختیار کرنے کا جبر نہ ہو تو وہ کبھی بھی دین اختیار نہ کریں:

جب میں ایک بھائی، خاوند یا عام شہری کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرتا ہوں، اپنے معاہدے پورے کرتا ہوں یا معاشرتی رواج اور قانون کے مطابق اپنے واجبات ادا کرتا ہوں تو اگرچہ یہ واجبات میرے ذاتی جذبات کے ساتھ متعارض نہیں ہوتے اور میں اِن کی حقیقت کا شعور رکھتا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ میرے شعور سے خارج ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے دین کو اپنے آپ پر خود لاگو نہیں کیا بلکہ مجھے تربیت کے طریقے سے اس کا عادی بنایا گیا۔ یہی صورت حال دین کے دیگر عقائد اور رسوم ورواج کی ہے۔ مومن اُن کو اپنی ولادت کے دن سے تشکیل شدہ محسوس کرتا ہے حالانکہ یہ عقائد فرد کے وجود سے مقدم ہوتے ہیں اور ان کی خاص وجہ ہوتی ہے جو درج ذیل ہے:

دین اور عقائد کا وجود فرد کی بہ نسبت خارجی ہوتا ہے۔ اور اس قسم کے دینی سلوک وافکار افراد کے شعور سے محض خارج ہی نہیں ہوتے بلکہ اُن کے پاس ایک زبردست حاکمانہ قوت ہوتی ہے جس کے تحت وہ اپنے آپ کو فرد پر مسلط کر دیتے ہیں چاہے اُس کی اپنی خواہش ہو یا نہ ہو۔ (۴۳۴)

③ **دور کا ئم اس خطرناک نتیجے تک پہنچا کہ دین اور اس کی طرح خاندان اور اخلاق فطری نہیں ہوتے۔** اُس کی اِس رائے کو بعد والے معاشرتی محققین نے بھی اختیار کیا اور اپنی تحقیقات کے اندر اس کو پھیلا دیا۔ ماہرین اس نظریے کے قائل ہونے سے پہلے یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ دور خائم کے ہاں کتنا تخریبی اور تلمودی جذبہ موجزن تھا:

بالعموم لوگ خاندانی نظام کی بنیادی تشریح یہ کرتے ہیں کہ خاندانی نظام کی بنیاد میں وہ انسانی جذبات ہیں جو باپ اپنے اولاد کے لیے دل میں محسوس کرتا ہے اور اولاد اپنے والد کے لیے۔ اسی طرح شادی کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک اور اُن کی اولاد کچھ خاص جذبات کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اخلاقی ظواہر میں سب کچھ ایسے ہی ہوتا ہے۔ اخلاق پسند مفکرین فرد کے واجبات کو اُس کے لیے اخلاق کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ یہی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صورت حال دین کی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ دین اُن جذبات سے پیدا ہوتا ہے جو کائنات کی بڑی بڑی قوتوں کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں یا کچھ منفرد اور غیر معمولی انسانوں کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں۔۔۔الخ۔ اِن باتوں کو اجتماعی ظواہر کی تشریح پر لاگو نہیں کیا جا سکتا وگرنہ ہم معاشرے کی طبیعت کو بگاڑ بیٹھیں گے (۴۳۵)

اسی طرح بعض مفکرین انسان کے فطری دینی جذبے کے قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جنسی غیرت، والدین سے حسن سلوک، بیٹوں سے محبت وغیرہ دین کی طرح فطری جذبات کے حامل ہیں۔ بعض لوگوں نے اسی بنیاد پر دین، شادی، خاندان وغیرہ کی تشریح کی ہے۔ لیکن تاریخ (۴۳۶) بتلاتی ہے کہ یہ انسانی میلانات فطری نہیں بلکہ بعض معاشرتی حالات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتے۔ اسی لیے درست بات یہ ہے کہ یہ مثالی جذبات اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہیں، اُس کی بنیاد نہیں۔ بلکہ میں اس پر ایک بات کا اضافہ کروں گا کہ ابھی تک کوئی ایسی دلیل قائم نہیں ہو سکی کہ معاشرتی میلان ایک فطری اور وراثتی جذبہ ہے جو تمام نسل انسانی کے لیے ابتدا سے موجود ہے۔ زیادہ فطری یہی ہے کہ معاشرتی میلان کو اِس نظر سے دیکھا جائے کہ یہ اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہے جو نسل در نسل ہمارے دلوں میں گھل مل چکا ہے (۴۳۷)

یہ دور خائم اور اُس کے تلمودی دعوی جات ہیں جو تحقیق اور علم کے غلاف میں لپٹے ہوئے ہیں۔ افسوس ناک بات یہ کہ اس کا مکتب فکر مغربی معاشرتی مکاتب فکر میں سے سب سے بڑا ہے اور کلاسیکل ہونے کی وجہ سے جدید مطالعہ جات پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے (۴۳۸)

④ اخلاق اور معاشرے کے بارے میں کیمونزم کا نظریہ:

ہم پچھلے ابواب میں کیمونسٹ نظریے پر مکمل گفتگو کر چکے ہیں نیز اُس کا دین کے بارے میں موقف اور تاریخ کی مادی تفسیر کا بیان بھی گزر چکا ہے۔ ہم نے وہاں پر اخلاق کے متعلق بھی کچھ اشارات بیان کیے تھے کیونکہ کیمونزم کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہر چیز کی بنیاد اور غرض و غایت اقتصاد کو بناتا ہے۔

یہ بتلانا بھی ضروری تھا کہ کیمونسٹ نظریہ معاشرے اور اخلاق کے بارے میں مستقل طور پر کیا اندازِ فکر رکھتا ہے اگرچہ اس کا عملی چہرہ فقط اقتصادی ہے:

کیمونزم اپنے ہدف کے اعتبار سے سابقہ مذکور نظریات سے مختلف نہیں۔ چنانچہ مارکس بھی اقوام کے اخلاق و عقائد تباہ کرنے میں پیچھے نہیں۔ مارکس اور دور خائم یہودیت میں بھائی بھائی ہیں اور اس تلمودی تصور میں بھی شریک ہیں کہ اُمّی اقوام کا اخلاق اور عقائد تباہ کر دینے چاہیے۔ لیکن اس کے عملی طریقہ کار میں وہ مختلف ہیں۔ یہود منصوبہ بندی کرتے ہیں تاکہ وہ کسی بھی وسیلے اور طریقے سے اپنی غرض تک پہنچ سکیں چنانچہ وہ اُمّی اقوام کے لیے مختلف طریقے وضع کرتے ہیں اور ان کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ ان میں سے جس راستے پر چلنا چاہیں چل سکتے ہیں لیکن وہ سارے راستے حقیقت میں ایک چھت کی مختلف کڑیاں ہیں جن کا ہدف ایک ہے کہ دین اور اخلاق کو تباہ کیا جائے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس طرح دور خائم معاشرے کی اجتماعی عقل کو الل ٹپ اور بے سوچے سمجھے قرار دیتا ہے اسی طرح مارکس اندھی تاریخ کا حتمی ہونا لازم قرار دیتا ہے۔ دور کائم معاشرے کی جبریت اور قوت قاہرہ کا قائل ہے اسی طرح مارکس اقتصاد کی جبریت اور قوت قاہرہ کا قائل ہے۔ وہ دونوں اِس بات پر متفق ہیں کہ اخلاق اور معاشرہ ارتقا پذیر رہتا ہے اور اُن میں کوئی چیز مطلق و مستقل نہیں۔ اسی طرح وہ اس نظریے میں بھی متفق ہیں کہ انسان حیوان ہے، معاشرتی حیوان یا اقتصادی حیوان۔ اُن کا یہ اتفاق عجیب نہیں کیونکہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ ڈارونزم کو بہت بُری طرح سے پھیلایا گیا۔

کیمونسٹ کہتے ہیں کہ دین عوام کے لیے افیون کا کام کرتا ہے اور یہ انسانی اشیا کا انسانی دماغ میں خیالی عکس ہے۔ دین سلبی اقتصادی بنیاد سے پھوٹتا ہے اور الٰہ سے مراد اُن فطری اور کائناتی قوتوں کی نشان دہی ہے جو انسان کی خوراک پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار وہم و خیال پر مبنی بے ہودہ باتیں ہیں جو دین سے سخت دشمنی اور کینے پر مشتمل ہیں۔

ان نظریات کی موجودگی میں کیمونزم کا اخلاق اور معاشرے کے بارے میں کیا تصور ہو سکتا ہے؟

بوخارین اپنی کتاب ''تاریخ کا مادی نظریہ'' میں بیان کرتا ہے: اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اجتماعی شعور کو ایک غیبی حقیقت بنانے سے پرہیز کرنا چاہیے لیکن اِس کے باوجود یہ تعبیر ہمیں دو ایسے مظاہر کی طرف راہنمائی کرتی ہے جس کو ملحوظ رکھنا ہر جگہ پر اور ہر وقت ضروری ہے:

① ہر دور میں ایسے غالب رجحانات ہوتے ہیں جو افکار، جذبات اور نفسیاتی حالات پر بڑا زور رکھتے ہیں یہ غالب سائیکالوجی ہوتی ہے جو معاشرتی زندگی کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔

② یہ غالب سائیکالوجی زمانے کے مزاج کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ہم اپنی زبان میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سائیکالوجی معاشرے کے ارتقائی حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ مؤلف وضاحت کرتا ہے کہ عملی زندگی میں کچھ عام نفسیاتی خصوصیات ہوتی ہیں جو معاشرے کے تمام طبقات پر حاوی ہوتی ہیں۔

اس طریقے کے مطابق ہم جاگیردارانہ نظام میں کچھ مشترک نفسیاتی علامات دیکھتے ہیں جو معزز سردار اور کسان کے مابین مشترک ہوتی ہیں مثلاً: قدیم اشیا سے تعلق، روٹین، رسوم و رواج، صاحب اقتدار کے سامنے عاجزی، اللہ تعالیٰ کا خوف، فکری جمود، ہر نئی چیز سے گھبرانا۔۔۔ الخ۔ یہ ساری باتیں معاشرے میں جمود کی علامات ہیں۔ جیسے کسان پدری نظام کے تحت گھر اور خاندان کا سردار اور باپ ہوتا ہے اسی طرح جاگیردار اپنی جائیداد میں سردار اور باپ ہوتا ہے۔ (۴۳۹)

یہ مارکس کے نظریے کی عملی تطبیق ہے کہ لوگوں کا وجود بذات خود اُن کے احساسات کو متعین کرتا ہے اور اِس کے الٹ نہیں ہوتا۔ چنانچہ جاگیردار معاشرہ زرعی ماحول کا حامل ہوتا ہے اور وہ دین دار ہوتا ہے جس کی اپنی روایات ہوتی ہیں اور اُس میں خاندانی نظام اور عزت کی حفاظت کو ایک بنیادی اخلاق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرہ ارتقا پذیر ہوتا ہے اور صنعتی بن جاتا ہے تو عورت اقتصادی طور پر آزاد ہو جاتی ہے جس سے لازمی طور پر ایک حتمی تبدیلی پیدا ہوتی ہے جو حتمی اقتصادی تبدیلی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی معاشرہ زراعتی، رجعت پسند رسوم رواج، اخلاق اور دین کی کسی چیز کی حفاظت نہیں کرتا بلکہ وہ نیا دین اختیار کرتا ہے چاہے وہ الحاد کیوں نہ ہو، وہ نیا اخلاق اختیار کرتا ہے چاہے وہ **موقع پرستی یا میکیاولیت** کیوں نہ ہو، اور نئے رسوم رواج اختیار کرتا ہے چاہے وہ دیوثیت اور مرد و زن کا اختلاط کیوں نہ ہو۔

چونکہ اخلاق بنیادی طور پر اقتصادی حالات کا نتیجہ ہوتے ہیں اسی لیے کیمونزم کا خیال ہے کہ ہر مرحلے کے لیے مخصوص اخلاق ہوتے ہیں، اسی طرح ہر ماحول کے اپنے اخلاق ہوتے ہیں بلکہ ہر گروہ اور طبقے کے اپنے مخصوص اخلاق ہوتے ہیں اور بنی نوع انسان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔

لوگ کس اخلاق کی بات کرتے ہیں؟ کیونکہ اخلاق تو پرانے دور میں جاگیردارانہ مسیحی اور ایمانی ہوتے تھے۔ پھر وہ دو بنیادی اقسام میں تقسیم ہوئے یعنی کیتھولک اخلاق اور پروٹسٹنٹ اخلاق ان کی مزید تقسیم در تقسیم ممکن ہے مثلاً یسوعی اخلاق، آرتھوڈکس اخلاق۔ اسی طرح اخلاق جدید دور میں بورژوائی ہو گئے پھر اس کے بعد مستقبل میں اخلاق پرولتاری ہونے کا امکان ہے۔

اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے کہ صحیح اخلاق کون سا ہے جبکہ ان میں سے کوئی بھی مطلق اور منتہی نہیں؟ کیمونزم اِس کا جواب اس طرح سے دیتا ہے؟ وہ اخلاق جو تمام عناصر کو مکمل طور پر گھیر لے اور بقا کا ضامن ہو، جو حاضر میں انقلاب پیدا کرے اور مستقبل کو تشکیل دے وہ حقیقت میں فقط **پرولتاری اخلاق** ہے۔ چونکہ کیمونزم اپنے مقصود ہدف تک پہنچنا چاہتا ہے اسی لیے وہ اپنے دعوے پر دعوے کے ساتھ استدلال کرتا ہے:

ہم جدید معاشرے میں تین طبقے دیکھتے ہیں: جاگیردار، ارسٹوکریسی (اشرافیہ)، بورژوائی اور پرولتاری۔ اِن سب کے اپنے اپنے مخصوص اخلاق ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ لوگ شعوری حالت میں یا لاشعوری طور پر اپنے اخلاقی مفاہیم اُن عملی تعلقات سے نکالتے ہیں جن پر مخصوص اقتصادی طبقاتی حالات قائم ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر پیداوار حاصل کی جاتی ہے اور اقتصادی تبادلے کیے جاتے ہیں۔

پھر کیمونسٹ فلسفہ اِس کی مثال بیان کرتا ہے: جب سے منقول اشیا کی خاص ملکیت پروان چڑھی ہے تو وہ تمام معاشرے جن میں خاص ملکیت رائج ہے، کی مشترکہ معاشرتی اخلاقی وصیت یہ ہوتی ہے کہ چوری نہ کرو۔ کیا یہ وصیت ابدی اور ہمیشہ کی اخلاقی وصیت بننے کے قابل ہے؟

ہرگز نہیں، کبھی نہیں۔ وہ معاشرے جہاں چوری کے محرکات ختم کر دیے گئے وہاں چوری کا ارتکاب پاگلوں کے سوا ممکن نہیں۔ لوگ اس اخلاقی واعظ پر کتنا ہنسیں گے جو لوگوں کے سامنے اس ابدی حقیقت کا اعلان کرے کہ چوری نہ کرو!

اسی لیے ہم ہر اُس امید کو رد کرتے ہیں جو ہم پر کوئی بھی عقیدہ یا اخلاق، مستقل ابدی اصول کے طور پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لاگو کرے جس کو کبھی ہلایا نہ جا سکے اور یہ دعویٰ کیا جائے کہ عالم اخلاق کے اندر کچھ ایسے دائمی اصول ہوتے ہیں جو تاریخ اور اقوام سے بالاتر ہوتے ہیں (۴۴۰)

اس اعتبار سے کیمونزم نے میکیاولی مذہب کو نظریہ و عمل دونوں اعتبار سے قبول کر لیا جیسا کہ سیاست کے باب میں گزر چکا ہے۔ اکناز یوسیلونی اس کی زبردست مثال پیش کرتا ہے: سیلونی کیمونسٹ پارٹی کا معروف رکن تھا جو بین الممالک کیمونسٹ جلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ وہ ہمیں بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ وہ ایک اجتماع میں شریک تھا۔ ایک قرارداد کے خلاف کچھ باتیں شروع ہو گئیں جس کو مرکزی کمیٹی نے صادر کیا تھا۔ بعض ممبران نے قرارداد کے مخالف نقطہ نظر کو پیش کیا اور وہ معقول تھا لیکن روسی مندوب اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا: تمام ارکان پر لازم ہے کہ وہ قرارداد کی فرمانبرداری کا اعلان کریں جیسا کہ وہ صادر ہو چکی ہے البتہ وہ عملی طور پر اُس کے الٹ اپنا کام کر سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں انگریزی مندوب قطع کلامی کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے کہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ سیلونی کہتا ہے کہ اس اعتراض پر ایک زوردار اور کھلے دل سے قہقہہ لگایا گیا، میں نہیں سمجھتا کہ اس سے پہلے کیمونسٹوں کے قومی دفاتر کے اندر کبھی ایسا قہقہہ لگا ہوگا۔ یہ نقطہ بڑی تیزی سے ماسکو کے طول عرض میں پھیل گیا اور انگریز مندوب کا جواب فوراً سٹالن اور روس کے بڑے اہل کاروں کی طرف فون کے ذریعے منتقل کیا گیا اور اس طرح ہر جگہ پر ہنسی اور خوش طبعی کا ماحول بن گیا۔ (۴۴۱)

کیمونسٹ اخلاق کی مزید صورت حال کسی دوسری جگہ بیان کی جائے گی، اگر کیمونزم میں اخلاق نام کی کوئی چیز ہے۔

⑤ نظریہ عضویت اور افادیت:

معاشرے کے متعلق بڑے بڑے نظریات میں سے ایک **نظریہ عضویت** (Organism) ہے جس کا سب سے بڑا نمائندہ ہربرٹ سپنسر ہے۔ (۴۴۲)۔ اسی طرح اخلاقی نظریات میں سے ایک **نظریہ افادیت** (Utilitarianism) ہے جس کا جھنڈا **ہابتھم**، **آدم سمتھ** اور **جون اسٹورٹ مل** نے اٹھایا اور موجودہ صدی میں اس کی نمائندگی برٹرینڈ رسل کر رہا ہے۔

ہمارے لیے مناسب ہے کہ ہم ان دونوں نظریات پر مشترکہ نظر ڈالیں کیونکہ یہ دونوں ایک ہی رجحان پر مشتمل ہیں۔ یہ دونوں انگلینڈ کے ماحول میں پیدا ہوئے اور دین و اخلاق کے متعلق یکساں نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ یہ دونوں نظریات انسان اور معاشرے کے تصور کو نظریہ ارتقا سے اخذ کرتے ہیں، خاص طور پر عضویت کا نظریہ اپنے لفظ سے ہی اپنا ماخذ بتلا رہا ہے۔

ہربرٹ سپنسر کا خیال ہے کہ تمام ادیان قانون ارتقا کے اُسی طرح پیروکار ہیں جیسے دیگر معاشرتی مظاہر۔ وہ دین کے ارتقا کے متعلق ایک خاص تشریح کرتا ہے جو بوترو کی زبانی اس طرح سے ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادیان کا نقطۂ آغاز تاریخی ترتیب کے مطابق ایک ہی اوّلین واقعہ تھا جس کی متعدد اور مختلف صورتیں پیدا ہوگئیں۔ سپنسر کہتا ہے ادیان کی کہانی انسان کے ہم زاد کی کہانی سے شروع ہوتی ہے۔ انسان پانی کے اندر اپنی تصویر یا ہم زاد دیکھتا ہے اسی طرح وہ خواب کے اندر اپنے آپ کو اور دیگر لوگوں کو دیکھتا ہے۔ انسان کے اندر ایک طبعی میلان ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتا تھا کہ انسان کا ہم زاد ختم نہیں ہوسکتا وہ سمجھتا تھا کہ ہم زاد مستقبل کے اندر دوبارہ ظاہر ہوگا اور جب موت کا وقت قریب آتا تو اس پر یہ عقیدہ رکھنا آسان ہو جاتا کہ انسان کی پوشیدہ انا ہمیشہ باقی رہتی ہے اور وہ کم وبیش اُس انسانی نفس کے مشابہ ہوتی ہے جس کی وہ انا ہوتی ہے۔ اِس طرح سے روحوں اور انسانی زندگی پر اثر انداز دیگر اجرام کا عقیدہ پیدا ہوا۔ یہ ادیان کی تاریخی حقیقت ہے جو ہربرٹ سپنسر نے پیش کی اور وہ اس معاملے میں ایپیقوریت کے ساتھ متفق ہے۔ اس طرح ایک عقیدے سے کئی عقائد، رسوم ورواج اور مذہبی پیشوائیت کے نظام پیدا ہوئے۔

ہر واقعاتی چیز کا ایک ہم زاد ہوتا ہے جس کو روح کے نام سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ دنیا روحوں سے بھری ہوئی ہے اور یہ سب روحیں بڑی روحوں کے ماتحت ہوتی ہیں جن کو الٰہ کہا جاتا ہے اور یہ سب الٰہ ایک بڑے الٰہ کے ماتحت ہوتے ہیں۔ انسان نے کوشش کی کہ وہ فطرت کی طاقتور قوتوں کے مجسمے بنائے تاکہ وہ اُن کو قریب دیکھ سکے اور اپنا محبوب بنا سکے۔ اس قسم کی کوشش سے قانون ارتقا کے مطابق، دینی خرافات یا میتھالوجی، دم درود، عبادات اور مختلف مذہبی نظاموں کی تشکیل ہوئی۔

یہ سب مذاہب اور ادیان عقائد کے ارتقا کی وجہ سے اپنا اعتماد کھو بیٹھے اور انھوں نے اپنا پہلا ہدف ضائع کر دیا تو اُن کی حیثیت ایک معاشرتی رابطہ وتعلق کے طور پر قائم ہوئی۔ معاشرتی رابطے کی حیثیت اتنی مستحکم تھی کہ ارتقا کے تصور نے بھی اسے تسلیم کیا۔ چنانچہ اب تک کے تمام ادیان فقط اسی لیے احترام کے مستحق رہے کہ ان کے اندر اِنسانیت کی مصلحت ہے اور یہ معاشروں کو ایک تسلسل میں قائم رکھتے ہیں۔ (۴۴۳)

اس طرح سے سپنسر نے اپنے خیالات پر محنت کی تاکہ وہ دین کے وہمی اُصولوں اور بعید جڑوں کو گھڑ سکے۔ اسی طرح سے کانٹ، دورخائم اور مارکس نے کیا تھا اور وہ سب اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ادیان فقط ایک ایسا رابطہ ہیں جو معاشرے کی مصلحت کے لیے مفید ہیں۔ اسی نتیجے پر افادیت پسند اخلاقی مکتبہ فکر کی بنیاد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نتیجے نے اس مکتبہ فکر کو نئی طاقت فراہم کی ہے۔ ہم بطور مثال برٹرینڈ رسل کو لیتے ہیں جو فقط بنتھم کی افادیت بیان ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کی عملی صورت حال کا بھی ذکر کرتا ہے جو مغربی زندگی پر غالب ہے۔ رسل کہتا ہے: جدید علم کو مذہب سے الگ کرنا آسان ہے لیکن اخلاق کو مذہب سے الگ کرنا بہت زیادہ دشوار ثابت ہوا۔ بے شمار روایتی اخلاقی تصورات کی تشریح بلکہ وجہ جواز ممکن ہی نہ رہتی جب تک کہ کوئی نہ کوئی الٰہ یا عالمی روح کا وجود تسلیم نہ کرلیا جائے یا کم از کم اخلاق کا کوئی کائناتی اور مضبوط اصل مان نہ لیا جائے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ماضی کے اخلاقی اصولوں کی تشریح اور وجہ جواز دین کے بغیر ممکن نہ تھی لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اگر دین کا تصور نہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا تو یہ اخلاقی اصول اپنی علمی اہمیت اور نفسیاتی طاقت کھو بیٹھتے۔ دین کو مضبوطی سے پکڑنے والے جس دلیل کو سب سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ دین کے بغیر لوگ شریر بن جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کے آزاد برطانوی مفکرین جیسے تھامس سے لیکر ہنری سیدجو بک اس دلیل کا سختی سے انکار کرتے ہیں۔

یہ موضوع کہ اخلاق دین سے الگ ہو کر بھی کسی مناسب اجتماعی اور مستقل صورت کا حامل بن سکتا ہے، ایک الگ بحث ہے جس کو تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ (۴۴۴)۔ رسل نے عملی طور پر اس کو سرانجام دیا چنانچہ وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ دین اخلاق کا مصدر نہیں بن سکتا۔ اس کے نزدیک اخلاق تین مراحل سے گزرتا ہے:

① تابو کا اخلاق (قدیم مذاہب کی وہمی پابندیاں)

② اطاعت الٰہی کا اخلاق۔

③ جدید اخلاق جو افادیت اور عقلیت پر مشتمل ہے۔

رسل اس کی تفصیل میں بیان کرتا ہے:

اخلاقی احساسات اور اعتقادات تمام معروف انسانی معاشروں میں پائے جاتے تھے جن میں اکثر ابتدائی معاشرے تھے۔ ان اعتقادات میں سے بعض کا دفاع عقلی بنیادوں پر ممکن ہے لیکن اس کے باوجود عقائد کی ایک بھاری بھرکم اکثریت ایسی بھی تھی جو خالص خرافات پر مشتمل تھی۔

تابو یعنی قدیم مذاہب کی وہمی پابندیاں، ابتدائی اخلاق کے بنیادی مصادر میں سے ایک ہے۔ بعض خاص اشیاء کا تعلق قبیلے کے رئیس سے ہوتا وہ بعض باتوں کو ممنوع قرار دیتا اور جو اُن کے قریب جاتا تھا وہ موت کا مستحق ٹھہرتا تھا۔ بعض باتیں روح سے متعلق شمار ہوتی تھیں جن کو فقط قبیلے کا ساحر ہی استعمال کرتا تھا۔ بعض کھانے مشروع ہوتے تھے اور بعض کھانے غیر مشروع۔ بعض افراد گندے شمار ہوتے تھے جب تک وہ طہارت حاصل نہ کرلیں اور یہ خاص طور پر اُن لوگوں کے لیے تھا جو قتل اور خون کے معاملات میں ملوث ہوں۔ گندگی کا تصور فقط قتل کے ساتھ ہی منسلک نہیں تھا بلکہ ان عورتوں کے ساتھ بھی لاحق تھا جو ولادت اور حیض والی ہوں (سفر اللاویین: ۱۵، ۱۹، ۲۹۔)۔ وہ صورتیں جن میں نیکی کی بنیاد کسی نہ کسی تابو کا احترام ہے، متمدن معاشروں میں بھی باقی رہے اور اتنی بڑی مقدار میں رہے کہ لوگ اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ مثلاً فیثا غورث سبزیوں کے کھانے کو حرام قرار دیتا تھا۔ امیڈ کلس ایک مخصوص پودے کے پتے چبانے کو گناہ سمجھتا تھا۔ ہندو گائے کا گوشت کھانے کے تصور سے ہی لرزتے تھے اور مسلمان اور یہودی جو اپنے دین کے مضبوط پیروکار ہوتے ہیں، خنزیر کو ناپاک سمجھتے ہیں۔۔۔۔ ۱۹۱۶ء میں سکاٹ لینڈ کے ایک دینی پیشوا نے ایک اخبار کو خط لکھا جس میں اُس نے جرمنی کے خلاف جنگی ناکامی کی وجہ یہ بیان کی ان کی حکومت نے اتوار کے دن ٹماٹر کی کاشت کاری کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان تمام آرا کو فقط تابو کے طریقے سے ہی سمجھایا جاسکتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ قوانین جو ایک ہی خاندان کے افراد کے مابین شادی کی مختلف صورتوں کو حرام قرار دیتے ہیں، مابو (Taboo) کی بہترین مثالیں ہیں مثلاً کوئی قبیلہ کسی خاص گروہ پر یا کسی خاص فرد پر حرام قرار دیتا کہ وہ اپنی بیوی کسی دوسرے گروہ سے حاصل کرے۔ انگلینڈ کے اندر ماضی قریب میں کوئی شخص اپنی مرحوم بیوی کی بہن سے شادی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

اس قسم کی وہمی پابندیوں کی تشریح اس طریقے سے ممکن نہیں کہ ان کے اندر کوئی نقصان ہے۔ ان کا دفاع فقط ایسے ہی ممکن ہے کہ یہ قدیم دور سے ممنوع ہیں۔

اس سے بڑی مثال یہ ہے کہ اکثر لوگوں کے ہاں محارم سے شادی شریعت کے مطابق جائز نہیں، لیکن شریعت لوگوں کو اس مسئلے میں اتنا زیادہ ڈراتی ہے جو اس کے ممکنہ ضرر کے متناسب نہیں۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم ان کو تابو کا اثر سمجھیں جو عقلی طرز فکر سے پہلے کا دور ہے۔ (۴۴۵)

آپ موازنہ کریں کہ محرم سے شادی پر کتنی نفرت دلائی جاتی اور جعل سازی اور فریب کاری جیسے جرائم پر ہلکی پھلکی حرمت کا اظہار کیا جاتا ہے حالانکہ اس کے اندر کسی خرافات کا کوئی عنصر نہیں۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اجڈ جاہل لوگ اس کے ارتکاب کی جرأت نہ کرسکیں۔

پھر رسل دوسرے مرحلے پر گفتگو کرتا ہے:

جب لوگوں نے شہروں کے اندر رہنا شروع کیا تو ان کے اندر یہ صلاحیت کم ہوگئی کہ وہ کسی پابندی کو فقط تابو کی بنیاد پر قبول کریں چنانچہ انھوں نے اس کی جگہ پر خدائی احکام کو رائج کیا۔ احکام عشرہ کی ابتدا ہوئی اور اللہ نے اپنا کلام شروع کردیا:

ہم تورات میں دیکھتے ہیں کہ اس میں شروع سے آخر تک اللہ گفتگو کرتا ہے۔

اس طرح سے 'اطاعت' اخلاق کا جوہر قرار پایا اور اساسی اطاعت وہ قرار پائی جو اللہ کی مشیت کی پابند ہو، اس کے علاوہ دیگر صورتیں بھی تھیں جن میں اطاعت اپنا جواز فراہم کرتی مثلاً معاشرتی عدم مساوات کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی مشیت ہے چنانچہ رعایا پر بادشاہ کی اطاعت، غلاموں پر سرداروں کی اطاعت، بیویوں پر خاوندوں کی اطاعت اور بیٹوں پر باپوں کی اطاعت لازم قرار پائی۔ (۴۴۷)

تیسرے مرحلے (عقلی اخلاق کا دور) کے متعلق رسل کا خیال ہے کہ اس کی بنیاد قدیم ہے لیکن اس کی شان وشوکت جدید دور میں ظاہر ہوئی۔ آغاز میں اخلاق کی بنیاد باہمی رضامندی کا اصول تھا۔ یہ چیز دیگر اخلاقی نظاموں یعنی خرافات وادیان میں موجود نہ تھی۔ باہمی رضامندی کا اصول عام زندگی میں عوامی ضرورت وخواہش کے عین مطابق تھا۔ مثلاً اگر میں کچھ ٹماٹر حاصل کرنا چاہتا ہوں اور رات کو چھپ کر اپنے پڑوسی کے کھیت سے حاصل کرتا ہوں تو میرا پڑوسی بھی انتقام لے گا کہ وہ میرے سیبوں کے درخت سے کچھ پھل چرالے گا۔ آخر میں ہم یہی نتیجہ نکالیں گے کہ پریشانیوں سے بچنے کے لیے اور آرام دہ زندگی کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مال

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا احترام کریں۔

اگر چہ اس نظام کے اندر تابو اور دینی شریعتوں سے تقویت حاصل کی جاسکتی ہے لیکن یہ بذات خود بھی قائم رہ سکتا ہے کیونکہ اس کے اندر کم از کم نیتوں کے اعتبار سے ایسی خوبیاں موجود ہیں جو سب کے لیے مشترکہ ہیں۔ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ اخلاقی نظام قانون سازی، حکومت اور اخلاقیات کے اندر اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اس نظام میں وہ گہرے احساسات پیدا نہیں ہو سکے جو دین یا تابو کے ذریعے گناہ و ثواب کی خوفناک گھبراہٹ یا غیر معمولی توقیر کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ (۴۴۸) رسل کا یہ استدراک یعنی باہمی رضامندی کا اُصول اور مغرب کی موجودہ زندگی، اس چیز کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اخلاق میں ایمان کے عنصر کی کتنی قدر و قیمت ہے۔

⑥ جدید نفسیاتی مطالعہ جات:

بعض محققین کا خیال ہے کہ جدید علم نفسیات تمام علوم کی بہ نسبت نیا ہے کیونکہ یہ آخری علم ہے جو دین اور فلسفے سے الگ ہوا ہے۔ وہ اس علم کی ولادت کے تین عوامل بیان کرتے ہیں جو پچھلی صدی کے نصف میں ظاہر ہوئے:

① طبیعیات اور علم وظائف اعضا کی جدید کامیابیاں۔
② چارلس ڈارون جس نے نظریہ ارتقا پیش کیا، نے ایک کتاب لکھی، انسان اور حیوان کے انفعالات۔
③ تجربیت پسند مفکرین جنھوں نے پہلی مرتبہ جدید نفسیاتی مطالعات کو تجربہ گاہوں میں ثابت کیا۔ (۴۴۹)

جدید نفسیاتی مکاتب فکر میں سب سے زیادہ مشہور نظری و عملی مکاتب دو ہیں جن کا ہمارے موضوع 'اخلاق' سے بڑا گہرا تعلق ہے۔

اوّل: سلوکی مکتب فکر (Behaviourism):

ہاری ویلز کا خیال ہے کہ تجرباتی علم نفس رجعی و مثالی افکار کو رد کرتا ہے۔ وہ ایک گمشدہ کڑی یعنی مادی میکانزم کا متلاشی تھا جو تفسیر کر سکے کہ فطرت کا شعور کیسے پیدا ہوتا ہے؟

وہ کہتا ہے: ''**مادیت کا نظریہ** اُس وقت سے کمزوری کا شکار تھا جب سے وہ انسان کی ایک گمشدہ کڑی کو تلاش کر رہا تھا یعنی انسان کا عصبی میکانزم۔ مثالی فلاسفہ اور رجعت پسند اس گمشدہ کڑی کو استعمال کرتے تھے اور جہالت و تخیلات پر مبنی من گھڑت افسانے پھیلاتے'' (۴۵۰)

وہ محقق جس نے اس محاذ کو سنبھالا، **پاولوف (Pavlov)** تھا جس نے **مشروط منعکس** اعمال کا نظریہ پیش کیا۔ سلوکی مکتب فکر انسان کے حیوانی اور مادی تصور پر قائم ہے اور نظریہ ڈارون پر اندھا ایمان رکھتا ہے اور یہی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایمان پاولوف کی تحریروں اور عملی تجربات سے بھی چھلکتا ہے۔ سب سے بڑی مشکل پاولوف کا یہ وہم ہے کہ اُس نے کامیابی کے ساتھ مسئلہ حل کر دیا یعنی اُس نے بنی نوع انسان میں شعور کی پیدائش اور ارتقا کی مشکل حل کر دی جو بندر سے انسان بننے کے دوران واقع ہوئی۔

وہ یہ بھی کہتا ہے: ''عالم حیوان اپنے ارتقائی سفر کے دوران انسانی مرحلے کو پہنچا تو اس نے ایک نیا اور مکمل ارتقائی مرحلہ طے کیا، یہ اعصاب کا میکانزم تھا''۔(۴۵۱)۔

اُس کے نظریے کا فکری خلاصہ یہ ہے کہ وہ روح کا انکار کرتا ہے اور عقل کو مستقل بالذات قرار دیتا ہے۔ وہ فقط جسم پر ایمان لاتا ہے اور بشری سلوک کو مکمل طور پر مشروط منعکس افعال شمار کرتا ہے، اِس کے سوا کچھ نہیں۔ سلوکیت کا مکتب فکر مارکسیت کو مضبوط کرتا ہے جو اِس چیز کا قائل ہے کہ انسان کا خارجی ماحول ہی اُس کے احساسات متعین کرتا ہے۔ اور وہ انجلو کے نظریے کو بھی طاقت دیتا ہے جس کا کہنا ہے کہ عمل نے ہی انسان کو پیدا کیا یعنی اُس کو بندر سے انسانی شکل میں ترقی بخشی۔ اِسی وجہ سے جاڈ نے اس مکتب فکر پر ''جدید مادیت'' کا نام بولا۔(۴۵۲)

ہاری ویلز کہتا ہے: ''پاولوف کا نظریہ، انسانی قوت ناطقہ سے متعلق ہے جو فقط انسان پر ہی محدود ہے۔ یہ نظریہ اُس خلا کو ختم کرتا ہے جس کی طرف انجلو نے اپنی کتاب میں اشارہ کیا کہ بندر کا انسان کی طرف انتقال کا مرحلہ مبہم ہے؟

ہم دیکھتے ہیں کہ پاولوف کا نظریہ ترقی یافتہ اعصابی عمل سے متعلق ہے جو انسان کی معرفت میں ایک اہم خلا کو دور کرتا ہے اور یہ مادیت کے لیے ایک بڑی کامیابی ہے۔ یہ ہمیں انسانی ارتقا کی آخری کڑی کے متعلق بتلاتا ہے اور اساسی مادیت کے حق میں یہ دلیل دیتا ہے کہ 'انسانی شعور یا عقل' مادہ کی بہ نسبت ثانوی ہے اور اُس سے اخذ شدہ ہے۔۔۔ اسی مکتب فکر کی وجہ سے مثالیت (Idealism) کو ایک بھرپور ضرب لاحق ہوئی، اگرچہ یہ فیصلہ کن نہ تھی۔ مثالیت یہ کہتی تھی کہ مادہ عقلی سرگرمی کے مقابلے میں ثانوی ہے اور اُس سے مشتق ہے۔(۴۵۳)

ترقی یافتہ اعصابی سرگرمی کا مطالعہ مادیت کی طرف پیش رفت ہے، جس کے مطابق شعور و معرفت واقعات کا عکس ہوتے ہیں اور حق خارج کے مطابق ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ اسی بارے میں لینن کہتا ہے، تمام مادی مکاتب فکر کا اجمالی مذہب یہ ہے کہ شعور وجود کا عکاس ہوتا ہے اور احساسات وہ اوّلین مواد ہیں جن سے تجرباتی علم و فکر اور حقائق و قوانین حاصل ہوتے ہیں جو فطرت اور خارجی دنیا کی حرکت کی عکاسی کرتے ہیں۔ کسی بھی مادی نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ احساسات واقعات کی تصویریں ہیں اور خارجی موضوعات سے صادر محرکات ہیں۔ اسی وجہ سے لینن کہتا ہے: ہر مادی مفکر یہ سمجھتا ہے کہ احساس عقل کو خارجی دنیا سے براہ راست جوڑتا ہے اور رابطہ قائم کرتا ہے۔ احساس خارجی محرکات کی طاقت کا ذہنی حالت کی طرف ڈھل جانا ہے اور یہ عصبی نظام کے ذریعے ڈھلتی ہے۔ پاولوف نے اسی چیز کا انکشاف کیا اور اِس کو مربوط میکانزم کی صورت میں بیان کیا جو کلاسی و حسی دو نظاموں کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے۔(۴۵۴)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ انسان اور اُس کے تصرفات کی تفسیر سے متعلق سلوکیت کا مختصر تعارف ہے۔ یہ نظریہ مادی فکر کا حامل ہے اور اس کا عملی زندگی پر بھی بُرا اثر واقع ہوا۔ تخریب کاروں نے اِس کو فطرت کی نفی اور مجرد اخلاقی اقدار کے انکار کے لیے استعمال کیا۔ اسی طرح جابر سیاسی لیڈروں نے جان لیا کہ وہ اپنے تجربات کو کتوں کے بدلے عوام پر کیسے استعمال کر سکتے ہیں، وہ اِس سے پہلے قانون انتخاب طبعی کو بھی استعمال کر چکے تھے۔ علامہ مالک بن نبی نے اِس بارے میں واقعاتی شواہد کے ساتھ تفصیلی گفتگو کی ہے۔ (۴۵۵)

حقیقت یہ ہے کہ پاولوف مشروط منعکس افعال کے نظریے کا پہلا قائل اور موجد نہ تھا اور نہ وہ سلوکیت کا اوّلین علم بردار تھا۔ اس سے پہلے اس نظریے کو اُس کے استاذ سیچنوف نے اپنی کتاب ''دماغ کے منعکس افعال'' سن ۱۸۶۶ء میں بیان کیا۔ لیکن کمیونسٹ انقلاب سے قبل کے حالات تخریبی فکر کے مقابلے میں رکاوٹ تھے۔ اسی وجہ سے اطبر سبرج کی نگران کمیٹی نے اِس کتاب کے اندر فساد اور خرابی کو محسوس کیا۔ کمیٹی کے نائب عام نے اس کتاب کے خلاف اعلان کیا کہ یہ کتاب معاشرہ میں اخلاق کی بنیادوں کو ادھیڑ دے گی۔

سیچنوف (Sechenov) نے اپنے نظریے کو علمی روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ نظریہ کا اسلوب علمی رنگ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مولف نے اس کو آسان اسلوب میں لکھا ہے تاکہ عام قاری کے لیے اس کو سمجھنا آسان ہو سکے۔ کتاب کی قیمت بھی سستی رکھی گئی تاکہ یہ نظریہ زیادہ سے زیادہ قارئین تک باآسانی پہنچ سکے۔ لیکن یہ کتاب اخلاق بگاڑتی ہے۔ قانونی طور پر اس پر پابندی ہے کیونکہ یہ لوگوں کے عقائد کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ اِسی وجہ سے اِس کو ضبط اور تلف کرنا ضروری ہے۔ (۴۵۶)

یہ وہ معاملہ ہے جو استاذ کو پیش آیا لیکن اُس کے شاگرد پاولوف کے لیے سٹالن کی حکومت جشن قائم کرتی ہے اور اُس کو اُس کی وفات ۱۹۳۶ء تک اعزاز سے نوازتی رہی۔ اِس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں۔ (۴۵۷)

دوم: تحلیل نفسی کا مکتب فکر (Psychoanalysis):

پاولوف اور فرائڈ ہم عصر تھے اور اُن میں کئی اعتبار سے خصوصاً نتائج و مقاصد میں گہری مشابہت تھی لیکن دونوں کے طریق کار میں گہرا فرق ہے۔ پاولوف نتائج حاصل کرنے کے لیے شعور سے چلا جبکہ فرائڈ لاشعور سے۔ پاولوف نے موضوعی تجربات پر اعتماد کیا ہے جبکہ فرائڈ نے ذاتی تصورات اور خاص تخلیلات پر اعتماد کیا ہے۔

فرائڈ کی تمام تالیفات اس کے علمی منہج کو، اگر اُس کا منہج علمی کہلانے کا حق دار ہے، بیان کرنے سے زیادہ اُس کی یہودیت کو بیان کرتی ہیں جو اس طرح واضح ہوتی ہے کہ وہ پوری نسل انسانی کو گندا اور غلیظ قرار دیتا ہے۔ اور یہی چیز محرف تورات میں بھی واضح اور نمایاں ہے۔ (۴۵۸)۔ اُس کی یہودیت اِس طرح بھی واضح ہوتی ہے کہ وہ اخلاق کو جان بوجھ کر فاسد کرتا ہے اور انسانی اقدار کے خلاف خبیثانہ سازش کرتا ہے۔ اور یہی دونوں چیزیں تلمود میں بھی عام پھیلی ہوئی ہیں۔ (۴۵۹)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دلیل کے طور پر فرائڈ کا وہ موقف کافی ہے جو اُس نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں، جو نصرانی یورپ کے ہاں مقدس ترین شخصیت ہے، بیان کیا ہے۔ تلمود مسیح علیہ السلام کو بدترین اور گھناؤنے القاب سے پکارتی ہے۔ کلیسا اُس کا ہر جگہ پیچھا کرتا، اُس کو جلاتا اور ضبط کرتا تھا۔ مؤلفین مجبور ہوئے کہ اُن عبارات کی جگہ خالی چھوڑ دیں جن میں مسیح کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور اُن جگہوں پر خالی مربع بنا دیں یا مخفی طریقے سے اشارہ دے دیں۔ (۴۶۰)

لیکن فرائڈ نے اپنی خبیث عقل مندی اور علمی قابلیت سے تلمود کا انتقام لیا۔ وہ اُن عبارات کو بدترین اوصاف سمیت نصوص کی صورت میں لے آیا اور اپنے لیکچرز میں اعلانیہ نشر کیا۔ اُس نے اُن کو تحریر کیا اور کوئی بھی اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ (۴۶۱)۔ اس کی روشنی میں اُس کا دینی و اخلاقی موقف بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اُس وقت کا یورپی ماحول کس بری طرح بگاڑ کا شکار ہو چکا تھا اور دینی پستی اور اخلاقی گراوٹ کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ یورپ کا ماحول فرائڈ کے افکار سے چوزے نکالنے کے لیے تیار تھا۔ فرائڈ کے افکار نے یورپ کو سب سے بڑے بگاڑ تک پہنچا دیا۔

مادی فکر نفوس میں گھس گئی اور پابندیوں سے رہا ہونے والی حیوانی خواہشات زندگی کا عام معمول بن گئیں۔ صنعتی انقلاب، اُس کے ہمراہ پیدا ہونے والی معاشرتی تبدیلی اور خاندانی زندگی کی شکست و ریخت نے عقائد و اخلاق کو منہدم کر دیا۔ براعظم کی اندرونی جنگوں اور پہلی عالمی جنگ نے یورپی معاشرہ کی بنیادیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔ اصول و عقائد کا اعتماد مفقود ہو گیا، گھبراہٹ اور بے چینی عام پھیل گئی اور تمام روایات، قوانین اور اخلاق ریزہ ریزہ ہو گئے۔

اس کے ساتھ ادب و فن میں بڑی تیزی سے انحطاط اور گراوٹ پیدا ہوئی جس کو سینما، جنسی لٹریچر، کہانیوں اور تشہیری مواد نے خوب پھیلایا۔

اس پر مستزاد یہ کہ یورپی نفسیات میں کلیسا کے خلاف بھرا ہوا مستقل کینہ، انتقام کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ اور گناہ کا شعور جو رہبانیت کی وجہ سے وراثتاً ملا تھا، نے اپنا ردِ عمل ظاہر کیا۔ اس طرح تلمودی تخریب کاروں کے لیے فضا سازگار ہو گئی کہ وہ یورپی اخلاق کے جسم سے آخری ٹکڑا بھی نوچ ڈالیں۔

ہم ان کا کردار فرانسیسی انقلاب میں بھی دیکھ چکے ہیں، سرمایہ داری کے قیام میں انھوں نے ڈارونزم کو خوب استعمال کیا پھر مارکس اور دورخائم کے تخریبی افکار بھی ہمارے سامنے ہیں۔ اب ہماری بحث تاریخ کی تیسری اہم شخصیت تک پہنچتی ہے، جو فرائڈ کے نام سے موسوم ہے۔ وہ ان سب سے زیادہ جرأت مند اور رذائل کو سب سے زیادہ صراحت سے بیان کرنے والا تھا۔ حق یہ ہے کہ بعض مغربی محققین فرائڈ کی فکر میں موجود مخفی اسباب و محرکات کا ادراک کرنے سے چوک نہ سکے۔ بعض نے کہا کہ یہ بات پکی ہے کہ فرائڈ نے انا عالی کا تصور اپنے یہودی دینی ورثے سے لیا ہے۔ یہ انا عالی وہ پوشیدہ قانون ہے جو بنیادی مذہبی شخصیت سے شروع ہوا جو باپ کی حیثیت رکھتی تھی یا موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوا جو باپ اور واسطہ دونوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ (۴۶۲)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن اس ادراک کے باوجود فرائڈ کے نظریات کو وہ مقبولیت نصیب ہوئی گویا کہ وہ کوئی زبردست علمی انکشافات ہوں۔ اس کا سارا بوجھ مغربی صحافت کے کندھے پر پڑتا ہے جو ہمیشہ یہودی اثرات کے تحت کام کرتا ہے۔

فرائڈ کا دعویٰ ہے کہ اُس نے انسانی نفس کے مطالعے کا منفرد اور محفوظ راستہ تلاش کرلیا ہے جس سے اُس کے سلوک اور رویوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اور وہ راستہ عقدہ اودیب (Oedipus Complex) ہے۔ فرائڈ کا خیال ہے کہ اُس نے بہت بڑی دریافت کی ہے۔ وہ کہتا ہے: ''تحلیل نفسی کا فقط اتنا فخر کافی ہے کہ اُس نے دبے ہوئے ''عقدہ اودیب'' کا انکشاف کیا۔ یہ کارنامہ جدید انسانی نسل کے کارناموں میں سب سے بڑا اور قیمتی شمار کیا جاتا سکتا ہے''۔ (۴۶۳)

آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ ''عقدہ اودیب'' کیا ہے جس کو اتنی اہمیت دی جارہی ہے؟!

فرائڈ اس کی تشریح میں کہتا ہے: ''چھوٹا بچہ اوائل عمر میں ماں کی محبت کا شعور رکھتا ہے اور وہ محبت دراصل ماں کے پستان سے متعلق ہوتی ہے جو کسی بھی ہدف سے محبت کی پہلی حالت ہوتی ہے۔ بچہ باپ سے تعلق کے تحت اُس کی شخصیت بھی اختیار کرتا ہے اور یہ دونوں تعلق کچھ وقت کے لیے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ پھر ماں کی طرف جنسی رغبت شدت اختیار کرتی ہے اور ایسے ظاہر ہوتا ہے گویا باپ اِس رغبت کی تسکین و تکمیل میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔ پھر بچے کا باپ سے تعلق دشمنی والا ہو جاتا ہے اور یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ باپ سے جان چھڑائی جائے تاکہ اُس کی جگہ ماں کو رکھا جاسکے۔ اس طرح بچے کا باپ سے تعلق وجدانی طور پر متناقض ہو جاتا ہے۔''

یہ وجدانی تناقض شروع سے ہی بچے کی شخصیت میں فطری طور پر داخل ہو جاتا ہے۔ باپ کے ساتھ وجدانی تناقض اور ماں کے ساتھ شدید محبت، اِس سے بچہ کے اندر ایجابی بسیط ''عقدہ اودیب'' پیدا ہوتا ہے۔

''عقدہ اودیب'' کو زائل کرنے کے لیے واجب ہے کہ ماں کی محبت سے یکسر علیحدگی اختیار کی جائے۔ اب اِس خلا کو دو باتوں سے پُر کیا جائے گا، یا تو مکمل طور پر ماں کی شخصیت اختیار کی جائے یا باپ کی شخصیت زیادہ شدت کے ساتھ اختیار کی جائے۔ کامل 'عقدہ اودیب' بچے کے اندر جنسی ثنویت (دُوئی) پیدا کرتا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ بچہ اپنے باپ کے ساتھ وجدانی تناقض اور اپنی ماں کے ساتھ عاشق کا پہلو ہی اختیار نہیں کرتا بلکہ وہ اس دوران لڑکی کا رویہ بھی اپناتا ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مونث میلانات ظاہر کرتا ہے اور اپنی ماں کے ساتھ دشمنی اور غیرت کا رجحان بھی ظاہر کرتا ہے۔ (۴۶۵)

جب کوئی شخص اِس کلام کو سنے اور وہ جانتا ہو کہ یہ ایک سنجیدہ شخص سے کامل شعور کے ساتھ صادر ہو رہی ہے۔ تو کئی سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جن میں یہ سوال اہم ہے کہ چھوٹے بچوں میں جنسی شعور کس قدر ممکن ہے؟ فرائڈ اس سوال کا جواب دیتا ہے بلکہ وہ غلیظ یہودی خیال پر اعتماد کرتے ہوئے تفصیل سے بات چیت کرتا ہے، وہ کہتا ہے: جنسی زندگی کا آغاز بلوغت سے نہیں ہوتا۔ یہ پیدائش کے وقت سے ہی واضح علامات کے ساتھ شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہم بچہ کی جنسی سرگرمیوں کی علامات کا مشاہدہ عہد طفولیت میں ہی کر سکتے ہیں۔ اُس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جنسی کیفیت کا انکار فقط پرانے رجعت پسند ہی کر سکتے ہیں۔

فرائڈ کے نزدیک یہ پہلا جنسی مرحلہ ہے پھر اس کے بعد ایک پوشیدہ دور آتا ہے جس میں جنسی سرگرمی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے۔ پھر تیسرا مرحلہ بلوغت کا ہے۔

فرائڈ اس سے یہ نتیجہ ظاہر کرتا ہے کہ انسانی بچے کی جنسی زندگی دو ادوار سے گزرتی ہے۔ اور یہ دو ادوار فقط انسانی نوع کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں ادوار کا بچے کی تشکیل میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ فرائڈ ان مقدمات کی علمی دلیل کے طور پر یہ مفروضہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان اُس پستان والے حیوان کی نسل سے ارتقاپذیر ہوا ہے جس کی جسمانی پختگی پانچویں سال میں مکمل ہوتی تھی۔

یہ ہے علمی دلیل (!)، فرائڈ ہمیں اس کے متعلق کوئی اہم معلومات نہیں دیتا اور نہ ہی کوئی تاریخی مصادر بتلاتا ہے۔

شاید اُس نے ڈارون کے فرضی نظریے پر اعتماد کیا جو اُس نے عنفوان شباب میں پڑھنا شروع کیا۔ اُس کی بے پناہ شہرت نے اُس کے گرد اٹھائے ہوئے سوالوں کو رد کر دیا۔ فرائڈ نے ڈارون کی ایسی شرح کی جیسے وہ عملاً ثابت شدہ علمی حقیقت ہو۔ وہ کہتا ہے: پہلا عضو جو شہوانی زبان کے ساتھ اپنا آپ بیان کرتا اور اپنا **لبیدی** (۴۶۶) جنسی مطالبہ پیش کرتا ہے، نفس انسانی کی پیدائش سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ بچے کا ابتدائی عمر میں پستان چوسنا اور چمٹنا، اسی جذبے کو واضح طور پر بیان کرتا ہے۔۔۔ یہ ممکن ہے بلکہ واجب ہے کہ اس کی تشریح جنسی جذبے کے ساتھ کی جائے۔

دوسرا مرحلے کا جنسی جذبہ اپنی تکمیل کے لیے دشمنی اور اخراج کے وظیفے کا تقاضا کرتی ہے۔

تیسرا مرحلہ قضیبی ہے۔۔۔، اس میں بچے کا جنسی جذبہ اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے اور اضمحلال کے قریب ہو جاتا ہے۔ اُس وقت نر بچوں اور مادہ بچوں کا راستہ مختلف ہوتا ہے۔ اس وقت بچہ اودیبی مرحلے میں داخل ہوتا ہے اور اپنے قضیب (آلہ تناسل) کے ساتھ بے مقصد چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، اس دوران اُس کو مختلف خیالات آرہے ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کے حوالے سے خاص جنسی نشاط محسوس کرتا ہے۔ (۴۶۷)

فرائڈ کے مفروضات اور غلیظ اوہام فقط یہاں تک واضح نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنی وضاحت ایک اور مفروضے سے کرتا ہے جو عقدہ اودیب سے پیدا شدہ ہے جس کا نام اُس نے ''**مثالی انا**'' رکھا۔

''**مثالی انا**'' عقدہ اودیب کا ورثہ ہے۔ اسی وجہ سے وہ قوی ترین محرکات کا نتیجہ ہے اور لبیدو (جنسی جذبے) کے ساتھ ''انسانی جبلت'' میں جاری ہوتا ہے۔ (۴۶۸)

اس مثالی انا کی تشکیل کے ساتھ ''انا'' عقدہ اودیب پر غلبے کی کوشش کرتی ہے جبکہ اسی دوران وہ خود کو انسانی جبلتوں کے تسلط کے تحت بھی رکھتی ہے۔ (۴۶۹)

جب ان توہمات کا سلسلہ یہاں تک پہنچتا ہے تو فرائڈ اپنے مقصد کی وضاحت شروع کرتا ہے: ''**مثالی**

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انا کی آسان تشریح یہ ہے کہ یہ اُن تمام وجوہ سے تشکیل پاتی ہے جو انسان کے لیے اعلیٰ طور طریقوں سے شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ انسان کا اپنے باپ کی طرف اشتیاق کا بدل ہوتی ہے جو کہ تمام ادیان میں ایک اصل پر مشتمل ہے۔ نفس کا یہ فیصلہ کہ ''مثالی انا'' کسی امر کو پورا کرنے میں ناکام رہی، نالائقی کا احساس پیدا کرتا ہے۔ اور یہ وہ احساس ہے جس کو دین دار انسان اپنے جذبات میں مستقل ثابت کرتا ہے۔ جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو باپ کی جگہ پر اساتذہ اور دیگر موثر ہستیوں کا اثر ورسوخ قائم ہوتا ہے۔ اُن کے اوامر ونواہی کا اثر مثالی انا میں قائم ہوتا ہے اور یہ ''ضمیر'' کی صورت میں اخلاق پر ایک مستقل نگران بن جاتا ہے۔ یقیناً دین، اخلاق، اجتماعی شعور جیسے اساسی عناصر جو انسانوں میں بلند وبرتر قرار دیے جاتے ہیں، یہ سب اصل میں ایک ہی چیز ہے۔ انسانوں کے یہ اعلیٰ پیمانے، جو انسانی نسل کی نشوونما کے دوران ظاہر ہوئے، اُس مفروضے سے پیدا ہوتے ہیں جن کو اُس نے اپنی کتاب ''طوطم ومحرم'' میں عقدہ اودیب کے تحت بیان کیا ہے۔ چنانچہ ''دین اور اخلاق'' عقدہ اودیب پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے ایک ایک عملی حقیقت کے طور پر پیدا کیے گئے۔ (۴۷۰)

شاید ہم جلد بازی میں یہ کہیں کہ اِس ساری بکواس پر کوئی دلیل نہیں اور اِس کی غرض فقط یہ ہے کہ سادہ لوح انجان لوگوں سے جان بوجھ کر انتقام لیا جائے اور اُن کے دین واخلاق کو خراب کیا جائے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم اُس غرض کو تلاش کریں جس کو فرائڈ نے انسانیت کے پہلے مرحلے سے متعلق ذکر کیا ہے، شاید اُس میں کچھ علمیت یا کم از کم نظافت کا کچھ حصہ ہے۔

فرائڈ نے ڈارون کو پڑھا کہ عالم بقر (بیلوں کا جہان) میں کئی نوجوان بیل 'ماں گائے' کو حاصل کرنے کے لیے متوجہ ہوئے۔ انھوں نے راستے میں اپنے 'باپ بیل' کو رکاوٹ بنے دیکھا۔ وہ سب اس کو قتل کرنے کے درپے ہوگئے۔ جب وہ اِس سے فارغ ہوئے تو پھر اُن کے درمیان جھگڑا کھڑا ہوگیا حتی کہ اُن میں سے ایک، جو سب سے قوی تھا، اکیلا ماں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور نیا سردار بنا۔

فرائڈ نے اپنے ٹیڑھے خیال کے مطابق عالم بقر کو عالم انسان پر چسپاں کیا تاکہ اُس پر اپنے مزعومہ مفروضے کی بنیاد رکھ سکے۔ وہ اِس کو اپنی کتاب 'طوطم ومحرم' میں انسانیت کے آغاز کے حوالے سے ذکر کرتا ہے کہ سب انسان اپنی ماں کی طرف جنسی محرک کے تحت متوجہ ہوئے۔ جب انھوں نے اپنے باپ کو اِس میں حائل دیکھا تو اُس کو قتل کر دیا۔ پھر انہیں اُس کے قتل پر احساسِ ندامت ہوا۔ انھوں نے باپ کو مقدس قرار دیا اور اُس کی عبادت کرنے لگے۔ اس طرح اوّلین انسانی عبادت کا آغاز ہوا جس کے متعلق بیٹے سمجھتے تھے کہ اُس کا باپ سے تعلق ہے۔ آغاز میں نسل انسانی کے ہاں طوطم کے کھانے کی حرمت دو بڑی حرمتوں میں سے ایک تھی اور دوسری بڑی حرمت ''محارم'' سے شادی تھی۔ اِس کی اصل یہ تھی کہ بیٹوں نے دیکھا کہ وہ ماں کے حصول کے لیے لڑ پڑیں گے۔ تو سب نے اُس کی حرمت پر اتفاق کر لیا۔ اس طرح پہلی جنسی تحریم پیدا ہوئی۔ اور ساری دنیا کے انسان ماں سے شادی کو حرام قرار دینے لگے۔ باقی حرمتیں بھی اسی طرح منتقل ہوئیں۔ (۴۷۱)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلوجل کہتا ہے: بلاشک وشبہ نفسیات کے بشری علوم پر زیادہ اثرات، فرائڈ کے طوطم ومحرم والے نظریے کے مطابق ہیں۔۔۔ فرائڈ نے اپنے افکار کو طوطمیت کے مطابق لاگو کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے انسانوں کی دو بڑی حرمتوں کو جو طوطمی معاشرہ میں موجود تھیں، یعنی طوطم حیوان کا کھانا اور داخلی شادی کی حرمت، مرکب اودیب کے مختلف پہلوؤں کی طرف لوٹا دیا۔ باپ کو قتل کرنے کی رغبت، ماں سے شادی کا شوق اور طوطم وغیرہ سے متعلق قدیم تہوار اسی طرح ظاہر ہوئے۔۔۔ مسیحی کلیسا کا مقدس روٹی کھانا بھی اُس قدیم واقعہ کی طرف لوٹتا ہے جب ابتدائی آدمی وجدانی طور پر متناقض تھا (۴۷۲) یعنی ایک طرف باپ سے محبت کرتا تھا اور دوسری طرف ماں کے حصول کی خاطر باپ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

یہ ہے فرائڈزم اور اُس کی کمزور بنیادیں۔ اِس کے تخریبی اثرات کا بیان آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ

محکم دلائل-و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث سوم: موجودہ لادین معاشرے کی صورت حال

مختلف فکری مکاتب فکر، رجحانات اور دیگر عوامل کے سبب یورپ نے دین اور اخلاق کا انکار کر دیا ہے۔ اُس کے معاشرے نے اُن تمام عناصر کو پھینک دیا ہے جو دین اور اخلاق سے حاصل شدہ تھے۔ یورپ کی موجودہ اعلیٰ اقدار فقط یہی ہیں کہ میکیاولی نظریے کے مطابق افادیت و مادیت کے اخلاق کو اپنایا جائے۔ اجتماعی معاشرتی تعلقات فقط ذاتی مصلحت و مفاد کے مطابق قائم کیے جاتے ہیں جن کو عقد اجتماعی اور تجارتی اخلاق کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے۔ (۴۷۳)۔ اسی طرح ذرائع اور وسائل کا فلسفہ پریگماٹزم (Pragmatism) ہے۔ (۴۷۴)۔ یہ ولیم جیمس اور جارج سنتیانہ کا فلسفہ ہے جو عملی فلسفے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجرد اقدار اور موضوعی احکام کا انکار کرتا ہے اور کسی بھی فعل و عمل کی قدر و قیمت کا اندازہ عملی نتائج سے لگاتا ہے۔ موجودہ امریکہ اسی فلسفے کا حامل ہے۔ ان فلسفوں کی موجودگی میں اخلاق کی ذاتی قدر و قیمت نہیں رہی بلکہ کسی بھی تعلق یا تصرف کی اخلاقی حیثیت کا اندازہ اُس کی عملی مصلحت اور مادی نتائج سے لگایا جاتا ہے۔

اخلاق کے ان تصورات سے مغربی معاشروں نے کیا حاصل کیا؟

تاریخ بشریت کے مصنفین کہتے ہیں:

انسان کی اپنی ذات کے متعلق جو فکر بیسویں صدی کے نصف میں ظاہر ہوئی تھی، اب بالکل بدل چکی ہے کیونکہ اُس کا معاشرہ، طبقے اور اللہ کے متعلق تصور بھی بدل چکا ہے۔ دنیا کے کئی علاقوں اور طبقات میں لوگوں نے دیکھا کہ وہ جدید قوتوں اور جدید وسائل پر غالب آ چکے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ وہ اِن قوتوں اور وسائل سے ایک نئی فجر طلوع کریں گے اور اُس کی روشن علامات بڑی تیزی سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ مستقبل کی امیدیں اور خدشات بیک وقت گھبراہٹ اور خوشی میں گُھری ہوئی ہیں۔

دنیا کے طول و عرض میں لوگ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ایک ایسی کشتی میں سوار ہو چکے ہیں جس کا خشکی سے تعلق ٹوٹ چکا ہے اور اب وہ نامعلوم سمندروں کے اندر بغیر نقشے کے کشتی میں سفر کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ مہم جوئی اور جانبازی کیف و مستی سے خالی نہیں جبکہ دیگر لوگوں کے نزدیک یہ ہلاکت کا بہت بڑا خطرہ ہے۔ جدید انسان اپنی ذات کو ایک ایسے دور میں کھڑا دیکھ رہا ہے جو تناقضات سے لبریز ہے۔ وہ جب بھی اپنے ماحول پر کوئی غلبہ حاصل کرتا ہے، اُس کا شعور اُسے بتلاتا ہے کہ وہ اپنی مسخر کردہ قوتوں کے سامنے بالکل عاجز ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خارجی دنیا کے بارے میں اُس کی معلومات جتنی وسیع ہو رہی ہے، اتنا ہی روزمرہ زندگی پر اُس کی قدرت کم ہوتی چلی آ رہی ہے۔ جیسے جیسے جدید معلومات اور معاشرتی قوتیں قدیم نظاموں اور یقینی اقدار کو تبدیل کر رہی ہیں، ویسے ہی انسان کا یہ شعور بھی بڑھ رہا ہے کہ امن وسکون کے لیے کوئی ایسا مصدر تلاش کیا جائے جو سابقہ مصادر کا قائم مقام ہو۔ (۴۵۷)

یہ کیسی مفلسی، حیرت اور محرومی ہے۔۔۔!!

ر۔ بوسکیہ اور اُس کا ساتھی جدید انسان کی مشکلات کے متعلق کہتا ہے:

میں کہاں ہوں؟ کس زمانے میں ہوں؟ کس قسم کے حالات میں پھنسا ہوا ہوں؟ کیا کوئی ایسی چیز ہے جو مجھے ماضی، مستقبل اور میرے زمانے کے دوسرے لوگوں سے جوڑے؟ کیا اِن باتوں کا حصول میرے لیے ممکن ہے؟ میں ایک ہی بات کرتا ہوں کہ میرا مقام اور مرتبہ کیا ہے؟

موجودہ معاشرے میں انسان کا اپنے روزمرہ ماحول کے ساتھ تعلق اس طرح بن گیا ہے کہ اُس نے اپنی داخلی آزادیوں کا بہت بڑا حصہ کھو دیا اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی گم کر دیا ہے۔ انسانیت اپنے انجام کی اُس وقت تک مالک نہیں بن سکتی جب تک انسان اپنی باطنی حریت اور احساس ذمہ داری کا مالک نہیں بن جاتا۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟

انسانیت اپنی منزل کی مالک اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک انسان اپنی باطنی آزادی اور احساس ذمہ داری کو حاصل نہ کر لے۔ لیکن کیا یہ موجودہ انسان کی استطاعت میں ہے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا جواب تلاش کرنا ہمارے ذمہ ہے۔

ہمارا معاشرہ بلا شک وشبہ مال و دولت اور اقتصاد کے میدان میں عظیم قوت کا حامل ہے لیکن انسانی میدان کے اندر یہ صورت حال نہیں۔ ہم جدید دور کی نفسیات، فلسفہ، سماجیات اور اخلاقیات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں لیکن ابھی تک اپنے آبا و اجداد کی طرح ہی اخلاق سے کورے ہیں۔۔۔ یہ عین ممکن ہے کہ ہم انیسویں صدی سے منسلک نظم وضبط پر زندگی گذارتے رہیں۔۔۔ ہم راکٹوں اور میزائیلوں کے دور میں گھوڑوں والے زمانے کے مطابق نہ چلیں۔۔۔ ہم اقتصادی اور معاشرتی ترقی کے درمیان فرق کو پہچان سکیں کہ اس وقت ہمارا معاشرہ کس بُری کیفیت اور بُرے نظام کا حامل ہو رہا ہے۔

بلا شک وشبہ اقتصادی ارتقا جدید ثروتوں میں اضافہ کر رہا ہے اور نت نئی قیمتی ایجادات پیدا ہو رہی ہیں۔ انسان ایک جنگجو کی طرح قدم بقدم آگے بڑھ رہا ہے اور کرہ ارضی کو تسخیر کر رہا ہے۔۔۔ اس نے فطرت اور نیچر کی پہچان حاصل کی، قدرتی طاقتوں پر غلبہ حاصل کیا، زمین کے ظاہری اور باطنی ذخیروں کو استعمال کیا لیکن اتنی ترقی ہونے کے باوجود معاشرہ باطنی مفلسی اور نفسیاتی عدم اطمینان کا شکار ہے۔۔ صنعتی ملکوں کے اندر مختلف علاقوں اور معاشرتی گروہوں کے مابین بہت بڑا فرق نظر آتا ہے اور اس خطرناک فرق کے باوجود وہ حاجات بڑھ رہی ہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جن کو مالدار جماعتیں اور معاشرے مصنوعی طور پر پیدا کرتے ہیں۔ فنی ترقی اور تجارتی نظم وضبط ایک ایسا جہنمی دائرہ بن گیا ہے جو معاشرتی نظم وضبط کی کمی پر دلالت کرتا ہے۔ ایک سخت کشمکش ہے جس میں ہر گروہ اور فرد اپنے مخصوص مفادات کے لیے ہر چیز سے برسر پیکار ہے۔ (۴۷۶)

ہم ایک جدید یورپی نوجوان کے تجربات پر غور کرتے ہیں جو اپنی اور اپنی نسل کی مشکلات کو بیان کرتا ہے:

جب میں بیس سال سے زیادہ عمر کا ہوا تو مجھے رُوحانی خلا کا احساس ہوا۔ وہ تمام اخلاقی اقدار جو کئی صدیوں سے یورپ کے اندر مروج رہیں، وہ مخصوص اور مقرر شکل وصورت کی حامل نہیں رہیں۔ یہ اُن خوف ناک حادثات کا نتیجہ تھا جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کے درمیان واقع ہوئے۔ ظاہر نہیں ہوتا کہ اخلاقیات کا کوئی نیا مجموعہ اپنے آپ کو خود لاگو کر دے گا۔ فضا کے اندر ایسا جذباتی پن اور معاشرتی وعقلی اُبال ہے کہ انسان شک وشبہ میں ہے کہ وہ اپنے افکار ومساعی میں کبھی ٹھہراؤ یا استقرار بھی حاصل کر سکے گا یا نہیں؟ یوں محسوس ہوتا ہے، گویا ہر چیز بغیر سوچے سمجھے ایک غیر منظم بہاؤ میں بہتی چلی جا رہی ہے۔ نوجوانوں کا روحانی اضطراب اس قدر بڑھ چکا ہے کہ انہیں اپنے قدموں کے لیے کوئی مضبوط جگہ میسر نظر نہیں آتی۔ قابل اعتماد اخلاقی معیار کے فقدان کے سبب، کوئی بھی انسان ہم نوجوانوں کے بہت سارے سوالوں کا جواب دیتا نظر نہیں آتا۔ ہمارے سوال ہمیں اضطراب میں ڈالتے ہیں۔ علم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ہر چیز کی معرفت کا نام ہے لیکن لوگ بھول جاتے ہیں کہ معرفت اخلاقی ہدف کے بغیر انارکی اور پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔

معاشرتی انقلابی اور کیمونسٹ مصلحین فقط اپنے خارجی معاشرتی یا اقتصادی حالات کے مطابق غور وفکر کرتے ہیں۔ اس کے مدمقابل روایتی دینی پیشوا اپنی مخصوص عادات کی نسبت اپنے الٰہوں کی طرف کرتے ہیں حالانکہ یہ عادات فرسودہ ہو چکی ہیں اور ایک طویل زمانے سے اُن کے اندر کوئی معنویت نہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مزعومہ الٰہی صفات ہمارے ماحول اور دنیا کے ساتھ آخری حد تک متناقض ہیں تو ہم اپنے دلوں میں کہتے ہیں ''وہ قوت جو قضا وقدر پر محیط ہے، واضح طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب صفتوں سے مختلف ہے، تو کیا پھر بھی اللہ تعالیٰ کا وجود ہے''۔

ہم میں سے بہت تھوڑی تعداد یہ جانتی ہے کہ اس انارکی اور پیچیدگی کا سبب دین کے اُن حامیوں کا استبداد ہے جو اپنے آپ کو نیک قرار دیتے ہیں، اللہ کی صفتیں بیان کرنے کو اپنا حق گردانتے ہیں اور اللہ پر مخصوص پردے ڈالتے ہیں۔ انھوں نے اللہ کو انسان اور اُس کی منزل سے جدا کر دیا ہے۔

فرد کی اخلاقی تبدیلی اخلاقی انارکی کی طرف لے جاتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی مخصوص مادی انسان جنم لے اور وہ پاکیزہ زندگی کو تشکیل دے۔

جنگ عظیم کے بعد جب مضبوط اخلاقی معیار تحلیل ہونا شروع ہوئے تو مرد اور عورت کے درمیان بہت سارے پردے بھی زائل ہو گئے۔ جو کچھ واقع ہوا وہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ بعض اخلاقی معیار ابدی اور شک وشبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے بالاتر تھے لیکن ہر چیز کو شک وشبہ کا محل بنایا گیا۔ وقت کے رقاصوں نے یہ عقیدہ منتقل کیا کہ کل کی زندگی خوش گوا رہوگی، انسان کی ترقی جاری رہے گی اور بیداری کا عمل وجود میں آئے گا۔ اِن باتوں کی طرف سپنگلر نے دعوت دی، نطشے نے اخلاق کی اضافیت کی دعوت دی اور تحلیل نفسی کے نفسیاتی ماہرین نے روحانی معدومیت کو پروان چڑھایا۔ (۴۷۷)

حق بات تو یہ ہے کہ کرہ ارضی پر موجود لادین معاشروں کی خوفناکیوں اور مصائب وآلام کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اِس کے مسائل اور پیچیدگیوں نے فلاسفہ کو تھکا ڈالا ہے، مصلحین مستقل اضطراب کا شکار ہیں اور ادیب و شعرا ماحول کی نحوست کو خوب اجاگر کر رہے ہیں۔ بہت سارے لوگ خلاصی اور کامیابی کی ہر امید ترک کر بیٹھے ہیں کیونکہ دائرے کے تمام اجزا وعناصر خوب مضبوط ہو چکے ہیں اب یا تو لذیذ موت کا خواب دیکھا جائے اور اس کو جلد طلب کیا جائے یا ایک ہولناک صبر کے ساتھ اُس کا انتظار کیا جائے!۔

یہ بات ہماری استطاعت میں نہیں کہ ہم اِس کمزور اور منتشر معاشرے پر ہر زاویے اور ہر گوشے سے گفتگو کریں لیکن ہم اِس کے مسائل میں سے چند تصاویر ضرور پیش کریں گے۔ یورپی معاشرے کا ایک اہم قضیہ ''عورت کی حیثیت'' سے متعلق ہے جو دین واخلاق کے لحاظ سے سب سے بڑا مسئلہ اور تاریخ کے لحاظ سے سب سے اہم اخلاقی قضیہ ہے۔ اس کی تفصیلات اگلے باب میں پیش خدمت ہیں۔

اصطلاحات: ۱۰

یورپ میں دین کے زوال کے بعد پیدا ہونے والے اخلاقی وفکری مکاتب فکر

جبریت (Determinism)

ہر واقعہ کسی نہ کسی علت کی طویل زنجیر کا نتیجہ اور قوانین طبعی کا پابند ہے۔ مارکس، فرائڈ اور ڈارون کسی نہ کسی شکل میں جبریت کے قائل تھے، اِن کے نزدیک ارادہ وحریت فقط وہم ہیں۔ جبریت کا نظریہ دین کی جڑیں کاٹتا ہے۔

میکانکی جبریت (Mechanical Determinism)

جبریت کا انتہا پسند نظریہ جس کے مطابق انسان میں قوت ارادی نہیں ہے اور وہ ایک مشین کی طرح مہیجات کا ردعمل کرتا ہے۔ میکانکی جبریت کے الٹ غایت پسندی ہے یعنی ہر عمل کی کوئی نہ کوئی غایت ہوتی ہے، اسی طرح انسان کی بھی ایک غایت ہے اور وہ مجبور محض نہیں بلکہ صاحبِ ارادہ ہے۔

اخلاقی اضافیت (Ethical Relativism)

یہ نظریہ کہ اخلاق مستقل بالذات اور دائمی نہیں۔ اس کے قائلین میں منطقی اثباتی، وجودی اور نتائجیتی ہیں۔ موجودہ دور میں یہ یورپ کا سب سے بڑا اخلاقی مکتب فکر ہے۔ دین کے نزدیک اخلاق مستقل بالذات اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دائمی اقدار پر مشتمل ہوتے ہیں اور وحی الٰہی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

لذتیت (Hedonism)

یہ نظریہ کہ اصل متاع اور انسان کا بنیادی اخلاقی فریضہ لذت کا حصول ہے۔ اِس نظریے کے پھیلنے سے اُخروی نجات اور رضائے الٰہی کی حیثیت ختم ہوگئی۔

افادیت (نفعیة۔Utilitarianism)

اخلاقیات کا وہ لادین معاشرتی مکتب فکر جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے زیادہ سے زیادہ فائدے کو اچھائی کا معیار قرار دے۔ اس کا بانی جرمی بینتھم تھا۔ جان اسٹورٹ مل اور ہربرٹ سپنسر بھی اسی کے قائل اور داعی تھے۔ اس نظریے سے معاشرے میں دنیوی زندگی کا اہتمام اور لذات میں انہماک بڑھ گیا اور آخرت پرستی کی جڑ کٹ گئی۔

نتائجیت (براجماتیة۔Pragmatism)

وہ افادیت پسند مکتب فکر جس کے نزدیک سچائی کوئی پہلے سے بنی بنائی چیز نہیں۔ یہ انسان کے عمل سے پیدا ہوتی ہے اور اس وقت قابل قبول بنتی ہے۔ جب اس کے نتائج وعواقب تسلی بخش ہوں۔ یہ جدید فلسفے میں مقبول عام رجحان ہے۔ امریکہ میں ۱۸۰۰ء کے بعد پیدائش ہوئی۔ یہ عقلیت کا معارضہ کرتا ہے اور وسائل کو مقاصد کے تابع کرتا ہے۔

اِنکارکل (عدمیة۔Nihilism)

اس نظریے کے مطابق کسی بھی قدر کا کوئی وجود نہیں چاہے وہ مذہبی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا سیاسی۔ فرد ہر قید سے آزاد ہے۔ ہستی کا علم ممکن نہیں۔ انسانی زندگی موت، تکالیف، دکھ اور مصائب سے عبارت ہے۔ عدم وجود کی انتہا ہے۔ اِس لفظ کا استعمال ۱۹ویں صدی کے آخر میں ہوا۔

اثباتیت (وضعیة۔Positivism)

یہ فلسفیانہ نظریہ کہ انسان کو اپنی مادی اور سائنسی ترقی پر توجہ دینی چاہیے اور مابعد الطبیعیاتی سوالات نہیں اٹھانے چاہیے کیونکہ ان سوالات کا معروضی مشاہدہ وتجربہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ انقلاب فرانس کے بعد پیدا ہونے والے اخلاقی وخاندانی انتشار کے حل کے لیے پیدا ہوا۔ یہ ۱۹ویں صدی کے وسط سے بیسویں تک مقبول ہوا۔ اس کا بانی آگسٹ کامتے (۱۸۵۷ء) تھا۔ ۱۹۲۰ء کے قریب ویانا سرکل کے مفکرین نے اِس کو مزید گہرا کیا۔ اُن کے نزدیک بھی علم فقط سائنسی تحقیق پر مبنی ہوتا ہے۔ اُن کا نظریہ منطقی اثباتیت کہلایا۔

منطقی ثبوتیت پسندی (Logical Positivism)

ایسے ثبوتیت پسند نظریات جن کا مقصد صحیح اور سائنسی تصورات معلوم کرنا ہے۔

اس مکتب فکر کے مطابق صرف دو قسم کے جملے بامعنی ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو تحلیلی نوعیت کے ہوں اور دوسرے وہ جن کی تجربے سے تصدیق کی جا سکے۔ مابعد الطبیعیاتی جملے اِن دونوں قسموں سے تعلق نہیں رکھتے، اس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے اُن کی تصدیق کسی طرح ممکن نہیں ہوتی۔

عضویت (عضویۃ۔Organism)

یہ نظریہ کہ منظم ہیئت یا معاشرہ ذی حیات جسم کے اجزا کی طرح مربوط ہوتے ہیں۔ اس کا بانی ہربرٹ سپنسر تھا۔ یہ نظریہ معاشرتی قوانین کو طبعی قوانین کی طرح مستقل مانتا ہے۔ یہ نظریہ وحی والہام سے مستنبط نہیں بلکہ دورِ عقلیت کی پیداوار ہے۔

عقلیت (عقلانیۃ۔Rationalism)

یہ نظریہ کہ علم کا واحد ذریعہ انسانی عقل ہے۔ رومانیت پسندی کے برعکس عقلی استدلال کائنات کی طبیعت جاننے کا واحد ذریعہ ہے۔ نہ کہ وحی اور انسانی تجربہ۔

اس نظریہ کے اوّلین مفکرین سقراط اور ارسطو تھے۔ پھر ڈیکارٹ، لیبنتز، سپائی نوزا، والٹیر وغیرہ ظاہر ہوئے۔ اس کے ذیلی مکاتب میں انسانیت (ہیومنزم) اور لادینیت ہیں۔ عیسائی تاریخ میں عیسائی متکلمین جیسے آگسٹائن اور تھامس اکوینی وغیرہ نے عیسائیت کو عقلیت کے ذریعے تحفظ دینے کی کوشش کی۔ اسلامی تاریخ میں یہی کام معتزلہ اور مسلم فلاسفہ نے کیا۔ عیسائیت میں عقلیت دین پر غالب آگئی اور دین زوال پذیر ہو گیا لیکن اسلام میں غالب مکتب فکر اہل سنت و جماعت کا رہا جو عقلیت سے مغلوب نہ ہو سکا۔ عقلیت کا مکتب فکر وحی کے بجائے عقل کو اوّلین مرجع قرار دیتا ہے، معجزات اور دیگر اہم دینی تصورات کا عقل کی بنیاد پر انکار کرتا ہے۔ اسلام میں نہ تو عقل کا یکسر انکار ہے اور نہ اس کو وحی سے مقدم قرار دیتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یورپ میں عورت کی معاشرتی آزادی اور حقوق
(Feminism)

نسائیت(Feminism)

اس کا آغاز اٹھارویں صدی کے آخر سے ہوا جب مغرب میں خواتین کو احساس ہوا کہ ان کے بھی حقوق ہیں اور معاشرہ، جس پر عملاً مردوں کی حکمرانی ہے، انہیں ان حقوق سے محروم رکھتا چلا آرہا ہے۔ بیسویں صدی آتے آتے مردوں کے مساوی مقام کی جدوجہد تیز تر ہوگئی۔ ادب میں پہلی ناقد ورجینیا وولف ہے اور دوسری سیمون دبوار ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد نسائی تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔

مغربی تحریک نسواں کی مختصر تاریخ۔

یورپ میں خواتین کی مردوں سے الگ تھلگ سرگرمیاں، حیا، حجاب اور جائز تعلقات پر اکتفا کبھی بھی معاشرہ کا حصہ نہیں رہا۔ تاہم پھر بھی ابتداء میں مغربی عورت کا زیادہ کردار گھریلو نوعیت کا ہوتا تھا اور مرد کا زیادہ کردار بیرون خانہ معاشی نوعیت کا۔ لیکن یورپ میں چلنے والی روشن خیالی کی تحریک، تحریک اصلاح مذہب، انقلاب فرانس، صنعتی انقلاب اور صنعتی معاشرے کے قیام نے عورت کے کردار کو بدلا۔

برطانیہ میں صنعتی انقلاب سے قبل کے زمانے میں خاندان، شادی اور باہمی مل جل کر رہنے کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ عورت زیادہ تر گھریلو کام کرتی اور مرد زیادہ تر باہر کے معاشی کام کاج سنبھالتا تھا۔ ۱۷۵۰ سے ۱۸۴۱ء تک برطانیہ کا مشہور صنعتی انقلاب کا دور ہے۔ اس دور میں عورت نے کپڑے کی فیکٹریوں میں کام کیا۔ صنعتی معاشرہ کے قیام اور گھر سے باہر کمانے کی غرض سے 'عورت' دفتروں، کارخانوں، کلبوں، فیشن انڈسٹری اور اشتہارات کی زینت بنی۔ آزادی، مساوات جیسی نئی قدریں رائج ہوئیں (یہ نئی اقدار بھی درحقیقت مذہبی تصورات سے آزاد تھیں)، عورت کی تذلیل کے تصور کو ختم کیا گیا، جاگیردارانہ نظام کے ظلم وستم ختم ہوئے، نکاح وطلاق کی بعض قیتوں کو نرم کیا گیا۔ لیکن مرد مزدوروں اور معاشرتی مصلحین

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کے دباؤ کے تحت عورتوں کی ملازمتیں محدود کی گئیں اور عورتوں کو گھر لوٹنے پر مجبور کیا گیا۔
۱۸۵۰ء تک عورتوں کے حقوق کے بارے میں فکری کشمکش اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ۱۸۵۰ء کے بعد مغربی خواتین نے باقاعدہ طور پر اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے اجتماعی سیاسی تحریک کی ابتداء کی۔ ابھی تک عورت کو قانونی طور پر حق ملکیت، حق وراثت، کاروبار کا حق، ووٹ کا حق وغیرہ جیسے حقوق حاصل نہ تھے۔ اس عرصے میں خواتین اور مغربی معاشرہ میں بتدریج وہ باتیں پروان چڑھیں جو مغربی معاشرہ کا طرہ امتیاز ہیں۔ ﴿نمبر۱﴾ مرد و عورت کی مساوات ﴿نمبر۲﴾ عورتوں کا معاشی استقلال ﴿نمبر۳﴾ مرد و زن کا آزادانہ اختلاط۔

خواتین کی حقوق کی تحریک اپنے سیاسی جدوجہد کے سفر میں مختلف کامیابیاں حاصل کرتی رہی۔ خواتین کو یورپی ممالک میں بتدریج قانونی اور سیاسی حقوق حاصل ہوئے۔ ایک جیسے کام کے لیے عورت و مرد کی تنخواہ قانونی طور پر یکساں قرار پائی۔ عورت کو ووٹ کا حق ملا۔ عورت کو حق وراثت، حق ملکیت، کاروبار کا حق وغیرہ جیسے حقوق حاصل ہوئے۔

۱۹۱۴ سے ۱۹۵۰ء تک عورتوں کو ملازمتوں کے مواقع بھی ملے اور انہیں وہ سب حقوق ملے جو مغربی معاشرے میں مرد کو حاصل تھے۔ لیکن اس عرصے میں عورت بیرون خانہ ملازمت کے ساتھ ساتھ گھریلو ذمہ داریوں کو بھی نبھاتی رہی۔ عورت کے گھریلو مرکزی کردار میں کوئی کمی نہ آئی۔ خواتین کو ملازمت کے تمام تر حقوق حاصل تھے لیکن اس کے باوجود یہ بات غور طلب ہے کہ عموماً خواتین کو نچلے درجے کی ملازمتیں ملتیں اور اکثر جز وقتی ملازمتیں ہوتیں۔

تحریک نسواں ابتداء میں خواتین کے حقوق کی تحریک تھی جو ۱۹۵۰ء تک اپنے تمام قانونی حقوق حاصل کر چکی تھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد یہ تحریک بتدریج آزادی نسواں میں تبدیل ہوئی۔ یعنی مغربی عورت نے خاوند، بچوں کی پیدائش و پرورش اور گھر بار کی ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کا اعلان کیا۔ شادی اور ایک مرد سے مستقل وابستگی کا تصور ختم ہوا، آزاد جوڑے مقبول ہوئے، طلاقیں اور علیحدگی کے رجحانات بڑھے، تنہا ماؤں کا بہت بڑا گروہ وجود میں آیا، ناجائز بچوں کی کثرت ہوئی، خاندانی انتشار سے بچوں کی نگہداشت کے مسائل پیدا ہوئے۔ سیکس انڈسٹری مستقل طور پر ایک مضبوط صنعت قرار پائی۔ آزادانہ جنسی عمل سے مردانہ ہم جنس پرستی اور زنانہ ہم جنس پرستی پیدا ہوئی۔ حمل عورت کے لیے سب سے بڑی طاقت بھی ہے اور سب سے بڑی کمزوری بھی ہے۔ لیکن مغربی عورت نے حمل، ولادت اور شیر خوار کی پرورش کو عورت کی آزادی میں خلل قرار دیا۔ تحریک آزادی نسواں کے مطابق

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عورت کا گھریلو اور ماں کا کردار ختم ہونا چاہیے۔ خواتین کے بعض غالی مکاتب فکر ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ بچوں کی پیدائش خواتین کے رحم کی بجائے کسی خارج جگہ ہونی چاہیے۔ تاکہ عورت کو کامل آزادی حاصل ہو سکے کیونکہ رحم کی آزادی ہی اصل آزادی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں مانع حمل گولیاں تیار ہوئیں اور آزادانہ اختلاط کو مزید سہولتیں حاصل ہوئیں۔

اس وقت مغرب میں آزادی نسواں کے تحت تین مکاتب فکر کام کر رہے ہیں۔

نمبر ① انقلابی۔ جو پدرسری معاشرے (مرد کی حاکمیت والے معاشرے) کو عورت کے مظالم کا سبب قرار دیتے ہیں اور مرد کو عورت کا دشمن قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض اس قدر غالی ہیں، کہ ہم جنس پرست عورتوں کو ہی اصل انقلابی قرار دیتے ہیں جو مردوں سے کسی بھی قسم کے تعاون سے پرہیز کرتی ہیں۔

نمبر ② مارکسی واشتراکی مکتبہ فکر۔ یہ عورت پر ظلم کا ذمہ دار سرمایہ دارانہ معاشرے کو قرار دیتا ہے کیونکہ عورت کو گھریلو کردار کا کوئی معاوضہ نہیں دیا جاتا، اس لیے وہ سرمایہ دارانہ معاشرہ کو بدلنا ہی مسئلہ کا حل سمجھتے ہیں۔

نمبر ③ لبرل مکتب فکر۔ یہ جمہوریت پسند ہیں اور انقلابی تبدیلیوں کی بجائے معاشرتی نظم کے تحت جمہوری طریقے کے مطابق کام کرتے ہیں اور مساوات مرد وزن کے قائل ہیں۔

یہ تینوں مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ عورت مظلوم ہے لیکن وہ ظلم کے اسباب کو متعین کرنے میں اختلاف کرتے ہیں۔ کوئی اس ظلم کی وجہ عورت کی فطری جسمانی کمزوری کو قرار دیتا ہے، کوئی مردانہ معاشرے کو۔ کوئی قدیم کلچر کے رسوم ورواج یعنی عورت کا گھر بار سنبھالنے کو اصل سبب قرار دیتا ہے اور کوئی سرمایہ دارانہ معاشرے کو۔ کوئی اس ظلم کی وجہ عورت ومرد کے دائرہ کار کی تقسیم (یعنی گھریلو زندگی اور عوامی زندگی) کو قرار دیتا ہے۔

ان مکاتب فکر کے مطابق عورت کے مسائل کے حل کے لیے خاندانی نظام کا خاتمہ ضروری قرار پاتا ہے لیکن وہ اس کے حل کے لیے مختلف تجاویز رکھتے ہیں مثلاً ریاست بچوں کی اجتماعی کفالت کا بندوبست کرے۔ یا مرد وعورت مل کر گھر بار اور پرورش کے کام کو نصف ونصف سنبھال لیں، یا پیشہ ور والدین کی خدمات حاصل کی جائیں وغیرہ۔

مغربی معاشرہ میں عورت کے حقوق اور آزادی کے حوالے سے جو تحریک چلی وہ کافی سفر طے کر چکی ہے۔ لیکن اب وہ اپنے ایجنڈا کو عالمی سطح پر پھیلانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے اپنا ایجنڈا اقوام متحدہ سے بھی منظور کرالیا ہے۔ اقوام متحدہ کے بنیادی چارٹر میں یہ شق شامل کی گئی کہ عورت اور مرد کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمام حقوق برابر ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں حقوق نسواں کی مخصوص دستاویز اقوام متحدہ سے پاس ہوئی۔ ابتداء میں اس دستاویز پر چند مسلم ممالک نے دستخط کیے تاہم ۱۹۹۵ء کی خواتین کی عالمی کانفرنس کے بعد اکثر مسلم ممالک بھی اس ایجنڈے پر متفق ہو چکے ہیں۔ مسلم ممالک میں برسراقتدار مغرب زدہ طبقہ اس ایجنڈا کی تکمیل کے لیے شروع دن سے ہی سرگرم ہے۔

مغرب میں تحریک نسواں کے نتیجہ میں خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا۔ شادیاں ختم ہوئیں، طلاقیں عام ہوئیں، بچے بے راہ رو ہوئے، بزرگ بے یارومددگار ہوئے، جنسی آوارگی پھیلی، زنا بالجبر اور زنا بالرضا عام ہوئے، ایڈز کی بیماری نے سر اٹھایا، عورت اور مرد کے طبقے میں باہمی نفرت عام ہوئی۔ مردوں میں بے روزگاری پیدا ہوئی۔ عورت اور مرد جو ایک دوسرے کے فطری حلیف اور معاون تھے وہ ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ محبتیں رقابتوں اور دشمنی میں بدل گئیں۔ عورتوں میں یہ ذہنیت عام ہوئی کہ وہ مردوں کے بغیر زندگی گذار سکتی ہیں۔ (اخذ و تلخیص۔ از اسلام کا معاشرتی نظام۔ ڈاکٹر خالد علوی)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث اوّل: مسیحی یورپ میں عورت کی صورت حال

یورپ کے اخلاقی معیار کو سمجھنے کے لیے بہترین مثال عفت وعصمت اور معاشرے میں عورت کے مقام ومرتبے کا مسئلہ ہے۔ جب سے کلیسا کی رہبانیت کا خاتمہ ہوا اور فرائڈ کی اباحیت عام ہوئی، اُس وقت سے یہ مسئلہ کئی اتار چڑھاؤ کا شکار رہا اور اُس نے ایک تاریخی سفر طے کیا جو لائق ملاحظہ ہے۔

عیسائیت کی تاریخ میں کلیسا بار بار وہی اقوال دہراتا تھا جو یونانی اساطیر میں مذکور تھے یعنی زمین میں شر کا سبب عورت ہے اور اسی بات کو تحریف شدہ تورات نے زیادہ سے زیادہ گہرا کیا۔ اُس نے عورت کو مرد کی گمراہی اور غلطی کا سبب قرار دیا۔ (۴۷۸)۔ ایک کلیسا کا پیشوا اپنے شاگردوں کو کہتا ہے: جب تم کسی عورت کو دیکھو تو اُس کو انسانی یا جنگلی وجود نہ سمجھو بلکہ وہ بذات خود شیطان ہے اور تم اُس کی جو بات سنتے ہو وہ سانپ کی پھنکار ہے۔ (۴۷۹)

رای ستراتشی عورت کے حقوق کا مطالبہ کرنے والیوں میں سے ایک ہے، رہبانیت کے متعلق ایک سچی بات کرتی ہے: ''یہ نظریہ عورت پر ظلم کرتا ہے، اس نظریہ کے مطابق جنسی شہوت گناہوں میں سے سب سے زیادہ برا فعل ہے۔ عورت ایسی خطا ہے جو انسان کے سقوط کا سبب ہے اور مکمل عفت زندگی کی سب سے بڑی قدر ہے۔ عورتوں پر لعنت کرنا واجب ہے کیونکہ یہ گمراہی کا سبب ہیں۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ شیطان ہمیشہ عورت کی شکل میں ظاہر ہونے کو پسند کرتا ہے، عبادت گزاروں نے اُس کو ہمیشہ اپنی خلوت گاہوں کے اندر اسی روپ میں دیکھا ہے۔ عورت کے بارے میں محض سوچنا بھی خطرناک ہے، اس کا وجود ایک نحوست کے سوا کچھ نہیں'' (۴۸۰)

جاگیردرانہ دور میں بھی عورت کا یہی تصور عام رائج تھا جیسا کہ رانڈال نے نقل کیا ہے: ''عورت کی تربیت ایک خادمہ کی حیثیت سے کی جاتی تھی جو ازدواجی زندگی کے اُصول سیکھتی اور انتہائی کڑی شرائط کے تحت کام کاج کرتی، روکھا سوکھا کھا کر گزارا کرتی، پھٹے پرانے کپڑے پہنتی اور غلامی کی زندگی گذارتی۔ جب وہ حاملہ ہو جاتی تو اُس کے بچے کو بھی غلام بنایا جاتا۔۔۔ غلام عورت کو حیوان کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ (۴۸۱)

عیسائی جاگیردارانہ دور میں عورت کی عفت وعصمت کی بڑی قدر کی جاتی۔ عورت کی عزت اسی شرف کے بدولت ہوتی اور مردوں کی مردانگی عورتوں کی عزت وناموس کے تحفظ سے ظاہر ہوتی۔ تاریخی اعتبار سے اِن دونوں باتوں میں بڑا گہرا ربط ہے کہ جب عورت اقتصادی اور معنوی اعتبار سے کم قیمت کی حامل تھی تو اُس وقت اُس کی عزت کا شدید تحفظ کیا جاتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث دوم: انقلاب فرانس کے بعد یورپی عورت کی صورت حال

انقلاب فرانس کے قائم ہوتے ہی عورت کے قضیے کی پہلی چنگاری پیدا ہوئی۔ رائے ستراتشی کا خیال ہے کہ فرانسیسی انقلاب نے بظاہر عورت کو کوئی براہ راست فائدہ نہیں دیا لیکن اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ انسانی آزادی کا نظریہ ہر طرف پھیل گیا جس کے ضمن میں عورت کو بھی موقع ملا کہ وہ جلد یا بدیر اپنی آزادی کی بات شروع کرے۔ (۴۸۲)

اس طرح تخریب کار لوگ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو گئے، انہیں وہ موقع مل گیا جس کا انہیں مدت سے انتظار تھا۔ لیکن عورت کا مسئلہ ابھی واقعاتی دنیا میں ظاہر نہیں ہوا تھا، اِس کا عملی ظہور صنعتی انقلاب کے بعد واقع ہوا جس نے مغربی معاشروں پر بالعموم اور نچلے طبقے پر بالخصوص مصائب و آلام کے دروازے کھول دیے۔ سود خور سرمایہ داروں نے لوگوں کی بھوک و افلاس کو ناجائز استعمال کیا اور عورتوں کو انتہائی معمولی اُجرتوں پر فیکٹری میں مشغول کیا۔ اس طرح مزدور پیشہ خاندان تباہی کی لپیٹ میں آ گیا۔ عورتیں کوئلے کی کانوں میں بوجھ سے لدی ہوئی ٹرالیاں انتہائی زمین دوز مقام پر کھینچتی تھیں، بہت بھاری بوجھ کو سطح زمین پر منتقل کرتیں اور انتہائی بلند پیچ دار سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ (۴۸۳)

اِس سب کے ساتھ ساتھ فقیر عورتوں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ہوا، اُن کی معیشت نسبتاً بہتر ہوئی اور عورت کی معاشرتی قدر و قیمت میں اعتدال کا امکان پیدا ہوا۔ تخریب کاروں اور اُن کے ہم نوا پروپیگنڈا کرنے والوں نے اِس ظاہری فائدے کو خوب اچھالا اور اِس معاشرتی تبدیلی کو **عورت کی آزادی** کے نام سے موسوم کیا۔ صحافت میں یہ اصطلاح عام ہو گئی حالانکہ یہ ایک دھوکہ دہی کی علامت تھی۔ مختلف مصنفین نے اپنے اپنے مقاصد کے تحت اِس کو زیادہ سے زیادہ راسخ کیا۔ حتیٰ کہ ہارولڈ لاسکی پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ کہتا ہے: ''عورتیں اپنی پابندیوں سے اُس وقت آزاد ہوئیں جب صنعتی انقلاب نے اُن کی اقتصادی کوششوں کو معاشرے کے لیے ایک پسندیدہ اور قابل قدر مظہر کے طور پر متعارف کروایا۔ اُن کی کوششوں کا اعتراف کیا گیا اور اُن کے لیے مختلف کام کاج کے دروازے کھول دیے گئے جن میں اُن کا داخلہ محال سمجھا جاتا تھا۔ دکانوں اور فیکٹریوں میں محنت کرنے والیوں اور کام کاج کرنے والیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اور اِس اضافے نے عورت کو سیاسی پابندیوں سے آزاد ہونے کی بھی راہ دکھلائی۔ اُن کے اقتصادی مفادات میں تھا کہ قانون ساز ادارے حتیٰ کہ پولیس کا شعبہ بھی اُن کے لیے ممنوع نہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے۔ اِس معاملے پر پچاس سال تک لوگوں کے مابین بحث مباحثہ ہوتا رہا اور وہ معاملے کی خطرناکی نہ سمجھ سکے۔ اسی دوران یورپ میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور اُس نے عورت کی اقتصادی حیثیت کو مزید واضح کیا۔ اب مردوں کے اختیار میں یہ نہ رہا کہ وہ عورت کے حق میں اٹھنے والی آواز سے منہ پھیر سکیں جبکہ عورتوں نے جنگ کے اندر ایک اچھا اقتصادی کردار ادا کیا تھا''۔ (۴۸۴)

یہ وہ تصویر ہے جو بعض مصنفین نے پیش کی ہے لیکن معاملے کی عملی صورت حال اِس سے یکسر مختلف تھی چنانچہ کچھ لوگوں نے عورت کے حوالے سے پیدا ہونے والے خطرات کی نشان دہی کی اور اُس پر آواز اٹھائی حتی کہ اُن میں کچھ عورتیں بذات خود شامل تھیں:

ایک انگریز مصنف عورت ''انی روڈ'' اس بارے میں کہتی ہے: جب ہماری بیٹیاں گھروں کے اندر خادموں کی طرح کام کرتی ہیں تو یہ زیادہ بہتر ہوتا ہے بہ نسبت یہ کہ وہ فیکٹریوں میں مشغول ہوں، مصائب میں مبتلا ہوں اور ایسی غلاظت میں ملوث ہوں جو اُن کی زندگی کی رونق کو ہمیشہ کے لیے لے جائے۔

کاش ہمارے شہر مسلمانوں کے شہروں کی طرح ہوتے اور ہماری عورتوں کی حیا، عفت اور پاکیزگی ویسے ہوتی جیسے مسلمانوں کی لونڈیوں اور خادموں کی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی عورتیں حتی کہ خادمائیں بہترین زندگی کے مزے لوٹتیں۔ وہ گھروں کے بچے سنبھالتیں اور اُن کی عزت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ ہاں انگلستان کے شہروں میں یہ ذلت ناک واقعہ ہوا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اخلاق رذائل کے حوالے کرتے ہیں اور اُن کو مردوں کے ساتھ بکثرت اختلاط کا موقع دیتے ہیں۔ ہم کیوں نہیں سمجھتے کہ ہماری بیٹیاں اپنی طبعی فطرت کے مطابق کام کاج کریں جیسا کہ آسمانی ادیان کا طریقہ کار ہے اور مردوں والے کام مردوں کے سپرد کیے جائیں تاکہ عورت کا شرف محفوظ کیا جا سکے۔ (۴۸۵)

ایک اور مصنفہ ''الادی کوک'' بھی یہی بات کہتی ہے:

عورتوں سے اختلاط مردوں کو محبوب ہے، اسی وجہ سے عورت نے اپنی فطرت کے برخلاف لالچ کا اظہار کیا۔ وہ جتنا زیادہ اختلاط میں داخل ہوتی چلی گئیں، اتنا ہی زنا سے پیدا ہونے والے بچے زیادہ ہوتے گئے۔ اس قسم کی صورت حال میں عورتوں پر جو مصائب نازل ہوئے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ میں لڑکیوں کے والدین سے کہتی ہوں، تمھیں اُن چندنکوں سے دھوکہ لاحق نہ ہو جو تمہاری بیٹیاں فیکٹریوں وغیرہ میں محنت مزدوری کر کے کماتی ہیں، اُن کا انجام وہ ہوتا ہے جو ہم بیان کر چکے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو یہ بات سکھلاؤ کہ وہ مردوں سے دور رہیں کیونکہ اعداد و شمار ہمیں بتلاتے ہیں کہ زنا سے پیدا ہونے والے مسائل بہت گھمبیر اور سنگین ہوتے ہیں اور یہ اُس وقت پیدا ہوتے ہیں جب مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط بکثرت واقع ہو۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ زنا کی اکثر اولاد اُن ماؤں کی وجہ سے ہے جو فیکٹریوں میں مشغول رہتی تھیں اور گھروں میں نوکرانیاں ہوتی تھیں، یا وہ معزز خواتین تھیں جو مردوں کی نظروں کا نشانہ بنتی تھیں۔ اگر ڈاکٹر حضرات اسقاط حمل کی دوائیاں نہ دیتے ہوتے تو یہ اعداد و شمار کہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑھ کر ہوتے۔ ہمیں موجودہ صورت حال نے ایک ایسی پستی میں داخل کر دیا ہے جو ہمارے وہم و گمان میں نہ تھی۔ حتی کہ ہمارے بعض علاقوں کے مرد اُس لڑکی کو قبول نہیں کرتے جو تجربہ کار نہ ہو یعنی اُس کے ہاں زنا سے پیدا شدہ اولاد نہ ہو۔ یہ شہری زندگی کی پستی کی انتہا ہے۔ یہ عورت پر الم زندگی کے کتنے کڑوے گھونٹ بھر کر اپنے بچوں کی کفالت کرتی ہوگی اور بچوں کا باپ، وہ نہ بچوں کو دیکھتا ہے اور نہ اُن کی کوئی پابندی قبول کرتا ہے۔ کیسی افسوس ناک صورت حال ہے کہ سخت گرمی کے دنوں میں اور سر چکرانے کی حالت میں اُس عورت کا کوئی ہمدرد نہیں ہوتا؟ حمل کی تکلیف اور شیر خوارگی کے مسائل میں کوئی اُس کا ساتھ نہیں دیتا۔ (۴۸۶)

ایک ماہر اخلاق مصنف لکھتا ہے:

وہ نظام جو اپنی عورتوں کو فیکٹریوں اور صنعتوں میں مصروف رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے، وہ نظام چاہے جتنی بھی دولت پیدا کر لے پھر بھی اُس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ گھریلو زندگی کی عمارت تباہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ یہ نظام گھریلو ڈھانچے کو نشانہ بناتا ہے، خاندان کے ارکان توڑتا ہے اور معاشرتی تعلقات بکھیرتا ہے۔ جب یہ نظام خاوند سے بیوی کو چھینتا ہے تو یہ اپنے خاص طریقے کے ساتھ عورت کے اخلاق کو کمزور کرتا ہے کیونکہ عورت کا حقیقی وظیفہ گھریلو ذمہ داریوں کی ادائیگی ہے جیسے بچوں کو سنبھالنا، گھر کی نگہداشت، گھریلو ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ معاشی وسائل میں میانہ روی اختیار کرنا وغیرہ۔ فیکٹریاں عورتوں سے یہ سب ذمہ داریاں چھین لیتی ہیں، گھر گھر نہیں رہتے، بچے غیر حقیقی طریقے پر تربیت پاتے ہیں اور اُن کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ عورت! یک خوش مزاج بیوی اور محبت کرنے والی دوست نہیں رہتی بلکہ وہ محنت اور مزدوری کے مقام کی ساتھی بن جاتی ہے۔ (۴۸۷)

بعض مفکرین کی یہ واضح انتباہ یورپی معاشرے کی عملی صورت حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکی بلکہ اس سے شریر قوتیں چوکنی ہو گئیں اور انھوں نے اِن اعتراضات کو ختم کرنے کے لیے غیر فطری متبادل ایجاد کیے۔ مثلاً زنا سے پیدا ہونے والے بچوں کے لیے نرسریاں اور چلڈرن ہاؤس بنائے گئے، قسم قسم کی مانع حمل ادویات پیدا کی گئیں تاکہ جنین کو گرایا جا سکے۔ تخریب کار اتنے طاقت ور ہو گئے کہ انھوں نے خواتین کی تعلیم کو ایک عملی واقعہ بنا دیا اور یہ ایک ایسا قدم تھا جس سے واپس پلٹنا ممکن نہیں تھا۔ یورپی خواتین کا اقتصادی مسائل کے حل میں اک نمایاں کردار تھا لہٰذا جلد بازی میں عورت کے حقیقی مسائل کے بجائے ثانوی مسائل کو اجاگر کیا گیا مثلاً خواتین مصنفین نے مطالبہ کیا کہ اُن کی اجرتیں مردوں کے برابر ہوں، نظام تعلیم اور اسمبلی کی نشستوں کے اندر اُن کو برابر کا حصہ دیا جائے وغیرہ۔ عورت کا حقیقی مسئلہ یعنی وہ گھر سے باہر نہ نکلے بالکل بھلا دیا گیا اور کوئی بھی اس پر بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔

مختلف مصنفین اور صحافی صورت حال پر فلسفیانہ نظر ڈالنے لگے اور مزید اصلاح کا مطالبہ کرنے لگے چنانچہ برٹرینڈ رسل کہتا ہے:

جن کو لوگ 'مذکر' یا 'مونث' کہتے ہیں، مجھے اُن میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ ہاں وہ عورت جو چھوٹے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بچوں کی نگہداشت کرتی ہے، اُس کے لیے بہتر ہے کہ اُس کی محنت کے بدلے میں اُس کو ایک معین پیسوں کی مقدار ادا کی جائے۔ لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت اور مرد میں فرق ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان فرق صرف اتنا ہے جیسے ایک کاشت کار اور ایک آٹا پیسنے والے کے درمیان۔ یہ فرق کسی بھی حالت میں اساسی نہیں، اور موجودہ صورت حال میں اِس کا اعتبار بھی نہیں کیا جائے۔ (۴۸۸)

مطالبات پروان چڑھتے رہے حتی کہ خواتین لکھاریوں نے اِس بات کا بھی مطالبہ کیا کہ عورتوں کو فسق وفجور میں بھی مردوں کے برابر حقوق دیے جائیں۔ وہ اُس معاشرے پر لعنت بھیجتی تھیں جو لڑکی کے زنا کو بُری نظر سے دیکھے اور لڑکے کے زنا سے چشم پوشی کرے۔ رسل یہ بھی کہتا ہے: ''یہ بات لازم ہے کہ جنس کو شروع سے ہی ایک فطری، پسندیدہ اور شاندار چیز کی حیثیت سے سمجھایا جائے اور اگر ہم اِس کے خلاف چلیں گے تو ہم عورت مرد اور والدین وبچوں کے درمیان تعلقات کو مسموم کر دیں گے''۔

وہ نیکی جو جہالت پر مبنی ہو کسی قدر وقیمت کی حامل نہیں۔ عورتوں کو جنسی معلومات حاصل کرنے کا اُسی طرح حق ہے جس طرح مردوں کو۔ (۴۸۹)

جنس کی محبت کی تعلیم ایک اساسی چیز ہے غیرت کا معاملہ درست نہیں جو چند مخصوص حقوق پر خواہ مخواہ کا اصرار ہے۔ بلکہ غیرت ایک المیہ ہے اور اس شخص پر ظلم ہے جو غیرت کا ہدف بنتا ہے۔ (۴۹۰)

رسل دوسری کتاب میں اِس کی مثال دیتا ہے: ''نیویارک اسٹیٹ کے اندر جہاں زنا کو ایک جرم سمجھا جاتا ہے، کی سزا قید مقرر کی گئی۔ یہاں پر کوئی مؤثر تحریک کھڑی نہیں ہوئی جو اِس قانون کو بدل سکے۔ بہت سارے لوگ کہتے ہیں کہ اس قانون سے کوئی خطرہ نہیں جس کو لاگو نہیں کیا جاتا۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔۔ یہ بات درست ہے کہ اِس قانون پر بالعموم عمل درآمد نہیں ہوتا لیکن اِس سے یہ ممکن ہے کہ کسی خاوند کو جوش آجائے اور اُس کی انتقامی روح بھڑک اٹھے۔ (۴۹۱)

وہ شخص جس کا حیا وعفت جیسی اخلاقی اقدار ختم کرنے میں سب سے زیادہ اثر تھا اور جس نے تاریخ اخلاق کے اندر ایک گہرے ترین بحران کا آغاز کیا، فوجی رولا (۴۹۲) کے بیان کے مطابق فرائڈ اور اس کا نظریہ تحلیل نفسی تھا۔ فلوجل کہتا ہے: ''حق بات تو یہ ہے کہ بعض تحلیل نفسی کرنے والے اس بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ وہ تمام رواجی رکاوٹیں جن کو ہمارے اخلاقی معیارات لازم کرتے ہیں، اِنسانی فطرت پر خواہ مخواہ کا بوجھ ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اناڑی اور جذباتی لوگوں نے ہر قسم کے نظام اور ضابطے سے یکسر علیحدگی کی دعوت دی، چاہے وہ تعلیم کا میدان ہو یا جنسی تعلقات کا یا اِس کے علاوہ کوئی میدان۔ یہ انحراف اتنا بڑھ گیا کہ والدین اپنے بچوں پر کئی قسم کی نگرانیاں کرنے لگے اور فکر مند ہوئے۔ انہیں ڈر تھا کہ اُن کے بچے جذبات کچلنے یا اعصابی امراض کی وجہ سے مسائل کا شکار ہو جائیں گے۔

وہ کہتا ہے: ''تحلیل نفسی جذبات کے اندر افراط، غلط فہمی اور غلط طرز عمل پیدا کرتی ہے۔ لیکن اِس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ساتھ ساتھ وہ عملی طور پر روایتی اخلاق توڑنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ اُس نے انسان کے اندر اخلاقی نظم وضبط کی غیر معمولی باتوں کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ (۴۹۳)

جاڈنامی مفکر کہتا ہے:

تحلیل نفسی کے نظریے نے زندگی کے انہماک اور لذت افروزی کے متعلق انسانی موقف پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ بات زیادہ درست ہے کہ تحلیل نفسی کا اثر براہ راست ہے اور مروجہ اخلاقی حدود وقیود کے متعلق کسی شک و شبہ کی وجہ سے نہیں۔ یعنی تحلیل نفسی زندگی کی سادگی ومیانہ روی کے متعلق قدیم رجحانات پر فقط اعتماد ہی نہیں کھوتی بلکہ وہ ایک مستقل ایجابی مکتبہ فکر بھی ہے جو لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ موجودہ زندگی میں جییں اور زندگی کے تجربات میں مکمل طور پر منہمک ہو جائیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ ہم آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے ہر قسم کی پابندیاں ترک کر دیں بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ ہم پر واجب ہے کہ ہم لذات کو خوب تلاش کریں، اُن میں ڈوب جائیں اور روح کے معاملات سے غافل ہو جائیں۔ تحلیل نفسی اِس ایجابی عقیدے کی ذمہ دار ہے جو نفس انسانی کی ماہیت بتلاتی ہے۔ فرائڈ کی یہ تعلیم تھی کہ فطری جذبات کا گلا گھونٹنا اور شعوری خواہشات کو کچلنا، انسانی شخصیت کے لیے نقصان کا باعث ہے اور اِس کے انتہائی عمیق اثرات ہوتے ہیں۔

بلکہ پاکیزگی کے وہ تصورات جو زہد وفقر پر مبنی ہیں، نفس کی محرومی کو عظیم فضیلت سمجھتے ہیں اور نفس کو ضابطوں کا پابند بناتے ہیں، فرائڈ کے نزدیک یہ سب باتیں لاشعوری محرکات ہیں۔ محروم لوگوں اِن طفل تسلیوں کے ذریعے اپنی محرومیوں کا جواز تراشتے ہیں۔ جو لوگ دنیا کی لذتیں اور مفادات حاصل نہ کر سکیں وہ لاشعوری طور پر خود کو اِسی طرح سے مطمئن کرتے ہیں۔ (۴۹۴)

فرائڈزم کی وجہ سے اخلاقی اقدار کو جو نقصان لاحق ہوا اور اباحیت کی دعوت عام ہوئی، وہ بالکل واضح ہے۔ ہم اس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں جو ''توجیہ المراھق'' کے مصنف نے ذکر کی ہے:

''لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان مخلوط تعلیم کو تقویت دینی چاہیے۔ لڑکیوں کو بتلانا چاہیے کہ جسمانی کھیل کود میں شرکت کرنے سے اُن کی مستقبل کی ولادت کی صلاحیت متاثر نہیں ہوتی اور اُن کو لڑکوں کے ساتھ روزانہ برابری کی بنیاد پر تعلقات قائم کرنے چاہیے۔ وہ کلاس روم کے اندر ایک دوسرے کو دیکھیں، کھیلیں اور ڈراموں میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک ہوں بلکہ ایک جیسے موضوعات کی تعلیم حاصل کریں۔ اس طرح سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع حاصل کر سکیں گے۔ وہ ایک دوسرے کو محض سطحی نظر سے نہ دیکھیں اور اُن کا باہمی تعلق محض جسمانی انگیخت، عقلی کمزوری اور روحانی جمود پر مشتمل نہ ہو۔ لڑکوں کو چاہیے کہ وہ لڑکیوں کو اپنی کلاس فیلوز اور دوست کی حیثیت سے دیکھیں اور اسی طرح وہ لڑکیاں جن کی تربیت اچھی ہو چکی ہے وہ بھی لڑکوں کو امانت داری کے ساتھ اچھے طریقے سے سمجھ سکیں گی۔

آپ دیکھیں گے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان یہ تعارف ہر اعتبار سے درست ہے۔ آج کی دنیا میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مرد اور عورت اکھٹے کام کاج کرتے ہیں اور پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اور یہ اس وقت تک آسان نہیں جب تک وہ ایک دوسرے کو سمجھ نہ لیں۔ اگر مرد اور عورت میں سے ہر جنس اپنے دور شباب میں دوسری جنس سے الگ تھلگ رہے گی تو اُن کے اندر ایسے خیالات اور اوہام جنم لیں گے جو دونوں جنسوں کے متعلق غیر صحت مند فرق پر مبنی ہوں گے۔

جب لڑکوں اور لڑکیوں میں باہمی تعارف مضبوط ہوتا ہے تو اُن کے اندر کافی خیالات دوڑتے ہیں۔ یہ خیالات نقصان دہ نہیں ہوتے بلکہ اِس کے برعکس یہ اُن کو فتنوں سے بچاتے ہیں کیونکہ وہ اِس طریقے سے بہتر شریک حیات تلاش کر سکتے ہیں۔

لڑکوں اور لڑکیوں کا مذکورہ باہمی تعلق کبھی کبھار خالص اخلاقی نقطہ نظر سے گرا ہوا بھی ہوتا ہے۔ لیکن نوجوان پوری قدرت رکھتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ اِس قسم کا رویہ اُن کی زندگی کی مصلحت کے موافق نہیں۔ (۴۹۵)

مرد و زن کے اختلاط کی یہ آگ بھڑکتی چلی گئی حتی کہ اس ہولناک دعوت نے ثقافت اور میڈیا کے تمام وسائل پر قبضہ کر لیا، معاشرتی رواج اور عرف و عادت مغلوب ہو گئے۔ حتی کہ اخلاقی انحطاط اور اقدار کی شکست وریخت اس درجے کو پہنچ گئی کہ ''امریکیوں کے نزدیک جو لڑکی کنواری رہے اُسے کینسر کے مرض کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ لہٰذا جلد از جلد کنوارے پن سے نجات حاصل کرنی چاہیے''۔ اس طرح سے جنسی انحراف اتنا بڑھ گیا کہ تین سالہ یا اِس سے کم عمر بچوں کے ساتھ جنسی تجربہ کیا جانے لگا۔ اُن کو مختلف جگہوں سے اغوا کر کے غلاموں اور مرغیوں کی طرح بازاروں میں بیچا گیا۔ (۴۹۶)

پرائمری سکولوں کے طالب علم اپنی یومیہ تعلیمی سرگرمیوں کے درمیان سینموں کے اندر جنسی مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اُن کے تعلیمی بستوں میں شدید نشہ آور اشیا ہوتی ہیں۔ میاں بیوی کی باہمی خیانت اتنا زور پکڑ چکی ہے کہ کوئی شخص اِس کا انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سے لڑکیاں زنا کاری اور ناجائز تعلقات اپنے ماں باپ اور معاشرے کی آنکھوں کے سامنے سرانجام دیتی ہیں، جیسے یہ کوئی تفریحی کام ہو۔

یہ مغرب کا عملی مشاہدہ ہے کہ وہاں پر اخلاقی خصوصاً عزت و ناموس کا انحطاط بے ہودگی اور لچرپن کی ایسی انتہا کو پہنچ چکا ہے جس کی کوئی مثال حیوانوں تک میں نہیں۔

کوئی کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ مغرب کی نظر میں اخلاق کا مسئلہ سرے سے کوئی مسئلہ ہی نہیں لہٰذا یہ کہنا فضول ہے کہ لادین معاشرہ بغیر اخلاق کے زندگی گذار رہا ہے کیونکہ معاشرہ اس میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ اگر ''اخلاق'' کلیسا کی لاگو کردہ حدود و قیود اور زراعتی دور کے بے کار رسوم و رواج کا نام ہے تو ایسے اخلاق سے علیحدگی ہی اچھی ہے۔

لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ مسئلہ فقط اخلاق کی پامالی اور رسوم و رواج کی مخالفت تک محدود نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھ چکا ہے۔

ڈاکٹر الیکسس کارِیل کا خیال ہے کہ موجودہ تہذیب کی گراوٹ کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ لوگ اُن قوانین طبعی کی مخالفت کرتے ہیں جن کو اسلامی زبان میں اللہ تعالیٰ کی کائناتی سنتیں کہا جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی متعین کردہ سنتوں اور قوانین کو نہیں پھلانگ سکتے کجا کہ وہ اُس کے آثار بد سے نجات حاصل کرلیں۔ (۴۹۷)

اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر لوگوں کو پیدا کیا ہے اُس کی خلاف ورزی لازمی طور پر معاشرے کی خوش بختی اور امن وسکون پر اثر انداز ہوگی۔ یہی اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کا مطلب ہے۔

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ﴾

(طٰہٰ۔۲۰/۱۲۳)

اب تمھارے پاس جب کبھی میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے نہ تو وہ بہکے گا نہ تکلیف میں پڑے گا۔

پوری تاریخ انسانیت کے اندر گمراہی بدبختی اور بے چین زندگی کی وہ مثال نہیں ملتی جو موجودہ مغربی تہذیب پیش کررہی ہے۔

مغربی عقلا چلّا رہے ہیں، مصیبت کے مارے گڑگڑا رہے ہیں اور یہی ان کے لائق ہے۔ وہ اپنی تہذیب کے انحطاط اور اپنے معاشرے کے بحران کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مغرب کے بعض لوگ جانتے ہیں کہ فطرت کی خلاف ورزی، مامتا کے وظیفے کو معطل کرنا اور زندگی کے معرکے میں مرد وزن کا اختلاط معاشرتی تباہی اور تیز رفتار انحطاط کا بہت بڑا سبب ہے۔

سپنگلر اپنی مشہور کتاب، ''مغربی تہذیب کا انحطاط'' میں کہتے ہیں:

جب کسی عظیم المرتبت ثقافت اور علوم کی حامل قوم غور وفکر کرتی ہے کہ بچوں کی نجابت کا اعتبار کس طرح سے کیا جائے اور اس کی اہمیت اور وجوہات کیا ہوسکتی ہیں تو اُس وقت اُس قوم کے بڑے بڑے نقطہ ہائے نظر سامنے آتے ہیں۔۔۔ جب ہمیں ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ہم زندگی کے کسی مسئلے کے اسباب اور وجوہات تلاش کریں تو ہمارے سامنے زندگی بذات خود مشکوک ہوجاتی ہے اور ایک سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔۔۔ جیسا کہ ہمارے مغربی لوگوں کے شہروں کی صورت حال ہے۔ ہم لوگ کسی بھی لڑکی کو تلاش کریں تو ہم اُس کے اندر بچوں کی ماں والی خصوصیات تلاش نہیں کرتے جبکہ کسانوں اور ابتدائی لوگوں کا طریقہ تھا کہ وہ اپنی رفیقہ حیات کے چناؤ میں اِس کو بنیادی حیثیت دیتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی مشکل ہے۔ ابسن (Ibsen۔۱۹۰۶ء) کے نزدیک شادی ایک بہت ترقی یافتہ ملاپ ہے جس میں دونوں فریق مکمل طور پر آزاد ہوتے ہیں۔۔ اسی طرح ''شو'' کے خیال کے مطابق عورت اُس وقت تک اپنے مؤنث ہونے سے آزاد نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنے خاوند، بچوں، معاشرہ، قانون اور کسی بھی انسان کے مقابلے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتی رہے۔ وہ اُس وقت آزاد ہوگی جب وہ صرف اپنی ذات کا احساس کرے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسان عورت ایک ماں ہوتی تھی اور اُس کی مکمل ذمہ داری جو وہ اپنے بچپنے سے سیکھتی تھی، ماں کے لفظ میں مضمر ہے۔ لیکن ہم آج ابسن کی عورت کو دیکھتے ہیں جو دوست، گرل فرینڈ اور ساتھی ہے اور تمام عالمی شہروں کے ادب و آداب کی حامل ہیروئن ہے جو شال کے ڈراموں اور پیرس کے افسانوں جیسی ہے۔ یہ بچوں کی ماں کیسے ہوسکتی ہے، اُس کے اپنے نفسیاتی تناقض بے شمار ہیں۔ شادی ایک فن ہے جس میں باہمی افہام و تفہیم کے ساتھ اپنے ہدف کو مکمل مہارت کے ساتھ حاصل کیا جاتا ہے۔

بچوں کی اخلاقی تربیت و نجابت کا مسئلہ مغرب کا حقیقی مسئلہ ہے، یہ امریکی خاتون کا مسئلہ ہے جو کسی بھی قیمت پر کسی بھی تقریب میں حاضری ترک کرنے کے لیے تیار نہیں، یہ پیرس کی معزز عورت کا مسئلہ ہے جو ڈرتی ہے کہ اُس کا عاشق اُس کو چھوڑ کر چلا نہ جائے یا ابسن کی ہیروئن کا مسئلہ ہے جو اپنی ذات کے علاوہ کسی کو توجہ کے قابل نہیں سمجھتی۔ ان سب کا مسئلہ ایک ہی ہے کہ یہ اپنی ذات کو اہمیت دیتی ہیں اور بچوں کی اخلاقی تربیت کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام ہیں۔ یہی صورت حال اسکندریہ کی ہے، یہی رومی معاشرے کی تھی اور بدیہی طور پر یہی صورت حال ہر متمدن معاشرے کی ہے۔

---جب معاشروں کا معیار اس طرح کا بن جائے تو شہری ادب و آداب پستی اور تناقض کے مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں، وہ آبادیوں کے لیے خطرہ ہوتے ہیں اور یہ مرحلہ کئی صدیوں تک جاری رہے تو انسانی تہذیب کی عمارت کمزور ہو جاتی ہے اور مکمل طور پر مٹ جاتی ہے۔ (۴۹۸)

سپنگلر کی یہ امیدیں کوئی بدفال یا نحوست پر مبنی نہیں بلکہ جدید صورت حال یقین کی حد تک اس کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس کی مخلوق میں جاری ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

ہم پچاس سال پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں جبکہ یہ آگ اتنی زیادہ نہیں بھڑکی ہوئی تھی اور مسئلہ ابھی مختلف مراحل میں محو سفر تھا۔ ہم ایک امریکی فلسفی مصنف کو دیکھتے ہیں جو اس مسئلے پر چیخ و پکار کرتا ہے اور قوم کو لاحق خطرات اور انجام سے ڈرانے کے لیے اپنی آواز بلند کرتا ہے۔ یہ ول ڈیورانٹ ہے جس نے ۱۹۲۹ میں کہا تھا:

---ہماری آج کل کی ثقافت سطحی ہو چکی ہے اور ہماری عمومی معلومات کمزور ہیں کیونکہ ہم بڑے بڑے آلات استعمال کرنے میں امیر ہیں لیکن اپنے اغراض و اہداف میں فقیر ہیں۔ وہ عقل کی پختگی چلی گئی جو دین و ایمان کی حرارت سے پیدا ہوتی تھی، علم نے ہم سے بلند پایہ اخلاقی بنیادوں کو چھین لیا۔ پوری دنیا بے چینی و بے قراری میں غرق ہے جو ہمارے اخلاقی انتشار کو ظاہر کرتی ہے۔ ہم اِس وقت دوبارہ اُس مشکل کا سامنا کر رہے ہیں جس نے سقراط کے دل کو بے چین کیا تھا یعنی کیسے اُس فطری اور طبعی اخلاق کو ڈھونڈا جا سکے جو طاقتور انسانی نظم و ضبط کا قائم مقام ہو سکے جس کا اثر لوگوں کی زندگیوں میں ختم ہو گیا ہے۔ ہم اس بے ہودہ فساد کے ساتھ اپنے معاشرتی ورثے کو بکھیرتے چلے جا رہے ہیں یا دوسرے لفظوں میں انقلابی جنون میں مبتلا ہیں---ہم اپنے امن و سکون کے مثالی رویے کو ترک کرتے جا رہے ہیں اور جنگ کی اجتماعی خودکشی میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ ہمارے پاس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ایک لاکھ سیاست دان ہیں لیکن ایک بھی عقل مند انسان نہیں۔ ہم زمین کے اردگرد اتنی تیزی سے چکر لگاتے ہیں جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی لیکن ہم نہیں جانتے کہ ہم نے کہاں جانا ہے اور ہم اس پر غور بھی نہیں کرتے۔ ہم نہیں جانتے کہ ہمارے بے چین نفوس کے لیے شفا بخش سعادت کہاں ہے۔ ہم تو اپنی قوت کے نشے میں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور ہم حکمت کے بغیر اس سے نجات بھی حاصل نہیں کر سکتے۔

مانع حمل ادویہ کی ایجاد اور اُن کا پھیلاؤ ہمارے اخلاق کی تبدیلی میں براہ راست ایک سبب ہے۔ قدیم دور کا اخلاقی قانون شادی کے ذریعے جنسی تعلقات کو محدود کرتا تھا کیونکہ نکاح سے باپ ہونے کی ایسی ذمہ داری حاصل ہوتی تھی جس سے بچنا ممکن نہیں۔ لیکن اب جنسی تعلق اور تناسل کے درمیان رابطہ منقطع ہو چکا ہے اور ایک ایسا موقف اپنایا گیا ہے جس کی توقع ہمارے آباو اجداد نہیں کر سکتے تھے جس کے نتیجے میں مرد اور عورت کے درمیان تمام تر تعلقات تبدیل ہو رہے ہیں۔ اخلاقی قانون کے ذمے ہے کہ وہ اُن جدید آسانیوں پر نظر رکھے جو ہماری گہری خواہشات کو پورا کرنے کے لیے نت نئی ایجادات میدان عمل میں لا رہی ہیں۔

شہری زندگی جنسی تعلق کو ابھارنے والے وسائل مہیا کر رہی ہے اور جنسی راستے ہموار کر رہی ہے جس کی وجہ سے عام لوگ شادی سے دور بھاگتے ہیں۔ جنسی نشوونما پہلے کی بہ نسبت جلد مکمل ہو جاتی ہے اور اقتصادی نشوونما دیر سے مکمل ہوتی ہے۔ زرعی معاشرے کے اندر خواہش کو کچلنا عملی طور پر ممکن اور معقول تھا لیکن اب یہ مشکل اور غیر فطری محسوس ہوتا ہے کیونکہ معاشرہ صنعتی بن چکا ہے جو شادی کو عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں کے لیے بھی موخر کر رہا ہے حتیٰ کہ مرد لگ بھگ تیس سال کی عمر میں شادی کرتے ہیں۔ قدیم دور کی بہ نسبت ضبط نفس کی قوت کمزور ہو گئی ہے اور وہ عفت جو ایک خوبی شمار ہوتی تھی اب مذاق کا نشانہ بنتی ہے۔ وہ حیا جو خوبصورتی میں اضافہ کرتی تھی، چھپتی جا رہی ہے۔ اب مرد حضرات اپنے گناہوں کی تعداد پر فخر کرتے ہیں اور عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ جانبازیوں اور مہم جوئیوں کا مطالبہ کرتی ہیں۔ شادی سے قبل تعلقات ایک عام دطیرہ بن گیا ہے۔ باغی عورتیں اپنی ہم مزاج عورتوں سے مقابلہ بازی کی وجہ سے کھلے عام سڑکوں پر ظاہر نہیں ہوتیں لیکن وہ پولیس سے بھی نہیں ڈرتیں۔ زرعی اخلاقی قانون کے اجزا بکھر گئے ہیں اور جدید شہروں میں اُن کا سکہ نہیں چلتا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ فطرت نے ہمیں صرف ایک شادی پر اکتفا کے لیے تیار نہیں کیا۔ بعض لوگوں کا یہ طریقہ کار ہے کہ وہ نت نئی جنسی تفریحات کو خریدتے ہیں اور اُس سے اپنی اکتاہٹ کو ختم کرتے ہیں۔ ان تمام شرور کی وجہ ہمارے گمان کے مطابق ازدواجی زندگی میں غیر فطری تاخیر اور شادی کے بعد دیگر اباحتوں کی خواہش ہے جو غالباً تعدد کا اثر ہے۔ ہم اِس کی مختلف معاشرتی اور حیاتیاتی وجوہات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس سے مفر نہیں۔ موجودہ دور میں عام مفکرین کی مشہور رائے یہی ہے۔ لیکن یہ بات بڑی خجالت والی ہے کہ ہم اُن نصف ملین امریکن خواتین سے خوشی کے ساتھ راضی ہو جائیں جو اپنے نفس کو اباحیت کی قربان گاہ پر قربان کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہم پر کھلے عام ڈراموں اور ادبی کتابوں میں پیش کیا جاتا ہے جو مال کمانے کے لیے تیار کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جاتی ہیں، جو محروم مردوں اور عورتوں میں جنسی خواہشات کو ابھارتے ہیں حالانکہ وہ ایک مصنوعی انارکی کی لپیٹ میں ہوتے ہیں۔

تصویر کا دوسرا رخ کم دردناک نہیں کیونکہ ہر شخص شادی کو لیٹ کرتا ہے اور وہ راہ چلتی لڑکیوں کو دوست بناتا ہے حالانکہ یہ ظاہری طور پر انتہائی بے راہ رو ہوتی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ پوری دنیا نے خواہشات کو ابھارنے اور ان کو اَسیر کرنے کے لیے ہر وہ طریقہ گھڑ لیا ہے جس کا تصور ممکن ہے۔ (۴۹۹)

ہمارا زیادہ گمان یہ ہے کہ نت نئی لذتوں پر متوجہ ہونے کی وجہ ڈارون کے وہ حملے ہیں جو اس نے دینی عقائد پر کیے اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے عریانی کی راہ اختیار کی ہے۔ مال و دولت نے لوگوں کو یہ جرأت بخشی کہ وہ سمجھنے لگے کہ دین اُن کی لذتوں میں روڑے اٹکاتا ہے۔ انھوں نے جدید علم کے اندر ایسے ہزار اسباب تلاش کیے جن کے ذریعے دین کو رسوا کیا جا سکتا ہے۔ جنسی زندگی کی رکاوٹوں کے نتیجے میں ادب اور نفسیات میں ایک رد عمل ظاہر ہوا جو جنس کو زندگی کے مترادف قرار دے رہا ہے۔ قدیم دور میں الٰہیات کے علما اِس مسئلے میں جھگڑا کرتے تھے کہ نوجوان لڑکی کے ہاتھ کو چھونا گناہ ہے یا نہیں؟ لیکن اب ہم دہشت زدہ ہو جاتے ہیں جب ہم اِس بات کو جرم قرار دیتے ہیں کہ لڑکی کے ہاتھ کو دیکھا جائے اور اُس کو بوسہ نہ دیا جائے۔ لوگوں کا ایمان مفقود ہو چکا ہے اب وہ قدیم احتیاطوں سے فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں اور بے ہودہ تجربات کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی جنگ عظیم اس تبدیلی کی ایک اور بڑی وجہ ہے۔ جنگ نے اُس پر امن زندگی کو ختم کر دیا جو صنعت اور تجارت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہی تھی۔ جنگ نے فوجیوں کو وحشت اور اباحیت کا عادی بنا دیا حتی کہ جب جنگ ختم ہو گئی تو ہزاروں فوجی اپنے علاقوں کی طرف واپس آئے اور اُن کے ساتھ اخلاقی خرابیوں کے انبار تھے۔ جنگ نے انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو ہلکا کر دیا اور ایسے جرائم پیشہ ٹولے تیار کیے جو نفسیاتی بیماریوں کے حامل تھے۔ جنگ نے مذہبی ایمان کو تہ تیغ کیا اور انسانی ضمیر سے دینی عقیدے کی سند چھین لی۔ خیر اور شر کے معرکے ختم ہونے کے بعد ایک ایسی فریب خوردہ نسل تیار ہوئی جس نے اپنے آپ کو آوارگی، فرد پرستی، اخلاقی بے راہ روی کے سپرد کر دیا۔ اب حکومتیں ایک رخ پر ہوتی ہیں اور عوام دوسرے رخ پر۔ مختلف طبقات میں کشمکش چھڑ گئی اور مختلف صنعتیں عام لوگوں کی مصلحت سے صرف نظر کر کے نفع آوری کو اپنا اصل ہدف بنانے لگیں۔ مرد حضرات ذمہ داری کے ڈر سے شادی سے دور بھاگنے لگے اور عورتیں یا تو مکمل غلام بن گئیں یا ذلیل طفیلی۔ نوجوان اپنی ذات کو سمجھتے ہیں کہ اُنہیں جدید حریتیں عطا ہوئی ہیں اور جدید ایجادات نے اُن نتائج سے محفوظ کر دیا ہے جو ماضی میں خواتین سے متعلق مہم جوئیوں سے پیدا ہوتے تھے۔ اب نوجوان نسل کو فن اور زندگی سے متعلق لاکھوں جنسی ترغیبات ہر طرف سے گھیر رہی ہیں۔

جب شہری خاتون شادی کے انتظار سے اکتا جاتی ہے تو وہ خواہشات سے بھرے نئے جہان کی طرف مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ہولناک انگیخت کے تحت دبی ہوتی ہے جس کی تسکین اُسے چاہنے والوں کی طرف سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

غزلوں، تسلیوں، تحفوں اور تقاریب کی صورت میں جنسی سرور اور شادمانی کے ساتھ حاصل ہوتی ہے۔

آزادانہ پیار و محبت کے بعد آخر کار لڑکا شادی کے لیے ہاتھ مانگتا ہے اور اُس کے ساتھ عقد قائم کرتا ہے۔ لیکن وہ کلیسا میں نہیں جاتے کیونکہ وہ آزاد خیال، دین سے ملحد لوگ ہیں اور اخلاقی قانون کا اُن کے دل پر اثر نہیں کیونکہ وہ ایمان کے ساتھ پہلے ہی رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ وہ دونوں بلدیاتی دفتر کے کمرے میں شادی کرتے ہیں جس سے سیاست کی خوشبو آتی ہے اور وہ حاکم شہر کی نصیحتیں سنتے ہیں۔ وہ کسی عزت اور شرف کے کلمے کے تحت آپس میں نہیں جڑتے بلکہ مصلحت کی خاطر عقد قبول کرتے ہیں اور انہیں کسی بھی وقت عقد سے آزاد ہونے کی اجازت ہوتی ہے لہٰذا نہ تو کوئی بھاری بھرکم رسوم ادا کی جاتی ہیں، نہ ہی عظیم خطبہ ہوتا ہے۔ اسی طرح اس موقع پر نہ کوئی عمدہ موسیقی ہوتی ہے اور نہ جذبات کے اندر کیف اور سرور کا نشہ۔ وہ ایک دوسرے کو بوسہ دیتے ہیں اور ماحول کے شور شرابے میں گھر کو رخصت ہوتے ہیں۔

یہ کوئی گھر نہیں ہوتا! اور نہ کوئی معمولی مکان ہوتا ہے جو خوش آمدید کے الفاظ کے ساتھ خوبصورت لان اور سایہ دار درختوں کے مابین ان کا منتظر ہو۔۔۔۔ بلکہ وہ اپنے آپ کو جیل کی کال کوٹھری کے اندر خجالت کے جذبات کے ساتھ چھپاتے ہیں۔ یہ رہائش کوئی روحانی چیز نہیں ہوتی جیسے بیس سال پہلے کے گھر اس کے مظہر ہوتے تھے۔ بلکہ یہ ایک فقط مادی چیز ہے جو خشک اور ٹھنڈی ہے جیسے ہسپتال جو شور، ہنگامہ، پتھر اور لوہے کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔۔۔

عورت اِس گھر کے اندر مایوسی محسوس کرتی ہے اور وہ دن رات اُس کی دیواروں کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں پاتی۔ کچھ ہی عرصہ گزرتا ہے وہ اپنے خاوند کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور طلوع فجر کے وقت واپس آتی ہے۔ خاوند کی امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔۔۔ کچھ عرصے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کے بعد والا گھر اُس گھر کے بالکل مشابہ ہے جو کنوارے پن کی حالت میں تھا اور اُس کے اپنی بیوی کے ساتھ تعلقات بالکل ویسے ہیں جیسے کسی مشکوک کردار کی حامل آوارہ بے ہودہ عورت کے ساتھ ہوتے ہیں۔

یہ شادی حقیقی معنی کی شادی نہیں ہوتی، یہ تو فقط جنسی تعلق ہے نہ کہ خاندانی جذبات کا مضبوط بندھن۔ چنانچہ جیسے ہی جنسی تعلق کی بنیاد کمزور ہوتی ہے ویسے ہی شادی فاسد ہو جاتی ہے۔ اور بالآخر یہ شادی زندگی سے لبریز نہ ہونے کی وجہ سے اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔ میاں بیوی اپنی اپنی ذات میں سکڑ جاتے ہیں جیسے وہ کوئی الگ تھلگ ٹکڑے ہوں۔ محبت میں موجود غیریت اُن کو انفرادیت پسندی کی طرف لے جاتی ہے اور زندگی ایک مذاق کا نشانہ بن جاتی ہے۔ آدمی نت نئے ذائقے تلاش کرتا ہے، وہ ایک دوسرے کی محبت کو حقیر سمجھتے ہیں۔ عورت کے پاس کوئی نئی چیز نہیں ہوتی جو وہ مرد کو پیش کر سکے۔

ڈیورانٹ کو حادثات اور مسائل کا قبل از وقت اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ کہتا ہے:

اس میں کوئی شک نہیں کہ وقتی جذبوں پر مبنی شادی عنقریب زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوتی چلی جائے گی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لیکن اس طرح نسل کا فروغ بذات خود مقصد نہیں رہے گا۔ آزاد شادی چاہے وہ مباح ہو یا غیر مباح بڑھتی چلی جائے گی اور عورت کی بہ نسبت مرد زیادہ آزاد ہوگا۔ عورت اس شادی کو خالص اور بانجھ عزلت گزینی سے زیادہ غنیمت سمجھے گی۔ یہ ایسے ایام ہوں گے جن میں کوئی اُس کی مدح سرائی نہیں کرے گا۔ شادیوں کا معیار گر جائے گا۔ عورت شادی سے پہلے ازدواجی تعلقات کا تجربہ کر لے گی اور بعد میں از خود مرد کو برانگیختہ کرے گی۔ طلاق کی تعداد بڑھ جائے گی۔ شادی کا نظام مکمل طور پر نئی شکل وصورت اختیار کرے گا جو پہلے سے زیادہ ڈھیلا ڈھالا ہو گا۔ جب عورت کی صنعت کاری مکمل ہو جائے گی تو خفیہ ضبط حمل ہر طبقے میں عام ہو جائے گا۔ حمل عورت کی زندگی میں ایک عارضی مرحلہ ہوگا یا حکومت بچوں کی تربیت کے لیے گھر کے متبادل کوئی دوسرا نظام وضع کرے گی۔ (۵۰۰)

ڈیورانٹ نے جو توقع کی تھی وہ پوری ہوئی بلکہ اُس سے بڑھ کر۔ عورت اور معاشرے کے لیے ایک مستقل بدبختی نے جنم لیا۔ مغرب کا معاشرتی طریقہ جو کسی پر رحم نہیں کرتا، نے عورت کو مجبور کیا کہ وہ اٹھارہ سال کے بعد گھر سے دھتکار دی جائے تا کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے لقمہ تلاش کر سکے اور محنت کر سکے۔ جب اُسے خود رغبت ہو یا حالات کے پیش نظر وہ اپنے خاندان کے ساتھ اُن کے گھر میں رہنا چاہے تو اپنے والدین کو کمرے کا کرایہ، کھانے کی قیمت، کپڑوں کی دھلائی ادا کرے حتی کہ ٹیلی فون کے رابطوں کے عوض معین مقدار ادا کرے۔ (۵۰۱)

جب یہ دھتکاری ہوئی لڑکی کسی کام کاج کو تلاش کر لیتی ہے تو وہ ہمیشہ اپنے ماحول سے تمسخر محسوس کرتی ہے اور اقتصادی مسائل کو برداشت کرتی ہے۔ وہ سرمایہ داروں کے استحصال کا نشانہ بنتی ہے یا حکومت کی غلامی اختیار کرتی ہے اگر وہ کیمونسٹ حکومت ہو۔ مستقل محنت اور دائمی قلق اُس کو اِس حد تک پہنچا دیتا ہے کہ وہ اپنی نسوانیت کھو بیٹھتی ہے اور اعصابی بیماریوں کا شکار بن جاتی ہے۔ بعض حالات میں وہ اُس خوف ناک کابوس سے چھٹکارا پانے کے لیے خودکشی کو ترجیح دیتی ہے۔ یہ معاشرتی خرابی مسلسل پیچیدہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور اُس کے اثرات معاشرے کے وجود میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ اب نارمل حالات کی طرف پلٹنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک کوئی ایسی تبدیلی نہ لائی جائے جو معاشرے کی عمارت نئی بنیادوں پر تعمیر کرے۔ لیکن اس تبدیلی کا امکان خود مغربی معاشرے کی طرف سے بہت مشکل ہے کیونکہ وہ گمراہی کے گڑھے کی طرف ہانپتا ہوا بھاگ رہا ہے۔ بلکہ اُس کو اُس چیخ و پکار کا بھی احساس نہیں جو مسئلے کی پیچیدگی کو سامنے لانے کے لیے مختلف تجربہ کار مرد اور عورتیں کر رہے ہیں۔

اجاثا کریستی جو پولیس کی محکمانہ تالیفات کی مشہور انگریز مصنفہ ہے، کہتی ہے:

جدید عورت بھولی بھالی ہے کیونکہ اُس کا معاشرتی مقام دن بدن بد سے بدتر ہو رہا ہے۔ ہم عورتیں غلط سمت کی طرف جا رہی ہیں۔ ہم نے گزشتہ سالوں میں بڑی جدوجہد کی تا کہ کام کاج میں مردوں کے برابر حقوق حاصل کر سکیں۔ مرد بے وقوف نہیں ہیں وہ ہمیں حوصلہ دیتے رہے اور آگے بڑھاتے رہے۔ وہ یہ اعلان کرتے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہے کہ عورتوں کے کام کاج میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بڑی غم زدہ بات ہے کہ ہم عورتیں اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ ہم صنف نازک ہیں لیکن پھر بھی ہم جان توڑ محنت اور پسینے میں مردوں کی برابری کرنا چاہتی ہیں جو فقط مردوں کے حصے میں تھی۔ (۵۰۲)

امریکہ میں منعقد ایک گیلپ ادارے کے سروے کے مطابق:

آج کل کی عورت تھکی ہاری ہے۔ امریکہ کی ۶۵٪ فیصد عورتیں اپنے گھروں میں رہنے کو ترجیح دینا چاہتی ہیں۔ عورت کا وہم تھا کہ وہ اپنے کام کاج کی خواہش کو مکمل کر لے گی لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ راستے کی لغزشوں نے اُس کے قدموں کو خون آلود کر دیا ہے۔ اُس کی محنتوں نے اُس کی قوتوں کو نچوڑ ڈالا ہے۔ اب وہ اپنے گھونسلے میں واپس جانا چاہتی ہے تاکہ اپنے چوزوں کو سنبھال سکے۔ (۵۰۳)

لیکن پریشان حال مغربی عورت جب گھر اور ممتا کے فرائض کی طرف پلٹنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی کیونکہ معاملہ اس قدر گھمبیر ہو چکا ہے کہ اسکی حقیقی واپسی ممکن نہیں رہی۔ اگر اس طرح سے کوئی کوشش کی جائے تو معاشرہ جو اختلاط اور انحلال کا عادی بن چکا ہے، اِس کو پسند نہیں کرتا اور اِس کا سختی سے انکار کرتا ہے۔ بلکہ شادی اپنی خوشیوں اور مسرتوں کے باوجود معاشروں کے سربراہوں کے لیے ایک دردسر بن چکی ہے۔ مغربی صحافت نے ایک دن ایک خبر میں یہ بیان کیا:

سکاٹ لینڈ کے تعلیمی افسران اُس وقت گھبرا اٹھے جب سکولوں کی استانیوں نے بکثرت شادیاں کرنی شروع کر دیں۔ سن ۱۹۶۰ کے دوران ۱۵۶۳ اُستانیاں مقرر کی گئیں لیکن تعلیمی سال کے اختتام پر ایک ہزار استانیوں نے شادی کی وجہ سے اپنی ذمہ داری ترک کر دی۔ افسران بالا کا کہنا ہے کہ شادیاں سکول کے نظام کے لیے خطرے کا باعث بن رہی ہیں۔ (۶۰۴)

اس کے مقابلے میں عورت بے چاری کیا کرے۔ وہ اِس خراب معاشرے کا سامنا کس طرح سے کرے جو اُس کی پیٹھ پر کوڑے برسا کر اُس کو لہولہان کر رہا ہے اور اُس پر فطرت کی طرف لوٹنے کا راستہ روک رہا ہے؟ اب فقط دو راستوں میں سے ایک رہ گیا ہے: یا تو اِس ظالم معاشرے سے انتقام یا اپنی ذات سے انتقام۔ معاشرے سے انتقام ایسے ممکن ہے کہ اُس کو خوف زدہ کیا جائے یا اُس کی پاکیزہ فضا کو گدلا کیا جائے۔ جیسا کہ ایک اخباری بیان آیا ''انگلینڈ کے اندر ۱۹۶۰ء میں بڑی بڑی تجارتی جگہوں سے چوریوں کی تعداد تقریباً ۳۲۱۹۴ تک پہنچ گئی۔ یہ اعداد اُن حالات سے ہٹ کر ہیں جن میں معاملہ پولیس تک نہیں پہنچ سکا۔ اِس میں عجیب بات یہ ہے کہ ۶۰٪ چوریوں کا ارتکاب عورتوں نے کیا جو بلوغت کی عمر عبور کر چکی تھی اور ۳۰٪ چوریاں اُن لڑکوں نے کیں جو ۱۷ سال سے کم عمر تھے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ چوری کرنے والی عورتیں کسی قسم کے مال کی حاجت مند نہ تھیں۔ (۶۰۵)

ہاں یہ چوری مال کی ضرورت کے سبب نہ تھی بلکہ انتقام کی خواہش اور غصے کا اظہار تھا۔

عورتوں نے اپنی ذات سے انتقام اس طرح سے لیا کہ اُس نے خودکشی کی راہ اپنائی جیسا کہ ایک مشہور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اداکارہ مارلن منرو نے کیا۔ وہ اپنی خودکشی سے کچھ دیر قبل اپنی ہم جنس لڑکیوں کے لیے نصیحت لکھتی ہے جس میں وہ کہتی ہے:

شہرت سے بچو۔۔۔ گلیمر کی دنیا سے بچو۔۔۔ میں روئے زمین پر سب سے زیادہ بدنصیب عورت ہوں ۔۔۔ میں ماں نہ بن سکی۔۔۔۔ میں ایسی عورت ہوں جو گھر یار کو ترجیح دیتی ہوں۔۔۔ معزز خاندانی زندگی ہر چیز سے افضل ہے۔۔۔ عورت کی حقیقی سعادت پاکیزہ شریف خاندانی زندگی میں ہے بلکہ یہ گھریلو زندگی عورت کی ہی سعادت نہیں بلکہ تمام انسانیت کی سعادت ہے۔ (وہ آخر میں کہتی ہے) مجھ پر سب لوگوں نے ظلم کیا۔۔۔ فلموں میں کام کرنا، عورت کو حقیر اور سستا مال تجارت بنا دیتا ہے اگر چہ وہ مصنوعی شہرت اور عزت کی چوٹیوں پر پہنچ جائے''

یہ اعداد وشمار ہرگز عجیب وغریب نہیں کہ عورتوں میں خودکشیوں کی شرح مردوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ فینا کا ایک ڈاکٹر اپنی ایک کتاب میں کہتا ہے: ''یہ بات قابل غور ہے کہ عورتوں میں خودکشی کی کوشش مردوں سے زیادہ ہے۔ ۱۹۴۸ میں عورتوں کی کوشش ۳۸۱ تھی اور یہ مجموعی طور پر 58.61 فیصد تھی۔ ۱۹۵۶ میں یہ تعداد ۵۹۰ تھی یعنی 56.73 فیصد۔ ۱۹۵۹ میں یہ نسبت 55.93 فیصد تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کی عمر چودہ سے بیس سال کے درمیان ہے، اُن کی خودکشی کی کوشش کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ لڑکوں کے اندر ۱۹۴۸ میں یہ 6.5 فیصد تھی۔ ۱۹۵۶ میں 6.53 فیصد۔ ۱۹۵۹ میں 6.81 فیصد۔ اِس کے مقابلے میں لڑکیوں میں یہ شرح انتہائی ہولناک ہے۔ ۱۹۴۸ میں ۵۰ لڑکیوں نے خودکشی کی کوشش کی اور یہ اِس سال میں کل کوششوں کا 7.69 فیصد ہے۔ ۱۹۵۶ میں ۸۹ لڑکیوں نے خوکشی کی کوشش کی اور یہ 8.55 فیصد ہے۔ ۱۹۵۹ میں ۱۵۰ لڑکیوں نے خودکشی کی کوشش کی اور یہ 14.20 فیصد ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر نو دن میں چھ کوششیں کی گئی جن میں سے چار لڑکیوں کی طرف سے تھیں اور دو لڑکوں کی طرف سے۔ (۵۰۶)

یہ اعداد وشمار اُن مصائب کے علاوہ ہیں جن کو معاشرہ عورت پر توڑتا ہے۔ درحقیقت خودکشی کی کوششیں وہ کدالیں ہیں جو معاشروں کو مکمل طور پر گرا رہی ہیں۔ کیونکہ کسی بھی عورت کی ذاتی مشکل درحقیقت اُس معاشرے کی مشکل کو ظاہر کرتی ہے جس میں وہ زندگی گزارتی ہے۔

امریکی اخبارات نے ۱۹۷۷ء میں یہ واقعہ نشر کیا: ایک امریکی لڑکی جو ایک غیر مشہور شہر کے قریب وسطی ریاستوں میں قتل کی حالت میں پائی گئی۔ اُس کا جسم جنگل میں پھینکا گیا تھا۔ پولیس نے اُس کے جسم کو ہسپتال منتقل کیا اور ایک اعلان نشر کیا جس میں لڑکی کی عمر اور اُس کی جسمانی خصوصیات بتلائی گئیں تا کہ اُس کے قریبی رشتے دار آئیں اور میت کو وصول کریں۔ پھر نتیجہ کیا نکلا؟۔۔۔ اخبارات کہتے ہیں: ہسپتال کو لوگوں کی طرف سے بارہ سو کالیں موصول ہوئیں۔ وہ سب یہ گمان کرتے تھے کہ یہ اُن کی رشتے دار ہے۔ بعض لوگوں نے کچھ صفتوں کی مزید وضاحت طلب کی جبکہ پانچ سو افراد میت کے معائنے کے لیے ہسپتال میں حاضر ہوئے۔ (۵۰۷)

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب لوگ اپنی اُن بچیوں کو گم کر چکے تھے جو مذکورہ صفات کی حامل تھیں اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذکورہ عمر کی حامل تھیں۔تو اُن بچیوں کا کیا حال ہوگا جو دیگر صفات یا دیگر عمروں کی حامل ہوں گی؟ اور جب ایک شہر یا ایک ریاست کی یہ صورت حال ہے تو باقی ریاستوں کا کیا حال ہوگا؟ اور اِس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ امریکہ میں کیوں ہو رہا ہے جو مطلق اباحیت کا حامل ہے؟؟

اسی طرح طلاق کی شرح بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔امریکہ میں ۱۸۹۰ میں یہ شرح ۶ تھی جو مسلسل بڑھتی رہی حتی کہ ۱۹۴۸ میں ۴۰ فیصد ہوگئی اور یہ شرح ۱۹۷۸ تک قائم رہی۔(۵۰۸)

یورپ میں عورت کی آزادی کے اثرات

عورت اپنی فطرت سے نکلنے کی وجہ سے جن مفاسد اور معاشرتی شر کی وجہ بنی وہ شمار سے باہر ہے۔ہم اختصار کے ساتھ کچھ باتیں ذیل میں بیان کرتے ہیں:

۱۔بچوں کی ناقص تربیت: جب عورت کے لیے اپنی بنیادی ذمہ داری کی طرف لوٹنا محال ہو گیا اور اُس کا گھر سے باہر نکلنا ایک مسلم امر بن گیا تو ایسی نرسریوں اور تربیت گاہوں کی ضرورت تھی جو بچوں کو پال سکیں۔اُن کے بارے میں الیکسس کارِیل کہتا ہے: جدید معاشرے نے ایک بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کیا ہے اس نے خاندانی تربیت کو مکمل طور پر سکول کے حوالے کر دیا ہے۔اسی لیے مائیں اپنے بچوں کو نرسریوں میں چھوڑ دیتی ہیں تاکہ وہ اپنے کام کاج پر جا سکیں، اپنے معاشرتی امور نبٹا سکیں، اپنی ادبی اور فنی دلچسپیوں کو پورا کر سکیں یا کھیل کود اور سینما گھروں سے لطف اندوز ہو سکیں۔۔۔اس طرح وہ اپنے اوقات سستی میں ضائع کر دیتی ہیں۔یہ اپنی خاندانی وحدت اور اجتماعی تعلقات کو کمزور کرنے کی ذمہ دار ہیں کیونکہ بچہ بڑوں سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔جیسے چھوٹا کتا ایک ہی باڑے میں اپنے ہم عمر پلوں کے درمیان نشوونما پائے تو اُس کی نشوونما مکمل نہیں ہوتی جبکہ وہ آزاد کتے جو اپنے والدین کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں، بالکل مختلف ہوتے ہیں۔یہی صورت حال بچوں کی ہے جو بچے اپنے ہم عمر بچوں کی بھیڑ میں زندگی گذارتے ہیں وہ اُن سے مختلف ہوتے ہیں جو بڑوں، سمجھداروں اور عقل مندوں کی صحبت میں رہتے ہیں کیونکہ بچہ اپنی جسمانی، عقلی اور جذباتی سرگرمیوں کو اپنے ماحول میں موجود سانچوں کے مطابق تشکیل دیتا ہے۔بچہ اپنے ہم عمر بچوں سے بہت کم سیکھتا ہے خصوصاً جبکہ وہ مدرسے میں اکیلا ہو۔اس طرح اُس کی نشوونما غیر مکمل ہوتی ہے۔فرد اپنی خفیہ صلاحیتوں تک اُس وقت پہنچ سکتا ہے جب اسے نفسیاتی عزلت بھی نصیب ہو اور معاشرتی مجموعہ بھی نصیب ہو جو خاندان سے تشکیل پاتا ہے۔(۵۰۹)

۲۔نوجوانوں کے انحرافات: خاندان کے تحت عمدہ تربیت نہ ہونے کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان انحرافات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ہم اِس کو اعداد و شمار سے سمجھاتے ہیں جن کو نوجوانوں کی قومی کمیٹی کے رئیس نے پیش کیا ہے:

فرانس میں ۱۹۳۹ کے اندر عدالت سے اپنے مقدمات نپٹانے والے نوجوانوں کی تعداد ۱۲۱۶۵ تھی اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعداد وشمار کے جدول کے مطابق ۱۹۶۸ میں ۴۴۰۱۶ ہوگئی۔۔۔منحرف نوجوانوں کی تعداد میں یہ اضافہ خوف ناک نتائج سے ڈرا رہا ہے کیونکہ ۸ سال کی مدت میں یہ گنتی تقریباً دگنی ہوگئی ہے یعنی ۱۹۶۰ میں ۲۶۸۹۴۔

موقع کی مناسبت سے ہم یہ بھی بتلا دیں کہ ۱۹۵۹ میں ایک ہزار میں 15.2 وہ منحرف بچے تھے جن کی عمر مولہ سے سترہ کے درمیان تھی اور ۱۹۶۵ میں یہ تعداد ایک ہزار میں 25.78 ہوگئی۔امریکہ کے اندر وہ نوجوان جن کی عمر ۱۸ سال سے کم ہے، اُن کے انحراف کی حالت ۱۷ فیصد تک پہنچ گئی جب کہ نوجوانوں میں ۱۸ سال سے کم عمر نوجوان آبادی کا فقط تین فیصد تھے۔

منحرف لڑکیوں کی تعداد کی شرح ۱۹۶۱ میں پچھلے سال کی بہ نسبت 18.6 فیصد تھی جبکہ لڑکوں میں یہ شرح پچھلے سال کی بہ نسبت 14.2 فیصد سے تجاوز نہ کرسکی۔ جو شخص موجودہ صورت حال میں انحراف کی مشکلات کے بارے میں بہتر معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے اُس پر لازم ہے کہ وہ رسمی منحرف افراد کی تعداد میں اُن لوگوں کو بھی شامل کرے جو کسی سرکاری رسائی کے تحت داخل نہیں ہو سکے۔اسی طرح سے دیگر اعداد وشمار کا اضافہ بھی ضروری ہے۔۔۔بعض وہ اعداد وشمار ہیں جو کسی تعلیمی اصلاحی پروگرام کے تحت داخل نہیں ہو سکے۔۔۔'' اور ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم ان میں اُن آوارہ گرد نوجوانوں کی تعداد بھی شامل کریں جو فرانسیسی قانون کے مطابق مجرم نہیں کہلاتے، کیونکہ فرانسیسی قانون کے مطابق آوارہ گردی کوئی قابل مواخذہ جرم نہیں۔

یہ یا دیگر اعداد وشمار کوئی نئی بات نہیں۔نئی بات یہ ہے کہ جان شازال انحراف کے اسباب کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔وہ ایک وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ'' بچے ماؤں کی توجہ سے محروم ہوتے ہیں اور جو بچے ماؤں کے ساتھ گہرے گرم جذبات محسوس نہیں کرسکتے، وہ اپنے جذباتی تجربات کو مختلف روعمل کی شکل میں ظاہر کرتے ہیں مثلاً کسی قسم کی دشمنی ظاہر کرنا، جنسی خواہش کی بے پناہ پیاس محسوس کرنا، کسی پر تسلط کی غیر معمولی خواہش محسوس کرنا اور اسی طرح دیگر انحرافات۔(۵۱۰)۔یعنی نوجوانوں کے مسائل کی بین الممالک کمیٹی کے رئیس نے حقیقت کا ادراک کرلیا لیکن وقت ضائع کرنے کے بعد۔

حقیقت بات یہ ہے کہ وہ معاشرہ جس کی اقدار اور اخلاقی بنیادیں لادینیت پر قائم ہوتی ہیں وہ چاہے جس فلسفے پر ایمان لے آئے، اُس کا ماحول جرائم اور انحراف کے لیے سازگار ہوتا ہے۔کیونکہ اُس کے پاس مفقود خاندانی تربیت کے بدلے میں کچھ نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ بعض ممالک میں صورت حال اس قدر ہولناک ہوتی ہے کہ جس کی تصدیق نہیں کی جاسکتی۔ہم ایک بیان کافی سمجھتے ہیں جو امریکہ میں نائب اتحادی نے امریکی مسلح جرائم کے بارے میں صادر کیا'' ہر ۴۳ منٹ میں ایک قتل کا جرم واقع ہوتا ہے، ہر انیس منٹ میں ایک عورت کو اغوا کیا جاتا ہے، ہر ۴۸ سیکنڈ میں کاروں پر ایک حملہ کیا جاتا ہے۔ہر بیس سیکنڈ میں ایک لوٹ مار کا واقعہ ہوتا ہے'' اور امریکہ کے فوجی مجلے فروری ۱۹۷۶ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ ۱۹۷۴ میں ۵۵۲۱۰ کے برابر عصمت دری کے واقعات ہوئے یعنی ۱۹۷۳ کے مقابلے میں ۹٪ فیصد زیادہ۔(۵۱۱)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ شرح مسلسل بڑھ رہی ہے۔

۳۔فطرت کا فساد: 'فرائڈ کا نفسیاتی انقلاب' کا مصنف کہتا ہے: امریکہ یا اُس جیسے کسی ملک کی جنسی زندگی کی صورت حال یہ ہے کہ عورت کی ضرورت سے زیادہ آزادی اور غلو سے یہ امکان پیدا ہوتا ہے کہ وہ جنسی صلاحیت کو سرے سے معطل کر دے کیونکہ مرد اور عورت کے درمیان تعلقات میں خطرناک تعطل واقع ہو رہا ہے۔ پہلے مرحلے میں شہوانی طغیانی و سرکشی میں حائل تمام رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں اور دوسرے مرحلے میں عورت کسی قدر مذکرانہ خصوصیت کی حامل بن جاتی ہے اور مرد کسی حد تک اپنی مردانگی کھو بیٹھتے ہیں۔ (۵۱۲)

مرد اور عورت کے مابین فطری تعلقات میں موجود حیوانی اباحیت کے ساتھ ساتھ جنسی شذوذ کے حیرت انگیز اعداد و شمار ہیں۔ اور اُن کی شرح کنزے کے بیان کے مطابق بیس فیصد ہے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ پچھلے بیس سالوں کے اندر یہ شرح آگے نہیں بڑھی ہوگی تو یہ ایک غلط گمان ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ امریکہ کی آبادی ۲۴۰ ملین ہے تو اِس کا مطلب ہے کہ ۴۸ ملین امریکی جنسی شذوذ کا شکار ہیں!!

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اِن بیس ملین میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو اپنے جنسی شذوذ کو ایک تنظیمی اعلانیہ جماعتی شکل میں سرانجام دیتے ہیں۔ اخبارات نے نشر کیا ہے کہ ایک وفد جو بیس افراد پر مشتمل تھا، نے امریکہ کے اندر مردانہ و زنانہ ہم جنس پرستی کی تنظیموں کی نمائندگی کی۔ یہ سب میڈم مارگریٹ کے سامنے پیش ہوئے جو صدر کارٹر کی معاون تھی۔ اِن نمائندگان نے عسکری اداروں میں مطلوبہ جنسی حریت کے حق کا مطالبہ کیا اور کہا کہ فیڈرل انوسٹی گیشن، انٹیلی جنس اور وزارت خارجہ کے محکموں میں لواطت پر مزید آسانیاں دی جائیں۔ ان تنظیموں کے لیے کچھ ٹیکس بھی معاف کیے جائیں۔ اس وفد کا رئیس کہتا ہے: امریکہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ ہوا ہے کہ صدر کارٹر نے بیس ملین امریکی ہم جنس پرستوں اور جنسی شذوذ کے حامل لوگوں کے لیے حقوق و مطالبات کا اعتراف کیا۔ (۵۱۳)

اس سے بھی زیادہ بری صورت حال یہ ہے کہ اسکنڈے نیویا کے شمالی ممالک میں پارلیمنٹوں نے مطالبہ کیا کہ مرد کی مرد سے شادی قانونی طور پر تسلیم کی جائے اور کلیسا میں ادا کرنے کی اجازت دی جائے۔ اور یہ عملی طور پر کیلی فارنیا کی ریاست میں ایک کلیسا کے اندر واقع ہو چکا ہے۔ (۵۱۴)

ان سب باتوں کا عورت کے گھر سے باہر نکلنے کے ساتھ اور خاندانوں کے ٹوٹنے کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ اس کا اعتراف جان شازال نے بھی کیا ہے اگرچہ وہ اپنی تعبیر میں فرائڈ کی اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ وہ اپنی مذکورہ کتاب میں کہتا ہے: ''جب کوئی بچہ خاندانی ٹوٹ پھوٹ کے تحت یا گہری نفسیاتی غلطیوں کے تحت پیچیدگیوں کو شکار ہوتا ہے تو اُس کے جذبات اُس کو ماں کے ساتھ تعلق جوڑنے پر ابھارتے ہیں اور اسے باپ سے دشمنی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے احساسات کی تعبیر اپنے جذباتی انفعالی اضطراب اور انحراف کے مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔ جب وہ اپنی ماں سے چمٹتا ہے تو وہ شرمندہ ہوتا ہے اور جھجکتا ہے۔ نوعمری میں وہ جلد ارتقا حاصل کرتا ہے اور استمنا، مخصوص دوستیوں اور لواطت کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ عورت سے ڈرتا ہے جب وہ اُس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سامنے ممتا کی تصویر بن کر نہیں آتی۔ اس کا ذوق مؤنث بن جاتا ہے اور وہ تصنع سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی پدری جذبات کا حامل بن جاتا ہے اور پختہ عمر آدمیوں کی رفاقت کو پسند کرنے لگتا ہے اور بعض اوقات بدقسمتی سے جنسی شذوذ کے حامل لوگوں سے ٹکراتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں وہ بچہ جو اپنی ماں کی توجہ بچپن میں حاصل کرتا ہے وہ اُن سب لوگوں کا دشمن ہوتا جو اس کی ماں کی جگہ پر محبتوں کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (۵۱۵)

۴۔ عقلی اور اعصابی امراض: عالمی صحت کی تنظیم نے جنیوا کے اندر اپنے سالانہ اجتماع ۱۹۷۸ء میں اپنی ایک قرارداد میں کہا ہے:

پوری دنیا میں چالیس ملین افراد عقلی امراض کا شکار ہیں اور ۸۰ ملین سے زیادہ افراد ادویہ، منشیات اور مخصوص مشروبات استعمال کرتے ہیں جو ان کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ اور دو سو ملین افراد ایسے ہیں جو کم درجے کے حامل عقلی اضطراب کا شکار ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ عقلی پس ماندگی کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ (۵۱۶)

امریکہ کے متعلق خاص طور پر اعداد و شمار بتلاتے ہیں:

عقلی مرض قوم کے بیٹوں کی صحت کے لیے انتہائی خطرناک صورت حال کو تشکیل دے رہا ہے۔ عقلی صحت کے قومی ادارے نے جولائی ۱۹۵۴ میں اشارہ دیا ہے کہ مریضوں کی وہ تعداد جن کی دیکھ بھال نفسیاتی ہسپتال کرتے ہیں، دیگر ہسپتالوں کے برابر ہے۔ کئی ہزاروں پر مشتمل ایک بہت بڑی تعداد تو ایسے مریضوں کی بھی ہے جو نفسیاتی ہسپتالوں کو رُخ ہی نہیں کرتے۔ (۵۱۷)

بعض ماہرین کا نظریہ ہے کہ اخلاق کی تباہی اور موجودہ نسل کی صحت کا مسئلہ خصوصاً عقلی صحت، نشہ آور ادویہ کے سبب سے نہیں۔ یہ تو حقیقی مسئلے کی فقط علامات ہیں۔ حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ نسل سے اُن کی مائیں چھن چکی ہیں اور نفسیاتی توازن کی تشکیل نہیں رہی۔ ڈاکٹر ایدا ایلین نے ایک تحقیق نشر کی ہے جس میں اُس نے بیان کیا کہ خاندانی مشکلات کا سبب اور معاشرے میں کثرت جرائم کی وجہ یہ ہے کہ بیوی نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے اور خاندان میں خرابیاں بہت بڑھ گئی ہیں اور جیسے جیسے خاندان کی خرابیاں زیادہ ہوئیں ہیں ویسے ویسے اخلاق کا معیار گرتا چلا گیا ہے۔۔۔ ایک امریکی تجربہ کار خاتون اِس بات پر زور دیتی ہے کہ ماؤں کو اپنے گھروں کی طرف فوراً لوٹ آنا چاہیے تاکہ اخلاق کی حرمت بھی واپس آسکے اور بچوں اور بیٹوں کے لیے وہ توجہ واپس آسکے جس سے ماؤں نے اُن کو محروم کر رکھا ہے اور وہ اپنے معاشی معیار کو بلند کرنے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر ایلین کہتی ہے کہ تجربات نے یہ ثابت کیا کہ عورت کا اپنے گھر کی طرف لوٹنا ہی واحد راستہ ہے جو موجودہ نسل کو اُس تباہی سے بچا سکتا ہے جس کی طرف وہ سفر کر رہی ہے۔ (۵۱۸)

کیمونسٹ معاشرے کی صورت حال:

جو باتیں گزر چکی ہیں، موجودہ مغربی معاشرے کے لیے لمحات فکریہ ہیں کہ وہ کس طرح سے ادنیٰ بہیمیت،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بے چینی اور بے قراری کے شعلوں میں لپٹی زندگی گزار رہے ہیں۔ یورپ کے پورے آسمان پر تاریک بادل چھائے ہیں جو اپنی بجلیاں اور کڑک یورپ کے ہر حصے پر برسا رہے ہیں۔ لیکن اِس کے باوجود ماسکو کے ساتھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کالک پر مبنی موجودہ تصویر فقط بورژوائی معاشرے کا حصہ ہے اور مغرب کے معاشرتی شر و فساد کی وجہ طبقاتی مزاج اور سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ اسی وجہ سے اُن کا دعویٰ ہے کہ مزدور معاشرہ یعنی پرولتاری ایسا معاشرہ ہے جو اُن نقائص سے پاک صاف اور صاحب اخلاق ہے جیسا کہ انجلو پہلے بیان کر چکا ہے۔

ہم کمیونزم کے آہنی پردوں میں لپٹے ہوئے اقتصادی اور سیاسی طرز پر پہلے جو کچھ بیان کر چکے ہیں وہ اس دعوے کے رد میں کافی ہے۔ کمیونسٹ معاشرے کی جڑوں میں کینہ ہے اور مزاج دہشت اور گھبراہٹ پر مشتمل ہے۔ کسی بھی حال میں اس کو صحیح سالم انسانی معاشرہ قرار دینا ممکن نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ معاشرہ تو انسانی عزت اور کرامت کو ضائع کرتا ہے اور پیداوار کے اضافے کو ترجیح دیتا ہے بلکہ اُسے اپنی بنیادی غرض و غایت قرار دیتا ہے اور اُس کی خاطر مزدوروں سے چھاونیوں اور اجتماعی زرعی فارموں میں بے پناہ مشقت کرواتا ہے۔

کمیونسٹ پارٹی لوگوں کی خوراک میں زبردستی فیصلے کرتی ہے اور اُن کے سروں پر خوف اور دہشت کی تلوار لٹکائے رکھتی ہے۔ وہ اُن کے اخلاق اور عادات میں جبراً دخل اندازی کی مالک بنتی ہے۔ اُس کا سارا زور اس بات پر ہے کہ انسانوں کو معین سانچوں میں کیسے ڈھالا جائے؟ لیکن اِن سب کا نتیجہ انسانوں کی تباہی اور بربادی کی شکل میں نکلتا ہے۔ سرخ نظاموں کے سائے میں جکڑا ہوا فرد اپنے پورے خاندان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے پر مجبور ہے۔ یہی کمرہ اُن کے بیٹھنے، سونے اور کھانا پکانے کی جگہ ہے۔ پھر یہ کمرہ ایک ایسے رہائشی مجموعے میں ہے جو ہم جنس لوگوں پر مشتمل نہیں۔ مثلاً ایک فلیٹ میں چھ کمرے ہوتے ہیں جس کی کل آبادی تیس افراد ہیں جو چھ مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خاندان مقامی علاقے کا ہے، دوسرا خاندان دور دراز کے جمہوری ملک سے تادیبی کاروائی کے تحت منتقل ہوا ہے اور تیسرا خاندان ماسکو کے ماتحت کسی قومی ملک سے آیا ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ ایک فلیٹ کے تمام رہائشی ایک ٹائلٹ استعمال کرتے ہیں اور عوامی ٹائلٹ بسا اوقات اپنے ابتدائی دور سے بغیر دروازوں کے بنائے جاتے ہیں۔ اور ایک کمرہ صرف ایک چارپائی پر مشتمل ہوتا ہے کہ جس پر ماں باپ سوتے ہیں جب کہ بچے اور بچیاں حتیٰ کہ بالغ بچے اور بچیاں قریبی میز پر سوتے ہیں جس کو دن کے وقت کھانا پکانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ (۵۱۹) یہ وہ رہائش گاہیں ہیں جو کسی فیکٹری سے ملحق مزدوروں کے لیے نہیں۔ مزدوروں کی رہائش گاہیں جو بڑی بڑی فیکٹریوں کے اندر بنائی جاتی ہیں، کئی ہزار افراد کی تعداد پر مشتمل ہوتی ہیں۔

کمیونسٹ ملکوں میں لوگوں کے اخلاق کو جان بوجھ کر اِس درجہ فاسد کیا جاتا ہے کہ وہ سیاح جنھیں کمیونسٹ ملکوں میں گھومنے پھرنے کا موقع ملتا ہے، عام مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ ایک سوئس سیاح کہتا ہے: دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کے اکثر ملکوں میں اخلاقی اقدار گر گئی ہیں لیکن اُن ملکوں اور کمیونسٹ ملکوں میں فرق یہ ہے کہ کمیونسٹ حکومتیں بذات خود اخلاق کی خرابی کے لیے بھاگ دوڑ کرتی ہیں اور اس پر ابھارتی ہیں۔ اور اسی طرح

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیمونزم جس طرز زندگی اور طور طریقوں کو لوگوں پر لاگو کرتا ہے وہ سب اخلاقی فساد کی دعوت دیتے ہیں اور اُس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ معاشرہ اُن لوگوں سے کیا امید کر سکتا ہے جن کا خاندان، ماں باپ اور بچے بچیاں چھوٹے بڑے ایک کمرے میں رہتے ہوں اور وہی کمرہ اُن کی نیند، بیٹھک اور کھانے پکانے کی جگہ ہو۔

اس قسم کی زندگی اور نفسیاتی و دینی جذبات کی تباہی، بذات خود ایسے امور ہیں جو اخلاقی فساد پر ابھارتے ہیں اگر چہ دیگر اسباب موجود نہ بھی ہوں۔ اور اُس وقت کیا صورت حال ہوگی جب حکومت بذات خود معاشرے کے فساد کے لیے ہر چیز مہیا کرے۔ اکثر کیمونسٹ ملکوں میں اور خاص طور پر بڑے بڑے شہروں میں کیمونسٹوں نے اخلاقی فساد کے لیے مخصوص جگہیں ایجاد کی ہوئی ہیں۔ میری مراد زنا کاری کے اڈے نہیں بلکہ وہ وسیع و عریض باغات ہیں جن میں گھنے جنگل لہلہاتے ہیں اور بدقماش افراد لوگوں کی نظروں سے چھپ جاتے ہیں یا وہ لوگوں کی نظروں کے سامنے بدکاری میں کوئی حرج یا عار محسوس نہیں کرتے۔۔۔۔ یا ایسی سڑکیں ہیں جو رات کو تاریک چھوڑ دی جاتیں ہیں تا کہ بدکاری کا وقوع آسان ہو سکے۔ مارشل ٹیٹو اپنی قوم کو دیے گئے ایک خطاب میں بڑی صراحت سے کہتا ہے: ''ہم نے تمہارے لیے شراب اور عورتوں کو کھلا چھوڑ دیا ہے، تم اُن کو استعمال کرو اور سیاست کو ہمارے لیے چھوڑ دو''!

عورت جو اخلاق کا بنیادی مرکز و محور ہے، اِن شہروں میں سب سے سستا سامان تجارت بن چکی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو مردوں کے سامنے گراتی ہے اور خاص طور پر اجنبیوں پر پیش کرتی ہے۔ اُس کا واحد مطالبہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے شادی کر لی جائے اگر چہ وہ وقتی اور عارضی کیوں نہ ہو تا کہ وہ کیمونزم کے جہنم سے بھاگ جائے۔ میں نے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ کیمونسٹ معاشرے میں ایسے زندگی گزارتے ہیں جیسے جانور زندگی گزارتے ہیں۔ اور مجھے خطرہ محسوس ہوتا ہے، اللہ محفوظ رکھے، اگر کیمونزم کی عمر طویل ہوگئی تو دنیا میں ایسے لوگ ظاہر ہو جائیں گے جو عام انسانوں سے مختلف ہوں گے۔ اور جس تمدنی زندگی کو اختیار کرنے میں انسانوں کو کئی ہزار سال لگے ہیں، وہ اُس کو ترک کر کے جنگل کی زندگی اختیار کر لیں گے۔

''۔۔۔ اسی لیے میرا خیال ہے کہ کیمونزم کے اختتام کے بعد انسان کو اپنی عزت اور شرف کو واپس حاصل کرنے میں صدیاں لگیں گی۔ اُس وقت ایک نئی صالح تربیت کی ضرورت ہوگی تا کہ ایک صالح انسان وجود میں آسکے۔ (۵۲۰)

کیمونسٹ معاشرے میں جو امور شادی سے متعلق ہیں اُن کی کچھ تفصیل اِس طرح ہے۔ مغربی سرمایہ دار معاشرے میں نظریاتی اعتبار سے شادی کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ یہ مرد و زن کے درمیان ایک جائز تعلق ہے۔ لیکن یہ نظریہ کیمونزم میں مقبول نہیں۔ کیمونزم کے نزدیک شادی اور جو اُس سے خاندان بنتے ہیں اور بچوں کی تربیت ہوتی ہے۔ یہ بورژائی خصوصیات ہیں اور جاگیردارانہ دور کی بچی کھچی باتیں ہیں جو جدید مزدور معاشرے کے لائق نہیں۔ کیمونزم کا بیان کچھ اس طرح سے ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بورژوائی خاندان سرمایے کے ختم ہونے کے ساتھ ہی خود بخود اپنی فطری شکل میں ختم ہو جائے گا۔۔۔رہا بورژوائی پروپیگنڈا کہ خاندان بہت زیادہ اہم ہوتا ہے، اور اُس کا بچوں کی تربیت اور والدین کے ساتھ گہرا تعلق ہوتا ہے، یہ باتیں گھٹن اور انقباض کا سبب ہیں۔ جدید صنعتی ترقی عن قریب مزدور طبقے کے تمام افراد کے درمیان خاندانی تعلقات کو ختم کر دے گی۔ (۵۲۱)

آرتھر کسٹلر جو کیمونسٹ پارٹی کا سابق رکن ہے، کیمونزم کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

''رہا مخصوص جنسی جذبہ تو اُس کا اقرار اور اعتراف کیا جا سکتا ہے لیکن ہم اُس کے بارے میں شدید حیرت میں مبتلا ہیں۔۔۔ہمارے نزدیک خاندانی نظام بورژوائی نظام کے آثار میں سے ایک اثر ہے جس کو مکمل طور پر ختم کر دینا چاہیے کیونکہ اس سے انفرادیت پرستی، نفاق اور طبقاتی کشمکش کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی طرح بورژوائی شادی ہمارے نزدیک بدکاری کی شکلوں میں سے ایک شکل ہے جو معاشرے کی رضامندی اور موافقت کے ساتھ مقبول عام ہو گئی ہے۔ اسی طرح کھلی زنا کاری اور گذشتہ جنسی تعلقات بھی بتدریج غیر مقبول ہو گئے ہیں۔۔۔ہم سمجھتے ہیں کہ پاکیزگی وعفت کا بورژوائی تصور بھی اُسی طرح سے بُرا ہے جس طرح زنا کاری بُری ہے۔۔۔جنسی جذبے کے متعلق جس درست موقف کو اپنانا ضروری ہے، مزدوروں کا تصور فضیلت ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو شادی کرنی چاہیے، اپنی بیوی کے ساتھ مخلص ہونا چاہیے اور مزدور بیٹوں کو نجیب بنانا چاہیے۔ اگر آپ یہ سوال کھڑا کریں کہ یہ تو وہی تصور فضیلت ہے جو بورژوائی ہے اور ہم اِس کا پہلے انکار کر چکے ہیں؟ تو اُس کو کہا جائے گا کہ اے میرے دوست! آپ کا سوال دلالت کرتا ہے کہ آپ آلاتی طریقے سے غور وفکر کرتے ہیں نہ کہ جدلی طریقے سے۔۔شادی کا نظام سرمایہ دارانہ معاشرے میں فساد اور آوارگی کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جو منطقی طور پر مزدور صحیح سالم معاشرے میں بدل جاتا ہے اور برعکس نتائج دیتا ہے۔ کیا آپ یہ بات سمجھ گئے اے میرے دوست یا میں آپ کو اس سے زیادہ محکم طریقے سے جواب دوں؟ (۵۲۲)

ہم نے خاندانی شکست وریخت اور اجتماعی بگاڑ کے متعلق مغرب کی جو باتیں بتلائی ہیں۔ بعینہ وہی باتیں کیمونسٹ ملکوں میں بھی موجود ہیں بلکہ اُس کے ساتھ ساتھ کچھ زائد خطرناک چیزیں بھی موجود ہیں مثلاً بے چینی اور بے قراری کا مستقل احساس، پولیس کی نگرانی، ہر انسان سے احتیاط اور شک حتیٰ کہ گھر کے افراد سے۔ کوئی بھی انسان کامل محبت اور باہمی افہام تفہیم کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوق گزارتی ہے۔ اِس پر بہترین گواہی ایک بچے کا افسانہ ہے جو آوارہ گرد کے نام سے مشہور ہے۔ اُس میں ایک بچہ اپنے والد کے متعلق حکومت کو چغلی کرتا ہے اور حکومت اُس کو دس سال قید اور بیگار کی سزا دیتی ہے۔ (۵۲۳)

عورت خاص طور پر ایسی تکلیف وپریشانی کا شکار ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ وہ اپنے شکوہ شکایت کو بیان نہیں کر سکتی چہ جائیکہ وہ اپنے حقوق میں کسی حق کا مطالبہ کرے حتیٰ کہ عورت کی ساتھی خواتین اپنی فیکٹری یا فارم کے اندر وہ باتیں منہ سے نہیں نکال سکتیں جو اُن کے سینوں میں مضطرب ہوتی ہیں کیونکہ اُن کے نکل جانے کا خوف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے اور عبرت ناک سزا لازم قرار پاتی ہے۔ چونکہ عورت نظام کے مزاج اور دباؤ کے مطابق ایک مزدور ہوتی ہے اسی لیے وہ اپنی ممتا کے جذبات کی تسکین سے محروم ہوتی ہے اور اُس کے موئث جذبات مقہور و مجبور ہوتے ہیں۔ رہے بچے تو اُن کے لیے نرسریاں کیمونسٹ ممالک میں اتنی زیادہ ہیں جتنی مغرب میں نہیں بلکہ یہ تربیت کے طریقوں اور زندگی کے وسائل کے اعتبار سے زیادہ متنوع ہیں۔ اس طرح کیمونسٹ معاشرہ معاشرتی آزمائش کے اعتبار سے تباہی کے زیادہ قریب ہے۔

کیمونزم کی صورت حال فقط اُس کے معاشرتی حالات کا ہی تقاضا نہیں بلکہ یہ اُن کے کیمونسٹ فلسفے کا جز بھی ہے۔ چنانچہ انجلز نے ذکر کیا ہے کہ پرولتاری کون کون سی تدابیر اختیار کر کے اپنے بچوں کی ایسی تربیت کر سکتے ہیں کہ وہ ماؤں کی توجہ سے بے نیاز ہو سکیں اور حکومت اور قوم کے تابع اداروں میں پل بڑھ سکیں۔۔۔ کیمونزم میں وراثت کے امور میں جائز اور ناجائز بچوں کا حق مساوی ہوتا ہے۔ (۵۲۴)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کیمونسٹ معاشرہ موجودہ انسانی معاشروں میں سب سے زیادہ گرا ہوا معاشرہ ہے، چاہے وہ اخلاقی اعتبار سے ہو یا نفسیاتی اعتبار سے یا اجتماعی سعادت کے اعتبار سے۔ یہ تحلیل شدہ قلق زدہ معاشرہ ہے جس پر گہری بدنصیبی اور کابوس نے اپنے خیمے گاڑے ہوئے ہیں اور انسان نجات کی کوئی فکر اپنانے کے قابل نہیں رہا۔

یہ خوف ناک بگاڑ اور تیزی سے پھیلتی ہوئی بدنصیبی جس کو لادین یورپ برداشت کر رہا ہے اپنی دونوں شاخوں یعنی سرمایہ دارانہ نظام اور کیمونزم سمیت ایک فطری نتیجہ اور ایک عاجلانہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ کے انکار، دین کے ساتھ کفر، انسانی خواہشات اور گمراہ فلسفوں کے نتیجے میں برپا ہوئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا اپنی مخلوق میں مستقل طریقہ ہے کہ وہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں پلٹتے اور اُس کی ہدایت کو نہیں تھامتے تو اُن کا مستقبل انتہائی خوف ناک اور شکست خوردہ ہو جاتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۲

ادب وفن کا سیکولرزم

تمہید:

ادب وفن ایک ایسا کھلا میدان ہے جہاں انتہائی اعلیٰ مباحث اور مطالعہ جات دُہرائے جاتے ہیں۔ نصابی مباحث اس کے علاوہ ہیں۔ یورپی ادب کا قصہ خاص طور پر بہت طویل ہے۔ پھر اس کے اکثر مسائل ماضی میں شدید فکری معرکہ آرائی کا شکار ہوئے۔ اس کے علاوہ سیاسی رجحانات اور قومی ومذہبی اختلافات نے بھی اپنا کروار ادا کیا۔

جب ہم یہ رائے اختیار کریں کہ ادب حقیقت میں زندگی کی تصویر پیش کرنے کا نام ہے۔ تو آپ کے خیال میں اُس یورپ کی تصویر کیا ہوگی جو حیران، مضطرب، بے کار اور متناقض زندگی گزار رہا ہے؟!!

یہ اور اِس جیسے دیگر امور نے، جو اہل فن پر مخفی نہیں، اِس میدان میں ہماری بحث کو تھکاوٹوں سے لبریز کر دیا۔ محقق کی جدوجہد آخری دم تک پہنچ جاتی ہے لیکن اِس کے باوجود وہ کسی مسلسل اور متناسب خلاصے پر قادر نہیں ہو پاتا جو کم از کم اُس کی کوششوں کی وسعت کو ہی بتلا سکے، اگر چہ وہ موضوع کی مطلوبہ صورت بیان نہ کر سکے۔

یہ بات واضح ہو کہ ہم ادب پر بحیثیت ادب بحث نہیں کر رہے۔ ہم اس پر اپنے موضوع کے مطابق عام نظر ڈالیں گے یعنی اس کا دین سے کیا تعلق ہے۔ اسی طرح ہم کتاب کے حجم کی بھی پابندی کریں گے تا کہ انسانی زندگی کا یہ پہلو دیگر پہلوؤں سے تجاوز نہ کرے۔

ان لوازمات کا تقاضا ہے کہ موضوع کی پیش کش اور تشکیل ایک خاص منہج کے مطابق ہو جو درج ذیل امور پر مشتمل ہو۔

① فقط اپنے بحث کے موضوع پر ہی اکتفا کیا جائے اور اس کو ایسے پیش کیا جائے جو حجم واسلوب کے اعتبار سے مناسب ہو۔

② جہاں تک ممکن ہو ادبی مکاتب فکر کے باہمی اختلافات، رجحانات اور مواد وشخصیات کی قدر و قیمت متعین کرنے سے دور رہنا۔

③ اس پیچیدگی سے اجتناب کی کوشش جو جدید مطالعہ جات کے پہلو بہ پہلو چلتی ہے۔ اگر چہ اُس کا کچھ نہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کچھ اثر، ہماری کوشش کے باوجود ظاہر ہوگا جب ہم ضیاع (Alienation) کے مکاتب فکر پر بحث کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ ہم اپنی عادت کے مطابق، ادبی مباحث کی پیش کش میں تاریخی تسلسل کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ موجودہ ادب وفن، سیکولرزم کی انتہا کو کیسے پہنچا اور تبدیلی کا عمل کیسے واقع ہوا۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث اوّل: یورپی بیداری کا دور

نوکلاسیکیت (Neo-Classicism):

یورپی بیداری کا یہ دور اُس تحریک سے ملا ہوا ہے جو اٹلی میں پیدا ہوئی، جو یورپ میں دوسرا اسلامی تہذیبی مرکز تھا۔ اس تحریک نے قدیم یونانی ادب کو زندہ کرنے کا مقصد اپنایا جس کو بعد ازاں انسانی ادب (۵۲۵) کا نام بولا گیا۔ تاکہ اس کو مذہبی کلیسائی پیشواؤں کے ادب سے جدا کیا جا سکے۔

یورپ جو تاریک دور کی نیند میں غرق تھا، اسلامی تہذیب کی روشنی سے بیدار ہوا۔ وہ اس روشنی کی چمک دمک دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اسے اپنی محرومی کا تلخ احساس ہوا کیونکہ وہ اپنے فکر و شعور اور سلوک و رویے پر سخت گھٹن اور دباؤ محسوس کرتا تھا۔ یہ ایسی تکلیف دہ زندگی تھی جس نے اُس کے انسانیت کے احساس کو ختم کر رکھا تھا۔

اس اچانک بیداری نے یورپی نفسیات کو دشواری میں مبتلا کر دیا۔ اُس کے اندر دو طاقتور جذبوں کا تصادم ہو گیا، ایک دافع تھا اور دوسرا مانع۔ دافع جذبہ چاہتا تھا کہ اسلام کے نور سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کی تہذیبی جنت میں داخل ہوا جائے جہاں دنیا و آخرت اور روح و جسم کا انوکھا توازن ہے۔ اس کے زیر سایہ انسانیت اپنی ذات کو فخر سے بیان کرنے لگتی ہے اور رہبانیت و کلیسا کی زیادتیوں سے دور ہو جاتی ہے۔

دوسرا جذبہ مانع تھا جو نفرت پر مبنی تعصب تھا اور اسلام و اسلامی تہذیب سے کینہ توز عداوت پر مشتمل تھا۔ اس جذبے کو صلیبی جنگوں نے مزید گہرا کیا اور یہ اُس وقت اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب مجاہد ترکوں کے زیر سایہ اسلامی توسیع اپنی انتہا کو پہنچی۔

مانع جذبہ دافع جذبہ سے زیادہ طاقتور تھا چنانچہ یورپ اِس نفسیاتی تناقض سے نکلا۔ اور اُس نے ایسے وسیلے کی تلاش کی جو اسے سرکش دینی پیشوائیت کے پنجوں سے بھی نجات دلائے اور اسے اسلام اور اہل اسلام کی عداوت سے بھی الگ نہ ہونا پڑے۔

اُس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے ماضی کی طرف پلٹے، یونانی ورثے کو زندہ کرے اور اُس کے ساتھ مضبوطی سے چمٹ جائے خصوصاً بہیمانہ شہوانی پہلوؤں میں!

یہ رجحان فطری طور پر کلیسا کے لیے پریشان کن تھا۔ اگرچہ اُس کے ہاں اسلام کے پیروکاروں کی طرف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

متوجہ ہونے کے بہ نسبت قابل قبول اور گوارہ تھا۔ اُس نے پوری کوشش کی کہ حالات کا رخ اُس کے مفاد میں رہے اور اُس کے عقائد و تصورات ادب کو اپنے رنگ میں رنگتے رہیں اور کلیسا کی علامات سنگ تراشی اور مصوری کے فنون میں اجاگر ہوتے رہیں۔

لیکن آزادی و رہائی کے عوامل رکاوٹوں کی بہ نسبت طاقتور تھے۔ بیداری کے عہد نے پوری کوشش صرف کر دی کہ وہ ادب و فن کو کامل سیکولرزم تک پہنچانے میں بڑے اور جرأت مند قدم اٹھائے تا کہ دین سے آزاد سیکولر ادب مضبوط ہو سکے۔

ہم کوشش کرتے ہیں کہ اس دور کے ادب و فن کی بعض علامات کو پیش کریں۔ اس ضمن میں ہمارا اعتماد بعض یورپی مفکرین کے تجزیات پر ہوگا۔ اس دور کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں!

① **یونانی وثنی ورثے کو زندہ کرنا:** یہ کلیسا کے قبضے سے بھاگنے اور قرونِ وسطیٰ کی فکر و روایت پر حملہ کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ یونانی ادب کے احیا سے بیداری کے ادیب و فن کار ایک دوسرے جہاں تک پہنچ گئے جو ان کے روایتی ماحول سے بالکل مختلف تھا اور جس میں مذہبیت کا کوئی نام و نشان نہ تھا۔ شروع شروع میں وہ یونانی ادب کے اندر محدود سطح پر گھسے لیکن پھر یہ عمل بڑھتا چلا گیا حتی کہ اس نے کلیسائی رسوم و رواج اور روایات کی بنیادیں اکھاڑ دیں۔ بیداری کے یہ ادبا و فن کار یورپی فکر پر نئے مفاہیم اور متبادل معیار لے کر آئے جو عقل پرستی سے لبریز تھے۔ بیداری کی جدید فکر اس کو اپنے بڑے کارناموں میں شمار کرتی ہے۔

برنٹن کہتا ہے:

قرونِ وسطیٰ حقیقت میں دینی ادوار تھے۔ عصر بیداری اگرچہ زندیقیت تک نہیں تو کم از کم لادینیت و وثنیت تک پہنچنے کی کوشش ضرور تھی۔ قرونِ وسطیٰ کا فن کلیسا کے ساتھ مربوط تھا اور عصر بیداری کا فن بوہیمی حریت (Bohemian) سے متمتع ہوتا تھا اور یہی حقیقی صورت حال ہے۔ سنگ تراش اور مصور عصر بیداری کے عروج میں کلاسیکی عریانی کی تقلید کرتے تھے جیسے وہ دیگر کلاسیکی امور کی پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ فن کار ایسی چیزیں پیدا کرنے لگے جو سخت وحشیانہ اور بے تکی زندگی کی عکاسی کرتی تھیں لیکن عظیم اہمیت کی حامل تھیں۔ یہ لازم تھا کہ وہ ایسی تخلیقات بڑھاتے چلے جائیں۔

عصر بیداری کے فن کار جن کی اکثر زندگی اس مقصد میں گزری تھی کہ مسیحی معتقدات کو لوگوں کے سامنے خوب صورت ترین شکل میں ظاہر کریں، اب ایسے فن کو لے کر کھڑے ہوئے جو انھوں نے قرونِ وسطیٰ سے بھی پہلے کے مشاہیر سے وراثتاً حاصل کیا تھا۔ اس طرح سے جدید دور میں فن تقریباً سیکولر فن میں تبدیل ہو گیا حتی کہ دینی فن تقریباً چھپ گیا یا دوسرے درجے پر چلا گیا۔

خیالی مصنفین وہ فن کار تھے جنھوں نے اپنے فن کو انسانی زندگی کی عکاسی کی سمت موڑ دیا۔ تیرارک، رابلہ،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکسپیر، **سرفانٹس** اور دیگر مصورین، مجسمہ ساز اور موسیقار جن کے نام کو ہم ہمیشہ سے جانتے ہیں، ایسے راستے میں چلنے لگے جو روایتی مسیحیت سے الگ تھلگ اور جدید سیکولرزم کے وسط میں تھا۔ وہ روایتی مسیحیت کو پیچھے چھوڑ آئے اور جدید سیکولرزم کو اپنانے لگے، لگتا تھا کہ یہ فن کائنات کے اسرار و سحر کو بے نقاب کر دے گا!!

یہ فن کار قرونِ وسطیٰ کی مسیحی روایت کے خلاف بڑا سخت باغیانہ رویہ رکھتے تھے۔ انھوں نے روایتی سند کا انکار کر دیا اور دوسری سند تلاش کرنے لگے بلکہ قائم کرنے لگے۔ ان فن کاروں نے ہر اس چیز کو قبول کیا جس کو قدیم یونانی یا رومیوں نے لکھا ہو، اس معاملے میں انھوں نے فقط فکری مشاہیر پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ کسی بھی شخص میں عقل پرستی کا معمولی نشان بھی دیکھا تو اُس کو یونانیوں اور رومیوں کے ساتھ جوڑ دیا۔ اس معاملے میں وہ معمار انجینئروں کی طرح تھے جو اپنی توڑ پھوڑ کو نئے سرے سے لوٹاتے ہیں۔ (۵۲۶)

④ **دنیا کی زندگی اور انسانی مسائل کا اہتمام:** یہ اہتمام اس چیز کا ردعمل تھا کہ کلیسا نے علم آخرت پر بہت زور دیا تھا۔ اس نے دینی پیروکاروں کی ہر فکری و فنی سرگرمی کو تثلیث، مسیحی اولیا، ملائکہ اور معجزات کے اردگرد گھما دیا تھا۔ کلیسا نے انسان کے مذہبی جذبات کے علاوہ ہر قسم کے جذبات کو دبا دیا۔ اس وجہ سے عہد بیداری کی اس پوری تحریک پر ہیومنزم (انسان پرستی) کا لفظ بولا گیا۔

دانتے (۱۳۲۱ء) اس میدان میں وہ کچھ لے کر کھڑا ہوا جو **میکیاولی** سیاست کے میدان میں لے کر کھڑا ہوا۔ اس نے کلیسا پر صریح خروج کیا۔ اُس کی روایات و معیارات کو توڑا۔ اور اس کے دور سے یورپی ادب نے انسان کو بتدریج ''الٰہ'' کی جگہ پر رکھ دیا۔ انسان کا اہتمام جس پر دانتے اور اُس کے ہم نواؤں نے محنت کی، وہ انسان کی الوہیت کی تصویر کشی تھی۔ یہ کوشش **انیسویں صدی** سے شروع ہوئی اور سارتر اور اُس کے ہم نواؤں کے ہاتھوں اس صدی میں مکمل ہوئی۔ اس دوران فطرت کو بھی معبود بنایا گیا جس کی طرف **عصر تنویر** نے دعوت دی تھی۔

داونز کہتا ہے:

دانتے ویسے ہی کھڑا ہے جیسے اُس کا دوست اور ہم **عصر مصور جیوتو** کھڑا ہے، ایک ایسی صدی اور دور کا آغاز جو انسانی فکر کے ارتقا میں نیا ہے۔ یہ دونوں عظیم فن کار تھے۔ انھوں نے نئے جذبات کی سچی تعبیر پیش کی جو اُن کے معاصرین میں سے کئی کے دلوں میں جوش مارتی تھی لیکن وہ اُس کو بیان کرنے پر قادر نہ تھے۔

یہ نئی چیز انسانیت (ہیومنزم) تھی یعنی انسان کے معاملات کا دنیا کی زندگی میں مکمل اہتمام۔ ہم اُس جدید چیز کی خطرناکی سمجھ سکتے ہیں جو قدیم سے ٹکراتی ہے خصوصاً جبکہ اس دور میں کائنات اور زندگی کے متعلق مخصوص نظریات قائم تھے جو بتلاتے تھے کہ دنیا کی زندگی اُخروی زندگی کے استقبال کے لیے تمہید ہے۔ یہ عقیدہ لوگوں پر کلیسا کے ہمہ گیر جبر و تسلط کے تحت قرونِ وسطیٰ میں نسل در نسل غالب رہا۔ اس دوران علما کا سارا علم دینی اصولوں اور کلیسائی عقائد کے اردگرد گھومتا رہا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

((پھر اُس کے بعد روشن خیالی کا دور آیا۔ یہ پہلی تبدیلی تھی جو لوگوں کے نظریہ زندگی پر طاری ہوئی۔ وہ فطرت کی گود کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ اُس سے کائنات کے اسرار لیتے اور انسانی عقل کی قدرت پر اپنا مطلق اعتماد قائم کرتے))

((روشن خیالی کی اس آواز کو اُس دور کے عبقری لوگوں نے اٹھایا۔۔۔اُن کا فکری میدان اُخروی اُمور کے بجائے اِس دنیا کے انسانی معاملات کا اہتمام تھا))

جیوتو اسی بیداری کا فن کار تھا جیسا کہ دانتے اس دور کا شاعر تھا۔ جیوتو اپنے شہر (اسیزی) میں کلیسا کی دیواروں پر قدیس فرانسس کی زندگی کی کہانیاں اور تصویریں بنانے لگا۔ ان تصویروں میں فطرت، پرندے، حیوان، پھول کی حقیقی منظر کشی کی گئی۔ یہ فن ایک نئی چیز تھی جو قدیم روایت سے بالکل الگ تھلگ تھی، جہاں فقط کنواری، بچے اور قدیسین کی تصاویر تھیں۔

((ڈیوائن کامیڈی ادب میں ایک نئی چیز تھی۔ ایک طاقتور نیا اضافہ جس کی کوئی مثال نہ تھی۔ اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لوگوں نے اس کو اُلوہیت کا لقب دیا، انھوں نے محسوس کیا کہ اس کے ظہور کے ساتھ ہی یورپی ادب جدید پھٹ پڑا ہے۔))

((تمام لوگ اس بات پر عقیدہ رکھتے تھے جیسا کہ کلیسا کی تعلیم تھی کہ جو انسان بھی مسیحیت کا کفر کرتا ہے اُس کا انجام جہنم ہے۔ اور جو اس پر ایمان رکھتا ہے اُس کا انجام جنت ہے۔ دانتے آیا تو اُس نے اِس قدیم عقیدے سے خروج کیا اور چند اخلاقی بنیادوں پر جزا و سزا کے نئے معیار قائم کیے۔ آج ہم پیچھے کی طرف دیکھیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ پوپ کے بجائے ایک شاعر جزا و سزا کو انصاف سے تقسیم کر رہا ہے۔ ہم نہیں دیکھتے کہ اُس کے عمل میں کوئی خرقِ عادت چیز یا غیر معمولی بات ہے لیکن اُس کے زمانے کے اعتبار سے بلاشک یہ ایک اہم انقلاب تھا۔

شاعر بوب نے سچ کہا جب اُس نے آنے والی اٹھارویں صدی کے فلسفے کی تعبیر بیان کی اور کہا: سب سے عمدہ مطالعہ جو انسان کے لیے ضروری ہے، انسان کا مطالعہ ہے۔ اور شیکسپیر (۱۶۱۶ء) اس سے پہلے اسی مطالعے پر قائم ہو چکا تھا۔ اور حق تو یہ ہے کہ شیکسپیر اپنے دور میں، یورپی بیداری کی بلند ترین مثال پیش کرتا ہے جو مختصراً انسان کی قدر و قیمت کی دریافت پر مبنی تھی جس کی اہمیت گزشتہ زمانوں میں ضائع ہو چکی تھی۔ (۵۲۸)

یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ دانتے (۱۳۲۱ء) نے اپنی ڈیوائن کامیڈی کے اندر تمام پوپوں کو جہنم کے گڑھے میں داخل دکھایا ہے، سوائے ایک پوپ کے جس کو جنت میں داخل کیا اور اُس کی وجہ مخفی نہیں۔ (۵۲۹)

④ رومی اباحیت کی طرف لوٹنا: یہ اُس رہبانیت اور غالی سنجیدگی کا ردعمل ہے جو کلیسا کے زیر سایہ یورپی معاشرتی زندگی پر غالب رہی۔ بیداری کے راہنما کلاسیکی نوجوانوں کی تجدید لے کر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے ایپیقوری مذہب کو زندہ کیا تاکہ لذتوں اور جسمانی شہوتوں سے خوب لطف اندوز ہوا جائے۔ انھوں نے رومی و یونانی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلاسیکی ورثے سے دیوتاؤں، اُن کی اساطیر اور کشمکش کو نظر انداز کر دیا۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ اباحی پہلو پر رکھی۔ اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مسیحی عقیدے پر زبردست قوت ایمانی کے حامل تھے بلکہ یہ تھی کہ وہ اپنے دبے ہوئے جذبات ومیلانات کو سیر کرنے کی رغبت ہر چیز سے زیادہ رکھتے تھے۔

اسی طرح بیداری کا عہد خاص کلاسیکی مزاج کا حامل ہے جو جسم کو مقدس گردانتا ہے اور ایسے وقت میں لذت کی عبادت کرتا ہے جس میں رہبانیت ایک بلند ترین مثال رہی ہے۔ اس دور کے زعمانے لوگوں کی نظروں کو رہبانیت کے عیوب کی طرف پھیرا۔ انھوں نے دلیل دی کہ یہ انسانیت کے منافی ہے اور وہ اسی دلیل کے تحت دیگر مسائل میں بھی آڑ لیتے تھے۔

مولف ''تکوین العقل الحدیث۔ جدید عقل کی تعمیر'' کہتا ہے: حقیقت یہ ہے کہ انسان پرستی کا یہ اہتمام واضح ترین صورت میں اُن ادوار کی تصویر ہے جب مسیحیت کی بربروں سے جنگ ہوئی۔ چنانچہ ہومیرس نے وثنی ملاحم کے اندر جس زندگی کی تصویر کشی کی ہے، وہ خالصتاً وجود انسانی کو منعکس کرتی ہے۔۔۔ مسیحی روایت نے زیادہ کوشش یہی کی ہے کہ اُس کی شہرت کو مسخ کرے۔ قرونِ وسطیٰ کے آخری حصے میں مبتذل گانوں کی بھرمار تھی جو صریح طور پر زندگی اور اس کی لذتوں سے لطف اندوزی کو عظیم و برتر قرار دیتے تھے۔ یہ گانے بہت زیادہ آزاد اور حیوانی پہلوؤں کے وصف میں افراط کے حامل تھے۔

((ہم اپنے گھومنے پھرنے پر بڑے پرشوق اور پرمسرت ہیں۔۔۔
ہم اتنا کھاتے ہیں کہ سیر ہو جاتے ہیں، اتنا پیتے ہیں کہ معمولی حصہ بھی نہیں چھوڑتے۔۔۔
ہم ہمیشہ عیش وعشرت کرتے ہیں، جہنم سے سیراب ہوتے ہیں۔۔۔
ہمارے سینے ایک دوسرے سے چپکے ہوتے ہیں۔۔))

اس طرح **سیکولر عوامی ادب** پیدا ہوا ہے۔ اس نے زندگی کے اعلیٰ اور ادنیٰ وسائل سے وثنی تمتع کو بیان کیا۔ **التروبادور** گانے والے شعرا نے مسیحی جان بازی کے بجائے انسانی محبت کی عظمت کے گن گائے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ ان قصائد کا اکثر حصہ صراحت اور واقعیت میں شہروں کی بورژوائی ثقافت سے پیدا ہوا۔ فرانس کے فحش قصے نہایت چابک دستی سے زندگی کی انواع واقسام سے لطف اندوزی کو بیان کرتے جیسا کہ وہ فی الواقع تھے۔ اِن قصوں میں خصوصی شغف کے ساتھ فراڈ و دھوکے کی کہانیاں اور کاہنوں کے عیوب بیان کیے گئے۔ یہی صورت حال **شوسر** کے قصائد اور حقیر نوکروں کی تصاویر کی ہے جن کو **بوکاشیو** نے مرسوم کیا۔

((حقیقت یہ ہے کہ **بارہویں صدی** کی ابتدا میں اور اُس کے بعد قصہ کا فن ظاہر ہوا ہے جس کے متعلق ادب میں گفتگو ہوتی ہے۔ کنواریاں، قدیس اور پرانے لوگ واقعی تصاویر میں تبدیل ہو گئے اور روایتی بازنطینی کنواریوں کی تصویریں اٹلی کی دیہاتی دوشیزاؤں کی جگہ پر منتقل ہو گئیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن اہم بات جو انسان پرست مفکرین نے یونان سے اخذ کی، یہ تھی کہ زندگی کی بھلائیوں سے اعلیٰ تہذیب کی صورت میں مفید فطری استفادہ کیا جائے۔

انھوں نے محسوس کیا کہ غیر ضرر بخش لذتیں اور طبعی میلانات انسانی زندگی کے لیے مفید وسائل ہیں جن کے واسطے سے ''عقل'' صالح زندگی کو منظم کرتی ہے، یہ شیطان کا حصہ نہیں چنانچہ اُن کو گناہ قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یا تو وہ اس گناہ پر مدد الٰہی سے غالب آئے گا یا وہ اُس سے خجالت اور ندامت کے ساتھ لطف اندوز ہوگا۔۔۔))

ان سب باتوں نے طبعی طور پر مسیحی اخلاق کے خلاف انقلاب کی فضا قائم کردی۔ چنانچہ مسیحی محبت کے بدلے میں تفریح اتر آئی کہ انسان اُن تمام قوتوں کو استعمال کرے جو اُس کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہیں۔ اللہ کی فرماں برداری کی جگہ وہ حریت و ذمہ داری اتر آئی جو عقل کی راہنمائی اختیار کرتی ہے۔ ایمان کی جگہ پر بتدریج بے باک فکری بحث اتر آئی۔

اس طرح ایک تیز و تند آندھی راہب کے سر پر آپڑی۔ کیونکہ راہب اُس طہارت و پاکیزگی کو بجالانے میں ناکام ہوگیا جس کی وہ بشارت و تبلیغ کرتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کا ادب اپنے آغاز کے ایام سے ہی راہب کی لغزشوں کی خوف ناک تصویریں پیش کرنے لگا۔ اُس کی تصویر یہ تھی کہ راہب دوسروں کی بہ نسبت زیادہ حیوان ہوتا ہے۔ اٹلی کے باشندوں میں سب سے زیادہ ماہر اور بے باک لورنزفالا تھا۔۔۔ اس نے اپنی کتاب ''حیات رہبانیت'' کے اندر سادہ اور پاکیزہ زندگی کی ہر قدر کا انکار کیا ہے اور لذات سے متعلق بعید ترین مذہب اختیار کیا حتیٰ کہ مذہب ایپقوری کے ساتھ متفق ہوگیا۔ اس نے اعلان کیا کہ شادی شدہ عورت بلکہ بدکار عورت بھی راہبہ عورت سے افضل ہوتی ہے کیونکہ وہ مرد کو فیض یاب کرتی ہے جبکہ راہبہ ایسا تجرد اختیار کرتی ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے بیان کیا کہ انسان اپنے وطن کی راہ پر قربان ہو یا کسی بھی بلند قدر پر، یہ عقل کے منافی ہے۔

یہ اچانک پلٹا بتلاتا ہے کہ شاید خالص وثنیت کی طرف واپسی کا سفر ہے۔ اٹلی کا فن مسیحیت اور وثنیت کے کامل ملاپ کی بہترین تصویر ہے۔ اگر ہم بعض مشہور تصاویر پر نظر ڈالیں تو ہم اللہ، سردار، کنواری، بچہ اور کیوپڈ دقدیس وغیرہ کے مابین فرق نہیں کرسکتے۔

اٹلی کے لوگوں نے مسیحی اخلاق کے خلاف بغاوت کی اور اس کی جگہ لاکھوں قسم کے جمالیاتی اشکال کے ساتھ لطف اندوز ہونے لگے لیکن شمالی اقوام نے زندگی میں زیادہ خوب صورتی محسوس کی۔ اس روح کو رابلیہ کبیر نے اپنی کتابوں میں لکھا۔۔۔

بیداری کا انقلاب مجسم شکل اختیار کرتا ہے جس میں رابلیہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم ان ٹیڑھی عقل والے مکار عوام اور ریاکار عیسائی بزرگوں سے بھاگ جائیں۔ یہ کھردرے راہب جو سخت جوتے پہنتے ہیں۔۔۔ ان سب افراد سے بھاگ جا۔ اُن کی کراہت و تحقیر کو اتنا لازم پکڑ جتنا میں اُن سے نفرت کرتا ہوں۔ میں قسم اٹھاتا ہوں کہ اگر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو یہ کام کرے گا تو تو سب سے بہتر حالت میں ہوگا۔(۵۳۰)

اس طرح بیداری کا دور روایتی مسیحیت کے خلاف انقلاب اور وثنیت کی طرف پلٹنے کا اعلان تھا۔ اگر چہ یہ عمل سلبی تھا مگر کسی بھی نئی تحریک کے لیے یہ ایک لازمی قدم ہوتا ہے۔ یہ طبعی بات تھی کہ بیداری کے قائدین کی توجہ اُس موجود عمارت کو گرانے میں لگی رہی جس کو یورپ نے ایک ہزار سال تک قبول کیے رکھا، اس لیے وہ نئی صورت حال کی ماہیت میں غور وخوض نہ کر سکے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بحث دوم: جدید دور

(الف) رومانیت (Romanticism):

ہمیں یہ بات دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یورپی زندگی کا سفر خط مستقیم میں نہیں، یہ متذبذب خط ہے جس پر مختلف ردعمل مسلط رہتے ہیں۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس کے شواہد ہم زندگی کے ہر شعبہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ہم ادب کے میدان میں بھی اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں:

''چنانچہ نوکلاسیکی جوش جذبہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ جلد ہی یورپ کا ردعمل شروع ہوا۔ چونکہ یورپ کا ایجابی پہلو انسانیت کا اہتمام اور مدفون عقل کو بیدار کرنا تھا تاکہ وہ راہنمائی کے مرکز کو سنبھال سکے، چنانچہ یہ دونوں (انسان پرستی و عقل پرستی) بھی ارتقا و تبدیلی سے نہ بچ سکے۔

ترقی انسان پرستی کے حصے میں آئی اور عقل پرستی کے نصیب میں تبدیلی بلکہ انقلاب ٹھہرا۔ ان دونوں سے نیا مذہب پھوٹا جو رومانیت کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ مذہب تاریخی طور پر عصر تنویر سے ملا ہوا تھا۔

① انسان پرستی کے میلان کا ارتقا:

اس ارتقا کی بہترین تعبیر وہ ہے جو ''ثلاثۃ قرونٍ فی الادب۔ ادب کی تین صدیاں'' کے مصنفین نے کہی ہے:

''اٹھارویں صدی دین کو اہمیت نہ دیتی تھی بلکہ جدید علم اور سیاست کو اہمیت دیتی تھی۔ اس صدی کے زعما مسیحی پادری نہ تھے بلکہ فطرت پسند فلاسفہ تھے۔۔۔ یہ تغیر بڑا عمیق تھا۔ کئی اعتبار سے قدیم و جدید ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ دنیا کے ماورا آخرت دیکھنے کا رجحان ختم ہوا اور اس کی جگہ خود دنیا پر توجہ اہم قرار پائی۔ رضائے الٰہی کے گرد گھومنے والے عیسائی بزرگ کی جگہ پر ایسا انسان پرست مفکر آ گیا جس کا مرکز و محور فقط انسان تھا۔ اب وہ زندگی اہم نہ تھی جو کتاب مقدس کی ہدایت کے پیچھے چلتی تھی۔ یہ جہان ایسی جگہ نہ رہا جس کو عنایت الٰہی مستقل طور پر تمام جزئیات کے ساتھ منضبط کرتی اور چلاتی ہے۔ عقل کے نزدیک یہ جہان کائنات کی مشین کا ایک جز بن گیا جس نے ایک دفعہ چلنا شروع کیا تو وہ خود بخود چلتی جا رہی ہے (!) حتی کہ اللہ بذات خود ایسی شخصیت (باپ) نہ رہا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس سے محبت یا خوف کیا جائے۔ بلکہ ایسی عاقلانہ دوردراز کی قوت بن گیا جو شخصی نہ تھا بلکہ مشین کی علت اولی تھا جس نے آلہ کائنات کو چلا دیا اور اب آلہ بذات خود ریاضی وفزکس کے نظام کے تحت چلتا جا رہا ہے۔ یسوع ابن اللہ، یسوع ابن الانسان بن گیا۔

لوگوں کی بحث کا موضوع اللہ نہ رہا بلکہ انسان بن گیا۔

لوگوں کا یہ خیال بن گیا کہ انسان کی بہتری دین سے زیادہ جدید معاشرتی وسیاسی علوم سے ممکن ہے۔(۵۳۱)

اس طرح مبہم بیداری کا انقلاب ایک مقرر عقلی منہج کا مالک بن گیا۔ اور اس طرح ایک جدید وثنی صورت ہمارے سامنے آئی۔

یہ رومانیت کی پہلی خصوصیت ہے، جس سے یہ بات تاکیداً ظاہر ہوتی ہے کہ دل کو قائد ہونا چاہیے، انسان کے لیے داخلی نفسیاتی زندگی کی زیادہ اہمیت ہے اور وجود انسانی کی حدود میں ہی تمام تر اہتمام محصور ہونا چاہیے۔ رومانی ادیب کلاسیکی ادیب پر یہ تنقید کرتے تھے کہ اُن کا ہدف فقط انسان کی تصویر کشی ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جیسا کہ وہ بالفعل ہے اور نہ ویسا کہ جیسے اسے مثالی ہونا چاہیے(۵۳۲)۔ اس چیز نے ادب کو تقلید بنا دیا ہے اور تعبیر نہیں رہنے دیا۔ اسی وجہ سے رومانویوں نے خون ریزی وکشت وخون کو نظر انداز کیا، ڈراموں کے ڈائیلاگ لکھے اور ادب کو ایک داخلی شخصی سمت میں لے کر چلے۔ فنی نثر پارے اعترافات یا ذاتی خودنوشتوں کی صورت میں پیدا ہوئے۔ شاعری جذباتی غنائی صورت میں وارد ہوئی جو انسان کے وجدانی احساسات کو بیان کرتی تھی جیسے عشق، خوشی، الم وغیرہ۔ اس چیز نے کانوں اور سماعت کے لطف کو بھڑکا دیا۔

رومان کے لیے بہادری وجانبازی ایک طاقت ور معاشرتی عنصر تھا جو نوجوانوں کے لیے بڑا پُرکشش ہوتا ہے۔ رومانیت نے اس جذبے کو اپنے اندر سمو لیا جس سے ایسا رومانی ادب تخلیق ہوا جو شجاعت وشہ سواری کی زندگی کو مکمل خصائص وفضائل کے ساتھ بیان کرتا تھا۔(۵۳۳)

رومانوی مکتب فکر کے بعض زعما نے وضاحت کی کہ رومانیت کا رجحان مسیحی رجحان کا ردعمل تھا۔ مسیحیت نے عام انسان کو لگام ڈال کر رکھی تھی اور اُس کو میلانخولیا میں مبتلا کر دیا۔ وہ اُس تکلیف ومصیبت کا ذمہ دار تھا جو انسانیت کو لاحق تھی۔ جرمن رومانی ناقد **شلیگل** نے انسانی مصیبت کو دین مسیحی کی طرف منسوب کیا ہے جس نے سادہ انسان کو منفی ذہن کا مالک بنا دیا۔(۵۳۴)

مسیحیت سے رہائی پانے کے بعد رومانی ادیبوں نے اپنی ساری توجہ انسانی ذات پر مرکوز کی۔ انھوں نے مسیحی صوفی ذوق وشوق کے موضوع کو تبدیل کیا جو اللہ یا یسوع کے گرد گھومتا تھا اور اُس کی جگہ اباحیت پسند محبت کو لے آئے۔ وہ غنائی اسلوب میں محبوب کے حسن وجمال کو بیان کرتے، جو اکثر عورت اور کبھی کبھار فطرت ہوتی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

② عقلیت کے خلاف ردِّعمل، جو سترہویں اور اٹھارویں صدی میں غالب رہی:

یہ بات گزر چکی ہے کہ یورپ کا تنویری دور مسیحیت پر دو نعروں کے ساتھ حملہ آور ہوا جو اس کے ہاں بڑے مقدس تھے، ایک فطرت اور دوسرا عقل۔ اس نے فطرت پرستی کو، جو مسیحیت میں اللہ کے نام کی جگہ پر وارد ہوئی، وثنیت کے لیے ایک مخفی ذریعہ بنایا۔ اسی طرح عقلیت جو جدید معبود کو سمجھنے کا ذریعہ تھی، مسیحی وحی کی جگہ پر رکھا۔

کلیسا کے علمی جبر وتسلّط سے بھاگنے والوں نے عقل کی قوت وقدرت پر اندھا اعتماد کیا۔ کوپرنیکس کا انکشاف، گلیلیو و نیوٹن کے قوانین اور بیکن وڈیکارٹ کے اصول وقواعد نے عقل کو بڑی وقعت سے نوازا بلکہ وہ عقل کی عبادت تک پہنچ گئے۔ چونکہ اُن کا مقصد کلیسا کو غصہ دلانا اور اُس کی غلامی کا انتقام تھا، اسی لیے انھوں نے اِس میں آخری حد تک غلو کیا۔

ابھی وہ کلیسا کی مار پیٹ سے جان بچا کر پرسکون نہ ہو پائے تھے کہ بعض لوگوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ نیا معبود ''عقل'' اس لائق ہے کہ اس کو اتنی تقدیس واہمیت دی جائے؟

نتیجہ بڑا کڑوا تھا اور وہ یہ کہ عقل فطرت کی تفسیر کرنے سے عاجز ہے اور نفس انسانی کی تفسیر کرنے میں اس سے زیادہ عاجز ہے۔

انھوں نے سوال اٹھایا کہ کیا کلیسا کے خلاف انتقام اور فطرت وانسانیت کے فہم تک پہنچنے کا واحد طریقہ عقل ہے؟

انھوں نے عقلیت سے زیادہ کھلا راستہ دریافت کرنے کی کوشش کی جس کی منطق جامد اور قوالب محدود نہ ہوں اور جو اسرار کو کھولنے اور غموض کو ختم کرنے میں عقل سے زیادہ طاقتور ہو۔ اور ایسی چیز جذباتی شعور تھا۔ یہ شعور خیالات کے وسیع آفاق پر پھیلا ہوا تھا جو گہری انسانی ذات کی جانچ پرکھ اور فطرت کی خوب صورتی کو روشن کر سکتا تھا۔

اس طرح رومانی آہستہ آہستہ زمین سے بلند ہوتے چلے گئے اور فضائے دور دراز میں حلقے بنانے لگے لیکن یہ اللہ اور مسیحیت کے راستے سے ہٹ کر تھے۔

وہ محبت اور جمال سے متعلق بحث مباحثے کرتے۔ اُس کا فلسفہ گہرے دھندلے اسالیب میں بیان کرتے۔ اسی طرح وہ شیاطین، ملائکہ، سحر، مجہول دنیا کے بارے میں گفتگو کرتے تاکہ کائنات اور داخلی سعادت کا راز دریافت کر سکیں۔

وہ ادبی حقائق کا نقاب کھولنے لگے لیکن کتاب مقدس یا عقلی تالیفات کے ذریعے نہیں بلکہ فطرت کے پرکشش اور پرتخیل مناظر میں۔ وہ ایک ایسی مثالیت تک پہنچ گئے جو بہت کھوکھلی اور گہری تھی اور بعض ایسے پہلوؤں کے اعتبار سے وسیع تھی جن کے تحت وہ کلاسیکیوں پر تنقید کرتے تھے۔

رومانویوں کا نظریہ تھا کہ انتہا درجے کی مدہوشی اور کامیابی اس بات میں چھپی ہوئی ہے کہ انسان اپنے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نفس کی لگام کو کھلا چھوڑ دے تا کہ وہ فطرت کی محبت میں پگھل جائے جیسے صوفی اپنے معبود میں فنا ہو جاتا ہے۔ انھوں نے فطرت کو اللہ کے مقام پر اور شعور کو عقل کی جگہ پر اتارا، اس طرح وثنیت کی ایک جدید شکل ظاہر ہوئی۔ اس وثنیت کے جواز میں انتہائی خوب صورت، شہد آگیں رومانی نعرے لگائے گئے۔ مثلاً فطرت اللہ کا محراب ہے اور جمال اللہ کی تصویر ہے، ہم مخلوق کے اندر اللہ کی عبادت کرتے ہیں وغیرہ۔ یہ جذباتی جملے اس وثنیت کے عکاس تھے جو نفس الامر میں فقط محسوس چیز کی عبادت کرتی ہے اور اپنی روح کے ساتھ اللہ کا ادراک کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ روح محسوسات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ (۵۳۵)

روسو جو رومانیت کا قائد ہے، اس کو راہب سافوی میں واضح طور پر پیش کرتا ہے جو اس کی اپنی تصویر تھی۔ وہ عملی طور پر راہب تھا لیکن بنیادی طور پر کلیسا کے راہبوں سے مختلف تھا۔ وہ فطرت کے عبادت خانے کا راہب تھا اور فطرت کی ہی حمد و تقدیس کرتا تھا۔

روسو کی کتابیں (مثلاً اعترافات)، بوب کے قصیدے (مثلاً انسان کے متعلق ایک گفتگو) اور اسی طرح کیٹس، لامارٹین اور ان جیسے دیگر ادبا، رومانی مکتب فکر کی واضح ترین مثالیں ہیں۔

رومانیت کا سب سے بڑا اثر اور ردعمل، لادینی واقعی ادب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لہٰذا ہم واقعیت کے بارے میں کچھ گفتگو کرتے ہیں۔

(ب) واقعیت (Realism):

رومانیت اپنی تمام تر کج رو جذباتی تاثرات کے ساتھ حالات سے فرار کی سچی تصویر تھی۔ کلیسا کے جبر و استبداد سے فرار، قابل نفرت جاگیروں کے جوئے سے فرار، تلخ ماضی کی روایات سے فرار (۵۳۶)۔ اس کے بعد فرانسیسی انقلاب اور صنعتی انقلاب برپا ہوئے، قومی و دینی جنگیں واقع ہوئیں اور زندگی واضح طور پر بدل گئی چنانچہ ضروری تھا کہ ادبی زندگی کی تصویر بھی بدلے۔

کلاسیکی اور رومانی یورپ جیسے ہم نے پہلے بیان کیا وثنیت کی طرف لوٹ آیا۔ اس نے انسان یا فطرت کی عبادت اپنے خاص طریقے سے کی۔ اب تصویر نے ایک دوسرا مظہر اختیار کیا اب الٰہ کے مقابلے میں انسان موضوع گفتگو نہ رہا بلکہ بات انسان کے دنیوی مرتبے اور معاشرتی مقام تک محدود ہو گئی۔ انسان کی معاشی صورت حال، اُس کے میلانات، خواہشات اور حالات کے بعض مخصوص اجزا جن سے اُس نے سلبی یا ایجابی اثر قبول کیا، ادب کا موضوع قرار پائے۔

کلاسیکی ادبا انسانیت کے کلی مفہوم کو موضوع بناتے تھے، رومانی ادبا نے انفرادی مثالیت اور فطرت پر زور دیا اور واقعیت پسند اِن سب سے لوٹ کر عام مشخص انسان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس طرح ادب نے ایک نئی وثنی صورت اختیار کر لی جو انسان کی عبادت کرتی تھی اور اُس کو الٰہ کی جگہ رکھتی تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جیسا کہ یورپ کی عادت ہے کہ وہ معتدل اور سیدھے درمیانے موقف کو نہیں پہچان سکتا، اچانک ایک بلند فضا سے ایک ذلیل کیچڑ میں جا گرا۔

رومانیت کی کوشش تھی کہ وہ ایسا ادب پیش کرے جو انسان کی قوت و مثالیت کی اعلیٰ تصویر ہو، وہ فطرت یا الٰہ کے چیلنج کا مقابلہ کر سکے یا اپنی خواہشات و میلانات کو اعلیٰ اقدار کے لیے قربان کر سکے۔ لیکن واقعیت یہ تصورات لے کر آئی کہ انسان انتہائی کمزور لمحات میں کن کن پستیوں تک گر سکتا ہے۔

واقعیت اقدار کو پچھاڑتی، فطرت کو تابع کرنے کی کوشش کرتی لیکن خود وقتی میلانات اور کمزور لذات کے سامنے کمزوری کے ساتھ ہار جاتی۔

واقعیت پسندوں نے رومان پسندوں پر سخت گرفت کی، جو بڑی برمحل تھی، کہ وہ غریب عوام کے حالات کو نظر انداز کرتے ہیں اور انسان کے پامال شدہ حقوق سے غفلت برتتے ہیں۔ وہ اُن مظالم سے خاموشی اختیار کرتے ہیں جو معاشرے میں عام نظر آتے ہیں۔ وہ بدترین حالات میں بھی اپنے خوابوں میں مست رہتے ہیں اور خوبصورتی، نازک خیالی اور تخیلاتی زندگی پر بحث کرتے ہیں۔ وہ اپنا سب سے بڑا ہدف فطرت میں غرق ہونا سمجھتے ہیں۔

بلکہ انھوں نے یہ بھی کہا، جیسا کہ تاریخ نے اُن کی کسی قدر تائید کی، کہ رومانی اشرافیہ کے مقرب طبقوں میں سے ہیں۔ وہ شاہوں کے ہم نشین درباری شعرا ہیں۔ وہ اور اُن کا ادب، ظالم حالات کا حصہ ہیں جن کو ہمیشہ کے لیے ترک کر دینا چاہیے۔

انھوں نے اُن کے تمام فنی کارناموں پر یہ مواخذہ بھی کیا کہ یہ فقط مثالی انسان، نادر حالات اور تخیلاتی مناظر کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ مثالی انسان لوگوں میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ وہ نارمل انسانوں سے بالکل الگ تھلگ ہوتے ہیں۔ وہ عام زندگی کی مشکلات کو سرے سے نہیں جانتے ہوتے۔ اِن تنقیدی وجوہات کی بنا پر انھوں نے رومانیت اور اُن کے فنکاروں کا انکار کیا۔ لیکن انھوں نے رومانیت کا اِس وجہ سے انکار نہیں کیا کہ یہ مخفی طور پر ایک وثنی تحریک ہے بلکہ اس پر اُن کا کوئی اشارہ تک نہ تھا۔

اس لیے یہ ایک بدیہی امر ہے کہ فن ایک انحراف سے دوسرے انحراف کی طرف اور ایک وثنیت سے دوسری وثنیت کی طرف منتقل ہو گیا، چاہے واقعیت پسند اس کا اقرار کریں یا نہ کریں۔ اگر واقعیت کے ابتدائی نقوش و علامات پر غور کریں تو وہ ہمارے لیے بالکل واضح ہو جائیں گی۔

تحریک واقعیت کے ابتدائی اہداف:

اوّلین واقعیت پسندوں نے اپنے آپ کو اُن کہانیوں اور ناولوں تک مصروف رکھا جن کو رومانی اشعار کے مقابلے میں صدارت حاصل ہوئی۔ افراد و معاشرے کے مسائل کو سامنے رکھ کر رومانیت پر نقد و مناقشہ کیا گیا۔ یقیناً یہ انحراف نہ تھا بلکہ مطلوب امر تھا۔ لیکن انحراف اُس موقف کی وجہ سے آیا جو انھوں نے دین، اخلاق اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

روایات کے مقابلے میں اپنایا اور انسانیت کی عملی مشکلات کی تصویر کشی میں اختیار کیا۔ یہ اُس وقت ہے جب ہم تسلیم کرلیں کہ اُن کا ہدف فقط انسانی مسائل و مشکلات کا بیان تھا، کچھ اور باتوں کو نمایاں یا مقدم کرنا نہ تھا۔ یہ موقف جو ہمیں آغاز میں ہی معاصر وثنیت تک لے جاتا ہے، دو بنیادی قضیوں پر ارتکاز کرتا ہے۔

ا۔ جاگیردارانہ مسیحی روایات پر انتقام: یہ بعید نہیں کہ کلیسا کا جبر اور جاگیرداروں کا ظلم، واقعیت کا ایک سبب بنا۔ ہم اپنے قول کی تائید میں بلزاک (۱۸۵۱)، جو واقعیت کے قائدین میں سے ایک ہے، کی کہانی پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک بوڑھے پادری اور ایک عورت کی کہانی ہے جو ازدواجی زندگی میں اکٹھے نہ ہو سکے: بوڑھا کہتا ہے: محترمہ مارکیزہ آپ کس حالات میں ہیں، کیا آپ نے کبھی غور کیا کہ انسان پر تکالیف و آلام کا کتنا ہجوم ہے؟ کیا آپ نے آسمان کی طرف کبھی نظریں اٹھائی ہیں؟

اس نے کہا: نہیں، محترم! معاشرے کے قوانین میرے دل پر نہایت بھاری بوجھ ہیں جو اُس کو کچل رہے ہیں۔ میں آسمانوں کی طرف نظریں اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتی۔ شاید قوانین کا معاشرتی آداب سے کوئی تعلق نہیں۔ افسوس! معاشرہ!

بوڑھا: محترمہ! ہم پر لازم ہے کہ ہم ان دونوں کی پیروی کریں۔ قانون ایک کلمہ ہے اور آداب معاشرہ کا فعل ہیں۔

مارکیزہ دوبارہ کہتی ہے اور اس پر تنگ دلی کے آثار ہیں: معاشرے کی اطاعت؟ دیکھو محترم! ہماری ساری تکالیف اس سے پھوٹتی ہیں۔ اللہ نے کوئی قانون مصیبت کے لیے نہیں بنایا لیکن جب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں تو وہ اس کے عمل کو فاسد کر دیتے ہیں (۵۳۸)۔ اور ہم (یعنی عورتیں) ہمارے ساتھ معاشرے کا معاملہ فطرت سے زیادہ برا ہے۔ فطرت نے ہم پر فقط بدنی آلام لازم کیے جو تم پر لاگو نہیں جبکہ معاشرے نے کچھ ایسی زائد پابندیاں لگا دیں جن کی تم مسلسل خیانت کرتے ہو۔ فطرت نے اس کمزور مخلوق کا گلا گھونٹا ہے جبکہ تم اس پر زبردستی کرتے ہو اور اس کو مستقل بدبختی اور مصیبت کے سپرد کیے رکھتے ہو۔ اور شادی، معاشرے کی نظر میں واحد معتبر نظام، ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ فقط ہم ہی بوجھ ہیں۔ مرد کے لیے تمام تر آزادیاں ہیں اور عورت کے لیے فقط ذمہ داریاں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی تحفے میں پیش کر دیں اور تم پر ہمارے حصے میں فقط چند نادر کلمات ہیں۔ مرد صاحب اختیار ہے اور ہم اندھی ہو کر اطاعت و فرماں برداری کرتی ہیں۔ افسوس! محترم! میں چاہتی ہوں کہ آپ کو ساری بات کہہ دوں۔ شادی ہمارے آج کل کے حالات کے مطابق ایک جائز بدکاری ہے جس سے ہماری تمام تکالیف پھوٹتی ہیں۔ پادری کی کچھ باتیں قبول و رد کرنے کے بعد مارکیزہ اُسے کہتی ہے: ''۔۔۔ تم مسکین مخلوق کو ذلیل و رسوا کرتے ہو جو ایک مسافر انسان کے چند ٹکوں کے بدلے اپنے آپ کو بیچتی ہے۔ بھوک اور ضرورت اس عارضی تعلق کو حلال قرار دیتی ہیں، معاشرہ اس سے درگزر کرتا ہے بلکہ براہ راست تعلقات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ شادی کی صورت میں وہ ساری زندگی کے لیے بک جاتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں کوئی شک نہیں کہ قیمت مہنگی ہے کہ تم اس کے آلام میں اس سے نرمی کرتے ہو اور اس کی عزت افزائی کرتے ہو۔ لیکن نہیں۔۔۔ کیونکہ معاشرہ ہماری بہترین فاضل عورتوں پر بھی تہمت لگاتا ہے! یہ ہمارا واضح ترین انجام ہے، دونوں صورتوں میں: عام کھلی بدکاری کی صورت میں ذلت و رسوائی یا خفیہ بدکاری کی صورت میں بدبختی (۵۳۹)۔

ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بلزاک کی واقعیت نے عورتوں کے مسائل کو ہدف بنایا یا دینی پیشواؤں کے افلاس اور روایات کے جبر و تشدد کو۔ یہ بات عجیب نہیں کہ واقعیت کے اکثر ناول معاشرے کی ایسی تصویر پیش کرتی ہیں جیسے وہ انسانوں کا سخت دشمن ہو، فرد کو پابندیوں میں جکڑے ہوئے ہو اور اس کی حریت و آزادی پر پابندی لگا رہا ہو۔

۲۔ حقائق دین پر براہ راست حملہ: جب سے بیداری کی تحریک شروع ہوئی، ادبا و فنکاروں کے شعری و فنی تخلیقات میں کراہیت کی فضا عام نظر آتی ہے۔ شروع میں دینی پیشواؤں پر حملہ کیا جاتا تھا تھوڑے ہی عرصے میں دین کے حقائق پر براہ راست حملہ ہونے لگا۔ اس کی ایک مثال ہم نے دانتے کی کامیڈیا اور رابلیہ کے سابق قول میں دیکھی۔ اسی طرح مولیر کے دو ڈرامے "المتزمت اور طرطوف" میں بھی یہی صورت حال ہے۔ مؤخر الذکر میں ایک دینی شخص کے نفاق اور لالچ کی داستان ہے (۵۴۰)۔ اسی طرح شوسر کی ایک کہانی "صاحب طاحون" ہے۔ قصة الفكر الغربي کا مصنف کہتا ہے: عوامی ادب میں لالچی، فاسق اور مغرور پادریوں کا ذکر بکثرت آتا ہے جن کو امور دنیا نے مشغول کر دیا۔ اسی طرح شوسر ہمیں دینی پیشواؤں کی خوب صورت تصویر پیش نہیں کرتا۔ اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ معمولی بات ہے۔ واقعیت پسند پادری کو فقط ایک عام انسان کی سطح پر اتارتے ہیں اور اُن کا مقصد دین کی ہمہ گیر مسیحی نظریاتی بنیادوں کو چیلنج کرنا نہ تھا جیسا کہ اُن کو والٹیر اور تھامس پین (۱۸۰۹ء، امریکی سیاسی مفکر) کے دور میں چیلنج کیا گیا (۵۴۱)۔

پھر عصر تنویر کی تحریروں میں معاملہ اس سے آگے بڑھ گیا کہ دینی پیشوا اپنے مفاسد کے سبب دین پر حملہ کرنے کا ایک مستقل سبب بنے۔ یہ چیز دیدرو کے قصہ راہب میں ظاہر ہوتی ہے، جو فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کے مصنفین کا سربراہ تھا۔ اس قصہ نے پیرس کے اندر ساٹھ کی دہائیوں میں کلیسا پر اعتراضات کی عمارت کھڑی کر دی (۵۴۲)

واقعیت آئی اور اُس نے حقائق دین پر براہ راست حملے کا کردار ادا کیا، دینی پیشواؤں اور دین کے عیوب کی تشہیر کی گئی۔ جلد ہی یہ صراحت میں تبدیل ہو گئی۔ گستاؤ فلابیر (۱۸۸۰ء) کو دیکھیں، وہ اپنی کہانی "میڈم بواری" میں زبردست گواہی فراہم کرتا ہے۔ اُس دور میں میڈم بواری کی کہانی کے سبب کئی عدالتی مقدمات قائم ہوئے۔

کہانی کے ایک باب میں ہے: ہوٹل کی مالکن پادری سے سوال کرتی ہے، جب وہ اس سے ایک گھونٹ نبیذ کا سوال کرتا ہے اور وہ نبیذ ہوٹل میں دستیاب نہیں ہوتی، راہب لوٹتا ہے۔ اسی طرح جب ادویہ فروش کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ راہب چلا گیا تو وہ اس کے قدموں کی آواز سنتا ہے۔ راہب واپس آنے کی وجہ بتلاتا ہے کہ اسے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تکلیف لاحق ہے اور وہ دوسرے پادریوں کی طرح ریاکار نہیں جو چھپ کر شراب پیتے ہیں اور اُس دور کو لوٹانے کی کوشش کرتے ہیں جب کلیسا رعایا سے ٹیکس کا تقاضا کرتا تھا۔

ادویہ فروش: اپنی بیٹیوں کو بھیجو، وہ اس قسم کے پادریوں کے سامنے اعتراف کریں (!) اگر میں صاحب اختیار ہوتا تو میں حکم دیتا کہ ہر مہینے پادریوں کا علاج کیا جائے۔ تاکہ پولیس کے حالات بہتر ہوں اور لوگوں کے اخلاق سنور سکیں۔

پادری: رک جاؤ! تم کافر ہو، تمھارا کوئی دین نہیں۔

ادویہ فروش: بلکہ میرا دین ہے، خالص دین۔ میرا وہ تقویٰ ہے جو پادریوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ لوگ منافق اور دجال ہیں اور میں اِس کے برعکس اللہ کی عبادت کرتا ہوں، سب سے اعلیٰ ہستی پر ایمان لاتا ہوں۔ میں خالق کے وجود پر ایمان لاتا ہوں، چاہے اس کی حقیقت جو بھی ہو۔ لیکن مجھے کلیسا جانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں اپنے پیسوں سے ایسے افراد کو موٹا نہیں کرسکتا جو کسی کام کے نہیں۔ انسان اللہ کی طرف ہدایت بذات خود حاصل کرسکتا ہے، چاہے وہ جنگل میں ہو یا کھیت میں یا وہ زمین کے کسی حصے میں غور وفکر کر رہا ہو۔۔۔ میرا ''الٰہ'' سقراط، فرانکلن، والٹیر اور **بیرانجیا** کا الٰہ ہے۔ میں اس ایمان کا ساتھ دیتا ہوں جس کی دعوت سافوا (روسو) نے دی تھی۔ میں انقلاب ۱۷۸۹ء کے اصولوں پر ایمان لاتا ہوں۔ میں اس فرضی الٰہ پر ایمان نہیں لاسکتا جو اپنے باغ میں چلتا ہے۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اپنے دوستوں کو مچھلیوں کے پیٹ کے سپرد کرتا ہے اور چیختا چلاتا مر جاتا ہے۔ پھر تین دن بعد دوبارہ زندہ ہوجاتا ہے۔ یہ سب کچھ بذات خود قوانین فطرت سے مکمل طور پر متضاد اور بے کار باتیں ہیں۔

اس سے ضمنی طور پر واضح ہوتا ہے کہ پادری کیسے ایک مستقل جہالت سے چمٹے ہوئے تھے۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ انسان کو اپنے ساتھ جہالت میں دفن کردیں۔ (۵۴۳)

اس طرح واقعیت کی تحریک پیدا ہوئی، یورپی زندگی کے پہلو بہ پہلو تصویر کشی کرتی ہوئی پروان چڑھی۔ یورپی زندگی سے آہستہ آہستہ مسیحی عقائد واخلاق ختم ہوتے چلے گئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بحث سوم: معاصر ادب

واقعیت سے لامعقولیت کی طرف:

موجودہ ادب کے نئے عوامل واضح ہیں جو موجودہ صورت حال کو سابقہ رجحانات و مکاتب فکر سے جدا کرتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ یہ عوامل محض ادبی ہوں۔ چونکہ ادب زندگی کی تصویر کشی کا نام ہے چنانچہ یورپی زندگی پر جو بھی تبدیلیاں طاری ہوتی ہیں، اسی طرح فن و ادب میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔

ایک مغربی ناقد کا خیال ہے کہ مغرب کے چار مفکرین ایسے ہیں جن کا جدید فنی تنقید اور رجحانات پر بڑا گہرا اثر ہے۔ یعنی ڈارون، مارکس، فریزر، فرائڈ۔ (۵۴۴)

سچ یہ ہے کہ ان میں سے بھی ڈارون اور فرائڈ کا اثر سب سے زیادہ ہے۔

ڈارونزم کے حیوانی فلسفے نے یورپی نفسیات میں دو گہرے شعور پیدا کیے۔ یورپی ادب کے جس قدر مکاتب و مظاہر بن جائیں، وہ ضرور اِن دو شعوروں میں سے ایک کی تعبیر ہوں گے۔

① انسان کی حیوانیت: جس نے روحانی احساسات کو مکمل طور پر لغو قرار دیا اور انسانی جسم کو دیگر حیوانوں کی طرح گوشت کا لوتھڑا بنا دیا جس کا حیوانی خواہشات اور جسمانی لذات کے علاوہ کوئی مقصد نہیں۔

② زندگی کی ناقدری اور حقارت کا احساس اور وجود کی کسی بھی بلند غایت کا انکار: یہ وہ شعور ہے جس کو ضیاع کے مختلف مکاتب فکر نے مختلف نعروں اور ناموں کے تحت بیان کیا۔

فرائیڈ ازم نے اس حیوانی رجحان کو مزید گہرا کیا اور آخری تہہ تک پہنچا دیا۔ اس نے حیوانی رجحان کی ایسی فلسفیانہ لیپا پوتی کی جو جنسی ملاپ کو ہی واحد غایت اور وسیلہ قرار دیتی تھی۔ 'جنس' زندگی کا مرکز و محور اور فکر و بحث کی علت العلل ٹھہری۔

اسی طرح اُس نے ضیاع و حیرت کے شعور کو گہرا کیا اور جنسی فلسفے کے مجہول پہلوؤں کو اجاگر کیا جیسے باطنی عقل، لاشعور، مثالی انا وغیرہ۔ گویا اُس نے انسانی زندگی کے مجہول مراکز کو روحانی احساس و ایمان کی جگہ پر رکھا۔

اس کے علاوہ کئی موثر عوامل ہیں جو معاصر ادب کی تشکیل کا باعث بنے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مثلاً دو عالمی جنگیں۔ یہ دونوں بڑی مصیبتیں تھیں جنھوں نے اقدار۔ روایات اور قوانین کو تباہ کر ڈالا۔ جنگوں کی ہول ناکیوں نے انسانی عقل کو دہشت زدہ کر دیا۔ ایٹمی خطرہ اور تیسری عالمی جنگ کا خوف لوگوں کے خوابوں پر مسلط ہوا اور اُن کی نیندیں اڑا دیں۔

اسی طرح معاشرتی بگاڑ نے خاندانی نظام اور اعلیٰ انسانی احساسات تباہ کر ڈالے۔ خون خوار مسابقت پورے عروج پر پہنچ گئی۔ انسانی زندگی مستقل خوف اور قلق میں مبتلا ہوئی۔ پیدائش سے موت تک ایسا کوئی اقدام نہیں جو اُس کے نفس کو سکون دے سکے۔

اس کے علاوہ اضافیت پر مبنی کئی جدید فکری نظریات بھی ہیں جن کا کردار ظاہر ہے۔ لوگوں کے پاس کوئی ایسی اقدار نہیں بچیں جو مطلق ہوں اور اُن پر مضبوط ایمان واعتماد کیا جا سکے۔ پھر یہ نظریات کائنات وانسان کے متعلق ایسے حیران کن اعداد وشمار پیش کرتے ہیں کہ جن کے تصور سے عقل دہشت زدہ ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی حیران کن مرکب زبان استعمال کرتے ہیں کہ انسان تناقض کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اُن کی صداقت وعلمیت پر ایمان بھی رکھتا ہے لیکن مدلول کے ادراک اور معموں کی تفسیر سے عاجز بھی ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جدید فنی وسائل ہیں جیسے سینما، ٹی وی، ترقی یافتہ صحافت اور نشریات۔ ان چیزوں نے ادبی مواد کی عام نشر واشاعت کو آسان کر دیا ہے، جس کے باعث مصنفین، ادیبوں، اور فنکاروں کے درمیان سخت کشمکش کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔

معاصر ادب ان تمام عوامل سے متاثر ہوا اور دین سے مکمل طور پر علیحدہ ہو گیا۔ اُس کے مکاتب ومذاہب جس قدر زیادہ ہوں پھر بھی اُس کے بڑے بڑے رجحانات فقط دو ہیں۔ یعنی اباحیت اور ضیاع

ناقدین مجموعی طور پر معاصر ادب پر لامعقولیت (absurdism) کا لفظ بولتے ہیں۔ یہ لفظ خاص طور پر ضیاع (Alienation) کے مکاتب فکر پر صادق آتا ہے۔ وہ اس میں کوئی تناقض نہیں دیکھتے کہ ضیاع کا مکتب فکر لامعقول (absurd) بھی ہے اور واقعی بھی۔ ان کے نزدیک بیسویں صدی کی واقعیت لامعقولیت میں ظاہر ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعیت سے لامعقولیت کی طرف سفر ایسے ہے جیسے کلاسیکیت سے رومانیت کی طرف، اگرچہ شکل وصورت مختلف ہے۔ لیکن اِن سب میں وثنیت مشترک پہلو ہے۔

① اباحیت کا رجحان (Permissiveness):

یورپی ادب تاریخ کے تمام مراحل میں اباحیت سے الگ کبھی نہیں رہا۔ لیکن اُس کی صورتیں مختلف اور ترقی پذیر رہی ہیں لیکن یہ ترقی معکوس تھی۔ برنٹن کا یہ قول کتنا درست ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری مغربی ثقافت میں خشونت وفحاشی مستقل صفات ہیں۔ بدزبانی والے گانے اور گھٹیا ڈرامے بیداری کے دور میں پیدا ہوئے پھر اُس کے بعد رومانیت کے تحت لذت وجمال کی عبادت عمل میں آئی پھر واقعی ادب میں فحاشی وفجور کی صریح دعوت دی گئی پھر اس کی تصویر بڑھی اور گھٹیا ہوتی گئی حتی کہ عریاں ادب تک پہنچ گئی۔

اس کے بعد کلیسا کی رہبانیت اور فن کے درمیان دوری بڑھتی چلی گئی اور ایسی خلیج واقع ہوگئی جس کو پاٹنا ممکن نہ رہا۔ جب ہم جانتے ہیں کہ افروڈیٹ (یونانیوں کا محبت کا دیوتا) ہالی وڈ کی ہیروئنوں کے لیے جسمانی خوب صورتی کا ایک معیار ہے (۵۴۶) تو ہم پر یہ مخفی نہیں رہتا کہ یہ رجحان سراسر وثنیت کی طرف لوٹ رہا ہے۔

ہم معاصر ادیبوں کا ایک گروہ دیکھتے ہیں جنھوں نے اپنے فن اور زندگی کو اباحیت کے لیے مختص کر دیا۔

یہاں فریدی موسیہ ہے، راتوں کا شاعر جو وسیع مفہوم میں ایپیقوری تھا۔ اُس کا ہم عصر بروسیر جس کا قصہ کولمبیا مشہور ہے۔ اسکندریہ دوماس کبیر وصغیر ہے، مؤخر الذکر کا میلیانا می دوشیزہ کا قصہ معروف ہے اور فلوبیر مادام بوفاری کا مصنف اور اسی طرح خاتون لکھاری جارج ساند جولیلیا واندیانا کی مصنفہ ہے اور ہم ستندال کو نہیں بھول سکتے جو الاسود والاحمر اور اوسکار وایلد کا مصنف ہے۔ (۵۴۷)

ان سب کا ادب رذائل کی حمد وثنا، بدکار عورتوں کے کارناموں اور اُن کے لطف وکرم سے بھرا ہوا ہے۔ اور یہ رجحان ایک زیادہ مکمل مرحلے میں فطرت کے مکتب فکر سے ہم آہنگ ہوگیا، جس کا لیڈر یہودی امیل زولا، زمین اور جانور نامی کتاب کا مصنف تھا۔ یہ خاص الخاص اباحیت کا مکتب فکر تھا۔

اس رجحان کے بارے میں یورپی ادب کا ایک بڑا لکھاری ٹالسٹائی ۱۸۹۸ء میں کہتا ہے:

عمدہ اور ردی فن کا واحد معیار شخصی لذت بن گیا ہے۔ خیر وہ ہے جو نفوس میں لذت بھڑکائے اور وہی جمیل بھی ہے۔ اس طرح وہ ابتدائی یونانی تصور کی طرف لوٹ گئے جس کی مذمت افلاطون نے کی تھی۔ اس فہم کی تطبیق سے فن کا ایک خاص نظریہ پیدا ہوا۔ (۵۴۸)

اور کہتا ہے: ''ہم موجودہ فن کو ایک ایسی بدکار عورت کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں، اگر چہ یہ تشبیہ غریب ہے، جو اپنا جسم بیچتی ہے تا کہ اُن لوگوں کو راضی کرے جو لذت کے متلاشی ہیں۔ یہ بدکار عورت اپنی نسوانیت کو مامتا کے لیے سنبھال کر نہیں رکھتی بلکہ جگہ جگہ تقسیم کرتی ہے۔ چنانچہ معاصر فن اپنی ادق تفصیلات کے اندر زنا کار شخص کے مشابہ ہے۔ یہ فن بدکاری کی طرح مزین ہے، اس کی طرح ہمیشہ قابل فروخت ہے اور اس کی طرح مکمل طور پر بھڑکیلا اور تخریب کار ہے''۔ (۵۴۹)

پھر فرائڈ آیا اور پہلی جنگ عظیم وارد ہوئی تو یہ رجحان مزید طاقتور ہوگیا اور اس کے رذائل عوام میں ہر طرف پھیل گئے۔ پھر ساری توجہ اس کی سستی پیداوار پر ہوگئی۔ تخریب کار پیشہ وروں نے موقع غنیمت پایا کہ اپنا زہر لوگوں میں پھونک دیں۔ انھوں نے لوگوں کے احساسات کو استعمال کیا، اُن کے جذبات سے کھیلے اور اُن کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سامنا کرتا تھا۔

یہاں **سپنگلر** اور **اوریل** کی وہ پیش گوئی سچ ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے بنی نوع انسان کے متعلق کی تھی۔ انسان کی سب سے بڑی مشکل یہ بن گئی ہے کہ وہ زندہ وجود ہے۔ وہ بات جو **آگسٹن** نے کہی تھی کہ میں خود اپنے لیے بوجھ بن گیا ہوں، فقط فلاسفہ کے ساتھ خاص نہیں رہی بلکہ ضیاع کے دور کی ہر نسل اور ہر فرد اپنی زبان سے یہی دہرا رہا ہے۔

آج کا انسان خوش ہو کر کہتا ہے: ''ہم کبھی بھی جامد معانی پر ایمان نہ لائیں گے جو انتہائی مہلک ہیں جن کو قدیم الٰہی نظام پیش کرتا رہا اور پھر اس کے بعد انیسویں صدی کا عقلی نظام پیش کرتا رہا۔ ہماری ساری امیدیں فقط انسان میں ہیں۔ اُس نے جن اشکال کو وجود بخشا، وہی اس قابل ہیں کہ جہان کو کوئی معنی عطا کریں (۵۵۲)۔ یہ ہے **لامعقول ادب** کا دستور۔

موجودہ ادب مقرر معانی اور مجرد اقدار پر ایمان لانے سے انکار کرتا ہے کیونکہ وہ کائنات میں کسی مستقل ہدف پر ایمان نہیں رکھتا، چاہے وہ کلیسا کی مقرر کردہ اقدار ہوں یا افلاطون و یونانی فلاسفہ کی تخیلاتی مثالی صورتیں۔ ضیاع کے ادیبوں کے ہاں کوئی ایسا ارادہ نہیں جو انسانی زندگی کو کسی مقرر لائحہ عمل یا مقصود ہدف کی طرف چلائے۔ کوئی ایسی بلند و برتر مثال نہیں جو ادراک سے بالاتر ہو اور حسی زندگی اُس کا عکس یا متوازی صورت بن سکے۔

اُن کو اس وہم نے انکار پر مجبور کیا کہ کسی بھی چیز پر ایمان لانا، اُن کی مزعومہ انسانی حریت کے خلاف ہے۔ اور اسی طرح کائنات میں پھیلا ہوا تناقض اُن کو کسی بھی تفسیر سے عاجز کرتا ہے۔

یہ اعتقاد محض ایک فکر نہ تھا بلکہ اِس پر فن کے علمی دستور کی بنیاد رکھی گئی۔ اس پر فن برائے فن کا لفظ بولا گیا۔ اس کی وضاحت میں ایک صاحب فن عنوان باندھتا ہے: لکھاری کے لیے واحد ممکن پابندی ادب ہے، پھر اس کی تشریح میں لکھتا ہے:

یہ دعویٰ درست نہیں کہ ہم اپنے افسانوں میں کسی سیاسی نعرے کی خدمت کریں چاہے وہ قضیہ ہمارے ہاں کتنا ہی عادلانہ کیوں نہ ہو اور حتی کہ ہم اپنی سیاسی زندگی میں اُس کے غلبے کے لیے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرتے ہوں۔ سیاسی زندگی ہمیں مسلسل چند معروف مفاہیم فرض کرنے پر مجبور کرتی ہے مثلاً تاریخی مفاہیم یا اخلاقی مفاہیم۔ فن زیادہ بلند پرواز ہے، اِس کی نظر میں کوئی ایسی معروف چیز نہیں جو پہلے سے طے شدہ ہو۔ عمل سے پہلے کچھ نہیں، نہ یقین، نہ قضیہ اور نہ پیغام۔ چنانچہ یہ گمان کہ کہانی کار کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کو کہنے کا وہ ارادہ کرتا ہے اور کہنے کے بعد اُس پر یہ بحث کہ کیسے کہی گئی، یہ حقیقت کے مناقض خطرناک ترین عمل ہے (۵۵۳)۔

ضیاع اور کسی بھی نسبت سے انکار نے، ایک ایسے جہان میں جو تہذیبی مشکلات اور انسانی مسائل سے لبریز ہے، ایک نئے قسم کے ہیرو کو تخلیق کیا ہے۔ کہانیوں کا ہیرو ادبی مکاتب فکر کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا گیا

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

سامنا کرتا تھا۔

یہاں سپنگلر اور اوریل کی وہ پیش گوئی سچ ثابت ہوتی ہے جو انھوں نے بنی نوع انسان کے متعلق کی تھی۔ انسان کی سب سے بڑی مشکل یہ بن گئی ہے کہ وہ زندہ وجود ہے۔ وہ بات جو آگسٹن نے کہی تھی کہ میں خود اپنے لیے بوجھ بن گیا ہوں، فقط فلاسفہ کے ساتھ خاص نہیں رہی بلکہ ضیاع کے دور کی ہر نسل اور ہر فرد اپنی زبان سے یہی دہرا رہا ہے۔

آج کا انسان خوش ہو کر کہتا ہے: ''ہم کبھی بھی جامد معانی پر ایمان نہ لائیں گے جو انتہائی مہلک ہیں جن کو قدیم الٰہی نظام پیش کرتا رہا اور پھر اس کے بعد انیسویں صدی کا عقلی نظام پیش کرتا رہا۔ ہماری ساری امیدیں فقط انسان میں ہیں۔ اُس نے جن اشکال کو وجود بخشا، وہی اِس قابل ہیں کہ جہان کو کوئی معنی عطا کریں (۵۵۲)۔ یہ ہے لامعقول ادب کا دستور۔

موجودہ ادب مقرر معانی اور مجرد اقدار پر ایمان لانے سے انکار کرتا ہے کیونکہ وہ کائنات میں کسی مستقل ہدف پر ایمان نہیں رکھتا، چاہے وہ کلیسا کی مقرر کردہ اقدار ہوں یا افلاطون و یونانی فلاسفہ کی تخیلاتی مثالی صورتیں۔ ضیاع کے ادیبوں کے ہاں کوئی ایسا ارادہ نہیں جو انسانی زندگی کو کسی مقرر لائحہ عمل یا مقصود ہدف کی طرف چلائے۔ کوئی ایسی بلند و برتر مثال نہیں جو ادراک سے بالاتر ہو اور حسی زندگی اُس کا عکس یا متوازی صورت بن سکے۔

اُن کو اس وہم نے انکار پر مجبور کیا کہ کسی بھی چیز پر ایمان لانا، اُن کی مزعومہ انسانی حریت کے خلاف ہے۔ اور اسی طرح کائنات میں پھیلا ہوا تناقض اُن کو کسی بھی تفسیر سے عاجز کرتا ہے۔

یہ اعتقاد محض ایک فکر نہ تھا بلکہ اِس پر فن کے علمی دستور کی بنیاد رکھی گئی۔ اس پر فن برائے فن کا لفظ بولا گیا۔ اس کی وضاحت میں ایک صاحب فن عنوان باندھتا ہے: لکھاری کے لیے واحد ممکن پابندی ادب ہے، پھر اس کی تشریح میں لکھتا ہے:

یہ دعویٰ درست نہیں کہ ہم اپنے افسانوں میں کسی سیاسی نعرے کی خدمت کریں چاہے وہ قضیہ ہمارے ہاں کتنا ہی عادلانہ کیوں نہ ہو اور حتی کہ ہم اپنی سیاسی زندگی میں اُس کے غلبے کے لیے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرتے ہوں۔ سیاسی زندگی ہمیں مسلسل چند معروف مفاہیم فرض کرنے پر مجبور کرتی ہے مثلاً تاریخی مفاہیم یا اخلاقی مفاہیم۔ فن زیادہ بلند پرواز ہے، اِس کی نظر میں کوئی ایسی معروف چیز نہیں جو پہلے سے طے شدہ ہو۔ عمل سے پہلے کچھ نہیں، نہ یقین، نہ قضیہ اور نہ پیغام۔ چنانچہ یہ گمان کہ کہانی کار کے پاس کوئی ایسی چیز ہے جس کو کہنے کا وہ ارادہ کرتا ہے اور کہنے کے بعد اُس پر یہ بحث کہ کیسے کہی گئی، یہ حقیقت کے مناقض خطرناک ترین عمل ہے (۵۵۳)۔

ضیاع اور کسی بھی نسبت سے انکار نے، ایک ایسے جہان میں جو تہذیبی مشکلات اور انسانی مسائل سے لبریز ہے، ایک نئے قسم کے ہیرو کو تخلیق کیا ہے۔ کہانیوں کا ہیرو ادبی مکاتب فکر کے ارتقا کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا گیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ چنانچہ کلاسیکی ادب کا ہیرو وہ ہے جس پر حقیقی ہیرو کا لفظ ثابت آتا ہے پھر رومانیت نے اپنے ہیرو کو ایک عاشق یا صوفی کی شکل میں پیش کیا۔ پھر واقعاتی ادب کا ہیرو اکثر شہوانی اور مادی ہوتا ہے۔ اور معاصر ادب ضیاع میں ہم ہیرو کو اِس روپ میں دیکھتے ہیں کہ وہ فقیر، کمزور اور کچلا ہوا انسان ہے یا وہ اجمالی طور پر ایک ایسا انسان ہے جس کا انجام تباہی و بربادی قرار پا چکا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادب ضیاع کی مثالیں

قضیہ۔کافکا(۵۵۴):

اُس انسان کے بحران کا اندازہ لگائیں جو عام فطری زندگی گزارتا تھا جیسے سب لوگ گزارتے ہیں اچانک اس کو دو عجیب وغریب پولیس کے آدمی پکڑ لیتے ہیں اور اس کو قابو کر لیتے ہیں۔ وہ اُن سے سبب پوچھتا ہے لیکن بے سود۔ پھر اُس کا مقدمہ کسی ایسی اجنبی عدالت میں پیش کیا جاتا ہے جس کے اشخاص، قانون اور عدالت بالکل غیر مانوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس کا خود دفاع کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ مقدمہ کی ماہیت کیا ہے۔ وہ گرفتاری میں ہی رہتا ہے لیکن یہ گرفتاری عجیب وغریب اور غیر معمولی ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی وقت میں آزاد بھی ہوتا ہے اور قید بھی۔ اس کا ہر جگہ پیچھا کیا جاتا ہے اور نظر رکھی جاتی ہے۔ وہ اپنے جاننے والوں اور دوستوں سے شکایت کرتا ہے اور کسی مضبوط وکیل کی تلاش کرتا ہے۔۔ہائے مصیبت۔۔اس کے سب جاننے والے اس اجنبی عدالت کے ارکان ہوتے ہیں! حتی کہ وہ مذہبی انسان جس کو وہ اچانک کسی کلیسا میں ملتا ہے، بھی عدالت کا کارکن ہوتا ہے۔ مقدمے کی طویل پیچیدہ وقفوں کے بعد الزام سے جاہل ہونے کی حالت میں اس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے(۵۵۵)۔اس کو دو مجہول شخص گھسیٹ کر لے جاتے ہیں اور شہر سے باہر ہلاک کر دیتے ہیں۔اس کی آخری بات یہ ہوتی ہے کہ وہ کتے کی طرح بھونک رہا ہوتا ہے۔

کہانی کے صفحات ختم ہو جاتے ہیں اور مقدمہ کا فیصلہ ابھی باقی ہوتا ہے۔ یہ موضوع نامکمل رہ جاتا ہے، کافکا اس کو مکمل کرنا ہی نہیں چاہتا!

یہ قضیہ حقیقت میں، اِس زمین میں انسانی وجود کا قضیہ ہے۔خود زندگی کا قضیہ جیسا کہ کسی بھی فکر ونظریے سے عاری انسان کے لیے ظاہر ہے۔ اس کہانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان بغیر کسی مشورے کے وجود میں آ گیا اور وہ زندگی کا یرغمال بن گیا۔ تقدیر اُس کو اٹھا اٹھا کر پھینکتی ہے۔ وہ ایک بیابان میدان میں ہانپتا چلا جا رہا ہے، وہ تھکا ہوا ہے حتی کہ اُس پر حتمی فنا دھاوا بول دیتا ہے۔ وہ اپنے وجود کا راز نہیں جان سکتا اور وہ مقدمہ جس کی وجہ سے وہ آیا اور پھر چلا گیا، معدوم ہی رہ جاتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

② بوڑھا اور سمندر ''ہمنگوائے'':

یہ کسی بھی فکر یا نظریے سے عاری انسانی بحران کی ایک دوسری تصویر ہے جو موجودہ انسانی تہذیب کا شاخسانہ ہے۔ اس میں ایک خوف ناک خسارہ اور حادثہ بیان ہوا ہے جو ایک طویل عمر کا ثمرہ ہے۔

اس کہانی میں ایک بوڑھے شکاری کا ذکر ہے جو سمندروں کی پیمائشیں طے کرنے میں زندگی فنا کر دیتا ہے۔ وہ ایک مرتبہ ایک ایسے سمندری گوشے میں داخل ہوتا ہے جس کے بارے میں اُس کا تجربہ کم ہوتا ہے اور اُس کے پاس زیادہ اسلحہ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ اپنے جال کے ساتھ کوئی بڑی کامیابی لے کر گھر جائے گا۔ سخت مشقت اور غیر معمولی جانبازی کے بعد وہ اپنے خواب کی تکمیل پر کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب وہ اپنی کشتی کے ساتھ کسی امن والی خشک جگہ کی تلاش کرتا ہے۔ لیکن اچانک اُس پر ایسے حملے وارد ہوتے ہیں کہ اُس کے لیے اپنے شکار کو سنبھالنا، حاصل کرنے سے زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ اُس کا زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے، بچا کھچا اسلحہ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے اور اُس کے قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ مگر مچھ اور بڑی بڑی مچھلیاں اُس کی کشتی پر شدید حملے سے باز نہیں آتیں۔ طویل کشمکش کے بعد زخموں سے چور ہو کر کنارے پر پہنچتا ہے۔ لیکن اُس کے پاس قیمتی شکار نہیں ہوتا بلکہ ایک بڑا ڈھانچہ ہوتا ہے اور اس کا سب کچھ ختم ہو چکا ہوتا ہے!!

اس کہانی میں ہمنگوائے نے بوڑھے شکاری کی صورت میں انسانی تہذیب اور شخصی بحران کی تصویر کشی کی ہے۔ بوڑھا اس قدر مصائب و آلام جھیلنے کے بعد زندگی چھوڑنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اُس کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں بچتا کہ وہ خودکشی کر لے (۵۵۶)

③ پچیسواں گھنٹہ:

یہ ایک لمبی کہانی ہے جس کو رومانی لکھاری کانسٹنٹائن جورجیو نے تالیف کیا۔ جو ایک بڑے ادبی کارنامے کے طور پر شمار ہوتی ہے۔ اس نے ضیاع کے بحران کی دقیق تصویر کشی کی ہے، جو مغربی تہذیب کے انحطاط اور انسان کی انسانیت ختم ہونے سے متعلق ہے۔ وہ اس کہانی میں کہتا ہے:

میں محسوس کرتا ہوں کہ ایک بہت بڑا حادثہ ہمارے اردگرد واقع ہو چکا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کب پھٹا، اور کب شروع ہوا اور کب تک جاری رہے گا؟ لیکن مجھے اس کے وجود کا احساس ہے۔ ہم ایک لٹو میں بیٹھے ہیں جو ہمارے چمڑوں کو پھاڑ رہا ہے اور ہماری ہڈیوں کو ایک ایک کر کے توڑ رہا ہے۔ مجھے اس ہولناک حادثے میں ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی پھنسا ہوا چوہا دوسروں کو دعوت دیتا ہے کہ کشتی چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی ہے۔ ہمارے لیے جہان میں کوئی مقام کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا (۵۵۷)

اس کہانی میں المناک حادثہ بیان کیا گیا ہے کہ اقدار سے عاری آلاتی ترقی کے معاشرے میں انسانیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کملا کر رہ گئی ہے۔ یہ سب کچھ انسانی معاشرے کو ایک خوف ناک انجام کی طرف لے جا رہا ہے۔ ایک ایسی خاص قسم کی نسل جنم لینے والی ہے جو نہ انسانی ہوگی اور نہ آلاتی۔ مؤلف نے اُس کا نام تکنیکی غلام رکھا ہے۔ تکنیکی غلام اپنی کثرت کے سبب دنیا پر غلبہ پانے کے لیے انقلاب برپا کر دیں گے اور عملاً کامیاب ہو جائیں گے۔ اور اصل انسان زمین میں ایک معمولی اقلیت کی صورت رہ جائیں گے۔

جدید معاشرہ میں ایک آدمی کے پاس کل تیس تکنیکی غلام ہوں گے۔ وہ سب منظم تکنیک کے تحت عمل کریں گے کیونکہ وہ میکانکی ضروریات پر مبنی ایک وضعی معاشرہ ہوگا جو انسانی نہ ہوگا۔ یہاں سے وہ اندوہ ناک حادثہ شروع ہوتا ہے۔ انسانی مخلوق بھی زندگی گزارنے کے لیے انسانی قوانین سے ہٹ کر عجیب وغریب تکنیکی قوانین کی پابند ہو جاتی ہے۔ (۵۵۸)

اور جب آلاتی تکنیکی غلام انقلاب برپا کرتے ہیں تو پھر کیا نتیجہ نکلتا ہے؟

یہ انقلاب زمین کی مکمل سطح پر ظاہر ہوگا۔ اور ہم اس سے چھپ نہ سکیں گے، نہ جنگلوں میں، نہ جزیروں میں اور نہ کسی اور جگہ پر۔ دنیا کی کوئی قوم ہمیں نہ بچا سکے گی۔ دنیا کی فوجیں تنخواہ دار افراد سے تشکیل پائیں گی۔ وہ آلاتی معاشرے کی مضبوطی کی خاطر بہادری و جان بازی کے کارنامے پیش کریں گے۔ اس معاشرے میں انفرادی زندگی نہ ہوگی۔ شاید یہ دور تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ تاریک ہوگا۔ کیونکہ ابھی تک انسان کی اس حد تک تحقیر نہیں کی جا سکی۔

انسانی زندگی کی اس کے سوا کوئی قیمت نہ رہے گی کہ وہ حرکت کرنے کے قابل ہوگا۔ قیاس آرائیاں خالص علمی بن جائیں گیں۔ ہمارا مستقبل کا قانون تاریک آلاتی بربریت کا ہوگا۔ ہم عن قریب آلاتی تکنیکی غلاموں سے کلی طور پر مغلوب ہو جائیں گے (۵۵۹)۔

پھر مؤلف مشرق ومغرب کے شہریوں کے متعلق گفتگو کرتا ہے، امریکی شہری، روسی شہری، کمیونزم کے زیر سایہ رہنے والے یا ڈیموکریسی کے زیر سایہ رہنے والے، سب کے متعلق وہ کہتا ہے: انسان تمام چیر پھاڑ والے جانوروں پر غالب نہیں آسکا لیکن آخری دور میں ایک نیا حیوان زمین کی سطح پر ظاہر ہوگا جو نئے قسم کا شہری ہوگا۔ یہ جانور انسانوں اور آلات کے ملاپ سے جنم لے گا۔ وہ بدکاری کی اولاد کی ایک نئی قسم ہوگی، وہ زمین کی سطح پر موجود ہر جنس اور ہر اصل سے زیادہ طاقتور ہوگا۔ اُس کا چہرہ انسان کے چہرے کے مشابہ ہوگا بلکہ انسان اُس کے ساتھ گھل مل جائے گا لیکن جلد ہی اُس کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ انسانوں کی طرح حرکات نہیں کرتا بلکہ آلات کی طرح کرتا ہے۔ اس کا معیار مشینی گھڑیوں کے مشابہ ہوگا جو دل و دماغ کی جگہ پر فٹ ہوں گی۔ وہ آلہ اور انسان کے مابین ایک قسم ہوگی، نہ مکمل انسان اور نہ مکمل مشین۔ اُس کی رغبت وخواہش خون خوار درندوں جیسی ہوں گی لیکن وہ خون خوار درندہ نہ ہوگا بلکہ شہری ہوگا۔ یہ اور اس جیسے مشینی انسان ساری زمین کا صفایا کر دیں گے۔''

اس کہانی سے مولف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ شہری کا لفظ انسان کے مترادف نہیں رہا۔ (۵۶۰)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مؤلف اپنی طویل کہانی میں ضیاع وافلاس کی اقسام بیان کرتا ہے جو ہر انسانی شعبے کو لاحق ہوگئی ہیں، معاشرت وریاست، انسان کا ذوق وتخلیق، فن وادب، غرض ہر چیز اس سے متاثر ہے۔ وہ کہتا ہے: تہذیب نے جو کچھ انسان کو پیش کیا ہے وہ بیڑیوں کے سوا کچھ نہیں"۔ (۵۶۱)

مناسب ہے کہ ہم یہاں دیگر فنی کاموں کی طرف بھی اشارہ کریں جو اسی رجحان سے متعلق ہیں اور مذکورہ مثالوں سے کم تر نہیں: قلعہ آکسل از ایڈمنڈ ولسن، ضائع شدہ زمانے کی تلاش از بروسٹ، خوش طبعی کی دنیا از آلڈس ہکسلے، بندروں کا سردار از لیبر یل بیل، مستقبل کی دنیا کا سفر از ویلز۔

ڈرامے کی سطح پر "دل کا تباہ شدہ گھر" جوشو کے ڈراموں میں سے ایک ہے۔ جس میں وہ جدید تہذیب کے افلاس کو بیان کرتا ہے جیسا کہ وہ جنگ عظیم کے بعد ظاہر ہوئی۔ (۵۶۲)

شاعری کو دیکھیں تو "الیوت" کا نام اور اس کا قصیدہ "الیباب" نمایاں ہے یا بیابان زمین (The waste land)۔ اس قصیدے کا جدید شاعری پر بڑا گہرا اثر ہے۔ یہ موجودہ انسان کے بحران کو پیش کرتا ہے جو شاعر کے نزدیک حقیر، بے بس، لاچار اور کمزور ارادے کا مالک ہے۔ وہ ایک ایسے جہان میں زندگی گزارتا ہے جو فنا کے گھاٹ اترنے والا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضیاع کے مکاتب فکر کی مثالیں

① وجودیت (Existentialism):

سارتر نے اپنی کتاب ''وجودیت'' میں کہا ہے کہ یہ ایک خالص انسانی مکتب فکر ہے (۵۶۳)۔ لیکن اس کے باوجود یہ ضیاع کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ اگر ہم اُس کے دعوے کی تصدیق کریں کہ یہ انسانیت کی ہر غیر انسانی چیز کے خلاف بغاوت ہے۔ پھر بھی یہ سلبی اور مایوس کن ردعمل ہے۔ یہ اس قابل نہیں کہ بیماری کی تشخیص کرے چہ جائیکہ دوائی بھی پیش کرے۔ جو بات آپ سچائی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس نے عوام کے سامنے انسانی بحران کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یہ وہ بحران ہے جس کو ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ ''الٰہ کی تلاش'' ہے۔ یہ مکتب فکر ایمان باللہ کا انکار کرتا ہے جو کہ تمام ادیان کا مشترکہ عقیدہ ہے لیکن وہ اس کا کوئی متبادل بھی نہیں پاتا۔ وہ انسان جو خود معبود بننے کی کوشش کرتا ہے، کائناتی جبر و قدر، آلاتی غلبے اور محدود تاریخی ضابطوں کے سامنے مقہور و بے بس ہے۔ اس تناقض سے نکلنے کے لیے وجودیت کا فلسفہ کئی نعرے پیش کرتا ہے۔ جیسے سارتر کے نزدیک حریت اور البیر کاموکے نزدیک کھیل کود اور لغویات وغیرہ

وجودیت شروع سے آخر تک ضیاع و افلاس کی تعبیر ہے۔ ہم البیر کاموکے ہیروؤں میں سے ایک ہیرو کو بطور مثال پیش کرتے ہیں جو وجودی انسان کی مثال ہے: ''میں کبھی کبھار غور کرتا ہوں کہ مستقبل کے مؤرخین ہمارے بارے میں کیا کہیں گے۔ تو ایک ہی تعبیر ہے جو جدید انسان کا وصف بیان کرنے کے لیے کافی ہے: ''وہ جماع کیا کرتا تھا اور اخبارات پڑھا کرتا تھا''۔ اس تعریف کے بعد مزید بحث کی گنجائش نہیں۔ (۵۶۴)۔ ''میرا وجود ایک خاص ترکیب کے ساتھ جسم سے مرکب ہے۔ یہ میری داخلی موافقت اور میری سہولیات کی تفسیر کرتا ہے، اُن لوگوں کے لیے جو محسوس کرتے ہیں۔۔۔''

میں پر اعتماد ہوں کہ میں ہر چیز میں سہولت کے ساتھ تصرف کر سکتا ہوں لیکن اسی دوران میں کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر رشک والی چیز مجھے دوسری چیز کی خواہش پر مجبور کرتی ہے۔ میں ایک خوشی سے دوسری خوشی کی طرف بھاگتا پھرتا ہوں۔ بعض مواقع پر میں ساری ساری رات رقص کرتا ہوں اور لوگوں اور زندگی کے بارے میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرا جنون بڑھتا چلا جاتا ہے۔ بعض اوقات جب راتوں کا آخری وقت ہوتا ہے اور رقص، خفیف مدہوشی، وحشیانہ جوش اور ہر چیز سے رہائی کا احساس مجھے اندر سے بھر دیتا ہے، مجھے ایک خاص لمحے میں جب میں تھکاوٹ سے چور ہوتا ہوں، بجلی کی چمک کے ساتھ محسوس ہوتا ہے کہ میں مخلوقات اور جہان کے راز کو سمجھ گیا ہوں۔ لیکن جب دوسرے دن تھکاوٹ ہلکی ہو جاتی ہے تو وہ راز بھی چھپ جاتا ہے اور میں نئے سرے سے خود کو وحشیانہ مصروفیتوں میں خود کو گم کر دیتا ہوں۔ (۵۶۵)

انسان کو اپنی ذاتی معرفت کے متعلق تھوڑا سا زادِ راہ دیا گیا ہے، اب وہ اس پر چیختا چلاتا ہے۔ وہ کسی طرح قادر نہیں کہ اِس شہوانی بندر (خود کو مراد لیتا ہے) کو ہمیشگی نصیب کر سکے، وہ اس ہمیشگی کا متبادل تلاش کرتا ہے۔ چونکہ میں ابدی زندگی کے لیے روتا رہتا ہوں، اس لیے میں اپنے بستر پر باغی بدکار عورتوں کے ساتھ جاتا ہوں، ساری ساری رات شراب پیتا ہوں۔ (۵۶۶)

آہ! میرے دوست، زندگی کا بوجھ اُس شخص کے لیے بہت خوف ناک ہے جو بغیر الٰہ اور بغیر آقا کے ہے۔ انسان پر واجب ہے کہ وہ کوئی مالک، کوئی الٰہ تلاش کرے۔ انسان کی نظر میں الٰہ کا معنی مفہوم ہی ساقط ہو گیا ہے، وہ اس قابل نہیں رہا کہ انسان اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا خطرہ مول لے۔ (۵۶۷)

② رمزیت (Symbolism):

یہ وہ مکتب فکر ہے جو اصل میں انیسویں صدی کی **میکانکیت** کے ردعمل میں ظاہر ہوا جس نے دعویٰ کیا کہ اُس نے کائنات کو مکمل احاطے کے ساتھ سمجھ لیا ہے اور اُس کی عقلی و علمی تشریح ڈھونڈ لی ہے۔ اِس مکتب فکر نے ہر اُس چیز کا انکار کیا جو منطق اور حواس کے ادراک کے تحت داخل ہو سکے۔ رمزیوں کا عقیدہ ہے کہ رمزیت موجودہ واقعات کی تفسیر سے عاجز ہے چہ جائیکہ مجہول جہانوں کی تفسیر کرے جو کائنات اور نفس سے متعلق ہیں۔ اُن کا احساس انہیں مجبور کرتا ہے کہ ایجابی امکان کے پیچھے ایک راز ہے جو ابھی تک کھل نہیں سکا اور ایسا مجہول جہان ہے جس کا پتہ نہیں چل سکا۔ مجہول کی طرف میلان کے اس پہلو کو جدید علم "سائیکالوجی" نے بیان کیا ہے کہ انسان میں دو حالتیں ہیں: شعور والی حالت جس کا ادراک عقل کر سکتی ہے اور لاشعور والی حالت جس کے ادراک سے عقل قاصر آتی ہے۔ پھر کبھی یہ حالتیں انسان کے لیے حقیقی ہوتی ہیں اور کبھی جذباتی واقعہ اور سراب (۵۶۸)۔ اس بنیاد پر رمزی ادب قائم ہوا جس نے لغت و واقعات کو استعمال کر کے مجہول حقائق بیان کرنے کی کوشش کی جس پر اُن کے خیال میں فطرت اصرار کرتی ہے اور خود ہمیشہ مجہول رہتی ہے۔ ان کے خیال میں مجہول حقائق کے بیان کے لیے اِس اسلوب سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا۔ اس مکتب کے مشہور زعما **بودلیر** اور **رامبو** ہیں۔

③ سریالیت (Surrealism):

یہ جدید مکتب فکر ہے جو زیادہ تر شاعری اور مصوری سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ اُسی مقام سے شروع ہوا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں سے وجودیت کی ابتدا ہوئی لیکن یہ اِس اعتبار سے مختلف ہے کہ یہ لامعقولیت میں گھس گیا اور اُس نے تاریخی حقائق اور فکری منطقی بحث میں غور وخوض سے انکار کر دیا۔ وہ مجہول کی گہرائیوں میں گھس گیا اور اُس نے ذہن سے خارج حقیقت کے وجود سے انکار کر دیا۔

اس تحریک کی تہہ میں فرائڈ کا باطنی عقل کا نظریہ ہے۔ سریالیت چاہتی ہے کہ باطنی عقل کو بذات خود نفسیاتی حقیقت بنا دے اور فن کو اس کی وضاحت کا مستقل آلہ۔

شروع شروع میں اس کا مقصد نئے انسانی رجحانات کی بنیاد رکھنا نہ تھا بلکہ اِس کے برعکس یہ ہر اُس رجحان کا ناراضی سے تعارض کرتا تھا جو زندگی کو مافوق الواقع طریقے سے بدلتا اور مافوق الواقع تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ سریالیت کا رجحان اُن تمام تناقضات کو لغو قرار دیتا ہے جس نے انسان کی شخصیت کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے جیسے شعور و بے شعور، میں اور جہان، طبعی و مافوق الطبعی وغیرہ

اس کے مشہور شعرا میں بریتون اور اراغون ہیں۔ بریتون نے مطلق کی تلاش کے لیے واحد راستہ اسی سریالیت کو قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک سریالیت اس وقت فکر کو بھر دیتی ہے جب عقل کی نگران قوت غائب ہو جاتی ہے۔ (۵۶۹)

④ کچلی ہوئی نفسیات کا ادب:

یہ ادب بھی ضیاع کی اقسام میں سے ایک ہے جو ناامیدی اور ابتذال کی طرف مائل ہے۔ اِس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہیرو ایسی مخلوق ہیں جن کا اپنی ذات اور اپنے مستقبل پر اعتماد ختم ہو چکا ہوتا ہے اور وہ کبھی اس بات پر تیار نہیں ہوتے کہ انسانی زندگی کو بھرپور طریقے سے قائم کر سکیں۔

اس ادب کے لکھاریوں نے اپنا کام فزیالوجی وسوسوں سے شروع کیا اور انسانی حیوان کے مسائل کو خوب استعمال کیا۔ گویا انھوں نے ریمون کے ہیروؤں والا نعرہ لگایا کہ مخلوق خواب وخیال کے سوا کچھ نہیں جو اُس کو ہانکتے رہتے ہیں۔ زندگی میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا کھوج لگایا جائے، زندگی میں انسانی آنتوں سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں جو ساری کی ساری حیوانی ہیں (۵۷۰)

⑤ مایوسی اور قنوطیت کا ادب (ادب مستحیل):

یہ ایک جدید رجحان ہے جو دوسری جنگ عظیم کے بعد ظاہر ہوا۔ یہ رجحان جنگ کی ہولناکیوں سے شدید متاثر ہے اور اپنا فلسفہ مایوسی اور قنوطی الحاد پر مرکوز کرتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ انسان وقت مقرر پر مر جائے گا کیونکہ کوئی بھی اُس کو بچانے کی فکر نہیں کر رہا۔

''ادب المعاصر'' کی لغت کہتی ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ادب مستحیل کے افسانے بیس سال سے یعنی ۱۹۴۵ء سے ادب پر بے کار ہی نہیں چھائے رہے بلکہ وہ ایک دعوت و پیغام کے جھنڈے تلے پروان چڑھ رہے ہیں۔ کاموکی کتاب ''الکتاب المفتاح ۱۹۴۷ء'' اسی فکر کی حامل ہے جو کہتی ہے کہ ان دنوں ہر معاشرہ اپنی جہنم کو اپنے اندر اٹھائے ہوئے ہے۔ ممکن ہے کہ ہر معاشرہ طاعون سے مر جائے۔ جنگ کے بعد والی نسلیں چالیس سال تک اپنے زخموں کو چاٹتی رہیں گی۔ ان حالات میں کشمکش، دعا، غور و فکر اور ایمان کا کیا فائدہ؟! وہ جہان جس میں لوگ عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں اور مر جاتے ہیں، وہی جہان ہے جس میں چیونٹیاں بھی عذاب میں مبتلا ہوتی ہیں اور مر جاتی ہیں۔ یہ جہان بے رحم سفاک ہے جس کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔

بیس سال سے ہیروشیما کے دھوئیں اٹھ رہے ہیں جو ہمیں بتلاتے ہیں کہ یہ جہان اچھا نہیں اور نہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ روجیہ نیمیہ کا یہ بیان ایک پوری نسل ظاہر کرتی رہی جو ادب مستحیل نسل تھی۔ (۵۷۱)

⑥ عدمیت پسند ادب (Nihilism) :

یہ ایک معاصر رجحان ہے جو ناامیدی اور قنوطیت سے لبریز ہے۔ اس ادب کی تخلیقات اس تکلیف دہ اور اذیت ناک امر کی عکاسی کرتی ہیں کہ انسان مر گیا ہے۔ اب کچھ باقی نہیں بچا، نہ کوئی شخص اور نہ کوئی زبان جو خاص طور پر انسانی وجود کی ذرہ برابر مدد کر سکے۔ انسانی وجود اپنے اساسی انجام کی طرف سکڑ گیا ہے اور وہ اعلان کرتا ہے کہ اُس کا تعلق عدم سے ہے اور وہ اسی کی طرف لوٹ جائے گا۔ اُس کے لیے اِس کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔ (۵۷۲)

⑦ فرار اور خواب و خیال کا ادب:

یہ ادب بھی ضیاع کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔ اس کے بارے میں بیار بوادیفر کہتا ہے:

یہ ایسا ادب ہے جو ہمارے آبا کے وجود اور اخلاق کا سرے سے انکار ہی نہیں کرتا بلکہ اُس پر غور کرنے کا بھی انکار کرتا ہے۔ وہ روح کے مشینی فہم کا انکار کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسانی نفس کے معاملات پر ایمان لانے کی کوئی ضرورت نہیں جس کے تحت زندگی کے حصول کا ارادہ کیا جا سکے، زندگی کے زخم بھرنے کی کوشش کی جا سکے اور وجود کی پیچیدہ جڑوں کو پکڑا جا سکے۔ یہ درحقیقت اللہ کے بغیر تصوف کی ایک قسم ہے۔ اس کے مشاہیر میں بلانشو اور باتالی ہیں۔ مؤخر الذکر اشعار سوچتا، فطرت کا انکار کرتا اور ہستی مطلق کی فکر کے ذریعے اقدار سے مستغنی ہوتا تھا۔ (۵۷۳)

یہ کچھ ادبی مکاتب فکر کا تذکرہ تھا۔ اِن کے علاوہ دیگر رجحانات بھی ہیں جو اپنے جوہر میں سابقہ مکاتب سے مختلف نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اصطلاحات: ۱۲

فن (Art)

آرٹ یعنی فنون لطیفہ کی تین شاخیں ہیں۔ مادی فنون جیسے فن تعمیر، سنگ تراشی۔ ادراکی فنون جیسے مصوری، موسیقی۔ تصوری فنون جیسے ادب و شاعری۔

کلاسیک (Classic)

کسی زبان کا وہ تمام شعری یا نثری سرمایہ جسے ایک مدت سے قبول خاص و عام حاصل ہو اور جو ادبی حلقوں اور ناقدین کی نظر میں بڑی اہمیت کا حامل ہو۔ ہر قدیم تحریر کا کلاسیک ہونا ضروری نہیں۔

نشاۃ ثانیہ (Renaissance)

قدیم یونانی اور قدیم رومی (لاطینی) علم و ادب کا احیا۔ اس احیا کا سلسلہ ترکوں کے ہاتھوں فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) کے زمانے اور چھاپے خانے کے آغاز (۱۴۴۰ء) سے جڑتا ہے۔ اس کا دور ازمنہ وسطیٰ کے بعد ہے۔ اس دور میں نئے براعظم دریافت ہوئے، کوپرنیکس کا نظام کائنات پیش ہوا، ہیومنزم عام ہوا اور جاگیردارانہ اور کلیسائی نظام کی جڑیں ہل گئیں۔

نوکلاسیکیت (Neo-classicism)

ادب کے میدان میں اس کا زمانہ ۱۶۶۰ء تا ۱۸۰۰ء ہے۔ رُومانی شعرا نے نوکلاسیکی شعرا کے اسلوب سے بغاوت کی۔

رومانیت (رومانسیة۔Romanticism)

انقلاب فرانس (۱۷۷۹ء) سے ۱۸۳۰ء تک یورپی ادب میں ایسا رجحان ظاہر ہوا جو نوکلاسیکیت کے مقلدانہ اسلوب کے خلاف بغاوت تھا۔ اس انقلاب نے رومانیوں کو یہ تاثر دیا کہ یہ ایک عظیم دور ہے جس میں دنیا بدل گئی ہے۔ نئے امکانات ظاہر ہو رہے ہیں۔ جاگیری اور کلیسائی تسلط کے خلاف عوامی آزادی کی تحریک برپا ہوئی۔ فرانسیسی انقلاب کے نتیجے میں معاشرتی دائرے میں بہت بڑا انحطاط پیدا ہوا جس کا رومانیت پر بڑا گہرا اثر تھا۔

رومانیت کے نمائندے شلیگل، گوئٹے وغیرہ ہیں۔ رومانویت اور رومانیت کا ایک ہی مطلب ہے۔

حقیقت نگاری/واقعیت (واقعیة۔Realism)

ادبی، فکری، مادی الحادی مکتب فکر جو زندگی کی مادی تصویر کشی کرتا ہے، زندگی کی ایسی تصویر کشی جس پر اصلیت کا دھوکہ ہو۔ روزمرہ کی نارمل اور عمل پسندانہ زندگی کا تصور پیش کرنا اس کا مقصود ہے۔ یہ تحریک رومانی تحریک کی جذباتی اور اسلوبیاتی بے اعتدالیوں کے خلاف ردعمل تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ مکتب فکر ایمان باللہ کا انکار کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان حیوانی جذبات کا مجموعہ ہے۔ اسی بنیاد پر وہ معاشرے پر تنقید کرتا ہے اور مشکلات کا حل تلاش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات کی فطرت بلا روح اور بلا قدر ہے۔

اس کے اہم نمائندے بالزاک، ٹالسٹائی، دستوفسکی، ہمنگوائے اور زولا وغیرہ ہیں۔ جبکہ اشتراکی ادیبوں میں گورکی، مایا کوفسکی، ردجیہ جارودی ہیں۔ ان کے علاوہ فلابیر، ڈکنز، گوگول، ٹالسٹائی، مارک ٹوین، میلول، گالدوس بھی اسی مکتب کے نمائندے ہیں۔ اردو میں ابتدائی افسانوں کا رنگ حقیقت پسندانہ تھا۔

فن برائے فن (Art for Art's sake)

زندگی کے بھرپور تقاضوں اور حقیقت پسندی کے برعکس فن کا کلی طور پر آزاد ہونا۔ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی میں حقیقت پسندوں کے مقابلے میں ظاہر ہوا۔

سریالیت رورائیت (سریالیة۔Surrealism)

جدید آرٹ کا ایک رجحان جس کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں فرانس میں ہوئی۔ یہ فرائڈ کے نظریہ جنس پر مبنی ہے اور لاشعوری جنسی تقاضوں کے اظہار کی فنی کوشش ہے۔ سریالیت پسندوں نے فنون اور ادب میں لاشعوری کیفیتوں کو زبان عطا کرنے کی سعی کی اور شعوری سوچ اور لاشعوری مواد کو جوڑ کر ایک نئی طرز سامنے لانی چاہی۔

یہ تحریک پہلی جنگ عظیم کے چند برس بعد شروع ہوئی اور دادازم کا شاخسانہ تھی۔ پہلی جنگ عظیم چھڑنے سے قبل روز افزوں سائنسی ترقی اور معاشی استحکام کی وجہ سے مغربی تہذیب اس زعم میں مبتلا ہو چکی تھی کہ وہ باقی دنیا سے فائق ہے اور بالکل صحیح راستے پر ہے۔ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں نے اس کے زعم کو خاک میں ملا دیا۔ بے یقینی اور قنوطیت نے سر اٹھایا۔

رمزیت یا علامتیت (Symbolism)

یورپی ادبی تحریک جو فرانس میں واقعیت نگاری کے ابتدائی دور کے بعد انیسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں ابھری۔ اس تحریک میں سریت، اشارات اور باطنیت بنیادی عناصر ہیں۔ اس کے نزدیک حقیقت مبہم ہے لہٰذا فنی علامات بھی مبہم ہونی چاہییں۔ یہ فن برائے فن کی قائل ہے۔

اس مکتب کے نمائندے بودلیئر، راں بو، ورلین، میلا رمے، والیری وغیرہ ہیں۔

وجودیت (وجودیة۔Existentialism)

۲۰ صدی کی ادبی و فلسفی تحریک جو ہیگل کی عقلیت تامہ کے خلاف شدید ردعمل کے طور پر رونما ہوئی۔ یہ عقل و فکر کے بجائے جذبے اور احساس کی روشنی میں وجودیاتی مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس تحریک نے انسان کی قدر و قیمت اور اُس کی حریت و ارادے پر زور دیا۔ وجودیت لفظ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ مکتب فکر وجود کو جوہر پر مقدم کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجودیت کا بانی کیرکیگارڈ ہے جو مذہبی رجحانات بھی رکھتا تھا۔ سارتر نے اِس کو لادینی بنیادوں پر پروان چڑھایا۔ سارتر کی وجودیت کلیسا، دین اور عقلیت کے خلاف زوردار بغاوت ہے۔

لامعقولیت (عبثیۃ/ لا معقولیۃ۔Absurdism)

ادبی فکری مکتب فکر جس کا دعویٰ ہے کہ انسان ضائع ہے۔ معاصر زندگی میں اُس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ اُس کے افکار کا کوئی مضمون نہیں رہا۔ وہ اپنے افکار کو گھسیٹتا ہے اور آلات کے غلبے کی وجہ سے اشیا کو حقیقی حجم کے مطابق دیکھنے سے محروم ہے۔

یہ رجحان مغرب میں مذہب کے زوال، روحانی خلا اور مابعد الطبعیات سے دوری کی وجہ سے پیدا ہوا۔ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد سماجی اقدار تلپٹ ہوگئیں اور اس فضا میں سارتر اور کامیو کے وجودی تصورات خوب غالب آئے۔

ضیاع (بیگانگی۔Alienation)

انسان کا یہ احساس کہ اُس کا اپنے عمیق ترین جذبات اور ضروریات سے کوئی ربط باقی نہیں رہا۔ بامعنی عقائد یا اقدار اپنانے کے راہنما اصول بھی اسے کہیں سے نہیں ملتے۔ کوئی سرگرمی نظر نہیں آتی جو صحیح معنی میں تسکین پہنچا سکے۔ مغرب ادب میں ضیاع کا رجحان بہت طاقت ور ہے لیکن ہمارے یہاں بھی بڑے شہروں میں بسنے والوں کے لیے بیگانگی اور لاتعلقی رفتہ رفتہ حقیقت بنتی جا رہی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۳

دین کے لیے کیا باقی بچا؟

دین کے لیے کیا باقی بچا؟

ایک طویل سفر کے بعد یہ سوال ہمیں درپیش ہے!

ہم نے دیکھ لیا کہ کیسے دین کی جڑوں کو زندگی کے تمام میدانوں سے اکھاڑ دیا گیا۔ سیاست، اقتصاد، معاشرت واخلاق، علم وفن، غرض ہر شعبہ دین سے خالی ہوگیا۔ دین کے لیے کیا باقی بچا؟ کیا نظری یا عملی سطح پر کوئی قابل ذکر شعبہ باقی رہ گیا؟ (۵۷۴)

عملی وفکری سطح پر مشرقی اور مغربی یورپ بعید سمجھتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی مسئلے میں دین سے استفادہ کرے یا اس سے متاثر ہو یا کسی مسئلے میں فتویٰ حاصل کرے۔

کلیسا اور جدید علم کے مابین تلخ روایتی کشمکش نے اِس کی امید ہی ختم کردی ہے۔ اب معاصر یورپی زندگی جس بنیادی اصول پر قائم ہے، وہ دین سے ہٹ کر خواہشات کی غلامی ہے۔ موجودہ انسان جو طوق پہن کر جوان ہوا اور اُس نے اللہ سے جان چھڑائی، اب دوبارہ اُس کی طرف لوٹنے کی حاجت محسوس نہیں کرتا۔

ہر محقق جو چاہے لکھ سکتا ہے، نظریہ، نقد، خرافات، لغویات، گری ہوئی باتیں، فحاشی، طنز ومزاح ۔۔۔ وغیرہ، کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی رائے کو مکمل آزادی کے ساتھ ظاہر کرسکتا ہے جب تک وہ ممنوع مقام کی طرف رجوع نہ کرے، اور وہ دین کا مقام ہے یعنی حلال وحرام کا مرکز۔

اس بارے میں جارج سنتیانا کا بہت عمدہ کلام ہے جو موجودہ ثقافتی مزاج کو مختصراً بیان کرتی ہے: ''ہماری پوری زندگی اور عقل ایک سست لیکن مسلسل ترقی پذیر جدید روح کے ساتھ بھرتی جارہی ہیں۔ یہ آزادی، قومی ڈیموکریسی کی روح پر ایمان رکھتی ہے اور اللہ پر ایمان نہیں رکھتی''۔ (۵۷۵)

اسی طرح ہم علمی محققین کو دیکھتے ہیں، حتی کہ وہ نوجوان جو ہر اتوار کلیسا جاتا ہے، یہ تخصص کے ہر شعبے میں دین کی اندھی دشمنی کے تحت لکھتے ہیں:

جو نفسیات میں گفتگو کرتا ہے، وہ کہتا ہے: دین ایک رکاوٹ ہے جس کو گرا دینا چاہیے تاکہ فرد کی نفسیاتی تعمیر کو نقصان نہ ہو۔!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

جو اقتصادیات میں گفتگو کرتا ہے، وہ کہتا ہے: صنعتی اقتصاد ایک ایسے معاشرے کی محتاج ہوتی ہے جو زرعی معاشرے کی عائد کردہ بیڑیوں سے آزاد ہو۔ جیسے عورت کو فقط مامتا کے لیے محدود کرنا (یعنی صنعتی معاشرے میں عورت کو بھی کام کے لیے نکلنا چاہیے!

جو سماجیات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے، وہ اس سادگی کو حقارت و استہزا سے دیکھتا ہے جو دین کو فطرت اور آسمانی چیز خیال کرتی ہے۔ لوگ کیوں نہیں جانتے کہ انسانوں نے اپنی جہالت اور سادگی کے دور میں دین کو خود گھڑ لیا تھا؟ دیکھو اُن پس ماندہ معاشروں کو جو افریقہ اور آسٹریلیا کے جنگلوں میں ابھی تک ایسی ہی زندگی گزار رہے ہیں۔ تم دیکھو گے کہ دین کا بیج ہمیشہ جہالت، سادگی، خرافات اور خیالی قصہ کہانیوں وغیرہ سے اگتا ہے۔ پھر ۲۰ ویں صدی کی تہذیبی ترقی کو دیکھو! تم اس بات سے شرماتے نہیں کہ تمھارے دل و دماغ میں جنگلیوں سے وراثت شدہ بقیہ جات ہوں؟!

جو خالص سائنسی علوم میں بحث کرتا ہے، وہ بھی دین کی مذمت کو نہیں بھولتا! وہ لوگوں کو یاد دلاتا ہے کہ ایک وقت تھا جب لوگ دین دار ہوتے تھے، وہ اپنی شدید جہالت کے سبب کائنات میں ہونے والے ہر حادثے کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے! ہائے اُن کی جہالت! وہ اُن طبعی قوانین سے واقف نہ تھے جو کائنات پر حاکم ہیں۔۔۔ ہم بیسویں صدی کے اصل علما ہیں۔

جو فن میں گفتگو کرتا ہے۔ وہ اُس دور کو حقیر سمجھتا ہے جب جنس پر گفتگو کرنا عیب سمجھا جاتا تھا اور اخلاق اس کو برا سمجھتا تھا! افسوس ہے تم پر پس ماندہ لوگو! تم پر کشش، دل فریب، حسن و جمال کے رنگوں سے کتنے دور تھے! ہمیں دیکھو ہم اصل آزاد لوگ ہیں! ہم نے آج جنس کو قائم بالذات فن بنا دیا ہے۔۔۔ جنس کے لمحات ایک مکمل جہان ہے۔۔۔ آؤ ہم اُس کے تمام گوشوں کی سیر کریں۔۔ آؤ ہم اس کو نفس کی گہرائیوں میں اور عملی زندگی میں بیان کریں۔۔ آؤ ہم اُس کی مستی کو کھول کھول کر ظاہر کریں۔۔۔ آؤ ہم مرد و زن تمام لوگوں کو ننگا کریں۔۔۔ آؤ ہم ان کو چھوڑ دیں کہ وہ جنس کی سرگرمیوں سے جوش و بشاشت حاصل کریں۔۔۔ ہم ابھی کیمرے کو رجسٹرڈ کرا لیں۔ (۵۷۶)

جو سیاسیات پر گفتگو کرتا ہے۔ وہ قرونِ اولیٰ میں انسان کی حالت پر افسوس کرتا ہے، جو ایسے غیبی قوانین کے ماتحت ہوتے تھے جن کے وضع و تشکیل میں اُن کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا۔ وہ اطاعتِ الٰہی کے نام پر زندگی کے تمام حقوق و حریتوں سے محروم تھے!!! اس کے علاوہ کئی محققین اور مصنفین ہیں۔

یہ فکر و بحث کی سطح پر ہے۔ عملی میدان میں کیا ہوتا ہے؟

مشرق کا کمیونسٹ صراحت سے اعتراف کرتا ہے کہ اس نے عبادت اور دینی مظاہر کی تمام شکلوں کا کام تمام کر دیا ہے حتی کہ دین کی انفرادی شکلیں بھی ختم کر دی ہیں۔ اس لیے اب اس موضوع پر گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں۔ مغربی سرمایہ دار نظام کہتا ہے کہ اُس کا سیکولرزم لادین ضرور ہے لیکن دین دشمن نہیں۔ بظاہر ایسے ہی محسوس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا ہے کہ مغربی سرمایہ دار نظام دین کا دشمن نہیں۔

لادینیت کے داعی، چاہے وہ خود دھوکے باز ہوں یا دھوکے میں مبتلا ہوں، کہتے ہیں: اس میں دین کا کوئی نقصان نہیں کہ زندگی کو لادینیت پر قائم کیا جائے !! کیونکہ اس طرح کلیسا بدستور کھلے رہیں گے بلکہ ان کی تعداد زیادہ ہو جائے گی۔ اتوار والے دن رسمی اور غیر رسمی دائرے کے امور بند ہو جائیں گے، اُس وقت کلیسا کے واعظین اور داعی بھرپور سرگرمی اختیار کر سکتے ہیں۔ یہاں شخصی حریت بھی ہوگی جو حریت عقیدہ پر کسی قسم کی پابندی نہیں رکھے گی۔ اور دین کا کوئی جوشیلا حامی یہ موقع بھی پا سکتا ہے کہ وہ رہبانیت کی لڑی میں داخل ہو جائے، کسی فلاحی کام کی جماعت میں شریک ہو یا کسی تبلیغی عیسائی مشن کے ساتھ بیرون ملک سفر کرے۔

اسے یہ بھی حق ہوگا کہ اُس کے دینی مراسم، روایات اور تقاریب، ریاست کی طرف سے کسی اعتراض کے بغیر قائم ہوں۔ بلکہ حکومت کے افراد بھی کبھی کبھی حاضری دے کر کلیسا کو مشرف کیا کریں گے۔

نکاح کی بات کریں تو عوام کی اکثریت نظری طور پر اِس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ کلیسا میں نکاح، عدالتی نکاح سے بہتر ہے یا بلا نکاح تعلقات قائم کرنے سے بہتر ہے۔

یہ سب امور، اُن کی نظر میں، دین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے اثر و رسوخ کی حفاظت کرے اور اپنے مخصوص دائرے میں اپنے پیروکاروں کی حسب منشا راہنمائی کرے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کو لادین طرز پر جاری کرنے سے یہ اندیشہ جو ظاہر کیا جاتا تھا کہ اِس سے دین کو نقصان ہوگا، لغو تھا جس کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

ہم جواباً یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے نازل کردہ دین کو زندگی کے کسی زاویے میں سکیڑ دینا درست نہیں۔ لیکن ہم یہ بھی کہیں گے کہ یورپی زندگی کے جس گوشے کے متعلق یہ وہم دلایا جاتا ہے کہ وہ دین کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے، خالص دینی نہیں رہتا۔ بلکہ اُس پر دین سے آزادی کی موجیں سرکشی کرتی ہیں حتی کہ دین کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ ایک کھوکھلا مظاہرہ بن جاتا ہے جس کا لوگوں کے احساسات اور رویوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

یہ بات کوئی عجیب و غریب نہیں کیونکہ سیکولرزم کا تصور اس چیز پر قائم ہے

﴿فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَى شُرَكَآئِهِمْ﴾ (الانعام۔۶/۱۳۶)

پھر جو چیز ان کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے۔

انسانی فطرت بلکہ اللہ کی سنت، اِس بات کی کبھی اجازت نہیں دیتی کہ دین اور لادینیت اکٹھے گزر بسر کریں اور ایک ہی معاشرہ میں یا ایک ہی فرد میں اکٹھے مل جل کر نشو و نما پائیں۔

اسی وجہ سے مغربی معاشرہ ۲۰ ویں صدی کے آغاز سے ہی دین سے حقیقی طور پر خالی ہو گیا ہے۔

دین اپنے صحیح مفہوم سے گر گیا ہے۔ اب دین کا مطلب فقط دو باتیں ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سخت بے جان رسومات کی ادائیگی جن کو لوگ دینی ورثے کے تحت عادت اور فقط عادت کے تحت مضبوطی سے کرتے ہیں یا کچھ لوگ خوش طبعی یا لاابالی پن میں یہ سمجھ کر دینی مراسم ادا کرتے ہیں کہ یہ پرانی خرافات ہیں جن کو کوئی بھی فرد بعض مواقع پر ظاہری طور پر ادا کر سکتا ہے لیکن وہ تنہائی میں نادم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی نامعقول حرکت کر گزرا ہو۔(۵۷۷)

ایک امریکی صحافی دین کے زوال اور مادیت کے عروج کو ان لفظوں میں بیان کرتا ہے: انگلینڈ والے ہفتے میں چھے دن بنک انگلینڈ کی پوجا کرتے ہیں اور ساتویں دن کلیسا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔(۵۷۸)

لیکن حقیقت میں معاملہ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ جو لوگ اتوار کو کلیسا جاتے ہیں، وہ بہت تھوڑی مقدار میں ہیں۔ پھر یہ معمولی مقدار کلیسا کے دین سے اتنا حصہ بھی نہیں پاتی جو اُن کے دلوں کی گہرائی میں اتر سکے۔ بلکہ بسا اوقات اُسے کلیسا میں لذت ونشاط کے وہ اسباب میسر آتے ہیں جو دیگر مخصوص مقامات سے میسر نہیں آتے۔

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ دین یا صحیح تر لفظوں میں وہ محدود وقت جس کے بارے میں لادین احسان جتلاتے ہیں کہ، انھوں نے دین کے لیے چھوڑ دیا، کا کتنا اثر اور ثمرہ ہے؟

مشہور امریکی ادیب ایمرسن (۱۸۸۲ء) کہتا ہے: ''بے شک اتوار کا دن پادری کے لیے بھی فطرت کی چمک دمک سے محروم دن ہوتا ہے۔ یہ قابل نفرت دن ہے ہمیں اس کے گزر جانے پر خوشی ہوتی ہے۔ جب اس دن میں دُعا شروع ہوتی ہے تو ہم سکڑ جاتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے نزدیک بلند مرتبہ نہیں۔ یہ دعا ہمیں تکلیف دیتی ہے۔ اُس وقت ہماری خواہش ہوتی ہے کہ ہم اپنی چادروں میں چھپ جائیں اور کسی الگ تھلگ جگہ چلے جائیں جس میں ہم کسی کو نہ سن سکیں۔ میں ایک دفعہ ایک واعظ کی بات سننے چلا گیا۔ اس نے مجھے کچھ کہنے پر اتنی شدت سے مجبور کیا کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ آئندہ کبھی کلیسا کا رخ نہ کروں گا۔ لوگ میرے گمان کے مطابق کلیسا اس لیے جاتے ہیں کیونکہ وہ اس کے عادی ہیں وگرنہ کوئی بھی شام کے وقت عبادت خانے کا رُخ نہ کرے۔(۵۷۹)

وہ کہتا ہے: ''بے شک دعائیں، بلکہ ہمارے کلیسا کے ثابت شدہ عقائد دندرہ (ایک مقام) میں برج کے زیادہ مشابہ ہیں جو لوگوں کی زندگی اور اعمال سے یکسر الگ تھلگ اور جدا کھڑا ہوتا ہے۔

کیا کوئی شخص اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ اپنے دوست کو ہفتے والے دن دینی اجتماع میں آنے کی دعوت دے حالانکہ سب جانتے ہیں ایسے دن کی دعوت قبول ہونے کی امید بہت کم ہے؟ کیا وہ ان کو خاص عشائے ربانی کی دعوت دے سکتا ہے؟ وہ اس پر جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ جب دل دینی شعائر کی گرمی سے خالی ہوں تو اُس کا کھوکھلا ظاہری ڈھانچہ حقیقت حال کی کھلی وضاحت کرتا ہے۔ وہ اتنی طاقت نہیں رکھتا کہ اُس کی بات کو کوئی عقلمند قبول کرے اور وہ اُس کو بلاخوف وخطر دعوت دے سکے۔ دین کا محب پادری اُس گستاخ دیہاتی کو کیا کہے گا جو شارع عام پر اللہ کے ساتھ کفر کرتا ہے؟ کافر دیہاتی خود پادری کے چہرے پر خوف محسوس کرے گا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کسی شخص کے بارے میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ اپنے مخصوص لادین نظریات کے ساتھ کسی کلیسا کا رُخ کرے اور اسے یہ محسوس نہ ہو کہ کلیسا کا لوگوں پر قبضہ ختم ہو چکا ہے۔ کلیسا نے تو اپنا غلبہ بہترین لوگوں کے دلوں سے بھی اٹھالیا اور شریر لوگوں کے اندیشوں سے بھی۔ اب آدھی دینی سرگرمیاں محض دینی ترانے گانے تک محدود ہیں۔ اور آثار یہ بتلاتے ہیں کہ اخلاق و دین خود دینی اجتماعوں سے بھی ختم ہو گئے ہیں۔ میں نے ایک دین دار شخص کو سنا جو اتوار کے مذہبی دن کو بہت اہمیت دیا کرتا تھا، وہ ناگواری کے ساتھ کہہ رہا تھا: میرا خیال ہے کہ آدمی اتوار کے دن کلیسا کا رخ کرے تو یہ ایک گناہ ہوگا۔ (۵۸۰)

ایمرسن کی وفات کو ایک صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ اگر وہ اس صدی میں زندہ ہوتا تو کیا لکھتا جبکہ کلیسا کس بری طرح زوال پذیر ہو چکا ہے۔ کلیسا کے زوال کا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا جاتا ہے، ایک لکھاری لکھتا ہے:

جب کلیسا میں مذہبی عبادت ختم ہوگئی اور دعا میں نوجوان ارکان، لڑکے لڑکیاں شریک ہوگئیں اور دوسروں نے بھی اپنی مذہبی عبادت مکمل کر لی۔ ہم پہلو کی جانب سے ایک دروازے سے کھسک کر رقص کے میدان کی طرف آ گئے جو عبادت کے ہال سے ملحق تھا اور درمیان میں ایک دروازہ تھا۔ فادر اپنے دفتر کی طرف چڑھ گیا اور ہر لڑکے نے ایک لڑکی کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ لڑکے لڑکیاں وہ تھے، جو مذہبی ترانے گا چکے تھے اور اب رقص کے فلور پر تھے۔ سارا فلور سرخ، نیلی اور سفید روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گراموفون کے نغموں پر رقص گرم ہو گیا اور میدان قدموں اور پنڈلیوں سے تھرکنے لگا۔ ہاتھ کمروں کے ساتھ لگ گئے، ہونٹ اور سینے باہم ملنے لگے۔ فضا عشق و مستی سے بھر گئی۔ جب فادر دفتر سے نیچے اترا، اُس نے رقص گاہ پر ایک بھرپور نظر پر ڈالی۔ وہ بیٹھی ہوئی خواتین و حضرات کی حوصلہ افزائی کرنے لگا تا کہ وہ اٹھیں اور رقص میں شریک ہوں۔ اُس نے غور کیا کہ سفید روشنیوں کی تعداد کچھ زیادہ ہے جو رومانی خواب ناک فضا کو خراب کر رہی ہے۔ وہ امریکی چابک دستی سے چلا اور اُن کو ایک ایک کر کے بجھانے لگا۔ وہ بچ کر چل رہا تھا کہ کسی کے رقص میں خلل واقع نہ ہو۔ فضا بہت رومانی ہوگئی، وہ گراموفون کی طرف بڑھا تا کہ رقص کے لیے ایسی ٹون منتخب کرے جو ماحول سے ہم آہنگ ہو اور بیٹھے ہوئے مردوں عورتوں کو بھی شرکت پر اُبھارے۔ اُس نے ایک مشہور امریکی نغمہ پسند کیا۔۔۔

(But baby it is cold outside) (لیکن پیاری! باہر کی فضا تو بہت ٹھنڈی ہے)

یہ نغمہ ایک مکالمہ پر مشتمل ہے جو ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کے درمیان ہوا، جو اپنی نیند سے جاگے تھے۔ لڑکے نے لڑکی کو اپنے گھر میں روکا ہوا تھا۔ جب بھی وہ باہر جانے کے لیے کوئی حجت پیش کرتی تو لڑکا اُس کو اس جواب سے نوازتا (پیاری! لیکن باہر کی فضا تو سخت سرد ہے)

فادر نے کچھ انتظار کیا حتی کہ جب اُس نے دیکھا کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے پاؤں بھڑکیلے گانوں کے ہم آہنگ بے روک ٹوک تھرک رہے ہیں۔ تو وہ مطمئن ہو گیا۔ اس نے رقص گاہ سے اپنے گھر کی طرف رخ کیا اور اُن

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لڑکوں اور لڑکیوں کو اس لذیذ اور مست شب بیداری کے لیے چھوڑ دیا۔ اُس نے کلیسا کی چابیاں یہ کہہ کر سپرد کیں کہ کلیسا سے رخصت ہونے والا آخری جوڑا تالہ لگا کر چابیاں اُس کے گھر دیتا جائے۔ اب ہر جوڑے کی واپسی اُن کے حسب مزاج اور حسب منشا تھی!! (۵۸۱)

اس طرح کلیسا مجبور ہوا کہ موجودہ صورت حال کے پہلو بہ پہلو چل سکے۔ جب اُس نے لوگوں میں مسلسل بے اعتنائی دیکھی تو اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا۔ اب مٹھی بھر چند جاہل بوڑھیاں اور شاذ لوگ ہوتے ہیں جو کلیسا کا رخ کرتے ہیں۔

اس مایوس کن صورت حال نے دین کے حامی بعض معاشرتی راہ نماؤں کو پریشان کیا، چنانچہ ایک کتاب صادر ہوئی جس میں مصنفین نے کہا: بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یومیہ زندگی کی مشکلات اور دین کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہیں۔ لیکن یہ رائے بڑی عجیب محسوس ہوتی ہے۔ اگر اِس رائے کو قرونِ وسطیٰ میں پیش کیا جاتا تو شاید یہ اُس وقت کلیسا کی نظر میں کفر شمار ہوتی یا کفر کی دعوت، کیونکہ کلیسا کا دائرہ انسان سے صادر ہونے والے ہر قول یا فعل پر لاگو ہوتا تھا۔ لیکن اس دور کے فرزند اُن فلسفوں سے تعلق رکھتے ہیں جو عقل مطلق کو ہر چیز سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ اُن کے لیے مشکل ہے کہ وہ اُس زمانے کے حالات کو سمجھ سکیں جب انسان کلیسا کے مقرر کردہ دائرے میں، اُس کے قوانین و نظام کے تحت ہی زندگی گزارتا تھا۔

حال ہی میں ایک فتویٰ طلب کیا گیا کہ دین کا یومیہ زندگی کے متعلق کیا کردار ہے؟ تو نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ دین کا کم از کم شعوری سطح پر ہزاروں لوگوں کے قلوب و اذہان سے کوئی بڑا تعلق نہیں۔ لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ یہ غیر دین دار تھے، ان میں سے بہت سارے کلیسا کے سربراہ تھے۔ اصل سبب یہ تھا کہ وہ اپنے یومیہ مشاغل اور اپنے دین کے درمیان کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے۔ اُن میں سے اکثر یہ اعتراف کرتے ہیں کہ دین اُن کی شخصیت کی گہرائیوں تک نہیں پہنچ سکا۔ بے شمار لوگوں کے لیے یہ صورت حال تکلیف دہ ہے خصوصاً کلیسا کے افراد کے لیے جو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ فقط انسان کے ظاہر تک پہنچ پائے ہیں اور وہ دین کو انسان کی قلبی گہرائیوں تک نہیں پہنچا سکے۔ (۵۸۲)

انگریز فلسفی جوڈ کہتا ہے: ''میں نے بیس طالب علم بچوں اور بچیوں سے ایک سوال کیا، وہ سب اپنی عمر کی دوسری دہائی میں تھے، میں نے پوچھا: اُن میں سے کتنے ہیں جو کسی بھی معنی کے لحاظ سے مسیحی ہیں۔ اُن میں سے فقط تین نے ہاں میں جواب دیا۔ سات نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلے میں کبھی غور نہیں کیا۔ باقی دس نے صراحت سے کہا کہ وہ مسیحیت کے دشمن ہیں''۔ (۵۸۳)

جب دین اس حد تک عوام کے احساسات اور جذبات سے گم ہو جائے۔ پھر کسی شخص کے لیے یہ سوال پوچھنے کی ضرورت رہ جاتی ہے کہ دین کا مغربی لوگوں کی زندگی میں کیا کردار ہے؟ کیا دین کے خاتمے کی وجہ یہ نہیں کہ سیکولرزم زندگی کے تمام شعبوں پر لاگو ہو گیا اور فرد و معاشرے کے وجود میں سرایت کر گیا؟

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ معاشرہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کا سیکولرزم دین کا دشمن نہیں لیکن اس کے باوجود اس میں یہ سوال اٹھتے ہیں۔ اسی سیکولرزم کے متعلق ایک نوآموز لکھاری لکھتا ہے، جس کو کتاب مقدس اٹھانے کے معاملے میں لوگوں کی طرف سے سختی کا سامنا کرنا پڑا، وہ اُس کو دین داری کے سبب نہیں اٹھا رہا تھا بلکہ فقط معلومات حاصل کرنے کے لیے اٹھا رہا تھا۔ وہ کہتا ہے: ''میں نے کتاب مقدس کو اپنی عمر کے ابتدائی دس بیس سالوں میں پڑھا تھا۔ یہ اُن دین دار گھرانوں کی تقلید میں ایک رواجی عمل تھا جہاں کتاب مقدس کی قرأت فقط ایک رسم ہے۔ ایک دفعہ مجھ پر سختی کی گئی کہ میں اپنے کام کی طرف جاتے ہوئے اور آتے ہوئے کتاب مقدس کیوں اٹھاتا ہوں۔ یہ سلسلہ چند ماہ چلتا رہا۔ ایک دن مجھ پر ایک اور مشکل آن پڑی، میں نے کتاب مقدس کو ایک ورق میں لپیٹ دیا جیسے یہ کوئی سکول کی کتاب ہو۔ میں نے اُس کو لوگوں کی نظروں سے چھپایا گویا یہ کوئی بری چیز ہے۔ میں اُس کو اپنے کام کی طرف جاتے ہوئے راستے میں نہیں کھولتا تھا۔ میرے ساتھ ایک بندہ بیٹھتا تھا، اس نے ایک دن کتاب کھولنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے مجھے ایسی خشمگیں نظروں سے دیکھا گویا کہ میں نے لپ سٹک لگائی ہوئی ہے اور آپ کا اُس وقت کیا حال ہوگا جب لوگ آپ کو پادری یا دین کا متعصب داعی سمجھیں'' (۵۸۴)

جب دین کی یہ صورت حال بن جائے کہ وہ ایک محدود شخصی چیز قرار پائے اور فقط حسب مزاج استعمال کیا جائے۔ کیا اُس کے بعد بھی کوئی چیز باقی رہ جاتی ہے؟!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

باب: الحاقی۔ ا

سرمایہ دارانہ نظام، بنیادی تعارف

یہ وہ نظام ہے جو عیسائیت میں روایت پسندی اور اجماع کے انکار کے بعد پروٹسٹنٹ فکر اور جدیدیت کی فکر کے نتیجے میں یورپ کے اندر پروان چڑھا۔ یورپ میں وحی الٰہی کے مقابلے میں دو مشہور علمی تحریکیں، تحریک تنویر (این لائٹن منٹ) اور تحریک وجدان (رومانسٹسزم) کامیاب ہوئیں۔ مذہبی علمیت (کتاب الٰہی، روایات، اجماع علماء دین) کے مقابلے میں مادی علمیت (فلسفہ، نیچرل سائنس، سوشل سائنس) کو پروان چڑھایا گیا۔ معاشرہ کی سطح پر عبدیت الٰہی کے مقابلے میں آزادی، مساوات اور ترقی کو بلند ترین معاشرتی قدر کے طور پر اپنایا گیا۔ علوم کا مقصد رضاء الٰہی کی بجائے انسانی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسکین ٹھہرا۔ یہ نظام فرد، معاشرہ اور ریاست کی سطح پر انسانوں میں زیادہ سے زیادہ لادین آزادی کو فروغ دیتا ہے اور عبدیت کی بجائے سرمایہ پرستی، حرص وحسد اور حیوانی لذات کو عام کرتا ہے۔ حکومت کی سطح پر ایسا نظام قائم کرتا ہے جس کا جواز مذہب واخلاق کی حاکمیت کی بجائے انسان کی ذاتی خواہشات کی حاکمیت پر ہو۔ عالمی سطح پر یہ نظام اپنی بقا کے لیے سرمایہ اور حرص اور حسد کے عالمی فروغ کو ضروری سمجھتا ہے اور مختلف حکومتوں اور معاشروں کو سرمایہ دارانہ اخلاق بزور یا برضا ورغبت اپنانے پر مجبور کرتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کا تاریخی پس منظر

سرمایہ دارانہ نظام کی ابتداء یورپ سے شروع ہوئی اور یورپ کی فکری تاریخ کے ماخذ چار ہیں۔

① یونانی فلسفہ (ارسطو وافلاطون وغیرہ کا فلسفہ) جو کہ فلاسفہ کا عہد زرّیں کہلاتا ہے۔

② یونانی دیومالائی خرافات وضمنیات جو فلاسفہ کے دور میں ہی موجود تھیں۔

③ منحرف عیسائیت (صلیب کی پوجا، تثلیث، نجات کا عقیدہ، ازلی گناہگار ہونے کا نظریہ، رہبانیت)

④ رومن افکار ونظریات۔

☆ ۱۰۰۰ء میں سینٹ آگسٹائن نے کلیسائی نظام کے تحفظ کے لیے بادشاہت کو ناگزیر قرار دیا لیکن اس نے خدائی بادشاہت اور انسانی بادشاہت کو الگ قرار دے کر سیکولرزم کا بیج بویا۔ اس کے نزدیک خدائی بادشاہت دل ودماغ پر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائم ہوتی ہے اور انسانی بادشاہت اعمال وظاہر پر۔ دین اللہ کا اور قانون رومن ایمپائر کا۔ عیسائیوں کے پاس تورات ویہود کا قانون موجود تھا لیکن انھوں نے اس کی پیروی کو لازم نہ سمجھا۔

تحریک اصلاح مذہب۔ عیسائیت کی پہلی علمی شکست

تاریخ یورپ میں عیسائیوں کو پہلی علمی شکست مارٹن لوتھر کی تحریک سے ہوئی۔ اس تحریک کے تین اہم پہلو تھے۔

① اس تحریک نے انجیل کی تشریح کا حق ہر انسان کو دیا۔ اجماعی مسائل کا انکار کیا۔ یہ مکمل مذہبی تحریک تھی لیکن اس کے نتیجے میں لبرلزم (آزادی کو بنیادی قدر ماننا) کا نظریہ پروان چڑھا۔ آزادی اور مساوات کی اقدار رائج ہوئیں۔

② اس تحریک نے بادشاہوں کی مطلق اطاعت کا حکم دیا۔ بادشاہ کو خیر وشر متعین کرنے کا حق بلا شرکت غیرے حاصل ہے۔ بادشاہ پوپ کے اثر سے آزاد ہوئے۔ عظیم عیسائی ریاست چھوٹی چھوٹی قوموں اور بادشاہوں میں تقسیم ہوئی۔

③ مارٹن لوتھر کی تحریک سے عیسائی معاشرت میں پہلی دفعہ حرص حوس اور حسد کی مدح کی گئی جو کہ درحقیقت لادین سرمایہ دارانہ نظام کا بیج تھا (ص ۳۹)۔ قدیم جاگیردارانہ نظام اپنی کچھ خرابیوں کے باوجود، دینی و مذہبی اخلاقیات کے اردگرد گھومتا تھا لیکن دینی اخلاقیات کی کمزوری سے حرص اور حسد کو فروغ ہوا، جاگیردار سرمایہ دار بن گئے۔ کسان قلاش ہوگئے، جاگیرداروں نے صنعت کاری کا بھی آغاز کیا اور دیہاتوں سے شہروں تک سرمایہ داروں کا قبضہ ہوگیا۔ عیسائی بادشاہ نے اس کے مقابلے میں مزاحمت کی تو عیسائی بادشاہت ختم کر کے دستوری بادشاہت اور پارلیمنٹ کی بالادستی کو رائج کیا گیا۔ اور پارلیمنٹ پر سرمایہ داروں کا ہی قبضہ تھا۔

عیسائی علمیت کی پہلی شکست اجماع کے انکار پر مبنی تھی

مغربی مفکرین نے سب سے پہلے تصورِ خدا یا عیسائیت کا رد نہیں کیا بلکہ اجماعِ امت، دستورِ الٰہی اور قانونِ الٰہی کا رد کیا۔ جان لاک نے سب سے پہلے عوام کی حکمرانی کا نظریہ پیش کیا تو وہ خدا کی مرضی کے اصول ہی کی بنیاد پر تھا یعنی عوام کی حکمرانی ہونی چاہیے، اس لیے کہ خدا کی مرضی بھی یہی ہے۔ دنیا کا پہلا دستور امریکہ میں وجود میں آیا۔ اس کے بعد تمام تر جمہوری دساتیر اس کی توثیق کرتے ہیں۔ یہ دستور کتابِ الٰہی کو سند مان کر نہیں لکھا گیا اور نہ ہی عوامی آرا واکثریت سے لکھا گیا۔ اس کو مدوّن کرنے والے وہ مفکرین تھے جو علم کا ذریعہ عقل کو قرار دیتے تھے اور منبعِ علم کتابِ فطرت کو (ص ۴۰) (نیز دیکھیے۔ ص ۱۱۰ تا ۱۱۲)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سرمایہ دارانہ نظام، اُصول ومبادی اور اساسی اقدار

پروٹسٹنٹ فکر سے جدیدیت کی فکر تک

مارٹن لوتھر نے تحریک اصلاح مذہب کی صورت میں کیتھولک فرقے کے مقابلے میں پروٹسٹنٹ فکر کی بنیاد رکھی۔ جس نے درحقیقت جدیدیت کو ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ پروٹسٹنٹ فکر اور جدیدیت کی فکر میں دو گہرے فرق تھے۔

① پروٹسٹنٹ فکر کا مطلق نصاب انجیل تھا جبکہ جدیدیت کا کوئی مطلق نصاب نہ تھا۔ مثلاً خدا کے تصور کا انکار پروٹسٹنٹ فکر کے مطابق ناممکن تھا کیونکہ انجیل سے انکار خدا کا تصور اخذ کرنا کسی بھی طرح ممکن نہ تھا جبکہ جدیدیت میں تصور خدا کا انکار عین ممکن تھا اور عملاً واقع ہوا۔

② پروٹسٹنٹ فکر میں آزادی کا تصور مخصوص علمی بنیادوں پر تھا مگر جدیدیت میں آزادی کا تصور لامحدود تھا۔ مثلاً پروٹسٹنٹ فکر میں لواطت کو جائز قرار دینا کسی طرح ممکن نہ تھا لیکن جدیدیت میں یہ ممکن ہوگیا۔

ڈیکارٹ پہلا فلسفی تھا جس کو جدیدیت کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ ڈیکارٹ کے نزدیک دنیا میں واحد قائم بالذات سچائی انسان کا وجود ہے جس کا انکار ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ ہر قدر، معیار، تصور خیر وشر، وحی، وجود خدا وغیرہ کا انکار ممکن ہے۔

جدیدیت کی کوئی متعین تعریف نہیں کی جاسکتی تاہم اس کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں۔ نمبر۱۔ انسان کائنات کا مرکز ومحور ہے۔ نمبر۲۔ آزادی بنیادی آئیڈیل ہے۔ نمبر۳۔ مساوات بنیادی قدر ہے۔ نمبر۴۔ عقلیت بحیثیت معیار۔ عقل ہی خیر وشر کی پہچان کا واحد ذریعہ ہے۔ عقل کی بنیاد پر قطعی اور آفاقی سچ کا حصول ممکن ہے۔

☆ جدیدیت کے نتیجہ میں ہیومنزم کی تحریک پیدا ہوئی۔

ہیومنزم (انسان پرستی)۔ کائنات کے تمام حقائق صرف اور صرف انسانی پیمانوں پر ہی پرکھنا علمیت کی میراث قرار پایا۔ انسان پرستی کو اقداری ڈھانچے میں کلیدی اور قطعی حیثیت حاصل ہوگئی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

☆ ۱۶ویں صدی کے بعد یورپ میں دو ہمہ گیر تحریکوں کو فروغ ملا۔ یہ دونوں تحریکیں (تحریک تنویر یا این لائٹن منٹ) اور رومانٹسزم تھیں جو عیسائیت کو مکمل طور پر رد کرتی تھیں۔ ان دونوں تحریکوں نے آزادی کو بنیادی قدر قرار دیا اور ان کے نزدیک آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر وہ چیز حاصل کرنے کا مکلّف ہو جائے جس کی وہ خواہش کرتا ہے اور بحیثیت انسان وہ خیر و شر کے معیارات متعین کرنے کا خود اہل ہے۔

☆ تمام جدیدیت پسندوں کا اجماع ہے۔ کہ انسان کا آزاد ہونا بنیادی قدر ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی آزادی کو زیادہ سے زیادہ کیسے بڑھایا جائے۔ مغربی فکری و عقلی تاریخ کی تمام تر جدوجہد اس کے گرد گھومتی ہے۔

☆ **لبرلزم۔ کمیونٹیرین ازم۔**

مغرب میں انسان پرستی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی جن میں دو شکلیں اہم ہیں۔ لبرلزم۔ کمیونٹیرین ازم۔

یہ دونوں فکری تحریکیں درحقیقت تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کی جانشین تھیں۔ لبرلزم انفرادیت پسند تحریک تھی جو ہر ہر فرد کی اپنی اپنی آزادی کے فروغ پر یقین رکھتی تھی اور کلاس، طبقہ، نسل وغیرہ کی آزادی کو فرد کی آزادی کے منافی سمجھتی ہے۔ اسی وجہ سے لبرلزم کے نزدیک انسانوں کی حقیقی آزادی یہ ہے کہ وہ مذہب، معاشرہ اور ریاست کی مداخلت سے زیادہ سے زیادہ آزاد ہوں۔ اس کو آزادی کا منفی تصور بھی کہا جاتا ہے۔

جبکہ کمیونٹیرین ازم ہر شخص کی الگ الگ آزادی کی بجائے کسی قوم، طبقہ، نسل، وطن وغیرہ کی آزادی پر یقین رکھتی تھی۔ اس تصور آزادی کے حصول کے لیے فرد کو اپنی انفرادی آزادی اجتماعی آزادی کے حصول کے لیے قربان کرنا پڑتی ہے۔ اس تصور کو **آزادی کا مثبت تصور** کہا جاتا ہے۔ اس تصور آزادی کو روسو، ہیگل اور مارکس نے پیش کیا۔ اور نیشنلزم اور سوشلزم اسی قسم کی آزادی کی اضافت ہیں۔

ان دونوں تصورات کے حامل مفکرین ایک دوسرے کی آزادی کے منکر ہیں۔ لبرل مفکرین کے نزدیک آزادی کا منفی تصور (انفرادیت کا فروغ) ہی اصل آزادی ہے جبکہ مثبت آزادی خطرناک، لاحاصل اور لغو ہے۔ اس سے فاشزم کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ (ص ۸۱)

☆ **آزادی کی ٹھوس شکل۔**

آزادی بذات خود کچھ نہیں۔ اس کی ٹھوس شکل سرمایہ اور ووٹ کی شکل میں صورت پذیر ہوتی ہے۔ جس کے پاس سرمایہ زیادہ ہوگا وہ زیادہ سے زیادہ آزادی سے مستفید ہو سکے گا۔ اسی طرح ووٹ سیاسی و قانونی سطح پر آزادیوں کے فروغ کی ٹھوس شکل ہے۔ ووٹ میں آزادی کا حصول اس طرح ممکن ہوتا ہے کہ ہر فرد کی اخلاقی حیثیت سے قطع نظر اس کے ووٹ کو دوسرے کے برابر قرار دیا جاتا ہے۔

لبرلزم اور کمیونٹیرین ازم دونوں میں آزادی ہی بنیادی قدر ہے لیکن لبرل معاشرے میں، اشتراکی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشرے کی بہ نسبت سرمایہ اور ووٹ کے فروغ کی وجہ سے آزادی کے پھلنے پھولنے کے زیادہ امکانات نظر آتے ہیں۔ (ص ۵۴)

مغرب کا یہ تصور آزادی جیسا کہ اس کی بنیادوں اور تاریخ سے ثابت ہے۔ اسلامی تصور آخرت، تقویٰ، دین داری اور رضاء الٰہی کی عین ضدّ ہے۔

☆ **لبرل معاشرہ اور سول سوسائٹی۔**

لبرل معاشرہ میں غیر مذہبی علمیات غالب ہوتی ہیں۔ معاشرت اور معیشت کی بنیاد فقر و قناعت کی بجائے حرص و ہوس اور حسد ہوتی ہے۔ مذہبی اداروں کی بجائے حرص و ہوس کے ادارے غالب ہوتے ہیں۔ نظامِ حکومت ایسا ہوتا ہے جس کا جواز مذہب کی بجائے عوام سے حاصل کیا جاتا ہے۔ (ص ۳۳)

سول سوسائٹی یا لبرل معاشرہ مذہبی معاشرے کی ضد ہوتی ہے۔ اس کا قیام آناً فاناً نہیں ہوتا بلکہ بتدریج عمل میں لایا جاتا ہے۔ سول معاشرے کے قیام کی ابتداء اجماع امت کے انکار سے کی جاتی ہے۔ (ص ۳۶)

سول سوسائٹی میں مذہبی اخلاقیات (شرم و حیا، سخاوت و قناعت، تقویٰ و فکر آخرت) کی بجائے سرمایہ دارانہ اخلاقیات (حرص و حسد، حیوانی لذات، سرمایہ پرستی) کو غلبہ ہوتا ہے۔

لبرل معاشرے میں افراد خود غرض بن جاتے ہیں۔ معاشرہ شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ خاندانی نظام ختم ہو جاتا ہے۔ جنسی انارکی عام ہو جاتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ علمیت

علمیت (Epistomology) سے مراد علم کی ماہیت، علم کا ماخذ، علوم کی درجہ بندی وغیرہ کی بحث ہے۔

سرمایہ دارانہ تصورِ علم

سرمایہ دارانہ علمیت کے مطابق ''حوادثاتِ عالَم اور انسانی زندگی اور معاشروں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی تشریح وتعبیر میں انسانی نقطہ نگاہ سے غور کرنے کے رویے کا نام علم ہے''۔ دوسرے لفظوں میں وحی سے حاصل ہونے والے علم کی روشنی میں اس کائنات اور انسانی معاشروں کو سمجھنے کی کوشش کرنا سرمایہ دارانہ علمیت کے مطابق معتبر علم نہیں۔

سرمایہ دارانہ علوم۔

تحریک تنویر کے نتیجے میں جو علوم متشکل ہو کر آج تک ہمارے سامنے آئے ہیں۔ وہ دو قسم کے ہیں۔

① طبعی سائنسز (Natural Sciences) ۲۔ معاشرتی سائنسز (Social Sciences)

ان سائنسز کے ماہرین کبھی بھی اپنی راہنمائی کے لیے وحی کے علوم کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

تنویری مفکرین کے نزدیک جس طرح فطرت میں ایسے قوانین ہیں جو مادی اشیا پر عائد ہوتے ہیں بالکل اسی طرح انسانی معاشروں میں بھی ایسے قوانین فطرت ہیں جن کے تحت معاشرے قائم رہتے ہیں۔ لہٰذا معاشروں اور انسانی تعلقات کی تفہیم کے لیے بھی سائنسی تجربے اور مشاہدے کا طریقہ استعمال کرنا ضروری ہے۔

سرمایہ دارانہ علم کا نام سائنس ہے۔ چاہے وہ نیچرل سائنس کی شکل میں ہو یا سوشل سائنس کی شکل میں۔ بعض لوگوں کے نزدیک یورپ کی سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا بھی حصہ ہے۔ ان کے نزدیک علم ایک مسلسل تاریخی عمل ہے جو کسی قسم کی ایمانیات کا مرہونِ منّت نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے نزدیک موجودہ سائنس اسلامی تاریخ سے ہی پھوٹی۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ سرمایہ دارانہ علم (سائنس وٹیکنالوجی) کسی مسلسل تاریخی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ انسانی زندگی وکائنات کے بارے میں تصورِ حقیقت کی ایسی تبدیلی سے پیدا ہوا جو تحریک تنویر کے نتیجے میں عام ہوئی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کسی بھی تہذیب کے علوم اس کی ایمانیات کے مرہونِ منّت ہوتے ہیں۔

علوم اوران کی درجہ بندی چند مابعد الطبیعی ایمانیات کی مرہونِ منّت ہوتی ہے۔مقصد حیات کی بابت عقائد بدلنے سے علوم کا تصور ہی بدل جاتا ہے۔کسی تہذیب کا تصور علم اور علوم کی درجہ بندی اس تہذیب کے ایمانیات سے ماوراہو کر سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔

سرمایہ دارانہ تصور حقیقت کی ایمانیات ''آزادی، مساوات، ترقی'' ہیں۔

آزادی یعنی کائنات عالم میں انسان کا خودمختار ہونا کہ اسے خیروشر طے کرنے کا حق ہو۔مساوات یعنی تمام انسانوں کی خواہشات کا مساوی ہونا۔

ترقی یعنی ارادے اور خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تکمیل جس کی واحد صورت سرمایہ میں لامحدود اضافہ ہے۔

سرمایہ دارانہ علوم انہی تین بنیادی اقدار کے اردگرد گھومتے ہیں۔یہ کسی تاریخی تسلسل کا نتیجہ نہیں بلکہ تاریخ میں مغرب کے اندر پہلی دفعہ حادثاتی طور پر پیدا ہوئے۔

سرمایہ دارانہ علوم کو ہیومن سائنسز بھی کہا جاتا ہے۔مغربی فکر کے مطابق ہیومن وہ انسان ہے جو خود کو قائم بالذات سمجھتا ہو اور آزادی کا خواہاں ہو۔ہیومنزم اللہ کی غلامی اور عبدیت کا ردّ ہے۔مغرب کے تمام تر علوم ہیومن کے اردگرد ہی گھومتے ہیں نہ کہ عبد کے اردگرد۔فوکالٹ کے نزدیک تاریخ انسانی میں ہیومن کی پہلی دفعہ سترہویں صدی میں پیدائش ہوئی۔(جب مغربی علوم اس قدر ترقی کر گئے کہ انسان تاریخ انسانی میں پہلی دفعہ عبدیت سے مکمل طور پر آزاد ہو گیا)

سترہویں صدی میں پہلی دفعہ مقصد علم کی تبدیلی سے تصور علم بھی بدلا۔اب حقیقی علم وہی تھا جو زیادہ سے زیادہ آزادی وترقی کی تکمیل کرے چاہے انسان عبد رہے یا نہ رہے۔اور یہ سائنس وٹیکنالوجی کا علم تھا۔

جدید سائنس کا بانی راجر بیکن کو سمجھا جاتا ہے۔بیکن کے نزدیک جہالت کے چار اسباب ہوتے ہیں۔

نمبر ① مسلمہ مقتدرہ کا احترام۔

نمبر ② اسلاف کے طور طریقوں پر عمل۔

نمبر ③ ریت ورواجوں کی پیروی۔

نمبر ④ فخریہ ناسمجھ آنے والے دکھاوے۔

سرمایہ دارانہ علم کی خصوصیات۔

سرمایہ دارانہ علم کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

① علم کا منبع فقط انسان کی ذات ہے۔

② انسان آزاد اور خودمختار ہے، وہ خارج سے کسی راہنمائی کا محتاج نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

④ سرمایہ دارانہ تصورِ علم کے مطابق علم 'ارتقائی' ہوتا ہے۔ یعنی علم کوئی مستقل بالذات سچائی نہیں بلکہ حالات اور زمانوں کے بدلنے کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

④ سرمایہ دارانہ تصورِ علم کے مطابق حق ایک سے زائد بھی ممکن ہو سکتے ہیں۔

پس جدیدیت کی تحریک۔

سرمایہ دارانہ تصورِ علم کے ارتقائی ہونے کی وجہ سے بالآخر منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی قدر اور خیر حقیقی نہیں رہی بلکہ ہر قدر اور خیر اضافی ہے جو وقت کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی پس جدیدیت کی تحریک پیدا ہوئی جس نے حق کے وجود کا ہی انکار کر دیا کیونکہ حق کی تلاش ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک جب حق کا ادراک ناممکن ہے تو کوشش کیوں کی جائے؟

پس جدیدیت کی تحریک سے پہلے مغربی فکر اپنے آفاقی، برتر اور معقول ہونے کا دعویٰ رکھتی تھی لیکن پس جدیدیت کی تحریک نے اس دعویٰ کو لغو قرار دیا۔ ہیبر ماس کے نزدیک مغربی تہذیب کے آفاقی نیز عقلی طور پر برتر ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

اقدار سے محرومی، انسانی زندگی کی لایعنیت اور مقصدِ حیات سے لاعلمی کی وجہ سے مغرب میں خودکشیوں کا رجحان بڑھ گیا، لوگ اجتماعی طور پر معاشروں سے باغی ہو کر ہپیوں اور نشہ بازوں کے گروہ بنا کر رہنے لگے، فیشن اور موسیقی کے اندر نت نئے غیر فطری رجحانات پیدا ہوئے۔ وٹگنسٹائن جیسے بڑے فلسفی نے زندگی کی لایعنیت سے تنگ آ کر خودکشی کر لی۔

ارتقائی تصورِ علم کی وجہ سے بدکردار عالم کا جواز پیدا ہوا۔ یعنی ایسا عالم بھی قابلِ قدر قرار پائے جن کا طرہ امتیاز فقط ان کا علم تھا چاہے ان کا کردار جس نوعیت کا ہی ہو۔ کیونکہ اقدار تو سب کی سب برابر درجے کی ہیں، اصل چیز فقط علمی کارگزاری ہے۔ اسی وجہ سے کانٹ اور آئن سٹائن کی ذاتی زندگی انتہائی نجس اور غلیظ ہونے کے باوجود ان کا نام مغربی فکر و فلسفہ میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہی صورتِ حال دیگر مغربی مفکرین کی ہے۔

☆ **سرمایہ دارانہ علم کی اخلاقیات** یہ ہیں کہ فقط اس علم پر محنت کی جائے جس کی مارکیٹ میں زیادہ سے زیادہ مانگ ہو۔ ایسے تھیسس، مقالے اور علوم پر محنت کی جائے جن سے زیادہ سے زیادہ پیسے کمائے جائیں۔ قرآن و حدیث اور فقہ غیر عقلی علوم ہیں کیونکہ ان کی مانگ نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تصورانسانی حقوق

تصورانسانی حقوق مغربی سرمایہ دارانہ نظام میں بلندترین معراج سمجھا جاتا ہے۔لیکن تاریخ فکر یورپ میں اس کا ایک خاص مفہوم ہے۔ ہیومنزم (انسان پرستی) کی تحریک تاریخ یورپ میں مارٹن لوتھر کی تحریک کے بعد پیدا ہوئی جب مغربی فلسفیوں نے عیسائی علمیت کو رد کیا اور انسان کو مستقل بالذات، مقصود بالذات اور آزاد مطلق قرار دیا۔ ڈیکارٹ، نطشے اور روسو وغیرہ نے وجود انسانی کو ہی فقط ناقابل تردید حق قرار دیا۔ اور اس کے علاوہ ہر چیز کے رد کو ممکن قرار دیا۔ نیز عقل انسانی خیر وشر کی تعین کے لیے کسی خارجی راہنمائی (مثلاً وحی وغیرہ) کی محتاج نہیں۔

اس مخصوص طرز فکر، طرز حقیقت (ایمانیات) کے حامل کو ہیومن بینگ کہتے ہیں۔ اس وقت مغرب کے تمام علوم (نیچرل سائنسز اور سوشل سائنسز) اسی ہیومن بینگ کے گرد گھومتے ہیں جو وحی الٰہی سے آزاد ہیں۔ اور ایسے علوم کو ہی ہیومن سائنسز کہا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر مغربی فلاسفہ کے تصورات انسان سے ہی ماخوذ ہے۔ یہ چارٹر ۱۷۸۸ء کے امریکی دستور کا چربہ ہے۔ جو اس دور کے ملحد مفکرین کے تصورات انسان ہی کی روشنی میں لکھے گئے۔

انسانی حقوق میں سب سے زیادہ زور آزادی (freedom) پر دیا جاتا ہے۔ یعنی انسان زیادہ سے زیادہ آزاد ہوں (زندگی گذارنے میں، حکومت چننے میں، خیر وشر کے تعین میں۔۔۔ وغیرہ) اہل مغرب کے نزدیک حقیقی انسان وہ ہے جو آزادی، مساوات اور جمہوریت پر یقین رکھتا ہو۔ جو عہد ظلمات کی بجائے تحریک تنویر کے نتیجے میں ۱۸ویں صدی میں پیدا ہوا۔

استعماری طاقتیں حقوق انسانی کو عام کرنے کے لیے دو طرح کے طریقے اختیار کرتی ہیں۔

نمبر ① قوت کا طریقہ۔ جس ملک کی عوام حقوق انسانی کی خلاف ورزی کرے وہاں سلامتی کونسل کے تحت فوجی کارروائی کی جاتی ہے۔

نمبر ② این جی اوز کا طریقہ۔ استعماری طاقتوں کے زیر سرپرستی سینکڑوں تنظیمیں مختلف ممالک میں حقوق انسانی کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتی ہیں۔

حقوق انسانی اصلاً کتاب الٰہی کا رد، ربوبیت کا انکار، سرمایہ داری کے فروغ کا ذریعہ، عبدیت الٰہی سے فرار کا راستہ ہیں۔ انسانی حقوق کا چارٹر کفر خالص ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جمہوریت اور سرمایہ داری

جمہوریت کا لفظ عام طور پر فرد واحد کی حکومت کے مقابلے میں عوامی طرز حکومت پر بولا جاتا ہے۔

تاریخ انسانی میں جمہوری طرز حکومت کے سب سے پہلے تجربے یونان کے گرد و نواح کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں ہوئے اور جمہوری طرز حکومت پر سب سے پہلی فکری بحث یونانی مفکرین ارسطو اور افلاطون نے کی۔ ارسطو نے جمہوریت کو یہ کہہ کر رد کیا کہ اکثریت قطعی فیصلہ کرنے میں گومگو رہتی ہے، اس سے عدم استحکام جنم لیتا ہے۔ جمہوریت سے عمومی بے راہ روی کو فروغ ملتا ہے۔

یونانیوں کے بعد کلاسیکی مفکرین نے جمہوریت پر گفتگو کی۔ جن میں سے روسو اور مل زیادہ اہم ہیں۔

روسو کے نزدیک انسان آزاد اور علیحدہ ہے۔ اسے اپنی آزادی میں اضافہ کے لیے ارادہ اجتماعی میں ضم ہو جانا چاہیے اور ارادہ اجتماعی کی مثالی صورت جمہوریت ہے۔

مل کے نزدیک انسان کا ہدف زیادہ سے زیادہ لذت کا حصول ہے۔ لیکن مل افادی فلسفے کے مطابق معاہدہ عمرانی کا انکار کرتا ہے اور معاشرے کی بنیاد افادیت (لذت کے زیادہ سے زیادہ حصول اور آزادی) کو قرار دیتا ہے۔ مل کے نزدیک معاشرہ کو فرد کی آزادی میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرنی چاہیے جب تک کسی فرد یا معاشرہ کے مفادات کو لامحدود اور معین خطرات لاحق نہ ہوں۔ مل کے نزدیک جمہوریت بہترین طرز حکومت ہے لیکن جمہوریت فقط ان معاشروں کے لیے قابل عمل ہے جو تعلیم وغیرہ کے ذریعے مہذب (مغرب زدہ) نہ بنا لیے جائیں۔ مل کے نزدیک مساوات کے بغیر جدید معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔

ان دو مفکرین کی آرا سے یہ ثابت ہوا کہ جمہوریت فقط سیاسی آلہ نہیں بلکہ ایک مکمل نظام زندگی کے نفاذ کا طریقہ ہے۔ جمہوریت اور لبرلزم لازم و ملزوم ہیں۔ جمہوریت سے لبرل معاشرہ اور لبرل ریاست قائم ہوتی ہے اور لبرل معاشرہ و ریاست کے علاوہ کوئی معاشرہ جمہوریت سے قائم نہیں کیا جا سکتا۔

لبرلزم کا بنیادی عقیدہ انسان پرستی ہے۔ اس کی مرکزی اقدار آزادی اور مساوات ہیں۔ لبرلزم کا قائل ہر فرد اپنے خیر و شر کے پیمانے خود وضع کرتا ہے۔ لبرل معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جن کا مقصد خواہشات کا زیادہ سے زیادہ حصول ہوتا ہے۔ لبرل معاشرہ تمام خواہشات کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔ لہٰذا خواہشات کی ترجیحی ترتیب فقط اکثریت پر منحصر ہوتی ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لبرلزم یا آزادی کو فروغ دینے کے لیے جمہوریت کے مختلف ادارے ہیں۔ مثلاً رائے دہندگی میں ایک ووٹ ایک فرد کی بنیاد پر تمام نیک و بد برابر قرار پاتے ہیں۔ رائے دہندگان اپنے نمائندے اپنی اغراض و اہوا کی بنیاد پر منتخب کرتے ہیں۔ نمائندگان بھی معاشرہ میں اغراض کو ہوا دیتے ہیں۔ اغراض کے فروغ سے اقدار کی حیثیت کم ہوتی ہے اور ٹیکنو کریٹ و بیوروکریٹ مضبوط ہوتے ہیں۔ عوام کی دلچسپی اقداری بحثوں سے ختم ہو کر فقط اغراض کے گرد گھومتی ہے۔ بڑے بڑے اقداری مسائل سہولیات کی نذر ہو جاتے ہیں۔

جمہوریت کا دعویٰ تھا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ پبلک عمل میں شریک ہوں گے اور شہری اوصاف کو فروغ ملے گا لیکن نتیجہ اس کے برعکس نکلتا ہے۔ عوام ادنی سیاست (اغراض کی سیاست) میں مشغول ہو جاتی ہے۔ مقتدرین ہی فقط اعلیٰ سیاست (دستور کی تشریح، خارجہ پالیسی، اقدار کا فروغ وغیرہ) کو اپنی دلچسپی کے مطابق چلاتے ہیں۔

کلاسیکی مفکرین کے بعد **اثباتی سیاسی مفکرین** ہیں۔ جو کسی بھی مستقل قدر کو لغو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خیر و شر کا ادراک ناممکن ہے لہٰذا اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ ان کے نزدیک عوام فطرتاً مطلبی، لالچی اور خود غرض ہیں۔ اس سے اقدار کا تعین اور معاشرے کی مجموعی اغراض کے تعین کی امید نہیں لگائی جا سکتی۔ کلاسیکی مفکرین اور اثباتی مفکرین کا فرق یہ ہے کہ کلاسیکی مفکرین تعلیم وغیرہ کے ذریعے عوام کی تہذیب اور شہری اوصاف کے حصول کی امید لگاتے ہیں لیکن اثباتی اس قسم کی امید کو ناممکن خیال کرتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ معیشت

تاریخ

یورپ میں سلطنت روم کے انحطاط کے بعد جاگیردارانہ نظام قائم تھا اور اس نظام میں اقدار کی وقعت کا تعین مذہبی پیمانوں پر تھا۔ پندرھویں صدی کے مارٹن لوتھر کی تحریک نے دنیا پرستی کو مذہبی جواز فراہم کرنا شروع کر دیا۔ اس نے احتکار اور ارتکازِ دولت کو خدائی نظام کا تصور دیا۔ اس کے بعد فلسفہ تنویر کے بیشتر مباحث اور نتائج کو مذہبی راہنماؤں نے قبول کر لیا۔ سترہویں صدی کے بعد کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں دنیاداری، حرص وحسد کی معاشرتی تقویم کو جواز فراہم کرنے لگے۔

سرمایہ داری درحقیقت حرص وحسد کا عام ہونا ہے۔ تاریخی طور پر اس کے تین ادوار گذرے ہیں۔

نمبر ① محدود دور۔ اس دور میں ریاستی جبر کے ذریعے قومی ریاستوں کے زرعی علاقے کسانوں سے چھین لیے گئے اور بین الاقوامی طور پر دور دراز کے ممالک کے وسائل پر قبضہ کیا گیا۔ ۱۶۰۰ء تا ۱۹۰۰ء تک عالم اسلام میں تاریخی طور پر لوٹ مار کی گئی۔ شمالی امریکا اور آسٹریلیا میں لاکھوں سرخ ہندیوں اور ابورجینز کو قتل کیا گیا۔ افریقہ کو تباہ کیا گیا۔ ہندوچین اور انڈونیشیا کی دولت کا ۶۰ سے ۸۰ فیصد حصہ یورپ منتقل کیا گیا۔ یہی بہیمیت مغربی تہذیب کی اصل بنیاد ہے۔

نمبر ② قومی سرمایہ دارانہ فلاحی ریاست کا قیام۔ پہلے دور میں حرص وحسد کی مہلک بیماری ملک کی چند مخصوص کمپنیوں اور اداروں میں تھی لیکن اس دور میں قومی سطح پر عام شہریوں اور ہر ہر فرد کے اندر نفوذ کر گئی۔ ریاست نے جمہوریت کے ذریعے خودغرضی کو عام کر دیا۔

نمبر ③ حرص وحسد کا عالمگیر ہونا۔ مکمل عالم انسان کا سرمایہ دار بننا۔ یہ دور ابھی نہیں آیا۔

سرمایہ دارانہ نظام، ہدف وطریق کار۔

سرمایہ دارانہ نظام کا قیام اور استحکام اس بات پر منحصر ہے کہ حرص وحسد عام ہو۔

حرص سے مراد زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے کی خواہش اور حسد دوسروں سے سبقت لے جانے کی خواہش ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ اخلاق ہے۔

اس اخلاق کی بنیاد اس تھیوری پر ہے کہ ہر انسان فطرتاً خودغرض ہے اور لذات کا حصول اس کی فطرت کا تقاضا۔ حرص وحسد اور خودغرضی کو مغرب میں فطری وصف حمیدہ اور معقول سمجھا جاتا۔ سرمایہ دارانہ معاشرے میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

خواہشات بے لگام ہوتی ہیں۔ (بچت رجمع=صرف- حاصل) ہر شخص کا مقصد ہوتا ہے۔ جمع کی مقدار بڑھانے کے لیے قیمتیں متعین کرنے میں رسّہ کشی ہوتی ہے۔ قیمتوں کا تعین قوت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ قیمتوں کے تعین میں صارف کی خواہش سے زیادہ ان کمپنیوں کا اختیار زیادہ کارگر ہوتا ہے جو حرص میں سب سے آگے ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں ریاست ان کمپنیوں کی مدد کرتی ہے جو اشیا کی طلب کی مقدار اور کھپت کی مقدار میں زیادہ دخیل ہوتی ہیں۔

حرص سے سرمایہ پیدا ہوتا ہے۔ سرمایہ وہ زر (Money) ہے جو گردش میں ہو اور مسلسل بڑھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ جیسے جیسے اشیا کی انواع، صرف اور تقسیم کے مرحلے میں تیز ہوں گی ویسے ویسے زر کی گردش تیز ہوگی اور سرمایہ کے احتکار کے مواقع زیادہ ہوں گے۔

لیکن یہاں ایک مسئلہ بھی ہے کہ سرمایہ کی بڑھتی ہوئی رفتار، پیداواری نظام سے مطابقت نہیں رکھ سکتی۔ مقامی منڈیوں میں شرح منافع گھٹ جاتا ہے۔ بڑھوتری کے ساتھ ساتھ سرمایہ کی گردش کے مواقع بھی کم ہو جاتے ہیں چنانچہ سرمایہ اپنے پرانے مراکز چھوڑ دیتا ہے اور نئی منڈیاں تلاش کرتا ہے اور یہی استعماریت (Imperialism) کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد پر پہلی جنگ عظیم میں جرمنی اور جاپان کو تباہ کیا گیا۔ ایشیا اور افریقہ پر قبضہ کیا گیا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں افراد سودی معیشت میں ضم ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں، نجی ملکیت کی بجائے کارپوریشن کی ملکیت کو فروغ ملتا ہے۔

سرمایہ کو پیداواری نظام سے آزاد کرنے کے لیے زر کا بازار قائم کیا جاتا ہے۔ زر کے بازار کے فروغ میں بنیادی کردار بنکوں کا ہوتا ہے۔ زر کی قدر اور قیمت ''سود'' ہے جس کا تعین بنکاری نظام کرتا ہے۔ سود ربا الفضل کی شکل میں ہر شے اور ہر خدمت کی قیمت میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے بنکاری کا نظام وسعت پاتا ہے ویسے ویسے حرام خوری عام ہو جاتی ہے اور فرد سرمایہ دارانہ معیشت میں ضم ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

فرد کی اس مجبوری میں اضافہ ''سرمایہ کا بازار'' بھی کرتا ہے۔ سرمایہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں اور ان کے حصص کی شکل میں تجسیم اختیار کرتا ہے۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں شخصی ملکیت کو ختم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں شخصی ملکیت بتدریج ختم ہو جاتی ہے۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں پورے پیداواری اور تقسیمی نظام پر حاوی ہوتی ہیں۔ انہی کی آپس کی قوت کی رسّہ کشی کے نتیجے میں بیشتر اشیا اور خدمتوں کی قیمتیں اور پیداواری مقدار مقرر ہوتی ہیں۔ ایک جوائنٹ اسٹاک کمپنی کے لاکھوں قانونی مالک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ ملکیت محض افسانوی حیثیت کی ہوتی ہے۔ کمپنی کو چلانے والے اور اس کی پالیسی متعین کرنے والے اس کے قانونی مالک نہیں بلکہ اس کی مینج منٹ کے ارکان ہوتے ہیں۔ جن کے پاس عملاً کمپنی کے ایک فیصد حصص بھی نہیں ہوتے۔ کمپنی کی کامیابی اس بات پر منحصر ہوتی ہے کہ مینج منٹ سرمایہ کے احتکار میں کتنا اضافہ کرتی ہے۔ اس اضافہ کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے لازم ہے کہ مینج منٹ، کمپنی کے ہر کارکن کو زیادہ سے زیادہ خود غرض، سفاک، دنیا پرست اور ظالم بنائے یہی سرمایہ دارانہ عقلیت کا فطری تقاضا ہے۔ جب سرمایہ کا بازار وسعت اختیار کرتا ہے تو جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معیشت پر غالب آجاتی ہیں۔ شخصی ملکیت ختم ہوجاتی ہے اور سرمایہ دارانہ عقلیت نفس انسانی کو مسخ کر کے رکھ دیتی ہے۔ لذت پرستی، خودغرضی اور استحصال ایک وبا کی طرح تمام انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ (۱۱۶۔۱۱۷)

سرمایہ دارانہ معاشرہ میں حرص وحسد کے عموم سے **خواہشاتی عقلیت** (rationality bounded by desires) معاشرے پر غالب آتی ہے۔ سرمایہ دارانہ ادارے مضبوط ہوتے ہیں اور ادارے ہر فرد کو بے بس اور لاچار بنا دیتے ہیں۔ جو شخص حریص وحاسد نہ ہو تو اس کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ سارا معاشرہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سرمایہ دارانہ عقلیت میں مذہبی، نسلی، لسانی اور طبقاتی امتیازات رد ہوجاتے ہیں۔ ہر شخص کو سرمایہ کی خدمت کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ اور یکساں مواقع دیے جاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ ریاست سرمایہ دارانہ معاشرت کی پشت پناہی کرتی ہے۔ آزادی اور مساوات کو عام کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ اداروں و بازاروں کو تحفظ دیتی ہے۔

☆ **نقد**۔ سرمایہ دارانہ عقلیت انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ ہر انسان فطرتاً حریص اور حاسد نہیں ہوتا بلکہ محبت کرنے والا ہے۔ نیز سرمایہ داری میں لاتعداد تضادات بھی ہیں۔ پیداوار میں اضافے کے لیے خواہشات میں اضافہ کیا جانا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے لیے تفریحی، مواصلاتی اور اشتہاری صنعتیں وجود میں آتی ہیں۔ بے روزگاری عام ہوجاتی ہے۔ مزدور نظام جبر کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ عام شہری ملکی جمہوری سیاست سے لاتعلق ہوجاتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں اسلامی انقلابی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت ہے۔ یعنی حلال روزی کو فروغ دینا، بلاسود تجارت، اسلامی مزدور یونین کا قیام، اسلامی ریاست کا قیام، سود کا خاتمہ، استعماری نظام سے تعلق منقطع کرنا۔

سرمایہ اور مارکیٹ

سرمایہ آزادی کا دوسرا نام ہے۔ آزادی (ہر خواہش کو پورا کرنے کی آزادی) ان کو حاصل ہوتی ہے جن کے پاس سرمایہ زیادہ ہو۔ مارکیٹ وہ جگہ ہے جہاں پر سرمایہ کے طلب گار آزادی کے حصول کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔

مارکیٹ اور بازار میں فرق ہے۔ بازار وہ ادارہ ہے جس کا تعلق مخصوص تہذیب، اخلاقیات اور مذہب سے ہے۔ بازار معاشروں کی تعمیر نہیں کرتے بلکہ پہلے سے قائم معاشرتی قدروں کے تابع ہوتا ہے۔ بازار مارکیٹ کے مقابلے میں معاشرتوں کا بہت قلیل حصہ ہوتا ہے۔ جبکہ مارکیٹ پورے معاشرے کے اندر غالب قدر ہوتی ہے اور وہی معاشرتی قدروں کو متعین کرتی ہے۔ اسلامی بازار کے مقابلے میں اسلامی مارکیٹ ایک غلط اصطلاح ہے۔ کیونکہ مارکیٹ کے معیارات سرمایہ داری سے متعلق ہیں۔ مارکیٹ اور بازار کے دائرہ کار کے لحاظ سے پانچ فرق ہیں۔

① مارکیٹ جس معاشرے کو جنم دیتی ہے وہ **سول معاشرہ** کہلاتا ہے۔ جہاں ہر قسم کے تعلقات کی بنیاد غرض

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ومعاہدہ ہوتی ہے۔ پورا معاشرہ ہی دراصل مارکیٹ بن جاتا ہے۔۲۔ مارکیٹ میں ہر خواہش مساوی اور جائز ہے۔ یعنی دینی اقدار اور لادینی اقدار کو برابر سمجھا جاتا ہے۔۳۔ مارکیٹ نجی ملکیت کو ختم کر دیتی ہے۔ لوگوں کا سرمایہ مجتمع ہو کر کارپوریشن کی شکل میں بدل جاتا ہے جن کو چلانے والے خالص فنی لوگ ہوتے ہیں جن کا کام پیسے کو بڑھانا ہے وہ کسی بھی قدر کو اعلیٰ نہیں سمجھتے۔۴۔ تمام ترقی یافتہ ممالک کے اندر فنانشل مارکیٹ (سود اور سٹے کی بنیاد پر زر اور اسٹاک کی خرید و فروخت) پیداواری مارکیٹ (اشیا کی مارکیٹ) پر فوقیت رکھتی ہے۔۵۔ جب فنانشل مارکیٹ کا غلبہ ہوگا تو اس کا مطلب ہے کہ سود اور سٹہ کے تحت ہی مارکیٹ میں قدر طے ہوگی۔

مارکیٹ کی تاریخ۔

نمبر ① فورڈ ازم (۱۹۳۳ء۔۱۹۸۰ء) کا دور۔ مغربی ثقافت کے عروج کے ساتھ ہی سرمایہ داری کو عروج حاصل ہوا۔ اس سے پہلے نہ مارکیٹ کا تصور تھا اور نہ ہی سول معاشرہ۔ فورڈ ازم کے دور میں مزدور اجتماعیت پیدا ہوئی۔ ان کے نزدیک آزادی کا حصول اس وقت مکمل ہے جب مزدوروں کو کارپوریشن کے منافع میں برابر کا حصہ ملے۔ انھوں نے سرمایہ داروں کو مزدوروں کے حق پر ڈاکہ ڈالنے والا تصور کیا۔ چنانچہ یہی اشتراکیت ہے۔ اسی طرح اسی دور میں مارکیٹ کے فروغ کے لیے نیشنلزم کا تصور بھی مقبول ہوا۔

نمبر ② پس فورڈازم (۱۹۸۰ء سے اب تک)

مزدوروں کی اشتراکیت سے سرمایہ داری کو خطرہ تھا چنانچہ اس خطرہ کو ختم کرنے کے لیے مزدوروں کو بھی سرمایہ کاری میں سے حقوق کا حصہ دیا گیا۔ اس کو سوشل ڈیموکریسی کہتے ہیں۔ اور اس طرح مغرب میں اشتراکیت کا سیاسی غلبے کا خطرہ ختم ہوگیا۔ مغرب میں اشتراکیت رائج نہ ہوسکی۔

برٹین وڈ سسٹم ایسا نظام تھا جو ریاست کی سطح پر سرمایہ کا محافظ تھا۔ جب سرمایہ ریاستوں کی سطح سے بلند ہوا تو مالیاتی نظام کو چلانے کے لیے ایک بین الاقوامی ادارہ قائم کیا گیا جس کو آئی ایم ایف کہتے ہیں۔ اس ادارہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ ممبر ممالک کو اس مالیاتی نظام کے تابع کریں جس کے نتیجے میں سرمایہ ان ممالک میں پروان چڑھ سکے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد کا دور پس فورڈازم ہے۔ اس میں سرمایہ مزدور اجتماعیت اور نیشنلزم سے آزاد ہوگیا۔

سرمایہ داری اور معاشیات:

جدید معاشیات (اکنامکس) تمام سوشل سائنسز کی طرح سرمایہ دارانہ علمیت سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی بنیاد بحیثیت سائنس آدم سمتھ نے رکھی جو تنویری دور کا مفکر تھا۔ جدید معاشیات کے تین بڑے ادوار ہیں۔

نمبر۱۔ معاشیات کا کلاسیکل دور۔ (۱۷۷۲۔۱۹۳۰) جس کے اہم مفکرین آدم سمتھ، ڈیوڈ ریکارڈو، مالتھس، بینتھم، جان اسٹورٹ مل، الفریڈ مارشل ہیں۔ یہ سب لبرل مفکرین ہیں۔ کلاسیکل دور میں ایک نمایاں تبدیلی کارل مارکس (۲۳۔۱۸۱۸) نے پیش کی۔ جو اشتراکیت اور کمیونزم کے نظریات تھے۔ کارل مارکس کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علاوہ تمام مفکرین لبرل سرمایہ داری کا حصہ ہیں۔ یہ تمام مفکرین دور تنویر کے نظریات کے مطیع تھے۔

کلاسیکل دور میں فرد، معاشرہ اور ریاست کی سطح پر جو نظریات پیش کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں۔

مغربی معاشی تنویری مفکرین اس بات پر ایمان لے آئے کہ فرد انفرادی طور پر لذات کا پیروکار ہے اور وہ اپنی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ صارف کا رویہ، نظریہ افادہ، نظریہ طلب و رسد، قیمتوں کا تعین سرمایہ دار کے ذریعے نہ کہ طلب و رسد کی بنیاد پر۔۔۔ یہ تمام نظریات اسی مفروضے پر مبنی ہیں کہ ہر فرد لذات کا پیروکار ہوتا ہے اور خواہشات کو پورا کرنا چاہتا ہے۔

مغربی معاشی تنویری مفکرین کے نظریات ماننے سے ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جہاں حرص و حسد اور خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ پورا معاشرہ مارکیٹ کے تابع ہو جاتا ہے اور سول معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

ریاست کے متعلق کلاسیکل مفکرین (ماسوائے کارل مارکس) یہ نظریہ تھا کہ ریاست کو معاشی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ معیشت کے استحکام کے لیے کلیدی کردار فنانشل مارکیٹ کا ہوگا۔

نمبر۲۔ معاشیات کا دوسرا مرحلہ (کنزین معیشت۔ ۱۹۳۰۔۱۹۶۰ء)

جنگ عظیم (۱۹۳۰ء) کے بعد کلاسیکل نظریات کو شدید دھچکا لگا۔ معیشت عدم استحکام کا شکار ہوگئی۔ عالمی کساد بازاری کی وجہ سے سرمایہ داری زوال کے قریب تھی کہ لارڈ کینز نے انقلابی نظریات پیش کیے۔ لارڈ نے ثابت کیا کہ کساد بازاری سے نکلنے کے لیے ریاست کو مالیاتی پالیسی مستحکم کرنی ہوگی۔ سابقہ لبرل سرمایہ داروں کے برخلاف اس نے سرمایہ کے ارتکاز کے لیے ریاست کی اہمیت پر زور دیا نیز عالمی ادارے کے قیام پر بھی زور دیا۔ اس کے مشورے پر آئی ایم ایف کا ادارہ قائم ہوا۔ اس کا مقصد ممبر ممالک کو زر مبادلہ کے ذخائر میں کمی کو پورا کرنا تھا۔ اور شرح زر مبادلہ کا تعین کرنا تھا۔

نمبر۳۔ معاشیات کا تیسرا دور۔ (نیو کلاسیکل دور۔ ۱۹۶۰ء سے اب تک)

۱۹۶۰ء کے بعد کنزین معیشت، سرمایہ داری کو استحکام دینے سے قاصر رہی۔ بریٹن وڈ سسٹم (سرمایہ کا تحفظ ریاست کی داخلی مالیاتی پالیسی کے ذریعے) تباہی سے دوچار ہوا۔ اور اس کی جگہ نیو کلاسیکل سسٹم آیا۔ یہ دور پس فورڈازم کا ہے۔ اس دور میں سرمایہ کو دوبارہ ریاست کی مداخلت سے آزاد کیا گیا اور کارپوریشن کی بالادستی قائم کی گئی۔ اس دور میں فنانشل مارکیٹ مملکتوں کی حدیں پار کر کے منافع محض کے لیے کام کرتی ہیں۔ ریاست کی عدم موجودگی میں محافظ عالمی سرمایہ دارانہ ریاست کی ضرورت سامنے آئی تو یہ فرائض ''امریکا'' کے سپرد سمجھے گئے۔

ان تینوں ادوار میں قدر مشترک یہ ہے کہ انسان کو خواہشات کا غلام تصور کیا گیا۔ حرص و حسد کے فروغ کو فطری، معقول اور مستحسن سمجھا گیا۔ البتہ سرمایہ داری کے تحفظ کے لیے مختلف نظریات ایک دوسرے کی جگہ آئے۔ اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشیات کوئی غیر اقداری علم نہیں بلکہ سرمایہ داری عقلیت، معاشرت اور معیشت کے فروغ کا علم ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اسلامی معاشیات۔

اسلامی معیشت دانوں نے اپنی معیشت کو مغربی معیشت کی بنیادوں پر ترتیب دے کر اسلامی بنکاری کو پروان چڑھایا۔ ان کا یہ عمل کوئی ایک غلط مفروضات پر مبنی ہے۔ مثلاً وہ مغربی معاشیات کو غیر اقداری اور فطری سمجھتے ہیں۔ تمام معاشی نظریات کو حق سمجھتے ہیں۔ وہ سرمایہ داری کو فقط معیشت تک محدود سمجھتے ہیں حالانکہ وہ پورے نظام زندگی اور مکمل معاشرے پر محیط ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سرمایہ داری سے فقط نجی ملکیت کو فروغ ملتا ہے حالانکہ اس سے سرمائے کی ملکیت کو فروغ ملتا ہے اور ہر فرد سرمائے کا غلام بن جاتا ہے۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اشتراکی یا ریاستی سرمایہ داری

سرمایہ دارانہ نظام کی دو شکلیں ہیں۔ ۱۔ لبرل سرمایہ داری۔ ۲۔ اشتراکی سرمایہ داری

ان دونوں شکلوں کی قدر مشترک یہ ہے کہ یہ دونوں تحریک تنویر کی پیداوار ہیں۔ اور ان کے بنیادی ماخذات، اساسی تصورات، منہج اور اہداف میں کوئی فرق نہیں۔ تحریک تنویر کے مطابق انسان قائم بالذات، خودمختار ہستی ہے۔ یہ خیر و شر کے لیے کسی خارجی راہنمائی کا محتاج نہیں۔ آزادی اور مساوات لبرلزم کی دو بنیادی قدریں ہیں جن کو اشتراکیت نے من وعن قبول کیا۔ اس لیے جس قدر باغی اور رذیل انسان لبرل سرمایہ داری میں پروان چڑھتا ہے اسی طرح اشتراکی سرمایہ داری میں پروان چڑھتا ہے۔

لبرل سرمایہ داری اور اشتراکی سرمایہ داری میں فرق یہ ہے کہ لبرل سرمایہ داری میں حق اور خیر کا تعین ہر شخص انفرادی سطح پر کرتا ہے جبکہ اشتراکیوں کے نزدیک فرد کو یہ حق حاصل نہیں بلکہ انسانیت کے ایک گروہ کی جدوجہد کے مطالعے کی ضرورت ہے جو تاریخی عمل کے نتیجے میں غالب آتا ہے۔ اس لیے ہمیں حق اور خیر کی تشریح جاننے کے لیے یہ دیکھنا پڑے گا کہ تسلسل تاریخ انسانیت کیا ہے اور وہ کون سے رجحانات ہیں جن کی وجہ سے ایک خاص طرز زندگی غالب آیا ہے۔ اس نظریہ کو مارکس کا مادی نظریہ تاریخ یا جدلی مادیت کہتے ہیں۔ اس نظریہ تاریخ کے مطابق دنیا کی ساری صداقتیں اضافی ہیں۔ یعنی ہر صداقت جس دور کے معاشی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے۔ اس دور کے ختم ہونے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔

مارکس کے نزدیک سرمایہ دارانہ معاشرہ مزدور کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ مزدور ذرائع پیداوار سے محروم ہوتا ہے اور ان کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اشتراکیت کا اعتراض سرمایہ دارانہ نظام پر یہ نہیں ہے کہ اس نظام میں کچھ اہداف ایسے ہیں جن کو اشتراکیت رد کرتی ہے۔ بلکہ محض یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں وہ اہداف حاصل نہیں ہوتے جن کا لبرل سرمایہ داری وعدہ کرتی ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظم ملکیت کو محض اس لیے ختم کرنا چاہتی ہے تاکہ آزادی اور مساوات کے وہ اہداف حاصل کر سکیں جن پر دونوں بالکلیہ متفق ہیں۔ یہ صرف اس وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب سرمایہ دارانہ جمہوریت کی جگہ مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہو جائے اور یہی ڈکٹیٹر شپ، اشتراکیوں کے نزدیک اصل جمہوریت ہے۔

یہ دونوں نظام رد کے قابل ہیں کیونکہ جو شخص جس حد تک اشتراکی یا لبرل فکر سے متاثر ہوگا وہ اس حد تک حقوق کا طالب ہوگا۔ آزادی کا خواہش مند ہوگا، مساوات کا علم بردار ہوگا اور عبدیت و ہدایت سے دور ہوگا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوشل ڈیموکریسی۔

اشتراکیت کی ایک شکل تو وہ ہے جس میں مزدوروں کی سیادت وقیادت کو انسانیت کی فلاح متصور کیا جائے۔ اس کی دوسری شکل ''سوشل ڈیموکریسی'' ہے۔ جس نے دوسری جنگ عظیم کے بعد تقویت حاصل کی۔ سوشل ڈیموکریسی کا دعویٰ ہے کہ ہم لبرل پارلیمانی نظام اور لبرل مارکیٹ کو استعمال کر کے مزدوروں کی بالادستی قائم کر سکتے ہیں۔ ہم جمہوری عمل سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے فلاحی حقوق پر زور دیا جائے یعنی محض انسانی حقوق کافی نہیں ہیں بلکہ کچھ معاشرتی آزادیاں بھی تسلیم کی جائیں اور یہ معاشرتی حقوق انسانی حقوق کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے نتیجے میں ویلفیئر ریاست قائم ہو جائے گی۔

۱۹۹۹ء کے بعد پوری دنیا میں **ردّ عالمگیریت** (antiglobalization) کی تحریک چلی۔ یہ انہی حقوق کی تحریک ہے یعنی آمدنی محفوظ ہونے کا حق، ملازمت کا حق، غربت کا خاتمہ، سہولیات کا وعدہ۔۔۔ وغیرہ

سوشل ڈیموکریسی یا معاشرتی حقوق کی سیاست کو مسلمانوں میں بھی اچھی نظر سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ اس کے دو بڑے نقصانات ہیں۔

① اس تحریک میں مسلمانوں کی شمولیت اس بات کا جواز ہے کہ دنیوی مفادات کی جدوجہد کو اخروی مفادات پر برتری دینا جائز ہے۔

② اسلامی دعوت اور اقامت امارت اسلامی کا راستہ جہاد کا راستہ ہے۔ اس میں مشکلات بھی پیش آتی ہیں لہٰذا لوگوں سے دنیا میں ہی جنت بنانے کے وعدے نہیں کیے جا سکتے۔ معاشرتی حقوق کی جدوجہد کی دعوت دینا، غلبہ دین کا طریقہ نہیں۔ اسلام معاشرتی حقوق کی سیاست کو ردّ کرتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وحی یا سائنس

جدید سائنس کی ابتداء کوپرنیکس، گلیلیو اور نیوٹن جیسے سائنس دان سے ہوتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں عیسائی علمیت غالب تھی۔ لیکن مسخ شدہ عیسائی افکار اور کلیسا کی زیادتیوں کے باعث عیسائیت کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ تحریک اصلاح مذہب کے نتیجہ میں جدیدیت اور تحریک تنویر جیسی تحریکیں پروان چڑھیں۔ اس موقع پر تحریک تنویر کی جو علمیت معتبر قرار پائی وہ جدید سائنس یا سائنٹفک میتھڈ تھا۔

سائنٹفک میتھڈ (سائنسی طریق کار) یا تجرباتی طریقہ کار وہ طریقہ ہے جس میں تجربات اور مشاہدات کے ذریعے مسلسل تحقیق کی جاتی ہے۔ اور اس سے علم حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس طریقہ کار میں کسی بھی معلومات کو حتمی اور آخری حقیقت نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ تبدیلیاں جاری رہنے کا امکان ہوتا ہے۔ سائنٹفک میتھڈ کی آخری حد ''انسانی مشاہدہ، عقل اور سمجھ'' ہے۔

مشاہدہ سے مراد حواس خمسہ اور حواس کی صلاحیت میں اضافہ کرنے والے آلات۔

عقل سے مراد استقرائی واستخراجی طریقہ دلیل ہے۔ یعنی جزئیات سے کلیات اخذ کرنا اور کلیات سے جزئیات نکالنا۔

انسانی سمجھ سے مراد پہلے ادوار کی تمام معلومات اور تجربوں کا مجموعہ ہے۔ جو اس سائنسی طریقہ مشاہدہ اور عقلیت سے جمع کیا گیا ہو۔

سائنٹفک میتھڈ کی ایک اور خصوصیت اس کا متعین خصوصی حالات میں ہر بار ایک ہی جیسے نتائج پر پہنچنا ہے۔ ان متعین خصوصی حالات کی مدد سے کوئی بھی سائنس دان کسی بھی تحقیقی تجربے کو دہرا سکتا ہے۔

سائنٹفک میتھڈ موجودہ دور کے اکثر علوم میں تحقیقی طریق کار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ یہ عددی یا تاثراتی بھی ہوسکتا ہے۔ عددی ہونے کی صورت میں معلومات میں شماریات استعمال کی جاتی ہے۔ جبکہ تاثراتی ہونے کی صورت میں رائے، تصورات اور تنقیدوں کی مدد لی جاتی ہے۔

اس طریقہ سائنس کا مکمل دارومدار انسانی سمجھ یا صلاحیتوں پر ہے۔ اس میں کہیں بھی خدا کی محتاجی یا راہنمائی کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی۔ اس کا مقصد دنیا و کائنات پر انسان کو زیادہ سے زیادہ اختیار دلانا ہے تاکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔

ابتداء میں سائنٹفک میتھڈ فقط نیچرل سائنسز (فزکس، کیمسٹری، بیالوجی وغیرہ) پر تھا لیکن تحریک تنویر کے فلاسفہ خصوصاً کانٹ کو نیوٹن کا سائنٹفک میتھڈ بہت پسند آیا اور انھوں نے اس طریقہ کو معیشت، معاشرت، سیاست وغیرہ) جیسے علوم میں بھی رائج کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اور آج یہ علوم بھی سوشل سائنس کے نام سے سائنس ہی کہلاتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نقد۔

① سائنسی علوم (خصوصاً سوشل سائنسز) میں حق وصداقت ارتقائی ہے۔ جو ہر زمانے کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام جو حق بیان کرتا ہے وہ اٹل ہے جو کائنات کی ابدی اور حتمی صداقت ہے۔

② تحریک تنویر اور جدیدیت کے مفکرین سائنس کو بہترین آفاقی طریقہ سمجھتے ہیں۔ جدیدیت کی تحریک کے نزدیک سائنس کے ذریعے ایک ممکنہ حق اور سچائی کی طرف سفر جاری رہتا ہے۔ اور وہ اسے علمی و بہترین طریق سمجھتی ہے۔ اس کے مقابلے میں پس جدیدیت کی تحریک کسی سچ کے حصول کے امکان کو یکسر مسترد کرتی ہے اور وہ کسی مخصوص طریق کار کے بہتر ہونے کی بھی قائل نہیں۔ ان کے نزدیک سائنس کی فضیلت نہ ممکن ہے اور نہ ضروری۔

③ سائنس وحی کو کامل ردّ کرتی ہے۔ اس کو وحی سے کوئی سروکار نہیں۔

ٹیکنو سائنس

جدید سائنس وحی کی متبادل علمیت ہے جو وحی سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر شروع کرتی ہے۔ اس کی ابتداء تحریک تنویر کے بعد شروع ہوتی ہے۔

جدید سائنس کے ساتھ ٹیکنالوجی کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔ ٹیکنالوجی ٹیکنیک سے ہے جس کا معنی تدبیر ہے۔ مثلاً گھر، برتن، ہتھیار، اوزار، لباس بنانے کی تدابیر۔

ٹیکنالوجی وہ تدابیر ہیں جو ہر دور کی تہذیب نے اپنے حالات و مسائل سے نمٹنے کے لیے اختیار کیے۔ ٹیکنالوجی اس دور سے ہے جب سے انسان اس دنیا میں تشریف لایا۔ اس ضمن میں قدیم مصری، موئن جوداڑو، قدیم یونان، رومی وغیرہ کے پاس اپنے دور کے مطابق مختلف ٹیکنالوجیز تھیں۔

ٹیکنو سائنس (ٹیکنالوجی سے متعلق سائنس)

ٹیکنو سائنس محض ایک تدبیر نہیں بلکہ سرمائے کی بڑھوتری کے لیے، جدید سائنسی طرز فکر پر مبنی اور سرمایہ دارانہ اداروں کی تحقیقی مد میں مالی معاونت سے بنائی جانے والی تدبیر کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ٹیکنالوجی انسان کی ضروریات سے زیادہ انسان کی خواہشات کی تکمیل میں مصروف نظر آتی ہے۔ مثلاً موٹر کار سواری کے لیے ضرورت ہے لیکن ہر سال اس کے نت نئے ماڈل اور ڈیزائن، تعیش ہے نہ کہ ضرورت۔ اسی طرح موبائل فون رابطہ کے لیے ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن روز بروز اس کے دل کش ماڈل تعیش ہے۔

ٹیکنو سائنس کی بنیادی قدر بڑھوتری برائے بڑھوتری ہے۔ اس سے لوگوں میں عبادت بطور مقصد حیات کی رجحان کم ہو کر تصرف فی الاشیا اور عمدہ صارف ہونے کا رجحان بڑھتا ہے اور یہی سرمایہ داری کا اصل مقصود ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لبرل سرمایہ دارانہ ریاست، حقیقت و ماہیت

سرمایہ دارانہ ریاست میں اقتدار ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو سرمایہ دارانہ عقلیت کے حامل ہوں یا مؤید ہوں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت سے مراد ''آزادی اور مساوات پر ایمان لانا'' ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے سرمایہ دارانہ عقلیت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ یہ کوشش ہوتی ہے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس عقلیت کو قبول کر لیں۔ معاشرہ سارے کا سارا اغراض و اہوا کا پجاری بن جائے۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں نظام اقتدار کی دو قسمیں۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں دو مختلف طریقوں سے نظام اقتدار مرتب ہوتا ہے۔

① جمہوری طریقہ۔ یعنی لبرل ریاست سرمایہ دارانہ معاشرہ کی خواہشات کو پورا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اصولاً و نظراً اس کے تابع ہوتی ہے۔

② لبرل ڈکٹیٹرشپ یا آمریت۔ جب لوگ یا معاشرہ نہ جانتا ہو کہ انہیں کیا چاہیے تو کوئی مخصوص گروہ آمریت قائم کر کے لوگوں کو سرمایہ دارانہ عقلیت قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے یعنی ریاست محض معاشرہ کے تابع نہیں ہوتی بلکہ معاشرہ پر غالب ہوتی ہے۔ یہ آمریت (چاہے وہ مزدوروں کی ہو مخصوص طبقہ کی ہو یا کسی مخصوص قوم کی) ہو سکتی ہے۔

یہ دونوں طریقے اس اعتبار سے سرمایہ دارانہ ہی ہوتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ خواہشات نفسانی کی تکمیل کی جدوجہد کرتے ہیں۔ دونوں طریقوں میں سرمایہ دارانہ عقلیت کو مارکیٹ و معاشرہ میں اس قدر فروغ دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہر ہر انسان حرص و حسد کا حامل بن جائے۔ ہر انسان اور پورے معاشرے کا مقصد اوّل یہ ہوتا ہے کہ آزادی بصورت سرمایہ مجسم شکل میں مل جائے۔

سرمایہ دارانہ عقلیت کا فروغ (سرمایہ دارانہ معاشرتی عمل)۔

سرمایہ دارانہ اشرافیہ کی کوشش ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ عقلیت (حرص و حسد) فقط مارکیٹ میں ہی نہ ہو۔ بلکہ خاندان، رشتہ ازدواج، بچوں کی تربیت، برادریوں کے تعلقات، مذہبی ادارے، قبائل اور قوم کی سطح تک نفوذ کر جائے۔ فرد صرف مارکیٹ میں ہی سرمایہ دار نہ ہو بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہو۔ اس کو سرمایہ دارانہ معاشرتی عمل کہتے ہیں۔ یعنی (Capitalist socialization)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سرمایہ دارانہ عقلیت کے فروغ کے افراد وادارے۔

افراد۔

اس معاشرتی عمل کے لیے درج ذیل افراد کا کردار خصوصی ہوتا ہے۔

① دانشور (سوشل سائنسز کے ماہرین)

② کلچرل ہیروز (اسپورٹس مین، فلم، میوزک و ماڈلنگ کے ہیروز، فزیکل سائنس دان)۔

③ ٹیکنو کریٹ و بیوروکریٹ (مغرب کے تربیت یافتہ اور مغرب کے وفادار)۔

④ آرمڈ فورسز (سرمایہ دارانہ ریاست کا آخری حصار)۔

⑤ استعماری ایجنٹ (استعمار کے مقامی ایجنٹ، استعمار کے وفادار)۔

ادارے۔

سرمایہ دارانہ معاشرتی عمل میں سرمایہ دارانہ عقلیت کے فروغ کے لیے درج ذیل ادارے حصہ لیتے ہیں۔

① کارپوریشن۔ (شخص قانونی جس کے ہر فرد کا کام سرمایہ کی بڑھوتری ہوتی ہے۔)

② بنک اور مالی ادارے۔ (اسٹاک مارکیٹ، زر کی مارکیٹ۔ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ مال مرتکز ہو کر گردش میں آسکے۔

③ فنانشل ریگولیشن (زری اصلاحات) ریاست یا مختلف پرائیویٹ ایجنسیاں جو معاشی سرمایہ دارانہ بحران کے خطرات سے نمٹنے کے لیے مختلف فیصلے اور تجاویز پیش کرتی ہیں۔

④ لیبر یونین۔ (مزدوروں میں سرمایہ دارانہ عقلیت کو فروغ دینے کے ادارے، مزدوروں کے مادی حقوق کی جدوجہد کرنے والے)۔

⑤ انتظامیہ، مقامی اور قومی۔ داخلہ امور، خارجہ امور، دفاعی امور، تعلیمی امور، معاشی امور عملاً انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ بیوروکریسی عملاً مقننہ پر حاوی ہوتی ہے۔

⑥ میڈیا (میڈیا کے تینوں شعبہ یعنی تعلیم، تفریح اور اشتہارات، سرمایہ داری کے خادم ہوتے ہیں۔

⑦ کورٹس (لبرل دستور کی محافظ ہوتی ہیں۔ دستور درحقیقت آزادیوں اور حقوق کا مجموعہ ہوتا ہے جو فرد کو سرمائے کی بڑھوتری کے فرض کو پورا کرنے میں مدد دے)۔

⑧ پولیس (سرمایہ دارانہ عدل کو نافذ کرنے والا ادارہ)۔

⑨ آرمڈ فورسز (اقتدار اعلیٰ کا تحفظ، سرمایہ دارانہ لبرل ریاست کا دفاع)۔

⑩ مقننہ (عملاً پوری دنیا میں مقننہ کا رول کمزور ہوتا جا رہا ہے اور ٹیکنو کریسی ہی اصل فیصلے کرتی ہے)۔

⑪ عالمی ریٹنگ ایجنسیاں اور نگران ایجنسیاں (آئی ایم ایف، ورلڈ بنک)۔ سرمایہ دارانہ اصولوں کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابق ملکوں کی کارکردگی پر نظر اور کسی بھی ملک کی داخلی اور معاشی سرمایہ کاری پر اثر انداز کا خاص میکنزم۔

سرمایہ دارانہ مقتدرین کا طریق حکومت۔

سرمایہ دارانہ مقتدرین کا طریق حکومت دو طرح کا ہوتا ہے۔

① نمائندگی (Representation)

اس طریق حکومت میں مختلف انٹرسٹ گروپس، ہیروز، سیاسی پارٹیاں، انتظامیہ اور عدالتیں، لبرل، قوم پرست، اشتراکی سرمایہ دارانہ تحریکیں، استعمار کے زیر سایہ چلنے والی این جی اوز، پروفیشنلز ایسوسی ایشنز وغیرہ حصہ لیتی ہیں۔

② نفاذ احکام بذریعہ طاقت (Mediation)

فوج و پولیس، کورٹس، شمولیت (سیاسی مخالفین کو ساتھ ملانا مثلاً اسلامی جماعتوں اور مزدوروں کو سرمایہ داروں کا حامی بنانے کی کوشش کرنا)۔ اخراج (مخالفین کو بے دست و پا کرنا مثلاً علماء و بزرگان دین کے معاشرتی اثر و رسوخ کو صفر کر دیا گیا ہے)۔ سوشل ویلفیئر (لوگوں کو سیاست علیا سے بے خبر کرنے کے لیے مادی فلاحی رفاہی کام کرنا)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

عالمی سرمایہ دارانہ تنظیم اور امریکہ

سرمایہ دارانہ نظام فطری نہیں بلکہ حادثاتی ہے اس لیے اس نظام کو قائم ودائم رکھنے کے لیے ایک زبردست ریاستی جبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اٹھارویں، انیسویں اور بیسویں صدی کے وسط تک یہ ریاستی جبر ہمیں یورپی استعمار کی شکل میں متحرک نظر آتا ہے۔ جب یورپی استعمار نے مکمل اسلامی دنیا اور کئی دیگر ممالک اپنے زیر قبضہ رکھے ہوئے تھے۔

آج کا استعمار پہلے کے مقابلے میں کمزور ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔

① ایک وجہ تو یہ ہے کہ آج خود مغرب اپنے بنیادی افکار ونظریات میں متزلزل ہو رہا ہے۔ پس جدیدیت کی تحریک اس کی واضح مثال ہے۔ انگریزی استعمار کے دور میں یہ صورت حال نہ تھی۔

② عملی طور پر سرمایہ دارانہ نظام عالمی ہو گیا ہے۔ سرمایہ گلوبل ہو گیا ہے، اب وہ ریاستوں کے کنٹرول سے نکل کر بین الاقوامی کارپوریشن اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے کنٹرول میں آ گیا ہے۔

سرمایہ دارانہ ریاست اپنی توسیع کے لیے دو طریقے اختیار کرتی ہے۔

① جبر واستبداد۔ جیسا کہ ریڈ انڈینز اور آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، اسرائیل، کیوبا، کوریا، میکسیکو، ویت نام، چین، سوڈان، لبنان، بوسنیا، افغانستان اور عراق والوں پر جبراً فوج کشی کی گئی۔

② دستوری جمہوریت۔ اگر کوئی معاشرہ سرمایہ دارانہ ریاست کی اقدار (انسانی حقوق، آزادی، رواداری وغیرہ) کو برضا ورغبت قبول کر لے تو وہاں دستوری ریاست وجود میں آتی ہے اور یہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کی دوست یا حلیف ریاست ہوتی ہے وگرنہ حریف ریاست۔

امریکہ۔

امریکہ ایک سرمایہ دارانہ ریاست ہے۔ امریکہ کا اعلان آزادی ۱۷۷۶ء میں ہوا۔ فیڈرلسٹ پیپرز اور امریکی دستور حقوق انسانی کا منشور اور کتاب الٰہی کا ردّ ہے۔ امریکی ریاست ایک اعتبار سے عالمی سرمایہ کی محافظ ریاست ہے اور دوسرے اعتبار سے قومی ریاست ہے۔ عالمی فرائض ادا کرتے ہوئے اس کو بعض اوقات قومی مفادات چھوڑنے پڑتے ہیں جس کی وجہ سے مفادات میں تصادم ہوتا ہے۔

سرمایہ دار ریاستوں کی عام کمزوریوں کی طرح امریکہ بھی کمزوری کا شکار ہو رہا ہے۔ جس کی مختلف

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجوہات ہیں۔

① تمام یورپی ممالک اور امریکہ، خاندانی نظام کے ٹوٹنے کی وجہ سے عددی طور پر زوال کی طرف گامزن ہیں۔

② حرص وہوس اور لذات کی وجہ سے قوم میں قربانی کا جذبہ مسلسل ختم ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے مغرب کسی بھی طویل المدت جنگ لڑنے سے قاصر ہے۔

③ سیاسی اور مذہبی ایشوز کی جگہ غیر سیاسی اور فنی بنیادوں پر فیصلے طے پا رہے ہیں۔ سیاسی اداروں کی بجائے فنی ماہرین اور ایجنسیاں سرمائے کی بڑھوتری کے لیے فیصلے کرتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کو جو عالمی سطح پر ''تنظیم'' فراہم کرتی ہے وہ یو این او یعنی اقوام متحدہ ہے۔ مگر قوانین کے نفاذ کے لیے جو ریاست قوت فراہم کرتی ہے وہ امریکہ ہے۔ چنانچہ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب تک امریکی قوت کو بے دخل نہیں کیا جائے گا اور اس کی شان وشوکت کو توڑا نہیں جائے گا سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنا ممکن نہیں لہٰذا سرمایہ دارانہ نظام اور مغربی تہذیب سے مقابلہ دراصل امریکہ سے مقابلہ ہے۔

اس لیے امریکہ سے ہماری دشمنی کسی نسلی تعصب یا امریکی عوام سے نفرت کی بنیاد نہیں بلکہ عالمی سرمایہ دارانہ نظام کے پشتی بان کی حیثیت سے ہے اور اگر وہ سرمایہ دارانہ نظام کی پشت پناہی چھوڑ کر اسلام قبول کر لے تو وہ اسی طرح ہمارے بھائی ہوں گے جس طرح قریش مکہ کی حیثیت اسلام قبول کر لینے کے بعد تھی۔

(تلخیص از سرمایہ دارانہ نظام، ایک تنقیدی جائزہ۔ مرتب، محمد احمد حافظ۔ زیر نگرانی۔ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری۔ الغزالی پبلی کیشنز، کراچی۔ اشاعت دوم، مئی ۲۰۰۹ء)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

حصہ چہارم

اسلامی زندگی میں سیکولرزم

عالم اسلام میں سیکولرزم کے اسباب

باب ⑭ امت اسلامیہ کا انحراف

باب ⑮ یہودی صلیبی ریشہ دوانیاں

اسلامی زندگی میں سیکولرزم کے مظاہر

باب ⑯ اسلامی ممالک میں سیاست وقانون کا سیکولرزم

باب ⑰ اسلامی ممالک میں نظام تعلیم کا سیکولرزم

باب ⑱ اسلامی ممالک میں معاشرت واخلاق کا سیکولرزم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

باب:۱۴

اُمت اسلامیہ کا انحراف

(عالم اسلام میں سیکولرزم کا پہلا سبب: داخلی دینی کمزوری)

قرونِ آخر میں امت مسلمہ کی پس ماندگی اور انحطاط کی تفصیل بہت طویل اور گنجلک ہے۔ لیکن اس کی ایک واضح نشانی جس سے یہ دیگر صدیوں کے انحطاط سے الگ ہوسکتی ہے، وہ خود اسلام کے فہم میں انحراف وانحطاط ہے۔ آخری صدیوں میں اسلام کے بنیادی تصورات اور عقائد محدود معانی اور تنگ مفاہیم میں سکڑ گئے۔ یہ انحراف بیک وقت پس ماندگی کا سبب بھی بنا اور اُس کا نتیجہ بھی۔

یہ انحراف اُس کمزوری کا نتیجہ تھا جو امت مسلمہ کو بڑے پیمانے پر لاحق ہوئی یعنی دنیا کی بے تحاشا محبت اور موت سے کراہت وبغض۔ یہ انحراف اس ذلت کی وجہ سے بھی تھا جو امت مسلمہ پر مسلط ہوئی جب اُس نے جہاد کے وسیع مفہوم کو ترک کر دیا۔ دینی تربیت کے اُصول وقواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی ایک گناہ کی سزا اس طرح بھی دیتے ہیں کہ بندہ دیگر گناہوں میں مبتلا ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ اللہ کی بدترین سزا ہوتی ہے۔ امت مسلمہ بھی اسی سزا میں گرفتار ہوئی۔ جب اس نے عملی انحراف کا راستہ اختیار کیا تو اس کو زیادہ سخت انحراف یعنی عقیدہ وتصور کے انحراف میں مبتلا کر دیا گیا۔

یہ وہ سبب تھا جس کی وجہ سے بڑے بڑے واقعات اور بھیانک خطرات نے جنم لیا، حتی کہ خطہ اسلامی شروع سے آخر تک ملیامیٹ ہوگیا۔ ہم بطور مثال چند حادثات کا ذکر کرتے ہیں۔

اسلامی زندگی میں عام علمی جمود اُس وقت غالب آیا جب یورپ ماضی کی گرد وغبار جھاڑ کر نت نئی ایجادات ودریافت کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ مادی ومعنوی ضعف نے اسلامی ممالک کو کافروں کے لیے لقمہ تر بنا دیا۔ یورپ اُن کو ایک ایک کر کے ہڑپ کرتا چلا گیا، حتی کہ یہ ممکن ہو چلا کہ وہ حرمین شریفین پر بھی قبضہ کر لے!

عثمانیوں کو سان جونار میں شکست ہو چکی تھی۔ مصر کے مملوک حکمران نپولین کے سامنے بڑی تیزی سے پسپا ہو رہے تھے۔ یہ بات واضح اشارہ تھی کہ علمی جمود اور مادی ومعنوی کمزوری ہی پسپائی کا اصل سبب تھے۔ اسلام کی راہبری وقیادت کا دور فقط پوری دنیا سے ہی ختم نہ ہو رہا تھا بلکہ خود اسلام کے اپنے علاقوں میں بھی مٹنے والا تھا!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عقیدہ کا انحراف ہی تباہی وانحراف کا اصل سبب ہے تو ہم خارجی عوامل کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ کفار عملی وعسکری اعتبار سے برتری حاصل کر چکے تھے۔ اندھی صلیبی عداوت نے استعماری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لشکروں کے ساتھ اپنے گمراہ کن فکری لشکر بھی پھیلائے۔ لیکن اسلامی منطق ثابت کرتی ہے کہ خارجی قوت جس قدر طاقتور ہو اور ریشہ دوانیاں جس قدر خطرناک ہوں۔ مسلمان کبھی شکست خوردہ نہیں ہو سکتے۔ وہ ہمیشہ اپنے ذاتی اسباب سے ہی ہارتے ہیں۔ یہ اللہ کا قاعدہ ہے جو اس نے جاری کیا۔

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ﴾ (انفال۔۸/۵۳)

یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کہ کسی قوم پر کوئی نعمت انعام فرما کر پھر بدل دے جب تک کہ وہ خود اپنی اس حالت کو نہ بدل دیں جو کہ ان کی اپنی تھی۔

اور نبی اکرم ﷺ نے بھی اس کو واضح کیا ہے۔

(دَعَوْتُ رَبِّي أَلَّا يُهْلِكَ أُمَّتِي بِسَنَةٍ عَامَّةٍ وَأَلَّا يُسَلِّطَ عَلَيْهِمْ عَدُوًّا مِنْ سِوَى أَنْفُسِهِمْ فَيَسْتَبِيحَ بَيْضَتَهُمْ حَتَّى يُقَاتِلَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا)

(مسلم مع النووی، ۱۸/۱۴۔ الترمذی، ۴/۴۷۲)

میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ میری امت کو عام قحط سالی سے ہلاک نہ کرے اور اُن پر اُن کے اپنے نفسوں کے سوا کسی دشمن کو مسلط نہ کرے جو اُن کی جڑ کاٹ دے، حتی کہ وہ آپس میں لڑائی کریں۔

یہ ایک فطری طریقہ ہے کہ عالم اسلام میں سیکولرزم کے پھیلاؤ کے اسباب میں مسلمانوں کے انحراف کو پہلے بیان کیا جائے اور اس کے بعد یہودی و نصرانی سازشوں کو بیان کیا جائے جن کو اس معاملے میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سیکولرزم یورپ میں اس لیے ظاہر ہوا کیونکہ اُن کا دین نصرانی تحریف کا شکار ہو چکا تھا اور عالم اسلام میں اس لیے ظاہر ہوا کیونکہ مسلمان اپنے دین سے منحرف ہو چکے تھے۔

اس انحراف کے مظاہر کا خلاصہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے:

① الوہیت کے مفہوم میں انحراف

ہم فی الحال عقیدہ لا الٰہ الا اللہ اور سیکولرزم کے مابین تضاد کو بیان نہیں کریں گے کیونکہ اس کا موقع و محل آگے آئے گا۔ لیکن ہم اختصار کے ساتھ وہ حالات بیان کریں گے جو تاریخی طور پر عالم اسلام کو آخری ادوار میں پیش آئے۔

بعض علمائے سلف توحید الوہیت کو دو ضروری اقسام میں تقسیم کرتے ہیں:

ا۔ توحید اطاعت و اتباع

ب۔ توحید ارادہ و قصد

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس تقسیم کے مطابق امت مسلمہ کی صورت حال اس طرح تھی۔

① **توحید اطاعت واتباع میں امت مسلمہ کی صورت حال**

مسلمان اس عظیم توحیدی قاعدے کو بھول چکے تھے کہ خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی کوئی اطاعت روا نہیں۔ وہ اللہ تعالی کے اس فرمان سے غافل تھے۔

﴿اتَّبِعُواْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلاَ تَتَّبِعُواْ مِن دُونِهِ أَوْلِيَاء﴾

(اعراف۔۳/۷)

تم لوگ اُس کی اتباع کرو جو تمھارے رب کی طرف سے آئی ہے اور اللہ تعالی کو چھوڑ کر من گھڑت سرپرستوں کی اتباع مت کرو۔

انھوں نے عبادت کی اِس قسم کو یا اِس کے کچھ حصے کو حکمرانوں، والیوں، متعصب مذہبی علما اور صوفی مشائخ کی طرف پھیر دیا۔ امت پر اس قدر جہالت وسادگی غالب تھی کہ وہ شعبدہ بازوں سے بھی متاثر ہو جاتے۔ اُس وقت عالم اسلام تین سلطنتوں میں تقسیم تھا۔

① ہند میں مغلیہ سلطنت۔

② فارس میں صفوی سلطنت۔

③ بحیرہ روم کے حوض میں عثمانی سلطنت۔

صفوی سلطنت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مکمل منحرف تھی اور اس کا اسلام سے رشتہ محض نام کی حد تک تھا۔ اس حکومت کی سب سے بڑی دل چسپی عثمانی بادشاہوں پر حملے کرنا تھی، فقط اس وجہ سے کہ وہ سنی تھے۔ عوام بادشاہوں اور علما کو مقدس مانتے تھے جیسا کہ رافضی مذہب انبیا کے علاوہ دیگر کی عصمت کو جائز قرار دیتا ہے۔ (۵۸۵)

مغلیہ سلطنت میں اورنگ زیب کو چھوڑ کر باقی سارے بادشاہ اسلام کی حقیقت سے جاہل تھے۔ اُن کا فہم اسلام بہ کثرت خرافات اور ناقص تصورات سے بھرا ہوا تھا۔ اور یہ باعث تعجب نہیں کیونکہ مغل صاف ستھرے اسلام کو شروع سے ہی حاصل نہ کر سکے۔ بلکہ وہ اسلام کی اُس شکل وصورت میں داخل ہوئے جب امت مسلمہ عباسی سلطنت کے دوسرے دور کے آخر میں تھی۔ اُس وقت اسلام کو مذہبی جھگڑوں، فکری کشمکش اور باطنی گروہوں نے کھوکھلا کر دیا تھا اور اسلام منہدم ہونے کے لیے تیار تھا۔ مغل اس دور میں اسلام کے اندر داخل ہوئے جب وہ مغلوبیت کا شکار تھا اور مثالی صورت کا حامل نہ رہا تھا۔

اسلام سے جہالت اور پھر مسلمانوں کا ہندوؤں کے مابین اقلیت میں ہونا، اسی وجہ سے جب انگریزوں نے اسلامی شریعت کو لغو قرار دیا تو وہ کوئی بڑی مزاحمت نہ کر سکے۔ عثمانی سلطنت، اگرچہ عقیدہ وسلوک میں دونوں سے بہتر تھی لیکن وہ خلافت راشدہ کے منہج سے دور تھی اور مختلف عثمانی سلاطین اپنے مزاج کے مطابق خلافت راشدہ سے قربت یا دوری اختیار کرتے رہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کوئی بھی مصنف اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ **عثمانی سلطنت** کے کارنامے اور خوبیاں ستائش کی مستحق ہیں۔ عثمانی سلطنت نے اسلامی غلبے کو مشرقی یورپ تک پھیلا دیا جبکہ مسلمان مغربی یورپ میں سقوط اندلس کی صورت میں اپنا بہت بڑا علاقہ کھو چکے تھے۔ اس نے یورپی استبداد کا پنجہ اُس وقت توڑا جبکہ وہ عالم اسلام کو کاٹنے میں لگا ہوا تھا۔ اور یورپ کو اپنی کامیابی عثمانی سلطنت کے گرنے کے بعد ہی ملی۔

اسی طرح **عثمانی سلطنت** کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ وہ اسلامی دعوت کے جذبے سے لبریز تھے اور وہ یورپ میں دین اسلام کو پھیلانے میں کارگر ثابت ہوئے اور اسی سبب وہ تاریخ میں مستقل حیثیت کے حامل بن گئے۔ (۵۸۶)۔ لیکن اس سب کے باوجود عثمانی سلطنت انحراف سے نہ بچ سکی بلکہ وہ لاشعوری طور پر حسن نیت کے ساتھ انحراف میں آگے بڑھتی چلی گئی۔ حکومت کے مظاہر دیکھیں تو عثمانی سلطنت کے انحراف کا یہ عالم تھا کہ وہ عملی طور پر حنفی مذہب کو تعصب کے ساتھ لاگو کیے ہوئی تھی۔ اور اس کے علما ''شیوخ الاسلام'' اجتہاد کے دروازے کو کھولنے سے انکاری تھے جو چوتھی صدی سے بند تھا۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ یہ جھگڑا اُس وقت دشمنی میں بدل گیا جب سلطنت نے جمود توڑنے والی تجدیدی تحریکات کا سامنا کیا۔ یہ تحریکیں، فکری آزادی اور قرآن وسنت سے براہ راست تعلق کی دعوت دیتی تھیں۔ جیسے امام محمد بن عبدالوہابؒ کی دعوت (۱۲۰۶)، امام شوکانیؒ (۱۲۵۰)، شیخ آلوسی وغیرہ۔ (۵۸۳)

اس کے درج ذیل برے نتائج مرتب ہوئے۔

① **عثمانی سلطنت میں، بادشاہوں والا جبری وراثت کا طریقہ** جاری رہا جس کی ابتدا اموی دور سے ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس معاملے کو عرف نے جاری رکھا۔ اس کے کچھ مثبت پہلو بھی تھے خصوصاً آل عثمان جیسے مجاہد خاندان کے اندر۔ لیکن کم از کم یہ تو ممکن تھا کہ وہ شوری کا بنیادی قاعدہ جاری رکھتے گو وراثتی خلافت بھی جاری رہتی۔ اگر معاملات کو کھلا چھوڑ دیا جائے تو ظلم واستبداد کا راستہ کھل جاتا ہے اور بعض سلاطین اور والیوں کی طرف سے ایسا ہی ہوا۔ عالمی حالات وواقعات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ شوری قائم ہو۔ **عثمانی سلطنت** کے ہم عصر مغربی بادشاہ اپنے تخت بچانے کے لیے آزادی اور جمہوریت کی دعوت کو کچل رہے تھے۔ **عثمانی سلطنت** پر لازم تھا کہ وہ ان حالات میں نصیحت پکڑتی اور مغرب کے حامیوں کا راستہ روک کر اسلامی اصول راشدہ کی طرف لوٹنے کا مشورہ قبول کرتی۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ عثمانی سلطنت نے یہ کام ضرور کیا لیکن دیر ہوچکی تھی بلکہ اُس کی کوشش بذات خود اُس دباؤ کے تحت ہوئی جو مغرب کے داعی اور وکیل سلطنت میں برپا کیے ہوئے تھے۔ عثمانی سلطنت کی تجدید ذاتی طور پر اپنے شعور کے ساتھ نہیں ہوئی۔

② **جدید واقعات کے تناظر میں فقہی استنباط کا جمود:** اسلامی شریعت انسانی زندگی کے لیے ایک ہمہ گیر اور کامل طریقہ کار ہے۔ یہ جب سے نازل ہوئی ہے اس وقت سے کامل اور مکمل طریقہ ہے اور یہ طریقہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اللہ زمین اور اس پر بسنے والوں کا وارث بنے گا۔ شریعت کی فقہ کو ان واقعات، چاہے وہ جتنا نیا

محکم جلد اللہ زمین اور اس پر بسنے والوں کا وارث بنے گا۔ شریعت کی فقہ کو ان واقعات

www.KitaboSunnat.com

ہواور حالات وظروف اپنے وسیع دائرے میں جس قدر بدل جائیں اِس طریقے سے خارج نہیں۔ اسلامی تصور کے مطابق یہ ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس میں شک کرنے کا مطلب ہے کہ بدیہی طور پر باری تعالی پر تہمت لگائی جائے کہ وہ ناقص ہے اور حالات کو پہلے سے نہیں جانتا۔ اور یہ خالص کفر ہے۔

انسانی زندگی مستقل طور پر تبدیلیوں کا نشانہ بنی رہتی ہے۔ اس کی گنجائش کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اور انسانی عقل مطلق طور پر اس کے گوشوں کا احاطہ نہیں کرسکتی کیونکہ وہ غیب کا علم حاصل نہیں کرسکتی۔ چنانچہ شریعت کا مجتہد، چاہے وہ جتنی وسعت اور دقت نظر کا حامل ہو، وہ بہ ہر حال اپنے ماحول کے واقعات میں محصور ہوتا ہے۔ اور اسی نقطہ پر کھڑا ہوتا ہے جہاں بشریت اپنے طویل سفر کے دوران پہنچتی ہے۔

یہ دونوں (شریعت کا مکمل ہونا اور انسانی زندگی کے تقاضوں کا بدلنا) ایسی حقیقتیں ہیں جن پر امت مسلمہ شروع سے پختہ ایمان کی حامل رہی ہے۔ البتہ دوسری حقیقت بعض لوگوں کے ذہن سے غائب ہوگئی جو جدید حالات سے متاثر تھے اور دیکھتے تھے کہ کئی صدیوں سے فکری جمود طاری ہے اور نیا کچھ نہیں۔

انہی لوگوں میں سے **عثمانی سلطنت** کے بعض خلفا اور علما تھے جنھوں نے اجتہاد کے دروازے کھولنے سے انکار کیا یا اجتہاد کو سابقہ حنفی فقہا سے منقول ورثہ میں ہی محدود کردیا۔ یہ جمود ایک ایسے وقت میں تھا جبکہ زندگی اللہ کی سنت کے مطابق بڑی تیزی سے ارتقاپذیر ہورہی تھی۔ اس طرح تاریخ مسلمین میں پہلی دفعہ یہ موقع آیا کہ واقعاتی فقہ کا دائرہ تنگ ہوگیا بلکہ فرضی مسائل کی فقہ بھی جدید مسائل کا احاطہ کرنے سے عاجز آگئی۔ (۵۸۸)۔ طبعی طور پر شریعت تنگ نہیں ہوئی بلکہ متون وحواشی کی فقہ تنگ ہوئی۔ شریعت کے لائق نہیں کہ وہ تنگ ہو۔ شیخ محمد الغزالی کہتے ہیں:

''وقت ٹھہرتا نہیں اور لوگ جیسے جیسے نت نئے فسق وفجور میں داخل ہوتے ہیں، ویسے ہی ان کے مسائل زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔ نسل انسانی نئے مراحل میں داخل ہوتی ہے اور نئے سیاسی تعلقات، ادارتی، اقتصادی طور طریقے جنم لیتے ہیں۔ دین کی ذمہ داری ہے کہ وہ چلنے والے قافلے کی راہ نمائی کرے۔ ان سب باتوں کے باوجود اسلامی فقہ کی فکر معاملات کے اکثر میدانوں میں ٹھہر گئی، اگرچہ وہ مکمل طور پر جامد نہیں ہوئی۔ اجتہاد کا دروازہ کچھ صدیوں سے بند تھا حتی کہ ضرورتوں کے زوردار دباؤ کے تحت ٹوٹ گیا اور اس کے ٹوٹتے ہی شریعت کے فہم وتطبیق میں خوف ناک ابتری پھیل گئی۔ (۵۸۹)

افسوس ناک بات یہ ہے کہ معاملہ اس طور ٹھہرا کہ اجتہاد کا دروازہ نہ کھولا گیا اور نہ توڑا گیا، بلکہ کافروں کے غیر ملکی قوانین درآمد کیے گئے۔

درآمد کا معاملہ اتنا سست اور پیچ دار تھا اور اُس کی قبولیت میں ایک سبب حسن نیت بھی تھی، کہ اُس کی خطرناکی کا احساس تک نہ ہوا۔ ابتدا میں حالات وواقعات کے تحت **اصلاح وتنظیم** کا نام استعمال کیا گیا۔

عثمانی فوج اب رضاکاروں کا مجموعہ نہ رہی تھی جو تلواروں کو اٹھائے پھریں اور گھوڑوں کو دوڑاتے پھریں۔ اب ملکی عسکری حالات تقاضا کررہے تھے کہ ایک منظم تربیت یافتہ فوج ہو جو جدید وسائل استعمال کرے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور جہاد کی ذمہ داری کے لیے فارغ ہو۔

اس فوج کے لیے انتظامی لائحہ عمل تیار کرنا مجلس علما کے بس میں نہ تھا کیونکہ وہ اس قسم کے مسائل کو ظاہری شمار کرتی تھی اور توجہ کا مستحق نہ سمجھتی تھی۔ اس طرح یہ خود فوجی قیادت کے بس میں نہ تھا کیونکہ علمی و ذہنی جمود جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ترقی و جدت کے ہر موقع کو ضائع کرنے پر تلا ہوا تھا۔ تب کیا حل ہو سکتا تھا؟

عثمانی سلطنت مجبور ہوگئی کہ یورپی بادشاہوں کی طرف رجوع کرے جن کو وہ ہمیشہ سے اور اُس وقت بھی حقیر خنزیر شمار کرتے تھے۔ (۵۹۰)۔ وہ عثمانی فوج کے تربیت کاروں کی کھیپ اُن سے منگواتے رہے۔ جرمنی، فرانس اور سویڈن کے تربیت کار آئے۔ اور تاریخ اسلام میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ اسلامی لشکر کی تنظیم کے لیے کافر ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔

یہ ابتدا تھی اور اس کے بعد جو ہوا سو ہوا۔

جب اداراتی نظم و نسق کی اصلاح کا ارادہ کیا گیا تو صوبوں، گورنروں اور قاضیوں کی ذمہ داریوں اور تنظیم کے لیے مغربی طریقے درآمد کیے گئے۔ جب تعلیمی نظام کی اصلاح کا ارادہ کیا گیا تو سکول بنائے گئے اور یورپی اسلوب پر تعلیمی پروگرام وضع کیے گئے۔

جب حکومتی نظام کی اصلاح کا ارادہ کیا گیا تو مغرب زدہ داعیوں کا اصرار تھا کہ ممبران اسمبلی مغربی طریقے کے مطابق ہونی چاہیے۔ لکھا ہوا دستور وضع کیا جائے جس میں یورپی طرز پر نکات و شقیں ہوں اور وہی ہوا جو وہ چاہتے تھے۔

یہاں ہمارا مقصود ان اُمور کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ توحید اطاعت و اتباع میں غیر شعوری طور پر اور نادانستگی میں کوتاہی برتی گئی۔ فقہی دائرے کی تنگی اور زندگی کی وسعت کے سبب درآمد شدہ قوانین رفتہ رفتہ اسلامی زندگی کے نئے مقامات پر داخل ہوتے چلے گئے۔ اس خطرناک معاملے کی طرف غور نہ کیا گیا حتی کہ ایک وقت ایسا آیا کہ ان قوانین سے استفادہ ایک مستقل طریقہ اور اُصول قرار پایا جس میں کوئی شک و شبہ نہ رہا۔

یہ بات درست ہے کہ شروع شروع میں یہ استفادے فقط انتظامی نوعیت کے تھے اور حلال و حرام کی قانون سازی پر مبنی نہ تھے، بلکہ عثمانی خود بھی ان کو **انتظامی اصلاحات** کہتے تھے۔ لیکن حالات جو بھی ہوں، حلال و حرام کی قانون سازی (تشریعات) کا راستہ ہموار کیا گیا خصوصاً ''مجلس مبعوثان'' کی تشکیل کے بعد۔ (۵۹۱)

اس سے مسلمانوں کی سیاست کا نکتہ سمجھ آتا ہے، مسلمانوں کا انحراف یہ تھا کہ وہ اپنے دین کی حقیقت سے جاہل ہوگئے، زندگی میں اللہ کی سنت سے غافل ہوگئے اور حالات کا قدم بقدم ساتھ نہ دے سکے۔ یہ بنیادی سبب ہے کہ سیکولرزم اسلامی مشرق کے اندر گھس آیا۔

ب۔ توحید ارادہ و قصد میں انحراف۔

مختلف تاریخی اسباب کے تحت عصر عباسی میں ''صوفیہ'' کا ظہور ہوا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ مرکزی خلافت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کمزور اور منحرف ہوگئی، لوگ عیش وعشرت میں منہمک ہوگئے، دار آخرت کا اہتمام دلوں سے رخصت ہوگیا۔ تب مختلف صوفی فرقوں کا مختلف انحراف سامنے آیا۔ وہ سنت کے ساتھ تمسک اور سلف صالحین کی اقتدا کے جتنا قریب ہونا چاہتے، اتنا ہی دور ہوتے چلے گئے۔

صوفی فکر کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کے ساتھ دشمنی کا نظریہ اختیار کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدھ مت اور اشراقی فکر سے متاثر تھے۔ حادثہ یہ ہوا کہ عوام صوفیہ کی قیادت میں مختلف رسوم ورواج اور وردوظیفوں پر متوجہ ہوگئے اور حکمران طبقے نے شہوات ولذات کو اپنا مرکز ومحور بنا لیا! صوفیہ کا احمقانہ خلط مبحث، اسلامی فکر میں پہلی دفعہ خرابی کا باعث بنا بلکہ امت مسلمہ کے وجود کو پہلی ضرب لگی جو بعد میں مکمل تباہی کا سبب بنی۔ (۵۹۲)۔ دین اور دنیا کی علیحدگی سے عبادت کا مفہوم چند مخصوص شعائر واذکار میں سکڑ کر رہ گیا۔ بلکہ اس نظریے کے التزام سے خود ارکان اسلام کے بعض حصوں کی ادائیگی مشکل ہوگئی، خصوصاً زکوۃ۔

صوفیہ کے بعض اکابرین سے یہ منقول ہے: جب انھوں نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سنا

﴿يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ﴾ (انبیاء۔۲۱/۲۰)

وہ دن رات تسبیح بیان کرتے ہیں اور ذرا سی بھی سستی نہیں کرتے۔

قرآن یہ کہتا ہے اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم تھک جاتے ہیں؟ صوفیہ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے کہ وہ اسلام میں عبادت کی حقیقت سے کس قدر جاہل ہیں۔ وہ زمین میں انسان کے وجود کی غایت کو جانتے ہی نہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے تفصیل سے واضح کیا ہے۔

حالانکہ ایک مسلمان، چاہے اس کا جو بھی دنیوی عمل ہو یہ بات اپنے دل کی گہرائیوں میں جانتا ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ وہ اپنے اہل وعیال کے لیے محنت مزدوری کرتا ہے، یا علم کو تلاش کرتا ہے، یا تعلیم دیتا ہے، یا رزق کی خاطر زمین میں گھومتا پھرتا ہے، یہ سب عبادت کی ہی شکلیں ہیں۔ اب عبادت کا مفہوم نمازوں اور اذکار میں محدود ہوگیا ہے۔ اس محدود تصور کا حامل سوچتا ہے کہ اپنی فارغ زندگی کو کیسے مکمل کرے۔ چنانچہ وہ شیخ کی طرف مجبور ہوتا ہے تاکہ اس خلا کو ختم کرے۔ اس وقت شیخ ایسی شریعت بیان کرتا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ وہ مرید کو مجبور کرتا ہے کہ وہ وردوظیفوں کے لمبے لمبے متون یاد کرے اور اُن کو ہزار تسبیحات کی صورت میں بار بار دھرائے۔ کبھی اس کو مجبور کرتا ہے کہ زمین میں بغیر زاد راہ سیر وسیاحت کرے تاکہ اس کا یقین مضبوط ہو سکے اور وہ اپنے توکل میں سچا ثابت ہو سکے!! اس طرح عبادت کا مفہوم سکڑ کر خود عبادت کے انحراف تک پہنچ گیا، احکام کا اخذ واستنباط قرآن وسنت کے چشمے سے ہٹ کر ہونے لگا۔

ہم صوفیہ کے افراد کو چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم امت میں اُن کے معنوی اثر پر غور کرتے ہیں۔ عوام میں سے ایک عام درجے کا فرد اپنے دل میں حیرت والم کو محسوس کرتا ہے جب وہ لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم دیکھتا ہے:

ایک نیک گروہ ہے جو آخرت کے لیے محنت کرتا ہے اور اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اطاعت وتقرب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اعمال بجالاتا ہے لیکن اُس کا دنیا میں کوئی حصہ نہیں اور دوسرا اللہ کا فاسق و نافرمان ہے جو دنیا کی لذتوں اور ناز و نعم سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان دو گروہوں کے علاوہ تیسرا گروہ نہیں۔ اب اُس کے لیے مشکل ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرے۔ کیا وہ پہلے گروہ میں جائے اور اپنے آپ کو محرومی و فاقے کا شکار کر لے یا دوسرے گروہ میں شامل ہو کر اللہ کی نافرمانیوں میں واقع ہو جائے!!

امت کا بڑا حصہ طبعی طور پر دنیا سے الگ نہ رہ سکا لیکن اب وہ دنیا میں محنت تو کرتا ہے لیکن احساسِ گناہ اور شرمندگی کے ساتھ۔ وہ سمجھتا ہے کہ جب وہ دنیا میں مصروف ہوتا ہے تو اللہ کی عبادت نہیں کر رہا ہوتا۔ وہ یہ بھول چکا ہے کہ یہ بھی اس عظیم مقصد کا حصہ ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔!

یہ سب انحرافات اس وقت پیدا ہوئے جب ابھی لادین مغرب کا واسطہ مشرق سے نہیں پڑا تھا اور ابھی عثمانی سلطنت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

جب عثمانی غالب آئے تو معاملے کی خرابی مزید بڑھ گئی اور انحرافات میں بھی اضافہ ہوا۔ اب لوگوں کا خیال یہ بنا کہ جن بدعات کا مزعومہ مشائخ و اولیا حکم دیتے تھے، وہ اول درجے کی عبادت ہے۔ اب امت اپنی سادگی اور جہالت کے سبب شرک حقیقی میں واقع ہوگئی۔ بعض نام نہاد علما لوگوں کو مقبروں، مزاروں اور مردوں کے تقدس کی بدعات میں مبتلا کرنے لگے اور نفع کے حصول اور دفع ضرر میں اُن پر اعتماد کرانے لگے۔

معاملہ اس حد تک کمزور ہو گیا کہ بیرونی استعمار کے لشکر اسلامی شہروں میں گھس آئے اور مسلمان اُن سیدوں اور ولیوں کو پکارتے رہ گئے جن کی وفات پر کئی صدیاں گزر چکی تھیں! (۵۹۳)

مصیبت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ سرحدی چوکیداری (رباط) اور دینی محاذ جو جہاد اور کفار کی سرکوبی کے لیے بنائے گئے تھے، صوفیہ کی خانقاہوں اور تکیوں میں تبدیل ہو گئے۔ زیادہ بہتر صورت میں ہوں تو ایسے خالص علمی مدارس بن گئے جن میں جہادی تربیت کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے تعلیمی اصول و قواعد پس ماندہ اور محدود ہوتے چلے گئے۔ (۵۹۴)

صوفیہ کے ساتھ ساتھ متاخرین فقہا کا بھی بڑا ہاتھ ہے کہ انھوں نے نادانستگی میں فقہ کے ابواب ایسے بنائے جس سے اس انحراف کو تقویت ملتی تھی، انھوں نے شرعی احکام کو عبادات و معاملات میں تقسیم کر دیا۔ پہلی قسم میں خالص تعبدی احکام رکھے اور دوسری قسم میں ایسے تعبدی احکام رکھے جو اجتماعی و معاشرتی سرگرمیوں سے متعلق ہوں۔ وہ اس بات کے نہ قائل تھے اور نہ عقیدہ رکھتے تھے کہ دوسری قسم عبادت نہیں۔ لیکن انھوں نے فنی اور اصطلاحی اعتبار سے جو تقسیم کی وہ اصل موضوع سے مَس نہیں رکھتی تھی۔ قرنِ اول و ثانی میں فقہی کتب کی تالیف کا یہ انداز نہ تھا اور نہ عام کتب سنت اس تقسیم کی حامل تھیں۔ یہ تقسیم صوفیہ کے ظہور و انتشار کے بعد پیدا ہوئی، جب اسلامی زندگی میں عملی علاحدگی واقع ہوگئی جو اس تقسیم کی تقویت کا باعث بنی۔ سید قطب شہیدؒ فرماتے ہیں: ''انسانی سرگرمیوں کو عبادات و معاملات میں تقسیم کرنا ایسا مسئلہ تھا جو فقہی تالیف میں متاخرین کے ہاں پیدا ہوا۔ یہ علمی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تالیف کا انداز تھا۔ لیکن افسوس کہ اس نے بعد میں تصورات کے اندر بہت برے آثار پیدا کیے، پھر کچھ عرصہ بعد اُس نے ساری زندگی کے اندر برے اثرات کھڑے کر دیے۔ اُس نے لوگوں کے ذہن میں یہ راسخ کیا کہ عبادت کا وصف خاص پہلی سرگرمی سے تعلق رکھتا ہے جو فقہ میں عبادات کے نام سے موسوم ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ دوسری قسم کی سرگرمیوں میں دیوانے ہو گئے جن کا فقہی نام معاملات رکھا گیا۔ یہ اسلامی تصور میں ایسا انحراف تھا جس کے انحراف ہونے میں شک کی گنجائش نہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے نتیجے میں پورے اسلامی معاشرے کی زندگی میں انحراف در آیا۔ (۵۹۵)

اس انحراف سے ایک اور انحراف پیدا ہوا۔ یہ ارکان ایمان میں سے ایک رکن میں تھا۔ یہ تقدیر کے مفہوم کا انحراف تھا۔

② تقدیر کے مفہوم میں انحراف:

ایک جرمن مستشرق نے مسلمانوں کے آخری دور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے: ''مسلمانوں کی طبیعت ہے کہ وہ اللہ کے ارادے کو تسلیم کرتے ہیں، اُس کی قضاوقدر پر راضی ہوتے ہیں اور وہ واحد قہار کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس اطاعت کے دو مختلف اثرات پیدا ہوئے۔ اسلام کے اولین زمانے میں اس کا جنگوں میں بڑا کردار تھا، اس سے ایک مسلسل نصرت حاصل ہوتی رہی کیونکہ اس سے جنگجوؤں کے اندر فدائیت کی روح پیدا ہوتی تھی۔ لیکن آخری ادوار میں یہ عقیدہ جمود کا سبب بن گیا جس نے عالم اسلام کو پستی و عزلت میں گرا دیا اور اس کو عالمی واقعات میں اپنا کردار ادا کرنے سے دور کر دیا۔ (۵۹۶)

غیر مسلم ہونے کے باوجود اس محقق نے حقیقت کا صحیح ادراک کر لیا ہے۔ یہی فرق ہے سلف کے فہم کے مطابق ایمان بالقدر کے درمیان اور اُس عقیدے کے درمیان جو متاخرین نے صوفیہ سے متاثر ہو کر گھڑ لیا۔ چنانچہ قصور عقیدہ کا نہیں بلکہ معتقدین کا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو جو ذلت، رسوائی اور حسی و معنوی شکست کا سامنا کرنا پڑا، وہ اللہ کی تقدیر سے تھا کیونکہ کائنات میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اور اُس پر کوئی چیز مخفی نہیں بلکہ اس کا علم ماضی و مستقبل کے لحاظ سے برابر ہے۔ لیکن مسلمانوں نے آخری دور کے اندر اِس مفہوم کو بدل ڈالا۔ انھوں نے ایمان بالقدر کو اپنی عاجزی اور پستی کا بہانہ بنا لیا اور یہ بھول گئے کہ اللہ کی تقدیر اللہ کی ثابت شدہ سنتوں کے مطابق جاری ہوتی ہے جن کو اللہ نے خوب واضح کر دیا ہے۔ مسلمان اللہ کی سنتوں سے غافل ہو گئے، چنانچہ اصل ذمہ داری انہی کی تھی اور تیرا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

وہ توکل جو جہادی جذبے کے لیے قوی محرک تھا اور زمین میں اسباب حیات حاصل کرنے کے ساتھ محنت کرتا تھا، وہ حقیر و مذموم ''تواکل'' میں تبدیل ہو گیا جس کا نام متصوفین نے یقین رکھا، بعض نے قناعت رکھا اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر ایک نے اللہ سے اجر و ثواب کی امید بھی رکھی۔

امام ابو حامد الغزالی رحمہ اللہ (م ۵۰۵ھ) معتدل صوفیہ میں سے شمار کیے جاتے ہیں، توکل کے مقامات کے ضمن میں کہتے ہیں: پہلا مقام: خواص واصحاب نظر کا مقام، یہ وہ مقام ہے جس کا حامل جنگلات میں ایک ہفتہ یا اُس سے زائد کے لیے بغیر زادراہ کے گھومتا پھرتا ہے۔ وہ اللہ کے فضل پر بھروسہ کرتا ہے جو اس کو صبر پر طاقت دے گا یا اس کو گھاس مہیا کرے گا یا کوئی بھی ضروری خوراک یا رضا بالموت پر استقامت دے گا، اگر اس کو کچھ میسر نہ آسکا۔ دوسرا مقام: وہ اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھ جائے لیکن بستیوں اور شہروں میں نہ کہ جنگل میں۔ یہ پہلے سے کم تر درجہ ہے لیکن یہ بھی توکل ہے کیونکہ اس نے کسب کو چھوڑ کر اور اسباب ظاہری ترک کر کے اللہ کے فضل پر بھروسہ کیا کہ وہ مخفی اسباب سے خود ہی معاملات کی تدبیر فرمائے گا۔ اُس کا شہروں میں بیٹھنا اسباب رزق کی ہی کوشش ہے۔ (۵۹۸)

ہمیں معلوم ہے کہ یہ کلام اُس وقت لکھا جا رہا تھا جب صلیبی حملے اپنے عروج پر تھے۔ اس سے انحراف کی شدت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔۔۔

مسلمان ایک طویل نیند کا شکار ہو گئے اور تقدیر سے حجت پکڑتے رہے۔ انھیں کوئی چیز نہ جگا سکی حتی کہ **مغربی تہذیب** آداخل ہوئی۔ اس تہذیب نے اُن کی عقلوں کو کوٹنا شروع کر دیا اور اُن کے قلعوں کو مسمار کرتی رہی۔ اچانک حملے نے امت کا اپنے دین پر ایمان ہلا کر رکھ دیا۔ یہ وہ ایمان تھا جو ٹھنڈا اور بجھا ہوا تھا جس میں پہلے بھی کوئی حرکت نہ تھی۔ اس حیرانی و سرگردانی کے عالم کو دیکھ کر مستشرقین، عیسائی مبلغین اور اُن کے ہم نواؤں نے کہا: ''عالم اسلام میں جمود و پس ماندگی کا سبب ایمان ہے اور خاص طور پر عقیدہ تقدیر۔ غافلوں نے اس اندازے کی تصدیق کر دی جو دین کے شعائر کو فقط صوفیانہ سلسلوں کے مشائخ سے حاصل کرتے تھے یعنی درود و سلام اور ورد و ظیفے۔ وہ دین کے قواعد کو نہیں جانتے تھے، انھوں نے عوام کو یہی درس دیا کہ انسان اپنے لکھے ہوئے پر راضی ہو حالانکہ یہ تقدیر کا غلط مفہوم تھا۔ انھوں نے ''زہد'' کا مفہوم غلط لیا اور فقیری و ذلت قبول کرنے کو ایمان بالقدر کے پردوں میں چھپایا، جاہل پست ماحول نے اس کو مزید تقویت دی۔ اسلامی تہذیب پست ہو گئی اور کملا کر رہ گئی۔ حتی کہ مغرب کے پیش قدم تہذیبی و عسکری حملے کے ہاتھوں آخری سانسوں میں مبتلا ہو گئی۔

اس پسپائی کی وجہ مسلمانوں کے یہ غلط تصورات تھے کہ نیکی ہمیشہ فقیری کے ساتھ ہوتی ہے اور فساد ہمیشہ دولت کا ساتھی ہوتا ہے۔ یہی بات بیداری کے بعد دوسری شکل اختیار کر گئی۔ اب یہ کہا جانے لگا کہ کفر اور دنیا ایک دوسرے کے ساتھی ہیں اور دین و پس ماندگی ایک دوسرے کے ساتھی ہیں یعنی دنیا کی ترقی ہمیشہ کافروں کو ملتی ہے اور دین دار ہمیشہ پس ماندہ ہی رہتے ہیں۔

عام لوگوں کا یورپ اور عالم اسلام کے حالات کے متعلق یہی خیال تھا۔ یورپ کافر ہے لہٰذا اُس کے ہاتھ میں دنیا کی کنجیاں ہیں اور ہم مسلمان ہیں، (اسلام کی غلط تشریح کے مطابق) اسی لیے ہم پس ماندہ ہیں۔

فی الحال ہمارا موضوع ان افکار کا مناقشہ نہیں۔ ہم بہت اختصار کے ساتھ حالات کا تجزیہ کر کے آخری

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نتیجے تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ آخری نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی تصورات کا انحراف ہی وہ مقام ہے جس سے سیکولرزم مسلمانوں میں داخل ہوا اور تصورات کی جنگ، فکری جنگ کے مظاہر میں سے ایک ہے۔ سیکولرزم کے نزدیک دین کا زندگی اور اُس کے عملی رویوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو فقط بندے اور اُس کے رب کے مابین قلبی تعلق کا معاملہ ہے جس سے اُخروی زندگی کے اندر کامیابی اور نجات حاصل ہوتی ہے۔

یہ بات درست ہے کہ سیکولرزم ایک اجنبی فکر ہے جو استعمار کے ساتھ ہم تک پہنچی ہے۔ اور اُس کو مکمل کیل کانٹوں کے ساتھ مسلمانوں پر لاگو کیا گیا۔ لیکن ایک چیز اور بھی ہے جو ہم کبھی ذکر نہ کرتے اگر ہم مصیبت زدہ نہ ہوتے۔ مالک بن نبی کے بقول ہم میں استعمار کو قبول کرنے کی اہلیت پیدا ہوئی تو ہم غلام بنے یا علامہ مودودی رحمہ اللہ کے بقول ہم ذاتی طور پر غلامی پر راضی ہونے کے لیے تیار ہو چکے تھے، چنانچہ ہم پر سیکولرزم مسلط ہوا۔ یعنی اصل چیز غلام بننے کی قابلیت ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھی۔ (۵۹۹)

امت مسلمہ صلیبی جنگوں سے دوچار ہوئی پھر تاتاریوں کا خوف ناک حملہ ہوا اور مسلمان کئی سال تک شکست خوردہ رہے۔ لیکن اُن کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ غالب فاتح قوم کے سامنے سر جھکا لیں یا اُن کے نظاموں، رسومات اور اُصول وقواعد سے کوئی استفادہ کریں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے ہم کچھ مثالیں دیتے ہیں کہ مسلمان بذات خود مغربی تہذیب پر فریفتہ ہو گئے اور عالم اسلام میں سیکولرزم کے لیے بنیادی ستون ثابت ہوئے۔

مسلمانوں نے بذات خود سیکولر افکار کو کیسے قبول کیا (چند مثالیں)

فرانسیسی انقلاب پر گفتگو گزر چکی ہے کہ وہ کیسا لادین اور تلمودی اثر رکھنے والا انقلاب تھا۔ اسی طرح ہم نے طبعی مکتب فکر فزیوکریسی پر بھی سیاست واقتصاد کے باب میں گفتگو کی ہے اور دین وجدید علم کی کشمکش کو طبعی فلاسفہ کی آرا کی روشنی میں پیش کیا ہے۔

اب ہم ایک مسلمان شیخ کے کلام کے چند اقتباسات دیکھتے ہیں جو فرانس میں تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ ہمیں کیسے نصیحت کر رہا ہے کہ ہم اُن باتوں کو قبول کر لیں جن کی تفصیل گزر چکی ہے۔ گویا وہ روسو اور والٹیئر کی عبارتوں کا ترجمہ، تشریح کے ساتھ کر رہا ہے جن کی مثالیں ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

اُصول فقہ کے قواعد سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ تمام عقلی استنباط جن کو متمدن قوموں نے اخذ کیا ہے اور اپنے تمدن کی اساس بنایا، اُن اصولوں سے حاصل شدہ ہیں جن کو مسلمانوں نے اپنے معاملات کا مدار بنایا اور اُن پر فقہی فروعات کی بنیاد رکھی۔ جو چیز ہمارے ہاں **اصول فقہ** کہلاتی ہے، وہ اُن کے ہاں **حقوق طبعی** اور نوامیس فطرت کہلاتی ہیں۔ یہ حسن وقبح جاننے کے عقلی قواعد ہیں۔ اہل اسلام جس دینی محبت اور حمیت کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور اُس کے ذریعے دیگر قوموں سے ممتاز ہوتے ہیں، وہ اُس کو وطنی محبت کے نام سے پکارتے ہیں۔ مخلوقات کے انواع میں سے ہر نوع کے کچھ مخصوص اعمال ہوتے ہیں اور اُس نوع کا ہر فرد عمومی طبعی طور پر اُن کا پابند ہوتا ہے۔ ان قوانین کی خلاف ورزی سے عام وخاص نظام مختل ہو جاتا ہے۔ یہی وہ فطری قوانین ہیں جن کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الٰہی قدرتِ تامہ نے انسانوں اور دیگر انواع کے لیے مقرر کیا ہے۔ لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے ان اسباب کے مطابق چلے اور اِن کی حدوں سے تجاوز نہ کرے۔ اسی طرح اسباب سے ظاہر ہونے والے مسببات بھی منظم اور مقرر ہوتے ہیں۔ چنانچہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے اعمال انہی اسباب پر منطبق کرے اور ان کو مضبوطی سے تھامے وگرنہ خالق اسباب کی مخالفت سے الٰہی سزا میں گرفتار ہو جائے گا۔ ان طبعی قوانین کا اغلب حصہ احکام شرعیہ سے خارج نہیں۔ یہ فطری قوانین ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور دونوں کا وجود ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ رکھا۔ گویا کہ فطرت کا قالب انسان ہے جو فطرت کے مطابق بُنا گیا ہے اور اُس کے مطابق اس کی تصویر طبع ہوئی۔ فطری قوانین انسان کے لوح قلب پر الٰہی الہام کے ساتھ بغیر واسطے کے لکھے گئے۔ پھر اُس کے بعد انبیا کی شریعتیں واسطوں کے ساتھ آئیں اور کتابیں لے کر آئیں جن میں کسی طرح سے باطل کی ملاوٹ نہیں ہو سکتی۔ یہ فطری قوانین امتوں اور ملتوں کی شریعتوں سے مقدم ہیں۔ اور اُن پر زمانہ فترت میں اوّلین حکما اور قدیم ملکوں کے قوانین کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی طرح خالی زمانوں میں معاش کے طریقوں کی راہنمائی حاصل ہوئی اور اسی طرح قدیم مصر، عراق، فارس اور یونان کے ہاں قومی نظم ونسق ظاہر ہوا۔ یہ اللہ کا انسانی نوع پر احسان تھا کہ اُن کو حکما کے ذریعے اپنے معاش کی ہدایت دی جو شہری قوانین بناتے تھے خصوصاً حفظ مال، نفس اور نسل کے ضروری قوانین۔ (۶۰۰)

وہ ایک دوسری تالیف میں فرانسیسی دستور کی ثنا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس میں ایسے امور ہیں جن کے عادلانہ ہونے کا کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔۔۔ لاطینی زبان میں شرطہ کا معنی ورقہ ہے۔ پھر اس میں تسامح کیا گیا اور اس کو رجسٹر پر بولا گیا۔ جس میں منضبط احکام لکھے ہوئے ہوں۔ اس میں اگرچہ غالب احکام وہ ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے نہیں ہیں۔ لیکن آپ اندازہ لگائیں کہ اُن کی عقلوں نے کیسا عمدہ فیصلہ کیا کہ عدل وانصاف کو اپنے ممالک کی تعمیر وترقی اور بندوں کی راحت کا سبب بنا دیا۔ اِس وجہ سے اُن کے شہر آباد ہیں، اُن کے علوم ومعارف زیادہ ہیں، بڑی بڑی عمارتیں ہیں، اُن کے دل آرام میں ہیں۔ آپ کسی کو نہیں سنیں گے جو ظلم کی شکایت کرتا ہو۔ اس سے پتہ چلا کہ عدل ہی آبادکاری کی اصل بنیاد ہے۔ (۶۰۱)

ایک اور ہم عصر شیخ کہتا ہے کہ (غافل لوگوں کو ڈرانا واجب ہے کہ وہ غیروں کی اُن پسندیدہ باتوں سے اجتناب چھوڑ دیں جو ہماری شریعت کے موافق ہیں۔ مسلمانوں کی عقلوں میں یہ بات نقش ہو گئی ہے کہ غیر مسلم جس طریقے اور ترتیب پر ہیں اُس کو چھوڑنا بہتر ہے۔ اس قسم کی باتوں کو ردّ کرنا واجب ہے)

یہاں وہ اپنی باتوں سے یہ مراد لے رہا ہے کہ نظام حکومت میں مغربی طریقوں سے استفادہ کرنا چاہیے جیسے مدوّن دستور بنانا۔ ارکان اسمبلی وغیرہ۔ وہ یورپی ممالک کے بارے میں کہتا ہے: ''وہ اپنے بہترین اداروں کے سبب علمی وصنعتی ترقی کی انتہا کو پہنچے جو سیاسی عدل پر قائم ہیں اور جنھوں نے انقلاب کے عمل کو آسان کر دیا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اِن سب باتوں کا خلاصہ امن وعدل ہے جو اُن کے شہروں کا خاصہ بن چکا ہے۔ اللہ کی سنت بھی یہی ہے کہ عدل، حسن ترتیب اور دولت کی تدبیر، انسانی جان و مال کے اسباب سے ہے۔''

وہ مزید استشہاد پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: ''میں نے یورپ کے بعض افراد سے سنا ہے کہ یورپی تمدن، زمین میں وسائل کو پھیلا دیتا ہے۔ جو چیز اُس کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے، اُس کو مسلسل آندھی کی قوت جڑ سے اکھاڑ دیتی ہے۔ یورپ کے پڑوس میں بسنے والے بادشاہ اسی یلغار سے ڈرتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے قومی نظم ونسق میں یورپ کی پیروی کی اور غرق ہونے سے بچ گئے۔ (۶۰۲)

جمال الدین افغانی صراحت سے کہتا ہے: عوام قوت اور حکومت کا منبع ہے۔ قوم کا ارادہ ہی ایسا قانون ہے جو قوم کے لیے قابل اتباع ہے۔ حاکم پر بھی واجب ہے کہ وہ ایسے قانون کا خادم اور امین ہو۔ (۶۰۳)

متاخرین میں سے ایک، عبداللہ الندیم کہتا ہے: اگر کوئی شخص یہ کہے کہ شوری (ڈیموکریسی) مشرق میں کامیاب نہیں ہوسکتی یا مشرقی لوگ غیر عاقل ہوتے ہیں جیسا کہ انفرادی اقتدار کے حامی سمجھتے ہیں۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے: ''یہ بات غلط ہے کیونکہ مشرق اور مغرب تخلیق کے اعتبار سے ایک جیسے ہیں۔ مغربی لوگوں نے شوری (ڈیموکریسی) رائج کرنے کے لیے انقلاب برپا کیا۔ وہ غلطیوں کی اصلاح کرنے لگے اور بار بار غلطیاں ہوتی رہیں۔ وہ سچی نیت سے بحث ومباحثہ کرتے رہے حتی کہ ان کے اندر قوتیں تربیت پا گئیں اور مطلوبہ تصور عملی شکل میں ظاہر ہوگئے۔ (۶۰۴)

مسلمان مغرب سے کیسے متاثر ہوئے اور انھوں نے خارجی فکر کو کیسے قبول کیا۔ اس کی واضح ترین دلیل، ہم نے جمال الدین افغانی اور اُن کے شاگردوں کے کلام سے پیش کیا۔ شاید یہ تاریخ اسلام میں پہلی کوشش ہے جو اسلام اور انسانی وضعی مذاہب (نظام) کے باہمی ملاپ کے لیے کی گئی۔ چنانچہ وہ اشتراکیت کے بارے میں کہتا ہے: ''اِسی طرح سے اشتراکیت کا دعویٰ ہے۔۔۔ اگرچہ اس کے حامی آج کل کم ہیں، لیکن ایک دن یہ علم غالب ہو گا، جب علم صحیح عام ہو جائے گا اور انسان پہچان لے گا کہ وہ اور اُس کا بھائی ایک ہی مٹی اور ایک ہی جان سے ہیں۔ اور زیادہ فضیلت اُس کو حاصل ہوتی ہے جو معاشرہ کے لیے زیادہ کوشش کر کے مفید ہو''

وہ کہتا ہے: ''اشتراکیت دین اسلام کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ اہل اسلام کے اخلاق میں اس وقت سے شامل ہے جب وہ اہل دیہات اور اہل جاہلیت ہوتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد سب سے پہلے جن لوگوں نے اشتراکیت پر عمل کیا وہ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکابر خلفا تھے۔ اشتراکیت پر عمل کرنے کے لیے سب سے زیادہ ترغیب دینے والے بھی اکابر صحابہ تھے''۔ (۶۰۵)

افغانی کے شاگرد شیخ محمد عبدہ عوامی ڈیموکریٹک نظاموں کو اچھا قرار دیتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ اسلامی شوری کا ایک جدید ذریعہ ہے۔ وہ کہتے تھے: ''بیعت کی صحت شوری پر موقوف نہیں، لیکن وہ کبھی شوری کی محتاج ضرور ہوتی ہے تاکہ لوگوں کا اتحاد قائم ہو سکے اور امت راضی ہو۔ لیکن جب یہ اہل حل وعقد کے مشورے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بغیر ممکن ہو جیسے انتخابات کا معروف ڈیموکریٹک طریقہ یا اُس سے ملتا جلتا، تو مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔(۲۰۶)

ہم ان اقوال کو فقط ایک ہی غرض سے بیان کر رہے ہیں کہ امت اسلامیہ مغرب اور اُس کے نظاموں سے کس خوف ناک حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ وہ ذاتی طور پر اُس کو قبول کرنے کے لیے تیار تھی۔ دیگر شواہد بھی بتلاتے ہیں کہ اِس معاملے میں شعور و اختیار کا عمل دخل نہ تھا۔ جب قوم کے اکابر لادین نظاموں کو اپنی امت میں جائز قرار دینے لگے، اسلامی نفسیات بھی اُس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو گئی، اعتراضات دور کیے جانے لگے تو یہ ایک قابل بحث معاملہ بن گیا۔ اُن کے بعد ایسے مفاد پرست لوگ بھی آئے جن کو اسلام کے خلاف ریشہ دواں قوتوں نے خوب استعمال کیا۔ اُن کا وجود امت کے معنوی و مادی ڈھانچے کو توڑنے کے لیے کدال کے طور پر استعمال ہوا۔ ان کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہم اگلے باب میں کریں گے، ان شاء اللہ، اصل بات یہ ہے کہ امت مسلمہ شروع سے آخر تک اپنی فکری و نفسیاتی جنگ جیتنے کی خود ذمہ دار تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۵

یہودی صلیبی ریشہ دوانیاں

(عالم اسلام میں سیکولرزم کا دوسرا سبب: خارجی یلغار)

دشمنوں کی تاریخ میں ایسی مستقل اور خوف ناک دشمنی نظر نہیں آتی جو یہود و نصاریٰ اور امت مسلمہ کے مابین واقع ہوئی۔

یہ گہری دشمنی فقط مذہبی اختلاف یا سیاسی جھگڑا نہیں اور نہ ہی فقط اقتصادی تصادم۔ اس کے کئی پہلو ہیں، مختصر یہ کہ اس کو ختم کرنا اور جڑ سے اکھاڑنا ممکن نہیں۔

اہل اسلام اور یہود و نصاریٰ کی باہمی دشمنی کی وجہ میں جو بات **مستشرق گب** نے کہی ہے، وہ کچھ درست معلوم نہیں ہوتی۔ گب کہتا ہے: یہ واقعہ محمد ﷺ کی زندگی میں بہت پہلے پیش آیا کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کی تلواریں باہم ٹکرائیں اور وہ آج تک ٹکرا رہی ہیں اور اسی لیے مسیحی یورپی دنیا، اسلام کی پکی دشمن ہے (۶۰۷)۔ اصل میں یہ جنگیں نتیجہ ہیں، سبب نہیں۔ جنگوں کے پس پردہ بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ تاریخ میں کتنی ہی جنگیں ایسی گزری ہیں جن کے بعد دوستی اور تعلق قائم ہو گیا۔ اصل میں قضیہ ہماری توقع سے زیادہ گہرا ہے۔

اصل میں یہ قضیہ حق و باطل، نور و ظلمت اور یقین و خرافات کا ہے۔ اسی وجہ سے معاملہ بہت سخت ہے اور ان قوموں کا باہمی ملاپ ممکن نظر نہیں آتا۔

اس ادراک کے بعد **صلیبی جنگوں** کے کردار کو سمجھنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ جنگیں ایسی دشمنی پر مشتمل نہ تھیں جس کی کوئی علت نہ ہو۔ اسلامی ممالک اور یورپ کا باہمی تعلق، خاص طور پر اس وجہ سے کہ وہ سیکولرزم کا اوّلین گہوارہ رہا ہے، کو صلیبی جنگوں کو جانے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔

ان جنگوں نے پائیدار دشمنی پر ایک نئے مستقل سبب کا اضافہ کر دیا، اہل اسلام اور نصاریٰ میں مغایرت مکمل ہو گئی۔ اس کے آثار و نتائج دیگر جنگوں سے مختلف ہو گئے جو ختم ہونے میں نہیں آ رہے۔

اس کا ایک نفسیاتی سبب بھی ہے جو یورپ کے وجود اور اس کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی تشکیل کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ **صلیبی جنگیں** یورپ کی عہد طفولیت میں واقع ہوئیں جن کے تربیتی اثرات ہمیشہ قائم رہے اور مختلف شکل و صورت اختیار کرتے رہے۔ قوموں کا معاملہ بھی افراد کی طرح ہوتا ہے۔ جب ہم یہ مان لیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ طفولیت کے ابتدائی دور میں پیش آنے والے سخت واقعات، آنے والی زندگی پر ہمیشہ ظاہری و باطنی طور پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اثرات اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ بعد والی زندگی میں عقلی تجربات بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان اثرات کا مٹانا مشکل بھی ہوتا ہے اور نادر بھی۔

یہی حالت **صلیبی جنگوں** کی ہے اس نے یورپی نفسیات میں انتہائی گہرا اور پائیدار اثر ڈالا۔ ان جنگوں نے اپنے زمانے میں جس عام جاہلی حمیت کو بھڑکایا، اس کا مقابلہ یورپ کی سابقہ تاریخ سے کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بعد کے کسی دور سے۔ پورا براعظم تھوڑی مدت میں مختصر بچپنے کو ملیامیٹ کرتا ہے اور نوجوانی میں داخل ہوتا ہے۔ اُس وقت ایسا اتفاق ہوا کہ یورپ نے تاریخ میں پہلی مرتبہ تنہائی محسوس کی اور وہ بھی عالم اسلام کے مقابلے میں۔ ہم مبالغہ آرائی کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ یورپ صلیبی جنگوں کی روح سے پیدا ہوا۔۔۔ مغربی تمدنی فکر کے نزدیک، تمام یورپی اقوام کا مشترکہ ہدف یہ ہے کہ اسلام سے دشمنی اختیار کی جائے اور یہی جدید یورپ کا واضح ترین نشان ہے۔ (۶۰۸)

یورپ اور اسلام کے مابین دشمنی کی یہ گہری اور مکمل تحلیل، تمام سوالات حل کرتی ہے اور تمام شبہات کو زائل کرتی ہے۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ یورپ کی جنگ غیر دینی جذبات کے تحت تھی یا صلیبی جنگیں بذات خود اقتصادی جنگیں تھیں، بے کار کی باتیں کرتے ہیں۔

صلیبی جنگوں کے فوراً بعد **اندلس** سے اسلامی وجود کا صفایا اس طرح رونما ہوا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ پھر **قسطنطنیہ** کا مسلمانوں کے ہاتھوں سقوط ایک ایسا خوف ناک حادثہ تھا جس نے اندلس کی کامیابی کو یورپ کے لیے بھلا کر رکھ دیا۔ اس کے بعد صلیبی جنگوں کے دستے **جغرافیائی دریافتوں** کے جھنڈوں کے پس پردہ ظاہر ہوئے پھر صلیبی روح **نپولین** کے حملوں میں چھپی ہوئی رونما ہوئی۔ یہ جدید یورپ کی طرف سے اسلام کو جڑ سے اکھاڑنے اور اُس کے فرزندوں میں لادینیت کا بیج بونے کی پہلی بڑی کوشش تھی۔ حق یہ ہے کہ جنرل لنبی نے واضح طور پر کہا تھا، جب وہ پہلی جنگ عظیم میں **جبل زیتون** پر کھڑا تھا:

((الآن انتهت الحروب الصليبية۔ اب صلیبی جنگیں ختم ہوئی ہیں))

تاریخی صورت حال واضح طور پر بتلاتی ہے کہ یہ جنگ کبھی ختم نہ ہوگی۔ بعض مظاہر کے اختلاف سے نادانوں کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ جنگ ختم ہوگئی۔

دیکھیے **جان پول** رواس بات کو کتنی تاکید سے بیان کرتا ہے:

ہم کہہ سکتے ہیں آٹھ صلیبی حملے ہوئے۔ جن کی ابتدا ۱۰۹۶ء سے ہوئی اور انتہا ۱۲۷۰ء میں ہوئی۔ لیکن یہ تقسیم موجودہ صورت حال کے لحاظ سے درست نہیں۔ جب ہم مشرق کے طرف بھیجے گئے تمام حملوں کو شمار کریں، تو ہم اس کی صحیح تعداد شمار کر سکتے ہیں۔

(۔۔۔ لاکھوں یورپی مشرقی ساحلوں پر پہنچے ہیں اور ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ مشرقی عقائد کو تبدیل کریں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اُن پر لازم ہے کہ وہ مشرق کو ملیامیٹ کریں)!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہاں یہ ہدف مشرقی عقائد کو بدلنا ہے جو طبعی طور پر اسلام ہے۔ جب تک یہ ہدف مکمل نہ ہوگا تب تک ہر حملہ صلیبی حملہ ہوگا اور ہر دشمنی صلیبی دشمنی ہوگی۔

اس کی تاکید میں روکہتا ہے: عثمانی سلطنت کا خاتمہ ان مظاہر میں سے فقط ایک مظہر ہے جو یورپین نے اسلامی حکومتوں کے خلاف حملہ کی صورت میں رونما کر رکھا ہے۔ جزائر فلپائن سے افریقہ کے قلب تک سفید فام اپنے زیر اقتدار مسلمان فرد پر محنت کر رہا ہے اور اس پر وجود، معیشت، فکر، منصوبہ بندی اور تکنیک کے تمام مفاہیم لاگو کر رہا ہے۔

روکہتا ہے:

اسلام اور مسیحیت کے مابین جنگ تیرہ صدیوں تک جاری رہی۔ اور اس کے چار بڑے مرحلے ہیں اور چوتھا مرحلہ یہ ہے کہ ترکوں کو اُن کی مملوکہ زمینوں سے بھگا دیا جائے، ایشیا وسطی میں اسلام کی قوت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اسلام کے دیار کے بڑے حصے پر استعمار بذات خود قبضہ کرے یا اس کی سرپرستی کو لاگو کر دیا جائے (۶۰۹)

اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ انگریز نے **ہندوستان** کے اندر سب سے پہلا کام **شریعت اسلامی** کو لغو قرار دے کر کیا۔ اور **نپولین** نے **مصر** کے اندر پہلا کام یہی کیا کہ شریعت کو معطل کیا اور اس کی جگہ **فرانسیسی قانون** لاگو کیا۔ اور صلیبی یہودی منصوبہ کاروں کے ہم نواؤں نے ترکی کے اندر پہلا کام یہی کیا کہ شریعت اسلامی کو لغو کیا پھر لادین **ترکی ریاست** کا اعلان کیا۔!!

جب سے عالمی یہودیت نے مغربی دنیا پر اپنی سرگرمیوں کو مضبوط کیا ہے اور اُس کو اپنے چنگل میں پھنسایا ہے، دشمنی ایک ہی سمت اختیار کر چکی ہے جس کو صلیبی روح بھڑکاتی ہے اور یہودی سانپ مختلف رخ دیتا ہے۔ اب دونوں طرفوں کے مفادات باہمی یک جا ہو گئے ہیں۔ صلیبی مغرب اسلام کے سوا ہر کینہ اور دشمنی کو بھلانے پر تیار ہے۔ حالانکہ تلمودی منصوبہ بندیاں صلیبی عالم کو تسخیر کرنے پر تلی ہوئی ہیں، اُن کے قویٰ کو شل کر رہی ہیں اور اُس کے سر پر سوار ہیں۔ اب دونوں فریق اپنے سب سے بڑے دشمن اسلام کا خاتمہ کرنے کے درپے ہیں۔

اس کی وضاحت کے لیے ہم امریکی رئیس اول کے مشیر **جانسن** کی تقریر کو کافی سمجھتے ہیں جو ۱۹۶۴ء میں ہوئی اور یہ بات بھی معلوم ہے کہ امریکی صدور یہودی دباؤ کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ تقریر ہمارے اشارہ کردہ بات کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں سیکولرزم کے خاکے اور اس کے اثرات پر بھی عام روشنی ڈالتی ہے۔

تقریر میں کہا گیا:

(۔۔۔ہم پر لازم ہے کہ ہم اسرائیل اور عرب کے مابین اختلافات کو سمجھیں۔ یہ قوموں اور ملکوں کے مابین کے اختلاف نہیں بلکہ تہذیبوں کے مابین کے اختلاف ہیں)

(اسلام اور مسیحیت کے مابین مکالمہ (کشمکش) کسی نہ کسی صورت میں قرونِ وسطی سے مستقل برپا چلا آرہا ہے! ڈیڑھ صدی سے اسلام مغربی تسلط کے آگے سرنگوں ہو گیا ہے۔ یعنی اسلامی تہذیب مغربی تہذیب کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آگے جھک گئی ہے۔ اسلامی ورثہ مسیحی ورثے کے لیے سرنگوں ہو گیا ہے! اس غلبہ نے اسلامی معاشروں پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں، حتی کہ اب سیاسی شکل کا غلبہ ختم ہو گیا ہے، پھر بھی عرب علاقے کئی خطرناک مشکلات اور ہول ناک پیچیدگیوں کا سامنا کر رہے ہیں اور یہ سیاست، معاشرت، اقتصاد اور علوم کے میدان میں ہیں، عرب نہیں جانتے کہ وہ اپنے داخلی و خارجی تعلقات میں اِن سے کیسے نپٹ پائیں)

یہ بات درست ہے کہ مغرب کا سیاسی غلبہ ختم ہو چکا ہے لیکن مغرب کے تہذیبی غلبے سے آزادی نصیب نہیں ہوئی۔ عربی پٹرول کی دولت مغربی عقلوں، مغربی اسالیب اور مغربی آلات سے بنتی اور چلتی ہے۔ عربی لشکر اور فوج جو اس کے قومی غرور کا سرمایہ ہے مغربی اسلحہ استعمال کرتی ہے، مغربی کپڑا استعمال کرتی ہے بلکہ مغربی موسیقی کے نغموں پر چلتی ہے۔ حتی کہ عربوں کا انقلاب بھی مغربی مفاہیم، اقدار اور مبادیات سے حاصل شدہ ہے جو وہ مغرب سے سیکھتے ہیں۔ حتی کہ عرب کا اپنی تاریخ، تہذیب اور ورثے کی معرفت کا ذریعہ بھی مغرب کے پڑھے لکھے لوگ ہیں)

مشرق میں **مغربی تہذیب** کا غلبہ حالانکہ وہ اسلامی تہذیب کا قدیم دشمن ہے، نے عربی مسلمان کو ذلت، حقارت اور شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ وہ ایک ہی وقت میں اِس تہذیب سے نفرت بھی کرتا ہے اور احترام بھی کرتا ہے۔

بعض مشرقی ممالک جیسے ترکی اور ایران اپنے قومی مفادات کی بنیاد پر مغربی ممالک سے بہتر تعلقات کی کوشش کرتے ہیں لیکن مغربی سیاست ابھی تک **اسلامی امپیریلزم** کے خطرے کو اپنے دل سے بھلا نہیں سکی جس کے مطابق دنیا کی فقط دو ہی متعارض اور متناقض قسمیں تھیں، جو ایک دوسرے کی دشمن تھیں یعنی دار الاسلام جو کہ اسلامی امپیریلزم تھا اور دار الحرب یعنی اس امپیریلزم کے دشمن جو اِس حدیث کی بنیاد پر ایک تھے۔ یعنی الکفر ملة واحدة۔ کفر ایک ہی ملت ہے۔ (۶۱۰)

یہاں یہ اشارہ کرنا مناسب ہے کہ یہودیت اور صلیبیت کے مابین مشترکہ عمل کا خاکہ ایک ہی ہے جس پر دونوں عمل کر رہے ہیں۔ جب سے **سلطان عبدالحمید** رحمہ اللہ نے **ہرتزل** کے مقابلے میں سخت موقف اختیار کیا تو یہود و نصاریٰ کے مفاد میں ضروری قرار پایا کہ اسلامی خلافت کو ختم کیا جائے۔ نصاریٰ یہ اس لیے چاہتے ہیں کیونکہ وہ **صلیبی جنگوں** کے بدلے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے جبکہ یہود کو یقین تھا کہ سلطان یہود سے کنارہ کش ہونے کے بعد اپنی مکمل توجہ صلیبی دنیا پر مرتکز کرے گا اور اس طرح بھی صلیبی دنیا کی تسخیر تلمودی خواہشات کے مطابق ہی ہوگی۔ اور یہ مشترکہ منصوبہ اُس وقت مکمل اتفاق اور اتحاد کو پہنچا جب **مجلس مسکونی** نے یہ قرارداد منظور کی کہ یہود عیسی علیہ السلام کے خون سے بری ہیں۔ اس قرارداد کی وجہ سے مسیحی یہودی باہمی دشمنی کا ہر نشان مٹ گیا۔ نتیجہ میں اسلام کے خلاف یہودی و نصرانی کا اکٹھ قائم ہو گیا (۶۱۰)۔ دشمنی تو نہیں بدلی لیکن دشمنی کا طریق کار ضرور تبدیل ہوا۔

صلیبی جنگوں میں شامل اکثر لوگ اوباش اور عوام لوگ تھے اور اُن کا طریق کار خالص عسکری تھا جس کے ذریعے وہ اسلامی وجود کو تباہ و برباد کرنا چاہتے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن جدید استعماری صلیبی جنگوں کا طریق وہدف اسلام کا خاتمہ ہے۔ اور اِس کے لیے ذریعہ براہ راست مسلمانوں کی اراضی پر قبضہ ہے۔ **مستشرق کیمون** جو صلیبی جنگوں کی عقلیت کے ساتھ سوچتا ہے، مغربی دنیا کے لیے اسلام کو ملیامیٹ کرنے کا طریقہ بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

''میرا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے پانچویں حصے کو مکمل نیست ونابود کر دیا جائے اور باقیوں پر بھاری مشقت کا کام لاگو کیا جائے۔ کعبے کو تباہ کیا جائے اور محمد ﷺ کی قبر اور ان کے جثّے کو لوفر کے عجائب گھر میں رکھا جائے۔(۶۱۱)

عیسائی مبلغ **بالکراف** کہتا ہے: جب قرآن اور مکہ، عرب کے دیگر شہروں سے چھپ جائیں گے پھر ہمارے لیے ممکن ہوگا کہ ہم عربوں کو اُس تہذیب سے منسلک ہوتا دیکھیں جس کو صرف محمد (ﷺ) اور اُس کی کتاب نے ان سے دور کر رکھا ہے۔(۶۱۲)

شاید یہی بربری سوچ تھی جس کی وجہ سے اندلس میں اسلامی وجود کا خاتمہ ہو گیا اور یہی سوچ مشرق میں بھی اپنا تکرار چاہتی ہے۔

لیکن اُن کے ہاں ایک عقل مند سوچ بھی موجود تھی جس نے پے در پے عسکری شکستوں سے نصیحت پکڑی۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی غیر معمولی طاقت اور اچانک اٹھ کھڑے ہونے کا راز یہ جانا کہ ''اسلام'' بذات خود ایک طاقت ہے اور اُس کے سوا کوئی طاقت نہیں۔

چنانچہ انھوں نے اس کے مطابق اپنا خبیث لائحہ عمل تشکیل دیا۔ یہ ایسا لائحہ عمل تھا جس کے مطابق مسلمانوں اور اُن کی اراضی کو مٹانے کے بجائے اسلام کو ہی مٹا جائے۔ اسلام کو اُس کے فرزندوں کے دلوں سے اکھاڑا جائے، اسلام کو عملی زندگی کے دائرے سے الگ کر دیا جائے اور اسلام کا معنی ومفہوم سکیڑ دیا جائے۔

جب کشمکش مسلمانوں کی جنگ سے نکل کر عقیدہ کی جنگ میں تبدیل ہوئی تو معرکہ کے اطراف و پہلو تبدیل ہو کر رہ گئے۔ اب اصل میدان جنگ زمین نہیں رہا بلکہ دماغ قرار پائے۔ اب اِس کا واحد وسیلہ تلوار ہی نہ رہی بلکہ ''فکر'' اصل وسیلہ قرار پائی۔ اب اِس کے لشکر، فوجی بحری بیڑے اور جنگجو گروہ نہ تھے بلکہ ادارے اور منضبط طریق کار قرار پائے۔

انھوں نے اس جنگ میں سب سے بڑی احتیاط یہ کی کہ اسلام کے تذکرے کو جان بوجھ کر سختی سے چھپایا اور مسلمانوں سے دشمنی کی تصریح نہیں کی۔ اب جنگ کے مختلف نام اور نعرے استعمال کیے گئے مثلاً مشرق اور مغرب کی جنگ، دائیں بازو اور بائیں بازو کی جنگ، قومی مفادات کا تصادم وغیرہ۔ یہ مختلف نام اِس لیے رکھے گئے تاکہ دینی جنگ کے نام سے قطعی پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ یہ نام جہادی حمیت کو بھڑکانے کا سبب بن سکتا تھا، اور جہادی حمیت بھڑکتے ہی سارا منصوبہ ناکامی کا شکار ہو جاتا اور نئے سرے سے **حطین** کا واقعہ وقوع پذیر ہو جاتا۔

سب سے پہلے جس شخص نے صلیبی دنیا کو اس منصوبے کی طرف متوجہ کیا وہ **قدیس لوئس**، فرانس کا بادشاہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔ وہ دوسری صلیبی جنگ کے حملے کا قائد بھی تھا، شکست کھا کر منصورہ میں قیدی رہا۔ پھر اُس نے فدیہ دیا اور اپنے علاقوں کی طرف لوٹا تا کہ اپنی ملت کے فرزندوں کو قیمتی نصیحت کر سکے۔ مغرب کا ایک اہم مورخ جانفیل جولوئس نہم کا ساتھی بھی رہا، کہتا ہے: منصورہ کی قید کے دوران خلوت کے لمحات نے اُس کو وافر موقع فراہم کیا کہ وہ اُس سیاسی لائحہ عمل کو تشکیل دے جو مغرب کو مسلمان عربوں کے مقابلے میں استعمال کرنا چاہیے۔

لوئس نے غور وفکر اور اندازے کے بعد کیا رائے اختیار کی؟

اس کی سیاست کے جدید رجحانات اور بنیادی قواعد ذیل میں ہیں:

اول: عسکری صلیبی حملوں کو پرامن صلیبی حملوں میں تبدیل کیا جائے لیکن ہدف وغرض وہی سابقہ برقرار رہے گی۔ دونوں حملوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں کہ نئے صلیبی حملے میں مادی اسلحے کا استعمال نہ کیا جائے۔

دوم: مغربی مبلغین (مشنریز) کو اس پرامن معرکہ میں اسلام کی تعلیمات کے خلاف اکٹھا کیا جائے، اسلام کو پھیلنے سے روکا جائے، پھر معنوی اعتبار سے اُس کا کام تمام کرنے کی کوشش کی جائے۔ مغربی مبلغین اِن معرکوں میں مغرب کے لشکر ہوں گے۔

سوم: مغربی سیاست کی عملی تنفیذ میں مسیحی مشرق کو استعمال کیا جائے (یعنی مسلمانوں کے مابین آباد مشرقی مسیحی طبقہ)

چہارم: مشرقی عرب کے دل میں ایک بنیادی مقام کو وجود میں لانے پر محنت کی جائے جس کو مغرب اپنے لیے نقطہ ارتکاز، حربی قوتوں کا مرکز اور اپنی دینی وسیاسی دعوت کا گڑھ بنا سکے۔ وہیں سے اسلام کا محاصرہ اور حملہ ممکن ہو جب بھی موقع میسر آئے۔

لوئس نہم نے اس ارضی بنیاد کو وجود میں لانے کے لیے جگہ بھی متعین کی جو بحیرہ روم کے ساحل پر غزہ سے اسکندریہ تک اور فلسطین، اردن، بلاد مقدس اور لبنان پر مشتمل ہے۔ (۶۱۴)

اس نصیحت کو اُس کے پوتے **نپولین** نے خوب پلے سے باندھا۔ اُس نے مصر پر قبضہ کرتے ہی بیان جاری کیا جس کے شروع میں اس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور کہا:

''فرانسیسی، نبی (ﷺ) کے انصار ہیں جنھوں نے پوپ کو مغلوب کیا۔ مصریوں کو چاہیے کہ وہ ہماری تصدیق کریں جب ہم یہ کہیں کہ ہم سچے مسلمان ہیں۔

اگر تم میری آرا سے متفق نہیں تو کم از کم مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ میں تمھارے نزدیک اسلام کا دوست اور وکیل ہوں۔ مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ تم مجھے حقیقی مسلمان تسلیم کرو یا میرے وجود کا سرے سے انکار کردو۔ میرا اللہ کے بندوں کے بارے میں شعور نہیں بدلے گا۔ (۶۱۵)

بلکہ اُس نے جامع مسجد کبیر اپنے نام سے تعمیر کرائی۔ وہ عمامہ پہنتا تھا اور میلاد کی محفلوں میں حاضر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہوتا تھا۔۔۔الخ

اُس کے حقیقی اعمال جن کی خاطر وہ اپنے شہروں کو چھوڑ کر مصر آیا تھا، کسی پر مخفی نہ تھے۔ اِس سبق کو برطانیہ نے بھی خوب یاد رکھا جب اُس کا وزیر اعظم گلیڈ سٹون برطانیہ کی مجلس عموم میں کھڑا ہوا، وہ عالم اسلام میں برطانوی استعمار کا لائحہ عمل اِس طرح بیان کر رہا تھا:

(جب تک یہ قرآن مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے۔ یورپ مشرق پر کبھی بھی غلبہ حاصل نہ کر سکے گا۔ اور وہ خود بھی محفوظ نہ رہ سکے گا۔ (۶۱۶)

مکر وفریب کی اِس منطق کے تحت امت مسلمہ کو اُس کے دین سے خارج کرنے کے لیے منصوبہ بندیوں کا آغاز ہوا۔ اُس کے وجود کے بنیادی جوہر کو ختم کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ گب کے بقول مسلمانوں کو سیکولرزم میں داخل کرنے کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کے لشکروں کو تین بڑے دستوں میں تشکیل دیا جا سکتا ہے:

① براہ راست قبضہ کرنے والی قوتیں (استعمار)

② مستشرقین

③ مبشرین (عیسائی تبلیغی مشنریز)

اور ایک چوتھے دستہ کا اضافہ کرنا بھی ضروری ہے اور وہ عالم اسلام میں یہودی، نصرانی اور باطنی گروہ کا دستہ ہے۔

① براہ راست قبضہ کرنے والی قوتیں:

عسکری قبضہ کرنے والے لشکروں نے عالم اسلام پر پیش قدمی کی۔ اِس دفعہ اُن کی عقلیت وحشت و بربریت سے ہٹ کر تھی۔ اب یہ زیادہ خوف ناکی اور خباثت سے لبریز تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ اُن کی ذمہ داری اُن کے آبا کی ذمہ داری سے بڑی ہے۔ اور اِس ذمہ داری کی کامیابی نئے لائحہ عمل کی نازک تنفیذ پر منحصر ہے۔

مغرب نے اپنے لائحہ عمل کے اوّلین ثمرات اُس وقت چننا شروع کیے جب انھوں نے عثمانی سلطنت کے خلاف جنگ میں مسلمان افراد کی شرکت حاصل کر لی جو القدس کی فتح میں بھی ''جنرل لنبی'' کے ہم رکاب تھے۔

یہ تاریخ میں پہلی صلیبی جنگ تھی جس کے افراد میں اسلام سے منسوب نادان مسلمان بھی شامل تھے!

''سائیکس اور بیکو'' کے اتفاق کے تحت صلیبی فوجوں نے جدید عالم اسلام کا ایک مختصر حصہ چھوڑ کر باقی سارا تقسیم کر لیا۔ اب استعماری طاقتوں نے اپنی مقرر منصوبہ بندیوں کی تنفیذ شروع کر دی۔ اِن کامیاب کوششوں کا خلاصہ اس طرح ہے:

① **اسلامی جہادی تحریکوں کا خاتمہ:** جیسے سوڈان کی مہدی تحریک۔ (۶۱۷)۔ لیبیا میں عمر مختار کی تحریک اور مغرب اقصی میں عبدالقادر الجزائری اور عبدالکریم خطابی کی تحریک اور ہندوستان میں سید اسماعیل شہید کی تحریک۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مصر میں امام شہید حسن البنا کو اُس وقت راہ عدم کا مسافر بنایا گیا جب وہ ان کی دعوت روکنے سے عاجز آ گئے۔ پھر اُن کی تحریک کو براہ راست یا بالواسطہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا۔

② **شرعی عدالتوں کا الغا اور وضعی قوانین کا اجرا:** قبضہ کرنے والی فوجوں کے قدم جس اسلامی سرزمین پر واقع ہوئے وہاں سب سے پہلے یہی کام کیا گیا کیونکہ وہ اس کے بالغ نتائج سے آگاہ تھے۔

سب سے پہلے جس علاقے میں اسلامی شریعت لغو کی گئی وہ ہندوستان تھا جیسا کہ استاذ مودودی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے۔ ۱۷۹۱ء تک یہاں شریعت ہی قانون عام تھی لیکن انگریز اُس کو معطل کرنے میں بتدریج آگے بڑھتا چلا گیا حتی کہ یہ پچھلی صدی میں مکمل معطل ہوگئی۔ الجزائر میں فرانسیسی قبضہ کے ساتھ ہی ۱۸۳۰ء میں شریعت کا الغا واقع ہوا۔ پھر مصر میں اسماعیل (فرانس کا کارندہ حکمران) نے فرانسیسی قانون کو داخل کیا اور ۱۸۸۳ء تک شریعت کا حصہ شخصی احوال سے زیادہ نہ تھا۔

پھر تیونس ہے جہاں فرانسیسیوں نے اپنا قانون ۱۹۰۶ء میں داخل کیا حتی کہ شخصی احوال میں بھی مداخلت کرنے لگے اور ۱۹۱۳ء میں مراکش میں وضعی شہری قانون کا آغاز کیا گیا جو تیونس کے قانون کے مماثل تھا۔ (۶۱۸)

عراق وشام کے علاقے چونکہ عثمانی عدالتوں کے ماتحت تھے اور مجلّہ احکام عدلیہ پر اعتماد کرتے تھے لہٰذا اُن میں شریعت کی بے دخلی تاخیر سے واقع ہوئی۔ یہاں شریعت اُس وقت لغو ہوئی جب خلافت کا خاتمہ ہوا اور انگریز وفرانس کے قدم اُن میں جم گئے۔

③ **اسلامی تعلیم اور اسلامی اوقاف کا خاتمہ:** استعمار نے جان لیا کہ مسلمانوں کو اُن کے دین سے دور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ان کو دین سے جاہل رکھا جائے۔

انھوں نے **کلیپر** (۶۱۹) کے حالات سے نصیحت پکڑی جو ایک ازہری طالب علم سلیمان حلبی کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔ انھیں ہند ومراکش میں علما وطلبہ کے ہاتھوں ہونے والی مزاحمت کا بھی تجربہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے دینی تعلیم کا دائرہ بتدریج تنگ کیا اور اُس کی جگہ پر لادین تعلیم کو بتدریج لائے اور اس کے لیے پُرفریب منصوبہ بندی کو وضع کیا۔ ان منصوبہ بندیوں میں سب سے زیادہ مشہور منصوبہ بندی مصر میں کرومر اور ڈنلوپ کی ہے۔ جس نے ازہر، اُس کے ذیلی مدارس اور قرآن پڑھنے کے اداروں کو ختم کرنے کے لیے ایک طویل لیکن باریک سیاست کو اپنایا۔ اُس نے تعلیمی منہج کے ذریعے اسلام اور اُس کی تاریخ کو خراب کرنے کے لیے خبیث طریق کار اختیار کیا۔ اُس کے منصوبے کی کامیابی، آج مصر اور دیگر عربی شہروں میں خوب نمایاں ہے۔ (۶۲۰)

عراق میں مسٹر کک نے اِس کے ہم مثل لائحہ عمل وضع کیا جس نے علما کو اوقاف کا معمولی ملازم بنا دیا۔ اس نے اوقاف کی اداراتی انتظامی تنظیم کے بہانے اُس دینی تعلیم کو ختم کر دیا جو اوقاف کے پیسے سے چل رہی تھی۔ بلکہ اُس نے قرآن حفظ کرانے والی جامع مساجد کو بھی تالے لگوا دیے۔ (۶۲۱)

مراکش کے علاقوں میں فرانسیسیوں نے جامع مساجد اور تربیتی مراکز کو گھوڑوں کے اصطبل اور اسلحہ کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

گوداموں میں تبدیل کر دیا اور اُن کے طالب علم بھگا دیے۔ جبکہ اسی دوران لادین تعلیم کو مکمل وسائل فراہم کیے گئے۔ (۶۲۲)

اور یہ عمل اپنے عروج کو اُن کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے ذریعے پہنچا جو استنبول، قاہرہ، بیروت، لاہور وغیرہ میں بنائے گئے۔ وہ اُس وقت سے آج تک خالص لادینیت پر مبنی ہیں۔

④ **غیر اسلامی گروہوں کا استعمال واحیا:** یہ طریق کار سب سے زیادہ گہرا اور خبیث تھا۔ استعمار جہاں بھی پہنچا اُس نے مردہ عقائد کو اکھاڑا اور غیر اسلامی گروہوں کو منظم کیا اور اُن کے لیے اہم مناصب کے راستوں کو ہموار کیا۔ وہ ان گروہوں کو مسلمانوں کے خلاف بغض و کینے پر ابھارتے۔ وہ یہ کہتے کہ قرونِ اولیٰ میں اسلامی فتوحات اِن گروہوں کے حق میں ایک استعمار تھیں اور مسلمان اُن کے مدمقابل متعصب تھے۔۔۔۔ الخ۔ شام کے علاقوں میں فرانس نے نصاریٰ کو تقویت دی اور اعلیٰ مناصب سپرد کیے۔ اُن کی جمعیتوں، عسکری وشہری اداروں کو منظم کیا، مثلاً شام یونیورسٹی کے قیام کے وقت اُس کا مدیر ایک عیسائی کو مقرر کیا جو قسطنطین زریق تھا۔

اسی طرح باطنی گروہوں نے مستشرقین کے واسطے سے اپنے عقائد وکتب کو پھیلانے کی کوشش کی۔ فرانسیسیوں نے نصیریہ کو علویہ کے نام سے موسوم کیا اور اُن کو اپنا خاص کارندہ بنایا۔ وہ اُن کو فوج میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے حتیٰ کہ وہ اعلیٰ قیادت تک پہنچ گئے اور آخر کار وہ مسلمان اکثریتی علاقوں میں حاکم بنائے گئے اور اپنے خاص عسکری گروہ منظم کرنے لگے۔

مصر میں عدم تعصب اور غیر جانبداری کے پردے میں تعصب کا قضیہ کھڑا کیا گیا۔ قبطی لوگوں کو مواقع فراہم کیے گئے کہ وہ بہ کثرت کلیسا اور عیسائی سکول قائم کریں اور انگریز کے زیر سایہ حکومت میں وزارتی مناصب حاصل کریں۔ یعقوب قبطی جیسے خائن کا کردار مشہور ہے جس نے بذات خود اپنی قوم کے ساتھ فرانسیسیوں کو ہر قسم کی مدد فراہم کی حتیٰ کہ انھوں نے اس کا نام جنرل یعقوب رکھ دیا۔ (۶۲۳)

افریقہ کے اکثر بڑے ملکوں میں استعمار اپنے پیچھے ایسی نصرانی حکومت چھوڑ کر نکلا جو ۹۹ فیصد تناسب رکھنے والے مسلمان عوام پر حکمران تھی۔

ہندوستان میں مسلمان استعمار کے جانے کے بعد، حاکم قوت سے ضعیف اقلیت میں تبدیل ہو گئے جن کو انگریز، ہندو، سکھ اور بودھ ہر جانب سے نوچتے تھے۔

یہ باطنی گروہ اُن گروہوں کے علاوہ ہیں جن کو استعمار نے اسلامی عقائد کو گرانے کے لیے خود تخلیق کیا جیسے بابیت، بہائیت، قادیانیت۔ اِن کی اپنے آقاؤں کے ساتھ وفاداری وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واضح ہوتی چلی گئی۔ (۶۲۴)

⑤ **مسلمان افراد کو مغرب زدہ ایجنٹ بنانا:** پادری زویمر نے عیسائی مبلغین کو نصیحت کی تھی:

''مسلمانوں کو کی جانے والی عیسائی تبلیغ اُن کے اپنے بندوں کے واسطے سے ہو جو اُن کی صفوں میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

موجود ہوں۔ کیونکہ ضروری ہے کہ درخت کو اس کی اپنی شاخ سے کاٹا جائے''۔(۶۲۵)

یہ نصیحت تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ استعمار نے کوشش کی کہ ضعیف الایمان عناصر سے ایسی منظم قوت پیدا کی جائے جو سیاسی پارٹیاں تشکیل دے یا مختلف فکری رجحانات کو استعمار کی دلچسپی کے مطابق پیش کرے۔

مسلمانوں کے اذہان کو انہی باتوں سے بھرا گیا جو اسلام کے دشمنوں نے پھیلائیں۔ اور ان کو یہ مستقل احساس ستانے لگا کہ وہ مغرب سے کم تر ہیں اور اُس کے تابع ہیں۔

استعمار نے مسلمانوں میں سے ایسے افراد چنے جن کے بارے میں اُس کا خوب اندازہ تھا کہ وہ اُن کے لیے سواریاں بن سکتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے لیے بھاری بھرکم امداد تیار کی گئی، اُن کے اردگرد غبار پھیلایا گیا، امت کو یہ خیال دلایا گیا کہ یہ امت کے نجات دہندہ ہیں اور انہی کے ہاتھوں میں امت کی بیداری اور عظمت رفتہ کی کنجی ہے۔ اِن کے لیے لوگوں کے سر جھک گئے۔ جب وہ اُن پر مکمل قابض ہو گئے تو اُن پر ذلت، بربادی اور فاسد عقیدے کی ایسی مار ماری جو اِن کے آقاؤں نے بھی کبھی نہ ماری تھی۔

کتاب الرجل الصنم (۶۲۶) جس کو ایک سابق ترکی عہدے دار نے لکھا ہے۔ اُن تیار کردہ افراد میں سے فقط ایک کی جھلک پیش کرتی ہے۔ اس طرز پر عالم عرب میں کئی افراد تیار کیے گئے۔

اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ قوتیں جو عالم اسلام پر استعمار کے کوچ کرنے کے بعد حاکم بنیں، وہ کوئی جہادی تحریکیں نہیں تھیں جنھوں نے استعمار سے مقابلہ کیا بلکہ یہ مختلف گروہ اور قوتیں تھیں جن کے اعمال و آثار گواہی دیتے ہیں کہ انھوں نے امت پر وہ ظلم ڈھائے جو کھلے دشمن بھی نہ ڈھا سکے۔ یہ واضح دلیل ہے کہ یہودی منصوبوں کی تنفیذ اُن کے سپرد تھی اگرچہ علاقے اور طریق کار مختلف تھے۔

⑥ مستشرقین اور عیسائی مبلغین کی تجاویز نافذ کرنا، اہم مقاصد کی سرپرستی اور رکاوٹوں کو دور کرنا۔

یہ استعمار کے وہ اہداف تھے جو بظاہر واضح نہ تھے یعنی عالم اسلام کو ذلیل و کمزور کرنا، اُس کے عوام اور وسائل کی لوٹ کھسوٹ۔

② مستشرقین:

مستشرقین جدید صلیبی حملوں کے دماغ ہوتے ہیں۔ وہ عالم اسلام کی ثقافتی جنگ میں شیاطین کا کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ کشمکش کے اکھاڑے میں اُس وقت ظاہر ہوئے جب مسلمان تہذیبی افلاس، روحانی کمزوری اور عزتِ نفس کے فقدان کا شکار تھے۔ اس طرح اِن راہب علما اور صلیبی لشکروں کو موقع میسر آ گیا کہ وہ ماضی کی شکستوں کا بدلہ لے سکیں اور اپنے دفن شدہ کینوں کا غبار نکال سکیں۔

مستشرقین کا وجود ایک ایسے دور میں ظاہر ہوا جس میں جدید علم کی عبادت کی جاتی تھی اور اُس کو وحی کی طرح مقدس سمجھا جاتا تھا۔ مستشرقین نے اپنے لیے بہتر سمجھا کہ اپنے کندھوں سے احبار و رُہبان کی محنت کشی والے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اوزار اتار دیں، اسی طرح میدان کا اسلحہ بھی ایک طرف رکھ دیں۔ وہ علم کا لباس زیب تن کر کے اور معرفت کے اوزار لے کر ظاہر ہوئے۔ انھوں نے کئی ہزار منصوبے اکھٹے کیے اور اسلام کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے کئی سو تعلیمی و تربیتی ادارے قائم کیے۔ وہ بحث و مباحثہ کے اعتکاف خانے میں بیٹھ گئے اور انتہائی خباثت کے ساتھ فکری کشمکش چھیڑنے لگے۔

اُن پر یہ بات مخفی نہ تھی کہ وسیع و عریض اسلامی وجود شل ہو چکا ہے لیکن اُس میں دوبارہ زندگی پیدا ہونے کا امکان ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امت کو اپنے عظیم ورثے کو یاد کرنے سے روکا جائے۔ چنانچہ ایک سخت نفسیاتی جنگ چھیڑی گئی تا کہ مسلمانوں کے ذہن میں چمٹے ہوئے اسلامی عقائد و مفاہیم کو مکمل طور پر ختم کیا جائے۔ اگر وہ مکمل ختم نہ ہوں تو کم از کم تشکیک و کمزوری کا شکار ضرور ہوں۔

ان کی علمی کوششوں کا خلاصہ اس طرح ہے:

① **حقیقت اسلام، قرآن اور نبوت میں طعن**: انھوں نے اسلام کے بارے میں یہ کہا کہ یہ یہودیت و نصرانیت کا محرف چربہ ہے۔ یہ مشرقی ادیان کے مجموعوں میں سے ایک جز ہے جو اُس وقت وجود میں آیا جب عرب بت پرستی کو فارس و ہند کے ادیان کا سامنا کرنا پڑا۔ قرآن، محمد (ﷺ) کا وضع کردہ ہے، یہ ایک نسطوری راہب کی املا ہے جس سے محمد (ﷺ) شام میں طویل مدت تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہ تورات و انجیل کے متروک نسخوں سے ایک استفادہ ہے جس میں ورقہ بن نوفل جیسے عرب عابدوں کا حصہ شامل ہے۔ اس میں امیہ بن صلت جیسے روحانی مفکرین کی شعری حکمت سے بھی اقتباس ہے، وغیرہ

انھوں نے یہ بھی کہا کہ قرآن محمد ﷺ کی وفات کے بعد بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس چمڑوں اور ہڈیوں کی شکل میں تقسیم شدہ تھا، کچھ حصہ نامکمل اور غیر مرتب شدہ سینوں میں محفوظ تھا۔ ستر سال بعد جب ہڈیاں اور چمڑے کمزور ہو گئے اور حفاظ فوت ہو گئے تو مسلمانوں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ قرآن کو جمع کیا جائے۔ چنانچہ وہ سب اکٹھے ہوئے اور ہر ایک نے اپنے ساز و سامان میں سے کچھ قرآن حاضر کیا۔ پھر وہ اس کی تنظیم و ترتیب میں لگ گئے، انھوں نے کئی مقامات پر اختلاف بھی کیا لیکن آخر کار حاکم کے اقتدار نے ایک معین نسخہ لاگو کر دیا اور باقی مخالف نسخوں کو بغیر کسی جواز کے جلا ڈالا۔ اس طرح ایک قابل اعتماد نسخہ ہاتھ آ گیا لیکن وہ موضوع اور سیاق کے اعتبار سے منتشر تھا اور اُس کی کوئی ترتیب نہ تھی۔ کئی سورتیں جن کو محمد (ﷺ) نے اپنے دعوے نبوت کی ابتدا میں وضع یا جمع کیا تھا وہ قرآن کے آخر میں رکھ دی گئیں اور آخر والی شروع میں۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ اسلام کا بایاں باز و یعنی شیعہ و روافض دوسرے نسخوں کو سنبھالے ہوئے ہیں جو متداول نسخے سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ قرآن کا ایک بڑا حصہ گم ہو گیا تھا کیونکہ اُس کو ایک بکری نے کھا لیا تھا۔ یہ قرآن کا وہ حصہ تھا جو محمد (ﷺ) کے بعد خلافت و سیاست سے تعلق رکھتا تھا!!

مستشرقین محمد (ﷺ) پر نزول وحی کی کیفیت کو مرگی کا دورہ قرار دیتے ہیں اور کلام وحی کو شعری عبقریت کا کوئی اعلیٰ درجہ یا ہسٹیریا سمجھتے ہیں۔ اُن کے خیال میں محمد (ﷺ) بحیرا راہب کے عقائد بیان کرتا تھا جو اُس کو عرب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحرا میں املا کرائے جاتے، وہ اُس کو لکھ لیتے اور دعویٰ کرتے کہ یہ اللہ کی وحی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی اپنی ذات کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ مجہول النسب تھے۔ اس لیے اُس کو ابن عبداللہ کہا جاتا تھا کیونکہ عرب اپنی عادت کے مطابق مجہول والد والے شخص کو ایسے ہی پکارتے تھے۔ اس کا اصل نام قثم تھا جب عرب اُس کو پوجنے لگے تو اس کا نام بطور تعظیم محمد رکھ دیا گیا اور وہ (نعوذ باللہ) آپ کو شہوت پرست اور شراب نوش قرار دیتے ہیں۔ بلکہ بعض کمیونسٹ مستشرقین اس انتہا تک پہنچ گئے کہ یہ فقط ایک خیالی شخصیت ہے۔

سنت پر طعن کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اپنی زندگی میں اپنے ہر کلام کو قرآن شمار کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ فوت ہو گئے اور مسلمانوں میں سیاسی جھگڑے کی ابتدا ہوئی تو متخاصم فریقین میں سے ہر ایک نے اپنی آرا کی تائید میں کلام کی ضرورت محسوس کی اور قرآن میں سے تائید نہ ملی تو ہر گروہ نے محمد ﷺ کی طرف کئی اقوال کو اپنے مفاد کی خاطر منسوب کر دیا۔ اِن اقوال کے مجموعوں سے علمائے اسلام نے تین صدیوں کے بعد کتابیں لکھیں۔ یعنی اُس وقت جب ہر چیز ضائع اور خلط ملط ہو چکی تھی۔ پھر اِن کتابوں کا نام حدیث وسنت رکھا گیا۔ انھوں نے مسلمانوں پر لازم کیا کہ وہ سنت پر ویسے ہی ایمان لائیں جیسے قرآن پر۔ طبعی طور پر بائیں بازو کے استثنا کے ساتھ سب مسلمانوں نے یہی عقیدہ رکھ لیا۔ انھوں نے اپنے پیروکاروں کو اہل سنت کے نام سے پکارا تاکہ بائیں بازو والوں سے امتیاز ہو سکے۔

پھر وہ سنت کا مفصل نقد بھی کرتے ہیں۔ وہ کبار حفاظ جیسے ابو ہریرہؓ، زہریؒ پر طعن کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض شخصیات جیسے عروہ بن زبیرؒ جو اپنی خالہ ام المومنین عائشہؓ سے روایت لرتے ہیں، خیالی شخصیت ہیں!! (۶۲۷)

② **مستشرقین کا یہ کہنا کہ اسلام کے ذاتی دنیوی اغراض تھے**: یہ دعویٰ کئی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ اسلام محض ایک اخلاقی دعوت ہے جو عرب معاشرے کو بعض بری عادات سے چھڑانے کے لیے آیا تھا۔ جیسے پتھروں کی پوجا، بچیوں کو زندہ درگور کرنا، لوٹ مار، چھین جھپٹ، شراب نوشی۔۔۔ وغیرہ

کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام ایک اقتصادی تحریک تھی جس کا مقصد قبائلی معاشرتی بنیادوں کو تبدیل کر کے عرب قوم کا تہذیب یافتہ معاشرہ تیار کرنا تھا۔

کبھی یہ کہا جاتا ہے، اور یہ خاص کمیونسٹ مستشرقین کہتے ہیں کہ اسلام ایک غیر پختہ قسم کا انقلاب تھا جو مکہ کے سردار طبقے کے خلاف تھا۔ محنت کش افراد جیسے محمد ﷺ، بلال، صہیب وغیرہ سرمایہ دار افراد جیسے ولید بن مغیرہ، امیہ بن خلف وغیرہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کے علاوہ کئی اقوال ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ اسلام ایک محدود معین زمانے میں ایک معین مظہر کے ساتھ ظاہر ہوا، یہ کوئی ابدی اور مستقل دین نہیں۔ اِس کو اِسی نظر سے دیکھنا اور پڑھنا چاہیے جیسے قدیم دور کا کوئی قصہ پڑھا جاتا ہے جس کا موجودہ صورت حال سے کوئی تعلق نہ ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ اسلام کو محض کچھ روحانی شعائر اور رسومات کا نام دینا یا مغربی محدود مفہوم کے مطابق ایک ایسا دین قرار دینا جس کا حکومت، اجتماعی زندگی اور اقتصادی سرگرمیوں وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں۔

مستشرقین کے نزدیک اسلامی خلافت کا معاملہ ایک بدعت ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ محمد (ﷺ) تو فقط ایک دین کی بنیاد رکھنے کے لیے آئے تھے۔ اُن کا ہدف کسی ریاست کا قیام نہ تھا۔ جب اسلام کے اوّلین لشکر نکلے تو اُن کا ہدف روم کے سرسبز آباد حلقوں پر قبضہ اور لوگوں کو جبراً مسلمان بنانا تھا لیکن جب عرب فاتحین نے روم کے ہاں سیاسی وادارتی نظم ونسق دیکھا تو انھوں نے اُس سے استفادہ کا فیصلہ کرلیا پھر عوام کو دھوکہ دینے کے لیے اس (خلافت) کو اپنے عقیدے میں داخل کردیا تاکہ مسلم خلفا کا اثر ورسوخ جاری رہے۔ اُس وقت سے یہ بدعت جاری ہے کہ اسلام بیک وقت دین بھی ہے اور ریاست بھی!!

④ مستشرقین کا یہ کہنا کہ اسلامی فقہ رومی قانون سے ماخوذ ہے:

یہ سابقہ دعویٰ جات سے مرکب دعویٰ ہے۔ اس کا مقصد ایک اعتبار سے توحید الوہیت کو ساقط کرنا اور دوسرے اعتبار سے وضعی قوانین کے گناہ کو معمولی قرار دینا ہے۔ جب قدیم فقہ یورپی اُصولوں سے حاصل شدہ ہے تو آج یورپی قوانین سے استفادہ میں کیا حرج ہوسکتا ہے جیسے فرانسیسی قانون یا سوئس قانون سے استفادہ وغیرہ

⑤ یہ دعویٰ کہ اسلامی شریعت، تہذیب وتمدن کے لیے مناسب نہیں:

یہ بات واضح ہے کہ یہ دعویٰ مسلمانوں کے احساس کم تری کو استعمال کرکے کیا جاتا ہے۔ مسلمان اُس وقت خود کو پس ماندہ محسوس کرنے لگے جب انھیں امت مسلمہ یورپی تہذیب کے مقابلے میں کم تر محسوس ہوئی۔

انھوں نے کہا کہ اسلام صحرائی قبائلی دین ہے، اس کے شعائر وطور طریقے، جدید متمدن زندگی کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ یہ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ انسان بلند وبالا عمارتوں اور ہوائی جہازوں کے دور میں زندگی گزارے اور اُس کی شریعت صحرا اور اونٹوں والی ہو۔ بلکہ اس قسم کی شریعت بذات خود پس ماندگی کا سبب اور مشرق کے لیے سب سے بڑی بیماری ہے۔ ترقی وتہذیب کی راہ یہی ہے کہ محمد ﷺ اور اس کی کتاب کو پھینک دیا جائے۔

⑥ عربی زبان، رسم الخط اور اسالیب سے علیحدگی کی دعوت:

یہ دعویٰ پچھلے دعویٰ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس کی دلیل بھی یہ دی جاتی ہے کہ عربی زبان جدید تہذیب کے موافق نہیں۔ اس دعوت کا مقصد امت کو مسخ کرنا اور بالآخر دین سے الگ تھلگ کرنا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عربی نحو غیر علمی ہے۔ عربی نحو ولغت اور اسالیب قرآن میں تضاد ہے۔ اس قسم کے بیانات کا مقصد دونوں کا وقار ختم کرنا ہے۔

یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ جاہلی اشعار اور صدر اسلام کے کئی اشعار غلط منسوب کردیے گئے۔ ان کے خیال میں لغت وتفسیر سے کئی شواہد اس کی تائید کرتے ہیں۔

⑦ آزادی نسواں کا قضیہ کھڑا کرنا:

اس دعوے پر وہ اس لیے ارتکاز کرتے ہیں کیونکہ اس کے متعدد نتائج کا انھیں خوب اندازہ ہے۔ مثلاً

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شریعت پر طعن کیونکہ وہی عورت کی تحقیر کا سبب ہے، اسلامی معاشرے میں بے راہ روی کو عام کرنا، خاندانی نظام کا خاتمہ تاکہ دین سے جہالت عام ہو اور فرزندانِ اسلام کی حسب خواہش تربیت کی جاسکے۔ وہ کہتے ہیں، اسلام عورت کو بذات خود حقیر سمجھتا ہے اور اس کی قیمت لحاتی لطف ومزے کے سوا کچھ نہیں لگاتا۔ وہ عورتوں کی قید اور خرید وفروخت کو جائز قرار دیتا ہے۔ وہ عورت پر واجب کرتا ہے کہ وہ جاہل مہمل بن کر زندگی گزارے کیونکہ وہ اُس پر پردہ لاگو کرتا ہے۔ وہ عورت کے حق میں خوش حالی اور آسانی کو بدترین عار سمجھتا ہے جبکہ مرد کو ہر قسم کے وسائل لذت کی اجازت دیتا ہے جیسے لونڈیوں کا استعمال وغیرہ

اس کے علاوہ کئی دعویٰ جات ہیں جو مسلمانوں کی خراب صورت حال کے باعث اس قابل بنے کہ مستشرقین اُن کو اپنے حق میں استعمال کرسکیں۔

⑧ اسلامی تہذیب کو حقیر قرار دینا اور اس کی تاریخ مسخ کرنا:

مستشرقین دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ، یونانی ورثے کو منتقل کرنا ہے۔ لیکن یہ کارنامہ فقط منتقل کرنے اور ضائع ہونے سے بچانے تک محدود ہے۔ مسلمانوں کے فنی شہ پارے بازنطینی فن سے اخذ کردہ ہیں وغیرہ۔ اسلامی تاریخ کو بگاڑنے میں انھوں نے ہر وہ وسیلہ استعمال کیا جو انھیں میسر آیا۔ حتی کہ انھوں نے اسلامی تاریخ کے سارے روشن پہلو سلب کر لیے اور اُس کو فقط سیاسی دائرے میں محصور کر دیا ہے تاکہ وہ فقط بغض وکینہ، سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک سلسلہ نظر آئے۔ انھوں نے ساری گفتگو مسلمان بادشاہوں کے حرم، لونڈیوں اور شعرا کے موضوع پر مرتکز کی، امن وجنگ کے اکابرین پر جمود اور تہذیب دشمنی کا الزام لگایا، قدیم ورثے میں موجود بعض بے کار فضول باتوں کو اکابرین کی سیرتیں مسخ کرنے کا ذریعہ بنایا۔ اس طرح انھوں نے بے کار فکری تراجم کی نشر واشاعت پر محنت کی اور تحقیق کرنے والوں کو اعلی مراتب عطا کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کا مفہوم، جدید تعلیم یافتہ افراد کے ہاں **'قومی مقامی ورثہ'** (Folklore) کے لفظ سے تجاوز نہیں کرتا۔

⑨ تخریبی تحریکوں اور گمراہ گروہوں کو کھڑا کرنا اور ان کے کردار کو بڑا کر کے پیش کرنا:

یہ عمل بھی اسلامی تاریخ بگاڑنے کا ایک جز ہے۔ انھوں نے اس کو بڑے اہتمام سے اختیار کیا کیونکہ اس سے انھیں بیک وقت کئی فوائد حاصل ہوتے تھے۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ مسلمانوں کی تاریخ میں دفن شدہ فکری جنگ کو نئے سرے سے کھڑا کریں جس کے لیے وہ اسلام سے منحرف فرقوں اور گروہوں کو منظم کرتے رہے جیسے **باطنیہ اور اُن کی متعدد شاخیں جیسے اسماعیلیہ، قرامطہ، بابکیہ، عبیدی جو فاطمی کے نام سے مشہور ہوئے، معروف انقلاب کے حاملین زنج، دروز، متصوفین اور دیگر فرقے۔** اسی طرح وہ گمراہ شخصیات پر بھی خاص توجہ دیتے رہے جیسے حلاج، عبداللہ بن سبا، عبداللہ بن میمون القداح، حاکم عبیدی وغیرہ۔ یہ اُن فرقوں کے علاوہ ہیں جو بذات خود ایک نئے ہدف کے لیے پیدا کیے گئے جیسے قادیانیت، بابیت اور ان کی شاخیں۔

مُحکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

⑩ **قدیم تہذیبوں کو اکھاڑنا اور ان کی معلومات زندہ کرنا۔**

مستشرقین کی ایک بڑی تعداد نے اس سلسلے میں مہارت حاصل کی ہے۔ وہ قدیم مٹی ہوئی زبانوں کے مطالعے پر جت گئے اور گزرے ہوئے لوگوں کے آثار ڈھونڈنے لگے۔ انھوں نے اسے عرب کی تہذیبی تاریخ کا نام دیا۔ پھر ان تہذیبوں کے آثار کو عصر حاضر تک پھیلا دیا چنانچہ فتح اسلامی بھی قدیم عرب تہذیبوں کے سلسلے کی ایک کڑی ٹھہری یا مختلف عوامل میں سے محض ایک عامل۔

مثال کے طور پر انھوں نے مصر میں فرعونیت کو زندہ کیا۔ سرسبز ہلال کو **فینیقی** اور **آشوری** تہذیب کے درمیان لا کھڑا کیا۔ یمن میں حمیریت کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ترکی کی خفیہ جماعتوں میں **طورانی** قومیت کو گھڑا۔ جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اس سے کئی خطرناک رجحانات پیدا ہوئے جیسے دور جاہلیت کو خوب صورت قرار دینا، گزرے ہوئے طواغیت کو عظیم قرار دینا، اتحاد کے بجائے علیحدگی کے نعرے پھیلانا، امت کا حقیقی ماضی سے رشتہ کاٹ دینا، یا کم از کم محدود کرنا تاکہ اسلام کے بغیر بھی ایک متمدن زندگی کا تصور ممکن ہو سکے جیسے قدیم تہذیبیں پہلے زندگی گزار چکی تھیں۔

⑪ **علمی تحقیق کا لادین منہج وضع کرنا۔**

اگر مستشرقین کی کوششوں کا ثمرہ اس کے سوا کچھ نہ ہوتا تو یہ اکیلا کافی تھا۔ عصر حاضر کا عالم اسلام اپنی یونیورسٹیوں میں اسلامی ورثہ کو اُس منہج کے مطابق پڑھاتا تھا جو موضوعیت اور علمی غیر جانبداری کے عین مطابق تھا۔ وہ ہمیشہ اسی منہج کے مطابق چلتے رہے۔ اس کی واضح ترین مثالیں مسلمان محققین کی کتابوں میں عام مل سکتی ہیں۔

مستشرقین کا منہج لادین تو ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ غیر علمی بھی ہے۔ اس کے عمومی بنیادی نکات یہ ہیں۔

① مستشرقین فکری نصوص کو اپنی خواہشات کے تابع کرتے ہیں اور نصوص کے رد میں تحکم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کبھی نص میں تحریف کرتے ہوئے سوءِ فہم میں واقع ہو جاتے ہیں اور کبھی جان بوجھ کر غلط معانی لیتے ہیں جب تحریف کی گنجائش نہیں ہوتی۔

② مستشرقین مصادر چننے میں بھی من مانی کرتے ہیں۔ وہ ادبی کتب سے مواد نقل کر کے حدیث نبوی کی تاریخ پر حکم لگاتے ہیں اور تاریخ کی کتابوں سے فقہ کی تاریخ پر حکم لگاتے ہیں۔ وہ اُس کو صحیح قرار دیتے ہیں جو دمیری کی کتاب الحیوان میں لکھا ہے اور اُس کو رد کر دیتے ہیں جو امام مالک رحمہ اللہ کی مؤطا میں موجود ہے۔ (۶۲۸)۔ وہ صحیح بخاری پر حملے کرتے ہیں اور کتاب الاغانی اور الف لیلہ کو عظیم مانتے ہیں۔

اس کے باوجود اس منہج کی وبا مسلمان بیٹوں میں اس حد تک سرایت کر گئی ہے کہ یقین نہیں آتا۔ مستشرقین کے متعلق کلام ختم کرنے سے پہلے یہ اشارہ ضروری ہے کہ اُن کی محنتیں لگے بندھے لائحہ عمل کے مطابق نہیں چلتیں۔ بلکہ اُن کی تحقیقات حالات کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہتی ہیں۔ وہ پچھلے مرحلے میں جن نتائج کو پیش کر چکے ہوتے ہیں، اگلی تحقیق میں اس سے انحراف کر کے دوسری رائے قائم کرتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نتائج جو بھی ہوں۔ انھوں نے اسلامی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی ذمہ داری خوب نبھائی۔ انھوں نے فکری زمین ہموار کی تاکہ اُس پر مشرق کی لادین زندگی قائم ہو سکے۔ جلد ہی اُس کے پھل کئی میدانوں میں آنا شروع ہو گئے۔

③ عیسائی دینی مبلّغین (Missionaries):

مستشرقین اور عیسائی مبلغین کے اہداف اور وسائل ملتے جلتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کا اصل میدان فکر و تعلیم تھا جبکہ عیسائی مبلغین اپنی کوششوں کو معاشرتی و تربیتی پہلوؤں پر مرکوز کرتے تھے۔

یہ بات عجیب نہیں کہ مسلمان تبشیر کی حقیقت اور محرکات سے جاہل ہیں کیونکہ بعض تبشیری طائفوں کے پیروکار خود بھی اس سے جاہل ہوتے تھے۔ سب کے سب لائحہ عمل کے مقاصد کا مکمل ادراک نہیں رکھتے۔ بلکہ صلیبی عقلیت جوان کو مختلف شہروں کی طرف روانہ کرتی تھی، بذات خود اس کا اشارہ نہیں کرتی۔

ایک موقع پر پادری زویمر رئیس موتمر القدس التبشیری اس کی وضاحت کرنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ ایک طویل تقریر میں کہتا ہے: اے بہادر بھائیو اور ساتھیو! اللہ نے تم کو مسیحیت کی راہ میں جہاد کے لیے چن لیا ہے۔ یہ شرف تمھیں حاصل ہے کہ تم مسیحیت کو اسلامی شہروں تک پھیلا رہے ہو۔ اللہ نے تمھیں اپنی عنایت اور توفیق کے ساتھ گھیر لیا ہے۔ تمھارے ذمے جو پیغام لگایا گیا وہ تم نے بہترین طریقے سے ادا کر دیا، تمھیں اس کی بہترین توفیق دی گئی۔ مجھے خیال آتا ہے کہ اگرچہ تم نے اپنا کام بہترین طریقے سے مکمل کیا لیکن تمھارے بعض ساتھی اساسی مقصد کو سمجھ نہیں سکے''۔۔۔ ''میں تمھارے سامنے اقرار کرتا ہوں کہ جو مسلمان مسیحیت کے دائرہ پناہ میں داخل کیے گئے ہیں وہ حقیقی مسلمان نہیں تھے۔ یہ نئے مسیحی تین وجوہات میں سے ایک وجہ سے مسیحی بنے، یا تو وہ چھوٹے بچے تھے جن کے اہل خانہ میں سے کوئی اسلام سمجھانے والا نہ تھا، یا ایسے آدمی تھے جو سب ادیان کو ہلکا سمجھتے تھے، وہ فقط قوت حاصل کرنا اور فقیری مٹانا چاہتے تھے۔ بعض وہ تھے جو کسی شخصی مفاد تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مسیحی ممالک کی طرف سے محمدی شہروں میں جس تبشیر کی ذمہ داری تمھیں سونپی گئی ہے، وہ مسلمانوں کو مسیحیت میں داخل کرنا نہیں کیونکہ یہ تو ان کے لیے ہدایت و تکریم ہے! تمھاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم مسلمانوں کو اسلام سے نکالو تاکہ وہ ایسی مخلوق بن جائیں جن کا اللہ سے کوئی تعلق نہ رہے۔ نتیجے میں اُن کا اُس اخلاق سے کوئی تعلق نہ رہے گا جس کی بنیاد پر امتیں اپنی زندگی گزارتی ہیں۔ اس طرح تم اسلامی ممالک میں استعماری فتح کے ہراول دستے بن جاؤ گے۔ تم پچھلے سالوں میں اس کو بہترین طریقے سے ادا کر چکے ہو۔ میں تمھیں اس پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، مسیحی ممالک اور مسیحی برادری بھی تمھیں مبارک باد پیش کرتی ہے۔ بھائیو! انیسویں صدی کی تیسری دہائی سے لے کر آج تک ہم اسلامی ممالک میں تعلیم کے تمام منصوبوں پر قبضہ کر چکے ہیں! ہم ان علاقوں میں کئی تبشیری مراکز، کلیسا اور مسیحی سکول قائم کر چکے ہیں جن پر یورپی ممالک اور امریکیوں کا کنٹرول ہے۔ لیکن یہ سب تمھاری مہربانی ہے۔ تم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے اپنے وسائل کے ساتھ اسلامی ممالک کی تمام عقلوں کو تیار کیا ہے کہ وہ اس راستے پر چلنے کو قبول کر لیں جو تم نے متعین کیا ہے۔

تم نے مسلمان شہروں میں ایسی نسل تیار کی ہے جو اللہ کے ساتھ تعلق کو نہیں پہچانتی اور نہ ہی پہچاننا چاہتی ہے۔ اگرچہ تم مسلمانوں کو مسیحیت میں داخل نہیں کر سکے لیکن تم نے اُن کو اسلام سے ضرور خارج کیا ہے۔ نتیجۃً ایسی اسلامی نسل تیار ہوئی ہے جو مسیحی استعمار کی خواہش کے مطابق ہے جو عظمتوں کا ارادہ نہیں رکھتی اور راحت و سستی کو پسند کرتی ہے۔ وہ دنیا میں اپنی تمام تر ہمتیں کو فقط شہوتوں میں صرف کرتی ہے۔ وہ علم کا حصول فقط شہرت کے لیے کرتی ہے اور مال جمع کرنے کا مقصد شہوات کو بناتی ہے۔ وہ بڑے بڑے مراکز قائم کرتی ہے تو خواہش نفس کے لیے ہر شے قربان کر دیتی ہے۔ تمھاری ذمہ داری بہترین طریقے سے مکمل ہوئی ہے اور اُس کے بہترین نتائج نکلے ہیں، مسیحیت تمھیں برکتیں عطا کرے اور استعمار تم سے راضی ہو۔ تم اپنے پیغام کو جاری رکھو۔ تم مبارک جہاد کے فضل سے رب کی برکتوں کے مستحق بن چکے ہو۔ (۶۲۹)

اس کے لیے کئی وسائل و ذرائع استعمال کیے گئے۔ ہم کچھ کا ذکر کرتے ہیں۔

① **جو مسلمان مسیحی دین میں داخل ہونا چاہیں اُن کو داخل کرنا**، اگرچہ یہ اساسی غایت نہیں جیسا کہ زویمر نے کہا۔ لیکن یہ دوسروں کے ایمان کمزور کرنے اور اُن کی ہمتیں پست کرنے کا سبب ضرور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نصرانی کلیسا اس سے بھی بہت خوشی محسوس کرتا ہے کیونکہ یہ اسلام سے انتقام ہے جس نے اُن کے قدیم دیار کو ملیامیٹ کیا۔ اسی طرح یہ اُس عظیم خسارے کا ایک پرامید معاوضہ بھی ہے جو جدید یورپ کے ہاتھوں مسیحیت کو لاحق ہوا۔

② **عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں نرسریاں، سکول، کالج اور جامعات کھولنا**: اگر ہم بطور مثال فقط افریقہ کو لیں تو ہمیں اس میں تعلیمی مراکز کے ہولناک اعداد دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہاں تعلیمی اداروں کی تعداد ۱۶۱۷۱ ہے۔ کلیات و جامعات ۵۰۰ کے لگ بھگ ہیں۔ اور مذہبی سکول جو قسیس، رہبان اور مبشرین چلاتے ہیں، ۴۸۹ ہے۔ ننھے بچوں کے سکولوں کی تعداد ۱۱۱۳ سے زائد ہے جن میں تعلیم حاصل کرنے والے مسلمان بچے پانچ لاکھ سے زائد ہیں۔ (۶۳۰)

③ **عقیدہ ولا و برا کو ختم کرنا**: دوستی دشمنی کا صحیح تصور مسلمانوں کے اندر کافروں کے مقابلے میں مضبوط نفسیاتی رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ تبشیری محرکات کو انسانی ہمدردی کے پردوں میں چھپایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں میں طبی اور غذائی امداد بھی تقسیم کرتے ہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کے کمزور حالات کو استعمال کرتے ہوئے بعض شہری ضروریات پیش کیں اور مسلمان اس قسم کے تعاون اور وسائل کے محتاج بھی تھے۔ مبشرین نے آخری سالوں میں اپنی توجہ انڈونیشیا اور بنگلہ دیش کی طرف مرتکز کی جیسے انھوں نے یمن سے ابتدا کی تھی۔ انھوں نے وہاں کی عام فقیری کو اپنے حق میں خوب استعمال کیا۔

④ **اسلامی ماحول کو خراب کرنے کی کوشش**: مستشرقین کی کوششیں جس قدر اعلیٰ پیمانے پر ہوں وہ بہرحال

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلیم یافتہ لوگوں کے دائرے میں رہتی ہیں۔ اسی لیے مبشرین عام عوامی ماحول پر توجہ دیتے ہیں جو اسلامی طور طریقوں پر کاربند ہوتا ہے اور خرابی کو کم سے کم قبول کرتا ہے۔ جب اسلام کے بیٹوں پر جہالت، مرض اور افلاس کا غلبہ ہو گیا تو ان مبشرین کے لیے بھی ماحول سازگار ہو گیا۔ وہ صحت و روزگار کے اجتماعی مراکز تشکیل دینے لگے، سکول اور مختلف نرسریاں قائم کرنے لگے، دیہی زندگی کی آبادکاری کے پروگرام بنانے لگے اور بالغوں کی ناخواندگی کو ختم کرنے لگے۔ ان کا ہدف یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ عوامی طبقات تک رسائی حاصل کر سکیں۔

⑤ **مسلمان عورت کا اخلاق تباہ کرنے کی کوشش:** مبشرین نے دیکھا کہ مسلمان عورت کا نسوانی اخلاق اُس وقت تک تباہ نہیں کیا جا سکتا جب تک اُس کا حجاب قائم ہے۔ نتیجۃً مومن نسل کو بھی فساد میں مبتلا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ انھوں نے پوری کوشش کی کہ عورت کو اُس کی نسلوں پرانی پناہ گاہ سے نکالا جائے لیکن وہ اس کو زبردستی سرانجام نہ دے سکتے تھے۔ اس معاملے میں تعلیم سے بڑھ کر کوئی چیز کارگر نہ تھی۔ اس لیے ایک مبشرہ کہتی ہے: قاہرہ میں خواتین کے کالجوں میں ایسی لڑکیاں ہیں جن کا نہایت اعلیٰ خاندانوں سے تعلق ہے۔ کوئی اور ایسی جگہ نہیں جہاں اتنی بڑی تعداد میں مسلمان لڑکیاں مسیحی اثر کے تحت جمع ہو سکیں۔ اسلام کے قلعہ تک پہنچنے کا سب سے چھوٹا راستہ یہی سکول ہی ہیں۔ (۶۳۱)

اسی طرح انھوں نے میڈیا کے مختلف پروگرام اور وسائل استعمال کیے اور تفریح و فنون کی آڑ میں فساد کے مراکز قائم کیے۔

⑥ **میڈیا کے وسائل پر غلبہ:** اور اس کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا، لوگوں میں اسلامی عقیدہ کمزور کرنا، شریعت کے بارے میں شبہات پھیلانا۔ یا کم از کم ان وسائل کو لہو و لعب میں استعمال کرنا۔ اس کے ساتھ ساتھ بچوں اور اُن کی سادہ عقلوں تک رسائی۔

⑦ **ضبط ولادت کی حوصلہ افزائی:** یہ وہ بدعت ہے جس کو اس سے پہلے مسلمان کبھی نہ پہچانتے تھے۔ یہ مغرب کی منصوبہ بندی کا حصہ ہے جو غیر سفید نسلوں خصوصاً مسلمانوں کو مغلوب کرنے کے لیے اپنائی جاتی ہے۔ مسلمان اُن کے شدید دشمن ہونے کے باوجود ساری امتوں میں بہ کثرت تناسل والے ہیں۔

انھوں نے مسلسل یہ اشارہ کیا کہ اقتصادی مسائل کا سبب صرف اور صرف بچوں کی زیادہ تعداد ہے۔ اسی دوران مبشرین غیر اسلامی گروہوں کو کثرت نسل پر ابھارتے تھے جیسے قبطی وغیرہ

⑧ ان علما و دعاۃ کی کوشش ضائع کرنا جو تبشیر کے مقابلے میں کھڑا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی کوششوں کا دائرہ تنگ اور معطل کرنا۔

⑨ عالم اسلام کی نگرانی اور جاسوسی، امت کی نبض ٹٹولنا اور اسلامی تحریکوں پر گھات لگانا۔ تبشیری طائفوں کے ریاستی سی آئی ڈی کے ساتھ رابطے ثابت ہو چکے ہیں۔ یہ لازم بھی تھا اور متوقع بھی تھا کیونکہ ان کے مقاصد ایک ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

④ عرب نصاریٰ:

جن لوگوں نے صراحت کے ساتھ سیکولرزم کی دعوت دی یا قومیت وطنیت جیسے نعروں کی آڑ میں سیکولرزم کو متعارف کرایا، وہ مشرقی ممالک کے عیسائی تھے۔ اسلامی معاشرے نے اُن کو پرامن زندگی کے مواقع بلکہ بعض اوقات زائد محبت دی، لیکن وہ اُن کے سینوں میں بھڑکتی کینے کی آگ ٹھنڈا نہ کرسکی۔ وہ اِس بات کا ادراک رکھتے تھے کہ شریعت اسلامی کا غلبہ اُن کے کینوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ انھوں نے شریعت کے امکان کو ختم کرنے اور اُس کی جگہ لادین نظاموں کو اتارنے میں سب سے زیادہ کوشش کی۔ اِسی وجہ سے یہودی صلیبی منصوبہ سازوں نے عرب نصاریٰ کے اندر خلافت اسلامیہ کو ختم کرنے کی سب سے بڑی مطلوبہ صلاحیت دیکھی۔ اسی طرح اُن میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ اسلامی حکومت کے خاتمہ، زندگی کے میدان سے شریعت کی بے دخلی اور معاشرہ کی سیکولر راہنمائی کے لیے بھرپور کردار ادا کرسکیں۔

اُن سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ سیکولرزم نے یورپ میں اُن کے دین کے ساتھ کیا کیا بلکہ یہ محرک ہے کہ مشرق میں بھی سیکولرزم کی آواز لگنی چاہیے تاکہ اسلام کا بھی کام تمام کیا جاسکے۔

یہ بات صحیح ہے کہ سیکولرزم کا پھیلاؤ نصرانیت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، چاہے وہ جتنی احتیاطیں کرلیں لیکن جب وہ اسلام کو بھی ختم کرنے میں لگا رہے تو پھر کوئی حرج نہیں سمجھا جاتا۔ جیسے ایک شاعر کا قول ہے:

مجھے بھی قتل کرو اور مالک کو بھی اور مالک کو میرے ساتھ قتل کرو۔

مشرق کے نصاریٰ کی اس میدان میں کوششیں اتنی زیادہ ہیں کہ اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں لیکن اس کی واضح تقسیم اِس طرح ممکن ہے: سیاسی سرگرمیاں اور فکری سرگرمیاں۔

① سیاسی سرگرمیاں

عرب کے نصاریٰ مغرب کے گمراہ اور تباہ کن گروہوں کے ساتھ مضبوط تعلق میں ہیں اور اس کے علاوہ عالمی جاسوسی نیٹ ورک سے بھی منسلک ہیں۔ اِسی وجہ سے انھوں نے خفیہ جماعتیں تشکیل دیں جو اسلامی خلافت کے مدمقابل کھڑی ہوئیں۔ وہ لادین وطنی یا قومی حکومت کی دعوت دیتی ہیں۔ اِن جمعیات میں سے جمعیت بیروت فارس نمرہ، جامعۃ الوطن العربی (نجیب عازوری)، جمعیت قحطانیہ، اور جمعیت فتات عربیہ ہیں۔ اس کے علاوہ الحزب القومی شامی (انطون سعادۃ) اور حزب البعث (میشل عفلق) ہے۔ (۶۳۲)

② فکری اعمال

عرب نصاریٰ پہلے لوگ ہیں جنھوں نے مغربی فکر وثقافت کو جدید وسائل کے ساتھ خوب پھیلایا، خصوصاً

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحافت کا بھرپور استعمال کیا۔ انھوں نے کئی اخبارات نکالے جیسے الجنان، المقتطف، الہلال۔ اُن کے لکھاری نصیف یازجی، یعقوب صروف، جرجی زیدان جیسے تھے جو اسلامی مشرق میں لادینیت کے ہراول دستوں کے نمائندہ تھے۔

بعض نصاریٰ انسائیکلو پیڈیا جیسی تالیفات اور قدیم ورثے کی طرف متوجہ ہوئے جو مستشرقین کے طریقے کے عین مشابہ کام کرنے والے تھے۔ انھوں نے لغوی معاجم، ترجمہ کی ڈکشنریاں، بعض دائرۃ المعارف اور تحقیقات تالیف کیں جیسے احمد فارس شدیاق (۱۲۳۳) بطرس بستانی اور لوئس شیخو۔

بعض نصاریٰ مغربی فلسفوں پر متوجہ ہوئے، اُن کی تالیفات نشر کیں اور اُن کو عظیم راہ نما قرار دیا۔ انھوں نے عرب کو اُن کی پیروی کرنے اور زندگی کو اُن کی قائم کردہ بنیادوں پر استوار کرنے کی تلقین کی۔ جیسے شبلی شمیل، الداروسی، المتطرف، اور سلامہ موسیٰ وغیرہ۔

اسی طرح نصاریٰ شعرا بھی ظاہر ہوئے جنھوں نے اپنی پرجوش قومی شاعری کے ذریعے اسلام کے مخالف جذبات ابھارے جیسے ابراہیم الیازجی، بشارۃ الخوزی، الشاعر القروی اور مجر شعرا وغیرہ۔

البرٹ حورانی اعتراف کرتا ہے کہ ''سیکولر قومی معاشرہ کی آواز مسیحی شامی لکھاریوں میں سے ایک گروہ نے سب سے پہلے لگائی۔ (۱۲۳۴)۔ اور انھیں میں سے کسی سے شمیل الدراوینی یہ قول نقل کرتے ہیں ''دینی اور استبدادی حکومت صرف فاسد ہی نہیں بلکہ وہ دونوں غیر فطری اور غیر صحیح بھی ہیں''۔ دینی حکم بعض لوگوں کو دوسروں سے بلند کرتا ہے اور انسانی عقل کی صحیح نشو ونما روکنے کے لیے قوت کو استعمال کرتا ہے۔۔۔

یہ دونوں عقل کو جمود کی حالت میں برقرار رکھتے ہیں اور تدریجی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں جو کہ کائنات کا عظیم راز ہے۔ ممکن ہے کہ شرائع واحکام کا ایسا نظام موجود ہو جو کائنات کی فطری قوتوں کے موافق ہو اور جس کے نتیجے میں کائنات کا ارتقا بھی جاری رہتا ہو اور انسان بھی فطرت کے موافق زندگی گزارے۔۔۔ یہاں تک کہ وہ کہتا ہے: قومیں جتنا دین کو کمزور کریں گی، اتنا ہی طاقتور ہوں گی۔ یورپ عملاً اُس وقت قوی اور متمدن بنا جب اصلاح وانقلاب فرانس نے معاشرے پر پادری کے تسلط کو ختم کیا۔ اور یہی بات اسلامی معاشروں پر بھی صادق آئے گی۔ (۱۲۳۵)

وہ فرح انطون کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اُس کا سیاسی ہدف شمیل اور دیگر لبنانی لکھاریوں کے ہدف کے مشابہ تھا۔ اُس نے ایک سیکولر ریاست کی بنیادیں وضع کیں جس میں مسلمان اور مسیحی مکمل مساوات کے حامل ہوں''۔ وہ اُس کے ایک قول کو نقل کرتا ہے: دنیا بدل چکی ہے۔ اب جدید ممالک دین پر قائم نہیں رہے بلکہ اب وہ دو بنیادوں پر قائم ہیں: وطنی وحدت اور جدید علم کی مہارتیں۔

اس کا یہ قول بھی ہے: ''جدید دور میں وحدت فقط قومی جذبے کو تخلیق کرنے سے ہی مکمل ہوگی اور دینی اثر ورسوخ کو سیاسی قوت سے علاحدہ کرنا پڑے گا'' (۱۲۳۶)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس قسم کے دعویٰ جات اکثر عیسائی لکھاریوں اور صحافیوں سے صادر ہوئے ہیں۔ کوئی بھی انسان اِن آرا کو سلامی موسیٰ کی کسی بھی کتاب میں دیکھ سکتے ہیں یا امیر قطر کے بیان میں دیکھ سکتے ہیں۔

سیاسی پارٹیاں اور گروہ اس بات سے خائف نہیں کہ اُن کی بنیادیں اور اُن کے نعرے اسلام بیزاری اور لادینیت کی صریح دعوت پر قائم ہیں۔

اسلام دشمن نظام نے نصرانی اقلیتوں کو سیکولر نعرہ بلند کرنے اور شریعت اسلامی کی تنفیذ روکنے کا موثر ذریعہ بنایا ہے۔ یعنی دین اللہ کا اور وطن سب کا۔

یہ یہودی صلیبی منصوبہ کاروں کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ بلاشک وشبہ یہ منصوبہ انتہائی عقل مندی اور خباثت کا حامل ہے۔ اِس میں وہ قوت تاثیر اور ظاہری علمی اسلوب موجود ہے جس میں یہ سابقہ صلیبی حملوں سے مختلف ہو گئے ہیں۔ نصاریٰ کی فکر ایک ایسی فکر ہے جس کو قوت سہارا دیتی ہے، یہ ایسی تہذیب ہے جس کو جدید علم کی تائید حاصل ہے اور یہ ایسی خرابی بھی ہے جس کو نظام تقویت دیتا ہے۔

لیکن اِس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو بھول جائیں اور اپنے زوال کو اُن پر تھوپ کر خود بری الذمہ ہو جائیں۔ وہ کوئی افسانوی قوت نہیں جو ہمیں اچانک ملیامیٹ کر دے اور ہم اپنے دفاع میں ہاتھ بھی نہ اٹھا سکیں۔

جیسے پہلے بیان ہوا، ہم کبھی بھی شکست خوردہ نہیں ہوئے، ہاں اُس وقت، جب ہم خود سست اور کمزور ہوئے۔ ہمیں سزا ہمارے اعمال کے سبب ملی۔ ہم نے ہی کفار کو موقع دیا کہ وہ ہمارے مقابلے میں منصوبے بنائیں اور ہم نے ہی اپنی کمزوریوں اور بیماریوں کے ساتھ اُن کے منصوبوں کو کامیاب بنایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا﴾ (آل عمران:۳/۱۲۰)

تم اگر صبر کرو اور پرہیز گاری کرو تو اُن کا مکر تمھیں کچھ نقصان نہ دے گا۔

اگر ہم صبر وتقویٰ کے معاملے میں مفلس نہ ہوتے، بلکہ ایمان اور صحیح اسلامی تصورات میں مفلس نہ ہوتے تو ان منصوبوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ سارے منصوبے ایسے زخم ہیں جو جلد مندمل ہو جاتے ہیں یا ایسی اونگھ ہوتی ہے جس کے بعد چستی پیدا ہو سکتی ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ ہم پکے مسلمان تھے، کافروں نے آ کر ہمارے دین اور دنیا کو خراب کیا ہے تو ہم فقط اپنے نظریے میں ہی خطا کار نہیں ہوتے بلکہ ہم اپنے آپ پر واپسی کا صحیح راستہ بھی بند کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ صحیح راستہ یہی ہے کہ ہم خود دین سے منحرف تھے اور ہم اپنے انحراف واستقامت کے مظاہر واسباب نہ سمجھ سکے۔

اِس کی تفصیل آنے والے ابواب میں دیکھیں گے، جہاں ہم عالم اسلام میں سیکولرزم کے مظاہر پیش کریں گے۔ اِس سے واضح ہوگا کہ یہ مظاہر اُس وقت تک وجود میں نہیں آ سکتے تھے جب تک ہمارے اندر اور ہمارے معاشرے کے اندر ذاتی عوامل موجود نہ ہوتے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۶

سیکولرزم کے اسلامی زندگی پر اثرات

(۱) سیاست وقانون میں سیکولرزم:

امام احمد رحمہ اللہ سے مروی ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا: ''اسلام ایک ایک کڑی کر کے ٹوٹ جائے گا۔ جب بھی ایک کڑی ٹوٹے گی تو لوگ دوسری کڑی سے چمٹ جائیں گے۔ سب سے پہلے ٹوٹنے والی کڑی اسلامی حکمرانی ہوگی اور آخری کڑی نماز ہوگی۔''

قدیم دور سے ہی مسلم حکمرانوں کے معاملات میں دین سے انحراف شروع ہو گیا تھا لیکن اسلامی حکمرانی کی کڑی مکمل ٹوٹ پھوٹ کا شکار دور حاضر میں ہوئی ہے۔ مسلمان ضعف وتباہی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اسلام پچھلی تمام صدیوں میں دلوں کے اندر اتنا گہرا پیوست تھا کہ اُصولی طور پر اسلام کے بدلے میں کوئی منہج قبول نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسلام کے فرزندوں کی نظر میں جاہلیت انتہائی حقیر اور پست تھی۔

لیکن موجودہ دور میں صورت حال بالکل بدل گئی ہے۔ اسلام عملی طور پر فقط چند غلط تصورات کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جس پر تفصیلی گفتگو گزر چکی ہے۔ اسی دوران یورپ کی خیرہ کن جاہلیت نے انسانی فکر کی قیادت سنبھالی اور انسانی تہذیبوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگی۔ اِس میل ملاپ کی وجہ سے سیکولرزم عالم اسلام میں گھس آیا اور ہمارا سب سے بڑا کڑا ٹوٹ گیا۔

عالم اسلامی کے اندر کوئی ایسی چیز نہ تھی جس کو سیاست کا مستقل طریق کار کہا جا سکے۔ بلکہ سیاسی معاملات کو حکمرانوں کی خواہشات پر چھوڑ دیا جاتا۔ حتی کہ وہ بات درست ہے جس کو بعض مغربی محققین نے مسلمانوں کے ماضی کے بارے میں کہا ہے۔ اگر چہ اُس میں کچھ مبالغہ ضرور ہے لیکن وہ مکمل طور پر غلط نہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

ہر مشرقی شخص کی پیشانی پر مختصر شریعت لکھی گئی جس کے دسویں حصے کی مثال بھی یورپی وصیتوں میں موجود نہیں۔ مشرقی انسان کو کہا جاتا: ''اے مشرقی انسان: تجھ پر لازم ہے کہ تو اُس شخص کی عزت کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر بادشاہ بنایا ہے۔ تو اُس کو مقدس سمجھ اور اُس کی عبادت کر۔ جب وہ تجھ سے محبت کرے تو بھی اس سے محبت کر اور جب وہ تجھ سے تیرے مال ومتاع چھینے اور تجھے بدترین تعذیب کا نشانہ بنائے تو پھر بھی اس سے محبت کر۔ اس طریق سے انحراف پیدا نہ ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیونکہ وہ تیرا آقا ہے اور تو اُس کا غلام ہے۔ وہ تیرا مالک ہے جو تیرے معاملات میں ایسے صاحب اختیار ہے جیسے کوئی امانت دار اپنی امانت میں۔ (۶۳۸)

قانون سازی کے اعتبار سے عالم اسلام کا عدالتی نظام غیر منظم تھا جو شروح، حواشی اور آخری دور کے مختصرات پر اعتماد کرتا تھا۔ اُن کی عبارتیں اتنی ثقیل تھیں جیسے کوئی طلسمی باتیں ہوں یا معماجات۔ عام علمی جمود کی وجہ سے اِن کتابوں کو سمجھنے والے بھی تھوڑے ہو گئے۔ پھر یہ کتب قانون شرعی کا واحد مصدر نہ تھیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اہل اقتدار کی خواہشات، معاشروں کے رسوم و رواج اور قبیلوں کے طور طریقے بھی مصدر قانون تھے۔

جب یہ تکلیف دہ صورت حال تھی کہ اسلامی تصورات کے فہم میں انحراف پیدا ہو چکا تھا اور اسکی تطبیق و تحکیم میں کمزوری واقع ہو چکی تھی، ایسی صورت میں واحد حل یہ تھا کہ اسلام کی طرف دوبارہ رجوع کیا جاتا، اُس پر مضبوط ایمان لایا جاتا اور خالص عقیدہ اور کامل تطبیق پر عمل پیرا ہوا جاتا۔

اسلام کی طرف واپسی تو نہ ہوئی البتہ انحراف خطرناک اور گہرا ہوتے ہوتے دوسری انتہا کو پہنچ گیا کہ جاہلیت غالب آ گئی اور اسکو عمومی تسلط حاصل ہو گیا۔

بلا شک وشبہ جاہلیت کا زندگی کے ہر شعبہ میں غیر معمولی غلبہ اور تسلط ششدر کرنے والا تھا۔ لیکن علمی و عقلی سطح پر پسماندہ مسلمانوں نے اِس کو حقیقی حجم سے کہیں بڑا سمجھا۔ امت مسلمہ کو ایسی نفسیاتی چوٹ پہنچی کہ اُس کو سنبھلنے اور بتدریج واپسی میں کئی دہائیاں خرچ ہوئیں۔

سابقہ مثالوں میں امکان بیان ہوا کہ مسلمانوں نے بذات خود سیکولرزم قبول کیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے انحراف کی ابتدا اسلامی فقہ کے جمود سے چھٹکارا پانے کے لیے تھی جو جدید زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں ناکافی تھی۔ مسلمانوں کو وہم تھا کہ اُن کی پسماندگی کا سبب تنظیمی وادارتی سطح کی کمزوری ہے اور مغربی ضابطوں کی نقالی اِس پسماندگی کو ختم کر دے گی۔ اس بنیاد پر اسلام کے دو بڑے بازوؤں ''ترکی اور مصر'' میں اصلاحی تحریک کے نام سے تحریک کھڑی ہوئی۔

ترکی کی سیاست میں سیکولر رجحانات کا ارتقا

۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ء) میں سلطان عبدالحمید نے اپنا مشہور سرکاری پروانہ صادر کیا: ''عام لوگوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ ہماری عالیشان ریاست نے اپنی ابتدا سے بزرگ و برتر قرآنی احکام اور عظیم شرعی قوانین کو جاری کیا ہوا ہے۔ اسی طرح وہ طاقت اور بلند شان وشوکت کی حامل ریاست رہی۔ ہماری سلطنت کی قوت، عزت اور باسیوں کی خوشحالی انتہا کو پہنچی۔ لیکن اب ڈیڑھ سو سال سے معاملہ اِس کے برعکس ہو گیا ہے۔ مقدس شریعت کی اطاعت وفرماں برداری نہ ہونے سے مسائل ومصائب کی بھرمار ہو گئی ہے۔ ہماری قوت ضعف سے اور ہماری خوشحالی بدحالی سے بدل گئی ہے۔۔۔ اب ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کچھ نئے قوانین بنائے جائیں جن کے ساتھ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری عظیم پُرشکوہ ریاست کے ذیلی ممالک کا نظام بہتر ہو سکے۔ اِن قوانین کی بنیاد یہ ہو کہ جان و مال اور عزت کو محفوظ بنایا جائے، خراج کی تعیین کی جائے، فوج کی خدمات کا طریق کار اور تشکیل بہتر کی جائے۔ (۶۳۹)

یہ بات درست ہے کہ اصلاح بے حد ضروری تھی۔ اس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اصلاح کا تصور کمزور اور دھندلا تھا۔ جس کی وجہ سے آخر کار اصلاح کے نعرے کے تحت اسلامی شریعت کو مٹا ڈالا گیا جیسا کہ کمال اتاترک نے کیا۔

ہم سب سے پہلے امن کمیٹیوں کے حالات کا مطالعہ کرتے ہیں جو مختلف علاقوں میں قانون سازی کے لیے تشکیل دی گئیں اور جن کے ماتحت مجلّہ عدلیہ کا ظہور ہوا: ''عالی جناب پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ علم فقہ میں امورِ دنیا سے تعلق رکھنے والے معاملات تین اقسام پر مشتمل ہیں۔ یعنی مناکحات، معاملات اور عقوبات۔ اسی طرح متمدن اقوام کے سیاسی قوانین بھی تین قسم کے ہیں (۱) معاملات کی قسم کو شہری قانون کہا جاتا ہے (۲) تجارتی معاملات کے پھیلاؤ کی وجہ سے کئی قسم کے احکام کو معاملات سے الگ کر دیا گیا ہے جیسے 'ہنڈی' جس کو حوالہ کہا جاتا ہے اور دیوالیہ کے احکام وغیرہ۔ ان استثنائی احکام کے لیے ایک مخصوص قانون بنایا گیا ہے جس کا نام ''قانون تجارت'' ہے۔ (۶۴۰)

اس طرح شریعت میں پہلا عیب قانون تجارت داخل کر کے پیدا کیا گیا۔ سب سے بڑی مصیبت وہ فکری بنیاد تھی جس کے تحت اصلاح کی گئی یعنی ''شہری قانون'' کو مسلمانوں کی فقہی اصطلاح ''معاملات'' کا نام دیا گیا۔

یہ نود۔ دفکر یعنی اسلام کو کافر نظاموں کے مقابلے میں ماپنا اور کافر امتوں کو متمدن قرار دینا بہت بڑی آفت تھی۔

اصلاح کے اوّلین علم برداروں کے ہاں یہ سادگی اور غفلت برقرار رہی حتی کہ یورپ میں پڑھنے والے ترکی نوجوان کے لیے یہ ایک مستقل فکر اور بنیادی قاعدہ قرار پائی۔

اس طرح مغربی تعلیم یافتہ افراد ''اصلاح'' کے لفظ پر قابض ہو گئے۔ انھوں نے اصلاح کی خصوصیات کی من مانی حد بندی کی اور بالآخر اسلام کو ترک کرنے اور کافر یورپ کی رکاب تھامنے پر راضی ہو گئے۔

اُن کے دلوں میں انگریزی روح سرایت کر گئی۔ معاملہ آگے بڑھتا رہا حتی کہ انقلابی تحریک پیدا ہوئی جس نے داخلی اصلاح کا مطالبہ کیا یعنی سلطان عبدالحمید کے وسیع اختیارات کو محدود کیا جائے۔ اس تحریک کے قائدین مختلف رجحانات کے حامل تھے جن کو صرف ایک ہدف نے اکٹھا کیا یعنی دستوری حکومت کا قیام۔ اُس کے علاوہ وہ کسی مطالبہ پر متفق نہ تھے۔

اُن کے سیاسی نظریات متعدد تھے۔ غیر ملکی زبان کو پڑھنے میں جو شخص جتنا طاق ہوا اُتنا ہی وہ نت نئے سیاسی نظریے کا حامل بنا۔ دین کی صبح اُس کے ہاتھ میں واقع ہوگی جو ایڈمونڈ ڈیمولان کی کتاب کا حامل ہوگا اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اینگلو سیکسونین کی ترقی کا راز جانتا ہوگا۔(۴۶۲)۔اِس طرح سے لامرکزیت کی فکر پروان چڑھی۔

احمد رضا کا برا نصیب کہ اسے اگسٹ کومت کا تعارف حاصل ہوا۔اُس نے اثباتیت (Positivism) کا مکتبہ فکر اختیار کیا۔

احمد رضا کی ماں آسٹریا کی نسل سے تھی اور اس کا باپ انگریزی نام ''علی بک'' سے مشہور تھا جس سے اُس کی فرنگ سے محبت اور رجحان کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔(۴۶۳)

نامق کمال وطن پرست تھا اور قوم پرستی سے شدید متاثر تھا۔اُس نے مختلف یورپی شہروں کی اقامت کے دوران قوم پرستی کا مشاہدہ کیا۔(۶۴۴)۔آخر کار اس تحریک اصلاح اور سلطان عبدالحمید کے مابین حتمی تصادم واقع ہوگیا۔سلطان عبدالحمید حقیقی اصلاح کا خواہش مند تھا اور اسلامی یونیورسٹی کے قیام اور اعلان جہاد کا داعی تھا۔

۱۸۹۷ء میں اُس نے اس تحریک کو شل کرنے کے لیے مکمل زور لگایا۔وہ اکثر باتوں کی طرف مائل بھی تھا۔لیکن یہ تحریک جس فضا میں پروان چڑھ رہی تھی اور جن افکار کو اسلام کے مقابلے میں نشر کر رہی تھی، وہ ایک خفیہ سازشی تحریک کے لیے طاقتور محرک تھے۔اس تحریک کے اہداف و شعار بظاہر بہتر معلوم ہوتے تھے لیکن اُس کی گہرائیوں میں وہ خطرناکی چھپی ہوئی تھی جو کسی کے فہم و گمان میں نہ تھی۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذکورہ تحریک اور وہ تحریک جس کو **مدحت پاشا** اور اُن کے ساتھی چلاتے تھے، حادثے کا فقط ایک پہلو ظاہر کرتی ہے۔فضا امت کے دشمن کے لیے تیار ہو چکی تھی۔وہ اسلام کو بحیثیت عقیدہ و شریعت فنا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

۱۸۹۷ء میں **پہلی صیہونی کانفرنس** منعقد ہوئی اور اُس نے قرارداد پاس کی کہ اسرائیل کی سلطنت فلسطین کے علاقے میں سلطان عبدالحمید کے ماتحت قائم کی جائے۔سلطان نے فلسطین پر سودا بازی کرنے سے انکار کر دیا۔یہودی کینہ طویل زمانہ گزرنے کے باوجود اسلام کی دشمنی میں بجھنے نہ پایا تھا۔یورپ میں یہودی کامیابی کو دیکھتے ہوئے طریق کار یہ طے پایا کہ خلافت عثمانی کو تباہ کرنے کے لیے فرانسیسی انقلاب کے ہم مثل انقلاب برپا کیا جائے جو اپنے ہدف و شعار میں اُس جیسا ہو۔اس طرح یورپی طرز پر اسلام کے اندر سیکولر مملکتوں کا ظہور ممکن ہو سکے گا اور یہودیوں کا پرانا خواب اور سب سے بڑے ہدف کا راستہ کھل سکے گا یعنی یہودیت کی عالمی حکومت کا قیام۔ جس کا دستور تلمود ہو اور جس کی بادشاہت داؤدی نسل کے پاس ہو۔(۶۴۵)

اس میں کسی قسم کا مبالغہ نہیں۔**سرجی نیلوس** ''ناشر پروتوکولات'' نے یہودی سازشوں کے نتیجے میں روسی قیصروں کے نظام اور عثمانی خلافت کے خاتمے کی توقع ظاہر کی تھی۔اُس کی موت کے کچھ سالوں بعد ایسے ہی ہوا۔ اِس میں کوئی اچھنبا نہیں کہ اِس ساری بربادی میں بڑا ہاتھ یہودیوں کا تھا جن کو اسلامی رواداری نے اُس وقت پناہ دی جب عیسائی اسپین نے اُن پر عرصہ حیات تنگ کیا ہوا تھا۔

فرڈیننڈ اور ازابیلا نے یہودیوں کو اندلس سے نکال دیا اور وہ عثمانی سلطنت میں پناہ گزین ہوئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں کوئی تعجب نہیں کہ ''تلمودی یہودی'' غافل اور کمزور نیک دل مسلمانوں کو اپنی سازشوں کے لیے اہم پردہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔(۶۴۶)

اِن دو عناصر یعنی یہودی اور نیک دل سادہ لوح مسلمانوں نے مل کر سیکولر تحریک تشکیل دی جس کا نام ''تحریک اتحاد و قربانی'' رکھا گیا۔ یہ تحریک عالمی ماسونی طریقے پر چلتی تھی۔ اس تحریک کے بارے میں ترکی کے شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری نے جو کچھ کہا(۶۴۷)، وہ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سیٹون واسٹن نے کیا کہا:

''اس تحریک میں حقیقی دماغ یا تو یہودی تھے یا یہودی نما مسلمان۔ اِن کی مالی امداد سلانیک کے یہودیوں، عالمی سرمایہ داروں اور فینا، بوڈاپسٹ، برلن وغیرہ سے آتی۔ اور کبھی کبھار لندن اور باریس سے بھی آتی تھی۔''

جمعیت اتحاد و ترقی کی تشکیل میں واضح حقیقت یہ تھی کہ یہ غیر ترکی اور غیر اسلامی جمعیت تھی۔ یہ اپنی تاسیس سے ہی اپنے کسی ترکی الاصل لیڈر یا قائد پر مشتمل نہ تھی۔ لوگوں میں کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ اس یہودی گروہ کے بارے میں بتلائے کہ یہ تاریخ میں ایک انقلاب کا بنیادی کردار ادا کرنے جا رہا ہے جو دوررس نتائج کا حامل ہوگا۔(۶۴۸)

خلیفہ کے ساتھ ایک سخت جھڑپ اور کشمکش کے بعد تمام داخلی، خارجی اور ایجنٹ قوتیں خلیفہ کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ یہ گروہ کامیاب ہوگیا اور سلطان عبدالحمید کو خلافت سے ۱۳۲۵ھ = ۱۹۰۹ء میں بالجبر خلافت سے علاحدہ کر دیا گیا۔ خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی لادین منصوبہ بندی اور ریشہ دوانی کی آخری رکاوٹ بھی ختم ہوگئی۔

اس ٹولے نے خلافت کو سیاست سے الگ کر دیا۔ انھوں نے نیا سلطان چنا جو ان کی نظر میں مخصوص مدت کے حامل پوپ کی حیثیت سے کچھ زیادہ نہ تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ منصب خلافت کو ختم کرنے کے لیے ابھی فضا سازگار نہیں ہوئی۔

انھوں نے اسلامی یونیورسٹی کا قیام پہلے ہی رد کر دیا اور طورانی قومیت کے نعرے لگائے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ عثمانی صوبوں کو ترک بنانے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اُن کا اصل ہدف ''عرب'' تھے۔ نتیجے میں عربوں نے اپنا تعلق برطانیہ سے جوڑ لیا اور اپنا مستقبل ایک ایجنٹ ''لارنس'' کے ہاتھ میں دے دیا اور عرب انقلاب، عرب قومیت کے نعرے لگانے لگے۔

برنارڈ لوئس ذکر کرتا ہے کہ مستشرقین، جن میں سے ایک اہم کانٹ قسطنطین ہے، بوزریسکی جس نے اسلام کا دعویٰ کیا اور مصطفیٰ جلال الدین کا نام اختیار کیا۔۔۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے طورانی فکر کی بنیاد رکھی۔(۶۴۹)

پھر اُنھوں نے دستور نام کے بت کا اعلان کیا جو اُن کی وسیع و عریض دعوت کا سب سے بڑا ہدف تھا۔ یہ دستور لادین اہداف کو بیان کرتا، ماسونی جھنڈا اونچا کرتا اور ایک وطن کے نام پر مسلم و غیر مسلم کی برابری اور ناروا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

حریت دین و مذہب پر زور دیتا تھا۔ اِس دستور نے شرعی عدالتوں کے عمل کو معطل کیا اور نئی اصلاح و قانون سازی کا مطالبہ کیا۔ اِس طرح اسلام دشمن عناصر کو مکمل آزادی اور سرگرمی کے ساتھ کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔

اس تحریک کی فکری نشوونما پر ضیاء گوگ الپ کے افکار ملاحظہ کریں تو ہم بلاشک وشبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ کھلی لادین تحریک تھی۔ لیکن لوگ اس کی حالت کے بارے میں متردد تھے کیونکہ اِس کے حقیقی اہداف ظاہر نہ تھے۔ منصوبہ بندی کرنے والے بڑی مہارت اور دِقّت نظر کے حامل تھے۔

عالمی عمل ایک ایسے ہیرو کی تخلیق کا تقاضا کر رہا تھا جس کے سامنے حریف لشکر پسپا ہو جائیں اور امت مسلمہ کو اپنی بڑی بڑی امیدیں اور اونچے اونچے خواب اس کے وجود میں نظر آئیں۔ اُس کی عظمت اور شان و شوکت کی آڑ میں امت کے جسم سے آخری رمق بھی کھینچ لی جائے۔ وہ اُس کو نوچ ڈالے اور ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ (۶۵۰)۔ ترکی کے سوٹکڑے کرنے سے بہتر ہے کہ اُس کی اسلامی روح نکال دی جائے۔ چنانچہ اِس مقصد کے لیے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کیے گئے (۶۵۱)۔ اور اسلام کو بھی منہدم کیا گیا۔

اس ہیرو کی تخلیق بڑی کامیابی کے ساتھ مکمل ہوئی۔ وہ حلیف لشکروں کو للکارتا ہوا کھڑا ہوا اور یونان کو سمندر میں غرق کر دیا۔ (۶۵۲)۔ حلیف فوجوں کے لیے بات چیت اور مذکرات کے علاوہ کوئی اور راستہ نہ تھا۔ بات چیت کا نتیجہ ''کرزن کے اعلامیہ'' کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس کے چار بڑے نکات تھے۔

① ترکی خلافت کو ختم کر دے۔

② ترکی اسلام سے سارے رشتے توڑ دے۔

③ ترکی اپنے ملک میں تمام اسلامی عناصر کی تحریک کو بالجبر ممنوع کر دے۔

④ دستور عثمانی جو اسلام پر قائم تھا۔ اس کی جگہ خالص شہری (civil) دستور لایا جائے۔ (۶۵۳)

مورخ آرسٹرانگ اس مشترکہ اعلامیہ کی تنفیذ کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

''کمال اتاترک نے ہمہ گیر شکست و ریخت کو کامیابی سے مکمل کیا جس کی ابتدا بھی اس نے خود کی تھی۔ وہ اقرار کرتا تھا کہ ترکی کو اس کے فاسد و متعفن ماضی سے جدا کرنا واجب ہے۔ اُس پر لازم ہے کہ وہ اُن تمام رکاوٹوں کو زائل کرے جنھوں نے ترکی کو گھیرا ہوا ہے۔ چنانچہ قدیم سیاسی طریق کار کو ختم کرنا، سلطنت کو ڈیموکریسی کی طرف منتقل کرنا، وسیع ایمپائر کو فقط محدود ملک میں تبدیل کرنا، دینی حکومت کو عام جمہوریت میں ڈھالنا، اس کے فریضے کا حصہ ہے۔ اُس نے سلطان خلیفہ کو ایک طرف کر دیا اور عثمانی ایمپائر سے تمام تعلقات منقطع کر دیے۔ اب عوام کی عقلیت، قدیم تصورات، عادات، لباس، اخلاق، رسوم، گفتگو، گھریلو زندگی کے معاملات ماضی سے کاٹ دیے گئے اور بتدریج تبدیل کیے گئے''۔ (۶۵۴)

ٹوینبی نے اِس عمل کی تعریف کی اور اتاترک کو فن انہدام اور ماضی سے رشتہ کاٹنے میں ہٹلر سے بھی بڑا آدمی قرار دیا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نے کہا: ترکی قومی حکومت جس کو مصطفیٰ کمال نے مغربی اسلوب پر قائم کیا۔ اِن سطور کے لکھے جانے تک ایک کامیاب تجربہ ہے۔ اِس کی مثل کوئی تجربہ اس وقت تک کسی بھی دوسرے اسلامی شہر میں سرانجام نہیں پایا۔ (۶۵۵)

والفریڈ کاعل سمتھ نے اِس کے مخصوص طریقے کی تعریف کی اور کہا:

ہم نے ترکی کو نئے طور طریقوں میں بہت عظیم پایا۔ اُس نے دینی اثر ورسوخ کو مٹانے، دینی تعلیمات کو لغو کرنے میں کوئی تردد نہیں کیا۔ اُس نے اسلام کو آزاد کیا اور منضبط دین حق سے پردہ اٹھایا! (۶۵۶)

مصطفیٰ کمال نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے مدمقابل معبود کے طور پر نصب کیا۔ وہ قوم کے لیے من پسند قانون سازی کرتا تھا۔ اس نے قانون کا ایک منفرد مجموعہ ترتیب دیا جو زیادہ تر سوئس اور اٹلی کے قانون سے ماخوذ تھا، باقی ماندہ اُس نے اپنی طرف سے مکمل کیا۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا تھا کہ سارا قانون اُس کا ذاتی ہے۔

چنانچہ اُس کا کہنا ہے:

''ہم ایسی شریعت نہیں چاہتے جس میں دیگر لوگوں کے اقوال ہوں، ہم ایسی شریعت چاہتے ہیں جس میں ہمارے اپنے اور ہمارے مخاطبین کے اقوال ہوں'' (۴۵۷)

ایک لکھاری قومی اسمبلی کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

مصطفیٰ کمال کھڑا ہوا اور اُس نے کہا: قانون سازی اور عدلیہ جب زندہ موجود قوم کے لیے ہو تو وہ زمانے کے احوال کے مطابق قانون بنائے نہ کہ مخصوص رسوم ورواج اور قواعد کے مطابق۔

پھر اس کے بعد وزیر عدل نے شرح وتفسیر کرتے ہوئے کہا:

ترکی قوم اس بات کی زیادہ لائق ہے کہ وہ بذات خود غور وفکر کرے نہ کہ وہ دوسروں کے افکار کی پابندی کرے۔ ہماری عدلیہ کی کتابوں کا سارا مواد ''قال'' کے مقدس کلمے سے شروع ہوتا ہے۔ یعنی فلاں نے ایسے کہا، ہمیں بالکل پروا نہیں کرنی چاہیے کہ ماضی میں کیا کہا گیا۔ ہمارے لیے اہم یہ ہے کہ ہم بذات خود غور کریں اور خود اپنے اقوال کے قائل ہوں۔ (۶۵۸)

اس پر ایک قانون دان نے اعتراض کر دیا اور کہا:

جو نظام آپ وضع کرنا چاہتے ہیں، یہ تو کسی قانون کی کتاب میں نہیں۔ تو اُس کا جواب تھا، نظام تجربات کا ہی مجموعہ ہوتا ہے۔ میں اپنی پسند کو نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے کام کو کتابوں میں درج کر دیں تو یہ ایک مدوّن نظام بن جائے گا۔!! (۶۵۹)

اس انتہا پسندی اور غیر معقول اعمال کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اسلام کے خلاف یورپی حسد وکینہ کی تسکین ہو۔ وہ عجیب وغریب تدبیرات، جن کو سیکولر ترکی نے لازم کیا نقائص کا مجموعہ تھے جن کو مصطفیٰ کمال کے ہم نوا بھی اچھی طرح محسوس کرتے تھے۔ اُن کی تفصیل درج ذیل ہے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

''ترکی نے عربی رسم الخط پر بالجبر پابندی لگادی۔ پھر جرات کی اور اذان کو عربی میں کہنے پر ممانعت عائد کر دی۔ قرآن کے ترجمے کو عامیانہ زبان میں لکھا گیا۔ مساجد کی تعداد محدود کی گئی۔ اکثر مساجد کو مقفل کر دیا گیا۔ بعض مساجد کو ایسی عمارتوں میں تبدیل کیا گیا جو مسجد کے شایان شان نہ تھیں جیسے جامع ایا صوفیا۔ اسلحہ کی قوت کے ساتھ فکری مسخ و انحراف کو عوام پر لازم کیا گیا بلکہ بعض مظاہر بھی لازم کیے گئے۔ اسلامی عیدوں کو لغو کیا گیا۔ اسلامی حیا وحشمت کے مظاہر کو جبر و استبداد کے ساتھ ختم کیا گیا۔ خواتین کو ہر معاملہ میں مغرب کی تقلید پر مجبور کیا گیا۔ جو تقویٰ کی راہ پر چلنا چاہتے تھے یا معتدل رہنا چاہتے تھے، انھیں کمال کے پیروکاروں پر اعتراض کی پاداش میں شدید جنگ کا نشانہ بنایا گیا۔ (۶۶۰)

اسی وجہ سے کمال کی سیکولر حکومت، امیر شکیب ارسلان کے بیان کے مطابق، فرانس اور انگلینڈ کی طرح فقط لادین حکومت نہ تھی بلکہ روسی بالشویک حکومت کی طرح دین کی دشمن حکومت تھی۔

مغربی لادین ریاستوں نے مشہور انقلابات کے باوجود انا جیل کے حروف میں مداخلت نہیں کی اور نہ دینی رہنماؤں کے لباس مخصوص مراسم عبودیت اور کلیساؤں کے وجود میں مداخلت کی۔ (۶۶۱)۔ یہ بڑی کڑوی حقیقت ہے کہ مصطفیٰ کمال نے عالم اسلام کے حکمرانوں کے لیے ایک بدترین نمونہ پیش کیا۔

مصطفیٰ اتاترک سے زیادہ قابل تعجب تو وہ لیڈر ہیں جو آج اپنے ممالک میں سیکولر حکومتوں کے قیام کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کمال ان کا روحانی قائد ہے۔

www.KitaboSunnat.com

مصر کی سیاست میں سیکولر رجحانات کا ارتقا

ٹوینی کہتا ہے: مصر نے ترکی سے بہت پہلے محمد علی کے دور میں ہی یورپی رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ (۶۶۲) اسی طرح گب کا بھی خیال ہے کہ وہ اس معاملے میں ترکی سے مقدم ہے۔ (۶۶۳) خدیو اسماعیل مغرب کا دیوانہ تھا۔ اُس نے اپنی ناکام سیاست کی بنیاد اِس بات پر رکھی کہ برطانیہ مصری معاملات میں مداخلت کرے اور بالآخر قابض ہو جائے۔

مصر پر قبضہ ہوتے ہی کرومر اپنے خبیث منصوبے کے ساتھ آیا اور عالمی قوتیں اسلام کو معطل کرنے یا زندگی کے تمام شعبوں سے بے دخل کرنے پر تل گئیں۔

حق تو یہ ہے کہ یہ کام کرومر یا کسی دوسرے کے بس میں نہ تھا، یہ ہمارے لیڈر اور علما ہی تھے جنھوں نے رضا کارانہ یہ خدمت سرانجام دی۔ حزب وطنی جو مصر کی پہلی سیاسی جماعت ہے، اپنے رسمی پروگرام کا ۱۸۸۲ء میں اعلان کرتی ہے۔ اس میں یہ بات بھی مذکور ہے:

حزب وطنی لادین سیاسی جماعت ہے۔ یہ مختلف عقائد و مذاہب کے افراد کا مجموعہ ہے۔ اس کا بڑا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے کیونکہ مصر کی نوے فیصد آبادی مسلمان ہے۔ لیکن تمام نصاریٰ، یہود اور مصر کی سرزمین پر بھی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باڑی کرنے والے اور اُس کی زبان بولنے والے اس میں داخل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ عقائد کے اختلاف کو قابل توجہ نہیں سمجھتی اور اُس کا نظریہ ہے کہ تمام افراد بھائی ہیں اور اُن کے سیاسی و مذہبی حقوق برابر ہیں۔ (۶۶۴)

اگر عربی انقلاب کامیاب ہو جاتا تو وہ شاید بہت سارے امور میں مصطفیٰ کمال سے بھی آگے نکل جاتا۔ چنانچہ حزب کا ایک لیڈر کہتا ہے:

ہم شروع سے اپنی تحریک کا ہدف یہ بنائے ہوئے تھے کہ جمہوری مصر کو سوئٹزرلینڈ کی طرح بنایا جائے۔ لیکن ہم نے اپنے علما کو دیکھا کہ وہ اِس دعوت کے لیے تیار نہیں کیونکہ وہ اپنے زمانے سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن ہم مرنے سے پہلے اس کی بھرپور جدوجہد ضرور کریں گے۔ (۶۶۵)۔ اسی لیے کرومر بھی یہ کہنے میں پیچھے نہ رہا کہ:

اسلام ایک عقیدے اور دین کے اعتبار سے تو کامیاب ہے۔ لیکن اجتماعی نظام کے اعتبار سے ناکام ہے۔ اِس کے قوانین ساتویں صدی عیسوی میں جزیرہ عرب کی مناسبت سے وضع کیے گئے۔ لیکن وہ ابھی بھی ابدی ہیں اور جدید انسانی معاشرے کی ترقی کا ساتھ دینے کے لیے بزعم خود تیار ہیں۔ (۶۶۶)

پھر کرومر نے مصریوں کو یہ ترغیب دی کہ ''یورپی اخلاق سے عاری مسلمان مصری حکومت کے لیے مناسب نہیں۔ اسی طرح اُس نے زور دیا کہ مصر کے مستقبل کے وزیر یورپی تربیت سے آراستہ ہوں۔ (۶۶۷)۔ اسی وجہ سے قبضہ کرنے والی استعماری قوتوں کی شدید خواہش تھی کہ وہ ''روشن خیال'' علما کا تعاون حاصل کریں اور اسی وجہ سے انھوں نے ''تحریک اصلاح'' کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی۔

شیخ محمد عبدہ ہندوستان کی علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خان کے مکمل مشابہ ہیں۔ سرسید احمد خان کو جدید معتزلہ کا نام دیا گیا اور وہ مغربی تہذیب کے آخری حد تک والہ وشیدا تھے۔

لیکن مصر کے حالات ہندوستان سے مختلف تھے۔ اگرچہ محمد عبدہ خود بھی متشدد معتزلی تھے لیکن وہ لوگوں کے اسلامی جذبات کو اُس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، جتنا انھوں نے پہنچایا۔ ان کے بعض اقدامات کے خلاف عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں شور برپا ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرومر جس طرز پر جدید مصر کو ڈھالنا چاہتا تھا، وہ لادین ریاست کی طرز تھی جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو۔ محمد عبدہ کے ہاں کوئی واضح صورت نہ تھی۔ اُس کا ہدف اصلاح تھی جو وہ انگریزی استعمار کے زیر سایہ بیان کرتا تھا۔ اسی وجہ سے کرومر اور شیخ کا باہمی تعلق غالب اور مغلوب کا باہمی تعاون تھا، جس میں شیخ یقیناً مغلوب تھے۔ اُن دونوں کا دشمن مشترک تھا، پابند و بے بس علما جو اپنی کمزوریوں کے باوجود استعمار سے نفرت دلاتے تھے اور اس کے ساتھ اشتراک عمل کو کسی صورت درست نہ سمجھتے تھے۔

محمد عبدہ نے اپنے اصلاحی عمل کی ابتدا جامعہ ازہر پر حملوں کی صورت میں کی۔ اُس نے عدالتوں اور اجتماعی زندگی پر تنقید کی، کرومر اُن کے پیچھے پھلوں کو چنتا جاتا تھا۔

برطانیہ اپنی عادت کے مطابق مسلم ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد فوراً اسلامی شرعی قوانین کو ممنوع کر دیتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا۔لیکن کرومر نے اس کے لیے بہتر طریقہ یہ خیال کیا کہ شرعی عدالتوں کو اُن کے دائرہ کار سے ہی خالی کر دیا جائے۔اُس نے عدالتوں کی ذمہ داری آزاد خیال علما کے سپرد کر دی۔آزاد خیال علما کی تربیت کی ذمہ داری شیخ کے ذمے ڈالی گئی جو شرعی قاضیوں کے ادارے میں نگران تھے۔اُس نے اپنے عزائم کو ان معلومات کی بنیاد پر تقویت دی جو اس نے بزعم خود ایک کالج سے حاصل کی تھیں جس کو سراہیفو میں ہنگری کی حکومت نے قائم کیا تا کہ مسلمان شرعی قاضیوں کو تیار کیا جا سکے۔کرومر اس کالج کے بارے میں کہتا ہے: یہ کالج مکمل طور پر ایک کامیاب کالج تھا۔وہ ایک سالانہ حکومتی تقریر (۱۹۰۵ء) میں کہتا ہے:

۔۔یہ معلومات ایک ممتاز اور قابل کمیٹی کے تحت پیش کی گئی ہیں جس کے رئیس سابق مفتی اکبر (محمد عبدہ) تھے۔انھوں نے مصر کے حالات وضروریات کو دیکھ کر ایک مناسب منصوبہ ترتیب دیا۔کمیٹی نے اپنے کام کو مکمل کر لیا ہے، حکومت کی سرپرستی میں ایک پسندیدہ نظام وضع کر لیا گیا ہے۔۔۔یہ نظام طالب علم کو آزاد طبعی ثقافتی پروگرام مہیا کرے گا جو خاص دینی تعلیم سے حاصل نہیں ہو سکتا۔(۶۷۰)

یہ بڑی حیران کن لیکن درست بات ہے کہ محمد عبدہ مغربی قوانین سے اخذ واقتباس میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے جب تک وہ اُن کی نظر میں اصلاحی مقاصد میں گارگر ثابت ہو رہے ہوں۔''عقاد'' جو محمد عبدہ سے بڑا متاثر تھا، یہاں تک کہتا ہے: وہ جانتے تھے اِن قوانین کے عربی مراجع، ان اصول وقواعد کا احاطہ نہیں کر سکتے جو مغربی قانون کے فلاسفہ کے ہاں متداول تھے۔چنانچہ محمد عبدہ نے فرانسیسی زبان کی تعلیم کا آغاز کیا۔(۶۷۱)۔ محمد عبدہ مغربی تہذیب سے اِس قدر متاثر تھے کہ وہ جامعہ ازہر پر طعن وتشنیع کرتے اور اُس پر اصطبل، ہسپتال اور کھنڈرات کا لفظ بولتے۔وہ اُس کی تعلیم کو مغربی طریقے پر ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔

وہ کہتے ہیں:

اگر مجھے کچھ علم صحیح نصیب ہوا ہے۔۔۔تو فقط اس وقت جب میں نے ازہر کی میل کچیل کو اپنے دماغ سے کھرچنے میں دس سال لگائے۔اور ابھی بھی میری حسب منشا صفائی نہیں ہوئی۔(۶۷۲)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامعہ ازہر کو اصلاح کی ضرورت تھی۔لیکن جس اصلاح کو انگریز پسند کرتے تھے اور شیخ اُن کے ساتھ تھے، وہ دوسری قسم کی اصلاح تھی۔خصوصاً جبکہ سلیمان حلبی کا وجود کرومر کو ہر وقت دھمکیاں دیتا تھا۔(۶۷۳)

اسلامی شریعت کے خاتمے کے لیے انگریز کی سب سے بڑی منصوبہ بندی یہ تھی کہ اُس نے قوانین وضع کرنے کے لیے ایک مجلس شوریٰ بنائی جس کے واسطے سے وہ مصر پر حکومت کرتا تھا۔اس مجلس کے لیے شیخ محمد عبدہ کی اتنی خدمات تھیں کہ عدالتی اہل کار یہ کہنے پر مجبور ہو گیا:

''پچھلے سال کی شرعی عدالتوں کی روداد پر اپنے ملاحظات پیش کرنے سے پہلے، میں مجبور ہوں کہ دیار مصر کے عظیم مرحوم مفتی محمد عبدہ کی وفات پر چند باتیں کروں جو کہ پچھلے مہینے جولائی میں فوت ہو گئے۔میں اس خسارے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

پر شدید افسوس ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو ان کی وفات سے اس سارے منظر کو لاحق ہوا۔۔۔''

پھر وہ کہتے ہیں:۔''اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے لیے عظیم خدمت سرانجام دی جو مجلس شوریٰ برائے قانون سازی کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ ہمارے لیے جرم وسزا اور عدالتی اصلاحات پر بہت بڑا کام کرتے رہے۔ وہ اہل مجلس کے ناظرین کے لیے تشریح اور دفاع کرتے۔ بوقت ضرورت وہ ایسا حل تلاش کرتے جس پر دونوں فریق راضی ہو جاتے۔ اُن کی موت سے جو خسارا ہمیں لاحق ہوا ہے۔ اُس کی تلافی مشکل ہے۔ وہ بلند ادارک کے مالک، وسیع الاطلاع اور اصلاح کی تمام اقسام سے باخبر تھے۔ انھوں نے یہ سب معلومات یورپی شہروں میں قائم محکمہ سیر وسیاحت اور تعلیمی اداروں کے انتظامی اہل کار کی حیثیت سے حاصل کیں۔(۶۷۴)

محمد عبدہ کے خطرناک اثرات عالم اسلام میں سیکولرزم کی جڑ مضبوط کرتے ہیں مثلاً دین کی خاطر دوستی دشمنی کو کمزور کرنا اور دارالحرب ودارالاسلام کے تصور کو نقصان پہنچانا وغیرہ۔ **شیخ محمد عبدہ** علم سے منسوب لوگوں میں سب سے زیادہ دلیر تھے، وہ فقط کافر انگریز حکومت سے تعاون کی دعوت نہیں دیتے تھے بلکہ انگریز وغیر انگریز سب کی دوستی پر صریح دعوت دیتے۔ اُن کی دلیل تھی کہ کفار سے تعاون کسی بھی اعتبار سے حرام نہیں۔ اس طرح وہ تقریب بین المذاہب والادیان کے بھی داعی تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام نے شیخ کے ان فتووں پر غصہ کا اظہار کیا جن کے ذریعے انھوں نے کفار کی دوستی کو جائز قرار دیا۔ لیکن شیخ کے فتووں کے برے اثرات اُمت میں بلاشک وشبہ پیدا ہوئے۔ خصوصا اُن مشکل حالات میں جبکہ اسلامی تصورات دُھندلا چکے تھے۔

اِسی طرح اُن کا وہ خطرناک فتویٰ ہے جو انھوں نے سود کی حلّت کے حوالے سے دیا جیسا کہ عقاد کا خیال ہے کہ اُن کی مستدل وہ آیت تھی جس میں سود کو فقط مرکب طریقے سے حرام کیا گیا۔

آخر کار **شیخ محمد عبدہ** نے دانستہ یا نادانستہ ایسا لائحہ عمل ترتیب دیا جس پر نام نہاد اصلاح کے داعیان جمع ہو گئے۔ وہ مغرب کا دامن پکڑنے، اسلام کو زندگی کے دائرے سے الگ کرنے اور اسلام کی ایک ایک کڑی کو بکھیرنے لگے حتی کہ نوبت بایں جارسید کہ اب جھگڑا فقط شخصی قوانین کے گرد گھومتا ہے۔ اسلام کے شخصی قوانین اسلامی شریعت کے آثار میں سے ایک بچی کھچی کمزور روشنی ہے۔ یہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق کی محض معاشرتی علامت ہے۔

محمد عبدہ سیکولر نہ تھے لیکن انکے افکار بلاشک وشبہ ایک ایسا حلقہ بناتے تھے جس کے ذریعے یورپی سیکولرزم اور عالم اسلام کا ملاپ ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے یہودی صلیبی منصوبہ بندی کرنے والوں نے اُن کے افکار کو بابرکت سمجھا اور اُن کو ایک پل بنا کر عالم اسلام میں تعلیم وتربیت کے سیکولرزم تک پہنچایا۔

انھوں نے دین کو اجتماعی زندگی سے الگ کر دیا، شریعت پر عمل کو باطل قرار دیا، جاہلی درآمد قوانین کو جاری کیا اور مغربی اجتماعی نظریات کو عالم اسلام میں داخل کیا۔ اور یہ سب کچھ اصلاح کے نام پر مکمل ہوا۔(۶۷۶)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عالم اسلام نے شیخ کے اصلاحی افکار کو عرب دنیا میں گھسنے والی سیکولر تبدیلی کے لیے ایک جواز قرار دیا۔

محمد مویلحی اپنے مکالمے عیسیٰ بن ہشام کے اندر کرداروں کی زبان سے کچھ باتیں واضح کرتا ہے۔

ایک کردار تعجب سے سوال کرتے ہوئے کہتا ہے: مصریوں نے شریعت کے مخالف نپولین کے قانون کو کیسے درست سمجھ لیا۔ دوسرا کردار جواب دیتا ہے: کیونکہ مفتی نے اللہ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔ (۶۷۷)

۱۹۰۲ء میں محمد عبدہ کا ہم عصر، ایک اصلاحی داعی عبدالرحمٰن الکواکبی ظاہر ہوا جو صحیح معنوں میں سیکولرزم کا پہلا داعی تھا۔ اس کی فکر عین یورپی مفہوم کے مطابق تھی۔ وہ کہتا ہے:

''اے قوم: میری مراد وہ قوم ہے جو غیر مسلم ہے اور ض والے الفاظ بولتی ہے (یعنی عرب)۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ آپس کے کینے اور جھگڑے بھلا دو۔ ہمارے آباؤ اجداد نے جو قصور کیے اُن کو بھلا دو۔ انقلابیوں کے ہاتھوں جو کچھ ہو چکا ہے وہ کافی ہیں۔ میں تمھیں جلیل القدر سمجھتا ہوں، اس لیے تم یقیناً اتحاد کے وسائل اختیار کرو گے کیونکہ تم اوّلین روشن خیال ہو۔

دیکھو یہ یورپ اور امریکہ کی قومیں ہیں جن کو جدید علوم نے دین سے ہٹ کر وطنی اتحاد کی راہ دکھلائی ہے۔ نسلی اتحاد نہ کہ مذہبی، سیاسی تعلق نہ کہ ادارتی۔۔۔

ہمیں فقط دنیا کی زندگی کی تدبیر کرنی چاہیے، ادیان آخرت کی بات کرتے ہیں تو وہ فقط آخرت پر ہی اکتفا کریں۔ ہمیں ایک ہی کلمہ مشترکہ پر جمع ہونا چاہیے یعنی امت کو جینے دو، وطن کو جینے دو، ہمیں آزاد اور عزت دار رہنے دو''۔ (۶۷۸)

ان دونوں افراد کے پیچھے منتشر خیالات کے حامل صحافیوں اور لکھاریوں کی ایک بڑی تعداد لگ گئی، اُن میں بعض اسلام کے دعوے دار تھے اور بعض دیگر لوگ تھے۔ یہ سب مطالبہ کرنے لگے کہ دین کو سیاست سے الگ کیا جائے، دین کو عملی زندگی سے دور کیا جائے، یہی مشرقی مشکلات کا واحد حل ہے۔ مستشرقین کی زہریلی فضا اور عیسائی مشنریوں کی تلبیسات کا بھی گہرا اثر تھا۔

اسلامی شریعت کو مکمل طور پر حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ تشکیک کے پے در پے اعلانیہ حملوں میں یہ تک کہا گیا کہ شریعت عصر حاضر کے تقاضوں اور ترقیوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ جن بڑے موضوعات پر حملے کیے گئے، یہ ہیں:

① **اقتصادی پہلو**۔ مفاد پرستوں نے بہت کوشش کی کہ محمد عبدہ کے فتوے کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں تا کہ یہ پہلو مکمل طور پر شریعت سے ہٹ جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے حنفی ناصف کو استعمال کیا۔ جس نے کہا کہ فائدہ پر مبنی سود، حرام سود کی قسم میں سے نہیں اور مصر کی پسماندگی کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مغربی طریقے پر بنک قائم نہ ہو سکے۔ پھر اُس کے بعد دیگر لوگ بھی یہی کہتے رہے حتیٰ کہ ازہر کے بعض نامور شیوخ نے فتویٰ صادر کیا کہ سود حلال ہے۔ اور یہی رائے ان لوگوں کی ہے جو آج کل عصری رجحانات کے حاملین کہلاتے ہیں۔ (۶۸۰)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

عملی طور پر اس اہم میدان سے شریعت کو معزول کیا جا چکا تھا لیکن اہل غرض یہ چاہتے تھے کہ اپنے افعال کے جواز میں وجہ گھڑ لی جائے۔

② **معاشرتی پہلو**۔شریعت نے عورت کے بارے میں جو موقف اختیار کیا ہے، محمد عبدہ کے افکار نے اُس پر حملہ کیا۔اس موضوع کی تفصیل اللہ کے حکم سے آگے پر آئے گی۔

سب سے زیادہ اساسی موضوع غیر اللہ کی حاکمیت کا مسئلہ تھا یعنی شریعت کو سیاست وعدالت سے الگ کرنا۔محمد عبدہ کے بعد اِس کی الگ ایک تاریخ ہے۔

استعمار نے عملی طور پر شریعت کو زندگی سے الگ کر دیا بلکہ اس موضوع پر بھاری بھرکم پردے ڈال دیے۔ انھوں نے مختلف سیاسی پارٹیوں کی کاشت کی جن کا اجتماعی جھنڈا یہ تھا کہ اسلام اور اس کی حاکمیت کی دعوت ہمارا موضوع نہیں۔

جب **مصطفیٰ کمال** نے ۱۳۴۳ھ میں خلافت کا خاتمہ کیا تو عالم اسلام کی عمومی کیفیت ہولناک صدمے والی تھی۔ایسی صورت حال میں ایک از ہری شخص مشکوک اور عجیب وغریب فکر لے کر ظاہر ہوا، شمتز (۶۸۱) مستشرق اُس کے بارے میں کہتا ہے: کمال اتاترک نے جو فعل سرانجام دیا۔اس کا مسلمانوں کے احساسات پر بڑا گہرا اثر تھا۔اِس اثر کو کمزور یا ختم کرنے کے لیے جس شخص کا بہت بڑا کردار تھا۔وہ **علی عبدالرزاق** تھا جس نے کتاب ''اسلام اور اصول حکومت'' لکھی۔

عبدالرزاق نے اپنی کتاب کے اندر مستشرقین کا اسلوب اختیار کیا یعنی فکر کو موڑنا توڑنا، نصوص کو سیاق و سباق سے کاٹنا اور کمزور روایات کو باہم ملانا، باطنی طریقے کے مطابق بعید تاویل کرنا وغیرہ۔اس نے آمر حکمرانوں کی سیرتوں کا کچھ حصہ بیان کیا اور اپنے ہم نوا افراد کے کچھ اقوال ذکر کیے۔یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسلام بھی تحریف شدہ مسیحیت کی طرح انسان اور رب کے مابین ایک روحانی تعلق ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اُس نے عجیب مغالطے ظاہر کیے ہیں۔

عبدالرزاق نے ہمیں کچھ بڑے مراجع بھی بتائے ہیں تاکہ جو کچھ وہ بیان نہ کر سکا وہ دیگر مقامات سے مکمل کیا جا سکے۔وہ اپنی کتاب میں ہی لکھتے ہیں:

اگر آپ مزید تفصیل پڑھنا چاہتے ہیں تو علامہ سر تھامس آرنلڈ کی کتاب الخلافۃ کی طرف رجوع کریں۔ اس کے دوسرے اور تیسرے باب میں مفید اور تسلی بخش بیان ہے۔(۶۸۲)۔پھر وہ کہتا ہے:

عیسیٰ بن مریم نے قیصروں کی حکومت کے بارے میں کہا تھا کہ قیصروں کو وہ دو جو قیصروں کا ہے۔۔۔ اور جو کچھ نبوی احادیث میں امامت، خلافت اور بیعت وغیرہ کے بارے میں آیا ہے، وہ فقط اسی بات پر دلالت کرتا ہے جو مسیح علیہ السلام نے قیصر کی حکومت کے بارے میں شرعی حکم بیان کیا۔(۶۸۳)

وہ کہتا ہے: اگر فقہا امامت وخلافت سے مراد وہ چیز لیتے ہیں جس کو سیاست کے علما حکومت کہتے ہیں تو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُن کی بات کا صحیح مطلب یہ ہے کہ فقط دینی شعائر قائم کیے جائیں اور رعایا کی اصلاح کی جائے اور یہ دونوں باتیں خلافت یعنی حکومت پر موقوف ہیں، چاہے اُس کی صورت اور نوعیت جو بھی ہو، مطلق یا مقید، انفرادی ہو یا اجتماعی، استبدادی ہو یا دستوری وشورائی، ڈیموکریٹک، اشتراکی یا بالشویک، اُن کے پاس دینی شعائر کو قائم کرنے سے بڑھ کر کوئی دلیل نہیں، اگر وہ خلافت سے مراد حکومت اسلامی کی ایک خاص قسم لیتے ہیں تو اُن کی دلیل ان کے دعوے سے قاصر ہے اور اُن کی حجت قائم نہیں ہوتی۔ (۶۸۴)

ہم شکوک وشبہات سے لبریز اس کتاب کو مکمل طور پر پیش نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن یہ اشارہ ضرور غور طلب ہے کہ اس کتاب کے دور رس نتائج پیدا ہوئے۔ اِس کے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں کیے گئے اور اِس کو اسلامی مباحث کے لیے ایک قابل اعتماد مرجع کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کی تقریظ اور تعریف پر مغرب کے ماہرین نے قلم اٹھایا۔ اُن کی کتابوں میں اِس کے اثرات خوب ظاہر ہوئے۔ (۶۸۵)۔ استعمار کے دلال لکھاری اور صحافی خوشی سے جگمگا اٹھے کہ ایک روشن خیال آزاد فکر عالم کی طرف سے کتاب سامنے آئی۔ بعض نے اِس کتاب کو عصری فکر کا ایک اہم مرحلہ قرار دیا۔۔۔ وغیرہ

سیاسی جماعتوں نے اِس کے اندر اپنی گم شدہ میراث کو پایا چنانچہ وہ لادین مشرقی یا مغربی رجحانات سے اپنی نسبتوں کو اعلانیہ ظاہر کرنے لگے، اور دین اور اُس کے نام لیواؤں سے برات کرنے لگے۔ جو کتب ردّ میں تالیف کی گئیں اُن کو استعماری طاقتوں نے محصور کر دیا اور میڈیا کے وسائل نے اُن کو نظر انداز کر دیا۔ اُن کی آواز فقط ایک مختصر اور مخلص گروہ پر ہی ظاہر ہوئی۔

جب خلافت کا خاتمہ کیا گیا تو عالم اسلام کے اکثر اجزا استعمار کے ماتحت تھے اور اُن کی مکر وفریب پر مبنی منصوبہ بندی نہایت باریک بینی سے نافذ کی جا رہی تھی۔ اسلامی جہاد کی تحریکیں ہر علاقے میں ایک نئی اسلامی روح بیدار کرنے اور استعمار کے پنجوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھیں۔

مصر جدید عالم اسلام کی قیادت کا اہل تھا لیکن استعمار نے اپنا بکھرا کام سمیٹا اور مصر کو قیادت سے الگ تھلگ کر دیا۔

اسلام اور سیاست وحکومت کے مابین تعلق میں ایسی خرابی ظاہر کی گئی جس کو بیان کرنے والے عیسائی لکھاری تھے جیسے اسلام موسیٰ، لوئس عوض اور کچھ ایسے لوگ جو اسلام کا دعویٰ کرتے تھے۔

اسلام کے دعوے دار اشخاص میں ایک نمایاں نام **خالد محمد خالد** کا تھا۔ اُس نے اُسی بات کو ہدف بنا کر لکھنا شروع کیا جو اس سے پہلے علی عبدالرزاق لکھ چکا تھا لیکن اُس کا قلم زیادہ طاقتور اور جدید اسلوب کا حامل تھا۔ (۶۸۶)

اس سے پہلے شیخ **عبدالمتعال السعیدی** نے قرآن وسنت سے ثابت شدہ اسلامی حدود کو منہدم کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ حدود کے نفاذ کا حکم فقط مستحب ہے، واجب نہیں اور امر مستقل تکرار کا تقاضا نہیں کرتا اور اس کے علاوہ لغویات ذکر کی گئیں۔ (۶۸۷)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر اُس کے بعد کئی افکار ظاہر ہوئے جو جاہلی قوانین اور مغربی سیاسی منہج پر قائم تھے۔ اسی طرح ابلاغ کے وسائل بالخصوص صحافت نے اِن افکار کو نشر کرنے میں خوب حصہ ڈالا حتی کہ شریعت کی اجنبیت مستحکم ہوگئی اور دفاع کرنے والوں کی آواز پست ہوگئی بلکہ وہ عوام کی نظر میں پس ماندگی اور رجعت کی علامت بن گئے۔ (۶۸۸)

بعض لوگوں نے اس قول پر اکتفا کیا کہ دین عملی زندگی کے لیے ضرور ہے لیکن اس وقت اسلامی سیاسی فکر مشکلات کا شکار ہے اور اسلامی فقہ اور مغربی قوانین دونوں سے اخذ و اقتباس میں کوئی حرج نہیں۔ (۶۸۹)۔ اس قسم کے لوگوں میں فتحی عثمان، عبدالرزاق سنہوری، اور عصری مکتب فکر ہے۔

یہ فکری صورت حال تھی، جہاں تک عملی صورت حال کا تعلق ہے ہمارا آج کا مشاہدہ بہترین دلیل ہے کہ سیکولرزم نے اسلامی زندگی میں کیا طوفان بدتمیزی قائم کیا ہوا ہے۔ ڈیموکریسی اور اشتراکی تجربات کی ناکامی کے باوجود وسیع و عریض اسلامی علاقہ مختلف لادین افکار، نظاموں اور نعروں میں حیران و سرگرداں ہے۔ شریعت فقط عملی زندگی سے غائب نہیں ہوئی بلکہ شعور اور وجدان سے بھی غائب ہوگئی۔ جدید سیکولر نظام تعلیم اور میڈیا کے اثرات کے تحت مسلمان سیکولرزم کو مکمل سمجھے بغیر، اپنے مظاہر میں آخری حد تک سیکولر بن چکے ہیں۔ یہ سب کچھ ان کوششوں کا ثمرہ ہے جو مغرب نے عالم اسلام میں اپنی تہذیب پھیلانے میں کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے بحیثیت عقیدہ اپنی قوت اور غلبہ کو اتنا زیادہ نقصان کبھی نہیں پہنچایا۔

اسلام اجتماعی زندگی میں ایک غالب قوت کی حیثیت سے اپنا مقام و مرتبہ کھو چکا ہے۔ کچھ ایسے عوامل جو اسلامی تعلیمات کے صریح معارض ہیں، اسلامی معاشرہ میں مکمل طور پر راسخ ہو چکے ہیں۔

ماضی قریب میں مسلمانوں کے لیے اسلام کے مخالف کوئی سیاسی رجحان نہ ہوتا تھا۔ دینی ادب کے علاوہ کسی ادب کا تصور بھی نہ تھا۔ دینی عیدوں کے علاوہ کوئی تہوار نہ ہوتے تھے۔ وہ خارجی دنیا کو فقط دین کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اُن کے لیے ہر چیز کا پیمانہ دین تھا۔

لیکن اب وہ اپنی محدود دنیا سے پرے بھی نظر ڈالتے ہیں۔ وہ مختلف رنگوں پر مشتمل ایسے مباحث پڑھتے ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اُن میں دینی نقطہ نظر سرے سے لائق اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ عام مسلمان سمجھتا ہے کہ اسلامی شریعت انسانی مشکلات کو حل کرنے میں فیصلہ کن کردار ادا نہیں کرتی۔ وہ ایسے معاشرے میں زندہ رہتا ہے جس میں مغربی شہری قوانین کی حکمرانی ہے۔ وہ اِن قوانین کے اصول و مصادر کو نہیں پہچانتا لیکن اُن سے جڑا ہوا ضرور ہے، ہاں البتہ وہ یہ ضرور جانتا ہے کہ یہ قوانین قرآن سے ماخوذ نہیں۔

اِس طرح قدیم دینی تعلیم، روحانی ضروریات کو پورا کرنے کی اہل نہیں رہی چہ جائیکہ وہ اجتماعی ضروریات کو مکمل کرے۔ البتہ اِس دوران دنیوی ضروریات اور مصالح کو بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ اسلام مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں اپنی قوت کھو چکا ہے۔ اسلام کے اثر و رسوخ کا دائرہ تنگ ہوتے ہوتے یہاں تک سکڑ گیا ہے کہ یہ فقط چند رسوم و رواج میں محدود ہو گیا ہے اور یہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے بتدریج پیش آیا۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بہت معمولی تعداد نے پہچانا کہ ہماری اجتماعی زندگی کس طرح بتدریج خوف ناک تنزلی کا شکار ہے۔ جن لوگوں نے سیکولرزم کو سوچ سمجھ کر اپنایا، وہ بہت ہی کم تھے۔ اب یہ تبدیلی اتنی گہری ہو چکی ہے کہ واپس پلٹنا ممکن نہیں رہا۔ مغربی تعلیم کی حاجت اور مغرب سے استفادے کی ضرورت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس رجحان کو روکنا ناممکن نظر آتا ہے۔ یا اسلام کو اُس پہلے والی صورت پر واپس لایا جا سکے جس میں اسلام کو مکمل غلبہ حاصل تھا اور اسلامی سیاسی و معاشرتی زندگی سرے سے سوالیہ نشان بنتی ہی نہ تھی۔

گب کی بات یہاں ختم ہوتی ہے کہ عالم اسلام ایک مختصر وقفے کے بعد عن قریب اپنے تمام مظاہر حیات میں سیکولر بن جائے گا۔ (۶۹۰)

وہ ہماری سابقہ بات پر اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

یہ بات تو فطری ہے کہ اسلام باقی رہ گیا ہے۔۔۔ لیکن یہ ریاست کا فقط رسمی دین ہے۔ اِس کے قوانین چھین لیے گئے۔ اسلام اُسی مقام پر اتر آیا ہے جو یورپی ریاستوں میں مسیحی دین کی ہے، البتہ مختلف اسلامی ممالک میں اسلام کے رسمی دین ہونے میں فرق ہے۔ (۶۹۱)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۷

نظام تعلیم میں سیکولرزم

جب متمدن مغرب کا پس ماندہ مشرق سے تصادم ہوا تو اُس وقت مسلمانوں کا نظام تعلیم اسلوب و موضوع میں پس ماندہ تھا اور اُس کی علمی سطح جامد و محدود ہو چکی تھی۔

امت مسلمہ کا علمی ورثہ اس بچے کھچے حصے پر مشتمل تھا جس کو اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں علمائے کلام، فقہ اور لغت نے مدون کیا تھا۔ مغرب میں اس باقی ماندہ ورثے کو زرد کتب، روایتی ثقافت یا اصلی قدیم ثقافت کا نام دیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ باقی ماندہ ورثہ اسلامی تعلیم کے ایک پہلو کو تو تشکیل دیتا ہے لیکن وسیع تناظر میں دیکھیں تو یہ حقیقی تصور اسلامی پورا کرنے سے قاصر ہے۔ یقیناً اس ورثہ کو اسلامی تعلیم کی مثالی اور کامل صورت قرار دینا درست نہیں اور فقط ایک پہلو سے اسلام پر حکم لگانا یقینی خطا ہے۔

اسلامی تصور میں علم کا مفہوم کیا ہے؟ ہم اس پر بات نہیں کرنا چاہتے لیکن اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا علمی معیار پچھلی صدی میں علم کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہا بلکہ بعض حالات میں علم کے صریح منافی رہا۔

مصر کے نظام تعلیم میں سیکولر رجحانات کا ارتقا

جامعہ ازہر میں اپنی تاسیس کی ابتدا سے ہی بڑے بڑے حلقوں کے اندر فلکیات، الجبرا، انجینرنگ اور طب پڑھائی گئی جیسے فقہ، نحو اور حدیث پڑھائی گئی۔ دونوں قسم کے علوم کی تعلیم برابر تھی اور بغیر حرج کے تھی۔

یہی صورت اُس زمانے تک رہی جو زیادہ دور نہیں۔ جبرتی اپنی تاریخ میں بہت سارے نام وارد کرتا ہے جو اِن علوم میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق نابغہ روزگار تھے۔

اُن میں ایک ان کے والد بھی تھے۔ اگرچہ اُن کا معیار ہمارے معاصر مغرب کی صورت حال سے کم تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی یہ لوگ ایک شکست و ریخت کی شکار تہذیب کے باسی تھے جو زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں اہل مغرب ایک نوجوان تہذیب کا ہراول دستے تھے۔ اسلامی تہذیب کے بتدریج کملا جانے سے علم کا میدان سکڑ گیا اور فقط اُن ضروری علوم پر اکتفا ہو گیا جن کے بغیر اسلامی معاشرے کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ دیگر علوم حرام قرار دیے بغیر بے کار چھوڑ دیے گئے، اُس دور میں عالم اسلام کو زندگی کے ہر میدان میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

عاجزی اور کمزوری کا سامنا تھا۔

علمی جمود کے دور میں ایسی نسلیں تیار ہوئیں جنھوں نے اپنی لاچاری اور کمزوری کو مختلف بہانوں سے درست قرار دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے علمی کوتاہی کو جائز قرار دیا، دین کی محدود اور تنگ تفسیر کی اور علوم کو اپنے تاریک دور کے پس منظر میں محدود کر دیا۔ حالانکہ دین کی حقیقت اور جوہر کے اعتبار سے علوم کی تحدید نہ ہو سکتی تھی۔

ان ادوار میں جبکہ امت کے مراکز پستی کا شکار تھے، انھیں نپولین کے ہاتھوں ایک سخت تھپڑ کھانا پڑا جو کہ کافر مغربی تہذیب کا ہراول دستہ تھا۔ اِس ضرب نے امت کو خواب غفلت سے بیدار تو کر دیا لیکن وہ درست راہ عمل کو تلاش نہ کر سکی۔

مسلمانوں نے اپنی آنکھوں سے جدید وسائل کو دیکھا، جدید علوم کی نسبت سے وسیع امکانات کا مشاہدہ کیا اور مسلسل بحث و تمحیص نے امکانات کو تقویت بھی دی۔ عقلاً ممکن تھا کہ مسلمان اپنے مشاہدات کے بل بوتے پر اٹھ کھڑے ہوتے لیکن انھوں نے عملاً ایسا نہ کیا۔ اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔

① وہ جدید علوم کی اہمیت کو کما حقہ پہچان نہ سکے۔

② یہ جدید علوم وحشی صلیبی حملے کے زیر سایہ اسلامی ممالک میں داخل ہوئے اور اِس حملے کے تحت جامعہ ازہر کی حرمت کو پامال کیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اِن علوم سے نفرت کی اور مطلق طور پر رد کر دیا۔

ازہر کے علوم اور مغرب کے علوم کے درمیان شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ ازہری علوم کا خیال تھا کہ وہ اسلامی ثقافت کی بہترین نمائندگی کر رہے ہیں اور اُن کے گمان کے مطابق مغربی علوم خاص کافروں کے علوم تھے۔ تقریباً اس تاریخی خطا کے نتیجے میں عالم اسلام کے اندر علوم کی دوئی پیدا ہوئی۔

۱۔ دینی تعلیم جو تنگ اور محدود تھی۔ ۲۔ لادینی تعلیم جو غور فکر کی تمام سرگرمیوں پر مشتمل تھی۔

محمد علی نے ابتدا میں ہی کوشش کی کہ وہ جدید تعلیم کو ازہر کے تعلیمی نصاب میں داخل کرے لیکن وہ ازہریوں کی مزاحمت سے ڈر گیا۔ چنانچہ اُس نے اپنا الگ جدید تعلیمی نظام پیدا کیا۔ اس طرح مصر میں تعلیم دو نظاموں میں تقسیم ہو گئی۔ (۱) دینی نظام تعلیم۔ (۲) جدید شہری نظام تعلیم۔ (۶۹۲)

جب شیخ ازہر اور جومار (بیرون ملک بھیجے جانے والے طلبا کا فرانسیسی نگران) کے درمیان ملاقات ناممکن تھی۔ تو اُن دونوں کے پیروکاروں اور اُن کی تعلیم کے درمیان کشمکش ناگزیر تھی۔ جومار کے فرزندوں کا خیال تھا کہ ازہر کا خاتمہ ایسے ہو سکتا ہے کہ اسے جامد رہنے دیا جائے اور جدید زندگی کی تبدیلیوں سے الگ تھلگ رکھا جائے۔

انھوں نے **خدیو اسماعیل** (۱۸۷۲ء) سے مطالبہ کیا کہ ازہر کی تنظیم اور اصلاح کا خاص قانون صادر کیا جائے۔ اس میں فقرہ (ب) کی عبارت اس طرح ہے۔

ازہر میں فقط گیارہ مضامین کی تدریس کی حد بندی کی جائے: یعنی فقہ، اصول الدین، توحید، حدیث، تفسیر، نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع، منطق۔ (۶۹۴)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علمائے ازہر کی اپنی دلی خواہش بھی یہی تھی۔اس طرح ازہر کی اصلاح کی جامع کوشش کا راستہ روک لیا گیا۔ جدید سکول جن کو محمد علی اور اُس کی اولاد نے قائم کیا، کی سرگرمیاں وسیع تھیں اور اِس کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھیجے جانے والے طائفے بھی جاری رہے۔

اس سے بھی سخت معاملہ اُن وسائل کا تھا جو دونوں نظاموں نے اختیار کیے۔ دینی نظام تعلیم اپنے نام کے مطابق چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کی شکل میں مختلف بستیوں اور شہروں کے اندر ابتدائی مراحل کے لیے قائم تھا اور بڑے مراحل کے لیے جامعہ ازہر تھا۔

ان منتشر ٹکڑیوں میں فقہا تعلیم دیتے جو کتاب کے ذریعے طریقہ تدریس میں معروف تھے۔ بچے اُن کے اردگرد کھلے سرسبز علاقوں میں قدیم تختیاں اور مصاحف اٹھا کر جمع ہو جاتے۔فقیہ ان کے درمیان عمامہ باندھ کر اور ہاتھ میں لمبا عصا تھام کر تعلیم دیتا۔ وہ ایسے طریقے سے تلقین کرتا تھا جس کی روح قرونِ اولیٰ سے منقول اسلامی تربیت سے مختلف ہوتی تھی۔قرونِ اولیٰ کے تربیتی اسالیب اپنے دور میں دنیا کے ترقی یافتہ اسالیب تھے۔

جامع مسجد کے طالب علم برآمدوں میں بوسیدہ چٹائیاں بچھا کر حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے۔اُن کے درمیان ایسا شخص صدارت اختیار کرتا جو اپنی ہیئت میں کتابی مدرس سے مختلف نہ ہوتا تھا۔(۶۹۶)

جب طالب علم اپنا نصاب تعلیم مکمل کر لیتا تو اس کی سند شیخ اپنے ہاتھ سے تحریر کرتا اور اپنے شاگردوں کو وسیع و عریض القاب سے نوازتا۔

اس تعلیم کے اخراجات نیک مخیّر حضرات اور سرکاری اہل کاروں کے صدقات، اوقاف اور تحائف سے پورے کیے جاتے۔یعنی قدیم نظام تعلیم فقط غیر منظم ہی نہ تھا بلکہ اس میں فخر و ریا اور احسان پروری کا طریق کار بھی شامل تھا۔

اس کے برعکس سکول کے جدید نظام تعلیم میں:

سکولوں کے لیے عالیشان عمارتیں، جدید وسائل، مضبوط بجٹ اور نئے طریق ہائے کار تھے۔ان سکولوں کو فرانس کے ماہرین چلاتے جو اپنے مظاہر اور تصرفات میں جدت اور تہذیب سے آراستہ ہوتے تھے۔

اہم ازہر کے نظام تعلیم کو چھوڑتے ہیں جو شاید اپنے جمود کے سبب ختم ہو جائے۔ہم لادینی تعلیم کا سفر اور اُس کے فکری رجحانات کو دیکھتے ہیں۔

گب کہتا ہے: سب سے پہلا دروازہ جس سے یورپی فکر لپک جھپک کر مصری معاشرے میں داخل ہوئی وہ پیشہ ورانہ سکول تھے جن کو محمد علی نے پروان چڑھایا اور وہ علمی طائفے تھے جو یورپ میں جدید تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔

وہ ذکر کرتا ہے کہ اِن اداروں میں ایک زبانوں کی تعلیم کا ادارہ تھا جس کے نگران منفرد عالم رفاعۃ طہطاوی (۱۸۰۱۔۱۸۷۳ء) تھے اور وہ جناب طومار کے شاگرد تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

محمد علی کے بعد مغرب زدگی کی دوسری لہر خدیو اسماعیل کے دور میں اٹھی۔ اس دور کی علمی تحریک میں نمایاں نمائندے محمد عثمان جلال (۱۸۲۹۔۱۷۹۸ء) رفاعۃ کے شاگرد تھے۔ اس کے ادبی کارناموں میں سب سے نمایاں کام بعض مشہور فرانسیسی تالیفات کے ترجمے تھے مثلاً پول وفرجینی، خرافات لافونٹین، مولیبر کے طنز ومزاح وغیرہ۔ اس کے قابل ستائش کام میں نمایاں بات بذات خود ترجمہ نہیں بلکہ اُس تجدید روح کی بیداری ہے جو پہلے نظر نہیں آتی۔

اس نے لافونٹین کے ایسے منظوم آسان ترجمے کیے جن میں کوئی تصنع یا کمزوری نہ تھی۔ لیکن جب اس نے مولیبر کے طنز ومزاح کا ترجمہ کیا تو مصر کے عوامی لہجے کو اختیار کیا۔ ابھی وقت اِس جرات مند اقدام کا نہ تھا لیکن اس اقدام کے نتیجے میں ماضی کی قید سے مکمل آزادی کی طرف کئی قدم بڑھے۔ معاصر خدیو، خدیو اسماعیل کہتا ہے: مصر یورپ کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ اس لیے مصری ادب کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایشیائی اور افریقی تقلیدی بندھنوں سے آزادی حاصل کرے۔ (۶۹۷)

ابتدا میں مغرب زدگی فرانسیسی رجحانات کی حامل تھی لیکن جب مصر پر انگریز قابض ہوا تو یہ انگریزی تحریک بن گئی اور گہرے اور وسیع رجحانات کی حامل ہوگئی۔ انگریزی استعمار نے اُسی چیز کو ہدف بنایا جو لارڈ میکالے نے ہندوستان کے بارے میں ذکر کیا تھا:

ہم پر لازم ہے کہ ہم ایسا گروہ تیار کریں جو ہمارے درمیان اور ہماری لاکھوں رعایا کے درمیان ترجمان ہو۔ یہ گروہ رنگ اور نسل میں ہندوستانی ہوگا لیکن ذوق، رائے، زبان اور انداز فکر میں انگریز ہوگا۔ (۶۹۸)

استعمار جیسا کہ ہندوستان کے ایک شاعر نے کہا ہے کہ فرعون سے زیادہ ذہین تھا فرعون نے بچوں کو قتل کرنے کی سازش کی لیکن وہ ایسے سکول اور کالج نہ کھول سکا جن سے بچے قتل بھی ہوتے اور انھیں پتا بھی نہیں چلتا۔ استعمار نے یہ کام کر دیکھایا۔ (۶۹۹)

استعمار نے عالم اسلام کے بڑے بڑے ثقافتی مراکز میں قلب وقالب کے اعتبار سے مغربی سکول کھولے اور اصلی تعلیم کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے منصوبہ بندیاں کیں۔ ان تعلیمی اداروں میں وہ مشنری عیسائی کالج بھی تھے جو لاہور، بیروت، استنبول، قاہرہ میں کھولے گئے اور زیادہ واضح شکل میں مغربی علاقوں میں کھولے گئے۔ اِس میں کوئی شک نہیں اِن تعلیمی اداروں کا لادین رجحانات تشکیل دینے میں زبردست فکری کردار تھا اور اِن کے ذریعے سے ہی دینی تعلیم اور لادین تعلیم کے درمیان خلیج وسیع ہوئی۔ استعمار نے اِن فکری وادبی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کی جن کو عیسائیوں، خاص طور پر شامیوں نے کھڑا کیا۔ مصر وشام کے عیسائیوں کی ادبی کمیٹیاں اور جریدے مغرب سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ اصلی تعلیم کو گھیرنا اور اُس کو مغلوب کرنا اُن کا مشن تھا۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ خطرناک منصوبہ وہ تھا جس کو کرومر اور اس کے وزیر پادری ڈنلوپ نے مصر میں وضع کیا۔ اس مقصد کے لیے اُس نے اپنے دور کے بہترین نفسیاتی وتربیتی حربے استعمال کیے تاکہ غلامی کے قابل مسخ شدہ نسل تیار کی جا سکے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ڈنلوپ نے ابتدائی درجے کے سرکاری ادارے کھولے جن میں شہری علوم پڑھائے جاتے اور انگریزی زبان سکھلائی جاتی جو کہ استعمار کی زبان تھی۔ یہ ادارے ایسے کلرک پیدا کرتے جو انگریز کے انتظامی دفاتر میں کام کرتے۔ وہ ایسی تنخواہیں حاصل کرتے تھے جو روپوں میں ہوتی تھی نہ کہ سکوں میں۔

ہمیں مزید تفصیل اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنی بات کافی ہے کہ جامعہ ازہر میں اپنے بیٹوں کو فقط وہی لوگ بھیجتے تھے، جو فقیر ہوتے اور ضروری اخراجات پورے کرنے پر قادر نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مضبوط مستقبل فقط سرکاری نوکری میں ہے جہاں استعماری سرداروں کی زبان بولی جاتی ہے۔

جو صاحب قدرت تھے، وہ جامعہ ازہر سے الگ ہو گئے اور انھوں نے سرکاری تعلیمی اداروں کا رخ کیا حالانکہ انھیں باطنی اسلامی حس پریشان بھی کرتی تھی کہ یہ کافر تعلیمی ادارے نہ تو قرآن سکھلاتے ہیں اور نہ دین۔ یہ طالب علموں کا نیا طبقہ تھا جو اوّلاً غلام نسل سے تھا لیکن اُن کا مقصد حکومت کی نوکری تھا۔ استعماری اقتدار نے اُن کو وقتاً فوقتاً ظاہری طور پر یا باطنی طور پر شاباش کی تھپکیاں دیں۔ (۷۰۰)

ڈنلوپ نے جان بوجھ کر فاسد نظام تعلیم کا اسلوب اختیار کیا لیکن اُس نے اپنے تعلیمی اداروں کو دین سے کلی طور پر خالی نہ کیا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو بہتر ہوتا۔ اُس نے **دینیات کا مضمون** مقرر کیا لیکن وہ تعلیمی نصاب میں ثانوی درجہ کا مضمون تھا اور اُس کا دورانیہ یومیہ اسباق کے آخر میں رکھا جاتا، جب سب طالب علم تھک چکے ہوتے اور سکول کی تنگ فضا سے کشادہ سڑک اور کھلے گھر کی طرف کھسکنے کی کوشش میں ہوتے۔ دینیات کا سبق سکول کے سب سے بوڑھے استاذ کے سپرد کیا جاتا جو کھانستا اور تھوکتا رہتا اور فانی زندگی کی زندہ مثال پیش کرتا۔ اِس طرح طلباء کے وجدان میں ''دین'' عاجزی، فنا اور بڑھاپے سے جڑ گیا اور تھکاوٹ، مصیبت اور نفرت سے منسلک ہو گیا۔ (۷۰۱)

اسی طرح کے خبیث مقصد کے لیے ''**عربی زبان کا مضمون**'' بھی رکھا گیا۔ صورت حال یہ تھی کہ انگلش زبان کے مدرس کے لیے بارہ ہزار روپے کا ماہانہ وظیفہ تھا تو اُس کے ساتھی عربی زبان کے مدرس کو فقط چار ہزار روپے ملتے۔ اِس چیز نے دونوں کے درمیان معاشرتی مقام و مرتبہ کا خاصا فرق ڈال دیا اور عربی زبان کو حقارت و کراہت کے قابل بنا دیا۔ (۷۰۲)

لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ صورت حال اُن تعلیمی نصابوں کے اندرون میں تھی جو سرکاری تعلیمی اداروں میں پڑھائے جاتے۔ یہ نصاب اسلام پر طعن و تشنیع اور اسلامی تاریخ و تہذیب پر حملوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اِس کے مقابلے میں یورپی تاریخ و تہذیب کی تقدیس اور جلالت کو مبالغہ کی حد تک بیان کیا جاتا۔ اِن تعلیمی اداروں سے کچھ خاص چنیدہ طالب علم یورپ کی طرف اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجے جاتے۔ اور وہاں پر ذہنی مسخ کا عمل پایہ تکمیل کو پہنچتا۔ یہ سب طالب علم تیار کیے جاتے تاکہ یہ اپنے ملکوں میں واپس جا کر فکر و ثقافت کی کنجیاں سنبھالیں اور استعماری آقاؤں کے حسب منشا صورت گری کریں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی عمل مختلف ذرائع کے ساتھ شام اور بلاد مغرب میں فرانسیسی استعمار کے تحت کیا گیا۔ اس استعماری تربیت کا ایک ہی نتیجہ نکلا کہ ایسی نسل تیار ہوئی جو دین سے کٹی ہوئی تھی۔ مغرب اور اُس کے ثقافتی رجحانات پر فریفتہ تھی جو مختلف ہونے کے باوجود دین بے زاری کے نکتے پر متفق تھے۔ ولفریڈ کانٹھول مغربی ثقافت کی اثر پزیری کے بارے میں کہتا ہے:

عالم اسلام میں آزادی اور اباحیت کی تحریک زوروں پر نظر آتی ہے۔ اِس کا سب سے بڑا سبب مغرب کا عالم اسلام میں نفوذ ہے۔ یہ تحریک یورپ میں ۱۹ ویں صدی کے اواخر سے پہلی جنگ عظیم تک مختلف رنگ بدلتی رہی۔ یورپ کی بیداریوں اور ترقی کی صورت حال بھی یہی رہی تھی۔ کئی مسلمان نوجوانوں نے مغرب کی طرف سفر کیا۔ انھوں نے یورپ کی روح اور اقدار کا مشاہدہ کیا اور خاصے مرعوب ہوئے۔ یہ بات خاص طور پر اُن طالب علموں پر صادق آتی ہے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور روز بروز بڑھتے چلے گئے۔ یہ مغربی افکار و اقدار کو عالم اسلام میں منتقل کرنے کا سبب بنے۔ اِس دوڑ میں جو سب سے آگے رہے، وہ تعلیمی و ثقافتی ادارے تھے جو جدید مغربی طریقے پر سکہ بند ہوئے۔ مغرب نے عالم اسلام کی طرف جو کچھ منتقل کیا، اُن میں مختلف اہمیت کے حامل متعدد افکار، دقیق عقلی رجحانات اور جدید میلانات تھے جن کی نشر و اشاعت میں جدید مغربی تعلیم کا وافر حصہ تھا۔ اس سے بڑھ کر جن اداروں نے غضب ڈھایا وہ مغرب کے سیاسی اور اجتماعی حقوق کے جدید ادارے تھے۔ اِن اداروں میں سے بعض نے اپنا ایجنڈا جبراً نافذ کیا اور بعض نے مسلط ہونے کی فقط کوشش کی۔ مسلمانوں میں سے بعض نے اِس طوفان کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی اور بعض نے اِس کو خوش آمدید کہا۔ بعض نے مغربی تعلیم کے اثر کو رسمی طور پر قبول کیا اور بعض نے دل و جان سے مرحبا کہا۔ بہت سارے مسلمانوں نے اِن نظریات اور اداروں کو ایک مضبوط ثابت شدہ حقیقت کے طور پر قبول کرلیا۔ وہ بتدریج اُن کے ماتحت ہو گئے۔ اس طرح مغرب زدگی کا عمل نہایت تیزی اور قوت کے ساتھ جاری و ساری رہا۔ (۷۰۳)

استعمار کے غلبے کو کچھ مدت گزری تھی کہ عالم اسلام اپنے مختلف علاقوں میں مغربی فکر اور تعلیم کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

ترکی جہاں استعمار براہ راست کبھی قابض نہ ہو سکا۔ مغربی اثرات کے تحت عقیدہ و فکر کے شدید اوتداد کا شکار ہوا۔ اتاترک نے اسلام کو مٹانے کے لیے آہنی ہاتھ استعمال کیا۔ ہندوستان میں اسلامی ثقافت نے اپنی قیادت کھودی اور چھوٹے چھوٹے نجی اداروں میں گھر گئی۔ داخلی اور خارجی سطح پر کشمکش کی بھیڑ میں اُس کی اکثر مثبت سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں۔ عرب دنیا میں مغربی اثرات کی ترجمانی ٹوینبی نے کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام اور مغربی افکار کا فکری تصادم عرب دنیا میں اُس کامیاب طریقے سے نہیں ہو سکا جیسے ترکی میں ہوا۔ عرب دنیا کے نتائج ڈھیلے ہیں۔ وہ نہ مکمل مغربی ہیں نہ مکمل اسلامی۔ (۷۰۴)

ایک مستشرق کہتا ہے: ''قاہرہ میں دوسو سترہ چھاپے خانے ہیں۔ یہ ایک دن میں اتنا مواد چھاپتے ہیں جس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی مقدار ایک کتاب کے برابر ہوتی ہے۔ پھر وہ وضاحت کرتا ہے کہ اُن کا اکثر مواد مغربی ناولوں اور افسانوں کا ترجمہ ہے۔(۷۰۵)۔اس سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہمارا دوغلا پن کس سطح تک پہنچ چکا تھا۔امت عشق ومحبت کے افسانوں سے زیادہ اِس بات کی محتاج تھی کہ وہ عملی وتطبیقی علوم کے ترجمے کرتی۔ بیداری کے زیادہ بہتر اسباب اختیار کرتی۔

اس مسخ شدہ دوغلی ذہنیت سے کئی قسم کی دعوتیں اور برے نتائج پروان چڑھے۔ہم بطور مثال چند کا نیچے ذکر کرتے ہیں۔

ا۔مغربی تہذیب کو بغیر سوچے سمجھے اختیار کرنے کی دعوت: اس رجحان کو دوغلی فکر کے حاملین نے پروان چڑھایا۔''**مصر میں تعلیم کا مستقبل**'' کا مصنف کہتا ہے :

ہم اُن باتوں سے کہیں آگے بڑھ چکے ہیں جو میں نے بیان کی ہیں۔ہم یورپ سے اظہار عہد کریں کہ ہم سیاست میں اُس کے طریقے کی پیروی کریں گے۔اداروں میں اُس کے اسلوب اپنائیں گے۔قانون سازی میں اُس کے راستے پر چلیں گے۔آزادی اور امتیازات ختم کرنے کا معاہدہ جدید متمدن دنیا کے سامنے ایک صریح پابندی اختیار کرنے کا نام ہے کہ ہم سیاست،اداروں،اور قانون سازی میں اہل یورپ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اگر ہم یہ ارادہ کریں کہ ہم اپنے پرانے نظام کو زندہ کریں تو اُس کے لیے ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں۔ہم تو مغرب کے پیچھے چلیں گے اور اُسی کی خاطر ہر گھاٹی کو عبور کریں گے کیونکہ ہم ترقی اور پیش قدمی کے متوالے ہیں۔یورپ بھی ہماری مدد کرے کیونکہ ہم نے جدید تہذیب کے راستے میں اُس کے ہم راہ چلنے کا عہد کیا ہے۔(۷۰۶)

وہ تعلیم کے بارے میں خاص طور پر کہتا تھا:

بعض لوگ خالص شہری تعلیم کو ملک میں پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔اُن کا خیال ہے کہ قومی تعلیم میں دینی اجزا کا حصہ نہ ہو۔دینی تعلیم خاندانوں کے ذمے ہو اور ریاست اُس کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے۔جبکہ بعض دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ دینی تعلیم اُسی طرح واجب ہے جیسے زبان اور قومی تاریخ کی تعلیم کیونکہ دینی تعلیم بھی وطنی شخصیت کی تعمیر میں بنیادی جز ہے جس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔یہ بات بالکل واضح ہے کہ آخری رائے ہی مصریوں کا نظریہ ہے۔مصریوں سے اِس بات کا مطالبہ بالکل غیر معقول ہے کہ وہ اپنے علاقوں میں خالص شہری تعلیم کو قائم کریں اور دین کو خاندانوں کے سپرد کر دیں۔(۷۰۷)

اسی طرح **طہ حسین** اور **سلامۃ موسیٰ** اپنے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ اپنے ہم وطنوں کی طرح مشرقی انسان ہیں۔لیکن جب اُنہوں نے مشرق پر طعن وتشنیع کا آغاز کیا اور دیکھا کہ مشرق کی عادات ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں،انھوں نے مشرقی لوگوں کو دعوت دی کہ وہ مغربی لوگوں کی عادات اپنائیں تاکہ اُن کی طرح طاقت ور بن سکیں۔انھیں اس دعوت کی راہ میں کراہت اور نفرت کے کانٹے چننے پڑے۔انھیں محسوس ہوا کہ اُن کے درمیان اور معاشرہ کے درمیان بہت گہرا تناقض ہے جو اُن کے درمیان اور اُن کے ہم وطنوں کے درمیان دوری ڈال دے گا۔اُن کا اسلوب حیات،ثقافتی،سیاسی اور روحانی رجحانات معاشرہ کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عادات سے بہت دور ہے۔ وہ اپنے ہم وطن لکھاریوں سے بھی مختلف ہیں۔ اگرچہ وہ عربی میں لکھتے ہیں لیکن ان کی طرزِ فکر مکمل یورپی ہے۔

انہی لوگوں میں سے ایک احمد لطفی، اُن کے عزیز اسماعیل مظہر اور قاسم امین ہیں۔

② **اسلام کے گذشتہ ادوار کو حقارت سے دیکھنا اور اپنی نسل کو جدید لادین تربیت پر پروان چڑھانا:** ہم بطور مثال اس پر وہ بات پیش کرتے ہیں جو ''مصر اور اُس کا پیغام'' کے مصنف نے کہی ہے۔

جب عربوں نے مصر کو ۶۴۰ء میں فتح کیا تو انھوں نے دیکھا کہ بازنطینی سلطنت، قسطنطنیہ کے مقام سے ہی اُن پر حکومت کرتی ہے۔ اسی طرح جب نپولین نے مصر کو ۱۷۹۸ء میں فتح کیا تو اُس نے دیکھا کہ مصر پر عثمانیوں کی حکومت ہے جو قسطنطنیہ کے مقام سے ہی اُس پر حکومت کرتے ہیں، اگرچہ انھوں نے اُس کا نیا نام رکھ لیا ہے یعنی استنبول یا آستانہ۔ ۱۷۹۸ء کا حال، ۶۴۰ کے حال سے بہتر نہ تھا۔ لوگ تنگ دستی اور ذلت میں تھے۔ ملک کھنڈر بن چکا تھا۔

گویا اِس ملک کی تاریخ کے بارہ سو سال ضائع اور بے کار گزر چکے تھے۔ اتنے سال گزر گئے لیکن ہم اپنے وجود سے بے خبر سوئے رہے! کہا جا سکتا ہے کہ اسی دوران کئی ممالک اور اُن کی سربلندیاں قائم ہوئیں ۔۔۔ لیکن وہ سب کی سب ختم ہو گئیں۔ لیکن مصر والے اُسی طرح باقی رہے جیسے روم کے دور میں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصری تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔

مصر کی بارہ صدیاں کیوں ضائع چلی گئیں۔ یہ ہمارے لیے غور و فکر کا مقام ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی قدیم تہذیب و ثقافت سے دور ہو گئے (!) ہم نے مکمل طور پر مشرق پر انحصار کیا تو ہماری تاریخ کا تر از و خلل پذیر ہو گیا۔ اور اس طرح یہ عظیم خلا پیدا ہو گیا۔ (۷۰۹)

ان افکار کی روشنی میں مطالبہ کیا گیا کہ نئی نسل کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اس کا ماضی سے کوئی تعلق نہ رہے۔ ہم یہاں مجلس تربیتِ عربی کی نشریات میں سے کچھ حصہ پیش کرتے ہیں۔

ہم پر لازم ہے کہ عرب نوجوانوں کے نئے اوصاف پیدا کرنے کے لیے خاص عربی طرز کی تربیت، کام میں لائی جائے۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ ترکی اور استعماری دور کے ناکام عناصر کو جڑ سے اکھاڑا جائے۔ اِس کے بدلے میں متضاد خصائص پیدا کیے جائیں جن سے مستقبل قریب میں عرب قومیت وجود میں آئے۔ عرب باسیوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ترقی پسند شخص بنیں اور تغیر و ارتقا کے فلسفہ پر ایمان لائیں۔ عرب نوجوان کے لیے ضروری ہے کہ وہ مستقبل کا ذمہ دار بنے نہ کہ ماضی کا۔ آنے والی نسلوں کا ذمہ دار بنے نہ کہ بوسیدہ مردوں کا۔ (۷۱۰)

لیکچرر نے اسلامی تربیت کو روایتی تربیت کا نام دیتے ہوئے انتہائی حقارت بھری مثال دی۔ وہ کہتا ہے:

''بچہ کو غلاموں کی منڈی سے خریدا جاتا تھا۔۔۔ پھر وہ قلعہ میں داخل ہوتا۔ کچھ عرصہ گہری تلقین کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ماحول میں وقت گزارتا اور چند ہی سالوں کے بعد وہ اپنے اسلام کے لیے سخت متعصب مسلمان بن جاتا۔ اُس کے ساتھ ساتھ وہ غلام بھی ہوتا جو یہ عقیدہ رکھتا تھا کہ وہ اپنے آقا کی ملکیت ہے۔ کیونکہ اُسی نے اُسے خریدا ہے اور اس کی تربیت ہے۔۔۔۔"

پھر وہ چلتے چلتے یہ کہتا ہے: تلقین کا طریقہ تربیت کے لیے سب سے براطریقہ ہے کیونکہ یہ حیوانی جذباتی تعصب کو بغیر غور وفکر اور عقلیت کے پروان چڑھاتا ہے۔ (۱۱۷)۔ ایک اور لیکچرر کے واسطے سے کانفرنس یہ کہتی ہے:

"ہمارے خاص تجربے میں یہ بات ہے کہ بچوں کی نفسیات کو سب سے زیادہ نقصان دینے والی چیز دینی تعصب ہے۔ (۱۱۲)۔ وہ اپنے تصور دین کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

"دین فکر کا ایسا آلہ ہے جو جبر، تعلیم، ارشاد اور ترغیب وترہیب کے طریقے سے معاشرہ کے ساتھ جڑتا ہے۔ دینی تربیت اہداف کو کھوٹا کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ شر کو طبیعت وفطرت کا حصہ بنا دیتی ہے۔ دین کو زیادہ حزبی و جماعتی سیاست کے اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دین اور سیاست کے اس ربط سے قومی تعلقات اور ملکی عناصر کو سخت خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

بہت سارے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آسمانی کتب کا مقصد یہ نہ تھا کہ یہ مومنین کی جدید مشکلات کو حل کرنے کا انسائیکلو پیڈیا ہوتے جیسے بیسویں صدی میں مزدوروں کی مشکلات وغیرہ۔ بلکہ یہ آسمانی کتب تو فقط مومنوں کو الہام کرنے کا آلہ ہیں کہ وہ اپنی عارضی مشکلات کو حل کرنے کے لیے اپنی فکر کو استعمال کریں۔ (۱۱۳)

③ **جامعہ ازہر کا ترقی پذیر ہونا (مغربی اغراض کے ماتحت ہونا):** جامعہ ازہر اپنی پس ماندگی اور کامل اسلامی ثقافت کے اظہار میں تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اسلام کا ایک قلعہ تھا۔ اسلام کے دشمنوں کو اِس کا مکمل اندازہ تھا۔ جامعہ ازہر میں ایسے اشخاص بھی تھے جو اسلام کی غیرت سے معمور تھے جو داخلی یا خارجی جبر واستبداد کا مکمل جرات کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے۔

جامعہ ازہر نے فرانسیسی حملے کا مقابلہ کیا۔ فرانسیسی حملے کے ایک قائد نے ازہر سے منسوب ایک شخص کو قتل کر دیا۔ ازہر ہی ۱۹۱۹ء میں عوامی انقلاب کا لیڈر رہا۔ ان سب باتوں سے بڑھ کر ازہر وسیع اسلامی خطے میں پیدا ہونے والے واقعات پر عوامی اسلامی رابطے کا ذریعہ تھا۔ اِسی وجہ سے ازہر لادین اور مغرب زدہ مفکرین کی طرف سے کئی سالوں تک نفرت اور لعنتوں کا نشانہ بنا رہا۔ حتی کہ انھوں نے اِس کو مصر کے اندر تمام ثقافتی مسائل کی جڑ اور بیداری کی راہ میں بھاری رکاوٹ قرار دیا۔

پچھلی صدی میں ازہر پر جس شخص نے سب سے زیادہ جرات کی۔ وہ ازہر کا فارغ التحصیل مشہور شیخ محمد عبدہ تھا جس نے سب سے پہلے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ اگرچہ حسن نیت کے مالک تھے لیکن اُن کا شعور ناقص تھا۔ شیخ کو مستشرقین، عیسائی مبشرین اور ان سے نچلے طبقے کے سب لوگ بلا استثنا بڑی عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر طٰہٰ حسین، لطفی سید اور اُن کے ہم نواؤں نے کام کو آگے بڑھایا۔ انھوں نے نہایت اصرار سے مطالبہ کیا کہ مصر اور یورپ کے درمیان بحرابیض کو ماپنے والے پل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ''ازہر'' کو دور کیا جائے۔ اُن کے خیال میں مصر سو فیصد مغرب کا خواہش مند ہے لہٰذا مصر سے مشرق کا آخری نشان بھی ختم کیا جائے۔

اس صورت حال میں ازہر کے لیے دو ہی راستے تھے یا تو ماحول کی سرکش موجوں پر بہتا چلا جاتا اور اپنی مخصوص سوچ اور پیغام کو ترک کر دیتا یا وہ اپنی ذات کے لیے فنا کا فیصلہ کر لیتا۔

علمائے ازہر میں سے آزادی پسند! اور دیگر مغرب پرست طبقے کا خیال یہ تھا کہ ازہر کو اپنی مشکل سے نکلنے کے لیے بہترین وسیلہ اختیار کرنا چاہیے اور ازہر کو ترقی کے لیے تیار کرنا چاہیے، چاہے اس کی خاطر ازہر کو اپنا پیغام کیوں نہ ترک کرنا پڑے۔ اپنے وجود کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے۔

۱۹۳۶ سے ۱۹۶۱ کے دوران ازہر کی ترقی کے لیے قوانین صادر کیے گئے۔ (۷۱۴)۔ لادینیت کے داعیوں کو موقع مل گیا کہ وہ جامع ازہر پر تائے تانیث داخل کر کے اس کو جامعہ ازہر بنا سکیں۔ اس طرح وہ ازمنہ وسطیٰ کی ثقافت سے جدید شہری ثقافت کی طرف منتقل ہو گیا۔

مصر سے خارج دیگر اسلامی ادارے جو ازہر کو اپنا روحانی باپ یا کم از کم ایک طاقتور سند سمجھتے تھے۔ انھوں نے درآمد شدہ مغربی ثقافت کے غلبے کو بڑی تیزی سے قبول کیا اور ان کی باقی ماندہ اطاعت ذاتی رضامندی سے یا جبری قوانین سے پایہ تکمیل کو پہنچی۔

④ **عامیانہ زبان کے استعمال کی دعوت:** عربی زبان فقط اسلامی تہذیب وثقافت کا آلہ ہی نہیں بلکہ فرد یا معاشرہ کے اسلامی تشخص کا بنیادی جوہر بھی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین اور عیسائی مبلغین نے اپنی مخصوص تراکیب والفاظ کے ساتھ عربی زبان کی شائستگی پر سخت حملے کیے۔ وہ عربی زبان کو گرا کر قرآن کو گرانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ قرآن بھی لاطینی انجیل کی طرح ایک ایسی مذہبی کتاب بن جائے جس کو فقط مخصوص مذہبی پیشوا ہی پڑھ سکتے ہوں۔

تحریک اصلاح کا راہنما ''محمد عبدہ'' اس بات میں تو سچے تھے کہ لفظی صنعت گری پر مبنی نثر نگاری کا اسلوب ترک کر دینا چاہیے اور سلیس اور عام فہم نثر نگاری کو اختیار کرنا چاہیے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ تاریخ میں پہلی مرتبہ عرب زبان کے انہدام کا دروازہ کھول رہے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے صرف ونحو کی مشہور غلطیوں کی اصلاح کی دعوت دی جو اُن کے دور میں نثر کے اندر موجود ہوتی تھیں۔ (۷۱۵)

اس بنیاد پر ایک غلط قاعدے کی بنیاد بھی رکھی گئی: ''صحیح اور مشہور لفظ پر مبنی نثر فصیح ومہجور لفظوں سے بہتر ہے'' پھر اس میں مزید وسعت اختیار کی گئی حتی کہ نوبت یہاں تک آ گئی کہ ساری عربی نحو کے انہدام کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

عبداللہ ندیم نے جو محمد عبدہ کا شاگرد تھا، اِس میدان میں اپنا حصہ ڈالا۔ اُس نے لغت عامی کے رواج کی دعوت نہیں دی لیکن اُس نے صحافتی زبان میں عربی زبان کو استعمال کر کے لغت عامی کو رواج دیا۔ اُس کا طریقہ یہ تھا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ وہ اپنے مجلّے کے ہر شمارے میں ایک یا دو مضمون عامیانہ زبان میں پیش کرتا تھا۔(۷۱۶)

پھر اس کے بعد وہ نسل آئی جو مغرب کی غلام تھی۔ وہ اعلانیہ اسلامی ثقافت اور عربی زبان سے دشمنی ظاہر کرتی تھی۔ اس کے مشہور لیڈروں میں **احمد لطفی السید**، اس کا دوست اور ہم جماعت **عبدالعزیز فہمی** اور اس کی بہن کا خاوند **اسماعیل مظہر** اور اس کا گہرا دوست **طٰہٰ حسین**۔

اگر ہم **لطفی السید** کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالیں تو ہمیں ان کی فکر و اہداف کے اہم گوشے معلوم ہوں گے۔ لطفی السید اس پوری لسانی تحریک کے استاذ اور مرکز و محور تھے۔

لطفی السید محمد عبدہ کے قریب ترین شاگردوں میں سے تھے۔ اُن کو اپنے استاذ سے زیادہ مواقع میسر آئے، وہ محمد عبدہ کی وفات کے بعد چالیس سال زندہ رہے اور اُن کی کل عمر نوے سال سے زیادہ تھی۔

اُن کے اہم ثقافتی مناصب میں سے ایک منصب یہ تھا کہ وہ جامعہ مصریہ کے ابتدائی مدیر تھے۔ پھر وہ آخری عمر تک مدیر تعلیم بھی رہے۔

اُن کی سیاسی سرگرمیاں دیکھیں تو وہ **حزب الامۃ** کے لیڈروں میں سے ایک تھے۔ وہ حزب کے اخبار ''الجریدۃ'' کے رئیس التحریر بھی تھے۔ اُن کا مشہور نعرہ تھا: ''سیاست فوائد و مصالح کی بنیاد پر نہ کہ جذبات و عواطف کی بنیاد پر''(۷۱۷)

احمد کا یہ بھی نعرہ تھا کہ مصر فقط مصریوں کا ہے(۷۱۸)

لطفی کی زندگی پر لکھنے والے اِس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ لطفی نے **کتشنر** اور گراہم کا اُس وقت ساتھ دینے کا فیصلہ کیا جب مصر کو ترکی سے جدا کیا جا رہا تھا اور اُسے برطانیہ کے زیر سایہ ایک مستقل ریاست بنایا جا رہا تھا جس پر **خدیو** حکومت کر سکے۔(۷۱۹)

لطفی کی فکر ڈارون، مل، روسو اور ان جیسے مغربی مفکرین سے متاثر تھی۔(۷۱۹)۔ جب حکومت نے اُس کے دوست اور ہم فکر طٰہٰ حسین کو جامعہ سے الگ کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے خلاف عوام مشتعل ہو گئی تو لطفی السید نے اِس پر احتجاج کرتے ہوئے وزارت تعلیم کا منصب چھوڑ دیا۔(۷۲۱)

لطفی کا دعویٰ تھا کہ فصیح زبان پیچیدہ اور قدیم ہے لیکن اِس کے باوجود اُس نے اپنی زندگی کا چوتھائی حصہ ارسطو کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں صرف کیا۔(۷۲۲)

اُس کی زندگی کے مؤرخ حسین فوزی النجار نے بعض واقعات نقل کیے ہیں جو اُس کے بقول دلالت کرتے ہیں کہ لطفی غیبی، خفیہ اور ان دیکھی قوتوں پر ایمان نہ رکھتا تھا(۷۲۳)

لطفی السید نے مصر کی پس ماندگی اور مغرب کی ترقی کی علت یہ بیان کی ہے کہ مصر میں دو لغتیں الگ الگ استعمال ہوتی ہیں۔ تعلیم و تصنیف کی الگ لغت اور عام زندگی کی الگ لغت۔ اِس کا حل اُس نے یہ سمجھا اور تجاویز بھی پیش کیں کہ ہمیں فصیح زبان کے معیار سے اتر کر عامیانہ معیار اختیار کرنا چاہیے۔ حتیٰ کہ زمانہ کے تقاضے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مطابق دو لغتیں ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں یعنی طبعی طور پر لغت عامی کے اندر۔(۷۲۴)

لطفی کا دوست عبدالعزیز فہمی، لطفی سے زیادہ جرات مند تھا۔ اُس نے عربی نثر کو لاطینی حروف میں لکھنے کی دعوت دی۔ خوش قسمتی سے یہ دعوت پیدا ہوتے ہی مرگئی۔

لطفی کا گہرا ساتھی طٰہٰ حسین، مستشرقین کی طرز تحریر اور لغت عامی کی دعوت کا علم بردار تھا۔ اُس نے جاہلی شعر پر کچھ انتہائی خطرناک باتیں لکھیں۔ اللہ رافعی پر رحم کرے کہ اُس نے اس دعوت کو رسوا کیا اور اُس کے حامل کو ننگا کیا۔(۷۲۵)

لغت عامی کے داعی حضرات، لوگوں کے ہاں مشکوک افراد تھے اور اُن کے استعماری حلقوں کے ساتھ واضح تعلقات تھے۔ اِس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ بھی یہودی وصلیبی منصوبہ بندی کا ایک حصہ تھا جس کا مقصد اسلام کا قصہ ختم کرنا تھا۔ اہم بات یہ ہے کہ لغت عامی کے اوّلین داعی بذات خود استعماری افراد ہی تھے۔ عیسائی مبلغین کے زیر سایہ یہ تحریک ظہور پذیر ہوئی۔ اِس فکر کے اوّلین دُعاۃ کے نام اس طرح ہیں: بوریان، ماسیرو(۷۲۶)

یہ بات بھی لائق تذکرہ ہے کہ جس شخص نے مجمع لغوی کے اندر عبدالعزیز فہمی کا منصب سنبھالا وہ توفیق الحکیم تھا۔ اُس نے اپنے مشہور قاعدے کی طرف دعوت دی "سکّن تسلم" یعنی ہر حرف کو ساکن کر دو تو غلطی سے محفوظ رہو گے۔(۷۲۶)

اِس قسم کے زخموں کا علاج اِس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ عربی زبان وادب کے کالج کھولے جائیں اور اُن میں ادبی ورثہ اور عوامی ادب پر جامع اور بلند پایہ رسائل پیش کیے جائیں۔ لغت عامی کی فکر فقط مصر میں ہی نہیں بلکہ شام میں بھی اس کی جڑیں ہیں جیسے ایک غالی سعید عقل ہے، کچھ درمیانے ہیں جیسے بعض مہجرین۔

⑤ **مغرب کے لادین مناہج ونظاموں سے استفادہ**: مغرب زدگی کا معاملہ فقط کرومر اور ڈنلوپ کے مناہج تک محدود نہیں۔ بلکہ مغربی فکر کے عناصر مصر اور پورے عالم اسلام کو لادین مغربی رنگ میں رنگنا چاہتے تھے۔

دشمنان اسلام کا ہدف قاہرہ میں منعقد عیسائی مشنری کانفرنس ۱۹۰۶ء سے ظاہر ہوا۔ اِس کانفرنس نے لازم قرار دیا کہ جامعہ فرانس کی طرز پر ایک سیکولر یونیورسٹی قائم کی جائے جو ازہر کے اثرات کا مقابلہ کرے۔(۷۲۸)۔ انھوں نے ازہر کے بارے میں کہا کہ "یہ مسیحی کلیسا کے لیے خطرناک دھمکی ہے۔!"

اس ذمہ داری کی تنفیذ کے لیے مغرب کے کارندے آگے بڑھے چنانچہ کانفرنس ختم ہونے کے تقریباً دو سال بعد سعد زغلول، احمد لطفی السید اور ان کے ساتھیوں نے جامعہ مصریہ کی بنیاد رکھی۔ اُس کے قیام کی پہلی شرط یہ تھی کہ یہ یونیورسٹی کسی مخصوص نسل یا دین کے لیے نہ ہوگی۔ بلکہ مصر کے تمام باسیوں کے لیے ہوگی۔ چاہے اُن کی نسل یا دین جو بھی ہو۔ اس طرح سے اُن کے درمیان الفت قائم ہوگی۔(۷۲۹)

اِس ظالمانہ شرط کو اُس یونیورسٹی میں لاگو کیا گیا جو مسلم ملک کے اندر قائم تھی اور مسلم قوم کے پیسوں سے چل رہی تھی۔ اِس کے نتائج یونیورسٹی کے تعلیمی مناہج پر بھی واقع ہوئے۔ غیر مسلم اقلیت کے ہاں اسلامی علوم کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احترام سرے سے باقی نہ رہا اور یونیورسٹی کی جدید تعلیم ابتدا سے ہی سیکولر قرار پائی۔ اِس تعلیم کا نتیجہ اُن بڑی بڑی کھیپوں کی شکل میں ظاہر ہوا جو فکر وسلوک میں مغربی غلامانہ ذہنیت کی حامل تھیں اور اپنے آباؤ اجداد کے دین سے متنفر تھیں۔

مغرب پرستی فقط تعلیمی نصابوں میں ہی محدود نہ رہی بلکہ تربیت وسلوک کے اُسلوب میں بھی داخل ہوگئی۔ چنانچہ جامعہ مصریہ میں مرد وزن کے اختلاط کو لاگو کیا گیا۔ جامعہ مصریہ قاسم امین کی بے اعتقاد دعوت کا گڑھ بنی۔ اُس کو دیکھ کر عالم اسلام کی تمام یونیورسٹیوں نے پیروی کی۔ اسلام کے منافی مغربی طور طریقے جامعہ کے نظام میں داخل کیے گئے۔ جامعہ کی چار دیواری کے اندر ہی رقص، ڈرامے، مجسمہ سازی اور موسیقی کی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ یہ کیسے نہ ہوتا جبکہ قاسم امین جو لطفی السید کا دوست تھا، اپنی ایک کتاب میں یہ کلمات کہتا ہے:

''شاید مصری قوم کے انحطاط کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ فنون جمیلہ میں پیچھے رہ گئی یعنی ڈرامے، تصویر سازی، موسیقی وغیرہ۔ (۷۳۰)

افسوس ناک بات یہ ہے کہ عقاد نے یہ ثابت کیا کہ فنون لطیفہ کی تدریس کا آغاز محمد عبدہ کے افکار کا نتیجہ ہے۔ (۷۳۱)

تعلیمی نصاب میں خرابیوں کا معاملہ اتنا زیادہ خوف ناک نہ ہوتا اگر معاملہ یہاں تک محدود رہتا کہ خالص شرعی علوم کو نظر انداز کر کے دیگر علوم کو اسلامی تصور کے مطابق پڑھایا جاتا اور اُن کے اندر غیر علمی فلسفیانہ موشگافیوں کو حذف کر دیا جاتا، جن کی ضرورت فقط وہاں تھی جہاں کلیسا اور علوم کے درمیان کشمکش واقع ہوئی تھی۔ ہم اِس کی تفصیل دوسرے مقام پر بیان کر چکے ہیں۔ لیکن عملاً ایسا نہ ہوا بلکہ عالم اسلامی میں تمام نظام ہائے تعلیم کے اندر جدید علوم کو مغربی دین دشمن طریق کار کے تحت ہی پڑھایا گیا۔ دین دشمنی میں کسی بھی دو دینوں کے درمیان فرق روا نہ رکھا گیا۔

یہ بات درست ہے کہ استعمار نے اپنے نظاموں کو جبراً نافذ کیا لیکن استعمار کے رخصت ہونے کے بعد بھی یہ نظام جاری رہے بلکہ زیادہ مضبوط ہوئے۔ بلکہ یہ نظام وہاں بھی لاگو کیے گئے جہاں کبھی بھی استعمار کے قدم نہیں پہنچ سکے!

ہمارے لیے اس کی مثال مشکل نہیں۔ ذیل میں ایک مثال دی جاتی ہے جو غور وفکر کے لیے نہایت موزوں ہے۔

ڈارونزم۔ ہم اِس بارے میں مغرب کے محققین کی رائے پہلے نقل کر چکے ہیں۔ ہمارے ہاں ڈارونزم کو بیالوجی، تاریخ طبعی اور علم الارض میں ایک مضبوط علمی حقیقت کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ چاہے ڈارون کا نام ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

فرائڈزم۔ یہ بودا نظریہ تمام جامعات کے شعبہ نفسیات میں پڑھایا جاتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر پڑھایا جاتا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ یہ مضبوط علمی نظریہ ہے۔

سماجیات کے شعبہ میں **دورخائم کا نظریہ** پڑھایا جاتا ہے۔ بلکہ سماجیات سارے کا سارا مغربی نہج پر پڑھایا جاتا ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ یہ نفسیات کی طرح لادین بنیادوں پر قائم ہے۔

اسی طرح کیمسٹری، فزکس، فلکیات، طب وغیرہ، یہ علوم فلسفیانہ یا وثنی تصورات کے ساتھ تعلیمی نصاب میں بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان میں اِس قسم کی مسموم عبارتیں بھی ہوتی ہیں، مادہ نہ فنا ہوتا ہے اور نہ پیدا ہوتا ہے اور فطرت نے اس کو تخلیق کیا۔

اسی طرح زلزلوں، ستاروں کے ٹوٹنے اور جنین کی پیدائش اور اس طرح دیگر مظاہر کی تفسیر عمداً خالص مادی طریق پر کی جاتی ہے۔ اِسی طرح قرآن وسنت سے ثابت شدہ بعض باتوں کو قصہ کہانی کے طرز پر لایا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے، لوگ جدید علوم کے ظہور سے پہلے یہ عقیدہ رکھتے تھے، پرانی کتب اس طرح کہتی ہیں، لوگ جس چیز کی تشریح سے عاجز ہوتے تو اس کو خفیہ غیبی قوتوں کی طرف منسوب کرتے تھے وغیرہ۔''

مجمل طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے تعلیمی نصاب مکمل طور پر مغربی نہ ہوں تو غالب سطح پر مادی طرز پر ضرور ہیں۔ خالص ادبی مباحث کو دیکھیں تو ہمیں توقع نہ تھی کہ وہ افکار مغرب سے متاثر ہوں گے لیکن یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوتی ہے کہ یہ علمی مضامین سے بھی زیادہ مغربی افکار سے لبریز ہیں۔

ہم جلدی میں فقط تاریخ اور ادب کے معاصر نصاب میں سے کچھ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

تاریخ کا قالب مکمل طور پر مغربی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اس کی تین بڑی قسمیں بنائی جاتی ہیں۔

① تاریخ قدیم۔ جو جاہلی تہذیبوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اُن کو جاہلی قرار دینے سے گریز کیا جاتا ہے۔

② تاریخ ازمنہ وسطی۔ یہ ظہور اسلام سے کچھ قبل شروع ہوتی ہے۔ مغربی طریقے کے مطابق اسلام کی ساری تاریخ اسی دور میں درج کی جاتی ہے۔

③ تاریخ جدید۔ یہ نپولین کے مصر پر قبضے سے شروع ہوتی ہے۔

نپولین کے حملے کو جدید بیداری کا طلوع قرار دیا جاتا ہے۔

تاریخ کی اس تقسیم میں بذات خود کئی قسم کے اشارات اور دلالات موجود ہیں۔

یہ تاریخ کی تدریس کا منہج ہے۔ اگر تاریخ کے مضمون کا تفصیلی مواد دیکھیں تو وہ مستشرقین کی تلبیسات اور عیسائی مبشرین کی زہر آلود گیوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ مغربی اسلوب کے مطابق **مادی تفسیر تاریخ** سے لبریز ہے یا مخصوص فلسفیانہ نقطہ نظر کی روشنی میں ہے۔ اس قسم کی تاریخ میں ایمانی عامل کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا جبکہ تاریخ اسلامی ایمانی عامل کی تاثیر سے بھری ہوئی ہے۔

مثلاً ہم تاریخ کے اسباق میں اس قسم کی باتیں پڑھتے ہیں: غزوہ بدر کا مقصد مسلمانوں کے لیے اُن مملوکہ اشیا کا معاوضہ حاصل کرنا تھا جو وہ مکہ چھوڑ آئے تھے۔ فتح مصر کے خاص سبب میں حضرت عمرو بن عاص کا یہ قول ذکر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کیا جاتا ہے: ''یہ ملک سرسبز و شاداب ہے اور قدرتی وسائل سے مالا مال ہے''۔ فتح اندلس کا سبب اسلامی امپیریلزم کو یورپ تک وسیع کرنا تھا۔ عربی دنیا ترکی استعمار کے سامنے کئی صدیوں تک سرنگوں رہی۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریک ترکی قبضے کے خلاف پہلا عربی انقلاب تھا وغیرہ

عموماً اسلامی تاریخ اس طرح لکھی گئی کہ مسلمان حکمران اپنے سیاسی ہتھکنڈے اور باہمی کشمکش کے اُمور کو کیسے چلاتے تھے یعنی اسلامی تاریخ خاص حکمرانوں کی باہمی سیاسی شکست وریخت پر لکھی گئی۔ جبکہ اسلامی تہذیب کو **فولکاری** طریقوں کے مطابق لکھا گیا۔

تاریخ اسلامی اور تہذیب اسلامی کی باہمی خوب صورتیوں کو اکٹھا کرنے کا انداز اور دونوں کو پہلو بہ پہلو بیان کرنے کا طریقہ بالعموم نہیں اپنایا گیا۔

اگر ہم ادب کا مضمون دیکھیں تو یہ مغربی ثقافتی حملوں سے لبریز ہے۔ اِس میں وہ سب موضوعات اکٹھے ہوتے ہیں جو مغرب کی ستائش، اُس کی تہذیبی حمد وثنا اور اُس کے اکابر کی مدح سے بھرے ہوتے ہیں۔ جبکہ اسلامی تصورات، ایمانی اقدار کا سراغ بہت کم ملتا ہے۔

جب آپ نصاب کی ورق گردانی کرتے ہیں، خصوصاً سیکنڈری درجے کی تعلیم کا نصاب تو اُس میں اس قسم کے موضوع ملیں گے جیسے ماجلان سمندری ملاح نے امریکہ کیسے دریافت کیا۔ ابراہیم لنکن غلاموں کا آزادی دہندہ، آزادی نسواں، عرب قومیت کا ظہور، نپولین فاتح یورپ، عمر بن ابی ربیعہ، آپ کا مقصد حیات، سچی وطن پرستی۔

مصر میں سیکولر ادبی رجحانات کا ارتقا

⑥ **لادین فکری وادبی مکاتب فکر کی درآمد:** فرانس میں کومت کا فلسفہ اثباتیت اور انگلینڈ میں نظریہ ڈارون نے مغربی فکر کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ عالم اسلام میں جب بیداری کی دوڑ شروع ہوئی تو اس وقت یہ دونوں نظریے اپنے عروج پر تھے۔ عالم اسلام کی بیداری بھی اِن نظریات سے گہرے طور پر متاثر ہوئی۔ پھر جدید فکری و ادبی بیداری مغربی طریقے کے مطابق چل پڑی۔ حتی کہ نوبت وہاں تک جا پہنچی جو آج فکری اور ادبی صورت حال کی ہے۔ ادب خاص طور پر رومانی تحریک سے متاثر ہوا جو اِس مرحلے میں ادھیڑ عمر ہو چکی تھی۔ اس صدی میں واقعیت اور لامعقولیت کے مکاتب فکر نے بھی اپنے اثرات منتقل کیے۔

عربی فکر کی صورت حال یہ رہی کہ محمد عبدہ کو مت کے عقلی فلسفے سے متاثر ہوا۔ حتی کہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ محمد عبدہ کا اعتزالی رجحان کومت کی طرف ہی منسوب ہوگا نہ کہ مسلمان معتزلیوں کی طرف۔ یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس صدی کے آغاز میں ہر چھوٹا اور بڑا فکری راہنما شیخ سے تھوڑا یا زیادہ ضرور متاثر ہوا ہے۔

شیخ محمد عبدہ اور اُس کے مکاتب فکر کی کوششوں کا خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان اور عقلی رجحان کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی گئی۔ اِس کوشش سے کئی خطرناک نتائج ظاہر ہوئے۔ ان باتوں سے قطع نظر اُس وقت سب

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے زیادہ خطرہ فلسفہ ارتقا کا تھا۔ کیونکہ یہ فلسفہ صریح طور پر دین سے خروج اور عین الحاد کی دعوت دیتا تھا۔ (۷۳۲)

تین بڑے لکھاریوں نے ڈارون کا براہ راست ترجمہ کیا اور اخبارات میں اُس کی تفصیلات کو پھیلایا۔ وہ تینوں یہ تھے: شبلی شمیل، سلامہ موسیٰ، اسماعیل مظہر (۷۳۳)

پہلے دونوں شخص عیسائی ہیں اور اُن کا کفر والحاد ہر دین کے ساتھ یکساں ہے۔ (۷۳۴)۔ آخری شخص اصلاً مسلمان ہے لیکن اس نے جو کچھ لکھا، اُس کے قائل کی طرف نسبت کفر میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اِن کتابوں اور بحثوں کا موجودہ اور آنے والی نسل پر گہرا اثر تھا حتی کہ آج بھی جو شخص انسان کی قدیم اصل پر کچھ لکھنا چاہتا ہے تو وہ اسی راستے پر چلتا ہے۔

جدید دور میں الحاد کا پھیلاؤ یا کم از کم تشکیک اور لاادریت، مفکرین اور پڑھے لکھے افراد میں بالکل واضح ہے۔ ہم جدید فکری مذاہب کے انتقال پر فقط ایک مثال کو کافی سمجھتے ہیں۔

اس تحریک کو کھڑا کرنے والوں میں ایک اسماعیل احمد ادہم تھا۔ وہ ترکی میں سیکولرزم کے اعلان کے بعد مصر آیا۔ اس نے مصر والوں میں الحادی افکار کی نشر واشاعت شروع کر دی۔ اُس نے ایک چھوٹا رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا: میں ملحد کیوں ہوں؟ یہ اسکندریہ سے چھپا۔ اس رسالے میں لکھا ہوا ہے: ترکی میں جماعت نشر الحاد کی بنیاد رکھی گئی۔ اس میں چھوٹی مطبوعات اس قسم کی تھیں: دین کی ماہیت، دین کے ارتقا اور پیدائش کا قصہ، اللہ کے تصور کے ارتقا کا قصہ، ہمیشہ زندہ رہنے کی فکر۔ اُس کے بعد ہم نے امریکہ کی جمعیت نشر الحاد میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس ساری جدوجہد کا نتیجہ مصر میں مجلۃ العصور کی شکل میں ظاہر ہوا، میرا دوست عظیم مقالہ نگار، اسماعیل مظہر ۱۹۲۸ء میں مصر سے ایک مجلّہ نکالتا تھا جو الحادی دعوت اور فکر کی نشر میں ایک معتدل تحریک کا نمائندہ تھا۔ (۷۳۵)

نیز ہم نے اپنی جماعت کا نام بدل کر المجمع الشرقی لنشر الالحاد رکھ دیا۔

اسماعیل مظہر اپنے مجلّہ مارچ ۱۹۲۸ء میں ایک عنوان کے تحت لکھتا ہے:

انسان کی گہری غور وفکر واجب الوجود کے بجائے کائنات کے ساتھ جڑ گئی۔ جدید علم نے انسان کو فرشتوں کے بلند وبالا مقام سے اٹھا کر حیوانوں کی سطح پر دے مارا ہے۔ یہ نئی فکر انسان کے لیے اُس قدیم فکر سے کم مشکل نہیں جو ادیان کی شکل میں اُس کی لگاموں کو کستی رہی ہے۔

نظریہ ارتقا کے حاملین نے ظاہر کیا ہے کہ انسان اپنی اصل میں حیوان ہے۔ اور انھوں نے اِس کو مضبوط علم سے ثابت کیا ہے (!)۔ ارضیات کے ماہرین نے زمین کی ازلی قدامت کو ثابت کیا ہے۔ فلکیات کے ماہرین نے نظام شمسی کی ازلی قدامت کو ثابت کیا ہے۔ اُن کی بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات میں ایک طویل سلسلہ ارتقا کے بعد زندگی ظاہر ہوئی ہے۔ زمین کی سطح پر انسان نے اپنی عادت کے مطابق غور وفکر کرنا شروع کیا کہ اِس طویل سلسلہ کے پیچھے کس کا قصد کارفرما ہے۔ لیکن سلسلہ ارتقا نے ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا کہ انسان اُس کی آخری منزل ہے۔

جو بات آج تک ثابت ہوئی ہے۔ اُس سے انسان کے انجام کے متعلق کوئی اچھی امید پیدا نہیں ہوتی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن میں نہیں جانتا کہ جب انسان اپنی ابتدا میں حیوانوں کے ساتھ شریک ہوسکتا ہے تو وہ اپنی انتہا میں حیوانوں کے ساتھ شریک کیوں نہیں ہوسکتا۔(۷۳۶)

وہ ڈارون سے اتنا زیادہ متاثر ہے کہ اُس نے یہاں تک کہ دیا:

ادیان یہ بات کرتے ہیں کہ انسان اور جن کی پیدائش کا مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ یہ اچھی فکر ہے لیکن درست نہیں (!) کیونکہ اگر یہ بات صحیح ہو تو ماننا پڑے گا کہ اللہ جن وانس سے عبادت کرانے کا محتاج ہے (!) کیا نظام کائنات فقط اس لیے پیدا کیا گیا ہے تا کہ حیاتِ انسانی کو تقویت دے اور انسان عبادت الٰہی کے لیے مسخر ہو۔ میرے خیال میں یہ انسانی وجود کی بعید ترین غایت ہے۔(۷۳۷)

سچی بات یہ ہے کہ **اسماعیل مظہر** بے شمار لکھاریوں کا ایک نمائندہ ہے۔ یہ سب لکھاری اپنے الحادی عقائد کی تصریح کرنے میں برابر نہیں لیکن اپنے مقصد اور غایت میں برابر ہیں۔ مثلاً **منصور فہمی، لطفی السید، امین الخولی، طٰہٰ حسین** اور آخر میں **صادق العظم** ہے یعنی ''دینی فکر کی تنقید'' کا مصنف۔ اِس کے علاوہ کئی ایسے لکھاری ہیں جن کی نثر نگاری کی تاویل اسلام سے خروج کے علاوہ نہیں ہوسکتی۔ بعض اپنے الحاد کو علمی مباحث اور ادبی مکتب فکر کے پردے میں چھپاتے ہیں تا کہ عوام کے مذہبی احساسات سے تصادم نہ ہو اور اُن کی مقبولیت میں کمی نہ آئے۔

مغربی الحاد نثر نگاروں کی طرح شعرا پر بھی غالب ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مصر کے شعرا، عراق کے شعرا مثلاً **رصافی** اور **زہاوی** سے کم الحاد کا شکار ہیں۔ **زہاوی** کا دیوان (۱۹۳۶ء) الحادی افکار سے بھرا ہوا ہے۔ اور یہ افکار مجموعی طور پر **ڈارون تھیوری** اور **ہیگل** کے جدلیاتی نظریہ سے متاثر ہیں۔ ہیگل کا جدلیاتی نظریہ درحقیقت ڈارون کے ارتقائی نظریہ کا ہی پھیلاؤ ہے۔ ایک مقام پر زہاوی کہتا ہے۔

میں کائنات پر گہرا غور وفکر کرتا ہوں میرا غور وفکر مجھے الحاد تک پہنچا دیتا ہے۔
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کائنات فقط ایک جوہر ہے، اس کے مخفی اور ظاہر میں کوئی فرق نہیں
زمانہ اپنی گردش کی حالت میں ازل کو ابد سے ملاتا رہتا ہے۔(۷۳۸)

اسی طرح اُس کا قول ہے:

زندگی کی ابتدا اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ جمادات سے ارتقا کے بعد ظاہر ہوئی۔
زندگی ایک نظام کے تحت اپنی ضرورت کا سامان خود پیدا کر لیتی ہے۔(۷۳۹)

اُس کی ایک رباعی ہے۔

ہم بندر کے سوا کچھ نہیں ایک ہلاک ہونے والے بندر کی نسل سے
ہمارے ارتقا نے ہمیں پہنچا دیا ادراکات کی بلند سیڑھیوں میں (۷۴۰)

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شاعر نظریہ ڈارون کے معاصر مخالفین کی ہجو کرتا ہے۔

بے شک وہ لوگ جو بندروں سے دور ہیں، وہ انکار نہیں کر سکتے کہ وہ بندروں سے ہی پیدا ہوئے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ لوگ اپنے حواس وادراک میں ہمیشہ اپنی نسل کے قریب رہے۔ پھر بھی وہ انکار کرتے ہیں۔(۷۴۱)

زہاوی ایتھر کے بارے میں کہتا ہے:

کائنات فقط انسانوں کے لیے مشغول نہیں رہتی، صدیوں اور صدیوں کے بعد
کوئی چیز وجود پذیر ہوتی ہے اور پھر وہ وقت کے گزرنے پر معدوم ہو جاتی ہے۔
البتہ ایتھر ہمیشہ قائم ودائم رہتا ہے(۷۴۲)

نیز وہ کہتا ہے:

یہ زندگی تو فقط ایک شرارہ ہے، یہ ایتھر کی سانس سے شعاع کی صورت خارج ہوئی

اس سے زیادہ سخت بات وہ اس طرح کرتا ہے :

ایتھر کی زمین وآسمان میں اُس طرح تاثیر ہے جیسے اللہ کی تاثیر ہوتی ہے
شاید دونوں کا وجود اصل میں ایک ہے البتہ ایتھر فقط تعبیر میں الگ بولا جاتا ہے(۷۴۳)

فکر، شعر اور صحافت میں اِس قسم کے افکار پھیل جانے کی وجہ سے مادی افکار بالخصوص کمیونزم کے پھیلاؤ کا امکان پیدا ہوا۔ اُس کے بعد تقریباً ہر چیز میں عام شک وشبہ کی غذا بہم پہنچائی گئی۔ اب عالم اسلام میں ہر پڑھا لکھا نوجوان مہلک شکوک اور شیطانی وسوسوں کا شکار ہے۔ اکثر نوجوان بائیں بازو کی تحریکوں اور لادین جماعتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً جنگ عظیم دوم کے بعد اشتراکیت کو بقول بعض مفکرین ''زمانے کی خوب روحسینہ'' قرار دیا گیا۔

فکری مذاہب کی طرح ہی ادبی مکاتب فکر کی صورت حال ہے۔

تحریک رومانیت کی بازگشت مشرق میں بھی سنی گئی۔ جرجی زیدان نے انگریز رومان پرست کی نقالی میں اسلامی تاریخ کو بگاڑ کر کچھ رومانی ادبی روایات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ مازنی کی رومان پرستی واضح نہیں۔(۷۴۴)

ایک جگہ مازنی اپنی کتاب میں ایک فصل کا عنوان اس طرح باندھتا ہے۔ ''کتاب محرف یعنی مقدس سے منقول ایک عبارت''۔ اُس نے پچھلی صدی کے مغربی نثر نگاروں کی اندھی پیروی کی۔ اُس کی عادت تھی کہ وہ ہر فصل کے شروع میں کوئی مشہور عبارت لکھتا تھا۔(۷۴۵)

ادبا کا ایک گروہ ترجمہ کی صنف کی طرف متوجہ ہوا۔ یورپ کے مشہور اور بڑے ادبا کا ترجمہ کیا گیا جیسے شیکسپیر اور ٹالسٹائی۔ لیکن ان ترجموں میں غالب رجحان اباحیت پسندی کا تھا۔ جیسے الیگزینڈر تھامس، امیل زولا، اناتھول فرانس کے تراجم۔

اباحیت پسندی کا رجحان تقریباً ہر ادبی تحریک پر غالب رہا۔ اور یہ جنگ عظیم دوم تک ''واقعیت'' کے نام پر کام کرتا رہا۔ پھر مغرب میں لامعقولیت کی تحریک چلی تو اس کی بازگشت عالم اسلام میں بھی ظاہر ہوئی جیسے سارتر اور کامو نے انسانی محرومی اور ناقدری کا فلسفہ اپنے نثری افسانوں میں بیان کیا۔ اور اس مقصد کے لیے انھوں نے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قدیم یونانی کہانیوں کو استعمال کیا۔ اِس کے مقابلے میں طہٰ حسین اور توفیق الحکیم جیسے عربی ادبا نے تاریخ اسلامی اور قصص قرآنی کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ جیسا کہ علی ہامش السیرۃ، الفتنۃ الکبری اور اصحاب کہف وغیرہ جیسی کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

سیکولر افراد کے ہاتھوں مصروف عمل میڈیا نے اپنا حصہ ڈالا۔ انھوں نے اباحیت پسندی کو عام کرنے کے لیے صحافت، ریڈیو، ڈرامے وغیرہ کا استعمال کیا۔ اِس کے نتیجے میں ادب اپنے اسلوب اور مضمون میں انحطاط پذیر ہوگیا۔ جیسے احسان عبدالقدوس اور اس کے ساتھیوں کی نثر نگاری اور نزار قبانی اور اُس کے گروہ کی شاعری وغیرہ۔

جدید ادب اپنے موضوع میں زیادہ تر سیکولر رہا۔ لیکن اُس کی سیکولرزم کی دعوت ذاتی طور پر بھی ظاہر ہوئی۔ اُس نے فن برائے فن، آزاد ادب، ادب برائے قوم، ادب برائے حالات حاضرہ کے نام پر دین اور اخلاق سے علیحدگی کا مطالبہ بھی کیا۔

جس شخص نے ادب کو دینی اقدار سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کیا۔ اُن میں سے ایک سلامہ موسیٰ ہے۔ اس نے اپنے والد کو خط لکھا:

''اس کا جدید رسالہ دینی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ بشری بھی ہے۔ اس آخری جملہ کی تشریح ضروری ہے۔ غیبیات پر مبنی قدیم ادیان ہم پر کچھ فرائض اور واجبات عائد کرتے تھے لیکن اُن ادیان کی تمام تر اخلاقی وسماجی اقدار آخرت سے متعلق ہوتی تھیں نہ کہ دنیا سے متعلق۔ ہم پر لازم ہوتا تھا کہ ہم نیک ہوں، نیکی کرنے کی کوشش کریں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں، جنت الفردوس حاصل کریں اور موت کے بعد والی سزاؤں سے بچنے کی سعی کریں۔ چنانچہ یہ اقدار اخروی ہوتی تھیں۔ فرانسیسی ادب بلکہ پورا یورپی ادب بھی ہم پر کچھ واجبات اور فرائض عائد کرتا ہے لیکن یہ اجتماعی واخلاقی اقدار فقط دنیوی اقدار ہیں۔ ہم پر نیک بننا، نیکیاں حاصل کرنا اس لیے واجب ہے تاکہ انسانی معاشرہ کی خدمت کرسکیں، اپنی شخصیت کو اخلاق ومعارف کے ساتھ ترقی دے سکیں۔ ہم اپنے ارضی خطے کو جنت الفردوس بنا سکیں جس میں سعادت، خیر اور شرف موجود ہو''۔ (۴۶ ۷)

''وجودیت''، انیس منصور کے ادبی کام میں ظاہر ہوئی۔ ''مارکسیت'' مجیب محفوظ کی کتابوں میں نظر آئی۔ محرومی اور لامعقولیت کا رجحان بدر شاکر السیاب کی شاعری میں رونما ہوا۔ جیسے 'بارش کا نغمہ' دیکھ لیں۔ اسی طرح لبنانی شاعر ادونیس بھی بدر کے مکتب فکر کا حامل ہے۔ (۴۷ ۷)

لامعقول رجحان کا حامل ادب، اصل ادب کے موضوع وعنوان پر غالب نہیں آسکا لیکن اُس نے اصل ادب کی شکل واسلوب پر حملہ ضرور کیا ہے جیسے آپ الیوت یہودی کی انگلش شاعری دیکھ لیں۔ (۴۸ ۷)۔ یہ حملہ آزاد شاعری کے نام سے ظاہر ہوا جو حقیقت میں ہذیان اور عقلی پیچش کی ایک قسم ہے۔ شیخ غزالی نے اپنے ایک لیکچر میں یہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔

ابتدا میں باکثیر اور سیاب نے یورپی شاعری کا ترجمہ، عربی نثر کی شکل میں کیا۔ پھر اگلی نسل آئی جو ہر چیز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں کمزور اور مسخ شدہ تھی۔ اُن کا ادب فقط اِس ہذیان کے اندر ہی محصور ہو کر رہ گیا۔

چونکہ ہم نے اِس کوڑا کرکٹ کا ذکر کر دیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس کی ایک مثال پیش کریں۔ آزاد شاعری کا ایک دعویدار ''محمد الفیتوری'' کہتا ہے۔

ہمارے گناہوں کی آگ
ہماری پسلیوں میں بہتی ہے
ہمیں اپنے مردوں کی ہڈیوں پر ٹیک لگانا چاہیے
اور ہمیں اب خاموش ہو جانا چاہیے۔۔۔
قدیم کلیسا کے برج اور مضطرب راہب
اور بادل اپنے قدموں کو تیز کرتے ہیں اور افق پر چھا جاتے ہیں
اور آدمی بغیر گردن کے
اور عورت فٹ پاتھ پر پھسل جاتی ہے
اور سیڑھیوں کے نیچے ایک بلی کا گلا گھونٹا جاتا ہے
اور گرجا گھر کی گھنٹی بجتی ہے
وہ فضا میں ایک گردش کو قائم کرتی ہے اور بجتی ہے۔۔۔۔الخ

شیخ غزالی اس کوڑا کرکٹ کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

یہ منتشر کلام جن پراگندہ خیالوں کی طرف لے جاتی ہے، اُن کو چھوڑ دیں۔ اِن بکھرے ہوئے الفاظ کے درمیان عقلی ربط کی کمی کو بھی آپ خاطر میں نہ لائیں۔ لیکن ایک بات ایسی ہے جس کو آپ کسی صورت اثر انداز ہونے سے نہیں روک سکتے اور وہ استعمار کے ثقافتی جراثیم ہیں یا حیران و پریشان شاعر پر غالب صلیبی فکر کا حملہ ہے۔

یہ شاعر مشہور و معروف قاہرہ شہر میں رہتا ہے جس کا سورج ہر وقت چمکتا ہے جہاں بلند و بالا اذان کے مینار ہیں اور اوّلین اسلامی تہذیب کا رنگ ہے۔ لیکن اِس سرگرداں شخص پر ایسی فکری و نفسیاتی غلامی چھائی ہے کہ یہ اپنے تصور میں بادل دیکھتا ہے، کلیساؤں کے برج دیکھتا ہے، مضطرب راہب کو گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں گویا یہ شخص لندن یا روم میں ہے، مصر میں نہیں۔ (۷۴۹)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۸

معاشرت واخلاق میں سیکولرزم

عالم اسلام میں معاشرتی زندگی کا انحراف کئی صدیوں سے جاری تھا، لیکن یہ انحراف اپنی گوناگوں شکلوں کے تحت جدید دور میں صورت پذیر ہوا۔ اب اسلامی معاشرہ اپنے اخلاق، طور طریقوں اور رسوم ورواج کے اندر غیر اسلامی راستوں پر چلتا جارہا ہے۔ خالص اسلامی اخلاق پر جاہلی عرف، انحطاط پذیر خواہشات اور نت نئی عادات غالب آگئی ہیں۔ جدید دور سے قبل اسلامی اخلاق میں تمام تر بگاڑ کے باوجود موروثی دینی جذبات کے تحت فیصلے کیے جاتے تھے اور لوگوں میں فضائل اخلاق کی غیرت فطری طور پر موجود تھی۔ وہ اپنی تمام معاشرتی اقدار، رواج اور معیارات کو دین کی طرف منسوب کرتے یا کم از کم کسی اصول وقاعدہ کو تلاش کرتے تھے۔ لوگوں کے ہاں اتنی فکری استعداد تھی کہ وہ اصلاح کی کوششوں کو دین سے سند کی بنیاد پر پرکھتے تھے۔ کئی ایسے مجدد تھے جو اسلام کے دعویدار تھے اور کئی خارج سے آئے ہوئے فسادی اشخاص تھے، سب کو دین کی سند پر پرکھا جاتا۔

پچھلی صدی میں منحرف اسلامی معاشرے کو دین کے باغی مغربی معاشرے سے واسطہ پڑا۔ ابتدائی طور پر ہی مغرب نے اپنی مادی ترقی پر فخر کے ساتھ خود کو مشرق کے معاشرتی طور طریقوں سے افضل قرار دیا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی معاشروں میں ابھی بھی بعض ایسے فضائل موجود تھے جو مغرب میں مفقود تھے۔ لیکن غالب لوگ مغلوب لوگوں پر صحیح نظر ڈالنے کے قابل نہیں رہتے خصوصاً جبکہ اُن کے پیچھے صلیبی روح بھی کارفرما ہو۔

اِس کے مقابلے میں مشرقی معاشرت حیرت ومرعوبیت سے دنگ رہ گئی۔ اسے اپنی کمزوریوں کا شدت سے احساس ہوا۔ کافر مغربی یہ تک کہ اٹھے کہ اہل مشرق کی پس ماندگی کا سبب اسلام ہے۔ انھوں نے اپنے دعوی کے حق میں یہ دلیل بھی استعمال کی کہ مسلمان خود کو سچا مسلمان سمجھتے ہیں تو یہ پس ماندگی کیوں؟

اِس طرح اسلامی اخلاق پر حملہ کرنے اور معاشرتی اقدار کو ملیامیٹ کرنے کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کو جو اسلام کی حقیقی نمائندگی نہ کرتی تھی، اسلام پر حملہ کا سبب بنایا گیا۔ اس طرح مغرب کا دین سے آزاد اخلاق اپنی دل فریبی اور قوت میں زور پکڑ گیا۔

استعمار کی کینہ پرور صلیبی قوتوں اور اُن کے ہم نوا عیسائی مبلغین اور مستشرقین نے یہ جان لیا کہ اسلامی اخلاق اور مسلم معاشرہ کا جوہر اُن کی عزت وناموس میں پوشیدہ ہے جس کی وہ بے حد حفاظت کرتے ہیں اور یہی چیز اسلامی وغیر اسلامی معاشرت کا بنیادی فرق ہے۔ چنانچہ مکروفریب کے حامل منصوبہ سازوں نے مسلمانوں کے اِس

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

امتیاز کو چھپنے کا طریقہ وضع کیا کہ مسلم عورت کو دین سے دور کیا جائے اور مسلمانوں میں بے غیرتی کو عام کیا جائے۔

اس مسئلے میں اول تا آخر امت مسلمہ ہی ذمہ دار تھی۔ یہ مسئلہ انتہائی اہم اور ذاتی نوعیت کا ہے لہٰذا ہم اِس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں۔

بلادِ عرب میں بے حجابی اور تحریک نسواں کا ارتقا

ابتدا میں ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے ذہنوں میں وہ تصویر لائیں جس کو ہمارے مسلمان مؤرخین نے فرنگی بے حیائی و بے غیرتی کے ضمن میں بیان کیا ہے (۷۵۰)۔ یہ تصویر ہمارے لیے جبرتی نے ۱۲۱۶ھ کے واقعات بیان کرتے ہوئے پیش کی ہے۔ پھر ہم اس تصویر کا آج کے حالات سے موازنہ کریں گے:

اور ایک چیز عورتوں کا بن سنور کر نکلنا اور حیا و شرم سے عاری ہونا تھا۔ جب فرانس مصر میں داخل ہوا۔ تو بعض فرانسیسیوں کے ساتھ اُن کی بیویاں بھی ہوتی ہیں جو سڑکوں پر کھلے عام چلتی تھیں۔ یہ خواتین خوب صورت نقش نین کی مالک، عمدہ لباس زیب تن کیے، ہاتھوں میں رنگین ریشمی رومال لیے، کندھوں پر کشمیری چادریں اوڑھے اور رنگا رنگ منقش کپڑوں کے ساتھ گھوڑوں اور گدھوں پر سواری کرتیں اور اُن کو تیز دوڑاتیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنستیں اور عام لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتی تھیں۔ خواہش پرست طبقہ کی ادنی ورذیل عورتوں نے اِن فرانسیسیوں کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا۔ فرانسیسی، عورتوں کا احترام کرتے اور اُن پر مال خرچ کرتے۔ مقامی عورتوں نے جب فرانسیسیوں کے ساتھ گھلنا ملنا شروع کیا تو ابتدا میں یہ شرم وحیا کے تحت اور ذلت و عار سمجھ کر کیا گیا۔ جب مصر میں آخری ہنگامہ واقع ہوا اور فرانس و بولاق کی باہمی جنگ چھڑ گئی۔ فرانس نے بولاق کی آبادی اور اس کے اموال کو خوب لوٹا۔ خوب صورت عورتوں کو قبضے میں لے لیا اور لڑکیوں کو اپنا قیدی بنالیا۔ انھوں نے لڑکیوں کی آرائش وزیبائش اپنی عورتوں کے مطابق کی اور اُن کو اپنے طریقے کے مطابق اجرت پر دیا۔ ان لڑکیوں میں سے اکثر نے حیا کا پردہ اتار پھینکا پھر ان قیدی لڑکیوں کے ساتھ بدکار عورتوں کا آنا جانا ہوا۔ اہل علاقہ پر ذلت ورسوائی، مال واسباب کی لوٹ مار، فرانس اور اُس کے ہم نواؤں کی زیر سرپرستی جاری رہی۔ اہل فرانس نے عورتوں میں رغبت ظاہر کی۔ وہ عورتوں سے انکساری کے ساتھ پیش آتے اور اُن کے اشارہ ابرو پر چلتے، اگرچہ وہ عورتیں اُن کو غصے میں برا بھلا کہتیں۔ اہل فرانس نے مقامی بڑی حیثیت والوں کی بیٹیوں کو نکاح کا پیغام دیا اور انھوں نے بھی اقتدار و مال کے لالچ میں اپنی بیٹیاں بیاہ دیں۔ عقد نکاح کے وقت اسلام ظاہر کیا جاتا، کلمہ کی گواہی دی جاتی لیکن عقیدہ کے فساد سے خوف محسوس نہ کیا جاتا۔ چنانچہ فرانسیسی حکمران مردوں کے پہلو بہ پہلو مسلمان عورتیں بھی مغربی زیب وزینت کے ساتھ چلتیں، رعایا کے حالات دیکھتیں اور روزمرہ کے احکام صادر کرتیں۔ یہ عورتیں کبھی اکیلی گھومتی پھرتیں اور کبھی اپنی سہیلیوں اور مہمانوں کے ساتھ چلتیں۔ اُن کے آگے خدام اور کمان دار ہوتے جو لوگوں کی بھیڑ کو آگے سے ہٹاتے۔ یہ عورتیں اصل حکام کی طرح احکامات جاری کرتیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک دوسری چیز بھی اہم تھی، جب دریائے نیل جوبن پر ہوتا، اُس کا پانی خلیج میں بھر جاتا اور اس میں کشتیاں چلنے لگتیں تو اُس وقت عورتیں بن سنور کر نکلتیں اور اہل فرانس کے ساتھ گھل مل جاتیں۔ اہل فرانس بھی ان عورتوں کے ساتھ سواری کرتے، رقص و موسیقی اور شراب نوشی سے دل بہلاتے۔ دن رات، خوب صورت فانوس اور روشن چراغ کی موجودگی میں اعلیٰ لباس، زیور اور جواہرات زیب تن ہوتے۔ آلات موسیقی ہم راہ ہوتے، کشتیوں کے ملاح ہنسی مذاق اور بے ہودگی میں حصہ لیتے۔ وہ چپو چلانے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کو ادنیٰ تلذذ کی باتوں سے سوال و جواب کرتے۔ خصوصاً جب شراب اُن کے سروں پر چڑھی ہوتی، وہ چیختے چلاتے، طبلہ بجاتے، رقص کرتے، اپنے گانوں اور نغموں میں فرانسیسی الفاظ استعمال کرتے اور فرانسیسی کلام کی طرز پر بہت ساری باتیں کرتے۔ (۷۵۱)

اس سے واضح اشارات ملتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے کچھ لوگ لادین معاشرتی زندگی اور مغربی طرز اپنانے کے لیے تیار تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو مغرب کی خصوصی توجہ اور یورپ کے مزے لوٹنے کے لیے اپنی قوم کو مغرب پرستی کی دعوت دینا چاہتے تھے۔

محمد علی کے دور میں یورپی ممالک کی طرف طلبا کے طائفے روانہ کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ ابتدائی طائفوں میں مشہور ترین شیخ **رفاعہ طہطاوی** ہیں۔ اُن کا شمار اصلاح کے قائدین میں ہوتا ہے۔ مغرب کی طرف بغرض تعلیم بھیجے جانے والے، اس شیخ نے پیرس نامی مغربی شہر پر ایک مستقل کتاب لکھی۔ اس کتاب میں اُس نے اپنی قوم کے لیے فرانسیسی معاشرتی زندگی کے احوال بیان کیے۔ وہ فرانس کی مجلسوں اور رقص گاہوں کا حال اس طرح بیان کرتا ہے:

''بالعموم عورتوں کے لیے بیٹھنے کی خصوصی جگہ ہوتی ہے اور کوئی آدمی اُس وقت تک نہیں بیٹھتا جب تک خواتین بیٹھ نہ جائیں۔ جب عورت کسی مجلس پر داخل ہو اور وہاں کوئی کرسی خالی نہ ہو تو کوئی نہ کوئی آدمی کھڑا ہو جاتا اور عورت کو اپنی جگہ پر بٹھاتا لیکن عورت کھڑی نہ ہوتی۔ خواتین کی عزت ہمیشہ مردوں سے زیادہ کی جاتی ہے۔ اسی طرح جب انسان اپنے دوست کے گھر میں داخل ہوتا تو اس پر واجب ہے کہ وہ گھر والے مرد سے پہلے گھر والی عورت کو سلام کرے۔ آدمی جتنا بھی بلند مرتبہ ہوتا، اُس کا درجہ اُس کی بیوی یا گھر کی خواتین کے بعد ہوتا۔ (۷۵۲)

فرانس میں سب لوگ رقص کرتے ہیں۔ گویا کہ یہ روزمرہ کے امور جیسے حجامت، صفائی ستھرائی وغیرہ کی ایک قسم ہے (!) فسق و فجور نہیں۔ اسی وجہ سے رقص کو ہمیشہ حیا کے قوانین سے خارج سمجھا گیا۔ جبکہ مصری علاقوں میں رقص عورت کی خصوصیات میں سے ہے اور یہ شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ پیرس میں رقص محض ایک مخصوص طریقہ ہے جس سے کبھی بھی زنا اور بدکاری کی بو نہیں سونگھی گئی۔ ہر انسان کسی بھی عورت کے ساتھ رقص کر سکتا ہے۔ جب وہ ایک عورت کے ساتھ رقص سے فارغ ہوتا ہے تو دوسری کے ساتھ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ کسی عورت کو پہچانتا ہو تو پھر اُس کے ساتھ رقص کرے۔ عورتیں زیادہ خوشی محسوس کرتی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہیں جب اُن کے ساتھ رقص کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہو۔ کیونکہ وہ کسی ایک ہی شخص سے مستقل تعلق اختیار کرنے پر تھک جاتی ہیں۔ جیسے ایک شاعر کا قول ہے۔

اے خاتون! جسے کوئی ایک دوست راضی نہیں کر سکتا اور نہ ہی سال بھر میں ملنے والے ہزاروں دوست
میں تجھے موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ایک حصہ سمجھتا ہوں وہ بھی صرف ایک کھانے پر صبر نہ کر سکتے تھے

یہ رقص ایک مخصوص طریقے پر سرانجام پاتا تھا۔ مثلاً مرد رقص کرتا اور اس کا ہاتھ ساتھی عورت کی کمر میں ہوتا۔ اکثر اوقات وہ اُسے تھامے ہوتا تھا۔ مختصراً یہ کہ عورت کے اوپر والے بدن کے کسی حصے کو چھونا، اُن عیسائیوں کے ہاں عیب نہ تھا۔ جب آدمی کسی عورت کو اچھے خطاب اور مدح وستائش کے ساتھ پکارتا تو یہ اُس کی تہذیب و شائستگی کی علامت سمجھا جاتا۔ (۷۵۳)

یہ کلام اپنے قاری کو کئی باتیں بتلاتا ہے۔ ہم فقط دو کا ذکر کرتے ہیں۔

① اخلاق دین کے ساتھ مربوط نہیں ہوتے۔ یہ فکر شیخ طہطاوی کے ذہن کو نقصان دے گئی۔ لیکن وہ اس کو واضح طور پر بیان کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ پیرس کے معاشرہ میں کئی قسم کی بے حیائی داخل تھی جن سے طبعی طور پر دین راضی نہیں ہوسکتا لیکن اِس کے باوجود وہ حیا کے قوانین سے خارج تھی اور اُس سے بدکاری کی بو نہ آتی تھی بلکہ یہ ادب وشائستگی کی علامت تھی۔

یہ فکر نشو ونما پاتی رہی اور جوان ہوتی گئی حتی کہ یہ بات صراحت کے ساتھ کہی گئی کہ حجاب فواحش کی پردہ پوشی کا ایک ذریعہ ہے اور بغیر حجاب کے رہنا شرف و پاکیزگی کی دلیل ہے۔ اسی وجہ سے دین واخلاق کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔

② فرانس کا دیوث معاشرہ عورت کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اِس کے مقابلے میں اسلامی معاشرہ عزت کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن معاصر صورت حال کے مطابق عورت کی تحقیر بھی کرتا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے جو یورپ نے بھی محسوس کیا کہ عورت کے حقوق تب پورے ہوں گے جب وہ دین سے آزاد ہوگی۔ جب تک دین کو اتار نہ پھینکا جائے، یہ حقوق حاصل نہ ہوں گے۔

رفاعہ کے مقصد سے قریب تر احمد فارس شدیاق تھا۔ اُس نے مقامی اسلوب میں مغربی طرز زندگی کو بیان کیا اور اُس میں عورت کا ذکر خاص طور پر کیا۔ اس کی کتاب ''الساق بالساق'' کو دیکھیے جس میں پیرس پر الگ باب قائم کیا گیا ہے۔ (۷۵۴)

اس طرح عورت کا مسئلہ اور نسوانی قضیہ پیدا ہوا۔

یہ تحریک سوچ سمجھ کر شروع کی گئی، محض سادگی کی بنیاد پر نہ تھی۔ لیکن یہ رفاعہ اور شدیاق وغیرہ کی آرا سے آزاد بھی تھی۔ بلکہ اس میں دیگر شخصی افکار بھی داخل تھے۔ جیسے جمال الدین اسد آبادی جو افغانی کے نام سے مشہور تھا۔ جمال الدین ماسونی نعروں سے متاثر تھا۔ یہ نعرے انقلاب فرانس میں مقبول ہوئے۔ خصوصاً مساوات

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا نعرہ۔ جمال الدین افغانی کے خیال کے مطابق مشرق کی خرابیوں میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہاں عورت اپنے حقوق وواجبات میں مرد کے مساوی نہیں۔ افغانی کا یہ عقیدہ اُس کے شاگردوں محمد عبدہ اور قاسم امین میں منتقل ہوا۔ قاسم امین جمعیت عروۃ الوثقیٰ کا مترجم تھا (۷۵۵)۔ محمد عبدہ کے بارے میں گفتگو گزر چکی ہے۔ قاسم امین وہ شخص ہے جو فرانس میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔ اُس کے بارے میں اُس کی زندگی کا مؤرخ لکھتا ہے۔

''قاسم جامعہ موصلیہ کے لیکچر تھیٹر کی طرف لوٹتا ہے۔ اُسے یورپ کی طرز زندگی کے متعلق گہری واقفیت کی خواہش تھی۔ اُسے یونیورسٹی میں ایک ہم جولی ''سلافہ'' ملتی ہے۔ قاسم سلافہ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے فرانسیسی معاشروں میں ساتھ لے کر جائے۔ سلافہ اس بات کو خوشی سے قبول کرتی ہے اور اسے کئی سماجی تقریبات میں لے کر جاتی ہے۔ وہ بہت سارے فرانسیسی گھرانوں کا تعارف کراتی ہے۔ قاسم دیکھتا ہے کہ فرانس کی معاشرتی زندگی مصر کی معاشرتی زندگی سے مختلف ہے۔ اُس نے حجاب کے بدلے بے پردگی کو دیکھا، گوشہ نشینی کے بدلے گھلنے ملنے کا ماحول دیکھا اور جہالت کے بدلے پڑھا لکھا ماحول دیکھا (۷۵۶)

قاسم امین جب مصر واپس آیا تو وہ اپنی قوم کے لیے اِس خطرناک فکر کو ساتھ لایا۔ اُس نے اپنے دوستوں پر یہ فکر پیش کی تو بعض ہچکچائے اور اکثر نے اُس کی تائید کی۔ خاص طور پر مصر کے سیاسی راہنما جیسے **سعد زغلول، مصطفیٰ کامل**، اور **احمد لطفی السید** (۷۵۷)۔ اسی طرح **علی شعراوی** جو ہدی الشعراوی کا خاوند تھا۔ ہدی الشعراوی تحریک نسواں کی راہنما کے لقب سے یاد کی جاتی تھی۔ اُن سب کے بارے میں کرومر یہ کہتا ہے: ''مختصر یہ کہ یہ سب مفتی سابق شیخ محمد عبدہ کے پیروکار تھے'' (۷۵۸)

قاسم امین نے اپنی فکر اپنی دو کتابوں ''تحریر المرأۃ۔ آزادی نسواں'' اور ''المرأۃ الجدیدۃ۔ جدید عورت'' میں ظاہر کی۔ جب پہلی کتاب صادر ہوئی تو کئی لوگوں نے شک کیا کہ اِس کتاب کا مصنف قاسم ہو سکتا ہے؟ کیونکہ کتاب میں بکثرت فقہی اقوال اور آرا نقد ومناقشہ کے ساتھ پیش کیے گئے تھے اور قاسم امین فقہی استدلال میں کمزور صلاحیت کا حامل تھا۔ قارئین کو اِس بارے میں ذرہ برابر بھی شک نہ تھا کہ قاسم نے جو فکر پیش کی ہے وہ یا تو کرومر سے حاصل شدہ ہے یا محمد عبدہ سے۔ (۷۵۹)۔ لطفی السید اِس اشکال کو اپنی کتاب ''قصۃ حیاتی'' میں اس طرح حل کرتا ہے:

وہ کہتا ہے: قاسم امین نے اپنی کتاب کے کچھ حصے اُسے اور محمد عبدہ کو پڑھ کر سنائے۔ یہ نشر عام ہونے سے قبل ۱۸۹۷ء میں جنیف مقام کا واقعہ ہے۔ (۷۶۰)

اِس قسم کا واقعہ قاسم امین نامی کتاب میں بھی آیا ہے (۷۶۱)

اُس کی کتاب تحریر المراۃ میں سے چند اہم افکار کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

① عورت ہر اعتبار سے مرد کے مساوی ہے۔ اگر مرد بدنی اعتبار سے عورت سے طاقتور ہے تو اِس کی وجہ بدن کا بکثرت استعمال ہے۔ (۷۶۲)۔ اِس سے پتہ چلتا ہے کہ قاسم امین قرآن کریم سے روگردانی کرنے والا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ڈارون کے نظریے سے متاثر تھا۔

② نقاب اور برقع اسلامی طریقے نہیں، یہ نہ تو عبادت کے لیے ہیں اور نہ ہی معاشرتی ادب کے لیے۔ بلکہ یہ اسلام سے پہلے کے قدیم طور طریقے ہیں۔ اور اسلام کے بعد بھی یہ اِس لیے جاری رہے کیونکہ مسلمانوں نے دیگر قوموں کے اختلاط سے یہ طریقے سیکھے۔ مسلمانوں نے اِن کو اچھا سمجھا، قبول کیا اور مبالغہ کر کے اِن کو دین کا حصہ بنا دیا۔ اس طرح دین کے نام پر کئی نقصان دہ طریقے لوگوں میں جڑ پکڑ گئے حالانکہ دین اِن سے بری ہے۔ دیگر قوموں کے اندر معاشرتی تقاضوں کے بدلنے اور ترقی اپنانے کی خاطر نقاب اور برقعے ختم ہو گئے لیکن مسلمانوں میں یہ سلسلہ جاری رہا۔ (۷۶۳)

③ حجاب فقط ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ یہ رذیل اخلاق کا سبب اور بے حیائی کی پردہ پوشی بھی ہے۔ جبکہ مرد و زن کا اختلاط نفوس کو مہذب کرتا ہے اور شہوات کے جذبات کو ختم کرتا ہے۔؟!!

قاسم امین نے تقلید مغرب کی دعوت دی لیکن اُس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے آپ کو اس تہمت سے بری ثابت کرے (۷۶۴)۔ چنانچہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُس کے نسوانی نظریات فقط اس جذبے سے ہیں کہ وہ دین اور وطن کی حفاظت کرنا چاہتا ہے۔ وہ دعویٰ کرتا تھا کہ اُس کی اصل فکر در حقیقت دارکور نامی مستشرق کے رد میں ہے جو حجاب کا سخت دشمن تھا۔ لیکن قاسم کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے دارکور کی مخالفت میں کوئی خاص کام نہیں کیا۔

قاسم کی دوسری کتاب ''المراۃ الجدیدۃ'' اُس کے اِس دعویٰ کی تکذیب کرتی ہے۔ وہ اُس میں خود کہتا ہے:

''یہ وہ بیماری ہے جس کا علاج جلد از جلد ضروری ہے۔ اِس بیماری کا علاج یہی ہے کہ ہم اپنی اولاد کو مغربی معاشرت اور تمدن کے مطابق فہم دین اور تربیت دیں۔ وہ مغربی اُصول، فروع اور آثار پر واقفیت حاصل کریں۔ جب یہ وقت آجائے، اور ہمیں امید ہے کہ یہ دور نہیں، تو ہماری آنکھوں کے سامنے حقیقت ایسے روشن ہو جائے گی جیسے سورج روشن ہوتا ہے۔ تب ہمیں مغربی تمدن کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوگا اور ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ہمارے احوال کی اصلاح اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اس کی بنیاد جدید علوم پر نہ رکھیں''۔ (۷۶۵)

قاسم نے اس طریق کار کو اپنے گھر میں لاگو کیا۔ اُس نے اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے دو دائیوں کا بندوبست کیا۔ ایک دائی فرانسیسی تھی اور دوسری انگریز۔ (۷۶۶)۔

قاسم امین نے بہت سارے زعما، ادبا اور صحافیوں کا تعاون حاصل کیا۔ کچھ کا ذکر ہم نے کر دیا ہے اور کچھ کا ذکر نہیں کر سکے۔ شاعر **ولی الدین** بھی انہی میں سے ہے۔ وہ اپنے ایک قصیدے میں کہتا ہے:

کاش کسی دن تو اپنے حسن سے پردہ ہٹا دے اور تو اس کو کہہ دے کہ میں تجھ سے تھک گئی ہوں۔ اے حجاب نہ تو میرا حصہ ہے اور نہ میں تیرا حصہ ہوں لہٰذا تو بھی کہیں چلا جا اور میں بھی جا رہی ہوں۔ (۷۶۸)

عراقی شاعر **زہاوی** کے کچھ اشعار اس طرح ہیں۔

لوگوں نے اپنی بیٹیوں اور ماؤں کا مذاق اڑایا ہے انھوں نے بیویوں اور بہنوں کو ذلیل کیا ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دنیا کے ہر گوشے میں مسلمانوں کا یہی حال ہے
انھوں نے اپنی جہالت کے سبب مسلمان عورتوں کو برقعے پہنا دیے
انھوں نے عورتوں کو گھروں میں قید کر دیا چنانچہ انھوں نے آدھی قوم کو شل کر دیا جن کی محنت ضروری تھی
انھوں نے عورتوں کو روک دیا کہ وہ روشنی دیکھ سکیں چنانچہ ان کی زندگی تاریکیوں کا شکار ہو گئی
یہ حجاب ہر سرزمین میں نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے نقصان کے سوا کچھ نہیں (۷۶۹)

مصر میں الحادی فکر کے فروغ میں میڈیا کا ہاتھ کامیاب رہا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں شام و مغربی افریقہ میں بھی صحافت نے اسی فکر کی تائید کی۔

بلاد شام کے اندر مصر کی بہ نسبت خواتین سے متعلق الحادی فکر دیر سے پہنچی۔ اس ضمن میں جو سب سے پہلی کتاب بتلائی جاتی ہے، وہ ۱۹۲۸ء میں صادر ہوئی یعنی قاسم امین کی وفات کے ۲۰ سال بعد۔ اس کتاب کی مصنفہ **نظیرہ زین الدین** تھی۔ اور کتاب کا نام "السفور والحجاب ۔ پردہ و بے پردگی" تھا۔ یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ اس کتاب کی تقریظ علی عبدالرزاق نے لکھی جو "الاسلام واصول الحکم" کا مصنف تھا۔ اس نے اپنی گفتگو میں کہا:

میں سمجھتا ہوں کہ مصر الحمد للہ حجاب و بے حجابی کے مسئلہ میں نظریاتی بحث کے مرحلے سے گزر کر عمل و تنفیذ کے میدان میں آ چکا ہے۔ آج مصریوں میں فقط پس ماندہ لوگ ہی ہیں جو سوال اٹھاتے ہیں کہ بے پردگی دین میں ہے یا نہیں؟ یہ معقول ہے یا غیر معقول؟ یہ جدید زندگی کی ضروریات میں سے ہے یا نہیں؟ ہم رجعت پسند پردہ دار طبقے میں بھی بہت سارے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو اس بات پر ایمان لا چکے ہیں کہ بے پردگی دین، عقل اور ضرورت کے عین مطابق ہے اور شہری زندگی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

ہمارے شامی بھائی کے ہاں حجاب و بے حجابی کی تاریخ مصر سے مختلف ہے۔ وہ ابھی نظری بحثوں سے آگے نہیں بڑھے حالانکہ یہ بحثیں بیس سال پہلے مرحوم قاسم امین نے چھیڑ دی تھیں۔ اس کے باوجود شامی جدید دور میں ہمارے پہلو بہ پہلو ہیں اور عملی طور پر اور کلی طور پر بے حجابی کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ (۷۷۰)

بلاد مغرب میں تیونس بے حجابی کی دعوت میں سب سے آگے تھا۔ طاہر حداد نے ۱۹۳۰ء میں اپنی کتاب 'ہماری عورت۔ شریعت، معاشرہ اور عملی میدان میں' لکھی۔ اس کتاب سے متاثر ہو کر دو فن کاروں نے مل کر اپنا ایک فن پارہ ترتیب دیا۔ **محمود بیرم** شاعر اور **علی الدعاجی** مصور نے مل کر اس کو تخلیق کیا۔ شاعر تیونسی عورت کے پردے کے مراحل بتلاتا ہے۔ یہ کل سولہ اشعار ہیں۔ ہر چار شعروں میں پردے کے ارتقا کے ایک مرحلے کو بیان کیا گیا ہے۔ علی الدعاجی نے چار تصاویر میں معانی کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان چار تصاویر میں عورت مختلف ماحول میں نظر آتی ہے۔

پہلے اشعار اور تصویر نے ایک عورت کو پیش کیا جو مکمل طور پر برقعہ اوڑھے ہوئے تھی۔ اور اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ ظاہر نہ تھا۔ بیرم نے اس کو اس طرح تشبیہ دی جیسے ایک روشن دن پر ایک کالی رات نے پردہ ڈالا ہوا ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رات کو سیاہی نے ڈھانپ لیا
تاکہ اِس رات سے کوئی امید نہ لگائی جائے
یہ سیاہی حق کو ایسے ڈھانپ لیتی ہے
جیسے کافر منکر کا دل حق سے دور ہوتا ہے

اور جب عورت نے دوسری تصویر کے اندر نقاب کا کچھ حصہ کھلا چھوڑ دیا تو اُس کے ملگفن چہرے کے نور سے تھوڑی روشنی ظاہر ہوئی۔ شاعر اِس کوشش کو دھوکے باز روشنی قرار دیتا ہے۔

دھوکے باز روشنی ظاہر ہوتی ہے
جیسے غدار لیکن ہنسنے والے شخص کا رنگ روپ
یہ ایسی روشنی ہے جو شک پیدا کرتی ہے
ایک بے صبرے اور صابر دل دونوں کے لیے

اگلے منظر میں دعا جی مصور کے برش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عورت نے اپنا دوپٹہ ٹھوڑی تک کھولا ہوا ہے۔ اور اچانک زندگی اور سورج کا نور ہر طرف پھیل جاتا ہے۔ شاعر خیال کرتا ہے کہ اِس زبردست قدم سے صبح طلوع ہوتی ہے اور مرد و عورت کے دو جنسوں کا ایک دوسرے پر اعتماد قائم ہوتا ہے۔

صبح طلوع ہوئی اور صبح کی روشنی میں
عورت کا دل فریب باغ روشن ہوگیا
دونوں رخساروں میں موجود گلابی رنگت نے کہا
پاکیزہ خون ہے۔ آنکھیں جھکا لو

آخر میں عورت نقاب کو باقی رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی بلکہ گردن میں لٹکانے کی بجائے ایک ہی دفعہ اتار پھینکتی ہے۔ اور اِس کے ساتھ تنگ نظر رسومات کے بندھن بھی دور جا گرتے ہیں۔ اور وہ حق دیکھنے والوں کے سامنے سورج کی طرح چمکتی ہے اور اُس کا نور پوری دنیا کو ڈھانپ لیتا ہے۔

اور سورج کی روشنی میں اُس کا تاب ناک حسن پوری دنیا کا نظارہ کرتا ہے
ہر آواز والا تلاوت کرتا ہے اور اللہ قادر و بدیع کی تعریفیں کرتا ہے
اور ہر آنکھ والا جان لیتا ہے کہ حسن بدکار نہیں ہوتا

اس وقت لوگوں کی عقلوں کو پتہ چلتا ہے کہ عفیف اور فاجر میں کیا فرق ہوتا ہے۔ (۱۷۷)

یہ عورت کے قضیے کا نظریاتی پہلو تھا۔ اگر ہم عملی پہلو دیکھیں تو سب سے زیادہ بوجھ اُس تحریک نے اٹھایا جس کو ''بیداری نسواں کی تحریک'' کے نام سے پکارا گیا۔ اس کی مشہور خواتین یہ تھیں: **ہدی الشعراوی، سیزا نبراوی** سیکرٹری ہدی، **باحثہ البادیہ، منیرہ ثابت**۔ اِن کے اردگرد عورتوں کی ایک جماعت تھی جنھوں نے حیا کے پردے کو

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتار پھینکا اور اپنے آپ کو صلیبی مقاصد کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

اِس تحریک کے جوش و جذبہ کو اُس وقت انگیخت ملی جب ایک ہنگامی دور میں محسوس ہوا کہ ملک میں کوئی خاص ہلچل ہونی والی ہے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔ مصر استعمار کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ عوام چند مخلص افراد کے ساتھ حقیقی طور پر اپنے حریت و حیات کے مطالبہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ شور و شغب کا دور تھا جو عوامی بے چینی و بے قراری کو ظاہر کر رہا تھا۔ اِس قسم کے سخت انقلابی ماحول میں دو قسم کی خطرناک دعوتیں پروان چڑھیں جو آپس میں تعاون کی حامل تھیں۔ ایک دعوت نے انقلابی ماحول کو استعمال کر کے امت کو اُس کی اصل دینی نسبت سے دور کیا۔ یہ لادینیت کی دعوت تھی جو کھلم کھلا نہ تھی بلکہ مخصوص نعروں کے پردوں میں چھپی ہوئی تھی یعنی دین اللہ کا اور وطن سب کا۔ دوسری دعوت نے اسلامی اخلاق کو پیس کر رکھ دیا، یہ آزادی نسواں کی دعوت ہے۔

اِس تند و تیز ماحول میں ہدیٰ اور اُس کی سہیلیاں وطن کے حقوق اور قابض قوتوں کو دور بھگانے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ لیکن انھوں نے وطن کا دفاع اِس طرح کیا کہ وہ سب ایک مظاہرہ میں نکلیں، حجاب کو پھاڑ دیا اور ایک کھلے میدان میں اُس کو جلا ڈالا۔ یہ انقلاب کے اندر اُن کا سب سے بڑا حصہ تھا۔ برطانوی سپاہیوں نے اپنی بعض ظاہری وجوہات کی بنا پر مظاہرہ کے دوران سڑکوں کا گھیراؤ کیا اور مظاہرہ کرنے والی بعض خواتین پر زیادتی کی تو عوام کی نظر میں یہ بات آ گئی کہ مصری عورت برطانیہ سے آزادی کی کوشش کر رہی ہے۔ اس طرح نسوانی تحریک نے وطنی شجاعت کی داد وصول کی۔!! (۷۷۲)

اس سے زیادہ واضح حقیقت اُس وقت معلوم ہوتی ہے جب اتاترک بھی وطنی شجاعت کے پردے میں اسلام کو گرانے میں مصروف تھا۔

وطنی شجاعت کو اخلاقی فضائل کے خاتمے کے لیے جواز بنایا گیا۔ بلکہ اسلام کے احکام پر کھلا حملہ کیا گیا۔ اباحیت پسندوں نے بار بار یہ بات دہرائی: کیا صنف نازک نے وطنی و قومی آزادی میں اپنا کردار ادا نہیں کیا؟ کیا وہ اِس لائق نہیں کہ وہ صنف کرخت کے برابر ہو سکے؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ عورت وطن کے لیے سب کچھ قربان کرے اور وطن اُس کے لیے کچھ بھی پیش نہ کرے؟

سچی بات تو یہ تھی کہ نسوانی تحریک حقیقی طور پر ایک مشکوک عملی تحریک تھی جس کے خارج میں استعماری قوتوں کے ساتھ تعلقات تھے اور داخل میں نام نہاد لیڈروں کے ساتھ تعلقات تھے۔

استعمار سے تعلقات، خصوصاً عیسائی تبلیغی جمعیات سے رابطہ، اِس کی تائید ہمیں ہدیٰ الشعراوی کی اس تقریر سے معلوم ہوتی ہے جو اس نے برما کی عالمی اتحاد نسواں کی کانفرنس میں کی۔

اس تقریر کا مقدمہ اس طرح ہے:

مجھے حقیقت میں اِس بات سے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں اِس محترم و مکرم محفل میں آپ سب کے درمیان موجود ہوں۔ اِس محفل نے تاریخ میں پہلی مرتبہ ممکن بنایا کہ مصری عورت اپنے حقوق کے مناقشے کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیے آئے۔ مجھے بے حد فخر اور خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یل کی بیٹیوں اور یورپی بہنوں کے درمیان رابطہ قائم ہو گیا ہے۔(۷۷۳)

اُس نے اپنی گفتگو یہ کہہ کر ختم کی۔

''میری قابل احترام خواتین! میں واپس جانے سے قبل آپ سے اِس بات کی اجازت چاہوں گی کہ مصری عورت کو بھی اپنے عظیم اتحاد میں شامل کر لیں۔ ہمیں بہت سی امیدیں ہیں کہ ہم آپ کی قیمتی نصیحتوں کو، جن کو ہم سیدھا راستہ شمار کرتی ہیں، اچھی طرح سے وصول کریں گی۔ ہم آپ کے طریقے پر چلیں گی جس میں ہماری امیدوں اور تمناؤں کے پورا ہونے کی امید ہے۔ ہم آپ کے زیر تصرف، آپ کے اُصول و آرا کو نشر کرنے کی ہر ممکن خدمت بجالائیں گی''۔(۷۷۴)

نسوانی تحریک کا نام نہاد سیاسی لیڈروں سے تعلق اس طرح واضح ہوتا ہے کہ سعد زغلول کا سیکرٹری (جو حزب الوفد کا لیڈر تھا) سعد کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سعد نسوانی تحریک کا حقیقی لیڈر تھا۔ وہ سعد کی ایک تقریر کا حوالہ دیتا ہے جو اُس نے فرانسیسی حقوق کی ایک مصری تعلیم گاہ میں طلبا سے ملاقات کرتے ہوئے پیش کی۔ اِس تقریر میں وہ کہتا ہے:

''میں آزادی نسواں کے حامیوں اور مددگاروں میں سے ہوں۔ اِس نسوانی آزادی کے بغیر ہم اپنے ہدف تک نہیں پہنچ سکتے۔ میرا یہ یقین فقط آج کا نہیں بلکہ قدیم دور سے ہے۔ میں بہت طویل زمانہ پہلے اپنے دوست مرحوم قاسم امین بک کے ساتھ اس کے افکار میں شریک رہا ہوں۔ قاسم امین نے اپنے افکار اپنی کتاب المرأة الجديدة میں بیان کیے اور مجھے وہ کتاب تحفتہً دی''(۷۷۵)

مصنف لکھتا ہے کہ سعد کی بیوی مکمل طور پر فرانسیسی ثقافت کی حامل تھی۔ اور سعد نے اُس کو مکمل آزادی دے رکھی تھی (!)۔ سعد کی بیوی کے طور طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالباً پہلی عربی سیاسی لیڈر کی بیوی تھی جو اپنے خاوند کے ساتھ محافل اور تصاویر میں بے پردہ ظاہر ہوتی تھی۔ وہ مغربی طرز پر زغلول کی محبوبہ کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ اس نے سب سے پہلے یہ بدعت نکالی کہ مصریوں کی ماں کا لقب اختیار کیا۔(۷۷۶)

مصنف لکھتا ہے کہ زغلول کی یہ چہیتی، نسوانی تحریک کی حقیقی لیڈر تھی۔ لیکن اُس نے ظاہر ہونا پسند نہ کیا۔ اُس نے اور اُس کے خاوند نے ہدی الشعراوی کو منظر عام پر رکھا۔ ہدی کو سعد نے اپنی ایک خواتین کی کمیٹی کا صدر بھی بنایا۔(۷۷۷)۔ سعد کے سیکرٹری نے نادانستگی میں یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ سعد اور نسوانی تحریک استعمار کے قریب تر تھے بلکہ اُس سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سب باتیں اُس نے اس ضمن میں بیان کیں کہ سعد کے اپنی دوست ''منیرہ ثابت'' سے کیسے تعلقات تھے۔ جس کا لقب ''انقلابی خاتون'' تھا اور جو مصر کی پہلی خاتون صحافی تھی۔

وہ کہتا ہے۔ زیوری وزارت نے ''وفد'' کی صحافت پر پابندیاں عائد کرنا شروع کر دیں۔ اور اُس کے جرائد کو یکے بعد دیگرے بند کرنا شروع کر دیا۔ وہ کسی وفدی کو کوئی نئی رخصت دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ اچانک کچھ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دنوں کے لیے محترمہ منیرہ ثابت اپنی ماں کے گھر سے غائب ہوگئیں۔ پھر جب وہ واپس آئیں تو دو نئے صحیفوں کی رخصت حاصل کر چکی تھیں یعنی **امل** اور **بسوار**۔ پہلا سیاسی عربی ہفتہ وار رسالہ تھا جبکہ دوسرا فرانسیسی سیاسی روزنامہ تھا۔ اُس نے دونوں رخصتیں رئیس جماعت ''سعد'' کو پیش کیں تا کہ وہ اُس کے زیر تصرف رہیں۔ رہا یہ سوال کہ اس نے یہ دونوں رخصتیں کیسے حاصل کیں۔ میں اس بارے میں آج تک کچھ نہیں جانتا۔ (۷۷۸)

پھر یہ معاملہ پروان چڑھا اور کئی نسوانی جماعتیں تشکیل پائیں۔ جن میں سب سے اہم **الحزب النسائی** (۱۹۴۵ء) ہے۔ اور دوسری **حزب بنت النیل** (۱۹۴۹ء)۔ مصری اخبارات نے بذات خود اِن دونوں تنظیموں کی رسوائیوں کو نشر کیا۔ انھوں نے ثابت کیا کہ یہ تنظیمیں مغربی سفارتوں خصوصاً امریکہ اور انگلینڈ سے مال وصول کرتی ہیں۔ (۷۷۹)

نسائی تحریک کے نتیجے میں **نسائی صحافت** بھی وجود میں آئی۔ جنگ عظیم سے قبل مجلّہ ''**فتاۃ الشرق**'' صادر ہوا۔ یہاں یہ اشارہ ضروری ہے کہ اُس کا ہر شمارہ مہینہ بھر کے یورپی فیشن کو تصویروں اور مثالوں کے ساتھ شائع کرتا۔ (۷۸۰)

یہ ساری کوشش اِس لیے کی جارہی تھی تا کہ مسلمان عورت بھی یہودی فیشن کے شکار میں اس طرح پھنس جائے جس طرح نصرانی عورت مغرب میں گرفتار ہوئی۔

خواتین کے مجلّات سے ہٹ کر دیگر مجلّات ''**الہلال**، **المقتطف**، **العصور**'' نے بھی نسوانی تحریک کے لیے اپنا تعاون پیش کیا۔ یہ مجلّات نسوانی موضوعات پر فکری مناقشہ جات نشر کرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی و مغربی حسیناؤں کی تصاویر سج دھج سے شائع کرتے۔ اور اُن کی عظمت کے ایسے پل باندھتے کہ قاری خواتین اُن کی نقالی کرنے پر مجبور ہو جاتیں۔

تعلیمی میدان میں **لطفی السید**، **طہٰ حسین** اور اُن کے پیروکاروں نے کوشش کی کہ تعلیم مرد و زن دونوں کے لیے مخلوط ہو۔ اس وجہ سے یونیورسٹی کا ماحول کشیدہ ہوگیا۔ **شیخ رافعی** نے طہٰ حسین اور **سمیر قلمادی** کے رد میں ''شیطان و شیطانہ'' کی تحریر لکھی۔ انھوں نے ایک مقالہ لکھا جو اختلاط کو ناپسند کرنے والے طلبا کے لیے حیات بخش ثابت ہوا (۷۸۱)۔ لیکن کامیابی اختلاط کے داعیوں کو ہوئی کیونکہ اُن کی صف میں سیاسی لیڈر اور اکثر صحافی تھے۔ اِس کے علاوہ عیسائی مشنری اور یونیورسٹی کے مستشرقین جیسی دخیل قوتیں بھی سرگرم تھیں۔ یہ قوتیں طلبا کی اسلامی تحریک سے گھبرا گئیں اور انھوں نے اس محاذ پر سخت جنگ لڑی۔

نسوانی تحریک کے لکھاریوں کو کئی کامیابیاں حاصل ہوئیں لیکن اُن کی تسلی نہ ہوئی کیونکہ اُن کے آقا مزید کامیابیوں کے منتظر تھے۔ یہ نفسیاتی جنگ جاری رہی۔ حتی کہ بعض نے مبالغہ میں انتہا کر دی۔ انھوں نے کہا کہ معر کے کی تمام مشکلات اول تا آخر صرف ایک سبب سے ہیں اور وہ عورت کا مسئلہ ہے۔ چنانچہ **سلامی موسیٰ** کا قول ملاحظہ کیجیے:

''ہماری مشکلات یہ وہم پیدا کرتی ہیں کہ شاید ہمیں کئی قسم کی خرابیاں لاحق ہیں اور جن کا آپس میں کوئی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعلق نہیں۔ لیکن غور وفکر کرنے والا اُن کا نقطہ ارتکاز تلاش کرسکتا ہے، جہاں ان سب مشکلات کی جڑ اکٹھی ہوتی ہے۔ خاندان کا مرکز عورت ہوتی ہے۔ ہمارا اخلاق اور معاشرہ پدرسری یعنی مرد کی حاکمیت پر مبنی ہے۔ اِن سب مشکلات کی وجہ ایک ہی ہے کہ ہم نے قدیم جاگیردارانہ ذہنیت اختیار کی ہوئی ہے۔ جس کا اکثر حصہ ہم نے ملعون رومی سلطنت سے حاصل کیا (مصنف اسلام کا اعتراف نہیں کرنا چاہتا)۔ جاگیردارانہ ذہنیت جدید دور کی زندگی کے لیے مناسب نہیں رہی۔ ہماری تمام تر جدوجہد، اِسی ایک راہ میں ہیں کہ ہم جدید ڈیموکریٹک زندگی کو اپنائیں اور قدیم جاگیردارانہ زندگی سے جان چھڑائیں'' (۷۸۲)

اسماعیل مظہر نے قدیم اور جدید لوگوں کی آرا کو اپنی ایک کتاب میں جمع کر دیا اور اُس کا نام رکھا (عورت، ڈیموکریٹک دور میں)۔ اِس میں مذکور ہے: واضح اور روشن حق سے اندھے بہت سارے لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورت کا قضیہ حل ہو چکا ہے۔ قدیم دور نے اِس کے قواعد وضع کر دیے، فصول قائم ہوچکیں اور فروعات مکمل ہوگئیں۔ وہ اس بارے میں ایسے نظریات اور اقوال کی پیروی کرتے ہیں جن کو زمانے نے بوسیدہ کر دیا اور عصر حاضر اُن سے دور ہو چکا ہے۔ یہ نظریات ڈھیلے ہوگئے، اور لوگ اُن سے دور ہٹ گئے۔ لیکن بعض لوگ ابھی بھی چرب زبانی سے ان خرابیوں پر پردہ ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں۔ عورت گھر کے لیے ہوتی ہے۔ آدمی بیوی پر نگران ہوتا ہے۔ عورت کے لیے کوئی نفس نہیں ہوتا۔۔۔ (۷۸۳)

اس میں یہ بھی لکھا ہے۔ ''رجعت پسند لوگ ترقی سے خوف کھاتے ہیں کیونکہ اُن کے دلوں پر کچھ وہم مسلّط ہو چکے ہیں۔ یا وہ عورتوں پر اپنا قبضہ کمزور نہیں کرنا چاہتے۔۔۔ انھوں نے کچھ نصوص کا سہارا لے کر عورتوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنالیا ہے۔ حالانکہ اِن نصوص میں مخصوص زمانے کے حالات کی رعایت کی گئی ہے۔ ایک خاص زمانے میں عورت کو تلقین کی گئی کہ وہ اپنے گھر میں قرار پکڑے اور قدیم جاہلیت کی طرح بن ٹھن کر نہ نکلے۔ (۷۸۴)

پھر وہ دونوں دلیلوں کا مناقشہ کرتا ہے: رجعت پسند لوگ عورت کو گھر میں پابند رہنے کا معنی اخذ کرتے ہیں حالانکہ اس معنی میں جدید دور کے حوالے سے خاصا غموض ہے۔ اُن کی یہ کوشش بھی ہے کہ وہ آیت کا ایسا معنی کریں جو اُن کی نفسانی خواہش کے عین مطابق ہو۔

جب وہ چاہتے ہیں کہ عورت گھر کی قیدی بن جائے تو وہ اِس بات کو جدید دور کے لوازم کے ساتھ کیسے ہم آہنگ کریں گے۔ اور جب وہ اِس کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں کہ عورت اُس وقت گھر رہے جب اُس کو گھر سے باہر کوئی مشغولیت نہ ہو تو یہی معنی تو جدید زندگی اور اُس کی عملی تصویر کے عین مطابق ہے (۷۸۵)

یہ لوگ جو قدیم دور کی عینک کے ساتھ زندگی کو دیکھتے ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ عورت کے ہر بناؤ سنگھار کو جو عورت اختیار کر کے باہر نکلتی ہے ''تبرج'' سے تعبیر کرتے ہیں اور اُس کو قدیم جاہلیت کا تبرج قرار دیتے ہیں حالانکہ لفظ تبرج کی ریاضیاتی حدود متعین نہیں۔ اور اسی طرح قدیم جاہلیت کے تبرج کا کوئی جامع مانع وصف بھی ہم تک نہیں پہنچا۔!!

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

راجح معنی یہ ہے کہ تبرج سے مقصود وہ طور طریقہ تھا جو قدیم زمانوں میں مانوس تھا۔ وہ اپنی پیدائش میں ایک دینی طریقہ تھا۔ لوگ اُس کو دین سمجھ کر اختیار کرتے تھے۔ جنسی بدکاری آج کل کی تحقیق کے مطابق شروع شروع میں دینی مظہر تھی۔ یہ معبودوں کے تقرب کا ذریعہ شمار ہوتی تھی۔۔۔

پھر وہ کہتا ہے: ''جب اسلام آیا۔۔۔ اُس نے عورت کی طرف توجہ دی اور اُس کو نصف انسان قرار دیا۔ اسلام نے عورت کے لیے کرامت واحترام کا وہ معیار اختیار کیا جس سے آج تک تمام قانون ساز متاثر نظر آتے ہیں۔۔۔ لیکن پندرہ صدیوں کے گزرنے کے بعد انسانی عقل اس قدر ترقی کر چکی تھی کہ وہ عورت کے حوالے سے چند قدم آگے قانون سازی کی متقاضی ہوئی۔۔۔

اس اعتبار سے دیکھیں تو میرے خیال میں کوئی ایسا مانع نہیں جو عورت کو تمام شہری وسیاسی حقوق میں مرد کے برابر قرار نہ دے مثلاً وراثت، گواہی کی قبولیت، ملازمتیں، فکری واقتصادی خودمختاری، مختصر یہ کہ تمام اشیا وامور جن کے ساتھ اُس کی انسانیت مکمل ہوتی ہے۔ عورت بھی آخر انسان ہے۔(۷۸۶)

پھر اس کے بعد **خالد محمد خالد** اپنی کتاب ''ڈیموکریسی ہمیشہ کے لیے'' کے ساتھ آیا۔

عورت کو ڈیموکریسی سے دو چیزیں حاصل ہوئیں۔

① عورت کو خاوند کی متعدد شادیاں روکنے کا حق حاصل ہوا۔ اُس کے مطابق محمد عبدہ سے منسوب یہ قول اہم ہے کہ تعدد ازواج اب مستقل طور پر حرام ہے کیونکہ حدیث ہے [لاضرر ولاضرار]۔ یعنی نہ خود کو نقصان دو اور نہ دوسروں کو نقصان دو۔(۷۸۷)

② طلاق کو قومیانا۔ مصنف کے مطابق طلاق فرد کی ملکیت نہیں بلکہ اس کا فیصلہ قاضی کرے گا۔(۷۸۸)

پھر **حسین مونس** آیا۔ یہ اسلامی حجاب کو مصر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قرار دیتا ہے جو مصر کو مغرب کی طرف چلنے نہیں دیتا۔ اُس کا خیال ہے کہ مصر پس ماندہ مشرقی معاشروں کے ساتھ جڑا ہوا ہے حالانکہ قدیم مصری عورت جدید یورپی عورت کے ہم مثل ہوتی تھی اور دونوں کی تہذیب ایک تھی۔ وہ کہتا ہے: مشرقی معاشرہ اس لیے تباہ ہوا کیونکہ انھوں نے عورت پر ظلم کیا اور اُس کو حقیقی مقام ومرتبہ سے محروم کر دیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو مشرقی ممالک کی تاریخ پڑھنے والے اکثر افراد محسوس نہ کر سکے۔ لیکن یہ بات اہل مغرب کے قارئین کے ہاں معروف ہے۔ کیونکہ اُن کا معاشرہ مرد وعورت دونوں کی بنیاد پر قائم ہے۔ وہ لوگ انسانی معاشرہ میں عورت کی اہمیت کو پہچانتے ہیں۔ اور وہ اِس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ اِس بات کو بڑی تاکید سے بیان کرتے ہیں کہ اُن کے معاشرہ کی دیگر معاشروں کی بہ نسبت ترقی کا سبب عورت کو اہمیت دینا ہے۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ یہی چیز دو مختلف معاشروں کا اصل فرق ہے اور یہی زندہ رہ کر پروان چڑھنے والی تہذیبوں اور کملا کر مردہ ہونے والی تہذیبوں کے مابین امتیاز ہے۔

قدیم مصری تہذیب نے عورت کو اُس کا حق دیا اور اُسی کی فضیلت کا اعتراف کیا۔ اُس نے عورت کو گھر، عملی میدان اور زندگی کے تمام حقوق سے نوازا۔ آپ جونسی بھی قدیم مصری تصویر دیکھ لیں اُس میں عورت کو مرد کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہمراہ دیکھیں گے۔عورت کا سر بلند ہوگا اور وہ مرد کے ساتھ چلتی پھرتی اور کام کرتی نظر آئے گی۔۔۔

اس اساسی پہلو کے اعتبار سے مصر کی اصل تہذیب، ہماری قدیم ترین تہذیب ہی ہے۔آج ہم جس کو مغربی تہذیب کہتے ہیں۔وہ درحقیقت قدیم مصری تہذیب کی ہی ایک شکل ہے جو صحیح رخ پر ترقی پا گئی (۷۸۹)

مغرب کی آواز لگانے والے ہر جگہ چیختے رہے اور فکری وعملی اعتبار سے ہر رجحان کو اختیار کرتے چلے گئے حتی کہ یہ تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوگئی جس کو جان پول رونے واضح بیان کیا ہے۔

''مغرب کا اثر ہر میدان عمل میں غالب آیا ہے۔اور اُس نے اسلامی معاشرے کو الٹ کر رکھ دیا۔لیکن سب سے زیادہ واضح اثر، عورت کی آزادی کے مسئلے میں نظر آتا ہے۔''(۷۹۰)

اب اخلاقی بے راہ روی پورے عالم اسلام میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک کم وبیش پھیل چکی ہے۔نئی نسل جس کو استعمار نے خود تربیت دی ہے۔وہ سب سے زیادہ مسخ اور دینی پابندیوں سے آزاد ہو چکی ہے۔ اللہ کے احکام کو جتنا آزادی کی جدوجہد کرنے والے ہیروز نے پامال کیا ہے، اتنا تو خود استعمار نے بھی پامال نہیں کیا۔ہم رو کی بات سنیں۔وہ کہتا ہے۔''ترکی میں سن ۱۹۲۹ء کے اندر ایک شہری قانون صادر کیا گیا جو سوئٹزرلینڈ کے قانون کی طرز پر ہے۔چنانچہ اُس نے تعدد زوجات کو ممنوع قرار دیا ہے۔حجاب اور طلاق کے اختیارات ختم کر دیے۔اس طرح سے ترکی عورت ایک مختصر دورانیے میں سوئس عورت کی ہم مثل ہوگئی ہے۔(۷۹۱)

پھر وہ کہتا ہے: جدید ترکی عورت عام زندگی میں شب بیداری والا لباس پہنتی ہے جس سے کندھے اور کمر ننگی ہوتی ہے۔وہ باریک لباس پہننے سے بھی اجتناب نہیں کرتی۔لیکن اس میں مبالغہ کرنے سے اجتناب کرتی ہے۔رہی عشق ومحبت کی باتیں اور سرگرمیاں تو یہ اعلانیہ سرانجام نہیں پاتے اور اسی طرح بوسہ وکنار بھی سب کے سامنے نہیں ہوتا۔اس کے باوجود سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ اخلاقی بندھن کمزور ہوتے جارہے ہیں۔(۷۹۲)

الجزائر کے اندر انقلاب نے عورتوں کو جدوجہد پر مجبور کیا۔باغی کنواری لڑکیاں اپنے گھر سے نکل کھڑی ہوئیں اور انھوں نے حجاب اتار پھینکا۔الجزائر میں اسلام پھیلنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔امن کے دور میں وہ فتنے کھڑے نہیں ہوئے جو سخت معرکہ کے حالات میں واقع ہوئے۔یہ صورت حال مصری عوامی انقلاب سے ملتی جلتی ہے۔

تیونس کے اندر سید بورقیبہ نے کئی قراردادیں منظور کی ہیں جو جدید معاشرتی انقلاب کا پیش خیمہ ہیں۔ اس انقلاب کا مقصد تعدد ازواج پر پابندی لگانا، لڑکی کی شادی کی کم از کم عمر پندرہ سال مقرر کرنا، مقامی لڑکوں اور لڑکیوں کو ماں باپ کی پسند کی شادی سے آزاد کرنا جب وہ بیس سال کی عمر کو پہنچ جائیں، اسی دوران سید بورقیبہ نے اعلان کیا۔۔۔کہ طلاق کا اختیار فقط عدالت کے پاس ہوگا (۷۹۳)

اسی طرح مجلّہ العربی نے تیونس کے متعلق اپنی اطلاع کے مطابق ایک تصویر نشر کی ہے جو سڑک کے کنارے نصب شدہ ایک سائن بورڈ کی ہے۔اِس میں ایک میدان کے اندر دو تختیاں دکھائی گئی ہیں۔ایک تختی شرم و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حیا کے پردے میں ملبوس ایک خاندان کی منظر کشی کر رہی ہے اور اس پر کراس (×) کا نشان لگا ہے جبکہ دوسری تختی ایک بے حجاب فرنگی خاندان کی منظر کشی کرتی ہے۔ جس کے نیچے لکھا ہے ''اس جیسی بن''۔!

رہی وہ قرار دادیں جن کی طرف رو نے اشارہ کیا ہے تو یہ وہ قوانین ہیں جو دوسری حلال شادی پر تو سختی کرتی ہیں لیکن دس حرام آشنا عورتیں رکھنے پر کوئی مذمت نہیں کرتیں بلکہ حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

وہ خطرناک اسلحہ جس نے اسلامی فضائل کو تباہ کیا، اسلامی معاشرہ کی کمر توڑ کر رکھ دی اور مغربی معاشرے کی وبائیں ہمارے ہاں منتقل کیں، میڈیا کے وسائل کا اسلحہ تھا۔ یعنی صحافت، ریڈیو، سینما اور ٹیلی ویژن۔ میڈیا نے فنی مہارتوں اور جدید اسلوب کے ساتھ فتنے اور اخلاقی ابتری کی تمام انواع کو زبردست طریقے سے پیش کیا۔ یہ نفسیاتی جنگ کا اتنا وسیع وعریض محاذ تھا کہ اس کے مقابلے میں اصلاح کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی اخلاقی فضائل کی کوئی آواز لوگوں کی توجہ حاصل کر سکی۔ (۷۹۴)

اس کے ساتھ ساتھ مخلوط تعلیم، مخلوط مجالس وتقاریب اور سمندر کنارے مخلوط ماحول نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ مغرب میں موجود یہود کے گھروں سے اخلاق باختہ فیشن درآمد کیے گئے۔ مانع حمل ادویات اور اسقاط کے وسائل داخل کیے گئے۔

اس کے ساتھ حکومتی اور اداراتی دائروں میں کھلم کھلا اختلاط واقع ہوا۔ وسائل مواصلات، گلی کوچے، گھریلو آبادیاں، عالم اسلام کے بڑے بڑے علاقے مرد وزن کی مخلوط معاشرت کا مرکز بن گئے۔

تب ہمیں تعجب بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے اردگرد گا ہے بگا ہے وہی معاشرتی جرائم واقع ہونے لگیں جو یورپ اور امریکہ کے مشابہ ہیں جیسے قتل، مال لوٹنا، آوارہ گردی، اغوا وغیرہ۔ ہمیں اس بات میں بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ ہمارے ہاں وہ مہلک امراض پھیل رہے ہیں جو مرد وزن کی انفرادی خصوصیات کو ترک کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے خیال میں یہ بھی مردوں کے مخنث اور عورتوں کے مرجل ہونے کی ایک قسم ہے۔ مشکلات پیدا ہو رہی ہیں جو اسلامی ممالک کہلانے والوں کی حدود میں ہیں۔

غیر محفوظ تربیت سے غیر محفوظ نسل ہی جنم لے گی۔ ہماری جدید نسل کو دیکھ لیں جو شہوات اور شبہات میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تناقضات اور گمراہیاں اُس کو کچلے جا رہی ہیں۔ مہلک اکساہٹیں اور باطنی بے چینی اُس کو ہلاک کرنے کے درپے ہے۔ یہ نسل شیاطین اپنے آپ کو جن وانس کے ہاتھوں کے حوالے کر چکی ہے اور وہ اُس کے جسم وفکر کو نوچ رہے ہیں۔ اُس کی کمر کو اپنے کوڑوں سے سرخ کر رہے ہیں حتی کہ یہ نسل فسق وفجور اور اباحیت کے ذبح خانے پر گلے کٹوانے پر تیار ہو گئی ہے۔

کتنی تعجب کی بات ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود ابھی بھی مسموم الحادی دعوتیں اپنے عروج پر ہیں۔ الحاد کی موجیں شباب پر ہیں۔ ہر جگہ سے یہ آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ قدیم طور طریقوں کو رد کر دینا چاہیے۔ اخلاق کو دین سے آزاد ہونا چاہیے۔۔۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حصہ پنجم

اسلام میں سیکولرزم کا حکم

باب ⑲ کیا اسلام میں سیکولرزم کی گنجائش اور ضرورت ہے؟

باب ⑳ اسلام میں سیکولرزم کا حکم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب:۱۹

کیا اسلام میں سیکولرزم کی گنجائش اور ضرورت ہے؟

سیکولرزم کے دشمنوں اور داعیوں دونوں کو کوئی شک نہیں کہ سیکولرزم اغیار کی درآمد شدہ فکر ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ خالص اسلام سے حاصل شدہ نہیں اور نہ ہی اسلام سے منسوب لوگوں کی فکر کا نتیجہ ہے۔ اِس لیے سب سے پہلے سیکولرزم سے ہمارے تعلق کی بنیاد اُس طرح ہوگی جس طرح کسی بھی درآمد شدہ چیز کی ہوتی ہے۔ عقل مند قوم ہونے کے ناطے ہمارا فریضہ بنتا ہے کہ ہم ہر نئی درآمد کو بہت احتیاط سے دیکھیں اور اپنے لیے پسند کریں۔ یقیناً یہی اُصول سیکولرزم پر بھی لاگو ہوگا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اِس سے مکمل طور پر بے نیاز ہیں۔ ہم انتہائی احمق اور بے وقوف ہوتے اگر ہم سیکولرزم کو قبول کرتے اور وہ اپنے علاقے میں جہاں یہ پیدا ہوئی، انتہائی مفید اور نفع بخش ثابت ہو رہی ہوتی، پھر ہم سے بڑا احمق کون ہوگا کہ ایسے سیکولرزم کو قبول کر رہے ہیں جس کے کڑوے پھل مغربی زندگی کے ہر شعبے میں ظاہر ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ ہم اِس سیکولرزم کی فکر کو قبول یا رد کرنے میں بااختیار ہیں۔ ہم اس فکر کا بدیہیات کی روشنی میں مناقشہ کریں گے لیکن یہ مناقشہ جدلیات کے قبیلے سے ہے۔

وگرنہ ہمارا دین ہمیں ایک لمحے کے لیے بھی تردّد یا غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا کہ ہم سیکولرزم کو قبول کر سکیں۔ اِس کے باوجود ہم غور و فکر کرتے ہیں کہ کیا عالم اسلامی میں سیکولرزم کی کوئی گنجائش اور ضرورت ہے؟ کیا عقیدہ یا شریعت کی سطح پر یا تصور و تطبیق کی سطح پر کوئی ایسا سبب ہے جس سے سیکولرزم کی گنجائش اور ضرورت لازم آتی ہو۔

اسلام اور کلیسائی دین میں جوہری فرق:

اصل جواب میں غور و فکر کرنے سے پہلے ہمارے دماغ میں وہ خوفناک مشاہدات جاں گزیں ہوتے ہیں جو مغرب میں سیکولر زندگی سے متعلق پہلے گزر چکے ہیں جو اپنے لسان حال سے چیخ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو جہنم میں گرانے سے بچو۔

ہم یورپ میں سیکولرزم کی نشو و نما کے اسباب و علل بیان کر چکے ہیں۔ اُن کو ایک نظر دیکھنے سے ہم بغیر کسی محنت کے یہ واضح نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سیکولرزم تحریف شدہ دین اور مذموم روایات کا ایک غلط ردعمل تھا۔ یہ ردّی گھاس پھوس تھی جو گندی مٹی اور غیر طبعی حالات کی پیداوار تھی۔ یورپ کلیسا کے تحریف شدہ دین اور اندھے جبر و

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

استبداد کی وجہ سے مصائب وآلام کو پہنچا۔ وہ ایک لمبے دور تک اِس سفر میں لڑکھڑاتا رہا حتی کہ اُس نے تحریف شدہ دین کا کام تمام کیا اور اُس کا اختیار چھین لیا۔ لیکن وہ ایک دوسری انتہا اور انحراف کو پہنچ گیا جو پہلے سے بھی زیادہ ہولناک تھا۔ یورپ ایک ایسی جاہلیت سے بھاگا جو دین کا لباس پہنے ہوئے تھی لیکن وہ ایسی جاہلیت میں داخل ہو گیا جس نے ترقی اور عروج کی چادر اوڑھی ہوئی تھی۔ وہ دین کے وڈیروں اور جاگیرداروں کی سرکشی سے دوڑا لیکن سرمایہ داروں اور کیمونسٹ پارٹی کے چنگل میں پھنس گیا۔ یورپ کی اِس نقل وحرکت اور بھاگ دوڑ کے تاریخی اور واقعاتی اسباب تھے جو فقط یورپ کے ساتھ خاص تھے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ یورپ کے محرف دین کے مقابلے میں سیکولرزم کی قبولیت کوئی لازمی اور حتمی شکل نہ تھی۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ جو تحریف شدہ دین میں مبتلا ہو وہ لازمی طور پر لادین ہی بنے بلکہ اُس پر لازم ہے کہ وہ صحیح دین کو تلاش کرے۔ جب ہم کسی دوسرے معاشرے کو دیکھیں جو اپنے مخصوص حالات میں یورپی معاشرے سے مختلف ہے اور پھر لادینیت کو منہج بنانے کی کوشش کرے اور اس کو لازمی سمجھے۔ آپ کے خیال میں ہم اُس پر کیا حکم لگائیں گے؟ اور خاص طور پر اُس وقت جبکہ اس کے پاس دین صحیح موجود بھی ہو۔ یورپی دین میں ہمارا پہلا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ عقیدہ وشریعت میں تحریف شدہ ہے، عقیدۂ تثلیث جو انتہائی پیچیدہ اور مغلق ہے، اناجیل جو تحریف شدہ اور باہم متضاد ہیں، پھر وہ محدود نظر جس نے دین کو حکومت یا زندگی سے الگ کیا اور اُس کو گرجا گھروں اور عبادت خانوں میں محصور کر دیا۔۔۔ کیا اِس قسم کی کوئی چیز اسلام میں موجود ہے؟

ہم تثلیث سے ابتداء کرتے ہیں یعنی عقیدہ الوہیت سے منسلک بحث، ہم معمولی مبالغہ کے بغیر کہہ سکتے ہیں کہ زمین کی سطح پر کوئی دین یا مذہب ایسا نہیں جو اسلامی عقیدہ سے زیادہ آسان، عام فہم، فطری اور معقول ہو، بلکہ فطرت بذات خود غیر اسلامی عقائد کو انحراف وگمراہی قرار دیتی ہے۔ ہم پر ہر صورت لازم ہے کہ ہم اپنا رخ فطری دین حنیف کی طرف کریں۔

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾

(الروم، ۳۰/۳۰)

پس آپ یک سو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں۔ اللہ تعالی کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالی کے بنائے کو بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

اس فطری عقیدے کو ایک مختصر سورت بیان کر سکتی ہے جو ہر مسلمان کو زبانی یاد ہے:

﴿قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ O اللَّهُ الصَّمَدُ O لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ O وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ (اخلاص: ۱۱۲/۱-۴)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا۔ اور نہ کوئی اس کا ہم سر ہے۔

یہ سورت مشرکین کے ایک سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی۔ جب انھوں نے سوال کیا ہمارے لیے اپنے رب کے اوصاف بیان کرو۔ وحدانیت انتہائی سہل اور عام فہم عقیدہ ہے جسے انسانی نفس بغیر مشقت اور تکلف کے قبول کرتا ہے۔ اقانیم، باپ، بیٹا، تشبیہ، تمثیل وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ وہ حقیقت ہے جو اسلام کے ایک طالب علم کی توجہ پہلے دن سے ہی کھینچ لیتی ہے جس کے لیے اللہ کی ہدایت لکھی جا چکی ہو۔ وہ غیر فطری گرد و غبار فوراً جھاڑ دیتا ہے اور مکمل اطمینان کے ساتھ دین الٰہی میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قلب و نظر اسلامی عقیدے سے جو سبق سب سے پہلے اخذ کرتی ہے، وہ دین کا صاف ستھرا اور پیچیدگی سے پاک ہونا ہے۔ عصر حاضر میں امریکہ اور یورپ کے جو لوگ مسلمان ہو رہے ہیں، ان ہر پر انہی علامات کا غلبہ ہے۔ وہ اسلام کا وصف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن کو اسلام کی جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اُس کی سادگی ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جو افریقہ اور ایشیا کے قدیم و جدید بدوؤں پر بھی اثر ڈالتی ہے اور اُس فطرت کو بھی متاثر کرتی ہے جس میں تمام بدو اور متمدن شہری اجتماعی طور پر شریک ہیں (۷۹۶)

عیسائیوں میں بعض نومسلم اِس حقیقت کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میں نے ادیان کا بالعموم مطالعہ کیا اور اسلام کا بالخصوص مطالعہ شروع کیا۔ مجھے اپنے مطالعہ کے دوران میں یقین ہوا کہ میری غور و فکر کی دنیا مسیحیت کی بہ نسبت اسلام کے زیادہ قریب ہے۔ بتدریج مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل منہج ہے۔ یہ ہر اعتبار سے انسانی فطرت سے مطابقت رکھتا ہے۔ میں یہاں پر ایک نظری اور ایک عملی مثال بیان کرنے کی کوشش کروں گا۔ جب میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کو پڑھا تو مجھے ایسا لگا کہ میں بھی عیسیٰ ابن اللہ کا قائل نہیں رہا۔ میں نے اپنے ایک پروٹسٹنٹ استاد سے معلوم کیا تو انھوں نے بتلایا کہ کم از کم (۸۰ فیصد) مسیحی اس خاص مسئلہ میں مسیحیت کی بہ نسبت اسلام کے زیادہ قریب ہیں۔ عملی اعتبار سے میں شراب اور رقص و سرور جیسے معاملات سے پہلے ہی بھاگتا تھا۔ یہی باتیں اسلام میں بھی حرام معلوم ہوئیں۔ اسلام میرے لیے ایسا رہا جیسے میں نے اپنی فطرت کو دریافت کیا ہو۔

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفاً فِطْرَةَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾

(الروم: ۳۰/۳۰)

پس آپ یک سو ہو کر اپنا منہ دین کی طرف متوجہ کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے بنائے کو بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تثلیث کے جھگڑے میں قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ ''یورپ'' تثلیث کے انکار کو روشن خیال فلاسفہ کا کارنامہ سمجھتا ہے۔ جیسے والٹیر اور تھام پین (۱۸ویں صدی)۔ لیکن بعض مفکرین فلاسفہ کی مرعوبیت کو بھی واضح کرتے ہیں مثلاً ڈیکارٹ جو پکا عقل پرست فلسفی تھا، تثلیث کے انکار میں ایک لفظ تک نہیں بولتا۔

اسلام جو دینِ حق ہے، تثلیث کی کمزوری اور ابطال کو پہلے ہی بیان کر چکا ہے۔ وہ اس کی کمزوری اور شرک کی عام تردید نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام نے اِس پر الگ سے گفتگو کی ہے اور کئی طریقوں سے واضح کیا ہے کہ یہ قدیم وثنی عقیدہ ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو یورپ تقابلِ ادیان کے علم کے ظہور کے بعد پہچان سکا جو یورپ کے جدید نظری علوم میں سے ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ﴾ (التوبۃ:۹/۳۰)

یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصرانی کہتے ہیں مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ قول صرف ان کے منہ کی بات ہے۔ اگلے منکروں کی بات کی یہ بھی نقل کرنے لگے، اللہ انہیں غارت کرے وہ کیسے پلٹائے جاتے ہیں۔

رہا **انجیل کا قرآن سے موازنہ** تو قرآن تحریف سے پاک ہے اور یہ اپنے نصوص کے ساتھ مکمل طور پر محفوظ ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ الّا یہ کہ کوئی عقل وحواس کا سرے سے انکار کر دے۔ اگر کسی شخص کو اس میں شک ہے تو وہ ملائشیا سے مثلاً ایک قرآن کا مطبوعہ نسخہ لے اور دوسرا مصر اور تیسرا امریکہ سے، پھر اُن کا آپس میں موازنہ کرے اُس پر واضح ہوگا کہ یہ آپس میں مکمل طور پر متفق ہیں۔ وہ کسی مخطوط نسخے کا موازنہ ہندوستان کے مکتبہ جات یا یورپ کے عجائب گھر کے نسخوں سے کر لے تو ایک ہی حقیقت کو بار بار دیکھے گا۔ پرانے دور میں امام بیہقی رحمہ اللہ قاضی یحییٰ بن اکثم سے ایک عملی قصہ بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ''ایک 'یہودی' خلیفہ مامون پر داخل ہوا اور اُس نے بہت عمدہ گفتگو کی۔ خلیفہ مامون نے اُسے اسلام کی دعوت دی تو اُس نے انکار کر دیا۔ ایک سال کے بعد وہ مسلمان ہو کر آیا۔ اور اُس نے پھر بہت زبردست گفتگو کی۔ مامون نے اُس سے پوچھا کہ تمھارے اسلام کا سبب کیا ہے۔ اُس نے کہا میں آپ کی حاضری سے فارغ ہو کر مختلف ادیان کی جانچ پڑتال میں لگ گیا۔ میں نے تورات کو لیا، اُس کے تین نسخے بنائے، اُن میں کمی بیشی کی اور ایک کلیسا میں گیا۔ انھوں نے میرے تینوں نسخے خرید لیے۔ اسی طرح میں نے انجیل لی، اُس کے تین نسخے بنائے، اُن میں کمی بیشی کی اور گرجا گھر والوں نے اسے خرید لیا۔ پھر میں نے قرآن لیا، اُس کے تین نسخے بنائے۔ اُن میں کمی بیشی کی۔ میں نے اُن کو کتب فروشوں کے پاس پیش کیا۔ انھوں نے نسخوں کے الفاظ الٹ پلٹ کر دیکھے۔ انھوں نے دیکھا کہ اُن میں کمی بیشی ہے۔ وہ نسخے انھوں نے ایک طرف ڈال دیے اور خریدنے سے انکار کر دیا۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کتاب محفوظ ہے۔ یہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میرے اسلام لانے کا سبب تھا۔

یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ میں اُس سال حج پر گیا۔ میں سفیان بن عیینہ کو ملا اور میں نے ان کو یہ واقعہ ذکر کیا۔ انھوں نے کہا اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ میں نے کہا کہاں پر؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ تورات اور انجیل کے بارے میں فرماتے ہیں: (بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ) اُن سے کتاب الٰہی کی حفاظت کا مطالبہ کیا گیا، یعنی اللہ نے کتاب کی حفاظت کا معاملہ اُن کے سپرد کیا تو وہ ضائع ہوگئیں۔ اور قرآن کے بارے میں فرمایا۔ (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ) یعنی ہم اس کی خود حفاظت کرنے والے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُس کی حفاظت کی اور وہ ضائع نہ ہوا۔ یہ وہ عظیم حقیقت ہے جو مستشرقین اور حاسدین کی کوششوں کے سامنے ہر دور میں ایک مضبوط چٹان کی طرح قائم رہی۔

رہی شریعت کی تحریف یعنی شریعت کو زندگی کے شعبوں سے الگ کرنا اور اُس کو کسی مخصوص شعبے پر محدود کرنا یا اُس شعبے کے چند چھوٹے حصوں پر اکتفا کرنا، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین حق کو اِس سے محفوظ فرمایا۔ اسلام پر وہ حالات وارد نہیں ہوئے جو شریعت عیسوی کی عملی تطبیق میں رکاوٹ بنے۔

نبی اکرم ﷺ اُس وقت تک اِس دنیا سے رخصت نہیں ہوئے جب تک اسلام کی حکومت وسلطنت قائم نہ ہوگئی اور وہ ہر چھوٹے اور بڑے مسئلے میں ہدایت الٰہی پر کاربند نہ ہوگئی۔ یہ ریاست پوری دنیا کی منفرد اور یکتا تھی جو بتدریج پروان چڑھی اور پھلی پھولی۔ اللہ کے حکم کے تحت سب قومیں جھک گئیں۔ چینی بلاد کے متمدن علاقوں سے لے کر اٹلانٹک کے ساحلی علاقوں تک، کوئی قوم اسلام کے دائرے سے خارج نہ رہی، ماسوائے یورپ کے جو تہہ بہ تہہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا یا وہ وحشی قبائل جو وسط افریقہ اور جنوب وشمال مشرقی ایشیا میں تھے۔ اسی طرح شریعت اسلامی نے کوئی ایسا جبر واستبداد قائم نہیں کیا جو اسلام کی تعلیمات وحقائق کو مٹا دیتا اور عملی زندگی میں اُس کے اظہار کو ناممکن بنا دیتا جیسا کہ عیسائیت کے ساتھ معاملہ بنا۔

یہ خارجی عوامل کی بہ نسبت شریعت کی حفاظت تھی۔ اندرونی محاذوں پر بھی شریعت اسلامی باطل گروہوں کی تحریف اور اہل اہوا کی خرابیوں سے محفوظ رہی۔

اسلام کے کٹر مخالف فرقے اور متشدد گروہ اپنی کثرت کے باوجود اپنے اہداف حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ وہ تاریخ کے بہاؤ میں ڈوب گئے اور اسلام ویسے ہی تروتازہ رہا جیسے آج نازل ہوا ہو۔ قرآن کی حفاظت جیسا کہ پہلے بیان ہوا، کسی بھی مناقشے سے پاک ہے۔ سنت کی سلامتی وحفاظت تو اِس دین کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے۔ اللہ نے ایسے بندے پیدا کیے جو لاکھوں سندیں اور احادیث زبانی یاد کرتے تھے۔ اگر کسی کو کسی کلمہ یا حرف میں شک ہوتا تو وہ اُس کو بھی امانت وذمہ داری سمجھ کر ذکر کرتا۔ مسلمانوں نے ایک ایسے علم کو وجود بخشا جس کی کوئی نظیر سابقہ یا لاحقہ امتوں میں نہیں ملتی، یہ اصول حدیث کا علم تھا۔ اِس امت میں ہمیشہ ایسے علماء رہے جو نبی اکرم ﷺ تک سلسلہ سند کو محفوظ کیے رہے، حالانکہ مدون کتب پوری دنیا میں پھیل چکی تھیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس گہرے ضبط اور بلیغ نکتہ رسی کی بدولت امتِ مسلمہ نے اپنے علما پر بھروسہ کیا کہ وہ ہر نقلی اور جعلی چیز کو سنت سے نکال باہر کریں گے۔ ہارون الرشید کے پاس ایک زندیق لایا گیا۔ انھوں نے اُس کے قتل کا حکم دیا۔ اُس نے کہا: امیر المومنین! آپ اُن چار ہزار احادیث کا کیا کریں گے جو میں مسلمانوں کے مابین گھڑ کے پھیلا چکا ہوں۔ میں نے اُن کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا۔ حالانکہ نبی اکرم ﷺ نے اُن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا؟

ہارون الرشید نے کہا: اے زندیق! تمھاری عبداللہ بن مبارک اور ابو اسحاق فرازی کے مقابلے میں کیا حیثیت ہے۔ وہ چھلنی لگائیں گے اور ایک ایک من گھڑت حرف کو نکال باہر کریں گے (۸۰۱)

یہ امتِ مسلمہ اسی نہج پر ایک لمبی زندگی گذارتی رہی۔ اِس کا منہج اور سلوک ایک رہا، امت میں شعوری یا عملی طور پر شریعت و سیاست میں علیحدگی نہ تھی۔ دین اور دنیا اُس طریقہ پر جدا جدا نہ تھے جیسا کہ نصرانیت میں تھا۔

ہاں! امتِ اسلامیہ میں کئی انحراف ضرور پیدا ہوئے لیکن یہ شخصی انحراف تھے جو خواہش پرستی اور دنیاوی طمع کے تحت پیدا ہوئے۔ اِن انحرافات کے فروغ میں کئی عوامل کا حصہ تھا جن کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر یہ کہ شریعت اسلامیہ محفوظ اور سلامت رہی۔ اسلام کا عظیم منہج باقی رہا اور امت اپنی بیداری اور اصلاح میں اس منہج سے مستفید ہوتی رہی۔ اُمت کا جذبہ عمل مجموعی طور پر شریعت کو عملی زندگی پر لاگو کرنے سے خالی نہ رہا۔ انحراف لمبے بھی ہوئے لیکن خطرناک ترین اور مایوس کن حالات میں بھی امت کا ضمیر بیدار رہا۔ امت میں ایسے منفرد علما موجود رہے جو اسلامی تصورات کی تصحیح اور انحراف کو ثابت شدہ روشن دین کی طرف لوٹانے کی کوشش کرتے رہے۔

امام ابن القیمؒ، جو اُس تاریک دور میں زندہ رہے جو سقوطِ بغداد اور تاتاریوں کی اسلام پر خوفناک چڑھائی سے متصل تھا (یعنی ۷۵۱ھ)، کہتے ہیں:

''مختلف لوگ احکام اسلامی کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ بعض شریعت اور سیاست میں تقسیم کرتے ہیں، بعض شریعت و طریقت میں اور بعض عقل اور نقل میں۔ یہ شریعت کی باطل تقسیم ہے بلکہ سیاست، حقیقت، طریقت اور عقل وغیرہ کی دو قسمیں ہیں: صحیح اور فاسد۔ صحیح شریعت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ شریعت کے مدمقابل کوئی دوسری قسم نہیں۔ صحیح کے الٹ ''باطل'' کا لفظ ہے۔ وحدت و اکائی شریعت کا سب سے اہم اور سب سے نفع بخش اصول ہے جو صرف ایک بات پر مبنی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت بندوں کے تمام ضروری معارف، علوم اور اعمال کے لیے ''کافی اور عام'' ہے۔ آپ ﷺ کی امت آپ کے بعد کسی فرد کی محتاج نہیں۔ امت کو صرف اس بات کی حاجت ہے کہ کوئی عالم اُن کو نبی ﷺ کی بات پہنچائے۔ چنانچہ رسالت محمدی وسیع و عریض عموم پر مشتمل ہے جس میں کسی قسم کی تخصیص کی گنجائش نہیں۔

ایک عموم یہ ہے کہ رسالت تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ دوسرا عموم یہ ہے کہ رسالت دین کے تمام ضروری اصول و فروع پر محیط ہے۔ لہٰذا رسالت محمدی کافی، شافی اور عام ہے۔ اِس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کی ضرورت نہیں۔ اور ایمان اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک دونوں امور میں رسالتِ محمدی کا اثبات نہ کرلیا جائے۔ مکلفین میں سے کسی کو رسالت محمدی سے خروج کی اجازت نہیں۔ نبی اکرم ﷺ اُس وقت تک فوت نہیں ہوئے جب تک آپ ﷺ نے آسمان پر اڑنے والے پرندوں کے بارے میں کوئی ہدایت کی بات ارشاد نہ کردی۔ آپ ﷺ نے امت کو ہر اخلاقی امر کی تعلیم دی حتیٰ کے آدابِ قضاء حاجت، آدابِ جماع، نیند، قیام، کھانا پینا، سواری، اترنا، سفر وحضر، خاموشی، کلام، عزت، اختلاف، غنیٰ، فقر، صحت، مرض اور زندگی وموت کے تمام احکام کی خبر دی۔

آپ ﷺ نے عرش، کرسی، فرشتے، جن، جہنم، جنت، قیامت کی ایسی خبریں دیں جیسے یہ سب کچھ آنکھ کے سامنے ہو۔

آپ نے لوگوں کو اُن کے معبود کے بارے میں ایسی معرفت دی جیسے وہ اللہ تعالیٰ کو اُس کی کمالی اور جلالی اوصاف کے ساتھ دیکھ رہے ہوں۔ آپ ﷺ نے انبیا علیہم السلام اور اُن کی امتوں کا ماجرا بتلایا، آپ نے موت کے احوال اور برزخی امورِ نعمت وعذاب اتنی تفصیل سے بتلائے جو پہلے کسی نبی نے نہ بتلائے تھے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے توحید، نبوت، آخرت، اور اہل کفر وضلالت کا رد اتنی تفصیل سے بتلایا کہ کسی دوسرے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایسے علما کی ضرورت رہتی ہے جو آپ ﷺ کی احادیث کی تبلیغ، توضیح اور تشریح کا فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔

اسی طرح نبی ﷺ نے دشمنوں کے ساتھ محاذ آرائی اور نصرت وکامیابی کے طریقے اتنی وضاحت سے بتلائے کہ اگر اُن کو مکمل علم کے ساتھ بجالایا جائے تو کوئی دشمن کبھی مقابلہ نہ کرسکے۔

اسی طرح نبی ﷺ نے لوگوں کو ابلیس کے مکروفریب اور اُس کے طریقہ واردات کے بارے میں بتلایا۔ آپ نے اُس کے مکروفریب سے بچنے اور شر کو دفع کرنے کا طریقہ اتنی وضاحت سے بتلایا کہ اُس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح آپ ﷺ نے لوگوں کو اُن کے نفوس کے احوال، اوصاف اور خفیہ کمزوریاں اتنی باریکیوں سے بتلائیں کہ اب آپ کے سوا کسی کی طرف دیکھنے کی حاجت نہیں۔

آپ ﷺ نے لوگوں کو معیشت کے امور بتلائے تاکہ لوگ اُن کو جان لیں اور عمل کریں تو اُن کی دنیا مکمل طور پر درست ہوجائے۔

مختصر یہ کہ آپ ﷺ دنیا وآخرت کی مکمل بھلائی لے کر آئے۔ آپ ﷺ نے لوگوں کو اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں چھوڑا۔ یہ گمان کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کی شریعت سے زیادہ کامل شریعت تو دنیا میں کوئی نہیں لیکن آپ ﷺ کی شریعت سیاست میں ناقص تھی اور کسی خارجی تکمیل کی محتاج تھی۔ یا آپ کی شریعت حقیقت اور عقل کی محتاج تھی۔ یہ گمان تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص گمان کرے کہ لوگوں کو آپ ﷺ کے بعد ایک دوسرے رسول کی ضرورت ہے۔ اِس فاسد گمان کا سبب یہ ہے کہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی شریعت کی حقیقت کو مکمل طور پر سمجھ نہ سکے۔ وہ اُس فہم میں بہت کم حصہ پا سکے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نصیب کیا۔ نبی ﷺ کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صحابہ رضی اللہ عنہم تو شریعت پر ہی اکتفا کرتے تھے اور باقی ہر چیز سے مستغنی ہو جاتے تھے۔ اسی طرح انھوں نے دِلوں اور شہروں کو فتح کیا اور وہ کہتے تھے کہ یہی عہد ہمارے نبی کا ہم سے تھا اور ہمارا عہد تمھارے ساتھ ہے۔ (۸۰۲)

رہی مذہبی پیشوائیت (پاپائیت۔Papacy) تو اسلام میں اس کا کوئی وجود نہیں، نہ یورپی نصرانی شکل میں اور نہ کسی دوسری شکل میں۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام توحید خالص کا دین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس کو بندوں کی آزادی کے لیے اتارا ہے تاکہ وہ بندوں کی غلامی سے نکل کر اللہ کی عبادت و بندگی میں داخل ہو سکیں۔ وہ منہج و سلوک میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ضابطہ حیات اخذ نہ کریں۔ اس پر واضح قطعی حکم آیا ہے کہ عبادت کی انواع میں سے کوئی نوع غیر اللہ کے لیے نہ ہوگی، چاہے وہ مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل۔ لوگوں کے من گھڑت معبودان ''طواغیت'' کا معاملہ ایک ہی ہے کہ اِن کی عبادتیں کفر ہیں۔

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُواْ عِبَاداً لِّي مِن دُونِ اللّٰهِ وَلَـكِن كُونُواْ رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ O وَلاَ يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُواْ الْمَلاَئِكَةَ وَالنَّبِيِّيْنَ أَرْبَاباً أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾

(آل عمران: ۳/۷۹۔۸۰)

کسی ایسے انسان کو جسے اللہ تعالیٰ کتاب وحکمت اور نبوت دے، یہ لائق نہیں کہ پھر بھی وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو کہے گا کہ تم سب رب کے ہو جاؤ، تمھارے کتاب سکھانے کے باعث اور تمھارے کتاب پڑھنے کے سبب۔ اور یہ نہیں (ہو سکتا) کہ وہ تمھیں فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لینے کا حکم کرے، کیا وہ تمھارے مسلمان ہونے کے بعد بھی تمھیں کفر کا حکم دے گا۔

اسلام اور تحریف شدہ نصرانیت میں یہ پہلا جوہری فرق ہے۔ عیسائی مذہب میں 'نظام پاپائیت' اللہ کی مخلوق کے لیے عقیدہ و فروع میں امر و نہی کی شریعت سازی کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اکبر ہے، چاہے اِس کی کوئی بھی صورت ہو، چاہے یہ پاپائی رسوم ہوں یا کمیٹی کی قرار دادیں یا کلیسا کے منشور۔

عدی بن حاتمؓ کا قصہ عن قریب آگے پیش کیا جائے گا جو اِس مسئلے کی مکمل وضاحت کر دے گا۔ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کی اہلِ کتاب کو دعوت اُن کے حالات کے مطابق تھی۔ وہ انسانوں کی عبادت کرتے اور مخلوق کو غلطیوں سے پاک سمجھتے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے دنیا کے مختلف طاغوتی حکمرانوں کو خطوط لکھے اور اُن کو اسلام کی دعوت پہنچائی۔ انہی خطوط میں ہرقل (قیصرِ روم) کا خط خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کے خط کے الفاظ اِس طرح تھے:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محمد جو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، کی طرف سے ہرقل روم کے سربراہ کی طرف! سلام اُس شخص پر ہو جو ہدایت کی پیروی کرے۔ امابعد!

میں تمھیں اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔ اسلام لے آؤ، محفوظ رہو گے۔ اللہ تمھیں دگنا اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر تم پھر گئے تو تم پر عوام کا بھی گناہ ہوگا۔

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران:۶۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اے اہل کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنائیں۔ پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں۔

یہ بڑی واضح عبارت ہے کہ نصاریٰ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔ اللہ نے اُن کو اسلام کی دعوت دی اور بندوں کی عبادت کی مکمل نفی کی۔

جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے حج تمتع کے مسئلے میں ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے حجت پیش کی تو انھوں نے فرمایا:

ہوسکتا ہے کہ تم پر آسمان سے پتھر برس پڑیں۔ میں تمھیں نبی اکرم ﷺ کا فرمان سناتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ نے یوں کہا۔ نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کے سامنے ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کا یہ حال ہے جو امت میں افضل ترین اور کتاب وسنت کی مخالفت سے یکسر اجتناب کرنے والے تھے۔

اسلام کا یہ معیار و یٹی کن کی قراردادوں کے مقابلے میں کتنا بلند ہے۔ و یٹی کن کی قرار دادیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دو ہزار سال تک حلال وحرام کے من گھڑت فیصلے کرتی رہیں۔ طلاق کی حرمت واباحت کا مسئلہ تو بہت مشہور ہے۔

نصرانی کمیٹیاں حلال وحرام کے مستقل فیصلے کر کے جس شرک کا ارتکاب کرتی ہیں، اُس کا مسلمان علما کے اجتہاد سے کوئی تعلق نہیں، دونوں طریق ہائے کار میں بہت زیادہ فرق ہے۔

اجتہاد نصوص شرعیہ میں غور وفکر اور استنباط کا نام ہے اور وہ قرآن وسنت کی صورت میں وحی شدہ ہیں۔ اجتہاد کوئی مستقل شریعت سازی نہیں جیسا کہ کلیسائی قراردادوں کی صورتِ حال تھی۔

اجتہاد ایک انفرادی رائے ہوتی ہے جس میں خطا کی گنجائش ہوتی ہے۔ اجتہاد کی اتباع لازم قطعی نہیں بلکہ انسان پر لازم ہے کہ وہ اجتہاد میں شریعت اور نصوص کی خلاف ورزی دیکھے تو وہ اُس کی مخالفت کرے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مشہور قاعدہ ہے کہ ہر شخص کا قول قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی کیا جا سکتا ہے ماسوائے نبی اکرم ﷺ کے۔ یہ وہ عبارت ہے جو اکثر علما نے صراحت کے ساتھ بیان کی اور اس پر آئمہ اربعہ وغیرہ متفق ہیں۔ اس اُصول کی غالی رافضیوں کے علاوہ کسی نے مخالفت نہیں کی جنھوں نے اسلام کے پٹے کو سر سے گردن سے اتار دیا۔ (۸۰۴)

اس مسئلہ میں دوسرا جوہری فرق یہ ہے کہ اسلام میں **اللہ اور مخلوق کے مابین واسطہ** نہیں۔ رسول ﷺ اللہ کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں اور ''علما'' رسول کے پیغامات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے علما بھی واسطے کہلا سکتے ہیں لیکن نصرانی کلیسا نے جن واسطوں کو اختیار کیا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اکبر تھا اور اُس کا کوئی تاریخی وجود نہ تھا۔

ہاں! بعض صوفیوں کا اپنے مریدوں کے ساتھ اور بعض جاہل عوام کا اپنے مُردوں اور نیک صالحین سے تعلق عیسائیوں کے واسطوں کے مشابہ ضرور ہے۔ لیکن وہ کلیسا کے واسطوں سے مختلف ہے اور معتبر علماءِ امت نے اُس کی نفی کی ہے۔

شیخ الاسلام اپنے ایک منفرد رسالے میں فرماتے ہیں:

مشائخ اور علمائے دین امت اور انبیا کے مابین واسطہ ہیں۔ یہ اِس اعتبار سے تو درست ہے کہ علما و مشائخ امت کے لیے تبلیغ، تعلیم اور تادیب کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ اُن کا اجماع حجت قطعی ہوتا ہے، وہ ضلالت پر جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ آپس میں تنازعہ کریں تو اُن کے جھگڑے کو قرآن وسنت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اُن میں سے کوئی بھی مطلق طور پر معصوم نہیں بلکہ لوگوں میں سے ہر ایک کی کے کلام کو قبول بھی کیا جا سکتا ہے اور رد بھی کیا جا سکتا ہے ماسوائے نبی اکرم ﷺ کے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''علما انبیا کے وارث ہیں۔ انبیا درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ علم کا وارث بناتے ہیں جو علم حاصل کرے اُس نے وافر حصہ پایا۔'' جو اللہ اور بندوں کے درمیان واسطے بناتا ہے گویا وہ بادشاہ اور رعایا کے مابین رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ لوگوں کا یہ ذہن ہوتا ہے کہ واسطے مخلوق کی حاجات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اِن واسطوں کے ذریعے سے اپنے بندوں کو ہدایت اور رزق دیتے ہیں۔ لوگ اِن واسطوں سے سوال کرتے ہیں۔ جیسے بادشاہوں تک پہنچنے کے لیے واسطے ہوتے ہیں اور وہ واسطے بادشاہ کو لوگوں کی حاجات بیان کرتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے لیے اِس قسم کے واسطوں کے قائل ہیں وہ کافر اور مشرک ہیں۔ (اسلامی حکومت کے لیے) اُن سے توبہ کرانا واجب ہے وگرنہ اُن کو قتل کیا جائے گا۔ یہ اللہ کے لیے مخلوق کی تشبیہ گھڑنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے شریک بنانے والے ہیں''۔ (۸۰۵)

انٹین ڈینیہ نے اِس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا۔ اُس کے قبول اسلام کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔ وہ کہتا ہے: ''بندے اور خدا کے درمیان واسطے کا معاملہ ایسا ہے جس میں اسلام تمام ادیان پر فائق ہے۔ اسلام میں اللہ اور بندے کے مابین کوئی واسطہ نہیں۔ اسلام میں قسیسین اور رہبان نہیں ہوتے۔ اِن واسطوں کا وجود ادیان کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اندر بدترین شر ہے۔ یہ واسطے شر و فساد کے علاوہ کچھ نہیں، چاہے اِن کے عقائد، اخلاص اور نیتیں کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہوں''۔(۸۰۶)

اسلام میں دین کے مخصوص رہنماؤں کا تصور نہیں جو عیسائیت میں رائج ہیں۔ رجالِ دین'' دین کے مخصوص اجارہ دار راہنماؤں'' کا تصور بدعت ہے جس کا مقصد گمراہی اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

اسلام ایسے اشخاص کا انکار کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اُن دنیوی شعبوں کا انکار کرتا ہے جن کا دین سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اور ایسے دینی شعبوں کا بھی انکار کرتا ہے جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ انسانی نفس اور انسانی زندگی کو ایک وحدت سمجھتا ہے اور اسی بنیاد پر لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔ وہ بندے کو توحیدِ خالص کی بنیاد پر براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾

(بقرۃ۔۲/۱۸۶)

جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب کبھی وہ پکارے، قبول کرتا ہوں۔

نیز فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (آل عمران۔۳/۱۳۵)

جب ان سے کوئی ناشائستہ کام ہو جائے یا کوئی گناہ کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کا ذکر اور اپنے گناہوں کے لیے استغفار کرتے ہیں، فی الواقع اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون گناہوں کو بخش سکتا ہے؟

اسلام کی یہ تعلیم تحریف شدہ نصرانیت کے مقابلے میں کتنی بلند ہے! نصرانیت میں ایک گناہ گار اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے بیٹھتا ہے اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے۔ اور اُس سے بخشش و رضا کا طلب گار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اس قسم کی میل کچیل سے محفوظ رکھا ہے۔ اس طرح نصرانیت میں مذہبی وڈیروں اور پیشواؤں کا طبقہ پیدا ہوا جس نے اپنے علم کو مہنگا بیچنے کے لیے دین الٰہی میں تحریف کی۔ اسلام میں اِس قسم کا کوئی طبقہ نہیں اور عقیدہ و تصور کے لحاظ سے اس کی گنجائش بھی نہیں۔

اس من گھڑت مذہبی پیشوائیت کے نتیجے میں کلیسا کا وہ ہولناک انسانی جبر و استبداد پیدا ہوا جو سیکولرزم کی آمد کا سبب بنا۔ تاریخِ اسلام میں اس قسم کی صورتِ حال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوئی۔

دینی جبر و استبداد وحی کی تعلیمات وصول کر کے اُن کے الفاظ و معنی میں تحریف کرتا ہے۔ صلیبی لشکر اپنی رائے کے مخالف فرقوں کی سرکوبی کے لیے سرگرم ہوتے ہیں اور باطل فرقوں کی تلاش کے لیے تفتیشی محکمے قائم کرتے ہیں۔ اِس قسم کی کوئی مثال، الحمدللہ، ہماری اسلامی تاریخ میں موجود نہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کلیسا کے سیاسی جبر و استبداد کے تحت حکمرانوں کو دینی پیشواؤں کے ہاتھوں ذلت کا سامنا کرنا پڑتا۔عوام کو پاپاؤں کے معمولی غیض وغضب کے بدلے میں مکمل محرومی کی سزا کاٹنی پڑتی۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ''آزاد زندگی'' کو بیڑیاں ڈالی جاتیں۔اسلام میں اس قسم کی صورتِ حال بھی پیدا نہ ہوئی۔

کلیسا کی اقتصادی سرکشی کے تحت بندوں کے اسباب رزق پر زبردستی فیصلے مسلط کیے گئے اور پادریوں کی جاگیروں پر مفت بیگار لی گئی۔قوم پر ویٹی کن کے خزانے بھرنے کے لیے بھاری ٹیکس لاگو کیے گئے۔اسلام میں اِس قسم کی بھی کوئی مثال نہیں۔

اللہ تعالیٰ نے یہ فرمان نازل کیا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللّهِ﴾ (توبہ:۹/۳۴)

اے ایمان والو! اکثر علما اور عابد، لوگوں کا مال ناحق کھا جاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے روک دیتے ہیں

کلیسا کا فکری جبر و استبداد انسانی ترقی کی راہ میں پتھر بن کر حائل ہو گیا۔تفتیش کے محکمے علما کو زندہ جلانے لگے اور تجربیت کے حامل محققین کو ایسے چھانٹنے لگے جیسے تلوار گھاس پھوس کو چھانٹتی ہے۔کلیسا انسانی عقل کو تعصب و جمود کی بیڑیوں میں باندھنے لگا۔وہ لوگوں کو اس بنیاد پر کافر قرار دینے لگا کہ انھوں نے ایسی دریافتیں کیوں شروع کر دیں جو کائنات اور زندگی کے بعض حقائق کے سمجھنے میں مددگار تھیں۔اِس قسم کی مہیب طغیانی کا اسلام میں کوئی وجود نہ تھا۔اس قسم کا استبداد اسلام میں ممکن ہی نہیں۔اسلام علم کو شرعی فریضہ اور فکر کو بلند پایہ عبادت سمجھتا ہے۔وہ علما کی دوات کی سیاہی اور شہدا کے خون کو برابر قرار دیتا ہے۔وہ سدھائے ہوئے کتے کو پاکیزہ رزق کا ذریعہ سمجھتا ہے جبکہ جاہل کتے کو نجس حیوان قرار دیتا ہے۔

علم و دین میں نفرت کیسے ہو سکتی ہے؟ طب، فلکیات، ریاضی اور دین میں علیحدگی کیسے ہو سکتی ہے؟ اسلام میں شعر و ادب کی محفلیں جامع مسجد میں اُسی طرح پہلو بہ پہلو منعقد ہوتی تھیں جیسے حدیث، فقہ، اور تفسیر کے حلقے۔ طبیب، ماہرین فلکیات، ماہرین ریاضی خلیفہ کی مجلس میں پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے جیسے فقیہ یا بڑا قاضی بیٹھتا تھا۔رصد گاہوں اور بیت الحکمت کے لیے مسلمانوں کے وافر مال خرچ کیے جاتے۔

یہاں نصرانیت کے بعض عقائد و شعائر کا تذکرہ ضروری ہے جن کی وجہ سے لوگ متنفر ہوئے اور انھوں نے نصرانی عقائد سے بغاوت کر دی۔اُن میں سے ایک مسئلہ **موروثی گناہ** اور **عبادت کی پیچیدہ رسوم** کا ہے۔

موروثی گناہ کے تصور نے **والٹیئر** اور **پاسکل** کو بھڑکا دیا بلکہ پورے یورپ کو قلق و اضطراب میں مبتلا کر دیا۔یورپی ضمیر قبولیت عیسائیت سے اب تک اس میں گرفتار ہے۔موروثی گناہ کے تصور نے انسانی نفوس کے اندر مایوسی اور قنوطیت بھر دی۔لوگ راہب بن کر بکثرت گرجا گھروں اور عبادت گھروں میں بیٹھ گئے (جیسا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

رہبانیت پر گفتگو ہو چکی ہے)

ان باتوں کے بارے میں اسلام کا موقف واضح اور قطعی ہے۔

آدم علیہ السلام کا درخت سے پھل کھانا نافرمانی کا ارتکاب تھا۔ قرآن میں یہ قصہ ہمیشہ توبہ استغفار کے ذکر کے ساتھ متصل آیا ہے۔ یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول فرمائی اور گناہ کو معاف کیا۔ سورت بقرۃ میں قصہ کا سیاق اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر ختم ہوتا ہے۔

﴿فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ﴾

(بقرۃ۔۲/۳۷)

(حضرت) آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

سورت اعراف میں گناہ کا انجام اس طرح مذکور ہے۔

﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (اعراف۔۷/۲۳)

دونوں نے کہا اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر تو ہماری مغفرت نہ کرے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو واقعی ہم نقصان پانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

سورت طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

﴿وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى۔ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى﴾

(طٰہٰ:۲۰/۱۲۱)

آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس بہک گیا۔ پھر اُس کے رب نے نوازا، اس کی توبہ قبول کی اور اس کی راہنمائی کی۔

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی اور وہ اُس کے بعد بھی ملاء اعلیٰ میں برقرار رہے اور اُس کے بعد زمین پر اترے۔ آیاتِ کریمہ آدم علیہ السلام کی خطا کو وہ ہولناک درجہ نہیں دیتیں جو تحریف شدہ کلیسا دیتا ہے۔ یہ سارا قضیہ آدم علیہ السلام کی زندگی میں ایک عارضہ تھا۔ بلکہ ہر انسان کی زندگی میں گناہ ہو جاتا ہے جس کو توبہ و استغفار ختم کر دیتا ہے۔

یہ بات درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نے تقاضا کیا کہ گناہِ آدم علیہ السلام کو جنت سے اخراج کا سبب بنایا جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ (اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً) چنانچہ استخلاف کی جگہ زمین تھی اور وہی آزمائش کی جگہ ہونی تھی۔ یہ بذاتِ خود لعنت نہ تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی وجہ سے احادیث میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کا بحث و مباحثہ ہوا۔ اور موسیٰ نے آدم علیہ السلام پر تنقید کی کہ اُن کی وجہ سے اُن کی اولاد جنت سے نکالی گئی۔ حدیث کے مطابق آدم علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی تردید کی۔

اَفَلَیْسَ تَجِدُ فِیْمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ اَنَّہٗ سَیُخْرِجُنِی مِنْھَا قَبْلَ اَنْ یُّدْخِلَنِیْھَا۔ قَالَ بَلٰی ، قَالَ ﷺ فَحَجَّ آدَمُ مُوْسٰی (ثَلاثًا)۔

(اس حدیث کی اصل صحیح بخاری (۳۴۰۹) میں ہے۔ نیز دیکھیے فتح الباری: ۵۰۵/۱۱)

کیا تو نے اُس میں یہ نہ پایا جو اللہ نے تیرے اوپر نازل کیا کہ اللہ مجھے اُس سے داخل ہونے سے قبل ہی نکال دے گا۔ کہا: ہاں۔ نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے (تین دفعہ کہا)

اس حدیث کو ایک اور اعتبار سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تصور ایک اہم قاعدے کو بیان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو دوسرے کے گناہ کے سبب نہیں پکڑتا، چاہے ان کا باہمی تعلق کیسا ہی کیوں نہ ہو۔

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰیO وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی﴾

(النجم۔ ۳۸/۵۳)

اور یہ کہ ہر انسان کے لیے صرف وہی ہے جس کی کوشش خود اس نے کی۔

اگر ہم بالفرض مان بھی لیں کہ آدم نے توبہ نہیں کی تو پھر وہی اکیلے اپنے گناہ کے سبب پکڑے جائیں گے اور پوری انسانیت کا کوئی قصور نہیں ہوگا۔ نہ مسیح کا نہ کسی اور کا۔

اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے مطابق جائز ہی نہیں کہ آدم کے علاوہ کسی اور کو اُن کے گناہ کے بدلے پکڑا جائے، اگرچہ وہ شیطان کا بیٹا کیوں نہ ہو جس نے آپ کو گمراہ کیا تھا۔ چہ جائیکہ کہ آپ علیہ السلام کے گناہ کی سزا عیسیٰ علیہ السلام کو دی جائے جن کو اہل کلیسا یا کچھ بنی آدم اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تصور ان افکار و نظریات سے خالی ہے جن کو کلیسا نے بزعم خود گناہ کے لوازمات میں سے گھڑ لیا ہے۔ اب چاہے یہ لوازمات اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہوں یا انسان سے متعلق، دونوں صورتوں میں یہ بدعت ہیں۔

مسلمانوں کے علما اس مسئلہ کو شرح وبسط کے ساتھ یورپ کے تنویری فلاسفہ اور تاریخی ناقدین سے بہت پہلے بتلا چکے ہیں۔

''ان (عیسائیوں) نے سچے اللہ کے ساتھ وہ سلوک کیا جو رذیل ترین اور بیوقوف ترین انسان اپنے غلام اور نوکر کے ساتھ بھی نہیں کرتا۔ ایسا کام تو بتوں کے پجاریوں نے اپنے معبودوں کے ساتھ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی اس بات کی تکذیب کی کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول کر لی تھی اور اُس کا گناہ معاف کر دیا تھا۔ ان (عیسائیوں) نے اللہ تعالیٰ کی طرف قبیح ظلم کو منسوب کیا۔ اِن کا دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اولیا، رسولوں اور انبیا کو اُن کے باپ کے گناہ کے سبب جہنم میں قید کر دیا تھا۔ پھر انتہائی بیوقوفی کے ساتھ یہ بات بھی منسوب کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں کو اپنی ذات پر قدرت بخشی۔ چنانچہ انھوں نے (نعوذ باللہ) ذاتِ الٰہی کو قتل کیا، اُس کو سولی پر لٹکایا اور اُس کا خون بہایا۔ بالآخر اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کو عذاب سے نجات دی۔ ان عیسائیوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف عاجزی و کمزوری کو منسوب کیا کہ اللہ اس حیلے کے بغیر محض اپنی قدرت سے بنی آدم کو نجات نہیں دے سکتا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف نقص کو منسوب کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کو اللہ کی ذات اور اس کے بیٹے پر مسلط کرتے ہیں۔

ہم کسی امت کو نہیں جانتے جو اپنے معبود اور الٰہ کو اس طرح گالیاں دے جس طرح عیسائیوں نے دی ہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: انھوں نے اللہ کو وہ گالی دی جو کسی انسان نے دینے کی جرات نہیں کی۔

اسی وجہ سے بعض آئمہ اسلام جب کسی صلیبی کو دیکھتے تو اپنی آنکھوں کو بند کر لیتے۔ وہ کہتے کہ ہمارے اندر اتنی طاقت نہیں کہ ہم ان لوگوں کو آنکھ بھر کر دیکھ سکیں جو اپنے معبود اور الٰہ کو بدترین گالیاں دیتے ہیں۔

اس وجہ سے ہندوستانی بادشاہوں کے عقلا کہا کرتے تھے کہ ان (عیسائیوں) سے جہاد شرعاً و عقلاً واجب ہے۔ یہ لوگ بنی آدم پر عار ہیں۔ یہ عقلوں اور شریعتوں کو بگاڑنے والے ہیں (۸۰۸)

یہ کلام مسلمانوں کی عقلی تنقیدوں کی فقط ایک مثال ہے۔ زائد مثالوں کی کوئی حد نہیں۔ ان سب تنقیدوں کو علمائے اسلام نے **سپائی نوزا، پاسکل، والٹیئر** کی پیدائش سے پہلے مدون کیا۔ یہ باتیں علمائے اسلام نے اُس وقت بیان کیں جب یورپ ''**تاریخی نقد**'' ''اور حریت فکر'' کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔

نصرانی شعائر اور رسومات میں سب سے بڑی رسم ''**عشائے ربانی**'' ہے۔ یہ نصرانی مذہب کے خلاف کھڑے ہونے والوں کی سب سے بڑی دلیل تھی جو عقل، بداہت اور حواس کے متصادم تھی۔

ہمیں یہ بات بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اسلام میں اِس قسم کی رسومات کا کوئی وجود نہیں۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا سچا اور کھرا دین ہے۔ اِس کو دیگر قوموں سے درآمد شدہ وثنی رسومات کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر احسان عظیم کیا کہ اُس کو اِس قسم کی خرافات سے آزاد کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے شعائر نازل کیے جو حکمت، عقل اور فطرت کے عین مطابق ہونے کے لحاظ سے بے مثال تھے۔ اسلامی شعائر میں کوئی پیچیدگی اور خفیہ راز نہیں۔ اس پر سب سے بڑی دلیل اُن مغربی افراد کی ہے جو مسلمانوں کی اجتماعی نمازوں پر حاضر ہوئے اور یہی بات اُن کے اسلام میں داخل ہونے کا سب سے بڑا سبب بنی۔ **تھامس آرنلڈ** کہتے ہیں:

''مسلمانوں کے اجتماعی تہوار کے مواقع پر جو کوئی بھی حاضر ہوتا ہے، وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں نہایت بلیغ تاثرات محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ اجتماعی عبادت کی اِس زبردست قوت کو دیگر طریقوں کی عبادت سے بالکل الگ تھلگ قرار دیتا ہے'' (۸۰۹)

رینان کہتا ہے: میں جب کسی مسجد میں داخل ہوتا ہوں تو مجھے شدید افسوس گھیر لیتا ہے کہ میں خود کو مسلمان

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں پاتا''۔(۸۱۰)

''امریکی مستشرق بوڈلے نصرانیت اور اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اگر روحانی بزرگ **پطرس** روم تشریف لائیں، وہ بھاری بھرکم رسومات، کاہنوں کے منقش ملبوسات اور عبادت خانوں میں عجیب وغریب موسیقی دیکھ کر حیرت وتعجب سے بھر جائیں''۔ یہ سب کچھ اُن کے نام پر جاری کیا جاتا ہے۔ عبادت خانوں کی خوشبوئی بخارات، بگل اور مصنوعی ورد اُن کے ذہن میں آقا مسیح کی یاد نہ دلا سکیں گی۔ لیکن جب محمد ﷺ لندن اور زنزبار کے مابین پھیلی ہوئی مساجد میں سے کسی بھی مسجد میں لوٹ کر آئیں تو وہ خود کو انہی معروف شعائر میں محسوس کریں گے جو اُن کی اپنی اینٹوں اور کھجور کے تنوں سے بنی ہوئی مسجدِ نبوی میں قائم کی جاتی ہیں۔(۸۱۱)

''**بخشش کے سرٹیفکیٹ**'' لکھنے کی عظیم تاریخی غلطی، انسانی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اسلام کے دشمن اور سیکولرزم کے داعی چاہے جس قدر مرضی بلند و بانگ دعوے کریں، لیکن وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے کہ اسلامی تاریخ میں بخشش کے پروانے لکھے گئے چہ جائیکہ اُن کو اسلام کے اصولوں سے ثابت کر سکیں۔ بخشش کے پروانے ایسی مضحکہ خیز غلطی ہے جس کو مسلمان اپنی تاریخ کے جاہل ترین اور پست ترین دور میں بھی نہیں جانتے۔ موجودہ دور میں جاہل مسلمان عوام میں بے شمار خرافات جنم لے چکی ہیں لیکن اِس کے باوجود صوفیا کے مشائخ یا مبینہ اولیا میں کسی نے بخشش کے سرٹیفکیٹ نہیں لکھے۔ بلکہ ہم تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ہمارے جہان میں اِسے کوئی نہیں جانتا اور نہ کسی کے وہم وگمان میں یہ بات ہے۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ امت مسلمہ جتنی بھی منحرف اور خبطی ہوئی پھر بھی اُس میں عقل وایمان کی کچھ نہ کچھ رمق موجود رہی جو اُس کو اس طرح کی واضح حماقتوں سے باز رکھتی رہی۔ کلیسا کے پوپ اس طرح کی حماقتیں تین صدیوں تک کرتے رہے۔

یہ اسلام اور کلیسائی دین کے بڑے بڑے جوہری فرق ہیں۔ اسلام کی تاریخ اور کلیسا کی تاریخ ہمارے پیش کردہ سوال پر واضح اور زوردار جواب فراہم کرتی ہے۔ ہم اپنا سوال پہلے نقل کر چکے ہیں: ''کیا عالم اسلام میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجائش اور ضرورت موجود ہے؟'' اِن واضح تاریخی دلائل کے بعد بھی کوئی شخص دوسروں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس آیت کا مصداق ہے:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾ (الفرقان۔۲۵/۴۳)

کیا آپ نے اسے بھی دیکھا جو اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہے کیا آپ اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب: ۲۰

اسلام میں سیکولرزم کا حکم

اصطلاحات

توحید۔ عبادت کی تمام اقسام کو فقط اللہ کے لیے بجالانا۔ توحید کے اثبات کے لیے تمام انبیا تشریف لائے۔

عبادت۔ ہر وہ کام جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوں، عبادت کہلاتا ہے۔ اس تصور کے مطابق زندگی کے تمام افعال اللہ کے احکام کے مطابق ہوں۔ یہ کہنا کہ دین میں سیاست نہیں اور سیاست میں دین نہیں، اللہ کی عبادت کے منافی ہے۔

شرک۔ اللہ کے حقوق غیر اللہ کے لیے بجالانا۔

سیکولرزم اِس معنی میں شرک در عبادت ہے کہ اِس میں زندگی کا ایک حصہ (مثلاً سیاست) اللہ کے لیے مختص نہیں ہوتا۔ نیز یہ شرک در اطاعت بھی ہے یعنی اللہ کی صریح نافرمانی میں غیر اللہ کے احکام کو برضا و رغبت قبول کرنا، قرآن میں اِس کو اللہ کے مقابلے میں دوسروں کو رب بنانا کہا گیا ہے۔

طاغوت۔ وہ ہستی جس کی اللہ کے مقابلے میں عبادت کی جائے۔

کبھی یہ عبادت غایت درجے کی محبت و تعظیم کی شکل میں ہوتی ہے اور کبھی یہ ربّ کی نافرمانی میں غیر اللہ کی مطلق اطاعت برضا و رغبت قبول کر کے ہوتی ہے۔ طاغوت معبودِ باطل بھی ہوتا ہے اور شریعت کی تحکیم سے روگردانی کرنے والا فیصل قاضی اور حاکم بھی۔ طاغوت کا انکار کرنا ایمان کا لازم حصہ ہے۔

حکم بغیر ما انزل اللہ۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کی تنفیذ سے روگردانی کرنا اور غیر شرعی اُمور کو نافذ کرنا۔

سیکولرزم اس معنی میں حکم بغیر ما انزل اللہ ہے کہ اِس میں اللہ کی شریعت کو قانون عام کے طور پر لاگو نہیں کیا جاتا اور شریعت کی تنفیذ سے روگردانی کی جاتی ہے۔

نواقض اسلام۔ وہ امور جن کی وجہ سے انسان کفر اکبر کا مرتکب ہوتا ہے اور دائرہ اسلام سے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خارج ہو جاتا ہے۔ جیسے اللہ کی توحید کا انکار کرنا، محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کرنا، آخرت کا انکار کرنا وغیرہ۔

ناقض اسلام کے مرتکب انسان کا کوئی عمل اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں ہوتا۔ وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور اُس کے لیے جنت ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔

سابقہ ابواب کی تفصیل کے بعد مزید ضرورت نہیں رہی کہ اسلام اور سیکولرزم کا تناقض واضح کیا جائے۔ یہ ایک ایسا رجحان اور فکر ہے جس کے بارے میں ہمارے قدیم علما کہہ چکے ہیں کہ بعض رجحانات وافکار کا محض تصور ہی ان کے ردّ کے لیے کافی ہوتا ہے۔

لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ عوام میں اسلامی تصورات کے بارے میں کئی انحرافات اور کمزوریاں ہیں اور کئی شبہات ہیں جو اسلام کے ظاہری و پوشیدہ دشمنوں نے پھیلائے ہوئے ہیں تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ان تصورات کی حقیقت واضح کی جائے اور شبہات کا ازالہ کیا جائے۔

''توحید'' اسلامی تصورات میں سب سے بڑی حقیقت بلکہ کل حقیقت ہے۔ اسی طرح ''توحید'' سیکولرزم کی سب سے بڑی نقیض ہے۔ توحید کی کما حقہ معرفت از حد ضروری ہے۔

توحید کا قضیہ ایسا ہے جو رسولوں اور اُن کے اقوام کے درمیان سخت معرکہ کا سبب بنا اور اُس کی وجہ سے انسان دو مدِ مقابل گروہوں میں تقسیم ہوئے، موحد مسلمان گروہ اور مشرک گروہ۔

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ (الانبیاء:۲۱/۲۵)

تجھ سے پہلے بھی جو رسول ہم نے بھیجا اس کی طرف یہی وحی نازل فرمائی کہ میرے سوا کوئی معبود برحق نہیں پس تم سب میری ہی عبادت کرو۔

عقیدہ توحید کا حقیقی مفہوم بیان کرنے سے پہلے بہتر محسوس ہوتا ہے کہ ہم اقوام کا حال معلوم کریں جن میں رسول بھیجے گئے اور اُن کا اپنی اقوام کے ساتھ ایک مسلسل اور تاریخی جھگڑا شروع ہو گیا۔ اُن کے احوال میں، عقیدہ توحید کی پہچان کے لیے بہترین اسباق ہیں۔

تمام رسولوں کا اپنی امتوں کے ساتھ ایک ہی جھگڑا تھا، **توحید اور شرک کا جھگڑا**۔ ہم اس امت کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں جس کی طرف خاتم المرسلین بھیجے گئے۔ اس امت کے تصورات اور طرز زندگی کیسا تھا۔

اُن کے اور نبی ﷺ کی دعوت کے درمیان نزاع کس بات کا تھا اور کیوں تھا؟

عرب جاہلیت کے عقائد کا مطالعہ کرنے والا، پہلی دفعہ ہی جان لے گا کہ وہ اللہ کے وجود کے منکر قطعاً نہیں تھے۔ بلکہ وہ اللہ کو اُس کے افعال میں وحدہ لاشریک سمجھتے تھے جیسے خلق، رزق، تدبیر، زندگی دینا، موت دینا وغیرہ۔ اس کے شواہد قرآن میں بے شمار ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان۔

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

﴿وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (لقمان:۲۵/۳۱)

اگر آپ ان سے دریافت کریں کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے؟ تو یہ ضرور جواب دیں گے کہ اللہ، تو کہہ دیجیے کہ سب تعریفوں کے لائق اللہ ہی ہے، لیکن ان میں کے اکثر بے علم ہیں۔

وہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نافذ مشیت وقدرت کا بھی اقرار کرتے تھے۔

﴿سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ﴾ (الانعام۔۶/۱۴۸)

یہ مشرکین (یوں) کہیں گے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام کہہ سکتے۔

﴿وَمَن يُدَبِّرُ الْأَمْرَ فَسَيَقُولُونَ اللّٰهُ﴾ (یونس:۱۰/۳۱)

اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے؟ ضرور وہ یہی کہیں گے کہ ''اللہ''

وہ فرشتوں پر ایمان رکھتے تھے۔

﴿وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْمَلَائِكَةُ﴾ (الفرقان:۲۵/۲۱)

اور جنھیں ہماری ملاقات کی توقع نہیں انھوں نے کہا کہ ہم پر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے؟

وہ رسولوں پر ایمان رکھتے تھے۔

﴿وَإِذَا جَاءَتْهُمْ آيَةٌ قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَا أُوتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ (انعام:۶/۱۲۴)

اور جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے۔

وہ کتابوں پر ایمان رکھتے تھے اور یہود ونصاریٰ کو اہل کتاب کے نام سے پکارتے تھے۔

اسی طرح عرب کے اہل جاہلیت کے ہاں عبادت کے بعض مراسم بھی موجود تھے۔ جیسے بیت الحرام کی تعظیم۔ اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ذبح ونذر بھی کیا کرتے تھے جیسا کہ عبدالمطلب کی بیت الحرام کے لیے نذر کا قصہ مشہور ہے۔ اور وہ کھیتی اور جانوروں میں سے کچھ نہ کچھ اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کرتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی گواہی دی ہے۔

﴿وَجَعَلُوا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا﴾ (انعام:۶/۱۳۶)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا۔

عرب جاہلیت کے قانون کو دیکھیں تو وہ بعض حدود الٰہی کو بھی قائم کرتی تھی جیسے چوری کی حد۔ امام ابن کلبی اور قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ قریش چور کا ہاتھ کاٹتے تھے۔ یہ حد پچھلی شریعتوں میں بھی معروف ہے۔ مخزومی عورت کی چوری اور اسامہ بن زیدؓ کی سفارش والی حدیث سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ عرب جاہلیت موجودہ لادین جاہلیت سے ''حریت مذہب'' میں زیادہ آگے تھی۔ عرب جاہلی معاشرہ میں بعض حنفا تھے جو دین ابراہیم کے بچے کھچے امور پر عبادت کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

بعض اہلِ کتاب تھے، بعض ستاروں اور بتوں کے پجاری تھے اور بعض جنوں اور فرشتوں کے پجاری تھے۔

عرب جاہلی معاشرہ میں اس کے علاوہ کئی اخلاقی خوبیاں تھیں جو دیگر معاشروں میں ہمیں نظر نہیں آتیں۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس معاشرے پر کیا حکم لگایا ہے؟ ان تمام امور کی اسلام کے میزان میں کیا حیثیت مقرر کی گئی؟

اللہ تعالیٰ نے اس معاشرے پر اور اس دور کے تمام معاشروں پر ایک ہی حکم لگایا کہ یہ کفر و جاہلیت کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے عرب جاہلیت کی تمام خوبیوں کو اسلام کے میزان میں صفر قرار دیا۔ اسلام نے تمام اعتقادات کو نئی بنیاد اور صورت عطا کی۔

ہم دیکھتے ہیں عرب جاہلیت اور رسول ﷺ کے مابین طویل معرکہ واقع ہوا، سنگین لڑائی اور تنازعات جاری رہے حتیٰ کہ تلوار نے ہی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

سب سے اہم بات یہ کہ اس طویل اور سخت معرکہ کا موضوع فقط ایک ہی تھا۔ یعنی ''کلمہ لا الٰہ الا اللہ'' اسی کلمہ پر نبی ﷺ نے آخری حد تک اصرار کیا۔ عرب جاہلیت اس کلمہ کا مکمل طور پر انکار کرتی تھی۔ وہ اپنے علم اور یقین کی بنیاد پر اس کلمہ کا انکار کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کلمہ کو تسلیم کرنے سے کتنی خطرناک اور بھاری بھرکم تکلیف کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کلمہ کی ذمہ داری اور اس کا معنیٰ و مفہوم کتنا عظیم ہے۔ پہلے ہی لمحے جب نبی ﷺ نے ان کو لاإلٰہ إلا اللہ کی طرف بلایا تو ان کا فوری جواب یہی تھا۔

﴿ أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهاً وَاحِداً إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ (ص: ۵/۳۸)

کیا اس نے اتنے سارے معبودوں کا ایک ہی معبود کر دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

چنانچہ اُن کے ہاں مسئلہ بالکل واضح تھا۔ اُن کے ہاں کلمے کا معنی و مفہوم یہی تھا: ''اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمام معبودوں اور مختلف طواغیت کی کلی اور مکمل نفی''۔ وہ اسی معنی و مفہوم کے التزام سے گھبراتے تھے۔

''طواغیت کی نفی'' چاہے وہ طواغیت بتوں کی صورت میں ہوں یا باطل سرداری کی صورت میں، وہ قبیلے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کی صورت میں ہوں یا کہانت ورسوم ورواج کی صورت میں، الغرض کامل وفاداری کا حق فقط اللہ کے لیے ہے۔ احکام کا مرجع فقط اللہ تعالیٰ ہی ہے، چاہے وہ معمولی معاملات ہوں یا بڑے، حقیر امور ہوں یا جلیل القدر۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔

جب ابوطالب پر موت کا وقت قریب آیا تو نبی اکرم ﷺ اُس کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ ابوجہل، عبداللہ بن ابی اور امیہ بن مغیرہ بھی وہاں موجود ہیں۔ آپ نے کہا: ''اے چچا جان! آپ لَا اِلٰـــهَ اِلا اللّٰـه پڑھ لیجیے۔ میں اس کلمے کے متعلق اللہ تعالیٰ کے ہاں گواہی دوں گا۔ ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے کہا: اے ابوطالب! کیا تو ملت عبدالمطلب سے روگردانی کرے گا۔ نبی اکرم ﷺ کلمہ کی دعوت پیش کرتے رہے اور دہراتے رہے حتیٰ کے ابوطالب نے یہ جملہ ادا کیا۔ ''میں عبدالمطلب کے دین پر ہوں''

آپ نے غور کیا؟ موت کی آخری گھڑی میں فقط ایک خاص کلمے کو بولنے کا مطالبہ کیا گیا۔ جس کو زبان سے ادا کرنا بے حد آسان تھا۔ لیکن قریش کے طواغیت اِس کلمے کے ادا نہ کرنے پر کتنے شدید اصراری تھے۔ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک مرتا ہوا انسان بھی اِس کے بولنے پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر معاملہ صرف زبان سے ادا کردہ الفاظ کا ہوتا تو اِس قسم کا اصرار لازمی نہ ہوتا۔ لیکن معاملہ بڑا پُرخطر اور عمیق تھا جس کو یہ مشرک جانتے تھے لیکن آج کے اکثر مسلمان اس سے غافل ہیں۔

عبادت وطاغوت کی حقیقت:

کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا معنی طاغوت سے انکار اور اللہ تعالیٰ پر ایمان ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔

﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾

(بقرہ:۲/۲۵۶)

جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا۔

کلمہ کا مطلب اللہ تعالیٰ کے علاہ ہر معبود کی نفی ہے۔ جیسا کہ ہر نبی نے اپنی قوم سے کہا۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّٰهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ﴾

(النحل:۱۶/۳۶)

ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔

اس کلمے کی حقیقت طاغوت وعبادت کے معنی ومفہوم کو سمجھے بغیر ظاہر نہیں ہوتی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

① طاغوت

طاغوت کا لفظ قرآن وسنت میں بکثرت آیا ہے۔اور اسکی بہترین تعریف وہ ہے جو امام ابن القیم رحمہ اللہ نے ذکر کی ہے:

اَلطَّاغُوتُ كُلُّ مَا تَجَاوَزَ بِهِ الْعَبْدُ حَدَّهُ مِنْ مَعْبُوْدٍ اَوْ مَتْبُوْعٍ اَوْ مُطَاعٍ

جب کوئی عبد اپنی حد سے تجاوز کر کے معبود، متبوع یا مطاع بن جائے تو وہ طاغوت کہلاتا ہے۔

اسی طرح ہر قوم کا طاغوت وہ ہوتا ہے جسے شریعت الٰہی کے مقابلے میں امور متنازعہ کا آخری مرجع قرار دیا جائے، یا جس کی اللہ کے مقابلے میں عبادت کی جائے، یا جس کی پیروی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بصیرت سے ہٹ کر کی جائے، یا اُس کی اطاعت ایسے امور میں کی جائے جن کا منجانب اللہ ہونا معلوم نہ ہو۔

اس سے واضح ہوا کہ طاغوت کا لفظ عام ہے۔ جو لا الٰہ الا اللہ کے متضادات تمام چیزوں کو گھیرتا ہے۔ چاہے وہ کوئی شعار ہوں یا قانون، نظام ہوں یا شخصیت، جھنڈا ہو یا پارٹی وفکر وغیرہ۔

اسی وجہ سے امام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے ذکر کیا کہ طواغیت کی اقسام بہت زیادہ ہیں۔لیکن اُس کی بڑی بڑی اقسام پانچ ہیں۔

① شیطان جو غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِيْ آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (یسین۔۶۰/۳۶)

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے قول وقرار نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تو تمھارا کھلا دشمن ہے۔

② ظالم حکمران جو اللہ تعالیٰ کے احکام بدل ڈالے۔اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُواْ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيْدُونَ أَن يَتَحَاكَمُواْ إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُواْ أَن يَكْفُرُواْ بِهِ وَيُرِيْدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيْدًا﴾

کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا؟ جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر اور جو کچھ آپ سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

③ وہ حکمران جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَـٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾

(المائدہ:۵/۴۴)

جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ (پورے اور پختہ) کافر ہیں۔

④ وہ شخص جو علم غیب کا دعویٰ کرے حالانکہ یہ وصف فقط اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

⑤ وہ جس کی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں عبادت کی جائے اور وہ اپنی عبادت پر راضی ہو۔

اس تفصیل کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شرک بنی نوع انسان کا سب سے بڑا گناہ ہے اور یہ امتوں اور رسولوں کے مابین کشمکش کا مدار ہے۔

''شرک'' اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ طاغوت کی عبادت کا نام ہے یا خالص طاغوت کی عبادت کا نام ہے۔ یہ عبادت دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) ارادہ وقصد (۲) اطاعت واتباع۔

'ارادہ وقصد کا شرک' غیر اللہ کے لیے مراسم عبودیت بجالانے کا نام ہے جیسے نماز، قربانی، نذر، دعا، استغاثہ، وغیرہ۔ شرک کی یہ قسم عرب کی سادہ جاہلیت کے مقابلے میں ہے۔ جو کہتی تھی۔

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ﴾ (الزمر:۳۹/۳)

ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ (بزرگ) اللہ کی نزدیکی کے مرتبہ تک ہماری رسائی کرادیں۔

اس قسم کا طاغوت بت، پتھر، جن، یا ٹوٹم وغیرہ ہوتا ہے۔

''اطاعت واتباع کا شرک'' اللہ تعالیٰ کی شریعت پر سرکشی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کو مکمل زندگی میں یا زندگی کے کچھ حصے میں احکام کا ماخذ نہ سمجھنا شرک ہے۔ اطاعت کا شرک ہی درحقیقت اسلام اور جاہلیت کا فرق ہے۔ شرک اطاعت تاریخ انسان میں پھیلی ہوئی تمام جاہلیتوں کے مابین مشترک علامت تھی۔ اِس کی وجہ سے ہی جاہلیت کو جاہلیت کا نام دیا گیا، چاہے وہ عملی طور پر معرفت اور تمدن کے جس مقام ومرتبہ کو پہنچ جائے۔

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ﴾ (المائدہ:۵/۵۰)

کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔

﴿أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُم مِّنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَن بِهِ اللَّهُ﴾

(الشوریٰ:۴۲/۲۱)

کیا ان لوگوں نے ایسے (اللہ کے) شریک (مقرر کر رکھے) ہیں جنھوں نے ایسے احکام دین مقرر کر دیے ہیں جو اللہ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس قسم کے **طواغیت** جاہلی لیڈر، کاہن، وڈیروں، نظاموں، رسوم ورواج، قوانین، دساتیر اور خواہشات وغیرہ کی صورت میں ہوتے ہیں۔ عملی طور پر شرک کی دونوں اقسام کی بنیاد ایک ہی بنتی ہے۔ یعنی غیر اللہ کی حاکمیت اور اُس کو احکام کا ماخذ بنانا۔ اللہ اکیلے کی حاکمیت کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لیے عبادت وتقرب بجا نہ لائے۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت سے ہٹ کر کسی کی طرف متوجہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلَّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلَـكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَعْلَمُونَ﴾ (یوسف:۴۰/۱۲)

فرماں روائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ یہی دین درست ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہاں سارے معاملے کو اللہ اکیلے کی طرف لوٹایا گیا۔ اللہ اکیلے کو حاکم حقیقی قرار دینا ہی عبادت ہے جس کا کوئی حصہ غیر اللہ کی طرف نہیں پھیرا جا سکتا۔ یہی دین قیم ہے جس کے علاوہ کوئی دین اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں لیکن اکثر لوگ اس سے جاہل ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو جو شخص حاکمیت الٰہی کا کلی طور پر یا جزوی طور پر مقابلہ کرنے کوشش کرتا ہے۔ وہ **طاغوت** ہے، چاہے وہ جس صورت میں ہو یا جس زمانے میں ہو۔ کوئی انسان یا معاشرہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقی گواہی نہیں دے سکتا جب تک وہ طاغوت کا انکار نہ کردے، اُس سے اور اُس کے حواریوں سے برات کا اظہار نہ کردے۔

اسی وجہ سے جب کوئی دور نبوی میں کلمہ توحید ادا کرتا تو وہ جاہلیت سے مکمل طور پر الگ ہو جاتا تھا۔ وہ جاہلیت کے تمام طور طریقوں، اقدار، میزان اور رسوم ورواج سے نکل جاتا اور ایمان والوں کی جماعت میں داخل ہو جاتا۔ وہ فقط اللہ تعالیٰ کے احکام کا ہی بلا تردد واستثنا مطیع ہو جاتا۔

② عبادت:

اس کائنات میں موجود ہر جماد و جاندار کا اپنے خالق اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے تعلق کا نام ''عبادت'' ہے۔ یہ وجود انسانی بلکہ تمام مکلّف مخلوق 'جن وانس' کی غایت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (ذاریات:۵۶/۵۱)

میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔

عبادت کی بہترین تعریف شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

﴿اِسْمٌ جَامِعٌ لِكُلِّ مَا يُحِبُّهُ اللّٰهُ وَيَرْضَاهُ مِنَ الْاَقْوَالِ وَالْاَعْمَالِ الْبَاطِنَةِ وَالظَّاهِرَةِ﴾

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

''عبادت'' ایک جامع لفظ ہے جو اُن تمام ظاہری و باطنی اقوال اور افعال پر محیط ہے جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اور جن سے وہ راضی ہوتے ہیں''

شیخ رحمہ اللہ نے اپنے رسالے ''عبودیت'' کے اندر ثابت کیا ہے کہ دین سارے کا سارا عبادت میں داخل ہے۔ انھوں نے اس پر شرعی ولغوی دلائل ذکر کیے ہیں۔ پہلے اشارہ گذر چکا ہے کہ دین کا عبادت میں داخل ہونا ،اس آیت کے لفظوں میں شامل ہے۔

﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّهِ أَمَرَ أَلاَّ تَعْبُدُواْ إِلاَّ إِيَّاهُ﴾ (یوسف:۱۲/۴۰)

فرماں روائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

اسی طرح وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔

﴿وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ (بینہ:۹۸/۵)

اور انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اسی کے لیے دین کو خالص رکھیں۔

اس حقیقت کی وضاحت اُن کے شاگرد (**ابن القیم** رحمہ اللہ) نے کی ہے کہ **عبادت کے قواعد ومراتب** انسانی زندگی کی تمام سرگرمیوں پر محیط ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''عبودیت کی چکی پندرہ قواعد پر گھومتی ہے۔ جو ان پندرہ قواعد کو مکمل کر لیتا ہے وہ عبودیت کے مراتب مکمل کر لیتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبودیت دِل زبان اور اعضا پر تقسیم ہوتی ہے۔ ان میں ہر ایک کے ساتھ کچھ خاص قسم کی عبادتیں لاحق ہیں۔ عبدیت کے احکام پانچ ہیں یعنی واجب، مستحب، حرام، مکروہ اور مباح۔ یہ پانچوں احکام دِل زبان اور اعضا میں ہر ایک کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ (۸۲۱)

پھر امام نے اعضا کی عبادت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: اعضا کی پانچ عبادات مزید پچیس اقسام پر منقسم ہے۔ کیونکہ حواس پانچ ہیں اور حس کی پانچ عبادتیں ہیں۔ آپ نے ہر قسم کی شرح ومثال بیان کی ہے۔

اس کی تفصیلی وضاحت **سیّد قطب** رحمہ اللہ نے کی ہے۔ جب انھوں نے اس آیت کی تشریح فرمائی۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (ذاریات۔۵۱/۵۶)

میں نے جنات اور انسانوں کو محض اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔

اس کا کچھ حصہ یہاں بیان کیا جاتا ہے۔

عبادت کا معنی ومفہوم محض چند رسوم ادا کرنے سے کہیں زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے جن اور انسان اپنی ساری زندگی چند مخصوص رسوم ادا کرنے میں نہیں گزارتے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس کا پابند بھی نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے جن وانس کو چند دیگر سرگرمیوں کا بھی مکلّف بنایا جو ساری زندگی پر محیط ہیں۔ ہم جنوں کی سرگرمیوں کو تو نہیں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جانتے لیکن انسان سے مطلوب سرگرمیوں کو قرآن کے اس فرمان سے جانتے ہیں۔

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾ (بقرۃ:۲/۳۰)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔

''زمین میں خلافت'' انسانی وجود کا مقصد ہے جو کئی قسم کی سرگرمیوں کا متقاضی ہے جیسے زمین کی آبادکاری، زمین کی قوتوں اور طاقتوں کی پہچان حاصل کرنا، زمین کے ذخائر اور پوشیدہ خزانوں کو نکالنا، زمین کے وسائل کو اللہ تعالیٰ کے ارادہ ومنشا کے مطابق زندگی کی تعمیر وترقی میں استعمال کرنا۔ اسی طرح خلافت تقاضا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کو زمین میں قائم کیا جائے تاکہ زندگی کا الٰہی منہج کائنات کے الٰہی منہج کے موافق ہو جائے۔

یہاں یہ بات بالکل واضح ہے کہ عبادت ہی وجودِ انسانی کی غایت ہے۔ یہ انسان کا سب سے پہلا وظیفہ ہے جو چند مخصوص رسوم سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر مفہوم کا حامل ہے۔ انسان کا وظیفہ ''خلافت'' عبادت کے مدلول میں قطعی طور پر داخل ہے۔ چنانچہ عبادت کی حقیقت دو بڑی اقسام میں تشکیل پاتی ہے۔

① عبودیت کے معنی کو اپنے نفس میں اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا۔ یعنی شعور اس بات پر جم جائے کہ دنیا میں مخلوق عبد ہے اور اللہ رب ہے۔ عبد عبادت کرنے والا ہے اور رب معبود ہے۔ اس سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں۔ اس پوری کائنات کے اندر فقط دو ہی ہستیاں ہیں: عابد اور معبود۔ معبود فقط ایک ہے اور باقی سارے اُس کے غلام اور عبد ہیں۔

② اللہ تعالیٰ کی طرف دِل وضمیر کی تمام توجہات، اعضا کی حرکات اور زندگی کی سرگرمیوں کے ساتھ متوجہ ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف یہ توجہ خالص ہو جو دیگر معبودان کے شعور اور تعبد سے خالی ہو۔ (۸۲۲)

ان تمام معانی پر قرآن کی یہ صریح نص دلالت کرتی ہے۔

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ لَا شَرِيكَ لَهُ﴾ (انعام:۶/۱۶۲)

آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت میں شرک کرنے سے منع کیا اور اخلاص بجالانے کا حکم دیا۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے۔

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ﴾ (الزمر:۳۹/۲)

یقیناً ہم نے اس کتاب کو آپ کی طرف حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے پس آپ اللہ ہی کی عبادت کریں، اُسی کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿ قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ﴾ (الزمر:۳۹/۶۴)

آپ کہہ دیجیے کہ اے جاہلو! کیا تم مجھ سے اللہ کے سوا اوروں کی عبادت کا کہتے ہو۔

یہ آیات عبادت کی تمام اقسام کو گھیرتی ہیں جیسا کہ ایک آیت کی تفسیر میں عدی بن حاتمؓ کی حدیث وارد ہوئی ہے۔

انسان کی فطرت، مزاج اور اُس کی طبعی محتاجی قطعی طور پر بتلاتی ہے کہ وہ عبد ہے، اِس کے سوا کچھ نہیں۔ اُس کی ذمہ داری فقط یہی ہے کہ وہ اپنے لیے معبود کا انتخاب کرے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''عبودیت'' کے اندر ثابت کیا ہے کہ انسان کے سامنے صرف دو ہی راستے ہیں، تیسرا راستہ نہیں۔ یا تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبودیت کو اختیار کرے یا اللہ تعالیٰ کی عبودیت سے انکار کر کے غیر اللہ کی عبودیت میں واقع ہو جائے۔ (۸۲۳)

غیر اللہ کی عبادت چاہے چھوٹی ہو یا بڑی، اپنی آخری صورت میں شیطان کی عبادت ہی ہوتی ہے۔

﴿أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ﴾ (یسین۔۳۶/۶۰)

اے اولاد آدم! کیا میں نے تم سے قول و قرار نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تو تمھارا کھلا دشمن ہے۔

شیطان کی عبادت غیر اللہ کی عبادت کا آخری انجام ہے، چاہے اسالیب اور راستے جس قدر مختلف ہوں۔

غیر اللہ کی عبادت عربوں کو بھی گھیرے ہوئی تھی۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

﴿إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا﴾

(النساء:۴/۱۱۷)

یہ تو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر صرف عورتوں کو پکارتے ہیں اور دراصل یہ صرف سرکش شیطان کو پوجتے ہیں۔

اسی طرح یہ شرکیہ عبادت تاریخ میں موجود ہر غیر اللہ کی عبادت کو گھیرے ہوئے تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اب عبادت کے مظاہر بدل چکے ہیں۔ اب وہ مؤنث مورتیاں نہیں رہیں جن کو عرب اپنے شرک کی خاطر پوجتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود شیطان کی پوجا بذات خود نہیں بدلی۔ اب قدیم مؤنث مورتیوں کی جگہ دوسرے بت وارد ہو چکے ہیں۔ جیسے ریاست، لیڈر، مکتب فکر، تنظیم، سائنس، ترقی، پیداوار، تہذیب، ارتقا، معاشرہ، وطن، قومیت، انسانیت، عقل پرستی، محبت، جنس، شخصی آزادی، وغیرہ۔ عرب بسیط مونث مورتیوں کی پوجا کرتے تھے اور اُن کو مقدس گردانتے تھے۔ لیکن اب کئی قسم کی جدید مونث مورتیاں وجود میں آچکی ہیں جن کی اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجا اور اطاعت کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ وضع میں تبدیلی لائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عبادت کے مظاہر ارتقاپذیر ہو گئے ہیں لیکن جوہر نہیں بدلا اور وہ شیطان کی پوجا ہے۔(۸۲۴)

طاغوت اور عبادت کے اجمالی فہم کی روشنی میں ہمارے لیے لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی معنی واضح ہو جاتا ہے اور وہ جیسا کہ گزر چکا ہے ''طاغوت کا انکار کرنا اور اکیلے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے۔

سیکولرزم اسلام کے منافی ہے:

اِن بنیادی مفاہیم کو سمجھنے کے بعد سیکولرزم کے بارے میں حکم الٰہی کو پہچاننا آسان ہے۔مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ سیکولرزم ایک جاہلی طاغوتی نظام ہے جو دو اہم بنیادوں پر لا الٰہ الا اللہ کے منافی ہے۔

① سیکولرزم لا الٰہ الا اللہ کے منافی ہے کیونکہ یہ **حکم بغیر ما انزل اللہ** ہے یعنی شریعت الٰہی کی تحکیم سے روگردانی۔

② سیکولرزم لا الٰہ الا اللہ کے منافی ہے کیونکہ یہ عبادت الٰہی میں **شرک** ہے۔

اس حقیقت کے واضح اور آسان فہم ہونے کے باوجود ہم چند کمزور شبہات کا مناقشہ تفصیل سے کریں گے جو سیکولرزم کے حوالے سے پیش کیے جاتے ہیں۔

① سیکولرزم حکم بغیر ما انزل اللہ (شریعت کی تحکیم وتنفیذ سے روگردانی) ہے:

طاغوت کے متعلق سابقہ کلام سے معلوم ہوا کہ طاغوت ''حکم بغیر ما انزل اللہ'' یا ''شریعت الٰہی کی حاکمیت سے روگردانی'' کا نام ہے،ہم یہاں سیکولرزم کا حکم "إِنِ الْحُكْمُ إِلاَّ لِلّه (انعام:۶/۵۷)'' کے قاعدے کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔"ان الحکم الا للہ" یعنی حکم فقط اللہ کا،اسلام کا خلاصہ اور کلمہ توحید کا تقاضا ہے۔

سیکولرزم بدیہی طور پر شریعت الٰہی کی حاکمیت سے روگردانی کا نام ہے۔زندگی کو دین کے علاوہ کسی چیز پر قائم کرنا ہی حکم بغیر ما انزل اللہ یا شریعت الٰہی کی حاکمیت سے روگردانی ہے۔اس اعتبار سے سیکولرزم بدیہی طور پر جاہلی نظام ہے اس کے معتقد کے لیے دائرہ اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ وہ اس نص قرآنی کے تحت کافر ہے۔

﴿ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ فَأُوْلَـئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾(المائدہ:۵/۴۴)

جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ (پورے اور پختہ) کافر ہیں۔

غور طلب بات یہ ہے کہ شریعت کی حاکمیت سے روگردانی کرنے والے حاکم کے کفر اور عدم ایمان پر دلالت کرنے والی اکثر آیات (نہ کہ ساری آیات) اُن لوگوں کے سیاق میں نازل ہوئیں جو اہل کتاب میں سے تھے اور ایمان کا دعویٰ کرتے تھے یا ظاہری طور پر اسلام قبول کیے ہوئے تھے۔شاید اس کی حکمت یہ ہے کہ جو شخص کتاب اللہ پر ایمان کا دعویٰ ہی نہ کرے تو وہ یقینی کافر ہے،غیر اللہ کی طرف تحاکم (عدالتی فیصلے کے لیے جانا) کا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مسئلہ بھی واضح ہے کہ اس میں کوئی گنجائش سمجھ نہیں آتی۔ لیکن بسا اوقات کسی کو اُس شخص کے بارے میں وہم ہوسکتا ہے جو کسی آسمانی کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی شریعت کے ساتھ فیصلے نہیں کرتا، حاکمیت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ساتھ دوسرے کی بھی اطاعت کرتا ہے، یا اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر کسی دوسرے کی فرمانبرداری کرتا ہے۔ اس شخص کے بارے میں شبہ ہوسکتا ہے کہ آیا یہ شخص بھی کافر ہے۔

ہم ذیل میں اس بات کو چند آیات سے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ O ----- الی قولہ

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾

(المائدہ: ۵/۴۴۔۵۰)

ہم نے تورات نازل فرمائی ہے جس میں ہدایت ونور ہے، یہودیوں میں اسی تورات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ماننے والے انبیا (علیہم السلام) اور اہل اللہ اور علما فیصلے کرتے تھے کیونکہ انہیں اللہ کی اس کتاب کی حفاظت کا حکم دیا گیا تھا۔ اور وہ اس پر اقراری گواہ تھے۔ اب تمھیں چاہیے کہ لوگوں سے نہ ڈرو اور صرف میرا ڈر رکھو، میری آیتوں کو تھوڑے تھوڑے مول پر نہ بیچو، جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی وحی کے ساتھ فیصلے نہ کریں وہ (پورے اور پختہ) کافر ہیں۔۔۔۔۔ الی قولہ

کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ﴾ (آلِ عمران: ۳/۲۳)

کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا جنھیں ایک حصہ کتاب کا دیا گیا ہے وہ اپنے آپس کے فیصلوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں، پھر بھی ایک جماعت ان کی منہ پھیر کر لوٹ جاتی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلاً ○ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُوْلِي الأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ ذَلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيْلا۔۔۔الی قولہ

فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوْا فِيْ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْما﴾ (النساء:۴/۶۵)

اے ایمان والو! فرماں برداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرماں برداری کرو رسول ﷺ کی اور تم میں سے اختیار والوں کی۔ پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے لوٹاؤ، اللہ تعالیٰ کی طرف اور رسول کی طرف، اگر تمھیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے۔ یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام کے بہت اچھا ہے۔ کیا آپ نے انہیں نہیں دیکھا؟ جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر اور جو کچھ آپ سے پہلے اتارا گیا ہے اس پر ان کا ایمان ہے، لیکن وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں، شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ انہیں بہکا کر دور ڈال دے۔۔۔۔الی قولہ

سو قسم ہے تیرے پروردگار کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تمام آپس کے اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرماں برداری کے ساتھ قبول کر لیں۔

سورت انعام تو شاید تشریع وحاکمیت کے موضوع کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ ہم اس کی درج ذیل آیات ملاحظہ کرتے ہیں۔

﴿أَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيّاً﴾ (انعام:۶/۱۴)

آپ کہیے کہ کیا اللہ کے سوا، اور کسی کو معبود قرار دوں۔

﴿أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِيْ حَكَماً﴾ (انعام:۶/۱۱۴)

تو کیا اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں

قُلْ أَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِيْ رَبّاً﴾ (انعام:۶/۱۶۴)

آپ فرما دیجیے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لیے تلاش کروں۔

اللہ تعالیٰ نے حاکمیت، ولایت، اور ربوبیت کو برابر کر دیا اور مومنوں کو فرمایا۔

﴿وَلاَ تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ وَإِنَّ الشَّيَاطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ إِلَى أَوْلِيَآئِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لَمُشْرِكُونَ﴾ (انعام:۶/۱۲۱)

اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اور یہ کام نافرمانی کا ہے اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کے دل میں ڈالتے ہیں تاکہ یہ تم سے جدال کریں اور اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔

سورت توبہ میں یہ فرمان ہے:

﴿اتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوْا إِلاَّ لِيَعْبُدُوْا إِلَـهاً وَاحِدًا لاَّ إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (توبہ:۹/۳۱)

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے اور مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ انہیں صرف ایک اکیلے اللہ ہی کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک ہے ان کے شریک مقرر کرنے سے۔

اسی طرح سورت نور میں ارشاد فرمایا:

﴿وَيَقُولُونَ آمَنَّا بِاللّهِ وَبِالرَّسُولِ وَأَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُم مِّن بَعْدِ ذَلِكَ وَمَا أُوْلَئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ---الی قوله

إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُوْلَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ (نور:۲۴/۴۷-۵۱)

اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور رسول پر ایمان لائے اور فرماں بردار ہوئے، پھر ان میں سے ایک فرقہ اس کے بعد بھی پھر جاتا ہے۔ یہ ایمان والے ہیں (ہی) نہیں ----الی قولہ ایمان والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب انہیں اس لیے بلایا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول ان میں فیصلہ کر دے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

سورت محمد میں ہے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ ارْتَدُّوا عَلَى أَدْبَارِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطَانُ سَوَّلَ لَهُمْ وَأَمْلَى لَهُمْ ○ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لِلَّذِينَ كَرِهُوا مَا نَزَّلَ اللّهُ سَنُطِيعُكُمْ فِي بَعْضِ الْأَمْرِ﴾ (محمد:۴۷/۲۵-۲۶)

جو لوگ اپنی پیٹھ کے بل الٹے پھر گئے اس کے بعد کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہو چکی یقیناً شیطان نے ان کے لیے (ان کے فعل کو) مزین کر دیا ہے اور انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کی نازل کردہ وحی کو برا سمجھا یہ کہا کہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہم بھی عن قریب بعض کاموں میں تمھارا کہا مانیں گے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فرمان:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جو حکم بما انزل اللہ (شریعت کی تحکیم) کے وجوب کا عقیدہ نہ رکھے تو وہ کافر ہے۔ جو لوگوں کے مابین جھگڑوں کو اپنے من گھڑت عدل کے مطابق حل کرے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کی پیروی نہ کرے تو وہ کفر کا مرتکب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر امت عدل کے فیصلوں کو ترجیح دیتی ہے اور ہر امت کے نزدیک عدل اُس کے اپنے دین میں ہوتا ہے جس کو امت کے اکابرین اختیار کرتے ہیں۔ اسلام سے منسوب بہت سارے لوگ اپنے رسوم ورواج کے مطابق فیصلے کرتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو نازل نہیں کیا ہوتا جیسے دیہاتوں میں جاری رسوم ورواج اور وڈیروں کے من گھڑت ضابطوں کی اطاعت وغیرہ۔ دیہات کے لوگ سمجھتے ہیں کہ مناسب فیصلے وہی ہیں جو اُن کے رواج کے مطابق ہوں اور کتاب وسنت سے فیصلوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ طرز عمل عین کفر ہے۔ اکثر لوگ اسلام قبول کرتے ہیں لیکن وہ اپنے فیصلے قدیم ضابطوں اور طریقوں کے مطابق کرواتے ہیں جن کا حکم وڈیروں کی طرف سے جاری ہوتا ہے۔ جب اُن لوگوں کو بتلایا جاتا ہے کہ فیصلے شریعت کے مطابق ہونے چاہییں تو وہ اِس کا التزام نہیں کرتے بلکہ شریعت کے خلاف فیصلوں کو حلال قرار دیتے ہیں۔ یہ لوگ کفر کے مرتکب ہیں (۸۲۵)

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کا استدلال:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النساء:۶۵/۴)

سو قسم ہے تیرے پروردگار کی! یہ مومن نہیں ہو سکتے، جب تک کہ تمام آپس کے اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرماں برداری کے ساتھ قبول کر لیں۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے نفس کریم کی قسم اٹھا رہے ہیں کہ کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول ﷺ کو اپنے تمام امور میں حاکم نہ مان لے۔ آپ جو حکم دیں وہ برحق ہے جس کی اطاعت ظاہری و باطنی طور پر واجب ہے اسی لیے فرمایا۔

﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾

(النساء:۶۵)

پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرماں برداری کے ساتھ قبول کر لیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

یعنی جب وہ آپ کو حاکم بنائیں اور اپنے دل سے آپ کی اطاعت کریں، آپ ﷺ کے فیصلے کے خلاف اپنے دلوں میں کوئی حرج محسوس نہ کریں اور ظاہر و باطن میں فرماں بردار ہو جائیں، کلی طور پر بغیر رکاوٹ ،مدافعت اور جھگڑے کے تسلیم کرلیں تو مسلمان ہیں۔(۸۲۶)

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾

(المائدہ:۵/۵۰)

کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟

اس آیت کی تشریح میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ اُس شخص پر انکار کررہے ہیں جو اُس کے قطعی احکام سے خروج کرے حالانکہ وہ ہر قسم کی بھلائی پر مشتمل ہیں اور ہر شر سے روکنے والے ہیں، اور شریعت کے الٹ آرا، خواہشات اور لوگوں کے گھڑے ہوئے اُمور کی طرف رجوع کرے جو اللہ تعالیٰ کی سند پر مبنی نہ ہوں۔ وہ ایسے فیصلے کرنے لگ جائے جیسے اہلِ جاہلیت گمراہیوں اور جہالتوں پر مبنی فیصلے کرتے تھے۔ وہ اپنی من گھڑت آرا اور خواہشات کو مرجع بنالے۔ وہ ایسے فیصلے کرنے لگ جائے جیسے تاتاریوں نے اپنی ملکی سیاست میں اپنے بادشاہ چنگیز خان کے وضع کردہ قانون ''یاسق'' کو جاری کیا۔ ''یاسق'' احکامات کے مجموعے پر مشتمل ایک کتاب تھی جس میں مختلف شریعتوں سے اقتباسات اکٹھے کیے گئے جیسے یہودیت، نصرانیت، ملتِ اسلامیہ وغیرہ۔ اُس میں بہت سارے احکام محض اُس کی ذاتی نظر و خواہش کا نتیجہ بھی تھے۔ یاسق کا مجموعہ قوانین چنگیز خان کی اولاد میں ایک قابل اتباع شریعت قرار پایا۔ وہ اُس کو کتاب وسنت کے احکام پر مقدم کرنے لگے۔ اُن میں سے جس شخص نے یہ طرزِ عمل اختیار کیا وہ کفر کا مرتکب ہوا۔ اُس سے قتال واجب ہے حتی کہ وہ حکم الٰہی اور حکم رسول کی طرف لوٹ آئے۔ پھر وہ کوئی چھوٹا بڑا فیصلہ شریعت سے ہٹ کر نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ﴾ (المائدہ:۵/۵۰)

یعنی وہ جاہلیت کا حکم تلاش کرتے ہیں حالانکہ

﴿وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ (المائدہ:۵/۵۰)

اُس شخص کے لیے اللہ سے بڑھ کر کون عادل ہے جو اللہ سے اُس کی شریعت سمجھے، اُس پر ایمان لائے، یقین کرے۔ جان لو کہ اللہ احکم الحاکمین ہے۔ وہ اپنی مخلوق پر اُس سے بڑھ کر شفیق ہے، جتنا ماں اپنے بچوں پر شفیق ہوتی ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے، ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز میں عدل کرنے والا ہے۔

پھر امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے حسن بصریؒ کی روایت بسند ابو حاکم ذکر کی ہے۔ انھوں نے فرمایا: جو فیصلہ حکم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الٰہی سے ہٹ کر ہو، وہ جاہلیت کا حکم ہے۔ اسی طرح طاؤس رحمہ اللہ سے کسی شخص نے سوال کیا کہ والدین اپنے بچوں میں تحائف تقسیم کرتے وقت مساوات پر عمل کریں یا وہ کمی وبیشی بھی کر سکتے ہیں۔ امام طاؤس رحمہ اللہ نے جواباً یہ آیت پڑھی:

﴿ أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ ﴾ (المائدہ:۵/۵۰)

کیا یہ لوگ پھر سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، یقین رکھنے والے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے بہتر فیصلے اور حکم کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

اِس سے پتا چلتا ہے کہ سلف اس موضوع پر تلوار کی دھار کی طرح حساس تھے۔ وہ ہر معاملے میں غیر شرعی اُمور کی اتباع سے دور بھاگتے تھے، اگرچہ وہ چھوٹا موٹا معاملہ ہی کیوں نہ ہو۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اُس کے بعد بخاری شریف کی ایک حدیث ذکر کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔

اَبْغَضُ النَّاسِ اِلَى اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مَنْ يَبْتَغِي فِي الاسْلامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ

(صحیح البخاری:۶۸۸۲)

اللہ کے ہاں لوگوں میں سے سب سے زیادہ قابل نفرت وہ ہے جو اسلام کی حالت میں جاہلیت کے طور طریقے پسند کرتا ہے۔ (۸۲۷)

اس حدیث سے امام صاحب کی مراد یہ ہے کہ جاہلیت ایسی صفت ہے جو ہر اُس شخص کے ساتھ لاحق ہوگی جو اللہ کی شریعت سے ہٹ کر فیصلے کرے۔ جاہلیت کوئی مخصوص دور نہیں جو اسلام کے ظہور کے ساتھ اختتام پذیر ہو گیا۔

شیخ محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ کا قول:

شیخ محمد بن ابراہیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ حاکم بغیر ما انزل اللہ (شریعت کی تحکیم سے روگردانی کرنے والے فیصل قاضی اور حاکم) کو کافر کہے اور وہ کافر نہ ہو، بلکہ وہ مطلق کافر ہے۔ یا تو کفر عملی کا مرتکب ہے یا کفر اعتقادی کا۔ پھر وہ کفر اعتقادی کی تفصیل فرماتے ہیں:

① حاکم بغیر ما انزل اللہ (ایسا حاکم جو شریعت کی تحکیم سے روگردانی کرے) جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم کو دیگر قوانین سے زیادہ بہتر اور حق پر مبنی نہ سمجھے۔

② حاکم بغیر ما انزل اللہ جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم کے برحق ہونے کا انکار نہ کرے لیکن وہ عقیدہ رکھے کہ غیر نبوی حکم آپ ﷺ کے حکم سے زیادہ بہتر، مکمل اور ہمہ گیر ہو سکتا ہے۔ لوگ اپنے تنازعات میں غیر شرعی قوانین کے زیادہ محتاج ہیں یا زمانہ وحالات کے ارتقا کی وجہ سے نئے مسائل کا حل شریعت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

میں نہیں۔ بلا شک وشبہ یہ بات بھی کفر ہے کیونکہ مخلوق کے احکام جو محض اذہان وافکار کا کوڑا کرکٹ ہیں، کو اللہ بزرگ وبرتر کے حکم سے افضل قرار دیے جاتے ہیں۔

③ وہ غیر شرعی حکم کو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم سے افضل قرار نہ دے لیکن وہ عقیدہ رکھے کہ یہ اُس کے ہم مثل ہے۔ یہ شخص بھی پچھلی دو اقسام کی طرح کافر اور ملت اسلامیہ سے خارج ہے۔

④ وہ غیر شرعی حکم کو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم کے برابر نہیں سمجھتا اور نہ ہی افضل۔ لیکن وہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے حکم کے مخالف اُمور نافذ کرنا جائز ہیں، ایسا شخص بھی پچھلے بیان کردہ افراد کی طرح کفر کا مرتکب ہے۔

⑤ پانچویں قسم ایسے شخص کی ہے جو شریعت کی دشمنی، احکام شریعت کی مخالفت اور شرعی عدالتوں سے مقابلہ بازی میں سب سے زیادہ نمایاں، ہمہ گیر اور بڑا ہے۔ یہ شرعی عدالتوں کے مقابلے میں اصول، فروع، تشکیل، تنویع، حکم، الزام، مرجع واستثنا کے اعتبار سے بالکل متوازی مضبوط اور طاقتور نظام قائم کرتا ہے۔ جیسے شرعی عدالتوں کے لیے شرعی مرجع واستثنائیت ہوتی ہے جو کتاب وسنت سے حاصل شدہ ہوتی ہے، اسی طرح اِن وضعی عدالتوں کے مراجع ہوتے ہیں جو مختلف شریعتوں اور کئی قوانین سے جوڑ جوڑ کر بنائے جاتے ہیں۔ یہ وضعی عدالتیں آج کل اسلام کے بہت سارے علاقوں میں مکمل سرگرمیوں کے ساتھ کھلی ہوئی ہیں۔ لوگ اِن کی طرف گروہ در گروہ جاتے ہیں۔ اِن عدالتوں کے حکام کتاب وسنت کے احکام کے مخالف فیصلے کرتے ہیں۔ اِس سے بڑھ کر کون سا کفر ہوسکتا ہے اور اِس سے بڑھ کر کلمہ شہادت کی نقیض کیا ہوسکتی ہے (۸۲۸)

آیات کا یہ مجموعہ اور اِن جیسی دیگر آیات قرآن میں بہت زیادہ ہیں۔ بلکہ اِن کا موضوع قرآن کا بنیادی موضوع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علما نے اِن آیات کی تفہیم میں اقوال نقل کیے ہیں جو اس بات پر قطعی دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص زندگی کے کسی معاملہ میں غیر اللہ کے حکم کو پسند کرتا ہے، وہ ایمان سے خالی ہے۔ اس پر کفر، شرک، نفاق اور جاہلیت کا حکم لگانا بالکل درست ہے۔

بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

﴿ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴾ (انعام:۶/۱۲۱)

اور اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ گے۔

یہ محمد ﷺ اور اُن کے صحابہ کو خطاب ہے اور وہ بھی ایک فروعی مسئلہ میں یعنی ایسے ذبیحہ کا کھانا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو۔

کیا اتنی وضاحت کے بعد بھی کوئی شک وتردد کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

یقیناً شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ لیکن اسلام کے واضح حقائق لوگوں کے اذہان وقلوب سے اس قدر

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غائب ہو چکے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ انحراف کے موجودہ ادوار میں جہالت کا اتنا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے کہ لوگ ایسے کمزور اور ردی شبہات بھی کھڑے کر دیتے ہیں جن کی معمولی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔

سیکولرزم کے حامیوں کے شبہات:

① **سیکولر لادین نظام اللہ کے وجود کا انکار نہیں کرتا، عبادت میں رکاوٹ نہیں ڈالتا اور اس کے قائلین کلمہ شہادت کا اقرار کرتے ہیں۔**

پہلے شبہ کی تفصیل یہ ہے کہ بعض لوگ موجودہ لادین مغربی ڈیموکریسی پر کفر یا جاہلیت کا لفظ بولنے کو اس لیے بعید از قیاس سمجھتے ہیں کہ یہ نظام اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کرتا اور عبادت کے شعائر بجالانے میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ سیکولر لادین نظاموں کے بعض افراد کلمہ شہادت کے الفاظ ادا کرتے ہیں۔ نماز، روزہ حج، اور زکوۃ کے شعائر ادا کرتے ہیں، دینی رہنماؤں اور دینی اداروں کا احترام کرتے ہیں۔ یہ کہنا کیسے درست ہے کہ سیکولرزم جاہلی نظام ہے اور اُس پر ایمان لانے والے جاہل ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو لوگ اِس شبہ کو دہراتے رہتے ہیں وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے معنی نہیں جانتے اور اسلام کے مدلول کو بھی نہیں پہنچاتے ہیں، یہ ہمارا حسن ظن ہے۔ لیکن یہ حسن ظن اُن پڑھے لکھے افراد کے بارے میں نہیں جو اس قسم کے شبہات کو محض بے کار بہانوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسلامی کشمکش کی تاریخ اور قرآن اور سنت کی تمام تر تعلیمات اِس شبہ کو رد کرتی ہیں۔ کیا نبی اکرم ﷺ اور صحابہؓ نے مسلسل ۲۳ سال مصائب ومشقتوں پر مبنی دعوت وجہاد کو محض اس لیے برداشت کیا تھا کہ لوگ فقط زبان سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ ادا کریں اور چند شعائر عبادات کو ادا کرنے لگ جائیں جن کے بارے میں سیکولرزم کے داعی احسان جتلاتے ہیں کہ سیکولرزم میں مراسم عبودیت کی اجازت ہوتی ہے۔ کیا قرآن ۲۳ سال کے طویل دورانیہ میں امر ونہی کو اس لیے نازل کرتا رہا۔

قریش کہتے تھے کہ اے محمد! تو ہمارے معبود کی ایک سال عبادت کر۔ ہم تمھارے معبود کی ایک سال عبادت کریں گے۔ کیا سیکولر ملحدین یہی ایجنڈ البلفظہ یا بحالہ نہیں دہراتے کہ ہم مسجد میں تو اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے لیکن کاروبار، تجارت، پارلیمنٹ اور یونیورسٹی میں ہم اللہ کے علاوہ دیگر کی اطاعت کریں گے۔ کیا یہ دونوں باتیں ایک جیسی نہیں؟

فرق ہے تو صرف اتنا کہ قریش زمانے کی تقسیم کر رہے تھے اور یہ مکان یا موضوع کی تقسیم کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ﴾ (بقرہ:۲/۲۰۸)

ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی تابع داری نہ

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرو۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔

امام طبری رحمہ اللہ کہتے کہ سلم سے مراد اسلام ہے(۸۲۹)

نیز اللہ فرماتا ہے:

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال:۳۹/۸)

اور تم اُن سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا﴾ (النساء:۱۵۱/۴)

جو لوگ اللہ کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ بعض نبیوں پر تو ہمارا ایمان ہے اور بعض پر نہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے اور اس کے بین بین کوئی راہ نکالیں۔ یقین مانو کہ یہ سب لوگ اصلی کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔

﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (یوسف:۴۰/۱۲)

فرماں روائی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم سب سوائے اس کے کسی اور کی عبادت نہ کرو، یہی درست دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ بات ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کو محض زبان سے ادا کرنا واحد مقصود نہیں۔ اِس کی مزید وضاحت ذیل میں پیش کی جاتی ہے۔

علما نے کتاب وسنت کی چھان بین اور استقرا کے بعد لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کے لیے **شروط ونواقض** مقرر کیے ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ کی شرطوں میں سے کوئی شرط نہ پائی جائے یا نواقض میں سے کوئی ناقض پایا جائے تو کلمہ لا الٰہ الا اللہ ٹوٹ جاتا ہے اور مردود قرار پاتا ہے۔ صورت حال کا عملی مشاہدہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

مسلمانوں کے شہروں میں کئی ایسے لوگ ہیں جو کلمہ لا الٰہ الا اللہ کو زبان سے ادا کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ الحاد، ارتداد اور شرک کے اتنے واضح مرتکب ہوتے ہیں کہ اُن کے معاملے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

اگر فقط زبانی شہادت ہی معتبر ہوتی اور شروط ونواقض کا اعتبار نہ ہوتا تو یہ لوگ حتمی طور پر مسلمان ہوتے۔

اسلام کے دس بڑے بڑے **نواقض** ہیں جن کا مرتکب اسلام کو توڑ دیتا ہے اور دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ان میں سے دو اہم ناقض کا تعارف اس طرح سے ہے۔

① جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کسی دوسری ہستی کی سیرت، آپ کی سیرت سے زیادہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مکمل ہے۔ کسی اور کا حکم آپ ﷺ کے حکم سے زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ دور نبوی میں بعض لوگ آپ ﷺ کے حکم پر طواغیت کے حکم کو ترجیح دیتے تھے۔ تو ایسا شخص کفر کا مرتکب ہے۔

② جو شخص عقیدہ رکھے کہ بعض لوگوں کے لیے شریعت محمدی ﷺ سے خروج کی اجازت ہے جیسے حضرت خضر علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کی شریعت سے خروج کی اجازت تھی۔ تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ (۸۳۰)

ہر قسم کا شبہ ختم کرنے کے لیے بہتر ہے کہ ہم قدیم علمائے اسلام کا کلام نقل کریں جنھوں نے اس مسئلہ کی طرف خالص فقہی نظر ڈالی۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے تاتاریوں کے ساتھ قتال کے بارے میں سوال کیا گیا۔

تاتاری شام کی طرف گاہے بگاہے اقدام کرتے۔ وہ توحید و رسالت کی گواہی بھی دے چکے تھے اور اسلام کی طرف منسوب بھی تھے۔ وہ اُس کفر پر باقی نہیں رہے تھے جس پر وہ پہلے سے تھے۔ ہم ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتوے کو پڑھنے سے پہلے تاتاریوں کے قانون ''یاسق'' کے سابقہ تعارف کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیں جیسا کہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ ایک طویل قیمتی فتوی میں جواب دیتے ہیں۔ جس کا کچھ حصہ اس طرح سے ہے۔

''ہر وہ گروہ جو اسلام کے ظاہری متواتر شرعی مسائل سے خروج اختیار کرے۔ اُس سے قتال ائمہ اسلام کے اتفاق کے ساتھ واجب ہے۔ اگر چہ وہ شہادتین ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کو زبان سے کیوں نہ ادا کرتا ہو۔

اس طرح اگر وہ گروہ فواحش، زنا، جوا، شراب وغیرہ جیسی شرعی محرمات سے خروج اختیار کریں (یعنی پیروی لازم نہ سمجھے) یا لوگوں کے جان، مال، عزت کے معاملات میں قرآن وسنت کے احکام سے خروج اختیار کرے یا وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور کفار سے جہاد سے خروج اختیار کرے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾

(الانفال:۸/۳۹)

اور تم اُن سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ نہ رہے اور دین اللہ ہی کا ہو جائے۔

جب اس قسم کا معاملہ ہو کہ بعض دین اللہ تعالیٰ کا ہو اور بعض غیر اللہ کا تو قتال واجب ہے حتی کے سارا دین اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ، فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾

(بقرہ:۲/۲۷۸-۲۷۹)

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے وہ چھوڑ دو، اگر تم سچ مچ ایمان والے ہو۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ آیت اہل طائف کے بارے میں نازل ہوئی۔ وہ اسلام لا چکے تھے، نمازیں روزے بھی رکھتے تھے لیکن وہ سودی معاملات کرتے تھے۔ سود قرآن کے محرمات میں آخری تحریم ہے۔ سود ایسا مال ہوتا ہے جو دو بندوں کی باہمی رضامندی سے لیا دیا جاتا ہے۔ جو شخص اِس سے باز نہ آئے اور اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرے تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو دیگر محرمات سے باز نہ آئے جو حرمت میں مقدم اور زیادہ سخت ہیں۔

پھر امام رحمہ اللہ نے متواتر احادیث سے بھی استشہاد کیا ہے جو خوارج کے ساتھ قتال کے متعلق ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کا وصف بیان کیا ہے کہ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کے اندر سے نکل جاتا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ تم اپنی نمازوں اور تلاوتوں کو اُن کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے۔ امام رحمہ اللہ نے مانعین زکوۃ سے قتال پر صحابہؓ کے اجماع سے استشہاد کیا حالانکہ وہ نمازیں قائم کرتے تھے اور شریعت کا اقرار بھی کرتے تھے اور وہ زکوۃ کی ادائیگی سے انکار بھی محض تاویل کی بنیاد پر کرتے تھے کہ زکوۃ کی ادائیگی صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً﴾ (التوبۃ:۹/۱۰۳)

آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجیے۔

تو اس شخص کا کیا حال ہوگا جو متاول نہیں۔ بلکہ اِس سے بڑھ کے وہ شخص جو شریعت کے اُصول سے خروج اختیار کرے۔ امام رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ تاتاریوں کے بادشاہ کی تکفیر اور اُس سے قتال کو جو چیز واجب کرتی ہے، یہ ہے کہ وہ لوگوں کو انبیاء ورسل سے روک کر اپنے من گھڑت جاہلی طریقے اور کفریہ شریعت میں داخل ہونے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ اسلام کا دعویٰ بھی کرتے تھے اور کافروں کے دین کو دین اسلام سے برتر بھی سمجھتے تھے۔ وہ کافروں کی محبت واطاعت میں اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کی محبت واطاعت سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے درمیان جاہلیت کے حکم سے فیصلے کرتے تھے نہ کہ اللہ اور اُس کے رسول کے حکم سے۔ ان کا مرجع یاسق تھا۔

پھر وہ فرماتے ہیں: تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جو شخص دین اسلام سے ہٹ کر کسی دین کی اتباع کو جائز قرار دے یا شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹ کر کسی شریعت کی اتباع کو جائز قرار دے، وہ کافر ہے۔ اُس کا کفر ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص قرآن کے کچھ حصے پر ایمان لائے اور کچھ حصے سے کفر کردے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا﴾ (النساء:۴/۱۵۰-۱۵۱)

جو لوگ کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق رکھیں اور جو لوگ کہتے ہیں کہ بعض نبیوں پر تو ہمارا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ایمان ہے اور بعض پر نہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے اور اس کے بین بین کوئی راہ نکالیں۔
یقین مانو کہ یہ سب لوگ اصلی کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔

دین قبول کرنے کے بعد ارتداد اصلی کفر سے زیادہ سخت ہے۔ اسی طرح دین کے شرعی مسائل سے ارتداد، مکمل شریعت سے اصولی علیحدگی سے زیادہ قبیح ہے۔

جب کوئی اصلی مسلمان شریعت کے بعض مسائل سے ارتداد اختیار کرتا ہے تو اُس کی حالت اُس شخص سے زیادہ بری ہے جو دین کے شرعی مسائل میں کبھی داخل ہی نہیں ہوا۔ دین کے شرعی مسائل سے ارتداد کی مثال **مانعین زکوۃ** کی ہے جن سے حضرت ابوبکرؓ نے لڑائی کی۔ (۸۳۱)

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ نے اس مسئلے پر علما کے اس اجماع سے استشہاد کیا ہے جو عبیدیوں کی تکفیر پر کیا گیا۔ عبیدی غلطی سے فاطمی نام سے مشہور ہیں۔ شیخ فرماتے ہیں۔ ''یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بنو عبید القداح جو بنو عباس کے دور میں مغربی علاقوں اور مصر کے بادشاہ بنے وہ سب لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دیتے، اسلام کا دعویٰ کرتے اور جمعہ اور جماعت کے پابند تھے۔ جب انھوں نے شریعت کی اِن مسائل میں مخالفت کی جو بالکل مشہور ہیں تو علما نے اُن کے کفر و قتال پر اجماعی فیصلہ کیا۔ اُن کے علاقے دارالحرب قرار پائے، اُن کے خلاف مسلمانوں نے غزوہ کیا حتی اُن کے ہاتھوں سے مسلمانوں کے علاقے چھڑا لیے۔ (۸۳۲)

شیخ محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ **کا پوتا عبدالرحمان حسن نے لا الٰہ الا اللہ کی شروط** کو اُن لوگوں پر منطبق کیا ہے جن کا نام انھوں نے قبر پرست، طواغیت پرست اور بت پرست لیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی شرح کرتے ہیں۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ﴾

(بقرہ:۲/۱۶۵)

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے شریک اوروں کو ٹھہرا کر ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں، جیسی محبت اللہ سے ہونی چاہیے۔

''یہ لوگ اپنے قبر والوں سے محبت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی محبت کرتے ہیں۔ یہ لوگ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اور نماز روزہ کی پابندی کرتے ہیں۔ محبت و اطاعت کے معاملے میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔ ان کا اللہ تعالیٰ کے مدمقابل معبود گھڑنا، پھر ایسی محبت کرنا جیسی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کی جاتی ہے، اُن کے ہر قول و عمل کو باطل قرار دیتا ہے۔ کیونکہ مشرکین کا کوئی عمل قبول ہوتا ہے اور نہ صحیح ہوتا ہے۔ یہ لوگ اگرچہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں پھر بھی انھوں نے ہر اُس قید کو ترک کیا جس کے ساتھ یہ عظیم کلمہ جڑا ہوا ہے۔ کلمہ کی قیود درج ذیل ہیں۔

① کلمہ کے مدلول کا علم۔ مشرک کلمے کے معنی سے جاہل ہوتا ہے۔ جو شخص کلمے کے معنی سے جاہل ہو وہ اللہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ محبت وغیرہ میں شریک بناتا ہے۔ جہالت علم کے منافی ہے اور اخلاص فقط علم سے پیدا ہوتا ہے۔

② مشرک اپنے کلمے میں صادق بھی نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اُس شرک کی نفی نہیں کرتا جس کی نفی کلمہ کرتا ہے اور وہ اُس اخلاص کو ثابت نہیں کرتا جس کو کلمہ ثابت کرتا ہے۔

③ مشرک کلمہ پر یقین بھی نہیں رکھتا۔ کیونکہ اگر وہ اُس کا معنی ومفہوم سمجھتا ہوتا تو شرک کو برا سمجھتا یا اُسے چھوڑ دیتا۔

④ مشرک اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجے جانے والے معبودوں کا انکار بھی نہیں کرتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

مَنْ قَالَ لا اِلٰه اِلا اللّٰه وَكَفَرَ بِمَا يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ مَالَهٗ وَدَمَهٗ

(صحیح مسلم:۲۰)

جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے اور اللہ کے علاوہ معبودوں کا انکار کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جان و مال کو حرام قرار دیتا ہے۔

بلکہ مشرک اللہ تعالیٰ کے علاوہ پوجے جانے والوں پر ایمان لاتا ہے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اُن کی عبادت کرتا ہے۔ (۸۳۳)

یہاں شروط کی چار تک گنتی شیخ عبدالرحمان بن حسن کی طرف سے ہے۔ بقیہ شروط میں محبت، انقیاد اور قبولیت ہے، پچھلی ساری گفتگو پر بنیاد رکھتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ کلمہ شہادت فقط تلفظ اور بعض شعائر کے قیام کا نام نہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے قول پر کچھ دیر ٹھہریں اور غور وفکر کی کوشش کریں۔ شیخ فرماتے ہیں ''دین کے شرعی مسائل سے ارتداد، اُس کفر سے زیادہ بڑا ہے جو اصلی ہے اور جس میں دخول سرے سے واقع نہیں ہوا'' ہم اس پر کہتے ہیں: یہ وہ بات ہے جس کو یہودی اور صلیبی منصوبہ ساز ذہن نے پہچان لیا جیسا کہ زویمر کی وصیت میں تفصیل گذر چکی ہے۔ عالمی منصوبہ ساز مسلمانوں کو اُن کے مکمل دین سے نکال کر الحادی و مادی مذاہب اختیار کرنے سے مایوس ہو چکے ہیں۔

وہ غور وفکر کے بعد زیادہ خطرناک اور زیادہ خبیث طریق کار کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ایسے نظام گھڑنے لگے جو اللہ تعالیٰ کی شریعت سے ہٹ کر فیصلے بھی کریں، اسلام کا دعویٰ بھی کریں اور عقیدے کے احترام کو بھی ظاہر کریں۔ انھوں نے مسلمان عوام کے احساسات کو قتل کیا۔ اُن کی محبتوں کے خود ضامن بنے اور اُن کے ضمیروں کو سلا دیا۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی شریعت کو ایسے منہدم کیا کہ وہ خود محفوظ و مامون رہے۔ اسی وجہ سے اِن نظاموں کے سرکردہ لوگ صراحت کے ساتھ یہ اظہار نہیں کرتے کہ وہ ملحد یا لادین ہیں۔ البتہ وہ فخر کے ساتھ اِس بات کا اظہار ضرور کرتے ہیں کہ وہ ڈیموکریٹک وغیرہ ہیں۔

انسان مکمل لادین بنے یا بتدریج لادین بنے۔ دونوں کا راستہ اور انجام ایک ہی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کہ لادینیت کی صورتیں ابھی اختتام پذیر نہیں ہوئیں۔ (۸۳۴)

② **سیکولرزم کے حامیوں کا شبہ: شریعت مستقل اور جامد ہے جو زندگی کے نئے حالات وتقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔**

ایک اور شبہ بھی پیش کیا جاتا ہے جو بکثرت دہرائے جانے کی وجہ سے مروج ہو گیا ہے، یہ ہے کہ شریعت جامد ہوتی ہے اور زندگی ارتقا پذیر۔ جامد چیز ارتقا پذیر چیز کے مطالبات کیسے پورے کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون سازی کے لیے دیگر مصادر کی تلاش ضروری ہے جو عصری علم اور انسانی تجربات پر اعتماد کرے اور دین کو افراد کے روحانی دائرے میں محدود کر دے۔ یہ سیکولرزم کی صورت حال ہے۔

اس شبہ کو سب سے پہلے اسلام دشمنوں نے پیش کیا۔ اِس شبہ کو وہ انسان پیش نہیں کر سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی کما حقہ معرفت اور اُس کی قدرت کا صحیح اندازہ رکھتا ہو۔ اللہ تعالیٰ بدیہی طور پر جہالت ونقص کی تہمت سے پاک ہے۔ اس شبہ کے قائلین کے سامنے ہماری پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ اُن کو ایمان کی دعوت دی جائے اور قدرت الٰہی کی پہچان کروائی جائے۔

ہم تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ شبہ کسی دین دار کی طرف سے اٹھتا ہے جو دین میں مضبوطی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُس کے لیے ہم یہ کہیں گے کہ یہ شبہ اُس وقت لاحق ہوتا ہے جب ہم اس کے دو مقدمات تسلیم کر لیں جو یہ ہیں۔

① شریعت مستقل مطلق ہے، اِس معنی میں کہ اِس کے احکام جامد اور محدود ہیں جو عمل کے قابل نہیں اور توسع کو قبول نہیں کرتے۔

② انسانی زندگی ارتقا پذیر ہے، اِس معنی میں کہ اِس میں کوئی چیز مطلق طور پر جامد نہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ یہ دونوں فرضی باتیں خطا پر مبنی ہیں۔ اِس شبہ کا مصدر وہ اثرات ہیں جو یورپ سے درآمد ہوئے۔ یورپ کے ہاں ثابت اور مستقل اُصولوں پر ایمان اٹھ چکا ہے اور مطلق ارتقا پذیری پر ایمان واقع ہو چکا ہے۔ حتی کہ ہر تبدیلی کو ارتقا سمجھا جاتا ہے جیسا کہ اس کی تفصیل پچھلے باب میں گذر چکی ہے۔

اسلامی تصور نہ مطلق استقلال وثبات کا اقرار کرتا ہے اور نہ مطلق ارتقا پذیری پر ایمان لاتا ہے۔ بلکہ وہ زندگی کے جاری سفر کو تسلیم کرتا ہے۔

اسلام کے نزدیک زندگی کی حرکت ایک دائرے کے اندر بند ہے اور ایک ثابت شدہ مرکز ومحور کے اردگرد گھومتی ہے۔ (۸۳۵)۔ اسلام کی یہ خوبی کبھی نہ ہوتی اگر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ ہوتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شریعت انسانی زندگی کے دونوں پہلوؤں ''**ثبات وتغیر پذیری**'' پر حاکم ہے، کوئی بھی چیز اُس سے خارج نہیں ہو سکتی۔

امت کے اسلاف، زندگی کی نت نئی تبدیلیوں اور ارتقا کو مکمل طور پر سمجھتے تھے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے قول کو لے لیں۔ آپ فرماتے ہیں ''لوگ جس قدر فسق و فجور کے نئے راستے نکالیں گے، ہم اسی قدر اُن کے لیے شرعی فیصلے ثابت کر لیں گے''

یہ بات امام شافعی رحمہ اللہ کے طریق کار سے بھی ثابت ہے۔ جب وہ مصر میں منتقل ہوئے تو اپنے عراقی دور کے ڈھیروں فقہی مسائل سے رجوع کر لیا۔ حتی کہ آپ کے دو مستقل مذہب بن گئے: قدیم و جدید۔ ہم اس بات کو ایک اُصولی قاعدے سے بھی واضح کر سکتے ہیں جو بتلاتا ہے کہ فتویٰ، حالات و ظروف کے بدلنے سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

سلف صالحین اس بات کو پہنچاتے تھے حالانکہ اُن کو اس بات کا بھی گہرا علم تھا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (المائدہ:۵/۳)

آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمھارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔

اس آیت کی تفصیل امام ابن القیم رحمہ اللہ کے کلام سے پہلے گزر چکی ہے۔ سلف صالحین کا اس آیت کے مدلول پر بھی مطلق ایمان تھا۔

﴿أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا﴾

(الانعام:۶/۱۱۴)

تو کیا اللہ کے علاوہ کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمھارے پاس بھیج دی ہے، اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کیے گئے ہیں۔

اس حقیقت کا فہم، اُس عظیم قاعدے کے پہلو بہ پہلو تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان کیا۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات:۵۱/۵۶)

میں نے جنات اور انسانوں کو محض اس لیے پیدا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں۔

یہ آیت شریعت اور انسانی زندگی کے دائرے پر محیط ہے۔ شریعت اور انسانی زندگی کا دائرہ فقط تین اجزا پر مشتمل ہے۔

① **شریعت کے وہ مستقل اور غیر متغیر پہلو جو انسان کی حقیقت اور اُس کی ذات سے متعلق ہیں**، چاہے وہ جس زمان و مکان میں پایا جائے۔ انسان کی حقیقت مطلق طور پر تبدیلی کا شکار نہیں ہوتی۔ شریعت اِس حقیقت کے مطابق غیر متغیر مستقل احکام وارد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی تفصیل نقل کی ہے۔

جیسے خالص تعبدی شرائع مثلاً نماز، روزہ، حج، طہارت وغیرہ کے احکام۔۔۔، نکاح، طلاق، عدت،

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خاوندوں کا عورت پر قوام ہونا وغیرہ۔۔۔ بڑے بڑے محرمات جیسے زنا، شراب، چوری، خیانت وغیرہ۔ اِن احکام کو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور ہدایت کے مطابق مفصل بیان کیا گیا۔ اِس قسم کے احکام کو وضع کرنے پر انسان قادر نہیں۔ اگر اِس قسم کے احکام وضع کیے گئے تو انسان گمراہ ہو جائیں گے۔

② **شریعت کے وہ پہلو جن کا جوہر اور ہدف غیر متغیر ہیں** لیکن اُس کی صورتیں اور اسالیب اللہ کی سنت کے مطابق بدلتی رہتی ہیں جیسے نظام حکومت کی فنی نوعیت وطریقہ، امت کا اقتصادی منہج، تعلیمی منصوبہ بندی وغیرہ

ان کے لیے شریعت نے عمومی قواعد وضوابط بنا دیے ہیں جن سے خروج درست نہیں۔

مثلاً نظام حکومت کے لیے ضروری ہے کہ شریعت پر مبنی ہو، شورائی ہو، مصالح کے جلب اور مفاسد کے نفع پر قائم ہو، لوگوں کو عدل وانصاف مہیا کرے، رعایا کو حتی الامکان امن وسلامتی مہیا کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے نظام حکومت کی تفصیلات (بغیر بھول چوک کے) محض رحمت کرنے کے لیے امت کے اجتہاد پر چھوڑ دیں، جیسے بیعت کی شرائط وکیفیت، معزولی، شوریٰ کی حد بندی، ملکی شعبوں کی صف بندی کی کیفیت، عدالت کی تنظیم، مصلحت ومفسدت کی تحدید وغیرہ۔

اسلام کا اقتصادی نظام اِن اصولوں پر قائم ہوتا ہے: مال سارے کا سارا اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور انسانوں کو اِس میں خلیفہ بنایا گیا ہے، ہر فرد کی ضروریات مکمل کرنے کی ذمہ داری ادا کی جائے، لوگوں کا مال کسی بھی باطل طریقے سے کھانا حرام ہے۔ سود اور ٹیکس حرام ہیں، ناجائز ذخیرہ اندوزی اور حرص ولالچ ممنوع ہیں، مال صرف اغنیا کے درمیان ہی نہ گھومتا رہے، جب ضرورت ہو تو مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی جائے اور بسا اوقات وہ لازم بھی ہو جاتا ہے وغیرہ۔

اقتصادی منصوبہ بندی کی تفصیل، سابقہ اصولوں کو پورا کرنے کے طریقے، عمومی وخصوصی اداروں کے مابین مباح تعامل کی کیفیت، پیداوار اور تجارت وغیرہ پر ریاست کی نگرانی وضبط۔ یہ سب کچھ ان اصولوں کے دائرے میں امت کے اجتہاد پر چھوڑ دیے گئے۔

اِسی طرح زندگی کے باقی شعبوں کو قیاس کر لیا جائے۔

یہاں یہ بتلانا ضروری ہے کہ مباح یا واجب اجتہاد ایسی باتوں میں ہوتا ہے جن میں کوئی شرعی نص نہ ہو۔ اور اُس کی چند شرائط ہوتی ہیں۔ جن میں سے دو اہم ہیں۔

ا۔ مجتہد کی اہلیت۔ کسی بھی ذمہ دار یا اہل کار کا یہ حق نہیں کہ وہ حسب خواہش اجتہاد کرے۔

ب۔ اجتہاد کسی شرعی نص یا شرعی قاعدے کے مخالف نہ ہو۔

③ **خالص دینوی امور**۔ ہم اِن سے مراد وہ انسانی سرگرمیاں لیتے ہیں جن کا ہدایت وگمراہی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سرگرمیاں ایسی ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کی حکمت چاہتی ہے کہ انسان از خود کوشش کرے اور معلومات حاصل کرے تاکہ زمین میں اُس کا خلیفہ ہونا اور آباد کار ہونا ثابت ہو سکے۔ مثلاً زمین میں سیر وسیاحت کرنا تاکہ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کائنات کے اسرار اور عناصر کے خواص جان سکے اور انسانی زندگی میں استعمال کر سکے۔ اسی طرح وہ سرگرمیاں اور اعمال جو انسانی تجربے کے ماتحت ہوں اور اُن کا حصول کائنات کے اصول یا طبعی قوانین کے ماتحت ممکن ہو جیسے زراعت، صنعت، آبادکاری اور مادی زندگی کے تمام مظاہر (۸۳۶)

یہ سب سرگرمیاں انسانی جدوجہد کے سپرد ہیں لیکن اِن کا انسانی زندگی کے دائرے میں وقوع پذیر ہونا، انسانی وجود کی بنیادی ذمہ داری ''عبادت'' کے ماتحت ہے۔ کیونکہ انسانی حرکات وسکنات کے جز ہونے کی وجہ سے اِن سرگرمیوں کو فقط اللہ وحدہ کے لیے ہونا چاہیے اور یہ مباحات کے دائرے میں بھی درج ہیں۔ مباح پانچ تعبدی احکام میں سے ایک ہے۔ باقی چار احکام یعنی وجوب، ندب، حرمت، کراہت بھی انسانی سرگرمیوں پر ہی جاری ہوتی ہیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے یا ان کی کوئی کیفیت پیش نظر رکھی جائے۔ مختصراً مباح سرگرمیوں کی مثال ایک ایسے اسلحہ کی ہے جس کو چوکیدار اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور چور اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مومن اُن کو اللہ تعالیٰ کی حدوں کے چوکیدار ہونے کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔

انسانی زندگی کی کوئی سرگرمی ایسی نہیں جو اِن اقسام سے خارج ہو۔ لہٰذا اسلامی زندگی کو خالص اللہ وحدہ لاشریک کے لیے قرار دینے اور اُس کے حکم کے مطابق ڈھالنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہتی۔

② سیکولرزم عبادت الٰہی میں شرک ہے:

جیسے اللہ اکیلا ہے کہ فقط اُسی کی طرف معاملات کو لوٹایا جائے، اسی طرح مخلوق کو بھی فقط اللہ کا ہی عبد ہونا چاہیے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کا ایسا عبد نہیں ہونا چاہیے جس کو ڈھیر سارے شرکا آپس میں کھینچتے ہوں اور مختلف اہداف اُس کو کچلتے ہوں۔

'وحدت' کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خالق کائنات واحد ہے۔ کائنات اپنے اصول وقواعد کے اندر واحد اور منظم ہے۔ انسان اپنے جوہر اور غایت وجود میں واحد ہے۔

کائنات کی ساری عبادت اللہ کی طرف متوجہ ہونے میں یک رخی ہے:

﴿ وَلَهُ أَسْلَمَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ طَوْعاً وَكَرْهاً ﴾

(آل عمران:۸۳/۳)

تمام آسمانوں والے اور سب زمین والے اللہ تعالیٰ ہی کے فرماں بردار ہیں خوشی سے ہوں یا ناخوشی سے۔

اسی طرح صاحب اختیار مخلوق ''انسان'' کو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے یک رخ ہونا چاہیے۔ وگرنہ تصادم، ٹکراؤ اور تباہی واقع ہوگی۔

ا سریڈو وائٹ ہیڈ اور شپنگلر نے مغرب کی ہونے والی تباہی بڑی تفصیل سے بیان کی۔ دونوں نے ایک

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہی نتیجہ نکالا کہ تباہی کی واحد فطرت کے اجزا کو مختلف حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔(۸۳۷) یعنی فطری و غیر فطری امور میں تصادم، روحانی و مادی امور میں تصادم وغیرہ

وجودیت نے انسانی غم والم کو چند جملوں میں اس طرح بیان کیا کہ انسان انا اور جہان کے درمیان منقسم ہو چکا ہے۔ وہ طبعی اور فوق الطبعی امور کے درمیان ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے۔ وہ شعور، احساس اور عقل و منطق کے درمیان بکھر گیا ہے۔

مذکورہ احوال وظروف کے تحت مغربی انسان اور عام لوگ مستقل طور پر ایسے دائروں میں تقسیم ہو گئے جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اِسی وجہ سے حتمی تباہی کا آغاز ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت خاص کے تحت بندوں کو اسلام عطا کیا جو انسانی وجود کے لیے صحیح تصور ہے۔ یہ انسانی وجود کو اُس کے تمام پہلوؤں، سرگرمیوں، ضروریات اور رجحانات سمیت مخاطب کرتا ہے۔ یہ اُس کو ایک ہی سمت اور رخ کی طرف موڑتا ہے۔ ایک ہی سمت کی طرف سارے مطالبات، رجحانات، امیدیں اور خوف جاری ہوتے ہیں۔ انسان ایک ہی ہستی کے غضب سے ڈرتا ہے اور اُس کی رضا بھی تلاش کرتا ہے۔ ایک ہی ہستی جو ہر چیز کی مالک، خالق اور مدبر ہے۔ اِس طرح انسانی وجود ایک مصدر کی طرف لوٹتا ہے جہاں سے وہ اپنے تصورات، مفاہیم، اقدار، میزان، شرائع اور قوانین اخذ کرتا ہے۔ اُس مصدر سے ہر اُس سوال کا جواب حاصل کرتا ہے جو اسے بے چین کرتا ہے۔ یہ ''مصدر'' کائنات، زندگی اور انسان سے متعلق ہر استفہام کا جواب ہے۔

اسی طرح انسانی وجود اپنے شعور، سلوک اور تصورات سمیت عقیدہ و منہج کے تحت مرکوز ہوتا ہے۔ اور اسی طرح وہ ضابطہ زندگی، موت وحیات، محنت و جدوجہد، صحت ورزق اور دنیا و آخرت کے تمام امور میں ایک ہی جگہ مجتمع ہوتا ہے۔ انسانی وجود ٹکڑوں، متفرق رستوں اور گوشوں میں بکھرتا نہیں اور نہ ہی بھول بھلیوں میں گم ہوتا ہے۔(۸۳۸)

اس طرح اُس انحراف کی گہرائی بھی سمجھ آتی ہے جو عقیدہ و شریعت کی تفریق سے پیدا ہوتا ہے اور دنیا و آخرت اور عبادات و معاملات کو الگ کرنے سے جنم لیتا ہے۔ یہ وہ انحراف ہے جو دین اور عبادت کے مفہوم کو آخر حد تک سکیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

جب اِس قسم کا انحراف ایک مستقل فکر کی بنیاد بن جائے، اللہ تعالیٰ کے دین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے، انسانی سرگرمیوں یعنی 'عبادت' کو تقسیم در تقسیم کر دے اور دنیا و آخرت میں جدائی ڈال دے تو خوف ناک تباہی جنم لیتی ہے۔

محمد اسد کے الفاظ میں ''انسان اپنی منزل سے ہٹ جاتا ہے۔ اُس وقت یہ انحراف اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک بن جاتا ہے جس کو اللہ قبول کرتا ہے اور نہ ہی اُس سے راضی ہوتا ہے۔ عین یہی صورت حال سیکولرزم کی ہے۔

عقیدہ و شریعت کی باہمی تفریق کے متعلق ہماری گفتگو کافی ہو گئی۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی شریعت کو لازم نہیں پکڑتا اُس کے لیے اتنا کافی ہے کہ 'عقیدہ و ایمان' شریعت کے التزام کی نفی سے ضائع ہو جاتا ہے۔ دنیا و آخرت کی تفریق کے متعلق گفتگو اسلامی زندگی کے انحراف کے ضمن میں بیان ہو چکی ہے۔ ہمارے خیال میں تھوڑی سی مزید

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

تفصیل بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

اسلامی تصور میں 'دنیا' آخرت کا وسیلہ ہے لیکن دنیا کی حیثیت فقط یہاں تک نہیں بلکہ اُس کی ذاتی قدر و قیمت بھی ہے۔ یہ وہ مکان ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت وغضب، عقوبت ومغفرت، قدرت وارادے کی صفات ظاہر ہوتی ہیں۔ یہاں انسان کی وہ اختیاری عبادت واقع ہوتی ہے جو فقط اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کتابوں کا نزول اور رسولوں کی بعثت ہوئی۔

اسی وجہ سے یہاں انسان کی ہر حرکت اللہ تعالیٰ کے لیے لازم کی گئی۔

﴿قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

(انعام۔۱۶۲/۶)

آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے۔

حتیٰ کہ وہ حرکات بھی جن کو ہم اپنے گمان کے مطابق عبادت سے دور سمجھتے ہیں۔ مثلاً

''انسان کا اپنی بیوی سے لطف اندوز ہونا'' عبادت ہے اور ہر مومن کو اس کا اجر ملتا ہے جیسے نبی ﷺ کا فرمان ہے۔

وَفِي بُضعِ اَحَدِكُم صَدَقَة (صحیح مسلم:۱۰۰۹)

تم میں سے ہر شخص کی شرم گاہ میں بھی صدقہ ہے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا۔

مسلمان کا اختیار کردہ ہر کھیل 'باطل' ہے ما سوائے تیر اندازی، گھوڑے کی تربیت اور بیوی کے ساتھ کھیلنا۔ یہ تینوں کام برحق ہیں۔ (جامع الترمذی:۱۶۳۷)

صنعت کاری جو فرد یا امت مسلمہ کے ذریعے قائم ہوتی ہے، بھی عبادت ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔

﴿وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ فَهَلْ أَنتُمْ شَاكِرُونَ﴾ (انبیاء:۸۰/۲۱)

اور ہم نے اُسے تمھارے لیے لباس بنانے کی کاریگری سکھائی تا کہ لڑائی کے ضرر سے تمھارا بچاؤ ہو۔ کیا تم شکر گزار بنو گے؟

قرآنی سیاق کے مطابق ذوالقرنین کا قصہ صنعتی علم کو انسانی مصلحت میں استعمال کرنے پر زبردست دلیل ہے۔ حدیث شریف میں ہے: ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ساتھ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ ایک اُس کو خیر کی نیت سے بنانے والا، دوسرا تیر چلانے والا اور تیسرا تیر اٹھا کر دینے والا۔

اسی طرح زراعت کا معاملہ ہے۔ ''اگر قیامت قائم ہو جائے اور کسی کے ہاتھ میں پودے کی قلم ہو، تو وہ حتی الامکان اُس کو ضرور گاڑ دے''

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسری حدیث ہے: ''جو مسلمان کوئی پودا لگاتا یا کھیتی اگاتا ہے۔ اور اُس سے کوئی پرندہ، انسان یا چوپایہ دانہ دنکا کھالیتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے صدقہ ہے۔''

مومن کی زندگی کے تمام پہلو اِسی طرح ہیں۔ بعض سلف کا قول ہے۔ ''اللہ کی قسم! میں اپنی نیند میں بھی اسی طرح ثواب کی امید رکھتا ہوں جس طرح قیام اللیل میں''

ہمارے ایک عالم محمد بن عبدالرحمان الوصابی متوفی ۷۸۲ نے محنت وجدوجہد کی فضیلت پر ایک کتاب لکھی۔ اُس کتاب میں ثابت کیا گیا ہے کہ نیت سے مومن کی زندگی کی تمام حرکات وسکنات عبادت بن جاتی ہے۔ اور زراعت، صنعت وتجارت فروض کفایہ میں سے ہیں۔ (۸۳۹)

اِسی حقیقت کی عکاسی ''اخلاص'' کا تصور کرتا ہے۔ **سہل تستری** کہتا ہے۔ ''عقل مند لوگوں نے جب بھی اخلاص کی تفسیر میں غور کیا ہے تو انہیں یہی بات سمجھ آئی کہ انسان کی تمام حرکات وسکنات اور خلوت وجلوت فقط اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور اِس نیت کے ساتھ کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو (۸۴۰)

اِس حقیقت کو اُن لوگوں نے بھی پہچانا جن کو اللہ تعالیٰ نے طویل جدوجہد کے بعد اسلام کی ہدایت عطا کی۔

اُن میں سے ایک ''**محمد اسد**'' کہتا ہے: اسلام میں **عبادت** کا تصور تمام ادیان کے تصورات سے مختلف ہے۔ اسلام میں عبادت صرف ان اعمال میں محدود نہیں جن میں خالص خشوع ہوتا ہے۔ مثلاً نمازیں اور روزے وغیرہ۔ بلکہ عبادت انسان کی عملی زندگی کے تمام پہلوؤں کو گھیرتی ہے۔ ہماری زندگی کا عمومی مقصد اللہ کی عبادت ہے۔ چنانچہ ہم پر لازم ہے کہ ہم زندگی کے تمام مظاہر میں دینی آداب کے پابند ہوں۔ ہم پر واجب ہے کہ ہم اپنے تمام اعمال میں، اگرچہ وہ بظاہر معمولی کیوں نہ ہوں، اِس نیت پر عمل کریں کہ یہ عبادات ہیں (یعنی ہم ان کو مکمل شعور کے ساتھ اللہ کے لیے ادا کریں)۔ یہ عبادت اُس کائنات کا منہج ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ ایک عام انسان کہہ سکتا ہے کہ یہ بہت بلند اور بعید معیار ہے۔ لیکن کیا یہ دین کے مقاصد میں سے نہیں کہ زندگی کو عملی طور پر بلند معیار کے مطابق گزارا جائے؟

اِس معاملے میں اسلام کا موقف تاویل کا احتمال نہیں رکھتا۔ وہ ہمیں پہلے درجے میں یہ بتلاتا ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال ہمیشہ اور مستقل عبادت کی حالت میں ہیں۔ یہی زندگی کی اصل حقیقت ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے کہ ہم اپنے مقصد کو اُس وقت حاصل نہ کرسکیں گے جب ہم اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے لگیں، یعنی روحانی اور مادی زندگی۔ ہم پر لازم ہے کہ اِن دونوں زندگیوں کو اپنے ذہن اور اعمال میں یکجان کر کے رکھیں۔ اللہ تعالیٰ کے ایک ہونے کی سوچ انسانی زندگی میں وحدت پیدا کرتی ہے۔ اِس رجحان کا ایک منطقی نتیجہ، جو اسلام اور دیگر دینی نظاموں کے مابین فرق کو ظاہر کرتا ہے، یہ بھی ہے کہ اسلام فقط ایسی تعلیم نہیں جو زمین اور اُس کے خالق کے درمیان فقط مابعد الطبعی تعلقات کی حد بندی کرتی رہے۔

بلکہ اسلام اِس کے ساتھ ساتھ فرد اور ماحول کے درمیان دینی تعلق پر بھی زور دیتا ہے۔ اسلام دنیوی زندگی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کو محض ایک عام اور معمولی اتفاق نہیں سمجھتا اور نہ ہی اُس کو آخرت پر مبنی ایک رنگین قسم کا خیال سمجھتا ہے جس کے آنے میں تو کوئی شک نہیں لیکن وہ کسی بھی معنی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگ ایک مکمل ایجابی وحدت کی حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ فقط اپنے جوہر میں ہی اکیلے نہیں بلکہ وہ اپنے مقصد میں بھی اکیلے ہیں۔ اسی وجہ سے اُس کی مخلوق بھی اپنے جوہر میں وحدت کی حامل ہونی چاہیے اور مقصد بھی مکمل تاکید کے ساتھ وحدت کا حامل ہو۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت اپنے وسیع معنی و مفہوم میں، جیسے ہم نے ابھی تشریح کی ہے، اسلام کی صورت میں انسانی زندگی کو تشکیل دیتی ہے۔ یہی ادراک ہمیں بتلاتا ہے کہ انسان اپنے انفرادی دنیوی زندگی کے دائرے میں کمال تک پہنچ سکتا ہے۔۔۔(۸۴۱)

انسان جیسے ہم نے پہلے ثابت کیا اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے 'عبد' ہے، چاہے وہ جنگلات کا رہنے والا ہو یا فلک بوس عمارتوں کے شہر میں بسنے والا۔ عبدیت اُس کی ذاتی اور لازمی صفت ہے۔ وہ لازمی طور پر اپنے معبود کے ارادے کے مطابق چلے گا، چاہیے وہ معبود اللہ ہو یا کوئی اور۔ لیکن وہ کسی حال میں اللہ تعالیٰ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ وہ کفر و سرکشی میں جہاں تک نکل جائے لیکن وہ اللہ کے طبعی اصول و قواعد سے خروج نہیں کر سکتا۔ اُس کے سامنے فقط دو ہی راستے ہیں۔

① یا تو وہ اللہ تعالیٰ کے منہج کے مطابق چلے اور اپنے نفس کو کائنات اور نوامیس کی موافقت میں ڈال دے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والے ایک ہی راستے کا راہرو بن جائے۔

② یا وہ اللہ تعالیٰ کا راستہ پسند نہ کرے۔ لیکن یہ بھی خالص غیر اللہ کا راستہ نہیں ہو سکتا کیونکہ اِس صورت میں بھی اُس کے غیر ارادی پہلو لازمی طور پر سنن الٰہی کے پابند رہیں گے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے راستے کے علاوہ کوئی اور راستہ پسند کرتا ہے، وہ اپنی شخصیت میں انتشار، تصادم اور تقسیم کا فیصلہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ فرمائے، الّا یہ کہ وہ اللہ کی کائنات سے بھاگ نکلے اور اللہ تعالیٰ کی ابدی سنتوں کو چیلنج کر دے اور یہ بعید ترین محال ہے۔

قرآن نے اِس حالت کی بلیغ ترین تصویر کھینچی ہے۔

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلاً رَّجُلاً فِيهِ شُرَكَاء مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلاً سَلَماً لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (زمر:۲۹/۳۹)

اللہ تعالیٰ مثال بیان فرما رہا ہے ایک وہ شخص جس میں بہت سے باہم ضد رکھنے والے ساجھی ہیں اور دوسرا وہ شخص جو صرف ایک ہی کا (غلام) ہے، کیا یہ دونوں صفت میں یکساں ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کے لیے سب تعریف ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں کے اکثر لوگ سمجھتے نہیں۔

یہ آیت ہر اُس شخص پر صادق آتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے سے ضابطہ حیات لیتا ہے، اگرچہ وہ اسلام کا دعویٰ کیوں نہ کرے۔ دکتور عماد الدین خلیل کہتے ہیں:

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

''بے شک جو انسان اس قسم کا کمزور اور مسخ شدہ ایمان لاتا ہے۔ جلد ہی وہ اپنے سامنے ایک گہری کھائی محسوس کرتا ہے جو اُس کو دین کے ساتھ صحیح تعلق قائم کرنے اور گھلنے ملنے سے روک دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں اسلام کے بعض بنیادی جواہر و عناصر کو مٹایا ہوا ہے اور اُن کی جگہ پر دیگر جواہر و عناصر قائم کیے ہوئے ہیں۔ جو شخص اس طرح کرے وہ اسلام کی مستقل اور دائمی وحدت سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے گا۔ باطل نظریہ کی چوٹیں اُس کے انسانی وجود اور ذات کی وحدت کو توڑتی رہیں گی۔ آخر کار وہ اپنے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو جائے گا کہ حقیقی عناصر و اقدار کی جگہ پر دیگر عناصر و اقدار کو رکھے۔ جو شخص دین کو ٹکڑوں کی شکل میں قبول کرتا ہے، وہ مختلف عناصر کو ایک جگہ اکٹھا اور مضبوط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مختلف عناصر اپنے مجموعے سمیت اسلامی اقدار اور اسلامی کاملیت کی وحدت پیدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ایک اصیل تصور سے پھوٹے ہوئے نہیں۔ بلکہ یہ عناصر آپس میں بھی متناقض ہوتے ہیں کیونکہ ہر عنصر اور ہر مجموعہ اقدار مخصوص قسم کے تصور فرد سے آیا ہوتا ہے۔ اِن متناقض عناصر سے نفسیاتی و فکری وحدت بکھر کر ضائع ہو جاتی ہے۔ وہ بظاہر ایک مکمل اور وحدت پر مبنی عقیدہ اختیار کرتا ہے لیکن حقیقت میں یہ نقلی وحدت اور جھوٹی کاملیت ہوتی ہے۔ وہ ایسے عناصر کو ایک دوسرے میں گھسیڑنا چاہتا ہے جن کا آپس میں کوئی فطری ربط ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے جہالت و عناد کے سبب اُسے ایک وحدت پر مبنی منہج بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ (۸۴۲)

اِس سے اُس من گھڑت اور دھوکے پر مبنی دعوے کا پتا چلتا ہے جو کہتا ہے کہ اسلام فقط دین عبادت ہے یعنی انسان اور اُس کے رب کے مابین فقط روحانی تعلق۔ اسلام کا انسانی سرگرمیوں کے ساتھ بلحاظ فرد یا مجموعہ کوئی تعلق نہیں۔ یہ دعویٰ اسلام کو اُس کی بنیادوں سے منہدم کر دیتا ہے۔ عبادت اپنی اصل سے لغو ہو جاتی ہے۔ یہ دعویٰ احسان کرتا ہے کہ اُس نے انسانی سرگرمیوں کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کو عطا کیا ہوا ہے۔ حالانکہ انسانی وجود اور سرگرمی اصل میں ٹکڑوں میں بٹنے کے قابل ہی نہیں۔ وہ لوگ روحانی اُمور کے مقابلے میں مادے کو شیطان کے سپرد کرتے ہیں۔ روحانی سرگرمیوں کے مختصر اوقات کے مقابلے میں ساری زندگی شیطان کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ایک حدیث قدسی کے تحت اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَنَا اَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا اَشْرَكَ فِيهِ مَعِيَ غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ﴾ (صحیح مسلم:۲۹۸۵)

میں تمام شرکا کی بہ نسبت شرک سے سب سے زیادہ بے پرواہ ہوں، جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس میں وہ میرے ساتھ دوسرے کو شریک کرے تو میں اُسے اور اُس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔

یہ من گھڑت ٹیڑھی تقسیم اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہیں دیتی۔ اللہ تعریفوں والا پاک ہے۔ لیکن وہ اپنے نفوس اور انسانیت کو بے پناہ خسارے اور خوف ناک انجام سے دوچار کرتے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سیکولرزم کے بعض دعوے دار، جو اگرچہ غیر مسلم ہیں لیکن نام نہاد مسلمان اُن کی باتوں پر ایمان لاتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی شکوک وشبہات میں مبتلا کرتے ہیں، کہتے ہیں:

''اگر یہ روحانی فقیہ (مراد دین کے علم بردار) یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی زندگی کے پیچھے ایک نہ نظر آنے والی قوت ہے جو پوری زندگی کی مصدر ہے۔ زمان ومکان اُس کو محدود نہیں کر سکتے۔ یہ قوت انسان میں محبت، نیکی اور خیر کا الہام کرتی ہے۔۔۔۔

دوسرے لفظوں میں اگر روحانیت انسان اور اللہ تعالیٰ کے مابین تعلق سے تجاوز نہ کرے، انسان کے دنیوی معاملات میں مداخلت نہ کرے اور اپنے معاملات کو موت کے بعد والے امور پر محدود رکھے پھر بھی کسی شخص کے لیے مناسب نہیں کہ وہ مذہبی انسان نہ ہونے کے باوجود اِس قسم کی روحانیت کو برداشت کرے کیونکہ یہ فکری جمود، پس ماندگی اور جہالت سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ روحانی فقہا فقط انہی باتوں پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی فقاہت میں توسع اختیار کرتے ہیں۔ وہ دنیا کے ہر معاملے میں روحانیت کو داخل کرنا چاہتے ہیں حتیٰ کہ انسانی عقل کو بھی بیڑیوں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ وہ روحانیت کی خوشخبریاں سنا کر آزادی سے روکتے ہیں۔ وہ کسی بحث، مناقشہ اور معرفت کے دروازے کو کھلا نہیں چھوڑنا چاہتے۔ بعض لوگ اِس بھی آگے چلے جاتے ہیں۔ وہ مستقل شرعی ضابطے بناتے ہیں تاکہ لوگ اپنی انفرادی، عائلی، معاشی اور اجتماعی زندگی میں اُن کے پابند ہو سکیں۔ یہ لوگ دوسروں کو وہم دلاتے ہیں کہ یہ شرعی ضابطے اللہ کی طرف سے وحی شدہ ہیں۔ جو اِن شرعی ضابطوں کے لیے سر جھکائے گا اُس کے لیے ابدی سعادت ہے۔ جو اِن کا کفر یا اعتراض کرے وہ دنیا میں عذاب کا مستحق اور آخرت میں جہنم کا مستحق ہوگا۔ (۸۴۳)

کیا یہ وہی بات نہیں جس کو سیکولرزم کے علم بردار پسند کرتے ہیں اور اُن کا نعرہ ہے۔ **دین اللہ کا اور وطن سب کا۔ سیاست میں کوئی دین نہیں اور دین میں کوئی سیاست نہیں**۔ اور یہ لوگ اسلام کے دعوے دار بھی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو شیطانی میڈیا کے ذریعے سے روحانی دینی پروگرام بھی نشر کرتے ہیں اور جاہلی حکومتی قوانین کے ضمن میں شخصی قوانین بھی جاری کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ دین کی جگہ فقط مسجد ہے پھر زندگی میں ایک مرتبہ بیت اللہ کا حج بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مشرق ومغرب میں اللہ کے دشمنوں کے ہاں آنا جانا بھی لگائے رکھتے ہیں۔ یہ لوگ لادین پروگراموں اور غیر شرعی قوانین کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

اِن اقوال اور دعویٰ جات کی کیا حقیقت ہے؟ یورپ کی تکلیف دہ صورت حال ہم نے آپ کے سامنے رکھی جو زندگی کے ہر میدان میں اُن کے بلند بانگ دعووں کو جھٹلا رہی ہیں۔ یورپ نے ہم سے پہلے اپنے فکر وعمل میں سیکولرزم کو اختیار کیا۔ انھوں نے تباہی اور محرومی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا۔ ہم اُن کے تجربے سے نصیحت اور فائدہ حاصل کیوں نہیں کرتے؟ کیا مسلمانوں کو یہ لائق نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں کہ اللہ نے شرک کو حرام اور باطل قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شریعت عطا کر کے رحمت کی جس کی وجہ سے انسانی شخصیت بکھرنے اور

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضائع ہونے سے محفوظ رہتی ہے۔

ہم اسلام کے دعوے دار، سیکولرزم کے حامیوں سے سوال کرتے ہیں: بفرض محال انسانی زندگی کی سرگرمیوں میں سے کوئی جز مثلاً سیاست کو دین کے دائرے سے نکال دیا جائے تو پھر ہم اس کا منہج، اقدار اور پیمانے کہاں سے حاصل کریں گے؟

جواب جو بھی ہو لیکن اُس کا خلاصہ بلاشک وشبہ ایک ہی ہوگا کہ غیر اللہ سے حاصل کریں گے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم تاریخی ادوار سے حاصل شدہ انسانی تجربات سے فائدہ اٹھائیں گے یا ذاتی اجتہاد اور مخصوص افکار سے استفادہ کریں گے یا دور حاضر کے احوال وظروف کی روشنی میں لائحہ عمل بنائیں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے۔ اہم بات یہ ہے کہ منطقی نتیجہ ایک ہی ہوگا یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا۔ کیا شرک کے اعتراف کی اس سے زیادہ صریح صورت ہوسکتی ہے۔ یعنی اطاعت واتباع کا شرک۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شرک ہے اگرچہ جو لوگ اِس کو سرانجام دے رہے ہیں، وہ عبادت کے حقیقی معنی ومفہوم سے جاہل ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ حضرت عدی بن حاتمؓ بھی جاہلیت میں یہ تصور نہ کرسکتے تھے کہ اطاعت واتباع بھی عبادت کی ایک قسم ہے۔ حدیث شریف میں اُن کا واقعہ تفصیل سے آتا ہے۔

''جب وہ نبی ﷺ کے پاس آئے تو آپ نے یہ آیت تلاوت کی

﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ﴾ (التوبہ:۹/۳۱)

ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنایا ہے۔

حضرت عدیؓ سابق نصرانی تھے، کہنے لگے: یارسول اللہ۔ ہم تو احبار ورہبان کی عبادت نہیں کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا ایسا نہ تھا کہ وہ تمھارے لیے ایسی چیزیں حلال کرتے جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا، تو تم بھی اُن کو حلال مان لیتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام قرار دیتے تھے اور تم اُن کی بات مان لیتے تھے۔

حضرت عدیؓ نے کہا: جی ہاں۔ نبی ﷺ فرمایا: یہی تو ان کی عبادت ہے۔

شیخ الاسلام اِس کی تشریح میں فرماتے ہیں: اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اِس کو شرک قرار دیا حالانکہ وہ علما اور درویشوں کے سامنے نمازیں اور سجدے نہ بجالاتے تھے۔ (۸۴۴)

انسان پر سیکولرزم کے برے اثرات:

سیکولرزم کے شرک کا نتیجہ فقط جہنم میں ابدی دخول نہیں بلکہ اس کے حاملین دنیا میں بھی محرومی، قلق اور انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ ہم اِس کی متعدد مثالیں بیان کرچکے ہیں۔ کچھ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ سیکولرزم کے انسان پر کیسے برے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ جو شخص سیکولرزم جیسے شرکیہ اصول کے تحت زندگی گذارتا ہے، وہ کیسا ہوتا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دکتور عماد الدین خلیل کہتے ہیں: سیکولر معاشرے کے سائے میں پروان چڑھنے والی انسانی شخصیت اپنے متفرق اہداف کی وجہ سے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ روح اور مادے کی ثنویت تراشنے کی وجہ سے اُس کی شخصیت دُہری ہو جاتی ہے۔ سیکولر فکر حسی اور وجدانی تجربات کے درمیان دیواریں کھڑی کرتی ہے۔ حاضر اور غائب جہانوں کے درمیان فصیل قائم کرتی ہے۔ قابل دید قریب چیز اور نا قابل دید بعید چیز کو دور کر دیتی ہے۔ اس طرح جو انسان تیار ہوگا وہ کائنات، جہان اور زندگی پر پھیلے ہوئے گنجلک اور پیچیدہ تعلقات سے موافقت پیدا نہیں کر سکتا۔ بلکہ وہ تمام تعلقات کو جبر و عناد کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کرے گا، اُن کو کاٹے گا اور مسخ کرے گا۔ کائنات، انسان اور زندگی کی طاقتوں کے درمیان خوبصورت تعلقات کا جال، سیکولر انسان کی نظر میں بے کار، بے سود اور الگ تھلگ ہو جائے گا۔ دین علم سے متناقض نظر آئے گا۔ عقلی فلسفہ، حسی طبعی کائنات کے ساتھ جڑنے سے انکار کر دے گا۔ طبعی سائنسی مکتب فکر، انسانی اخلاقی اقدار کو ساتھ لے کر نہ چلیں گے۔

اسی طرح دیگر تناقضات برپا ہونگے۔

اس قسم کے گوناگوں تصادم کے برے اثرات فقط خارجی دنیا پر محدود نہیں ہوتے بلکہ انسانی وجود کی گہرائیوں اور تجربات پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ ہر قدر، طاقت اور سرگرمی کا کوئی نہ کوئی ہدف ہوتا ہے۔ جب ہدف بکھرے ہوئے ہوں اور اُن کے درمیان کوئی رابطہ تعلق نہ ہو تو پھر سیکولرزم جنم لیتا ہے جس سے منقسم شخصیت اور دُہری نوعیت کے افراد تیار ہوتے ہیں۔ سیکولرزم زندگی کی سرگرمیوں کو مختلف میدانوں اور ٹکڑوں میں بانٹ بیٹھتا ہے۔ ہر سرگرمی کا ہدف اُس کا خاص میدان ہوتا ہے۔ جو دیگر سرگرمیوں اور میدانوں سے الگ ہوتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے تناقضات سمجھتا ہے اور سرگرمیاں سرانجام دیتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی ذات بکھر کر رہ جاتی ہے۔ وہ یکسو ہونے کے بجائے دُہری ہو جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور میرے جیسے دیگر لوگ بھی جانتے ہیں کہ روح اور جسم میں تفریق ڈالنا بہت بڑی غلطی ہے۔ میں ایک ایسی زندگی کا خواب دیکھتا ہوں جس میں انسان روح و جسم سمیت اپنی ذات کو مکمل کرتا ہے۔ اور اُس کے اندر روح اور حواس ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوتے۔ انسان اپنی ذات اور اپنے ہدف میں وحدت پیدا کرتا ہے۔'' (۸۴۵)

مذکورہ عالم نے ایک تکلیف دہ حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ ہمارا ہدف و منزل ایک نہیں جس پر محنت کی جائے۔ اسی وجہ سے زندگی بکھر کر رہ گئی ہے۔ وہ کسی رابطے اور ہدف کے تحت نہیں رہی۔ وہ محراب میں داخل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتی ہے لیکن کائنات کو لعنت کرتی ہے۔ اور پھر فیکٹری جا کر آدمیت کے سامنے جھکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا کفر کرتی ہے۔ پھر عقل کے پیچھے بھاگتی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کے لیے کوئی لائحہ عمل تشکیل دے۔

اسی دوران میں وہ دین سے بھی امیدیں لگاتی ہے کہ وہ انفرادی زندگی میں اطمینان بھر دے۔ اُس کی ایک دنیا شمال میں بھاگی جا رہی ہے دوسری جنوب کی طرف بھاگ رہی ہے۔ اگر وہ دنیا کا ارادہ کرے تو آخرت ہاتھ سے جاتی ہے اور اُس کا ابدی گھر ضائع ہوتا ہے۔ اگر وہ آخرت کا ارادہ کریں تو دنیا دور ہو جاتی ہے اور اُس کی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی کا قریبی ہدف ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر وہ درمیان میں کھڑا رہ جائے اور پسند کرے کہ اپنے سارے ہدف حاصل کر لے اور اُس کی روح جسم، عقل، معبود، مسجد، کارخانہ سب متحد ہو جائیں تو اُس کی شخصیت ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اُس کے دل و دماغ میں یہ عقیدہ بھرا ہوا ہے کہ اللہ کا ارادہ انسان کے ارادے کے بالکل الٹ چلتا ہے۔ انسانی زندگی معنویت سے خالی نہیں رہ سکتی بلکہ یہ شعور، فکر و عمل کا ایک تسلسل ہوتا ہے۔ جب انسان ایک لگاتار کوشش میں زندگی گذارتا ہے اور کئی اہداف کو تشکیل دے کر جدوجہد کرتا ہے تو وہ تناقض و تصادم میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اُس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی وحدت کی ساری کوشش رائیگاں چلی گئی۔ وہ اپنے ہدف سے بری طرح محروم ہو گیا۔ اس کی وہ اقدار ٹوٹ پھوٹ گئیں جو کائنات، زندگی اور دنیا و جہان میں جاری و ساری تھیں۔ وہ اپنی محرومی کی چوٹی پر پہنچ کر یہ کہے گا: مجھے اِس انجام سے نجات دلاؤ، میں اِس انجام سے دور بھاگنا چاہتا ہوں۔ (۸۴۶)

اصل مسئلہ ذات، ارادہ اور ہدف کو یکسو کرنے کا ہے۔ جسے شرعی اصلاح میں ''عبادت کی توحید'' کا مسئلہ کہتے ہیں۔ ایک امریکی مصنف جو نفسیاتی معالج کے طور پر کام کرتا تھا، بے چارا اپنے پیشے کی مناسبت سے مریضوں کو قلق و اضطراب سے چھٹکارا دلانے کے بہترین اصول لکھنے لگا لیکن آخری فصل میں وہ اپنے مریضوں کو بھول گیا اور اپنے نفسیاتی مسائل میں مشغول ہو گیا کہ وہ خود ایک مریض ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ وہ خود کہتا تھا کہ میں صحیح ایمان کا مالک نہیں۔ وہ اپنی مدد کے لیے چلاتا تھا کہ کاش کوئی دین ہوتا جو میری زندگی کو منظم کرتا (۸۴۷)

لیکن دین کونسا؟ کیا تحریف شدہ عیسائیت؟ ہرگز نہیں۔

وہ سمجھتا تھا کہ اُس کا ایمان ناقص اور مسخ شدہ ہے۔ وہ کہتا تھا: مذہبی راہنماؤں سے میرا یہ جھگڑا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں زیادہ باتیں بتلاتے ہیں بلکہ میرا جھگڑا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بہت کم معمولی باتیں بتلاتے ہیں اور میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے بارے میں ہر بات جاننا چاہتا تھا۔ میں ایک حریص بچے کی طرح ہوں جس کو کرسمس کی عید پر پانچ سات کھلونے مل جائیں لیکن اُسے پھر بھی افسوس ہو کہ وہ کھلونوں کی دوکان سے سارے کھلونے حاصل نہیں کر سکا (۸۴۸)

اسی وجہ سے وہ جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف کرتا ہے:

''مغربی دنیا مشرق وسطی کے عظیم ادیان کو قبول نہ کر سکی۔ وہ ابھی تک اپنے تاریک دور سے باہر نہیں نکلی۔'' (۸۴۹)

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ آدمی طبیب ہے، لوگوں کا علاج کرتا ہے اور خود مریض ہے۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مغرب کے سرگرداں لوگ تو اپنی زندگی کو نظم و ضبط میں ڈھالنے کے لیے دین تلاش کر رہے ہیں، جبکہ وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے مشرق کے اندر دین کا عظیم تحفہ دیا ہوا ہے، کہتے پھر رہے ہیں کہ دین کا زندگی کے اجتماعی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنی زندگی کو پریشان فکر اہل مغرب کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فلسفوں اور تناقضات سے بھر دیں۔

ہم اس کی وضاحت میں ایک اور گواہی لانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ڈھیر سارے خدا ایک انسان میں جھگڑا کیسے کرتے ہیں، ایک مضبوط زمین جس پر کھڑا ہوا جا سکے چھین لیتے ہیں اور اُس کو ایسے صدمات سے دوچار کرتے ہیں جن سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں۔

سموئیل کہتا ہے:

''جب ہم سرمایہ دارانہ اخلاق پر عمومی گفتگو کرتے ہیں تو یہ علاقائی اخلاقیات کا مجموعہ نظر آتا ہے جس کو ایک مخصوص جنس اختیار کرتی ہے۔ معاشرہ ان اخلاقیات کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اپناتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود ڈھیروں رکاوٹیں ہوتی ہیں جو معاشرے کی حرکت میں روڑے اٹکاتی ہیں۔ کوئی ایسا عمومی اخلاق نہیں ہوتا جس کی پابندی پر دو متصادم طبقے راضی ہوں۔ اور کوئی ایسی قدر نہیں ہوتی جس سے نکلے ہوئے قانون پر کمزور فریق کو راضی کیا جا سکے۔

ہم بطور مثال مزدوروں اور کارخانے داروں کے باہمی تنازعات کو لیتے ہیں جو کسی قانونی ادارے سے اپنا مسئلہ حل کرانے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ جب دونوں گروہوں کے نمائندے آمنے سامنے بیٹھتے ہیں تو بہت جلد پتا چل جاتا ہے کہ مسئلے کا حل اخلاقی بنیادوں پر موجود نہیں۔ کیونکہ دونوں گروہوں اور فیصلہ کرنے والے کے درمیان مشترک اخلاقی معیار نہیں۔ مزدوروں کی اخلاقیات اپنے حق کو مزدوروں کی فکر پر قائم کرتی ہے اور فیصلہ کرنے والوں کی اخلاقیات شہری قانون کی تفسیر کو راجح قرار دیتی ہے یا انسان کے مثالی حقوق کے فلسفے کو راجح سمجھتی ہے۔ کوئی ایسا مشترک اخلاق نہیں جو مرجع بن سکے۔ تقاضا کرنے والے اور فیصلہ کرنے والے دونوں گروہ یہ طاقت نہیں رکھتے کہ وہ ایک دوسرے کو حقوق کی سیاست سے بلند ہو کر کسی قاعدے کلیے پر راضی کر سکیں۔ (۸۵۰)

آپ کا کیا خیال ہے، جو معاشرہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ٹھکرا دے اور ہدایت کے سفر کو رد کر دے، کیا اُس کے پاس ''حقوق'' سے بڑھ کر کوئی قاعدہ کلیہ ہو سکتا ہے۔ یہاں ہر معبود کے حریف ہیں جن کے اپنے اپنے قاعدے اور راستے ہیں۔ ان متفرق قواعد اور راستوں کو اکٹھا کرنا کسی طرح ممکن نہیں، الّا یہ کہ ہم تمام معبودان باطلہ سے نجات حاصل کریں اور اللہ وحدہ لاشریک کے لیے مطیع و فرماں بردار ہو جائیں۔

دنیا میں پھیلے ہوئے ڈھیروں ارباب، معبودان باطلہ اور طواغیت جن کے نعرے اور صورتیں باہم متضاد ہیں، موحد مومن ان سب کے درمیان ایک واضح اور روشن راستے پر مضبوط قدموں کے ساتھ چلتا ہے۔ اُس کے قدم لڑکھڑاتے ہیں اور نہ ڈگمگاتے ہیں۔ وہ اس اعتماد اور یقین سے بھرا ہوتا ہے کہ سیدھے راستے کے علاوہ کسی بھی دوسرے راستے پر چلنا تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

﴿قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ أَيُّهَا الْجَاهِلُونَ ○ وَلَقَدْ أُوحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الْخَاسِرِيْنَ○بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُن مِّنْ الشَّاكِرِيْنَ﴾(الزمر:۳۹/۶۴۔۶۶)

آپ کہہ دیجیے اے جاہلو! کیا تم مجھ سے اللہ کے سوا اوروں کی عبادت کا کہتے ہو۔ یقیناً تیری طرف بھی اور تجھ سے پہلے (کے تمام نبیوں) کی طرف بھی وحی کی گئی ہے کہ اگر تو نے شرک کیا تو بلاشبہ تیرا عمل ضائع ہو جائے گا اور بالیقین تو زیاں کاروں میں سے ہو جائے گا۔ بلکہ فقط اللہ کی عبادت کر و اور شکر گزاروں میں سے بن جاؤ۔

تمت بالخیر۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ①

اہم فلاسفہ کی تاریخ پر ایک نظر

قدیم فلاسفہ

(ا) کلاسیکل فلاسفہ

سقراط۔Socrates۔(۴۷۰تا۳۹۹ق م)

افلاطون۔Plato۔(۴۲۷تا۳۴۷ق م)۔مثالی فلسفے کا قائل۔فلاسفہ کے زیر حکومت معاشرہ کا قائل

ارسطو۔Aristotle۔(۳۸۴تا۳۲۲ق م)۔فلسفے کے ہر شعبہ پر فکری کام

(ب) ہیلی نستک فلاسفہ (سکندر اعظم کی وفات سے آگسٹس کے عہد تک)۔Hellenistic۔

اپی کیورس۔Epicurus۔(۳۴۱تا۲۷۰ق م)۔مادی جوہریت کا قائل، لذت پسند

زینو۔Zeno۔رواقیت (Stoicism) کا بانی

(ج) رومی دور۔

فلاطینوس۔Plotinus۔(۲۰۵۔۲۷۰)۔نوافلاطونیت کا بانی،

آگسٹائن۔Augustine۔(۳۵۴۔۴۳۰)۔پیدائشی گناہ کا قائل، چرچ فادر

عہد وسطی کے فلاسفہ

الکندی۔Al-kindi۔(۸۰۱تا۸۷۳) مسلم فلسفی۔نوافلاطونیت سے متاثر

الفارابی۔Al-farabi۔(۸۷۰تا۹۵۰) مسلم فلسفی۔نوافلاطونیت سے متاثر

الرازی۔Al-razi۔(۸۶۵تا۹۲۵) مسلم فلسفی۔عقلیت

ابن سینا۔Ibn sina۔(۹۸۰تا۱۰۳۷) مسلم فلسفی۔

الغزالی۔Al-ghazali۔(۱۰۵۸تا۱۱۱۱) مسلم فلسفی۔صوفی

پیٹر ابیلارڈ۔Peter Abelard۔(۱۰۷۹تا۱۱۴۲) عیسائی متکلم

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ابن رشد۔Averroes۔(۱۱۲۶تا۱۱۹۸)مسلم فلسفی
راجر بیکن۔Roger Bacon۔(۱۲۱۴تا۱۲۹۴) تجربیت پسند، ریاضی دان
تھامس ایکویناس۔Thomas Aquinas۔(۱۲۲۱تا۱۲۷۴)عیسائی فلسفی

جدید فلاسفہ

(ا) ابتدائی جدید۔۱۵۰۰تا۱۶۵۰

نکولومیکیاولی۔Niccolo Machiavelli۔(۱۴۶۹تا۱۵۲۷)سیاسی حقیقیت پسند
سر تھامس مور۔Sir Thomas More۔(۱۴۷۸تا۱۵۳۵)ہیومنسٹ۔یوٹوپیا کا مصنف
مارٹن لوتھر۔Martin Luther۔(۱۴۸۳تا۱۵۴۶)عیسائی عالم دین
جردانو برونو۔Giordano Bruno۔(۱۵۴۸تا۱۶۰۰)سورج کی مرکزیت کا حامی
جان کالون۔John Calvin۔(۱۵۰۹تا۱۵۶۴)عیسائی عالم دین
گلیلیو گلیلی۔Galileo Galilei۔(۱۵۶۱تا۱۶۲۶)سورج کی مرکزیت کا قائل
رینے ڈیکارٹ۔Rene Descartes۔(۱۵۹۶تا۱۶۵۰)سورج کی مرکزیت، دوئیت، عقلیت

(ب) ۱۶۵۰تا۱۸۰۰

تھامس ہوبز۔Thomas Hobbes۔(۱۵۸۸تا۱۶۷۹)سیاسی حقیقیت پسند
بلیز پاسکل۔Blaise Pascal۔(۱۶۲۳تا۱۶۶۲)طبیعیات دان، سائنسدان
باروخ سپائی نوزا۔Baruch Spinoza۔(۱۶۳۲تا۱۶۷۷)
آئزک نیوٹن۔Isaac Newton۔(۱۶۴۳تا۱۷۲۷)
جان لاک۔John Locke۔(۱۶۳۲تا۱۷۰۴) تجربیت پسند، سیاسی مفکر
جارج برکلے۔George Berkeley۔(۱۶۸۵تا۱۷۵۳)تصوریت پسند، تجربیت پسند
ڈیوڈ ہیوم۔David Hume۔(۱۷۱۱تا۱۷۷۶) تجربیت پسند، متشکک
والٹیر۔Voltaire۔(۱۶۹۴تا۱۷۷۸)
روسو۔Jean-Jacgues Rousseau۔(۱۷۱۲تا۱۷۷۸)معاہدہ عمرانی، سیاسی مفکر
آدم سمتھ۔Adam Smith۔(۱۷۲۳تا۱۷۹۰)معاشی مفکر، سکاٹس تنویر کارکن
عمانویل کانٹ۔Immanuel Kant۔(۱۷۲۴تا۱۸۰۴) آنٹالوجی کو رد کرنے والا،
جرمی بینتھم۔Jeremy Bentham۔(۱۷۴۸تا۱۸۳۲)افادیت پسند، لذت پسند

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(ج) انیسویں صدی (۱۸۰۰تا۱۹۰۰)

تھامس رابرٹ مالتھس۔Thomas Robert Malthus۔(۱۷۶۶تا۱۸۳۴)

ہیگل۔Hegel۔(۱۷۷۰تا۱۸۳۱)جرمن تصوریت پسند

آگسٹ کامتے۔Auguste Comte۔(۱۷۹۸تا۱۸۵۷)معاشرتی مفکر،اثباتیت پسند

لڈوگ فیرو باخ۔Ludwig Feuerbach۔(۱۸۰۴تا۱۸۷۲)

جان اسٹورٹ مل۔John Stuart Mill۔(۱۸۰۶تا۱۸۷۳)افادیت پسند

چارلس ڈارون۔Charles Darwin۔(۱۸۰۹تا۱۸۸۲)

سورن کیرکیگارڈ۔Soren Kierkegaard۔(۱۸۱۳تا۱۸۵۵)وجودیت کا بانی

کارل مارکس۔Karl Marx۔(۱۸۱۸تا۱۸۸۳)تاریخی مادیت

فریڈرک اینجلز۔Friedrich Angels۔(۱۸۲۰تا۱۸۹۵)جدلیاتی مادیت،مساوات کا حامی

ہربرٹ سپنسر۔Herbert Spencer۔(۱۸۲۰تا۱۹۰۳)لبرٹیرین ازم،معاشرتی ڈاروزم

فریڈرک نطشے۔Friedrich Nietzsche۔(۱۸۴۴تا۱۹۰۰)نیچرلسٹک فلسفی،وجودیت پر اثر

ایملی دورخائم۔Emile Durkheim۔(۱۸۴۸تا۱۹۱۷)معاشرتی مفکر

سگمنڈ فرائڈ۔Sigmund Freud۔(۱۸۵۶تا۱۹۱۷)ذہن کے نفسیاتی تحرک کا فلسفہ

میکس ویبر۔Max weber۔(۱۸۶۴تا۱۹۲۰)معاشرتی مفکر

ہنری برگساں۔Henry Bergson۔(۱۸۵۹تا۱۹۴۱)

جان ڈیوی۔John Dewey۔(۱۸۵۹تا۱۹۵۲)پریگماٹزم

ایڈمنڈ ہسرل۔Edmund Husserl۔(۱۸۵۹تا۱۹۳۸)مظہریت کا بانی

فرڈیننڈ ڈی سوشیور۔Ferdinand De Saussure۔(۱۸۵۷تا۱۹۱۳)لسانی سٹرکچلسٹ

(د) بیسویں صدی (۱۹۰۰تا۲۰۰۰)

برٹرینڈ رسل۔Bertrand Russel۔(۱۸۷۲تا۱۹۷۰)تجزیاتی فلسفی،دہریہ،

کارل بارتھ۔Karl Barth۔(۱۸۸۶تا۱۹۶۸)

مارٹن ہائیڈیگر۔Martin Heidegger۔(۱۸۸۹تا۱۹۷۶)مظہریت

جان پال سارتر۔Jean-Paul sartre۔(۱۹۰۵تا۱۹۸۰)انسان پرست،وجودیت کا قائل

کارل جاسپر۔Karl Jasper۔(۱۹۰۵تا۱۹۸۲)وجودیت کا قائل

تھوڈور ایڈورنو۔Theodor Adorno۔(۱۹۰۳تا۱۹۶۹)فرینکفرٹ مکتب فکر

جان رالز۔John Rawls۔(۱۹۲۱تا۲۰۰۲)لبرل

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

گلز ڈیلیوز۔Gilles Deleuse۔(۱۹۲۵تا۱۹۹۵)پوسٹ سٹرکچلرزم

میشل فوکو۔Michel Foucalt۔(۱۹۲۶تا۱۹۸۴)سٹرکچلرزم، پوسٹ سٹرکچلرزم، پوسٹ ماڈرنزم، کوئیر تھیوری

جرگن ہیبر ماس۔Jurgen Hebarmas۔(پ۱۹۲۹)

جیکوئس ڈریڈا۔Jacques Derrida۔(۱۹۳۰تا۲۰۰۴)ڈی کنسٹرکشن

رچرڈ رورٹی۔Richard Rorty۔(۱۹۳۰تا۲۰۰۷)پریگماٹزم، پوسٹ اینالٹک فلاسفی

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ②

یورپ کی فکری تاریخ کے اہم ادوار

ہیلنستی دور (۳۲۳ ق م تا ۱۰۰ ق م تقریباً)

قدیم یونانی دور جو اسکندر اعظم (۳۲۳ ق م) سے شروع ہوا اور دو سو سال تک یونان میں جاری رہا۔ یہ اصطلاح یونان کی روایتی قدیم تہذیب سے امتیاز کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

رومی دور (۲۷ ق م تا ۴۰۰ تقریباً)

اس دور کی ابتدا ۲۷ ق م سے ہوئی اور بتدریج پانچویں صدی عیسوی تک اختتام ہوا۔

قرونِ وسطیٰ کا یورپ (۴۰۰ تا ۱۵۰۰ تقریباً)

قدیم اور جدید ادوار کے درمیان مغربی یورپ کا تاریخی دور۔ یہ رومی ایمپائر کے سقوط کے بعد پانچویں چھٹی صدی سے ۱۶ ویں صدی تک پھیلا ہوا ہے۔ کبھی کبھار غلطی سے پورے قرونِ وسطیٰ کو قرونِ مظلمہ کہا جاتا ہے۔ یورپ کے اس دور میں رہبانیت عام ہوئی اور جاگیرداری کا نظام رائج ہوا۔

قرونِ مظلمہ (۴۰۰ تا ۹۰۰ تقریباً)

یورپی فکر و فلسفہ کی ایک خاص اصطلاح۔ یورپی قرونِ وسطیٰ کا خاص دور جس میں یورپ کے قدیم یونانی و رومی علوم و فنون معدوم ہو چکے تھے اور علم و معرفت کے اعتبار سے تاریکی تھی۔ یورپ انتہا درجے کے تہذیبی انحطاط کا شکار تھا۔ یہ دور ۵ ویں صدی سے ۱۰ ویں صدی تک ہے۔ یہ دور اسلامی تہذیب کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ ۶۳۲ء میں نبی اکرم ﷺ فوت ہوئے، ۶۶۱ء تک خلفائے راشدین کا زمانہ ہے اور ۷۵۰ء میں اموی خلافت ختم ہوئی۔ ۱۰۹۵ء میں پہلی صلیبی جنگ شروع ہوئی اور نویں صلیبی جنگ ۱۲۷۲ء میں ختم ہوئی۔

تحریک احیائے علوم (Renaissance۔ ۱۳۰۰ تا ۱۶۰۰ تقریباً)

یورپ کی ایک بڑی تہذیبی تحریک جو ۱۴ ویں صدی کے آغاز میں اٹلی میں شروع ہوئی اور پھر پورے یورپ میں پھیل گئی۔ ۱۷ ویں صدی میں بتدریج ختم ہوئی۔ اس دور میں قدیم یونانی و رومی فلسفہ، ادب اور فن کا احیا ہوا۔ اس دور میں جاگیرداری نظام کا زوال اور سرمایہ داری نظام کی ابتدا ہوئی اور اہم سائنسی دریافتوں کی بنیاد پر مادیت پسند نقطہ نگاہ کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی دور میں سودی بنکنگ کا آغاز ہوا، اس سے پہلے سود کی ممانعت تھی۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۵۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک یورپ بھر میں مرکنٹائل ازم نافذ ہوا اور یورپی تجارت عالم گیر سطح پر ہوئی۔ اس دور کا اہم واقعہ سقوط قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء) تھا۔ اسی دور میں واسکوڈی گاما (۱۵۲۴ء) اور کولمبس (۱۵۰۶ء) نے نئے علاقے (براعظم امریکہ) دریافت کیے۔ چھاپہ خانہ (۱۴۵۰ء) کی ایجاد ہوئی اور بارود کا استعمال شروع ہوا۔

صلیبی جنگیں (Crusades)

یورپ کی مشترکہ جنگی یلغاریں جو ۱۲ ویں اور ۱۳ ویں صدی میں مسلمانوں کے قبضے سے ارض مقدس چھڑانے کے لیے برپا کی گئیں۔ ۱۰۹۵ء میں پہلی صلیبی جنگ شروع ہوئی اور نویں صلیبی جنگ ۱۲۷۲ء میں ختم ہوئی۔

تحریک اصلاح مذہب۔ (Reformation۔ ۱۵۰۰ء و مابعد تقریباً)

سولہویں صدی کے لگ بھگ یورپ میں رومی کلیسا کی بدعنوانیوں کی اصلاح کے لیے پیدا ہونے والی مارٹن لوتھر کی وہ تحریک جس نے اصلاح مذہب کے نام پر کتاب الٰہی کی تشریح کا حق پوپ کی بجائے ہر انسان کو دیا اور دین کے اجماعی مسائل کے انکار کا جواز دیا۔ مارٹن لوتھر نے نئے عیسائی فرقے پروٹسٹنٹ کی بنیاد رکھی۔ تحریک اصلاح مذہب درحقیقت جدیدیت کو ٹھوس بنیادیں فراہم کرنے والی ثابت ہوئی۔ مارکس کے نزدیک اگر مارٹن لوتھر کی تحریک کامیاب نہ ہوتی تو یورپ میں جدیدیت کو شکست ہو جاتی۔

دور تنویر (Enlightenment۔ ۱۶۰۰ء تا ۱۸۰۰ء تقریباً)

یورپ کا وہ تاریخی دور جس میں فلاسفہ نے عقل کو افضل ترین وسیلہ معرفت قرار دیا۔ یہ دور انسان کی صمدیت پر ایمان لایا۔ تحریک تنویر ادراک حقیقت کے لیے کسی وحی کی ضرورت تسلیم نہیں کرتی بلکہ انسان اپنے کلیات کی بنا پر از خود حقیقت جان سکتا ہے۔ یہ دور ۱۷ ویں صدی کے اوائل سے شروع ہوا اور ۱۸ ویں صدی کے اواخر تک جاری رہا۔ اس کو عصر عقلیت (Age of reason) بھی کہتے ہیں۔

اس دور میں مدرسی فکر، کلیسائی اخلاق، جاگیرداری نظام اور مذہبی اثرات پر مبنی سیاست زوال پذیر ہوئی۔ اس دور کے نمائندہ مفکرین بیکن، ہوبز، لاک، ڈیکارٹ، سپائی نوزا، والٹیر اور روسو ہیں۔

رومانیت پسندی (رومانسیۃ۔ Romanticism)

اٹھارویں صدی کے آخر میں پیدا ہونے والی جرمن تحریک جس نے بورژوا طبقے کی عقلیت پسندی کی مخالفت کی۔ اس کے مطابق قدرت کی گہرائیوں تک پہنچنے کا ذریعہ سائنس اور عقل نہیں بلکہ محبت، جذبات اور تخلیقی کام ہے۔ عقلیت پسندی کے برعکس۔

فلسفے میں رومانیت عقلیت کی ضد ہے۔ جبکہ ادب میں کلاسیکیت کی ضد ہے۔

انسان پرستی (Humanism)

ایک فلسفیانہ عقلی تحریک جو عزت و کرامت کو انسانوں کی طرف لوٹانے کی قائل تھی۔ یہ ادبی فنی تحریک تھی جو یونانی، رومی اور کلاسیکی ادب کی طرف رجوع کی قائل تھی۔ ۱۶ ویں صدی میں کھڑی ہوئی۔ انسان پرستی کے

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نزدیک انسان بحیثیت خودمختار و آزاد ہستی کائنات کی واحد سچائی ہے جس کا انکار ممکن نہیں اور اس کے علاوہ ہر قدر (مثلاً تصور خدا، تصور آخرت وغیرہ) کا انکار ممکن ہے۔ انسان کائنات میں واحد مقصود بالذات ہستی ہے اور وہ کائنات کی ہر شے کو اپنی مرضی اور منشا کے تابع رکھنے کا حق رکھتا ہے۔

سائنسی انقلاب (Scientific Revolution)

یورپ میں سائنسی انقلاب کی ابتدا کاپرنیکس (۱۵۴۳ء) کے اس انکشاف سے ہوئی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، بعد ازاں اس کو کیپلر، گلیلیو، برونو نے بھی تقویت دی، نیوٹن نے سائنس کی دنیا میں ایک اور انقلاب برپا کیا۔ ۱۹۰۰ سے قبل یورپ میں سائنس کی ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز نہ تھی لیکن ۱۹۰۰ء کے بعد اس میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔

جیمز واٹ نے ۱۸۲۵ء میں سٹیم انجن ایجاد کیا جس کی وجہ سے صنعتی انقلاب ممکن ہوا۔ ۱۸۷۴ء میں اصلاح یافتہ موٹر کار ایجاد ہوئی۔ ۱۴۵۵ء میں چھاپہ خانہ کی ایجاد ہوئی۔ ۱۹۰۳ء میں ابتدائی نوعیت کا ہوائی جہاز تیار ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں ٹیلی فون اور ۱۹۲۳ء میں ٹیلی ویژن کی ایجاد ہوئی۔ ۱۸۸۸ء میں کیمرہ ایجاد ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں پہلی خاموش فلم ایجاد ہوئی، ۱۹۲۷ء میں پہلی بولتی فلم آئی، ۱۹۳۱ء میں برصغیر کے اندر پہلی فلم کی نمائش کی گئی۔ ۱۹۵۵ء میں آئن سٹائن نے نظریہ اضافیت دریافت کیا۔

انقلاب فرانس۔ (French revolution)

۹۹۔۱۷۸۹ء میں فرانس کے اندر ایک خونیں انقلاب آیا جس کے بعد فرانس کو عیسائیت سے مکمل الگ کر دیا گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد یورپ میں پہلی دفعہ ڈیموکریسی کا آغاز ہوا۔ بادشاہ اور چرچ کے اختیارات محدود کیے گئے اور مذہب کو ہر شخص کا انفرادی مسئلہ قرار دیا گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد پورے یورپ میں انقلابات برپا ہوئے اور چرچ کو ریاست سے یکسر الگ کر دیا گیا۔

صنعتی انقلاب (Industrial Revolution۔ ۱۷۵۰ء و مابعد تقریباً)

اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں مشینوں کی ایجادات اور تجارتی و زرعی انقلاب کی وجہ سے بڑی صنعتیں، سرمایہ دار اور مزدور طبقہ وجود میں آیا۔ ۱۷۵۰ء تک یورپ ایک زرعی معاشرہ تھا اور زیادہ تر گھریلو صنعتیں قائم تھیں۔ صنعتی انقلاب کی وجہ سے پورا یورپ اور بالخصوص انگلینڈ دنیا کا امیر ترین ملک بن گیا۔ صنعتی شہروں کی وجہ سے آبادی کی بے ہنگم نقل مکانی ہوئی۔ عورتوں کی مزدوری کی وجہ سے اخلاقی بے راہ روی عام ہوگئی۔ مزدوروں کا انتہائی خوف ناک استحصال شروع ہوا جس کی وجہ سے سوشلزم کی تحریک قائم ہوئی۔

جدیدیت (Modernism)

جدیدیت روایت سے بغاوت کا نام ہے۔ جدیدیت تحریک تنویر سے نکلنے والے جدید سائنسی علوم اختیار کرنے کو انسان کی آفاقی ضرورت مانتی ہے۔ جدیدیت کا بنیادی تصور انسانیت پرستی ہے۔ اس کی علمیت

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقلیت پرستی تھی۔ جدیدیت کا بانی ڈیکارٹ تھا۔ اِس کا آغاز دورِ عقلیت سے ہوا۔ جدیدیت روایت سے بغاوت اور سیکولرزم کو واحد حتمی سچائی قرار دے کر ۱۶۰۰ سے ۱۹۳۰ تک ترقی کرتی رہی اور ۱۹۳۰ کے بعد بتدریج مابعد جدیدیت کا دور شروع ہوا جس کے مطابق روایت سے بغاوت اور سیکولرزم حتمی وابدی سچائی نہیں بلکہ حتمی سچائی کا علم ناممکن ہے۔

پس جدیدیت (Post modernity)

وہ نظریہ جو انسان کے وجود کو کوئی حتمی وآفاقی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ یہ نظریہ درحقیقت آزادی کو بطور مقصد حیات فرض کرتا ہے، البتہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ تحریک تنویر نے جو اقدار و مقاصد بطور آفاقی حقیقت کے پیش کیے ان کے جواز کی کوئی عقلی دلیل نہیں۔ ان کا ایک اعتراض یہ ہے کہ عملاً مغرب میں آزادی اس طرح حاصل نہیں ہوئی جس طرح ہونی چاہیے تھی بلکہ مغرب نے حصول آزادی کے لیے ایک زبردست جبر قائم کر دیا ہے۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ضمیمہ ③

تاریخ یورپ کا ایک مختصر خاکہ

(150ق م۔600ق م)

یونان کے علمی وسیاسی عروج کا دور۔سقراط،۳۹۹ق م۔ افلاطون،۳۴۸ ق م۔ارسطو،۳۲۲ ق م۔ زینو،۲۶۴ق م،رواقیت کا بانی۔ پلاٹینوس،نوافلاطونیت کا بانی۔اپی کیورس،۲۷ق م،ابیقوریت کا بانی۔

(0-150ق م)

رومی اقتدار کا دور اور یونان کا سیاسی زوال۔

(0-800)

(۱ تا ۳۰۰ء)سلطنت روما کا عروج اور زمانہ تعذیب وابتلاء۔قسطنطین اعظم کا قبول عیسائیت، م۳۳۷ء۔نیقیہ (nicaea) کی مشہور کونسل اور تثلیث کے عقیدے کا تقرر،۳۲۵ء۔عقائد کی تشریحی مجالس دوصدیوں تک جاری رہیں۔

(۳۱۳ تا ۵۳۹ء)قسطنطین سے گریگوری تک۔عیسائیت روم کا غالب مذہب۔ دوکلیسا،بطریرک وپوپ۔۵۰۰ء میں رہبانیت عام،لاکھوں کی تعداد میں راہب۔زمانہ فروغ عیسائیت،۴۰۰ تا ۶۰۰۔رومی سلطنت کا خاتمہ ۶۷۶ء تقریباً۔

(۵۹۰تا۸۰۰)گریگوری سے شارلیمین تک۔پورا یورپ عیسائی بن گیا،تاریک دور

﴿قرونِ وسطیٰ۔۱﴾۶۰۰ تا ۱۰۰۰

قرونِ مظلمہ،رہبانیت کی ابتدا،اسلام کا عروج،معافی ناموں کا عروج۔ پاپائیت،بادشاہوں نوابوں اور پادریوں کی مثلث۔سینٹ اگسٹائن کا افلاطونیت کو مشرف بہ عیسائی کرنا۔طاقتور وحشی حملہ آوروں کا دور۔کلیسا کی علم دشمنی چار صدیوں پر محیط۔پیرس اور انگلینڈ میں پیرس اور آکسفورڈ یونیورسٹیز کی بنیاد،۱۱۵۰ء۔

﴿قرونِ وسطیٰ۔۲﴾قرونِ وسطیٰ،۱۰۰۰ تا ۱۴۰۰ء

یورپی خانہ جنگی۔ جاگیردارانہ نظام کا عروج۔یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا آغاز،۱۳۰۰ء۔ برطانیہ وفرانس میں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صد سالہ جنگ، ۱۳۳۷ تا ۱۴۵۳ء۔

پہلی صلیبی جنگ، ۱۰۹۶ء۔ آخری صلیبی جنگ، ۱۲۷۱ء۔ یروشلم پر صلاح الدین ایوبی کا قبضہ، ۱۱۸۷ء۔ میگنا کارٹا، ۱۱۸۸ء، بادشاہ کے اختیارات کم کیے گئے، لوگوں کو پارلیمنٹ میں نمائندگی ملی۔ تاجروں کی شمولیت سے جاگیرداروں کا طبقہ کمزور ہوا۔

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کی پیدائش، ۵۷۱ء۔ خلیفہ ہارون الرشید، م ۸۰۹ء۔ عالم اسلام کا مکمل عروج اوّل، ۷۰۰ تا ۱۲۰۰ء (نصف دنیا کی فتح)۔ سلطنت عثمانیہ کی بنیاد، ۱۳۰۰ء۔

اہم مسلم فلاسفہ (یہ اپنے دور میں زنادقہ کے نام سے مشہور تھے)

الکندی، ۸۷۰ء، مامون و معتصم کے دور کا یونانی فلسفہ کا مترجم۔ محمد بن موسیٰ خوارزمی، ۸۵۰ء۔ محمد بن زکریا رازی، ۹۳۲ء۔ الفارابی، ۹۵۰ء، پہلا مسلمان فلسفی۔ ابن الہیثم، ۱۰۳۹ء۔ البیرونی، ۱۰۴۸ء۔ بوعلی سینا، ۱۰۳۷ء۔ ابن رشد، ۱۱۹۸ء۔ نصیر الدین طوسی، ۱۲۷۴ء۔

اہم مسلم ناقدین۔ فخر الدین رازی، ۱۲۰۹ء، اشعری مکتب فکر کے پیروکار۔ الغزالی، ۱۱۱۱ء۔ ابن خلدون، ۱۴۰۶ء۔

(1400-1600)

عیسائی دنیا میں تین رجحانات۔

① عقلیت کا غلبہ، ۱۶۰۰ سے آج تک، سیکولرزم کا عروج، مذہب فقط انفرادی مسئلہ

② تجدد یا ماڈرن مذہب کی تحریک، مذہب میں ترمیم کی ضرورت، روسو، ہارنیک، رینان

③ کیتھولک احیاء کی تحریک، پاپائیت کے احیاء کی کوشش۔

پروٹسٹنٹ تحریک کا آغاز۔ نشاۃ ثانیہ و اصلاح مذہب کی تحریکیں۔ مارٹن لوتھر، ۱۵۴۶ء۔ پروٹسٹنٹ ملکوں کے قومی کلیساؤں کا قیام۔ یورپ میں فسادات، ۳۰ سالہ جنگیں، کیتھولک و پروٹسٹنٹ کی باہمی قتل و غارت۔ بائبل کے تراجم۔

کوپرنیکس، ۱۵۴۳ء۔ برونو، ۱۶۰۰ء زندہ جلایا گیا۔ کیپلر۔ سینٹ ٹامس ایکوائناس، ابن رشد کو شکست اور عیسائیت کو ارسطو کی بنیاد پر استوار کیا گیا۔ میکیاولی، ۱۵۲۷ء، دی پرنس کا مصنف۔ تھامس مور کی کتاب، یوٹوپیا۔ مشہور یونیورسٹیوں کا اجراء۔ روشن خیالی، علم دوستی، فکری آزادی، ماڈرنزم، ہیومنزم اور دنیا و فطرت پرستی کا بتدریج عروج۔ تجارتی ترقی۔ سرمایہ داری کا آغاز۔

ملوکیت کو عروج، مطلق العنانی، شاہوں کا نظریہ حق ربانی، پوپ کے تسلّط سے آزادی۔

دوربین، قطب نما، چھاپے خانے۔ بارود کی ایجادات۔

امریکہ کی دریافت۔ کولمبس، ۱۴۹۲ء۔ تین صدیوں تک لاکھوں ریڈ انڈینز کا قتل عام۔ افریقہ سے غلاموں

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی درآمد (۱۶۶۲۔۱۸۰۷ء)۔واسکوڈے گاما،۱۴۹۸ء،ہند کا نیا راستہ دریافت۔کیپٹن کک،آسٹریلیا کی دریافت۔ سیاحت کا دور (امریکہ،ہند کا بحری راستہ،بحرالکاہل)۔میگیلان کا زمین کے گرد پہلا چکر،۱۵۲۲ء۔

سقوط بغداد از ہلاکو خان،۱۲۸۵ء۔عالم اسلام کا عروج ثانی،۱۲۸۵ تا ۱۷۰۰ء۔ترکوں کا فتح قسطنطنیہ، ۱۴۵۳ء۔اکبر اعظم ہندوستان،۱۵۵۶ء۔سقوط اسلامی اندلس،۱۴۹۲ء۔

(1600-1700)

گلیلیو،۱۶۴۱ء۔نیوٹن،۱۷۲۷ء،میکانیت کا بانی۔فرانسس بیکن،۱۶۲۶ء،سائنسی طریق کار کا بانی۔ ڈیکارٹ،۱۶۵۰ء،عقلیت کا احیا۔سپائی نوزا۔تھامس ہابس،۱۶۷۹ء۔جان لاک،۱۷۰۴ء،تجربیت کا بانی۔

(معاشی مکاتب فکر) فزیوکریسی،فطرت کی حکمرانی،لاک وسپائی نوزا اس کے حامی تھے۔

(یورپی امپیریلزم) یورپی اقوام کا امریکہ،کینیڈا اور برازیل پر قبضہ۔

(1700-1800)

وجودیات کے بجائے علمیات کا عروج۔

(اہم مفکرین) برکلے،۱۷۵۳ء۔ڈیوڈ ہیوم،۱۷۷۶ء، مشکک، معجزات ومذہب کا منکر۔ مونٹسکو،۱۷۵۵ء۔روسو،۱۷۷۸ء،رومانیت وانقلاب فرانس کا ہیرو،نظریہ فطرت کا علم بردار۔والٹیئر،۱۷۷۸ء، عقل پرستی کا بہت بڑا مبلغ،انقلاب فرانس کا ہیرو۔کانٹ،۱۸۰۴ء،وضعیت عقلیت کا بانی۔

(معاشی مفکرین) آدم سمتھ،۱۷۹۰ء،سرمایہ دارانہ معیشت کا بانی،فزیوکریسی سے مختلف نظریہ،کلاسیکل اکانومکس کا آغاز۔جرمی بینتھم،نظریہ نفعیت کا بانی،فزیوکریسی کا مخالف۔

ماڈرنزم۔استنادیت کی مخالفت،مذہب کو توہم قرار دینا اور مذہب کی ماڈرن تشریح۔ہیومنزم ریشنلزم اور سیکولرزم کا بتدریج غلبہ۔روایت شکنی،آزاد خیالی،روشن خیالی پر مبنی تحریک تنویر۔

(یورپی امپیریلزم) عالم اسلام پر حملے۔ہندوستان پر قبضہ اور تاریخ میں پہلی دفعہ قحط۔امریکہ کی جدوجہد آزادی،۱۷۷۶ء،برطانوی نوآبادیات میں سب سے پہلے آزاد ہونے والے۔

(عالم اسلام کا خوف ناک زوال،۱۷۰۰ تا ۱۹۲۴ء) آل عثمان پر مسلسل یلغار اور بتدریج شکست،الغاء خلافت،۱۹۲۴ء۔ٹیپو سلطان کی شہادت،۱۷۹۹ء۔ہند پر انگریزی استعمار کا مکمل قبضہ،۱۸۵۷ء۔شاہ ولی اللہ، ۱۷۶۲ء۔سراج الدولہ کی شکست،۱۷۵۷ء۔

(1800-1900)

(مفکرین) جان اسٹورٹ مل،انفرادیت کا سب سے بڑا مفکر۔ہیگل،۱۸۳۱ء،جدید فکریات کا باوا

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آدم، اجتماعیت کا سب سے بڑا مفکر۔ کیئر کیارڈ، ۱۸۵۵ء، وجودیت کا بانی۔ نٹشے، ۱۹۰۰ء، جدیدیت کا پہلا ناقد۔

(معاشرتی مفکرین) کامتے ۱۸۵۷ء، فلسفہ اثباتیت اور عمرانیات کا بانی۔ ہربرٹ سپنسر، ۱۹۰۳ء، عضویت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ ایمل درخائیم، ۱۹۱۷ء۔

(معاشی مفکرین) مالتھس، ۱۸۳۴ء، آبادی کے اضافے کا نظریہ۔ ریکارڈو، ۱۸۲۳ء، معاشیات کا نیوٹن۔ سسمانڈے، ۱۸۴۲ء، سوشلزم کے ابتدائی تصورات۔ سائمن، ۱۸۲۵ء، مزدور طبقے کا حامی۔ پرادھن، ۱۸۶۸ء، مارکس کا پیش رو، جائیداد کا مخالف۔ کارل مارکس، ۱۸۸۳ء۔

(حیاتیاتی مفکرین) ڈارون، ۱۸۸۲ء، نظریہ ارتقاء پیش کرنے والا

(انقلاب فرانس کی صدی) انقلاب فرانس، ۱۷۹۰ء۔ صنعتی انقلاب، ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ۔ جیمز واٹ، دخانی انجن کا اصول، ۱۸۱۹ء۔

(حقوق نسواں) پہلی منظم تحریک، ۱۸۰۰ء۔ پہلی دفعہ سیاسی حقوق، ۱۸۵۰ء۔

(سائنسی ترقی کی صدی) کیمیائی عناصر کی درجہ بندی، ۱۸۷۹ء۔ تابکاری کی دریافت، ۱۸۹۷ء۔ طباعت کی مشین، ۱۸۴۵ء۔ کار موٹر سائیکل کی بتدریج ایجاد، ۱۸۸۵ء۔ جدید زراعت کا آغاز، سمندری دخانی جہاز کی ابتدا۔

(یورپی امپیریلزم) عالم اسلام پر قبضہ۔ امپیریل ازم ساری دنیا پر مسلط۔ مکمل افریقہ پر قبضہ، ۱۸۰۰ تا ۱۹۵۰ء۔ سرسید احمد خان، ۱۸۹۸ء۔

(1900-2000)

(اہم مفکرین) سارتر، ۱۹۸۰ء۔ برگساں، ۱۹۴۱ء، وجدان پرست۔ فرائڈ، ۱۹۳۹ء۔ برٹرینڈ رسل۔

(سیاسی صورت حال) پہلی جنگ عظیم، (۱۹۱۴۔ ۱۹۱۹ء)۔ دوسری جنگ عظیم، (۱۹۳۹۔ ۱۹۴۵ء)، جاپان پر دو ایٹم بم کا استعمال۔ انقلاب روس، ۱۹۱۸ء۔ انقلاب چین، ۱۹۴۸ء۔ اسرائیل کا قیام، ۱۹۶۷ء۔

(سائنسی ترقی) ایڈیسن، ۱۹۳۱ء۔ مارکونی، ۱۹۳۷ء۔ صوتی فلمیں، ۱۹۲۷ء۔ ہیلی کاپٹر، ۱۹۳۹ء۔ کمپیوٹر، ۱۹۴۴ء۔ ٹیلی فون، ۱۹۲۲ء۔ موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹی وی، ایٹم بم، سینما وغیرہ کی ایجادات۔

ماخذات

المعجم الفلسفی، دکتور مصطفیٰ حسیبۃ، دار اسامۃ، اردن، ۲۰۰۹ء (www.books4all.net)

الموسوعۃ المیسرۃ فی الادیان والمذاہب والاحزاب المعاصرۃ، الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی (WAMY)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

فلسفہ مغرب کی تاریخ، برٹرینڈ رسل ر پروفیسر محمد بشیر، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۶ء
تاریخ تہذیب انسانی، سرگودھا یونیورسٹی سرگودھا
جدیدیت، حسن عسکری، ادارہ فروغ اسلام لاہور، ۱۹۹۷ء
ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ثروت صولت، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۲ء
Patrick O'Brien Philip's Atlas of World History. 2005
Peter N. Stearns The Encyclopedia of World History 2001

مزید مطالعہ کے لیے مجوزہ کتب

افکارِ مغرب

سرمایہ دارانہ عقائد ونظریات، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، وراثت لاہور، ۲۰۱۴ء
سرمایہ دارانہ نظام ایک تنقیدی جائزہ، محمد احمد حافظ، زیر نگرانی ڈاکٹر جاوید اکبر، ۲۰۰۹ء الغزالی کراچی
اسلامی بنکاری و جمہوریت، فکری پس منظر اور تنقیدی جائزہ، زاہد صدیق مغل، وراثت لاہور، ۲۰۱۲ء
مغربی تہذیب ایک معاصرانہ تجزیہ، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، شیخ زاید لاہور، ۲۰۰۲ء
جدیدیت، حسن عسکری، ادارہ فروغ اسلام لاہور، ۱۹۹۷ء
اسلام کا نظریہ حیات، خلیفہ عبدالحکیم، ادارہ ثقافت لاہور
حالی و سرسید کا نظریہ فطرت، ڈاکٹر ظفر حسن، ادارہ ثقافت لاہور، ۲۰۰۳ء
قرآن اور علم جدید، ڈاکٹر محمد رفیع الدین، آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن لاہور، ۱۹۸۷ء
سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری، وراثت لاہور، ۲۰۱۴ء
گلوبلائزیشن اور اسلام، مولانا یاسر ندیم، دارالاشاعت کراچی، ۲۰۰۴ء
مابعد جدیدیت کا چیلنج اور اسلام، سید سعادت اللہ حسینی، ادارہ ثقافت لاہور، ۲۰۱۴ء
مابعد جدیدیت (نظری مباحث)، مرتب ڈاکٹر ناصر عباس نیر، بیکن بکس لاہور، ۲۰۱۴ء
مابعد جدیدیت (فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں)، ڈاکٹر اقبال آفاقی، مثال فیصل آباد، ۲۰۱۳ء
عالم اسلام، جدیدیت و روایت کی کشمکش (قرن اول سے عہد حاضر تک)، سید خالد جامعی، عمر حمید، جریدہ جامعہ کراچی
انڈیا کا مادہ: اردو دائرہ معارف اسلامی، پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

اہم انسائیکلوپیڈیا

الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ، (Global Arabic Encyclopedia)(www.intaaj.net)

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

Britannica Concise Encyclopedia 2006.
المعجم الاسلامی، اشرف طہ، دارالشروق قاہرہ، ۲۰۰۲ء

تاریخ عیسائیت

عیسائیت، عبدالوحید خان، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۷۵ء
اسلام اور مذاہب عالم، مظہر الدین صدیقی، ادارہ ثقافت لاہور، ۱۹۵۶ء

تاریخ برصغیر

مسلم ثقافت ہندوستان میں، عبدالمجید سالک، ادارہ ثقافت، لاہور، ۱۹۸۲ء
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، خلیق احمد نظامی، ادارہ ادبیات دلی، دہلی، ۱۹۸۱ء
سلطنت دہلی کا نظم حکومت، اشتیاق حسین قریشی / ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف کراچی، ۱۹۷۱ء
موج کوثر، شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافت لاہور، طبع ۲۶، ۲۰۱۴ء
تاریخ دعوت و جہاد برصغیر کے تناظر میں، عبیداللہ فہد فلاحی، ادارہ معارف، لاہور، ۲۰۰۰ء
برصغیر کی ملت اسلامیہ، اشتیاق احمد قریشی، شعبہ تالیف جامعہ کراچی، ۱۹۶۷ء
پاکستان میں اسلام اور لبرلزم کی کشمکش، اشتیاق احمد گوندل، شیخ زید اسلامک سنٹر لاہور، ۲۰۱۱ء

دینی تحریکیں

برصغیر میں بیداری ملت کی تحریکیں، سید اسعد گیلانی، فیروز سنز لاہور، ۱۹۹۲ء
آزادی کی تحریکیں، عبیداللہ قدسی، ادارہ ثقافت لاہور، ۱۹۸۷ء
عصر حاضر کی جہادی تحریکیں، شفیق ملک، نوید سحر لاہور، ۱۹۹۸ء
عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں، مسعودہ نعیم شاہ، سندھ ساگر اکادمی لاہور، ۲۰۱۳ء
احیائے ملت اور دینی جماعتیں، الطاف احمد اعظمی، دارالتذکیر، لاہور، ۲۰۱۲ء

خواتین

جدید دنیا میں اسلامی قوانین اور خواتین، جیانٹ فورم، اسلام آباد،
مسلم خواتین کی قومی کانفرنس، حکومت پاکستان اسلام آباد، ۱۹۸۰ء
پاکستانی عورت کی سماجی و قانونی حیثیت، رشیدہ پٹیل، اپوا کراچی،
عورت، خاندان اور ہمارا معاشرہ، مسائل اور لائحہ عمل، خالد رحمٰن، سلیم منصور، ips، اسلام آباد، ۲۰۰۷ء
اسلام کا معاشرتی نظام، ڈاکٹر خالد علوی، الفیصل لاہور، ۲۰۰۹ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان اور تعلیم

پاکستان میں تعلیم ایک تحقیقی جائزہ، انجم رحمانی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو لاہور، ۲۰۰۹ء
پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مناظر احسن گیلانی، رحمانیہ لاہور،
دینی مدارس، نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے، حقانی میاں قادری، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۰۲ء
تعلیم اسلامی تناظر میں، ips، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء
پاکستان میں تعلیم کا ارتقاء (ڈاکٹر عبدالرشید ارشد)، ادارہ تعلیمی تحقیق لاہور، ۱۹۸۵ء
پاکستان میں ذریعہ تعلیم کا مسئلہ، مسلم سجاد، سلیم منصور، ips، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء
اسلامی ریاست میں نظام تعلیم، مسلم سجاد، ips، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء
مغربی نظام تعلیم، تنقید و تبصرہ، پروفیسر سید محمد سلیم، ادارہ تعلیمی تحقیق و تنظیم اساتذہ لاہور، ۱۹۹۵ء

پاکستان اور ادب

اردو ادب کی تحریکیں، ڈاکٹر انور سدید، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۷ء
جدید اور مابعد جدید تنقید (مغربی اور اردو تناظر میں)، ڈاکٹر عباس نیر، انجمن ترقی کراچی، ۲۰۱۳ء
اردو میں اسلامی ادب کی تحریک، مہر اختر وہاب، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۱۰ء
اسلامی نظریہ ادب، سید اسعد گیلانی، ادارہ ترجمان القرآن

انگلش مراجع

ALloyd Ridgeon Major World Religions 2003
M.J. Charlesworth Philosophy and Religion_ from Plato to postmodernism 2002
Patrick O'Brien Philip's Atlas of World History. 2005
Peter N. Stearns Encyclopediaclopedia of European Social History 2000
Peter N. Stearns The Encyclopedia of World History 2001
Steven Hause, William Maltby Western Civilization - A History of European Society - Second edition 2004
The History of Science and Religion in the Western Tradition - An Encyclopedia
William J. Duiker Twentieth-Century World History 2004
Carl Waldman, Catherine Mason Encyclopedia Of European People (2 volume set(vol 1, 2 2006
Carol R. Ember, Melvin Ember Encyclopedia of Sex and Gender. Men and Women in the Worlds Cultures 2003

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

David Levinson Encyclopedia of World Cultures_ Europe and the Middle East Volume 4 1991

Donald_M._Borchert_The_Encyclopedia_of_Philosophy_10-volume_Set_2005

Edward_Craig_Routledge_Encyclopedia_of_Philosophy_10_Volumes_Set_1998

Mary Z. (Zeiss(Stange, Carol K. Oyster, Jane E. Sloan Encyclopedia of Women in Today's World 2011

Robert T. Francoeur, Raymond J. Noonan Continuum Complete International Encyclopedia of Sexuality 2003

عربی مراجع

حقيقة اللبرالية وموقف الاسلام منها۔ عبدالرحيم بن صمايل السلمی۔ مركز التاصيل للدراسات والبحوث۔ المملكة العربية السعودية، ۲۰۰۹ء

(www.taseel.org)

المعجم الفلسفی ، مجمع اللغة العربية، القاهرة، ۱۹۸۳ء

المعجم الفلسفی، دكتور مصطفی حسيبة، دار اسامة، اردن ، ۲۰۰۹ء

(www.books4all.net)

الموسوعة الميسرة فی الاديان والمذاهب والاحزاب المعاصرة، الندوة العالمية للشباب الاسلامی(WAMY) ، دار الندوة رياض، ط٤:١٤٢٠ه

قصة الفلسفة ، ول ديورانت، مكتبة المعارف بيروت، ط٦:١٩٨٨ء

مجوزہ ویب سائٹ برائے استفادہ

www.Sultan.org	(عربی کتب)
www.kt-b.com	(فلسفۂ تاریخ عالمِ جدید علوم پر عربی کتب)
www.libgen.info	(فلسفۂ تاریخ عالمِ مغربی تہذیب پر انگلش کتب)
www.saaid.net	(عربی کتب)
www.kitabosunnat.com	(اردو کتب)

تمت بالخیر

محمد زکریا رفیق

۲۵ر جنوری ۲۰۱۶ء

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد کتب پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ڈاکٹر سفر الحوالی (پیدائش 1955ء) سعودیہ کے نامور عالم دین، محقق اور فکری راہنما ہیں۔ انہوں نے ام القریٰ یونیورسٹی مکہ المکرمہ سے عقیدہ و افکار جدیدہ پر Phd کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ مکہ یونیورسٹی میں تدریس کا فریضہ سرانجام دیا اپنے دُروس، محاضرات، میڈیا، بیانات، انٹرویوز اور تالیفات کے ذریعے دینی راہنمائی کی۔ 1994ء کے بعد پانچ سال تک سعودی حکومت کے زیر حراست رہے۔ 2006ء سے اب تک دماغی تکلیف کی وجہ سے صاحب فراش ہیں۔ ان کی تالیفات کی تعداد ایک درجن سے زائد ہے۔

1990ء میں انھوں نے سعودی عرب میں امریکی فوج کی موجودگی کی مخالفت کی۔ انھیں نائن الیون کے حملے پر بھی اعتراض تھا۔ 2003ء میں انھوں نے القاعدہ کے ریاض حملوں کی مذمت کی۔ سیاسی و عالمی اسلامی حالات پر اُن کی گہری نظر ہے اور وہ علمی، فکری اور دعوتی میدان میں گہرے اثر و رسوخ کے حامل ہیں۔

زیر نظر کتاب "العلمانیۃ ۔سیکولرزم" ڈاکٹر سفر الحوالی کا ایم اے کا مقالہ ہے جو مدینہ یونیورسٹی میں عالم اسلام کے معروف مفکر و دینی راہنما "محمد قطب" کے زیر نگرانی لکھا گیا۔ یہ کتاب سیکولرزم کے کسی محدود معنی میں نہیں بلکہ یہ مکمل مغربی فکر و فلسفہ کا مختصر و جامع احاطہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر سفر مغربی فکر پر اسلامی تنقید کے سب سے بڑے راہنما سید قطبؒ اور محمد قطبؒ کی روایت کے امین ہیں اور انھوں نے ان کی وسیع ترین تنقید کو ایک کتاب میں جامعیت، اختصار، توازن، سہولت اور شرعی و علمی لب و لہجہ کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ گویا یہ کتاب مغربی فکر و فلسفہ کا جامع خاکہ ہے جو عقیدہ و مذہب، سیاست و معیشت، معاشرت و اخلاق، نسوانیات، تعلیم اور ادب و فن کے پہلوؤں پر محیط تمام بڑے مغربی مفکرین و مکاتب فکر کا تعارف تاریخی تسلسل اور تاریخی اسباب و نتائج کے ساتھ عام فہم اسلوب میں پیش کرتی ہے۔

ڈاکٹر سفر الحوالی عقیدہ و شریعت کے بھی بہت بڑے عالم ہیں۔ انھوں نے عالم اسلام میں سیکولرزم کے دخول اور اس کے شرعی و فنی حکم کا بھی جائزہ لیا ہے جو خاص پختہ کار علمائے شریعت کا منصب ہوتا ہے۔ یہ خوبی اس کتاب کی خاص انفرادیت ہے۔ عالم عرب میں مغربی فکر و فلسفہ پر شرعی تنقید کی یہ کتاب سب سے بہتر ہے، جس نے عرب کے دینی اور پڑھے لکھے معاشرے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ مترجم نے اس کتاب کے اُردو ایڈیشن کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اصطلاحات کی تفہیم اور دیگر علمی و فنی سہولت کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ سیکولرزم کی صحیح تفہیم پر اہل اسلام کے بہتر تعلیمی، معاشرتی، سیاسی اور تحریکی لائحہ عمل کا دارومدار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور ہماری کوششوں کو قبول کرے۔ آمین

Design By: 0300-4528821
MUHAMMAD AHSUN Gull

فضل سنز
فضل سنز پرنٹرز اینڈ پبلشرز
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ پاکستان
فون: 0092-42-37239884-37320318
ای میل: kitabsaray@hotmail.com